ڈھلتے سایے

زندگی نامہ

منیر الدین احمد

حقوق طبع بحق مصنف محفوظ ہیں

۲۰۰۶ء

انتساب

دادا جان

مولوی محمد فضل خان

کے نام

"ایک غلط فہمی بہت عام ہے کہ صرف غیر معمولی انسانوں کی کہانی سنائی جا سکتی ہے یا صرف انہیں اپنی کہانی سنانے کا حق حاصل ہے۔ درحقیقت ہر زندگی کی ایک کہانی پائی جاتی ہے، بشرطیکہ انسان اس کو سنانے کی استطاعت رکھتا ہو اور اس کی تکنیک اسے آتی ہو۔ تکنیک کی ایجاد ادب کا اولین فرض ہے اور ادیبوں کو کہانیاں اس لیے سنانی ہوتی ہیں تاکہ مزید زندگیاں سنائے جانے کے قابل بن سکیں"

پیٹر بخسل

فہرست

پیش لفظ ۷

پہلا باب

خاندانی پس منظر ۹

بچپن کی یادیں ۱۶

قادیان کی زندگی ۳۹

راولپنڈی کی کہانیاں ۵۴

اماں کی ملی خدمات ۶۴

ادب کی طرف پیش رفت ۷۵

دوسرا باب

احمد نگر کے قصے ۹۰

ربوہ کی باتیں ۱۰۹

جامعۃ المبشرین کی کہانیاں ۱۲۰

غیر ملکی طالب علم ۱۳۲

قصر خلافت میں بھونچال ۱۳۷

بیگار کی مشقت ۱۴۴

میرے شب و روز ۱۴۹

تیسرا باب

جرمنی کے لیے روانگی ۱۶۷
مشن ہاؤس سے علیحدگی ۱۹۱
اوتا کی کہانی ۲۱۶
یونیورسٹی کی زندگی ۲۲۵
سپین اور پرتگال ۲۳۶
شادی خانہ آبادی ۲۵۱

چوتھا باب

پاکستان کا پہلا سفر ۲۶۶
تہران میں سمینار ۲۷۲
افغانستان میں چندروز ۲۷۲ ۳۱۴
پاکستان کا دوسرا سفر ۲۸۰
قیوم کا جرمنی آنا ۲۹۰
مصر میں قیام ۲۹۲
احمد علی تالپور ۳۰۴
پاکستان کا تیسرا سفر ۳۰۶
مستشرقین کی عالمی کانفرنس ۳۱۱
سوئٹزرلینڈ اور اٹلی ۳۱۲

پانچواں باب

جرمن اوریینٹ انسٹی ٹیوٹ ۳۱۵
جرمن پاکستان فورم ۳۱۹
خیری برادران ۳۲۰
احمدیوں کا جرمنی میں پناہ لینا ۳۲۳
دتلف خالد ۳۲۶

جنوبی یورپ ۳۲۹
مراکو کی سیاحت ۳۳۱
اوتا کی پاکستان یاترا ۳۳۶
اردو ادب کی طرف واپسی ۳۳۹
حبشہ اور سوڈان ۳۴۱
پرتگال کا دوسرا سفر ۳۴۵
ماریشس کا سفر ۳۴۷

چھٹا باب

ترکی کا سفر ۳۵۸
پاکستان کا پانچواں سفر ۳۶۳
امریکہ کی سیاحت ۳۷۲
ہندوستان یاترا ۳۸۹
شام کا سفر ۳۹۸
سعودی عرب کی زیارت ۴۱۱
یمن کا سفر ۴۲۰

ساتواں باب

اسرائیل کا سفر ۴۳۵
سپین میں سمینار ۴۴۲
ترقی پسند مصنفین کی جوبلی ۴۵۲
چلی کا سفر ۴۵۴
پین انٹرنیشنل کی کانفرنس ۴۵۹
وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی زیارت ۴۶۷
سلمان رشدی کی "شیطانی آیات" ۴۷۷
پارلمانی الیکشن کی مبصری ۴۸۱

عالمی ادبی کانفرنس ۴۸۳
ایران کا دوسرا سفر ۴۸۶
ملائیزیا میں اسلام کانفرنس ۵۰۴

اختتامیہ ۵۰۶

پیش لفظ

یہ ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ ہم ایک روز قبل گرمیوں کی تعطیلات یوگوسلاویہ کے جزیرے رگوزنتسا پر گزارنے کے لیے پہنچے تھے اور دوپہر کے وقت سمندر میں پیراکی کے وقفے میں درختوں کے سایے میں پڑے تھے۔ اوتا ایک ناول پڑھنے میں مگن تھی۔ میں اپنے ساتھ پڑھنے کے لیے کچھ نہیں لایا تھا اور حسیناؤں کو نیم برہنہ بھاگتے دوڑتے ہوے اور آپس میں اٹکھیلیاں کرتے ہوے دیکھ رہا تھا۔ مگر انسان کب تک اس مشغلے سے دل بہلا سکتا ہے! میں تھوڑی دیر میں بور ہو کر سوچنے لگا کہ اگر پڑھنے کو کچھ نہیں ہے تو کیوں نہ کچھ لکھا جائے۔ تاہم میرے ذہن میں یہ چیز واضح نہ تھی کہ کیا لکھا جائے۔ البتہ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کر اسٹیشنری کی ایک دکان پر گیا، جو ایک قریبی اسکول کے پہلو میں واقع تھی۔ وہاں پر کھلے سفید کاغذ دستیاب نہ تھے، جن پر میں بچپن سے لکھتا آیا ہوں۔ میں نے سات سال کی عمر میں پہلی بار سفید کاغذ کا دستہ خرید کر کاپی بنائی تھی اور اس دن سے آج تک لکیر دار کاغذ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نے الٹ پلٹ کر اسکول کے بچوں کے لیے تیار کردہ کاپیاں دیکھیں، جو ساری لکیر دار تھیں۔ البتہ ایک کاپی سفید کاغذ والی نکل آئی اور دکاندار مجھے اپنا بال پوائنٹ پین بھی قیمتاً دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں اپنی جگہ پر واپس پہنچا تو اوتا نے کتاب پر سے نظر ہٹاتے ہوے پوچھا: ''کیا کہانی لکھنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے جواب میں کندھوں کو اچکا دیا، کیونکہ میں نے ابھی اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا تھا۔ آخری افسانہ ''سو شکستیں ایک فتح'' میں نے سولہ سال قبل لکھا تھا، جو میری پاکستان سے روانگی سے تھوڑا پہلے ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں چھپا تھا اور میری کتاب ''زرد ستارہ'' میں شامل ہے۔ میں نے کہا: ''اگر کہانی ہی لکھنی ہے تو کیوں نہ میں اپنی زندگی کی کہانی لکھوں۔'' اوتا نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا، کیونکہ چالیس برس کی عمر میں آپ بیتی لکھنے کا خیال فی الواقع بہت اوپرا تھا۔ اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ یہ چیز میری ادب کی طرف مراجعت کا ذریعہ بن جائے گی۔

آیندہ برسوں میں یہ کاپی سفروں کے دوران ہمارے ساتھ ہوتی تھی اور میں فرصت کے اوقات میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار پر نوٹ لیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۹ء تک پورے پانچ سال تک چلتا رہا، جب میں نے طولون (یونان) کے ساحلی مقام پر بیس برسوں کے وقفے کے بعد اپنا افسانہ "جنم جنم کا

ساتھ " تخلیق کیا۔اس طرح میری افسانہ نویسی کا دوسرا دور شروع ہوا،جس کے دوران اب تک میرے افسانوں کے چار مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور پانچواں تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ جرمن اور اردو ادب کے تراجم کی سات اور چند ایک دوسری کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔

یوں تو میرے افسانوں میں میری زندگی مرقوم ہے،مگر اس کو افسانے کے اندر اس طرح مدغم کر دیا جاتا ہے کہ قاری کو بعض اوقات یہ فیصلہ کرنے میں دقت ہو سکتی ہے کہ اس میں اصل زندگی کا حصہ کتنا ہے اور افسانہ طرازی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔اس لیے میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ مجھے اپنی زندگی کی کہانی علیحدہ طور پر رقم کرنی چاہیے۔اب یہ کہانی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔میں نے کوشش کی ہے کہ اسے افسانہ بننے سے بچایا جائے اور جہاں تک میرے لیے ممکن تھا اس میں حقیقت کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

" ڈھلتے سایے" کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے ریاض احمد اور محمد سلیم الرحمٰن کا شکریہ ادا کرنا ہے،جن کی خصوصی توجہ کے سبب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچ پائی ہے۔میرے دوست ڈاکٹر محمد احمد حامی کتاب کے مسودے کے پہلے قاری تھے اور ان کی مدد سے بعض غلطیاں درست کی جا سکیں۔اگر اب بھی کتاب میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، تو اس کی ذمہ داری سراسر میری ہے، جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

کمر فیلڈ (جرمنی) **منیر الدین احمد**

پہلا باب

خاندانی پس منظر

میرے آبا واجداد کا تعلق چنگا بنگیال تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی سے ہے، جو گوجر خان سے کلر سیداں جانے والی سڑک پر سات میل کے فاصلے پر واقع ہے اور سترہ ڈھوکوں پر مشتمل ہے۔ اس نواح میں بنگیال قوم کے پانچ گاؤں پائے جاتے ہیں۔ جہلم، گجرات اور گوجرانوالہ کے اضلاع میں بھی اس قوم کے لوگ آباد ہیں۔ راولپنڈی میں ان کا شمار راجپوتوں میں ہوتا ہے، جب کہ دوسرے اضلاع میں ان کو جاٹ گنا جاتا ہے۔ میرے قبیلے کا کہنا ہے کہ ہم پنوار راجپوتوں میں سے ہیں۔ ہمارے خاندان میں محفوظ شجرہ نسب انچاسویں نسل پر راجہ انگ پال تک جاتا ہے۔ کاغذاتِ جمعبندی سے تصدیق شدہ پیڑھی حسبِ ذیل ہے:

منیر الدین احمد بن عبدالرؤف خان بن محمد فضل خان بن غلام محمد خان بن جمال خان بن فقیر خان بن عزت خان بن دلیل خان بن نجارت خان بن بشارت خان بن عزت خان بن بیرم خان بن سبر خان بن ٹھکر خان بن خواجہ خان بن تاجا خان بن پیرو خان بن گنگ خان بن دیپال خان بن سونج خان بن راجہ پٹن پال۔

گویا میرے اجداد بیس نسلیں قبل پندرھویں صدی کے لگ بھگ ہندومت کو چھوڑ کر مسلمان ہوے تھے۔ قرینِ قیاس ہے کہ اس سے بہت پہلے میرے اجداد شاید بدھ مت کے پیروکار رہے ہوں گے، کیونکہ پٹھوہار کا علاقہ زمانہ قدیم میں بدھ مت کا گڑھ تھا۔

میں ۲۲ نومبر ۱۹۳۴ء کو راولپنڈی میں راجہ عبدالرؤف خان اور ان کی اہلیہ امۃ العزیز بیگم کے ہاں پیدا ہوا۔ میں اپنے والدین کا چھٹا بچہ تھا۔ پہلے تین بچے: ایک لڑکا عبدالقدیر اور دو توام پیدا ہونے والی بچیاں کم عمری میں مر گئے تھے اور صرف دو بچے: نصیر الدین احمد اور نصیرہ بیگم (شاہدہ عزیز) میری پیدائش کے وقت زندہ تھے۔ دادا جان مولوی محمد فضل خان نے، جو صاحبِ کشوف والہامات تھے، میرا نام محمد یحییٰ تجویز کیا۔ آپ کو ۲۴ اگست ۱۹۳۴ء کو الہام ہوا تھا: **انا نبشرک بغلام اسمه یحییٰ** (ہم تمھیں ایک

لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہوگا)۔اس کے دو ماہ انتیس دن کے بعد میں پیدا ہوا، تو ابا جی نے مجھے یہی نام دیا، جو میونسپل کمیٹی، راولپنڈی کے رجسٹر پیدایش میں درج ہوا۔مگر اس دوران میں اماں نے اپنے روحانی پیشوا مرزا بشیر الدین محمود احمد، امامِ جماعتِ احمدیہ، کو قادیان نومولود کا نام تجویز کرنے کے سلسلے میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ چند روز کے بعد قادیان سے خط آیا کہ بچے کا نام منیر الدین احمد رکھا جاتا ہے۔اس دن سے مجھے یہ نام دے دیا گیا۔البتہ مجھے بچپن سے پتا تھا کہ دادا جان مجھے اپنی وفات تک یحییٰ کے نام سے پکارتے رہے تھے، اس لیے میں شروع سے اپنے نام کے ساتھ یحییٰ کو بطور تخلص کے لکھا کرتا تھا۔ آگے چل کر میں نے یحییٰ فضلی کا قلمی نام اختیار کیا، جس کے تحت میرے ادب پارے لمبے عرصہ تک چھپتے رہے۔

دادا جان مولوی محمد فضل خان عربی زبان کے اجل عالم اور اسلامی علوم کے بلند پایہ مصنف تھے۔آپ نے ''اسرارِ شریعت'' جیسی عظیم الشان کتاب تین جلدوں میں تصنیف کی، جس میں اسلامی تعلیم وعقیدے کو عقل ونقل کی رو سے ثابت کیا گیا۔اسکے علاوہ بھی آپ نے درجن بھر کتابیں لکھیں۔آپکا سب سے بڑا کارنامہ ابنِ عربی کی کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' کا اردو ترجمہ ہے، جو بدقسمتی سے مکمل نہ ہو سکا۔ آپ کی زندگی میں اس کی صرف دو جلدیں چھپ سکیں، جن کا نیا ایڈیشن حال میں لاہور سے شایع ہوا ہے۔ میں نے بارہ سال کی عمر میں دادا جان پر کتاب لکھنے کا ارادہ باندھا تھا، جس کو ۶۶ سال کی عمر میں آ کر مکمل کر پایا ہوں۔فالحمدللہ۔ یہ کتاب بہ عنوان: ''مولوی محمد فضل خان: ایک عالمِ ربانی کی سوانح حیات'' بہت جلد ہندوستان سے چھپ کر شایع ہوگی۔

میرے والد راجہ عبدالرؤف خان اپنے والدین کی تیسری اولاد تھے۔آپ کی سب سے بڑی بہن زینب، جو ۱۸۹۱ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئی تھی، کم عمری میں فوت ہو گئی تھی۔ابا جی کے بڑے بھائی راجہ عبدالرحمٰن خان، جن کو ہم عمو جان کہہ کر پکارتے تھے، ۱۸۹۴ء کو عمرال (ضلع جہلم) میں پیدا ہوے، جہاں پر دادا جان صوبہ دار میجر و آنریری کپتان شیر باز خان کے بچوں کی اتالیقی کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ ابا جی کی پیدایش ستمبر ۱۸۹۹ء کو گوندل (ضلع اٹک) میں ہوئی، جہاں پر دادا جان انیسویں صدی کے آخری تین برسوں میں قاضی فتح محمد رئیسِ گوندل کے بچوں کے اتالیق تھے۔آپ کو اپنے دونوں متذکرہ بیٹوں اور ایک بیٹی ایمنہ بی بی کی جوانی کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوا۔دادا جان کا سب سے چھوٹا بیٹا عبدالرحیم خان صرف چودہ برس کی عمر میں ۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء کو وفات پا گیا تھا۔

ابا جی کی پیدایش کے چنداں بعد دادا جان اپنے گاؤں چنگا بنگیال لوٹ گئے، جہاں پر آپ کے والد راجہ غلام محمد خان اپریل ۱۸۹۷ء میں گزر گئے تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ کا اصرار تھا کہ آپ ان کے

پاس آ کر گاؤں میں رہیں۔ اس عرصے میں دادا جان نے تصنیف و تالیفِ کتب کا کام شروع کر دیا تھا، جس کے لیے آپکو کامل یکسوئی گاؤں میں ہی مل سکتی تھی، جہاں پر آپ نے اچھا خاصا کتب خانہ بنا لیا تھا۔

ابا جی نے ابتدائی تعلیم چنگا بنگیال کے پرائمری اسکول اور قاضیاں کے مڈل اسکول اور گوجر خان میں پائی۔ پھر آپکو بڑے بھائی عبد الرحمٰن کے ساتھ قادیان کے تعلیم الاسلام ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ یہ جنگِ عظیم اول کے دنوں کی بات ہے، جب ملک میں بے حد کساد بازاری پھیلی ہوئی تھی۔ دادا جان کی متعدد کتابیں اس دوران میں چھپیں۔ بالخصوص ''فتوحاتِ مکیہ'' کی اشاعت قسط وار چھپنے والے رسالوں کی صورت میں ہوتی تھی۔ دادا جان کا ارادہ پریس لگانے کا تھا تاکہ کتابوں کی چھپائی باقاعدگی کے ساتھ ہو سکے۔ آپ نے اس امر کا اعلان بھی کر دیا تھا مگر بوجوہ یہ پروجیکٹ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان حالات میں ابا جی اور عمو جان نے سوچا کہ انھیں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کی خاطر کسی جگہ ملازمت کر لینی چاہیے۔ عمو جان میٹرک کا امتحان پاس کر چکے تھے مگر ابا جی ابھی نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں عام طور سے نوجوانوں کو فوج میں ملازمت ملتی تھی۔ چنانچہ دونوں بھائی فوج میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ مگر یہ ملازمت زیادہ دنوں تک نہ چل سکی، کیونکہ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوگئی اور بیشتر ہندوستانیوں کو فارغ کر دیا گیا

عمو جان فوج سے ریلیز لینے کے بعد محکمہِ تعلیم میں چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں کیمبل پور (حالیہ اٹک) میں استادوں کی ٹریننگ کا سنٹر تھا، جہاں پر عمو جان نے ایک سال کا کورس کر کے ایس وی کی سند حاصل کی۔ آپ کی ساری عمر محکمہ تعلیم کی ملازمت میں گزری، جس کے دوران آپ کو ضلع راولپنڈی کے مختلف علاقوں بالخصوص کوہ مری اور گوجر خان میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ البتہ اکثر وقت آپ نے قاضیاں اور چنگا بنگیال کے اسکولوں میں بطور ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر کے بسر کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب عمو جان راولپنڈی میں ہمارے گھر پر ٹھیرے ہوئے تھے، مجھے ان کے ساتھ بازار جانے کا موقعہ ملا۔ نارتھ سرکلر روڈ پر ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر انھی دنوں میں چند نوجوانوں نے ایک ادبی رسالے کا دفتر کھولا تھا، جس کا نام مجھے اب یاد نہیں۔ عمو جان کو ادب سے لگاؤ تھا اور ان کے گھر پر ادبی رسالے بڑی تعداد میں آتے تھے۔ جب ہم اس دفتر کے پاس سے گزر رہے تھے تو عمو جان نے کہا: آؤ دیکھیں یہ کون لوگ ہیں اور کیا رسالہ چھاپتے ہیں۔ دفتر میں اس وقت ایک نوجوان شاعر تھا، جس نے عمو جان کو بہت ادب کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس نے اپنا نام باقی صدیقی بتایا اور کہا: جناب میں فلاں اسکول میں آپ کا شاگرد رہ چکا ہوں اور آج میرا شاعری میں جو تھوڑا بہت نام ہے اس میں آپ کی تربیت کا حصہ ہے۔

فوج سے ریلیز حاصل کرنے کے بعد ابا جی کا انتخاب محکمہِ پولیس میں بطور سب انسپکٹر کے ہوا

اور انھیں ٹریننگ کی خاطر بنگلور جانے کا حکم ملا۔ روانگی والے دن ریلوے اسٹیشن پر آپ کی ملاقات دادا جان کے جاننے والے ایک صاحب سے ہوئی، جو محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ جب انھیں پتا چلا کہ ابا جی پولیس کی ٹریننگ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں، تو انھوں نے کہا: ''تم ایک عالم دین کی اولاد ہو اس لیے یہ محکمہ تمھارے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس محکمے میں رشوت چلتی ہے۔ میں خود اِس محکمے میں ہوں اور چونکہ رشوت نہیں لیتا اور نہ ہی دوسری دھاندلیوں میں شریک ہوتا ہوں اس لیے اپنے ساتھیوں اور افسروں کے ہاتھوں سخت نالاں رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس طرف نہیں جاؤ گے اور ساری عمر عذاب میں مبتلا رہو گے۔ میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کر لو۔'' ابا جی وہیں سے واپس گھر لوٹ گئے اور عمر بھر اس بزرگ کے ممنونِ احسان رہے، جس کے بروقت مشورے نے آپ کو گناہ کی زندگی سے بچا لیا تھا۔

چنداں بعد ابا جی کو سول اینڈ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت مل گئی، جس کو اس زمانے میں کلکتہ دفتر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ محکمہ پہلے پہل وہیں پر قایم ہوا تھا اور اس کے ملازمین کی اکثریت بنگال سے تعلق رکھتی تھی۔ ابا جی سنایا کرتے تھے کہ جب آپ کو اس دفتر میں ملازمت ملی اور آپ کی تعیناتی راولپنڈی میں ہوئی تو دادا جان نے بتایا کہ جب یہ دفتر تعمیر ہو رہا تھا تو آپ ان دنوں بیروزگار تھے اور آپ نے وہاں پر مزدوری کی تھی۔ چنانچہ پہلے ہی روز گارا ڈھوتے ہوئے انھیں ایک پنسل زمین پر پڑی ہوئی ملی، جسے آپ نے اٹھا کر صاف کیا اور اپنے کان کے پیچھے لگا لیا۔ ٹھیکیدار نے آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا اور اپنے پاس بلا کر کہا: تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔ دادا جان نے اثبات میں جواب دیا جس پر اس نے آپ کو مزدوری کے کام سے ہٹا کر حساب کتاب پر لگا دیا۔

ابا جی بطور جونیر کلرک بھرتی ہوئے تھے اور سینیر سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس محکمے کی ملازمت اس زمانے میں بہت اہم تصور کی جاتی تھی اور وہاں پر ملنے والی تنخواہیں بھی دوسرے محکموں کی نسبت زیادہ ہوتی تھیں۔ ابا جی کی تعیناتی کوئٹہ، پشاور، رزمک اور راولپنڈی میں ہوئی۔ آپ کی باقاعدگی اور ذمے داری کا احساس ضرب المثل تھا۔ ابا جی نہایت درجہ راست گو اور انصاف پسند انسان تھے۔ سچی بات کو پوری آزادی کے ساتھ پیش کرتے تھے خواہ اس کے نتیجے میں نقصان بھی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اپنی اس عادت کے سبب آپ کو کئی بار تلخ تجربات ہوئے مگر وہ بضد تھے کہ انسان کو حق بات کہنے اور اس کی خاطر کھڑا ہونے سے کبھی گریز نہ کرنا چاہیے۔ وہ نہ صرف اپنے استحقاق کے لیے بلکہ دوسروں کی خاطر بھی بڑی سے بڑی دیوار سے ٹکر لینے کے لیے ہر لحظہ تیار رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی طبیعت میں انکساری تھی، یہاں تک کہ میرے نام لکھے جانے والے خطوط کو بھی ''خاکسار احقر العباد'' کے

الفاظ پر ختم کرتے تھے اور مجھے اپنے خطوط میں آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

ابا جی کی جن صفات کا میں دل سے مداح ہوں ان میں سے ایک یہ تھی کہ کبھی بیکار نہ بیٹھتے تھے اور ہمہ وقت کسی نہ کسی تعمیری کام میں مصروف رہتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ جانتے تھے۔ آپکو مہمانوں کے آنے پر بے حد خوشی ہوتی تھی۔ دن رات انکی سہولت اور آرام کے لیے بھاگتے پھرتے تھے۔ انھیں عمدہ سے عمدہ بستر مہیا کرتے تھے اور بہترین سے بہترین کھانا پکوا کر کھلاتے تھے۔ ابا جی کا سارا وقت ان کی خاطر داری میں لگتا تھا۔ فی الحقیقت مہمان کی آمد ابا جی کے لیے عید کے مترادف تھی۔

ابا جی لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور ہمیشہ صاف ستھرے مگر سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ کپڑوں کے رنگوں کا انتخاب کرتے ہوئے اصرار کرتے تھے کہ شوخ رنگ استعمال نہ کیے جائیں۔ چنانچہ کپڑا خریدتے ہوئے دکان دار کو صوفیانہ رنگ کا کپڑا دکھانے کو کہتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے آپ کے دفتر کے ساتھی ابا جی کو صوفی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ غالباً اس میں اس چیز کا بھی ہاتھ تھا کہ ابا جی نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ سنایا کرتے تھے کہ ابتداء میں آپ کلین شیوڈ تھے۔ ایک بار دادا جان ملنے کے لیے آئے تو انھوں نے کہا: "عبدالرؤف، تم داڑھی منڈاتے ہو۔" اس دن سے ابا جی نے داڑھی رکھ لی جو آپ کے چہرے پر اچھی لگتی تھی۔

ابا جی کو تحریر کا خاص ملکہ حاصل تھا مگر آپ نے سوائے چند معاشرتی تجاویز اور صدر محمد ایوب خان کے نام لکھے جانے والے خطوط کے کوئی باضابطہ تحریر نہیں چھوڑی۔ بائیبل اور قرآن کے تقابلی مطالعے سے آپ کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ آپ ہر تعطیل کے روز گھنٹوں ان کے مطالعے میں محو رہتے تھے اور ہمیں اہم مقامات پڑھ کر سناتے اور تشریح سے آگاہ کرتے تھے۔ آپ کو بعض اوقات تقریر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ آپ اپنے مافی الضمیر کو بخوبی ادا کرتے تھے۔ دادا جان نے اپنے ماموں اور استاد مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجدّدی (متوفی ۱۸۸۸ء) کی وفات کے بعد برادری کی اصلاح کا کام اپنے ذمے لیا تھا اور ان کی پیروی میں وفیات کے مواقع پر، جب برادری کے بیشتر افراد یکجا ہوتے تھے، وعظ کرنے کے کام کو آگے چلایا تھا۔ ابا جی نے اس رسم کو پھر سے جاری کیا اور برادری کے لوگوں کو منظّم کرنے کی بنیاد ڈالی۔ بالخصوص اپنی زندگی کے آخری تین چار برسوں کے دوران جب ابا جی چنگا بنگیال میں مقیم تھے آپ نے بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کے انتخابات کے لیے سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ آپ نے برادری پر واضح کیا کہ اس کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اپنے ووٹوں کا درست استعمال کرنا چاہیے۔ ہماری برادری کے ساڑھے چار ہزار ووٹ ہونے کے باوجود بنیادی جمہوریت میں چنگا کی نمائندگی سجاول خان کرتا تھا، جو نامی ڈاکو اور قاتل تھا، کنیال قوم سے تعلق رکھتا تھا اور ایک دوسرے

گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اباجی نے برادری کے سب ووٹوں کے اندراج کا کام اپنے ذمے لیا اور چنگا کی آبادی میں سے کسی کو انتخابات میں کھڑا کرنے کی تحریک کی۔

چنانچہ اباجی نے کئی مہینوں کی محنت سے ایک ایک گھر میں جا کر تمام افرادِ کنبہ کی فہرستیں تیار کیں اور ان کو ڈپٹی کمشنر اور کمشنر انتخابات کے سامنے پیش کیا۔ ان مساعی کے نتیجے میں تمام ووٹوں کا اندراج ہوا اور برادری کے سب لوگوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ انتخابات میں اپنا امیدوار کھڑا کیا جائے۔ عام طور سے یہ رائے تھی کہ اباجی ان کی نمایندگی کریں مگر آپ نے ایک نوجوان آدمی کو آگے کیا اور آپ کی تجویز پر راجہ ممتاز حسن نے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔

اسی پر بس نہ تھی، اباجی کی مساعی سے گوجر خان سے چنگا تک پختہ سڑک بنی اور گاؤں میں ٹیوب ویل لگایا گیا۔ پھر گاؤں کا مدرسہ، جو پچاس سالوں سے پرائمری چلا آ رہا تھا، مڈل اسکول میں تبدیل ہوا۔ غریب کسانوں کو حکومت سے قرضے دلوانے اور ٹریکٹر خریدنے کا انتظام بھی اباجی نے کرایا۔ اس کے علاوہ برادری کے مشترکہ جنگل کو حکومت کے محکمۂ جنگل کے سپرد کیا گیا تاکہ اسے دوبارہ اگایا جا سکے۔

ان سارے کاموں کے سبب اباجی کی حیثیت عمر کے آخری برسوں میں برادری کے سربراہ کی تھی اور آپ کی بے لوث خدمات نے سب کا دل موہ لیا تھا۔ ہماری حویلی برادری کے لوگوں کے لیے بیٹھک بن چکی تھی، جہاں پر ہر وقت محفل لگی رہتی تھی۔ اباجی سب کی خاطر داری کرتے تھے، ان کے مسایل کو حکام کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کے لیے عرضیاں اور یادداشتیں لکھتے اور پنشن کے معاملات میں ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اباجی نے ان دنوں مجھے ایک خط میں لکھا: ''میں اس قدر مصروف زندگی بسر کر رہا ہوں کہ مجھے پتا نہیں چلتا کہ سورج کب چڑھتا اور کب غروب ہوتا ہے۔'' اباجی کی وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ہوئی۔

میری والدہ امۃ العزیز بیگم اپنے بھائی بہنوں میں پانچویں نمبر پر تھیں۔ نانا جان فضل محمد خان ولد راجہ قایم دین میرے دادا جان محمد فضل خان کے خالہ زاد تھے۔ دونوں کے ماموں مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجدّدی (متوفی ۱۸۸۷ء) اپنے وقت کے اجل عالم تھے۔ ان کے بارے میں دادا جان نے لکھا ہے کہ آپ تصوف پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی حیثیت اپنی برادری میں ایک واعظ اور پیر کی تھی۔ ان کی قبر پر آج بھی نو بیاہتا جوڑے سلام کرنے اور برکت حاصل کرنے کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ نانا جان اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور دادا جان سے کم و بیش چودہ سال بڑے تھے۔ دادا جان کی سب سے بڑی بہن نتھو بی بھی چودہ سال بڑی تھی۔ نانا جان فضل محمد خان نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے آپ کے تین بچے تھے۔ ماموں لعل خان عمو جان کے ہم عمر تھے، جب کہ خالہ بیگم جی عمر میں

اباجی سے دو تین برس بڑی تھیں۔ اماں نانا جان کی دوسری بیوی سے تھیں۔ آپ سے بڑی بہن گلاب بی تھیں، جن کی پیدایش ۱۹۰۳ء کے لگ بھگ ہوئی۔ اماں ان سے عمر میں دو برس چھوٹی تھیں گویا آپ کی پیدایش ۱۹۰۵ء کی تھی۔ آپ بتایا کرتی تھیں کہ اباجی آپ سے پانچ برس بڑے ہیں۔ ماموں احمد خان نسیم اماں سے اڑھائی برس چھوٹے تھے۔ آپ مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات (۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) سے ایک ہفتہ قبل پیدا ہوئے تھے۔ ماموں کا نام مرزا صاحب کا دیا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اماں کا نام بھی ان کا ہی تجویز کردہ ہو کیونکہ نانا جان ۱۹۰۱ء سے جماعتِ احمدیہ میں شامل ہو چکے تھے، جسکی ترغیب آپکو دادا جان مولوی محمد فضل خان سے ملی تھی، جو جنوری ۱۸۹۷ء میں مرزا صاحب سے بیعت ہو چکے تھے۔

دادا جان اپنے خاندان میں سے پہلے شخص تھے، جنھوں نے احمدیت کو قبول کیا تھا۔ آپ کے علم و فضل کا اس زمانے میں شہرہ ہو چکا تھا اور پٹھوہار کے علاقے میں آپ کو سب لوگ مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجدّدی کا جانشین مانتے تھے، جس کے سبب بہت سے لوگوں نے آپ کی پیروی میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کر لی۔ بالخصوص آپ کے خاندان کے بیشتر افراد دادا جان کی ترغیب پر احمدی ہو گئے، البتہ نانا جان تین چار برسوں تک سخت مخالفت کرتے رہے۔ دادا جان ان کو تبلیغ کرنے کے لیے ان کی حویلی میں آتے تھے تو نانا جان لٹھ اٹھا کر ان کو گھر سے باہر نکال دیتے تھے۔ دادا جان تھوڑی دیر میں دوسرے دروازے سے آ جاتے تھے اور کہتے تھے: ''لالہ میں آپ کو منوا کے رہوں گا۔'' آخر ان کی ہٹ دھرمی رنگ لائی اور نانا جان نے نہ صرف بیعت کر لی بلکہ تھوڑے عرصے کے بعد چنگا سے ہجرت کر کے قادیان میں جا کر آباد ہو گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے پیروکاروں کو قادیان میں آ کر رہنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ ان کے گمنام قصبے کی آبادی بڑھے اور ان کی موروثی زمینیں زیادہ قیمت پر بک سکیں۔

اس طرح اماں کا بچپن قادیان میں گزرا تھا اور وہاں پر ہی آپ نے مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی نے بالخصوص عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی تھی، جس کے سبب اماں نہ صرف بے حد راسخ العقیدہ تھیں۔ آپ کے اندر قیادت کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ چنانچہ شادی کے بعد آپ نے کوئٹہ، راولپنڈی اور پشاور میں قیام کے دوران وہاں پر احمدی عورتوں کی تنظیم لجنہ اماء اللہ کی شاخیں قایم کیں اور سالہا سال تک ان مقامات پر اس کی صدر رہیں۔ بالخصوص راولپنڈی میں قیام کے دوسرے دور کا میں عینی گواہ ہوں، جب اماں نے اکتوبر ۱۹۴۵ء کو وہاں پر منتقل ہونے کے چند ہفتوں کے اندر اندر احمدی عورتوں کو پھر سے منظّم کیا اور نئے سرے سے لجنہ اماء اللہ کی مقامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اگست ۱۹۵۳ء میں اپنی وفات تک اس کی صدر رہیں۔

دادا جان نے جہاں پر بعض دوسری اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے چند ایک کا پہلے ذکر

ہو چکا ہے، وہاں پر آپ نے جماعتِ احمدیہ کی فقہ کی بنیاد بھی ڈالی۔ چنانچہ آپ نے ''فتاویٰ احمدیہ'' کے نام سے دو جلدوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے خلفاء کے فتاویٰ کو جمع کر کے چھاپا۔ بعدازاں آپ نے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں نماز، روزے، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کو یکجا پیش کیا ہے۔ مگر دادا جان نے اپنی زندگی کے اختتامی برسوں میں جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ (اس بارے میں تفصیل کے لیے میری کتاب ''مولوی محمد فضل خان: ایک عالمِ ربانی کی سوانح حیات'' دیکھیں)۔ آپ نے یہ قدم نہ تو بلاوجہ اٹھایا تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے ذاتی انا کا کوئی ہاتھ تھا۔ آپ خوب جانتے تھے کہ یہ چیز آپ کی زندگی کی کہانی کو ایک المیہ ڈرامے میں بدل کر رکھ دے گی، کیونکہ اس موقع پر کوئی آپ کا ساتھ نہ دے گا۔ آپ خود اپنے عزیزوں سے بھی یہ توقع نہ رکھ سکتے تھے کہ وہ آپ کی خاطر جماعتِ احمدیہ سے قطع تعلق کرنے کو تیار ہوں گے۔ وہ لوگ اس جماعت کے نظام کا حصہ بن چکے تھے۔ انکے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ ان وجوہات پر غور و فکر کرتے جنکی بنا پر دادا جان خود اپنے سایے پر سے پھلانگنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

بچپن کی یادیں

میرا بچپن راولپنڈی، پشاور اور قادیان میں گزرا۔ ابتدائی یادوں میں سے ایک سین آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ اماں دوپہر کا کھانا لگانے کے بعد مجھے دادا جان کو اطلاع کرنے کے لیے کہتی ہیں، جو مہمان خانے میں صبح سے بیٹھے لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ میں دروازے پر دستک دیتا ہوں، پھر دروازہ کھول کر اماں کے کہے ہوے الفاظ کو اپنی توتلی زبان میں دہراتا ہوں۔ دادا جان کاغذ قلم کو ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں پانی کے لوٹے کی طرف لپکتا ہوں، جسے میں نے پہلے سے بھر رکھا ہے۔ دادا جان مسکراتے ہوے میری طرف آتے ہیں اور پیار سے میرے گال کو سہلا کر کہتے ہیں: ''بیٹا میرے ہاتھ صاف ستھرے ہیں مگر تم اصرار کرتے ہو تو دھو لیتا ہوں۔'' اتنے میں ان کی نظر اماں پر پڑتی ہے، جو چپکے سے دادا اور پوتے کو دیکھ رہی ہیں۔ دادا جان اماں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں (میں یہ بات اپنے حافظے کی بناء پر نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اماں کی روایت پر، جنھوں نے برسوں بعد مجھے یہ واقعہ یاد دلایا تھا اور وہ ساری باتیں سنائی تھیں، جو ہم تینوں کے درمیان ہوئی تھیں): ''چنوں، تمھارا یہ بیٹا بہت صفائی پسند ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑا ہو کر عالم و فاضل بنے گا اور میرے کام کو آگے بڑھائے گا۔'' مجھے یہ ساری باتیں تو یاد نہیں ہیں مگر گھر کی وہ ڈیوڑھی آج بھی میری باطنی آنکھوں

کے سامنے ہے، جہاں پر کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد میں دادا جان کے ہاتھ اصرار کر کے دھلاتا تھا اور وضو کرنے کے لیے لوٹے میں پانی بھر کر دیتا تھا۔

دادا جان کی مستقل رہائش اپنے آبائی گاؤں چنگا بنگیال میں تھی، وہیں پر آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے بچوں نے اپنے مکانات بنوائے۔ آپ سال میں ایک دو مہینوں کے لیے ہمارے پاس آ کر شہر میں ٹھیرتے تھے۔ جب تک ابا جی راولپنڈی میں تعینات تھے دادا جان سال میں دو تین یا زیادہ بار آ جاتے تھے۔ مگر ابا جی کی تبدیلی پشاور ہو جانے کے بعد ان کا آنا جانا کم ہو گیا، پھر تھوڑے عرصے کے بعد ان کی وفات ہو گئی اور یہ دوسرا سین ہے جو کسی فلم کی طرح میری یادداشت پر مرتسم ہے۔ مجھے گاؤں کی حویلی میں وہ جگہ یاد ہے، جہاں پر شہتوت کے درخت کے نیچے دادا جان کی میت رکھی ہوئی تھی اور بیشمار لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اماں نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر آگے کیا تھا اور کہا تھا: "اجی (میری مادری زبان پٹھوہاری میں بزرگوں کو اس نام سے پکارتے ہیں) کو آخری سلام کر لو۔"

دادا جان کے بارے میں اس سے زیادہ عینی یادداشت کا سرمایہ میرے پاس نہیں ہے کیونکہ جب ان کی وفات ہوئی تو میں ابھی ساڑھے تین برس کا تھا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ دونوں سین کیونکر میرے ذہن میں رہ گئے۔ اس میں یقیناً اماں کا ہاتھ تھا، جنھوں نے یہ دونوں واقعات مجھے بچپن میں متعدد بار سنائے تھے۔ ان دو واقعات کے علاوہ راولپنڈی کے زمانے کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے۔ عمو جان کی اہلیہ اقبال بیگم نے، جن کو ہم بے جی کہتے تھے، مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے مجھے اپنی گائے کی ایک بچھڑی تحفے میں دے رکھی تھی، جس کے ساتھ مجھے بے حد لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایک بار مجھے نئے جوتے ملے تو میں ان کو لے کر سیدھا اپنی بچھڑی کی طرف گیا اور اسے جوتے دکھا کر کہا: "گائے، دیکھو مجھے نئے جوتے ملے ہیں۔"

اماں اس سے پہلے کا ایک واقعہ سنایا کرتی تھیں کہ جب میں ڈیڑھ دو برس کا تھا تو ایک روز سب کی نظر بچا کر سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا مکان کے کوٹھے پر پہنچ گیا تھا، جو دس گز اونچا تھا۔ وہاں پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں کسی طرح منڈیر پر چڑھ گیا اور جب اماں کی نظر مجھ پر پڑی تو انھوں نے جانا کہ میں کسی بھی لمحے گر جاؤں گا۔ اماں صدمے کے مارے بے ہوش ہو گئیں مگر گھر کا کوئی دوسرا فرد مجھے سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے اس زمانے کی دوسری باتیں تو یاد نہیں ہیں مگر یہ یاد ہے کہ میری آیا اکبر جان تھی جس کے بارے میں اماں بتایا کرتی تھیں کہ وہ مجھے لوری دیتے ہوئے گایا کرتی تھی کہ میرا بیٹا جرنیل بنے گا، کرنیل بنے گا، کپتان بنے گا، لفٹین بنے گا، حوالدار بنے گا، سپاہی بنے گا۔ جب اماں کہتی تھیں کہ تم اسے اوپر سے

نیچے لا رہی ہو تو وہ ہنس کر کہتی تھی: بی بی جی، میں ان باتوں کو کیا جانوں۔ مجھے یہ پتا ہے کہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا۔ مگر وہ اتنے دنوں تک انتظار نہ کر سکتی تھی، اس کی شادی جلدی ہو گئی اور اس کے خاوند نے اس کو نوکری کرنے سے روک دیا۔ سالہا سال بعد ایک دفعہ راولپنڈی میں اکبر جان ہمیں راستے میں ملی اور اس نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا: ''ہائے، میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے۔''

ایک واقعے کا ذکر آپا نصیرہ نے میرا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اس کو وہاں سے نقل کیا جاتا ہے: ''ہمارے والد صاحب ایک مرتبہ سیب کے دو کریٹ لے کر آئے اور ہم لوگ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے ایک کریٹ کھول کر پلیٹ بھر بھر کر تمام قریبی عزیزوں کے گھر میں بھجوانے شروع کر دیے۔ تمام کریٹ خالی ہو گیا۔ ہم بچے بڑی دل جمعی اور حوصلے کے ساتھ یہ دیکھ رہے تھے لیکن منیر، جو تب بہت چھوٹا تھا، بھاگ کر ابو کے کندھوں پر سوار ہو گیا، روئے جا رہا ہے اور مکے مارے جا رہا ہے۔ تو نے سارے ہی بانٹ دیے، ہمارے لیے ایک بھی نہیں بچا۔ بمشکل چپ کرایا گیا اور دوسرا کریٹ پورا اس کے حوالے کیا گیا۔ یہ سب تمھارا ہے، خود کھاؤ اور ہم سب کو بھی دو۔'' (منیر الدین احمد کے افسانے: تنقیدی جائزہ از مقصود حسنی، پنجاب بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۸)

یہ واقعہ تو مجھے یاد نہیں البتہ پشاور کا زمانہ مجھے خوب یاد ہے۔ ہمارا پہلا مکان قلعہ جمرود کے قریب اوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے دکانیں تھیں اور ہم بالکنی سے گلی میں جھانک سکتے تھے۔ دوسری طرف کمروں کے سامنے کھلا صحن تھا، جس کے خاتمے پر جنگلہ لگا ہوا تھا۔ ہمارے مکان کے پچھواڑے سے گزرنے والی سڑک پر دور دور تک نظر جاتی تھی۔ اس مکان میں خالو مولوی غلام نبی مصری، جو ان دنوں بیمار تھے، ڈاکٹری مشورے پر تبدیلِ آب و ہوا کے لیے آئے تھے اور دو تین ماہ تک ہمارے ہاں ٹھیرے تھے۔ خالو جان عربی زبان کے فاضل اور بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے مصر میں تعلیم پائی تھی اور وہاں پر لمبے عرصہ تک قیام کے سبب مصری کہلاتے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ تم ابھی منیر نہیں ہو بلکہ منار ہو اور سگنل دینے کے کام آ سکتے ہو۔ منیر تم اس وقت بنو گے جب اندر سے روشن ہو جاؤ گے اور نور پھیلانے کے قابل ہو جاؤ گے اور یہ درجہ حاصل کرنے کے لیے تمھیں بہت محنت کرنی ہو گی۔

میں اس بات پر بہت حیران ہوتا تھا اور نہیں سمجھ پاتا تھا کہ منار کا سگنل دینے سے کیا تعلق ہے۔ میرے پوچھنے پر خالو جان نے مجھے اسلامی تاریخ کی مشہور ترین سڑک "درب زبیدہ" کے بارے میں بتایا تھا جو بغداد سے مدینہ جاتی تھی۔ اس سڑک پر عباسی خلفاء کے زمانے میں ہر چند کوس کے فاصلے پر چوکیاں بنی ہوئی تھیں، جن کو منار کہتے تھے اور جو صرف چند گز اونچی ہوتی تھیں۔ خطرے کی صورت میں ان پر آگ جلا کر سگنل دیا جاتا تھا۔ اس طرح سرعت کے ساتھ حفاظتی فوج کی چوکی تک خبر پہنچ جاتی تھی اور

وہاں سے جائے وقوعہ پر کمک بھیج دی جاتی تھی۔ خالو جان نے جوانی کے زمانے میں مصر جاتے ہوے اس سڑک پر بغداد سے مدینے تک کا پیدل سفر کیا تھا۔ درب زبیدہ کا نام میرے ذہن پر ایسا مرتسم ہوا کہ میں نے سالہا سال بعد اس سڑک پر تحقیق کر کے اس کے بارے میں ایک مضمون بعنوان ''درب زبیدہ: اسلامی تاریخ کی مشہور ترین شاہراہ'' لکھا، جو ''اردو ڈائجسٹ'' لاہور، جلد ۲۸ (ستمبر ۱۹۸۸ء) شمارہ ۹، صفحہ ۹۷-۱۰۶ پر شایع ہوا تھا۔

خالو جان یوں تو ایک عربی مدرسے میں پڑھاتے تھے مگر وہ حاذق طبیب بھی تھے اور جڑی بوٹیوں کا خاص علم رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز جب وہ برآمدے میں بیٹھے ہوے تھے چھت پر سے ایک سانپ ان کی جھولی میں گرا تھا۔ خالو جان نے بڑے اطمینان کے ساتھ اس کو جھولی میں سے اٹھا کر زمین پر ڈال دیا اور ایک ڈنڈے سے مار ڈالا تھا۔ پھر اس کو ایک گملے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی۔ اس گملے میں انھوں نے ایک پودا لگایا، جو تھوڑے عرصے میں اُگ آیا۔ خالو جان اسکے پتے توڑ کر کھاتے تھے اور انکے مقوی القلب ہونے کے بارے میں بتاتے تھے۔

اسی مکان میں رہایش کے زمانے میں میرے بڑے بھائی نصیر الدین احمد کو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس پر میں نے اسکول بھیجے جانے کی ضد کی۔ ابا جی نے بہتیرا کہا کہ تم ابھی بہت چھوٹے ہو اور اسکول میں پورا وقت نہیں بیٹھ سکو گے مگر میرے دماغ میں یہ بات نہیں جاتی تھی۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ ہماری نوکرانی مجھے آٹھ نو بجے اسکول چھوڑ آیا کرے اور ایک آدھ گھنٹے بعد واپس لانے کے لیے پہنچ جایا کرے۔ ابا جی پہلے روز مجھے خود اسکول لے کر گئے اور ماسٹر صاحب کو دو چار روپے دے آئے تا کہ وہ مجھے ہر روز ایک پیسہ دے کر گھر واپس جانے پر رضامند کر لیا کرے۔ یہ اسکیم کامیاب رہی اور مجھے آج تک وہ چاٹ یاد ہے جو میں گھر جانے سے پہلے اسکول کے گیٹ پر خرید کر کھایا کرتا تھا۔ میں نے اس اسکول میں کچھ سیکھا بھی تھا یا نہیں، یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی ہے۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہماری نوکرانی مجھ سے پشتو میں بات کرتی تھی، جب کہ ہمارے ارد گرد اکثر لوگ پشاوری پنجابی یا ہندکو بولتے تھے۔ ہمیں یہ زبان سیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ راولپنڈی میں ہم اس سے قبل پنڈی وال پنجابی سیکھ چکے تھے، جب کہ ہمارے گھرانے میں پٹھوہاری بولی جاتی تھی۔ میں اتنا لمبا عرصہ جرمنی میں رہنے کے باوجود، جہاں پر مجھے کم ہی کبھی پٹھوہاری بولنے کا موقعہ ملتا ہے، اس زبان کو نہیں بھولا ہوں۔ اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ میں اسی زبان میں بات کرتا ہوں۔

پشاور میں ہمارا دوسرا مکان کالی باڑی میں تھا۔ وہاں پر سڑک کے کنارے بنی ہوئی دکانوں کی

پشت پر قطار وار مکانات بنے ہوے تھے۔ ہمارا مکان پہلی گلی میں آخری تھا۔ ڈیوڑھی کے ساتھ، جس میں سے سیڑھیاں چھت پر جاتی تھیں، بیٹھک تھی جو مہمانوں کے لیے مختص تھی۔ پھر صحن آتا تھا، جس کے دائیں طرف باورچی خانہ اور اسٹور اور بائیں طرف صحن تھا۔ اس سے آگے بڑا کمرہ تھا، جو بیک وقت دیوان خانہ اور سونے کا کمرہ تھا۔ اس مکان کے ساتھ میری یادوں میں سے ایک ایسا واقعہ ہے، جس کا تعلق دوسری عالمگیر جنگ سے ہے، جو انھی دنوں میں شروع ہوئی تھی۔ حکومت نے اپنی فوجی تیاریوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک گشتی نمایش لگائی تھی، جو ریل گاڑی میں سارے ملک میں گھوم رہی تھی۔ ہم بھی اسے دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ توپوں اور ٹینکوں کے علاوہ ڈبل ڈیکر ہوائی جہاز بھی دکھائے گئے تھے، جن میں سے فوجی جوان پیراشوٹ کے ذریعے نمایش کے میدان میں اترے تھے۔ ان دنوں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ ہٹلر کی فوج افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ آئے دن پشاور کے اوپر ہوائی جہاز فضا میں اڑتے ہوے دیکھے جاتے تھے، مگر عوام کو پتا نہیں چلتا تھا وہ جہاز اتحادیوں کے ہیں یا جرمنوں کے۔ ایک روز ہم ہوائی جہاز کی آواز سن کر چھت پر یہ دیکھنے کے لیے چڑھے کہ کہیں دشمن کا جہاز نہ ہو۔ عین اس وقت، جب کہ ابا جی جہاز کو اڑتے ہوے دیکھ رہے تھے، انھیں اپنی پنڈلی کو کھجلانا پڑا۔ تھوڑی دیر میں جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنی بچگانہ نادانی میں جانا کہ وہ دشمن کا جہاز تھا، جس نے محض اس وجہ سے ہم پر بم نہیں گرایا کہ ابا جی اس پر پتھر پھینکنے کے لیے جھکے تھے۔ میں نے اس بات کا ذکر آگے چل کر اسکول میں اپنے ہم جماعتوں کے سامنے بڑے فخر سے کیا، جیسے اکیلے ابا جی نے پشاور کو دشمن کے حملے سے بچا لیا تھا۔

اس مکان سے وابستہ میری یادداشتوں میں سے ایک کا تعلق بھائی نصیر اور آپا نصیرہ کے تین ماہ تک قادیان میں قیام کے بعد واپسی سے ہے۔ ان کو کلر سیداں کے باسی سید بشیر احمد شاہ پہنچانے کے لیے آئے تھے، جن کی خالہ ام طاہر جماعتِ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں اور جن کا بیٹا مرزا طاہر احمد جماعتِ احمدیہ کا چوتھا خلیفہ تھا۔ کلر سیداں، جو چنگا بنگیال سے سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، وہاں کے اس سید خاندان کے ساتھ دادا جان کے قدیمی رواسم تھے۔ بھائی نصیر اور آپا نصیرہ کو اماں نے تین ماہ کے لیے اپنی بڑی بہن بیگم جی کے پاس بھیجا تھا تا کہ وہ ان کو قرآنِ کریم پڑھا دیں۔ خالہ بیگم جی نے خاندان کے سب بچوں کو قاعدہ یسرنا القرآن کی مدد سے پڑھنا سکھایا تھا۔ وہ جگت استاد تھیں اور بچوں کی نفسیات کو خوب سمجھتی تھیں۔ کند ذہن بچے بھی تین چار ماہ کے اندر ناظرہ قرآن پڑھنا سیکھ جاتے تھے۔ خالہ بیگم جی کی اولاد نہیں تھی اس لیے ہمارے ہاں یہ رسم تھی کہ خاندان کے بچے اسکول میں داخل ہونے سے پہلے تین چار ماہ کے لیے ان کے پاس بھیج دیے جاتے

تھے، جن کو وہ ماؤں جیسا پیار دیتی تھیں اور قرآن پڑھنا سکھا دیتی تھیں۔ اس وجہ سے جب ہمارے خاندان کے بچے اسکول میں داخل ہوتے تھے تو اپنے ہم سبقوں سے آگے ہوتے تھے۔ بھائی نصیر کو اس لیے اسکول میں داخل کرانے سے پہلے خالہ بیگم جی کے پاس نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بہت لاغر تھا۔ اس کو ایک سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا، جس کے سبب اس کی ہڈیوں میں کمزوری رہ گئی تھی، جو ساری عمر دور نہ ہوسکی۔ جب نصیرہ کو قادیان بھیجنے کی باری آئی تو اسکے ساتھ نصیر کو بھی نتھی کر دیا گیا

ایک اور بات اس مکان کے تعلق سے میری یادداشت سے چپکی رہ گئی ہے، جو میرے لیے لائحہِ عمل بن کر ساری عمر میرے مدِ نظر رہی ہے اور جس پر میں نے حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک روز مجھے اماں کی کپڑے سینے کی مشین کی دراز میں سے چونی کا سکہ ملا، جسے نکال کر میں نے دکان سے کوئی چیز خرید لی۔ اماں کو جب وہ سکہ ڈھونڈنے پر نہ ملا تو بچوں سے پوچھ گچھ ہوئی۔ میں ڈر کے مارے خاموش رہا۔ اماں نے کہا کہ جس کسی نے وہ سکہ اٹھایا تھا اس میں یہ جرات ہونی چاہیے کہ صاف صاف بتا دے۔ سچ بولنے پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ مجھے بے حد شرم آئی اور میں نے اقرار کر لیا کہ چونی کا سکہ میں نے نکال کر خرچ کر دیا تھا۔ اماں کی یہ بات ہمیشہ میرے سامنے رہی ہے کہ انسان میں اپنے جرم کے اقرار کی جرأت ہونی چاہیے اور جھوٹ کے قریب نہ پھٹکنا چاہیے۔ میں نے اپنی زندگی میں مشکل ترین مرحلوں پر بھی سچ بولنے کو ترجیح دی ہے، جس کے سبب مجھے بعض اوقات دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس مکان سے نقلِ مکانی کا سبب یہ بنا کہ ایک شام کو سارا کنبہ سیر کرنے کے بعد گھر واپس لوٹا تو ہماری گلی میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابا جی کی بیٹری راستے میں جواب دے گئی تھی اس لیے جب وہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر دروازہ کھول رہے تھے تو میرے چھوٹے بھائی عبدالقیوم نے، جو تھک گیا تھا، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ ساتھ ہی اسکے منہ سے چیخ نکل گئی، کیونکہ اسکو ایک بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ جب دروازہ کھولنے پر بجلی جلائی گئی تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے مکان کے دروازے اور ساتھ کی دیوار پر درجنوں بچھو رینگ رہے تھے۔ ابا جی قیوم کو لے کر فوراً ہسپتال کی طرف دوڑے اور کہیں آدھی رات کو واپس لوٹے۔ انھوں نے راستے میں ہی نقلِ مکانی کا ارادہ باندھ لیا تھا۔

تھوڑے دنوں کے اندر ہمیں سرور گنج میں مکان مل گیا، جہاں پر میرے والدین اپنے سابقہ قیامِ پشاور کے دوران رہ چکے تھے۔ ہمسائے میں ابا جی کے دوست امین الحق اور ان کے بڑے بھائی فیض الحق اپنے لمبے چوڑے خاندان سمیت رہتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ابا جی کے تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔ ہمیں ان کے پہلو میں مکان ملا تھا۔ دوسری طرف ایک خان صاحب اپنی انگریز بیوی روزی کے ساتھ

رہتے تھے، جوان کے انگلستان میں قیام کی یادگار تھی۔ ان میاں بیوی کا ملنا جلنا محلے میں کسی کے ساتھ نہیں تھا، اس لیے ہم میں سے کسی کو ان کے ہاں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ امین الحق کے بھائی کے بیٹے ہم سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ بڑا لڑکا نور امرتسر میں میڈیکل پڑھ رہا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی محمود ہائی اسکول میں تھا۔ البتہ ان کی بہن محمودہ میری بڑی بہن نصیرہ کی ہم عمر اور ہم جولی تھی۔

چالیس برسوں کے بعد میری ملاقات جرمنی میں پاکستانی سفارت خانے کے ملٹری اتاشی کرنل رشید کے ساتھ ہوئی، جن کا بچپن میری طرح سرور گنج میں گزرا تھا، جہاں پر ان کی دوستی محمود کے ساتھ تھی۔ میں تو خیر اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر وہ ابا جی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا اکثر وقت محمود کے گھر پر صرف ہوتا تھا، کیونکہ وہ بہت بچپن میں اپنے والد کے مر جانے کے سبب یتیم ہو گئے تھے اور ان کی والدہ کو روزی کمانے کے لیے مزدوری کرنی پڑتی تھی، اس لیے انھیں ہدایت تھی کہ اسکول سے واپسی پر محمود کے ساتھ اس کے گھر چلے جایا کریں۔ اس وجہ سے وہ ہمارے پورے کنبے کو جانتے تھے۔

سرور گنج میں رہایش کے دوران میرے دو چھوٹے بھائی محمد رفیق احمد (۱۹۳۹ء) اور محمد اسد (۱۹۴۱ء) پیدا ہوے۔ ان کی پیدایش ملٹری ہسپتال میں ہوئی جہاں پر ابا جی کے دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن متعین تھے۔ انکے بچوں کے ساتھ ہماری دوستی تھی اور ہم اکثر انکے گھر پر جایا کرتے تھے، جو چھاؤنی میں تھا۔ اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دیتا تو ہم پشاور کے وسیع و عریض پبلک باغ چمن میں سے گزر کر پیدل انکے گھر پہنچتے تھے۔ یوں بھی ہم عام طور سے شام کے وقت چمن (کمپنی باغ) میں کھیلنے کے لیے جاتے تھے۔ گھر کا ایک نوکر ہمارے ساتھ کر دیا جاتا تھا، جو ہم سے عمر میں تھوڑا بڑا تھا اور بے حد چنچل تھا۔ اس نے ایک دفعہ ہمیں مرعوب کرنے کی خاطر کانٹوں والی تار کے اوپر سے چھلانگ لگائی، جو چمن کو سڑک سے جدا کرتی تھی۔ وہ تار پر سے تو پھلانگ گیا مگر بدقسمتی سے اسکے بازو میں ایک کانٹا اس طرح چبھ گیا کہ گوشت کی پوری بوٹی باہر نکل آئی۔ اس روز ہمارے سب سے بڑے تایا زاد بھائی عبدالمنان ہمارے ساتھ تھے۔ وہ اس کو ہسپتال لے گئے اور وہاں سے مرہم پٹی کرا لائے۔ بھائی جان بتایا کرتے تھے کہ میں نٹ بوجنیاں مارنے کا ماہر تھا اور گیند کی طرح باغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑھکتا ہوا چلا جاتا تھا۔

انھی دنوں میں جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر سڑکوں پر سول ڈیفنس کے لیے ٹرنچیں کھودی گئیں، جس کے سبب بچوں کو کھیلنے کے لیے ایک نیا میدان مل گیا۔ یہ ٹرنچیں دو تین گز گہری تھیں اور ان میں جانے کے لیے چار پانچ سیڑھیاں اترنا پڑتا تھا۔ آٹھ دس گز کے بعد ٹرنچ کا رخ بدل جاتا تھا۔ وہ

سڑکوں کے ساتھ ساتھ زگ زیگ کرتی ہوئی چلتی تھیں۔ محلے بھر کے بچے ان میں لکن میٹی کھیلا کرتے تھے۔ٹریفک یوں بھی ان دنوں اتنی نہیں ہوتی تھی،تاہم سڑکوں پر تانگوں اور ریہڑوں سے بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔مگر ٹرینچوں میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور ہمیں بھاگنے دوڑنے کی کھلی آزادی تھی۔آگے چل کر جب مجھے اسکول میں داخل کرایا گیا تو میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ٹرینچوں میں اترتے اور چڑھتے ہوئے اسکول جایا کرتا تھا۔

مجھے جس اسکول میں داخل کرایا گیا وہ ہمارے گھر سے شاید ایک دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اسی سڑک پر تھا،جس پر سرور گنج آباد تھا۔ ہمارے محلے کے پچھواڑے سے ریل گاڑی گزرتی تھی، جولنڈی کوتل تک جاتی تھی۔ہم اپنی کلاس میں بیٹھے ہوئے ریل کی وسل کو سنتے تھے مگر گاڑی کو نہیں دیکھ سکتے تھے، کیونکہ اسکول کی پچھلی دیوار راستے میں حایل تھی۔میری کلاس کا انچارج ایک ٹھگنا سا ہندو استاد تھا، جو بچوں کے ساتھ بہت خوش خلقی سے پیش آتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز انسپکٹر آف اسکولز معائنے کے لیے آیا تھا اور مجھے قاعدے میں سے پڑھ کر سنانے کو کہا گیا تھا،جس پر شاباش ملی تھی۔اس اسکول کے بارے میں بس یہ یاد ہے کہ کھیل کا میدان خاصا بڑا تھا،جس کی طرف جانے کے لیے شفاف پانی کی ایک نالی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔اسکول کے احاطے میں نالی کے ایک طرف کلاسوں کے کمرے تھے اور دوسری طرف کھیل کا میدان تھا،جس میں ہم آدھی چھٹی کے دوران خوب دوڑتے بھاگتے تھے۔

میرے اسکول میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد ابا جی کی تبدیلی پاراچنار ہوگئی اور اماں نے قادیان منتقل ہونے کا ارادہ باندھ لیا، جہاں پر اماں کا سارا کنبہ رہتا تھا۔ ماموں احمد خان نسیم برما سے واپس لوٹ آئے تھے، جہاں پر انکو جماعتِ احمدیہ کی طرف سے مبلغ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یوں بھی اماں کا خیال تھا کہ بچوں کو قادیان کے اسکولوں میں داخل کرانا چاہیے،جن کا معیارِ تعلیم ان کی نظر میں دوسرے اسکولوں سے بہتر تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ میں نے پہلی جماعت پشاور میں پاس کر لی تھی یا نہیں۔بہر صورت ابا جی پاراچنار جانے سے پہلے ہمیں قادیان چھوڑنے آئے تھے۔

یہ میرا ریل گاڑی کا پہلا سفر تو نہیں تھا تاہم یہ پہلا سفر تھا،جس کی تفصیلات میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔لاہور کے اسٹیشن پر بے شمار بندر تھے، جو گاڑی کے رکتے ہی اس کی چھت پر ٹوٹ پڑے تھے بلکہ کمپارٹمنٹوں کے اندر بھی گھس آئے تھے اور مسافروں کے ہاتھوں سے چیزیں چھیننے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ ہندو مسافر تو خیر ہنومان جی کی سیوا کرنے کے عادی تھے،مگر مسلمان مسافروں کو بندروں کی چھینا جھپٹی بالکل نہ بھاتی تھی۔اماں نے میرے چھوٹے بھائی اسد کو، جو ابھی بہت چھوٹا تھا، اپنے پہلو میں

سیٹ پر لٹا رکھا تھا۔ اچانک ایک بندر کھڑکی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اماں نے دیکھا کہ اس کی نظر بچے پر ہے۔ اس لیے اماں نے جلدی سے اسد کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ عین اس لمحے بندر نے، جس کی اسکیم ناکام بنا دی گئی تھی، اماں کے گال پر زناٹے سے ایک تھپڑ رسید کیا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ عین اس لمحے ابا جی ہمیں گاڑی سے اتارنے کے لیے زنانہ کمپارٹمنٹ میں پہنچے، جس میں اماں ہم بچوں سمیت بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ابا جی کو ماجرا سنایا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اسد کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی۔ ابا جی سوٹی لے کر بندر کے پیچھے بھاگے، جو جست لگا کر گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔

لاہور میں ہمیں گاڑی بدلنی تھی۔ امرتسر جانے والی گاڑی کہیں دو تین گھنٹوں بعد چلنی تھی۔ یہ وقت ہم نے ویٹنگ روم میں گزارا۔ نصیرہ اس دوران میں چپکے سے پلیٹ فارم پر نکل گئی۔ جب اس کی تلاش شروع ہوئی، تو وہ دور و نزدیک کہیں پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ ابا جی پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے تک بھاگتے پھرے۔ اچانک ان کی نظر نصیرہ پر پڑی، جو بڑے اطمینان کے ساتھ ایک اجنبی کی انگلی پکڑے ہوئے اس کے برابر چل رہی تھی۔ دونوں اسٹیشن کی حدود کو پار کر رہے تھے۔ ابا جی نے دوڑ کر اجنبی سے اپنی بیٹی چھین لی، جس کا کہنا تھا کہ وہ بچی کو اس کے والدین کے پاس لے جا رہا تھا۔ ابا جی نے پوچھا کہ اس نے بچی کے والدین کو ریلوے اسٹیشن پر کیوں نہ ڈھونڈا؟ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے وہاں سے کھسک جانے میں خیریت دیکھی۔ ابا جی کہا کرتے تھے کہ نصیرہ پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، جو ایک اجنبی کے ساتھ یوں چل دی تھی۔

میرے لیے اس سفر کے دوران سب سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ہماری گاڑی امرتسر اسٹیشن پر رکنے اور گھنٹہ بھر وہاں پر ٹھیرنے کے بعد جب چلی، تو بجائے آگے جانے کے پیچھے کی طرف چل دی، جس طرف نیا انجن لگا دیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر گاڑی اسی سمت میں چلتی رہی تو ہم پشاور واپس پہنچ جائیں گے۔ اماں نے بتایا کہ گاڑی گھوم کر سیدھے راستے پر جائے گی، مگر بٹالے تک میرا شک دور نہ ہوا۔ میں دل ہی دل میں ڈرتا رہا کہ کیا کرایا سفر رائیگاں چلا جائے گا۔ ہمیں پشاور سے لاہور پہنچنے میں پوری رات لگی تھی۔ اب مجھے یہ خطرہ تھا کہ ہم سارا دن سفر کر کے شام تک پھر پشاور میں ہوں گے۔

بٹالے پہنچ کر اطمینان ہوا کہ ہم ٹھیک لائن پر سفر کر رہے تھے۔ وہاں سے گاڑی چلی تو اس میں صرف احمدی مسافر باقی رہ گئے تھے، جو کھڑکیوں میں کھڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قادیان کے منارۃ المسیح کو تلاش کر رہے تھے، مگر وڈالے سے پہلے کسی کو منارہ نظر نہ آیا۔ قادیان میں جماعتِ احمدیہ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دمشق کے منارے پر اترنے کی پیشگوئی کو عملی رنگ میں پورا کرنے کے لیے ایک منارہ تعمیر کر دیا تھا، جو مسجدِ اقصیٰ کے اندر کھڑا ہے۔ جب منارہ نظر آیا تو پوری گاڑی نعرۂ تکبیر سے گونج

اٹھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہ آئی کہ اس نعرے بازی کی منطق کیا تھی؟

وڈالے سے قادیان صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے تلونڈی جھنگلاں کا گاؤں آتا ہے۔ نہر کو پار کرنے کے بعد تو سب لوگ گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر لٹکے ہوئے تھے۔ پھر قادیان کے قصبے کا ایک بیرونی محلّہ دکھائی دیا اور نواب محمد علی خان آف مالیر کوٹلہ کی کوٹھی، جسکے پیچھے تعلیم الاسلام ہائی اسکول کی عمارت درختوں میں چھپی چھپی نظر آ رہی تھی۔ قادیان کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

وہاں پر میرا خالہ زاد بھائی محمد احمد نعیم ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ اماں کی بڑی بہن گلاب بی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں تھوڑا عرصہ قبل فوت ہوئی تھی اور اپنے پیچھے دو بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑ گئی تھی۔ خالہ گلاب بی کا خاونداس سے پہلے مر گیا تھا۔ صرف ایک بیٹی صغریٰ بیاہی ہوئی تھی۔ بچوں کا چچا دونوں چھوٹے بیٹوں اشرف اور اسلم کو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ خالہ بیگم جی نے بھائی جان محمد احمد نعیم اور اس کی چھوٹی بہن صفیہ بیگم کو، جو نصیرہ کی ہم عمر تھی، اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بھائی جان محمد احمد ہمارے خاندان کے بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ وہ مدرسہ احمدیہ کا طالب علم تھا اور اس نے انھی دنوں میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا اور اس بات پر بہت حیران ہوا تھا کہ اس نے پٹھان فوجیوں کی طرح، جن کو ہم پشاور میں دیکھا کرتے تھے، پٹے رکھے ہوئے تھے، جو اس کے شانوں پر پڑتے تھے۔ اس نے پوری داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ابھی مرزائی کٹ داڑھی کا رواج نہیں ہوا تھا۔

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اس سفر میں اماں مرجو، جس کا اصلی نام مرزا بیگم تھا، ہمارے ساتھ تھی۔ وہ رشتے میں دور سے اماں کی بہن لگتی تھی۔ اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اپنے پیچھے اچھی خاصی جائیداد چھوڑ گیا تھا۔ اماں مرجو ابھی ادھیڑ عمر کی تھی اور اس کو نیا رشتہ مل سکتا تھا، مگر اس کے دیور اور دوسرے بھائی بند نہیں چاہتے تھے کہ وہ نئی شادی کرے۔ اماں مرجو کی اولاد نہیں تھی اس لیے سب کی نظریں اس کی جائیداد پر تھیں۔ ہم جب کبھی چنگا جاتے تھے تو وہ ہمارے گھر پر آجاتی تھی اور ہم بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ جب میرا چھوٹا بھائی عبدالقیوم پیدا ہوا، تو اس نے اس کو اپنی گود میں لے کر اپنا بیٹا بنا لیا، پھر خود ہی اماں سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اماں نے بہتیرا کہا کہ تم شہر میں نہ رہ سکو گی، مگر وہ ارادے کی پکی تھی۔ اس کو ایک بیٹا چاہیے تھا، جو اس کو قیوم کی صورت میں مل گیا تھا۔ وہ تو اس کو اپنا متبنیٰ بنانے کو پھرتی تھی، مگر ابا جی نے اس کی اجازت نہ دی۔ اماں مرجو ہمارے گھر کا فرد بن گئی اور جہاں کہیں ہم جاتے تھے وہ ہمارے ساتھ جاتی تھی۔

پشاور میں وہ ہمارے گھر پر رہتی تھی اور قادیان بھی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ اس کی موجودگی میں

ہمیں نوکر رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ باورچی خانے کا بندوبست اس کے ہاتھ میں تھا اور چونکہ وہ پردہ نہ کرتی تھی، اس لیے سودا سلف لانے کے لیے بھی چلی جاتی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہماری نوکرانی تھی۔ وہ کوئی تنخواہ نہیں لیتی تھی۔ پھر بھی اماں حیلے بہانے اسے کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ کبھی کپڑے بنوا دیے، گاؤں میں مکان کے لیے کوئی چیز خرید دی یا جب وہ سال میں دو بار ربیع اور خریف کی فصلوں کے موقع پر اپنے کھیتوں کا حصہ لینے کے لیے گاؤں جایا کرتی تھی، تو امی اس کے عزیزوں کے لیے تحفے تحائف خرید دیا کرتی تھیں۔ اماں مرجو اچھی بھلی زمیندارنی تھی، جس کے بٹائی پر دیے ہوئے کھیتوں سے خاصی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ کسی کی محتاج نہ تھی۔ ہمارے پاس آنے سے پہلے وہ گاؤں میں اکیلی رہتی تھی۔ ایک بکری اور ایک بھینس پال رکھی تھی، دو چار مرغیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس طرح دودھ، مکھن، گھی اور انڈوں کے سلسلے میں خود کفیل تھی۔ کھیتوں سے گندم، جوار، باجرے اور مکئی کی فصلوں کی بٹائی کے بعد اتنا حصہ مل جاتا تھا کہ پورا سال آرام سے گزر جاتا تھا۔ سودا سلف جنس کے بدلے میں گاؤں کی واحد دکان سے آجاتا تھا۔ مکان اس کا اپنا تھا، بلکہ ایک پوری حویلی اس کی ذاتی ملکیت تھی۔

خالو جان مولوی غلام نبی مصری کا گھر دارالفضل میں تھا اور اسٹیشن سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہمیں عارضی طور پر وہاں ٹھیرنا تھا۔ نانا جان اور نانی ایک کمرے میں رہتے تھے۔ دوسرے کمرے میں ماموں احمد خان نسیم اور ان کے بیوی بچے رہتے تھے۔ ان کا اپنا مکان ابھی تعمیر نہ ہوا تھا۔ گھر کی بیٹھک میں خالہ بیگم جی اور خالو غلام نبی مصری مقیم تھے۔ اس کے علاوہ ایک سٹور روم تھا۔ اس سے زیادہ مکانیت موجود نہیں تھی، اس لیے ساتھ کا ایک مکان کرایے پر لے لیا گیا تھا، جہاں پر آپا صغریٰ اپنے تین ننھے بچوں اور بہن بھائیوں سمیت رہتی تھی۔ اسی مکان میں ہمارے لیے ایک کمرہ خالی کر دیا گیا۔ خالو جان کے پاس اچھا خاصا قطعہِ زمین تھا، مگر رہایشی کمرے بس تین ہی تھے۔ صحن میں آم کا ایک بڑا تناور درخت تھا، جس پر اتنا پھل لگتا تھا کہ ہمسایوں میں بھی تقسیم ہوتا تھا۔ بیرونی دروازے کے پیچھے اور بیٹھک کے ساتھ انگور کے پودے تھے، جن کی ٹہنیاں چھت کی طرح مکان کی ڈیوڑھی پر چھائی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ صحن میں امرود اور پھلوں کے کئی ایک دوسرے پودے لگے ہوئے تھے۔ میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن پانی کا کنواں تھا، جو قطعہِ زمین کے عین درمیان میں دیوار کے اندر تھا اور ہمسائے کے دو مکانوں کے ساتھ مشترک تھا۔ یہ کنواں اس جگہ پر کھودا گیا تھا، جہاں پر تینوں مکانوں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ آپا صغریٰ کے گھر کی طرف والی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا گیا تھا تاکہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے کے لیے دروازے سے باہر گلی میں نہ جانا پڑے۔

ہمیں بہت جلد ایک مکان کرائے پر مل گیا، جو خالو جان کے مکان سے کم و بیش ایک سو گز کے

فاصلے پر تھا۔ یہ مکان چوہدری حمید اللہ، جو آج کل جماعتِ احمدیہ ربوہ کے ستونوں میں سے ہیں اور انجمن تحریکِ جدید کے چیئرمین ہیں، کے والد کا تھا، جو ان کے مکان کو دو حصوں میں بانٹ کر بنایا گیا تھا۔ ایک حصے میں وہ رہتے تھے اور دوسرے حصے میں ہم مقیم تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ حمید اللہ بھائی نصیر کے کلاس فیلو تھے جب کہ ان کا چھوٹا بھائی سعد اللہ میرے چھوٹے بھائی عبدالقیوم کا ہم جماعت تھا۔ حمید اللہ کی بڑی بہن رضیہ سلطانہ نے مجھے اپنا بھائی بنا رکھا تھا۔ ہم اس مکان میں صرف سال بھر رہے تھے، کیونکہ آپا صغریٰ نے اپنے خاوند کے پاس دوالمیال میں جا کر رہنے کا پروگرام بنایا اور اپنے بچوں سمیت وہاں چلی گئیں۔ ان کا مکان اماں نے کرائے پر لے لیا تا کہ بھائی جان محمد احمد نعیم اور ان کی بہن صفیہ بیگم ہمارے ساتھ وہاں پر ہی مقیم رہ سکیں۔

نقلِ مکانی سے پہلے اماں نے اپنی مرحومہ سہیلی امۃ اللہ کی بیٹی عزیزہ بیگم کا بیاہ رچایا، جو ایک نو مسلم سردار عبدالرحمٰن مہر سنگھ کی نواسی تھی۔ اس کے نانا چھوٹے سے قد کے تھے مگر بے حد فعال انسان تھے۔ وہ بالخصوص سکھوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اور آئے دن رسالے اور پمفلٹ چھاپتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ احمدی ان سے گورمکھی سیکھیں تا کہ خود سکھوں کا مذہبی لٹریچر پڑھ سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گورو بابا نانک دراصل مسلمان تھے اور انھوں نے مکّے کا سفر کیا تھا، جہاں پر وہ کئی ماہ تک مقیم رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی ساری مذہبی اصطلاحات اسلامی فقہ سے لی گئی ہیں۔ وہ اپنے گھر پر کلاسیں لگاتے اور مفت سبق دیتے تھے۔ ان کا بیٹا ڈاکٹر نذیر احمد حبشہ میں ہوتا تھا اور اپنے باپ کی طرح آنریری مبلغ تھا۔ میری ملاقات ڈاکٹر نذیر احمد کے ساتھ تین دہائیاں بعد جرمنی میں ہوئی۔ انھوں نے ایک جرمن نومسلمہ سے شادی کر لی تھی اور اسی سلسلے میں جرمنی آئے تھے۔

اماں نے عزیزہ کا رشتہ ماموں احمد خان نسیم کی وساطت سے ایک برمی احمدی فیملی میں کرایا تھا۔ عزیزہ کے والد تاج صاحب نے بیٹی کی شادی کی ساری ذمے داری اماں کے سر پر ڈال دی تھی۔ چونکہ عزیزہ کے خاوند محمود احمد برمی کا قادیان میں کوئی ٹھکانا نہ تھا، اس لیے عزیزہ اپنے نانا کے گھر سے، جو ہمارے ہمسائے میں تھا، رخصت ہو کر ہمارے مکان پر لائی گئی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی، جو میں نے بچپن کے زمانے میں دیکھی۔ اس موقع پر کوئی ڈھول نہیں بجا تھا اور کسی نے گیت نہیں گائے تھے۔ یہ چیز قادیان کے ماحول میں مستحسن نہ سمجھی جاتی تھی۔ دوسری طرف ہمارے مکان کے قریب ایک دومنزلہ مکان ڈاکٹر ظفر الحسن کا تھا، جہاں سے ہر شام کو فلمی گانوں کے ریکارڈ اونچی آواز میں سنے جا سکتے تھے۔ اس بارے میں کہا جاتا تھا کہ ڈاکٹر ظفر الحسن کی بیوی کو خلیفۂ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد کی طرف سے اس امر کی خاص اجازت ملی ہوئی ہے، کیونکہ وہ اس تفریح کے بغیر قادیان میں رہنے کے لیے تیار نہ تھی۔

مجھے تعلیم الاسلام ہائی اسکول کی پرائمری برانچ میں پہلی یا شاید دوسری جماعت میں داخل کرایا گیا۔ یہ اسکول ہمارے گھر کے قریب تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری کلاس شیشم کے ایک درخت کی چھاؤں میں لگتی تھی۔ میرے دائیں اور بائیں منکر ونکیر کی طرح سمیع اللہ اور ہدایت اللہ بیٹھتے تھے، جو اپنے قدوں کے تفاوت کے سبب گلی ڈنڈا لگتے تھے۔ سمیع اللہ میری طرح پدّا تھا، جب کہ ہدایت اللہ پتلا اور لمبوترا تھا۔ دونوں اندرون شہر میں رہتے تھے اور شاید ہمسائے تھے اور ایک دوسرے کو اس وقت سے جانتے تھے جب دونوں پوتڑوں میں لپٹے ہوتے تھے۔ میری دوستی ان کے ساتھ نئی تھی، کیونکہ میں اس قصبے میں نو وارد تھا۔

قادیان آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں خالہ بیگم جی کی شاگردی میں آگیا جنھوں نے مجھے قرآنِ کریم ناظرہ پڑھا دیا۔ چنانچہ جب میں اس اسکول میں داخل ہوا تو فر فر پڑھ سکتا تھا۔ اس طرح میں اپنے ہم مکتبوں سے آگے تھا۔ سمیع اللہ بھی میری طرح پڑھا کو تھا اور اسی پر ہماری دوستی قایم تھی۔ ہدایت اللہ کے اندر دوسری صفات پائی جاتی تھیں، جو ہمیں اتنی ہی قیمتی لگتی تھیں۔ وہ ایک جلد ساز کا بیٹا تھا اور ہماری کتابوں اور کاپیوں کی جلدیں باندھا کرتا تھا، وگرنہ پڑھنے لکھنے میں وہ خاصا پھسڈی تھا۔ وہ جتنا خاموش طبع تھا اتنا ہی سمیع اللہ شوخ اور شریر تھا، جس کے سبب اسے آئے دن استادوں کی خاص عنایتوں کو سہنا پڑتا تھا۔ چونکہ وہ ذہین تھا اور محنت سے جی نہیں چراتا تھا اس لیے کلاس میں ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔ بس ایک بات میں وہ مجھ سے مات کھا جاتا تھا۔ میرا خط اس سے بہتر تھا، جس کے سبب مجھے اکثر زیادہ نمبر ملتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان ہر روز مقابلہ ہوتا تھا مگر ہماری دوستی بھی مثالی تھی۔ میں اس کے بغیر اور وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمارا ساتھ پانچویں جماعت تک رہا۔ ہماری دوستی آج تک قایم ہے۔

مجھے ایک دوسرے پہلو سے اس اسکول میں ایک امتیاز حاصل تھا، وہ اس طرح کہ انھی دنوں میں پرائمری اسکول کو ہائی اسکول سے علیحدہ کر دیا گیا، جس کے سبب ہمارے اسکول کی صبح کی اسمبلی الگ ہونے لگی۔ اس سے قبل یہ ہوتا آیا تھا کہ سارے ہائی اسکول کی اسمبلی اکٹھی ہوتی تھی اور بڑی جماعتوں کا ایک طالب علم یمین المیامن قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا تھا۔ پرائمری اسکول کی علیحدگی کے بعد جب ہماری الگ اسمبلی ہونے لگی تو تلاوتِ قرآن کے لیے مجھے چنا گیا۔ اس طرح جب تک میں اس اسکول کا طالب علم رہا صبح کی اسمبلی میں تلاوتِ قرآن کا فریضہ ادا کرتا رہا

مگر اس امتیاز کا ایک منفی پہلو یہ تھا کہ مجھے آئے دن دھونسو قسم کے لڑکے ڈرانے دھمکانے لگ گئے۔ میں قد کاٹھ کا بہت چھوٹا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مجھ پر رعب ڈال سکیں گے۔ ایک روز میں نے اس بات کا ذکر گھر پر اماں سے کیا تو اماں مرجو نے بھی سن لیا۔ وہ بڑی دبنگ عورت تھی۔ اس نے کہا: ”کل

میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ تم ان لڑکوں کی نشاندہی کرنا اور پھر دیکھنا کہ میں ان کو کیسی پھینٹی دیتی ہوں۔'' میں گھبرا گیا کہ کہیں اماں مرجو سچ مچ وہاں پر نہ آن نکلے۔ مجھے اس معاملے میں گھر والوں کی مداخلت بالکل پسند نہ تھی، میں اس چیز سے اپنے طور پر خود نپٹنا چاہتا تھا۔ میں نے اماں سے کہا کہ اگر اماں مرجو سچ مچ میرے اسکول میں آن نکلی تو پھر میں کبھی اسکول نہیں جاؤں گا۔

اماں مرجو اپنی جوانی کے زمانے میں بہت مہم جو ہوا کرتی تھی، جس کا ذکر میں نے اپنے افسانے ''رتے کنویں کے سایے میں زندگی'' میں کیا ہے۔ وہاں سے یہ اقتباس درج کیا جاتا ہے:

''امی نے اماں مرجو کی جوانی کا زمانہ دیکھا تھا، اگرچہ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ جب اماں مرجو کی شادی ہوئی تھی اس وقت امی بمشکل چھ سات سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا کہنا تھا کہ مرجو جیسی صحت مند اور مہم جو لڑکی پورے گاؤں میں نہ پائی جاتی تھی۔ لڑکوں بالوں کا تو ذکر ہی کیا وہ اچھے بھلے مسٹنڈوں کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا کرتی تھی۔ مجال ہے جو کوئی اس کے ساتھ یا اس کی ہمجولیوں سے بدتمیزی کر جائے۔ شہ سوار وہ ایسی تھی کہ سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر چھلانگ لگا کر سوار ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ایک گھوڑا سوار گاؤں کے رتے کنویں پر، جہاں مرجو اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی نکال رہی تھی، آ کر رکا اور پانی پلانے کا خواستگار ہوا۔ مرجو نے کہا کہ وہ جی بھر کر پانی پی سکتا ہے مگر اس کے لیے اسے گھوڑے سے اترنا ہوگا کیونکہ ان کے پاس کوئی کٹورا یا چھنّا نہیں ہے۔ مرجو کی ایک سہیلی نے پانی سے بھرا ہوا بوکا نکالا اور جونہی گھوڑا سوار نے گھوڑے سے اتر کر اپنے ہاتھوں کو پانی ڈالے جانے کے لیے پیالہ بنایا اور اکڑوں بیٹھا مرجو کود کر اس کے گھوڑے پر سوار ہوگئی اور ایڑی لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ گھوڑا سوار پانی پینا بھول گیا اور اپنے گھوڑے کے پیچھے بھاگا مگر بے سود۔ دو تین گھنٹوں تک مرجو اس کی آنکھوں کے سامنے گھوڑے کو دوڑاتی پھری۔ رتہ کنواں گاؤں کے باہر عین سڑک کے کنارے پر واقع ہے، جو گوجر خان سے کلر سیّداں اور آگے پونچھ کو جاتی ہے۔ اس سڑک پر دن رات اونٹوں کے کارواں چلتے ہیں۔ مرجو کی گھوڑا سواری کے کرتبوں کو دیکھنے کے لیے بے تحاشا مخلوق وہاں پر جمع ہوگئی۔ کسی نے مرجو کے اجی کو جا کر بتایا کہ اس کی بیٹی نے سڑک پر میلہ لگا رکھا ہے۔ وہ اس وقت گاؤں کی شاملات میرا میں ہل چلا رہا تھا۔ وہ بے چارہ بیلوں کو وہیں پر چھوڑ کر بھاگا ہوا آیا۔ مرجو کی سہیلیوں نے دور سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا اور مرجو کو خبردار کر دیا۔ اس نے اپنے اجی کو چابک ہوا میں لہراتے ہوئے آتے دیکھا تو قبرستان کے پاس گھوڑے سے اتر کر جھنڈارنی کی طرف بھاگ گئی۔ اجی کے رتے کنویں پر پہنچنے تک گھوڑا سوار کو اس کا گھوڑا واپس مل چکا تھا۔ اجی نے پہنچ کر اس سے معذرت چاہی اور کہا کہ وہ مرجو کی ایسی خبر لے گا کہ وہ آیندہ ایسی حرکتوں سے باز آجائے گی۔''

اماں مرجو بہت حساس عورت تھی اور ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات ہمیں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کون سی بات اس کی ناراضگی کا موجب بنی تھی۔ اس بارے میں وہ کسی سے شکایت نہیں کرتی تھی، بس چپکے سے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی کو اٹھا کر چل دیتی تھی۔ ایک بار مجھے وہ اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی راستے میں ملی۔ میں نے پوچھا: اماں مرجو، کہاں جا رہی ہو؟ پہلے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا پھر میرے اصرار پر بتایا کہ وہ چنگا جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس نے اماں کو اس بارے میں بتایا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر جا رہی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے اس بارے میں کچھ بتانے سے انکار کیا۔ میں نے کہا کہ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔ یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ پتا چلا کہ اسے یہ شکایت تھی کہ کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔ اماں نے اسے یقین دلایا کہ وہ آیندہ خیال رکھیں گی اور پھر کبھی شکایت کا موقع نہ دیں گی۔ اس پر اماں مرجو نے جانے کا خیال چھوڑ دیا مگر کچھ عرصے کے بعد وہ پھر گٹھڑی اٹھا کر چل دی اور ہمیں اس کو منانے کے لیے قیوم کو بھیجنا پڑا۔ وہ اس کی کسی بات کو رد نہ کرتی تھی۔ وہ اس کو اپنا پتر کہتی تھی اور اس کی خاطر ہر قربانی کرنے کے لیے تیار تھی۔

میں نے اماں مرجو کی قیوم سے دیوانہ وار محبت کا ذکر اپنے افسانے ''رتے کنویں کے سایے میں زندگی'' میں ان الفاظ میں کیا ہے: ''ہم بہن بھائی اس کو 'اماں مرجو کا لاڈلا' کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ وہ اس بات پر برا مان جاتا تھا اور امی کے پاس ہماری شکایت کر دیتا تھا، جس پر ہمیں جھڑکا جاتا تھا مگر بچپن میں انتقام لینے کا جذبہ اور ناانصافی کو قبول نہ کرنے کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ چھوٹی موٹی سرزنش بھی بچوں کو اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اماں مرجو نے قیوم کو دوسرے بچوں پر ترجیح دینے کا جو طریق اختیار کر رکھا تھا وہ ایسا تھا کہ کسی سے پوشیدہ نہ رہتا تھا۔ درحقیقت قیوم کو ہر وقت اماں مرجو کی حمایت حاصل تھی اور وہ اس بات کا لحاظ کیے بغیر، کہ بچوں کے درمیان لڑائی جھگڑے میں قصوروار کون تھا، ہر حالت میں قیوم کی طرفداری کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ وجہ بے وجہ دوسرے بہن بھائیوں کو ستایا کرتا تھا۔ دوسری طرف کوئی دوسرا اماں مرجو کے لاڈلے پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ یہی نہیں اماں مرجو نے قیوم کی عادات کو بگاڑ دیا تھا۔ چونکہ وہی باورچی خانے کی کرتا دھرتا تھی، اس لیے مٹھائیوں، سویٹ ڈشوں اور پھلوں میں سے اس کو دگنا حصہ ملتا تھا۔ پہلی بار گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ پھر دوسری بار چھپ چھپا کر۔ جب اباجی نے اماں مرجو کو ایسا کرنے سے روکنا چاہا تو اس نے اپنا حصہ قیوم کو دینا شروع کر دیا بلکہ یہ چیز اعلانیہ ہونے لگی۔''

اس زمانے میں قادیان کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اکثریت احمدیوں کی تھی مگر ہندو اور سکھ بھی پرانی آبادی میں رہتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص دوستوں میں ایک ہندو لالہ ملاوا

مل بھی شامل تھا، جس کو وہ اپنے بعض الہامات کے پورے ہونے کا گواہ قرار دیتے تھے۔ چونکہ قادیان اورنواح کے پانچ دیہات مرزا صاحب کی فیملی کی ملکیت تھے اس لیے وہاں پر صرف ان لوگوں کے پاس مکان بنانے کے لیے زمین فروخت کی جاتی تھی، جو مرزا صاحب کی جماعت میں شامل ہو چکے ہوتے تھے۔ اس وجہ سے غیر احمدی مسلمان وہاں پر شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے۔ البتہ بعض لوگ ایسے بھی موجود تھے جو شاید احمدیت سے منحرف ہو چکے تھے مگر اس بات کا مجھے اس زمانے میں پوری طرح علم نہ تھا۔ ابا جی کے ایک واقف کار حکیم عبدالعزیز تھے، جن کے بارے میں خدا جانے کیسے میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ ان کا شمار منافقوں میں ہوتا تھا۔ اب تحقیق کرنے سے پتا چلا ہے کہ یہ بات درست نہ تھی۔ میں ابا جی کے ساتھ ان کے گھر پر گیا تھا، جہاں پر انھوں نے طبیہ عجائب گھر بنا رکھا تھا۔ آپ نے ابا جی کو معجون تحفے میں دی تھی جو ایسی مزیدار تھی کہ میں بھی اس کو کھانے کی خواہش رکھتا تھا، مگر ایسی نادر چیزوں سے خدا جانے کیوں بچوں کو دور رکھا جاتا ہے۔ پھر میں نے یہی بات ایک دوسرے شخص سردار مصباح الدین بی۔ اے کے بارے میں سنی، جو جماعت کی طرف سے لنڈن میں مشنری رہ چکے تھے۔ یہ مذہبی سکھوں میں سے مسلمان ہوئے تھے اور ان کو مولوی نورالدین خلیفہِ اوّل نے تعلیم دلوائی تھی۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ ان کا پہلا اسلامی نام چراغ دین تھا، جس کو مرزا محمود احمد نے بدل کر مصباح الدین کر دیا تھا۔ سنا تھا کہ ان کے تعلقات لاہوری جماعت کے ساتھ تھے، جو خلیفہِ اوّل مولوی نورالدین کی وفات پر قادیان کی جماعت سے علیحدہ ہوگئی تھی۔

مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ جس زمانے میں ہم قادیان جا کر آباد ہوئے جماعتِ احمدیہ زبردست بحران کا شکار تھی کیونکہ خلیفہِ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد پر تھوڑا عرصہ قبل سنگین جنسی الزامات لگائے جا چکے تھے، جن کی بنا پر ان کے ماموں میر محمد اسحاق نے، جو جماعت کے مقتدر علماء میں شمار ہوتے تھے، ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی۔ ایسے الزامات ان پر اس سے قبل بھی لگ چکے تھے۔ اس زمانے کے احمدی اخبارات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جماعت کے اندر بے چینی اور تذبذب پھیلا ہوا تھا۔ قادیان سے باہر رہنے والے احمدیوں کو درست صورتِ حال کا علم نہیں تھا، نہ ہی جماعتی اخبارات میں کھل کر بتایا جاتا تھا کہ ''فتنہِ خلافت'' کے پیچھے کون سے الزامات ہیں، جن کی بنا پر مرزا محمود احمد کی معطّلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ جب ہم قادیان پہنچے تو مجھے ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔

قادیان میں ہمارا قیام ابتدائی دنوں میں خالو جان مولوی غلام نبی مصری کے گھر پر تھا، جو نہایت بے ضرر اور مخلص انسان تھے اور میرے لیے وہ اپنے علم و فضل کے سبب بہت اہمیت رکھتے تھے۔ وہ ایک فرشتہ سیرت آدمی تھے، جنھوں نے اپنی زندگی کو حصولِ علم اور عباداتِ الٰہی کے لیے وقف

کر رکھا تھا۔ وہ چھاؤڑیاں، ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۸۹۷ء میں قادیان آ کر جماعتِ احمدیہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں قادیان میں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا، البتہ مولوی نورالدین جیسے اجل عالم موجود تھے، جو ۱۹۰۸ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات پر جماعتِ احمدیہ کے خلیفہِ اوّل منتخب ہوے۔ خالو جان آپ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ دو وقت کا کھانا لنگر سے مل جاتا تھا اور خالو جان تحصیلِ علم اور عبادتِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے کام سے غرض نہ رکھتے تھے۔ قادیان میں ان دنوں بہت سے لوگ جمع تھے اور لنگر پر بوجھ بن رہے تھے، اس لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے سولہ یا سترہ نوجوانوں کا کھانا بند کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس فہرست میں خالو جان کا نام بھی آ گیا۔ آپ نے اپنے استاد مولوی نورالدین کی خدمت میں حاضر ہو کر بھوپال جانے کی اجازت چاہی، جہاں پر اس زمانے میں نواب صدیق حسن قنوجی کے دم قدم سے علومِ دینی کا چرچا تھا۔ نواب صدیق حسن علمِ حدیث کے جیّد عالم تھے اور بھوپال کی فرماں روا شاہجہان بیگم (۱۸۶۸ء-۱۹۰۰ء) نے آپ سے عقدِ ثانی کیا تھا۔ مولانا اسلم جے راجپوری ''تاریخ الامت'' میں اس عہد کے بارے میں لکھتے ہیں: ''بھوپال کی حیثیت اس وقت بغداد الہند کی تھی۔'' صہبا لکھنوی کی روایت ہے کہ " وہاں پر اس وقت علم و ادب کی اشاعت کے لیے آٹھ سرکاری مطابع تھے، جو دن رات کتابیں چھاپتے تھے اور تقریباً دو سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر ہر سال مطابع سے شایع ہو کر مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔''

مولوی نورالدین نے اجازت مرحمت فرمائی اور شاگرد کو بعض کتابیں وہاں پر تلاش کرنے کو کہا، جن کو وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ خالو جان نے کچھ عرصہ تک بھوپال میں قیام کیا، جس کے دوران علمِ حدیث کی تحصیل کے ساتھ ساتھ چند کتابیں اپنے قلم سے نقل کر کے قادیان بھیجیں۔ باقی ماندہ مطلوبہ کتابوں کے بارے میں انھیں بتایا گیا کہ وہ سوائے ملک مصر کے کہیں پر نہ مل سکیں گی۔ چنانچہ خالو جان نے مصر جانے کا ارادہ باندھ لیا اور کراچی کا رخ کیا۔ وہاں پر تجارتی مال برداری کی کشتیوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، جو ملکِ عرب جانے والی تھیں۔ ایک کشتی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ چند روز کے بعد بصرے کے لیے روانہ ہو جائے گی۔ اس کشتی میں محدود تعداد میں مسافروں کو بھی لے جانے کا انتظام تھا۔ کرایہ بھی واجبی تھا مگر خالو جان کے پاس اتنی رقم موجود نہ تھی۔ البتہ آپ کے پاس ایک نیا کمبل تھا۔ ایک دکاندار نے انھیں اس کمبل کے لیے عین اتنے روپے دینے کی پیش کش کی جتنا کرایہ کشتی والوں نے مانگا تھا۔ چنانچہ اس طرح آپ بصرے پہنچ گئے مگر ملک مصر ابھی دور تھا۔

خالو جان نے مصر تک کا سفر پیدل کرنے کا ارادہ کیا بلکہ راستے میں مکّے اور مدینے جانے اور حج،

یا اگر حج کا موسم نہ ہوا تو، عمرہ کرنے کا عزم باندھا۔ چونکہ ان دنوں بصرے سے سیدھا مکّے جانے والا راستہ بند تھا، اس لیے بصرے سے پہلے کوفے اور بغداد، پھر وہاں سے اسلامی تاریخ کی مشہور ترین سڑک ''درب زبیدہ'' کے راستے مدینے اور مکّے کا سفر کیا۔ ایسے سفر اس زمانے میں قافلوں کی صورت میں کیے جاتے تھے، جن میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ بعض لوگوں کے پاس اپنی سواری کا انتظام ہوتا تھا یا سواری کے لیے اونٹ، گھوڑا یا گدھا کرائے پر بھی حاصل کر سکتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس اپنی سواری نہ ہوتی تھی اور کرایہ ادا کرنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے تھے، وہ پیادہ قافلے کے ساتھ چلتے تھے۔ خالو جان نے بھی یہ سفر پیادہ ہی کیا۔ البتہ راستے میں ایک بدو نے ان پر ترس کھا کر ان کو اپنے گدھے پر سوار ہونے کو کہا۔ خالو جان جب کبھی اس واقعے کا ذکر کرتے تھے تو اس بدو کا یہ فقرہ دہراتے تھے: ارکب یا هندی (سوار ہو جا اے ہندوستان کے رہنے والے) اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تھے۔

عمرے سے فارغ ہونے کے بعد اور مکّے اور مدینے کی مساجد میں تعلیمی مجالس میں کچھ عرصے تک شرکت کرنے کے بعد خالو جان نے مصری قافلے کی معیت میں مصر کا سفر کیا۔ وہاں پر قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی میں، جو کہ اسلامی دنیا کے بزرگ ترین تعلیمی اداروں میں سے ہے، آپ نے پانچ برسوں تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں جمال الدین افغانی کے شاگرد مفتی محمد عبدہ شیخ الازہر تھے۔ خالو جان آپ کے خاص شاگردوں میں شامل ہوئے اور مفتی محمد عبدہ کی وفات کے بعد ہی ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کیا۔ سارے عرصے کے دوران، جب کہ آپ جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، آپ نے اپنے استاد مولوی نور الدین کی مطلوبہ کتابوں کی فراہمی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس مقصد کے لیے آپ ہر روز مرکزی لائبریری ''دار الکتب'' میں جا کر کتابوں کو نقل کرتے تھے، جس کے لیے کاغذ لائبریری کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں لائبریری کے اندر سیاہی لے جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے پہلی نقل لائبریری میں پنسل کے ساتھ تیار کرتے تھے، پھر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر کئی گھنٹوں کی محنت سے تیار کردہ نقل کو سیاہی کے ساتھ نئے کاغذ پر لکھتے تھے۔ آپ کا قیام مصر میں اتنے عرصے تک رہا جب تک مطلوبہ کتابیں مکمل نہ ہو گئیں۔

مصر میں قیام کے دوران اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے خالو جان کو دوسرے طالب علموں کے ہمراہ محنت مزدوری بھی کرنی پڑتی تھی۔ سنایا کرتے تھے کہ وہ منڈی میں جا کر کھجور کی گٹھلیاں اکٹھی کرتے تھے، جنھیں بکریوں کے مالکوں کے پاس بیچا جاتا تھا۔ یہ گٹھلیاں بکریوں کا من بھاتا کھاجا ہے، جس کے کھانے کے نتیجے میں ان کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ خالو جان نے پیسے پس انداز کر کے وطن واپس جانے کا کرایہ بنا لیا۔ اس طرح واپسی کا سفر جہاز میں کیا۔

مصر سے واپسی پر خالو جان سیدھے قادیان پہنچے اور اپنے استاد مولوی نورالدین کی خدمت میں کتابوں کی نقلیں پیش کیں، جن کے حصول کی خواہش کا اظہار انھوں نے کیا تھا۔ اس کے بعد آپ قادیان ہی کے ہو کر رہ گئے۔ مولوی نورالدین نے آپ کو اپنے مطب میں بطور مددگار اور شاگرد کے رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو جماعتِ احمدیہ کی خدمت کرنے کا موقع بھی ملا۔ جب مولوی عبدالکریم سیالکوٹی اور مولوی برہان الدین جہلمی کی وفات پر مرزا غلام احمد قادیانی نے دینی مدرسہ قایم کرنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ تعلیم الاسلام میں ۱۹۰۵ء کو ایک شاخ دینیات کی کھولی گئی۔ اس کلاس کے پہلے استاد خالو جان مقرر ہوے۔ آگے چل کر ۱۹۰۹ء میں علیحدہ مدرسے کی بنیاد رکھی گئی، جس کا نام ''مدرسہ احمدیہ'' تجویز ہوا۔ جنوری ۱۹۱۰ء میں خالو جان اس مدرسے کے استاد مقرر ہوے اور پنشن پانے کی عمر تک اس مدرسے سے وابستہ رہے۔ سینکڑوں طلباء کو، جن میں جماعتِ احمدیہ کے بیشتر نامور علماء شامل ہیں، آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہو۔

خالو جان مختصر الکلام تھے۔ آپ سارا وقت مسنون دعاؤں کے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے، اس لیے دوسروں کے ساتھ لمبی چوڑی بات کرنے کا وقت ان کے پاس نہیں تھا، اگر کچھ بیان کرنا ہوتا تھا تو اختصار کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ یہی اختصار آپ کی تحریر کا خاصا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے خطوط میرے والدین کے نام آتے تھے، تو اکثر پوسٹ کارڈ کی صورت میں ہوتے تھے۔ عام طور سے سارا پیغام پوسٹ کارڈ کے ایک پرت پر لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ہر قابلِ ذکر بات اس مختصر تحریر میں سمیٹ دی جاتی تھی۔

جب ہم قادیان پہنچے، تو میں نے خالو جان کو ہمہ وقت مرزا غلام احمد قادیانی کی کتب کا عربی میں ترجمہ کرتے ہوے دیکھا۔ یہ کام آپ بے حد انہماک کے ساتھ کرتے تھے حتیٰ کہ اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہوے اسی کام میں ڈوبے ہوے ہوتے تھے۔ بھاری بھرکم کتابوں کو ہر وقت اٹھائے پھرنا بوجھل تھا، اس لیے خالو جان نے یہ طریق اختیار کیا کہ کتابوں کی جلد کو اکھاڑ کر ان کے اوراق کو علیحدہ علیحدہ کر لیا جائے۔ اس طرح آسانی کے ساتھ ایک یا دو ورق کتاب کے اور دو تین سفید کاغذ ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ فونٹین پین استعمال نہیں کرتے تھے، اس لیے ابا جی نے ان کو ایک خاص قسم کی دوات مہیا کی تھی جس میں دو چھوٹی شیشیاں ایک کیس میں بند تھیں، ان کے اوپر دھات کا خول چڑھا ہوا تھا، جس کو بند کرنے سے شیشیوں کے اوپر ڈھکنا چڑھ جاتا تھا اور سیاہی نہیں گر سکتی تھی۔ یہ دوات ہر وقت خالو جان کی جیب میں رہتی تھی۔ فرصت کا ایک ایک لمحہ ترجمے کے کام آتا تھا۔ مسجد میں بھی جاتے تھے، تو نماز کی ادائیگی کے علاوہ جتنا وقت وہاں پر گزرتا تھا، اسے ترجمہ کرنے میں صرف کرتے تھے۔ اس طرح آپ

نے بہت سی کتابوں کو عربی میں ڈھالا۔ جب سالہا سال کے بعد میرا تعارف قاہرہ میں جماعتِ احمدیہ کے صدر الاستاذ محمد بسیونی کے ساتھ ہوا تو انھوں نے بتایا کہ انھوں نے خالو جان کے بعض تراجم کے مسودوں سے استفادہ کیا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ان تراجم میں سے کوئی اب تک شایع نہیں ہوا۔ جملہ مسودے قادیان کی نور لائبریری اور ربوے کی خلافت لائبریری میں محفوظ ہیں اور اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب کوئی عرب اہلِ زبان اردو سیکھنے کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں کو عربی میں ڈھالنے کے لیے ان تراجم سے استفادہ کر سکے۔

خالو جان کی مختصر نویسی سے میں بالخصوص بہت مرعوب تھا اور حتی الامکان اس کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آگے چل کر جب میں نے جرمن اخباروں میں لکھنا شروع کیا تو اس مشق نے میری بہت مدد کی۔ عام طور سے یورپ میں یہ طریق رائج ہے کہ اخبار کی طرف سے مضمون نگار کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کا مضمون اتنی سطروں سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے اور فی سطر اتنے حروف استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ بعض اوقات الفاظ کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے۔ اس طرح مضمون نگار اپنے مافی الضمیر کو مقررہ حدود کے اندر بیان کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر اسکول کے زمانے میں مجھے اس کے الٹ یہ تجربہ ہوا کہ مختصر نویسی کے نمبر کم ملتے تھے۔ چنانچہ نویں جماعت میں مجھے ایک امتحانی پرچے پر بہت کم نمبر ملے، میں نے اس امر کی شکایت اپنے متعلقہ استاد سے کی اور کہا کہ وہ غور سے میرا پرچہ دیکھنے کے بعد بتائیں کہ کیا میں نے ہر سوال کا جواب درست نہیں دیا تھا۔ اس نے پرچے کو دیکھنے کے بعد کہا کہ تمھارے جوابات درست ہیں اور ان میں ہر قابلِ ذکر بات بیان کر دی گئی ہے مگر بے حد اختصار کے ساتھ، اگر تم نے یہی جواب پوری تفصیل سے دیے ہوتے تو کلاس میں اوّل آ سکتے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ چیز میرے لیے مشکل نہیں ہے، میں اگلی بار اتنے صفحے کالے کروں گا کہ آپ تنگ آ جائیں گے چنانچہ اس کے بعد مجھے امتحانوں میں زیادہ نمبر ملنے لگے۔

قادیان کی دوسری شخصیت، جس نے مجھے متاثر کیا، وہ ہمارے محلے کے صدر ڈاکٹر محمد طفیل تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ڈگری یافتہ میڈیکل ڈاکٹر نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہوں، جن کے پاس اس زمانے میں ڈگریاں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ بھی خالو جان کی طرح مدرسہ احمدیہ میں پڑھاتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر پر ایک فری ڈسپنسری کھول رکھی تھی، جہاں پر وہ مقررہ اوقات میں بیماروں کو دیکھتے اور مفت دوا دیتے تھے۔ میں بھی ایک دو بار نزلے زکام کے لیے دوا لینے کے لیے ان کے گھر کی ڈیوڑھی میں جا کر بیٹھا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ وہ سب بیماروں کو ایک ہی شیشی میں سے دوا دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ مجھے ایک ایسا تجربہ ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کے سفر کے دوران آگرے

میں ہوا، جہاں پر مجھے پیٹ میں درد کی وجہ سے ایک وید کے پاس جانا پڑا تھا۔ ہوٹل والے مجھے ایک میڈیکل ڈاکٹر کے پاس بھیجنا چاہتے تھے، مگر میں نے کہا کہ اگر قرب وجوار میں کوئی حکیم یا وید ہو تو اس کے پاس لے چلیں۔ چنانچہ مجھے وید کا پتا دیا گیا جو ساتھ کی گلی میں مطب کرتا تھا۔ میں شام کے وقت وہاں پر پہنچا، تو بے شمار مریضوں کو موجود پایا۔ میں بھی انتظار کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ وید نے کہا کہ اگر میں تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں تو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے مریضوں سے نپٹنے کے بعد مجھ سے بات کرے۔ چنانچہ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا اس کے طریق کار کو دیکھتا رہا۔ وید مریضوں کی زبان اور آنکھوں معائنہ کرتا، نبض ٹٹولتا اور بعض اوقات پیٹ کو دباتا تھا اور ایک نسخہ لکھ دیتا تھا ،جس کے مطابق اس کا مددگار، جو اسی کمرے میں ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا، دوا کی پڑیاں باندھ دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قریب قریب سب مریضوں کو ایک ہی قسم کی جڑی بوٹیاں دی جاتی تھیں۔ بیشتر نسخوں میں معمولی کمی بیشی ہوتی تھی۔ جب دو تین گھنٹوں کے بعد سب مریض جا چکے تو اس نے میرا معائنہ کیا اور میرے لیے بھی ویسا ہی نسخہ لکھا اور اپنے پاس سے اسپغول کی چند پڑیاں دیں جن کو مجھے دو تین روز تک دودھ میں ڈال کر کھانا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے نوے فیصد مریض پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اس لیے سب کو ایک جیسی دوا دی جاتی ہے۔ مجھ سے وہ کوئی معاوضہ لینے کے لیے تیار نہ ہوا، کیونکہ میں اس کے الفاظ میں اس کے ملک میں مہمان تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک سابقہ سفر کے دوران مجھے پشاور میں ایک ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا تھا ،جس نے یہی بات کہہ کر مجھ سے معاوضہ لینے سے انکار کیا تھا، حالانکہ میں اس کے دوسرے مریضوں سے زیادہ متمول تھا اور آسانی کے ساتھ اس کی فیس ادا کر سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مجھے چلّی کے سفر کے دوران گلے میں سوزش کے سبب طبی امداد لینی پڑی۔ ڈاکٹر میری بیوی اوتا کی بہن انگریڈ کا فیملی دوست تھا اور ان کے ہمسایے میں رہتا تھا۔ اس کی لڑکی اوتا کے بھانجے الیکس کے ساتھ دن رات لیس کی طرح چمٹی رہتی تھی۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے انگریڈ کے گھر پر آیا۔ اس نے ہمیں جو بل اس وزٹ کے لیے دیا وہ جرمنی میں ڈاکٹروں کے بلوں سے تین گنا تھا، حالانکہ چلّی جرمنی کے مقابلے میں بہت سستا ملک ہے۔

ڈاکٹر محمد طفیل کے بیٹے اعجاز الحق نے ان دنوں انجمنِ احمدیہ کے ایک کارکن کی خوبصورت بیوی پر ڈورے ڈالے اور اس کو لے کر غایب ہو گیا۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین نے ان کو نگل لیا تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد اماں کو، جو مہاجروں کی آبادکاری کے کام سے متعلق تھیں، کشمیر سے آئی ہوئی ایک فیملی کے بارے میں خبر ملی کہ ان کو فوری طور پر رہایش کے لیے مکان درکار تھا۔ وہ لوگ عارضی طور پر ایک گیراج میں ٹھیرے ہوئے تھے، جہاں پر اس فیملی کے پانچ بچوں کے لیے جگہ

ناکافی تھی۔ اماں خود ان کے ٹھکانے پر پہنچیں تا کہ ان کی ضروریات کا اندازہ لگا کر ان کے لیے مناسب رہائش گاہ کا انتظام کیا جائے۔ اماں نے میاں بیوی کو پہچان لیا کیونکہ وہ ان کو قادیان کے زمانے سے جانتی تھیں۔ اماں نے ان کو ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا اور ان کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ چند دنوں کے اندر ان کے لیے تمام ضروریاتِ زندگی کا انتظام ہو گیا اور ان کو رہائش کے لیے بہتر جگہ بھی مہیا کر دی گئی۔

نانا جان فضل محمد خان اور نانی خالو جان کے ساتھ رہتے تھے۔ دونوں بڑھاپے کے سبب چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ نانا جان قد کاٹھ کے اونچے اور بھاری بھر کم انسان تھے۔ جس زمانے میں میں نے انھیں دیکھا ان کی ریڑھ کی ہڈی ان کے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہی تھی اس لیے وہ ایک کھونٹی کے سہارے کبڑے ہو کر چلتے تھے۔ اکثر وقت بستر پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے قرآنِ کریم پڑھنے میں مصروف رہتے تھے اور تین دن کے اندر ختم کرتے تھے۔ آخری عمر تک ان کی نظر خوب کام کرتی تھی، عینک لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دانت بھی اچھی حالت میں تھے۔ آخری برسوں میں انکی داڑھی پھر سے کالی ہونے لگی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔

عام طور سے ہمارے خاندان میں کہا جاتا ہے کہ نانا جان نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی تھی۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے۔ ان کی وفات ۱۹۴۴ء میں ہوئی جب کہ دادا جان مولوی محمد فضل خان ۱۹۳۸ء میں ستر سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ اگر نانا جان نے ایک سو بیس سال کی عمر پائی تھی تو پھر وہ دادا جان سے چوالیس برس بڑے تھے۔ یہ اس لیے ناممکن ہے کہ ان کی والدہ اور دادا جان کی والدہ کی عمروں میں بہت زیادہ تفاوت نہیں پایا جاتا تھا، پھر اگر دیکھا جائے تو نانا جان کے بڑے بیٹے ماموں محمد خان اور دادا جان کی بڑی بیٹی زینب کی عمروں میں سات آٹھ سال سے زیادہ کا فرق نہیں تھا۔ میرے حساب سے نانا جان نے نوے برس یا شاید اس سے دو چار سال زیادہ عمر پائی تھی۔ آپ کی پیدائش ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ کی تھی۔ اگر تصور کر لیا جائے کہ نانا جان کی عمر ۱۹۴۴ء میں ایک سو بیس برس تھی تو پھر ماننا پڑے گا کہ جب آپ کا پلوٹھی کا بیٹا محمد خان ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوا تو آپ کی عمر ۵۸ سال تھی۔ ان کی شادی جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی اور پہلے بچے کی پیدائش کے وقت نانا جان کی عمر شاید ہی تیس سال کی رہی ہو گی۔

میں نے جس زمانے میں نانی کو دیکھا وہ سکڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نانا جان نے اس کو اغوا کیا تھا یا یہ کہ وہ خود گھر سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئی تھی۔ خدا جانے اصل حقیقت کیا تھی۔ نانی کے تعلقات اپنے میکے

کے ساتھ ساری عمر منقطع رہے۔ برسوں بعد، جب ہم راولپنڈی میں مقیم تھے، نانی کی ایک چچازاد بہن کے بیٹے محمود حسین نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کیا۔ میں ایک دفعہ چنگا بنگیال جانے کے لیے گوجر خان سے ایک بس میں سوار ہونا چاہتا تھا مگر بس بھر چکی تھی، اس لیے مجھے دوسری بس کا انتظار کرنے کو کہا گیا۔ جب پہلی بس چنگا پہنچی تو ایک عزیز مجھے لینے کے لیے بس کے اڈے پر آیا ہوا تھا۔ اس کو بس میں سوار ایک شخص محبوب غنی نے، جو بیول کا رہنے والا تھا، بتایا کہ اگر تم خالہ چنوں کے بیٹے کو لینے کے لیے آئے ہو تو وہ اگلی بس میں آ رہا ہے۔ اس شخص نے، جو مجھے اس سے قبل کبھی نہیں ملا تھا، میرے چہرے مہرے سے مجھے پہچان لیا تھا کہ میں اس کی خالہ کی آل اولاد میں سے ہوں۔

نانی چلنے پھرنے سے لاچار تھی اور سارا دن بستر پر بیٹھی یا لیٹی رہتی تھی مگر گھر بار میں اس کی سرداری قایم تھی۔ ہر بات اس سے اجازت لینے کے بعد کی جاتی تھی یہاں تک کہ اگر گھر میں پھل یا مٹھائیاں یا کوئی اور چیز لائی جاتی تھی تو اس کی تقسیم نانی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ باری باری سب بچوں کو اس کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا اور وہ ان کا حصہ ان کے حوالے کرتی تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ اس بارے میں جانبداری سے کام لیتی تھی، اس طرح کہ وہ اپنے بیٹے کی اولاد کو دوسرے بچوں سے زیادہ حصہ دیتی تھی۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ نانی ماموں احمد خان نسیم کے بچوں کو دوسری بار چپکے سے اپنے پاس بلا کر ان کو زاید حصہ دیتی تھی۔ مجھے یہ بات بہت بری لگی اور میں نے ایک روز اس کی دی ہوئی مٹھائی اس کے منہ پر دے ماری اور کہا کہ میں آیندہ اس ڈائن سے کچھ نہیں لوں گا۔ نانی کی تو سٹی اڑ گئی۔ ایک تین بالشت قد والے بونے لڑکے نے اس کی سرداری کو چیلنج کیا تھا۔ اماں کو بلایا گیا مگر نانی کی توقع کے برعکس اماں نے مجھے سزا نہ دی بلکہ نانی سے کہا کہ تمھاری جانبداری کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

آم کے موسم میں خالو جان کے گھر والے آم کے پودے پر اس قدر پھل لگتا تھا کہ سارا خاندان جی بھر کر کھاتا تھا۔ ہمیں قادیان میں رہتے ہوئے دو سال ہو چلے تھے۔ ایک روز آم کھاتے کھاتے ہمارا سب سے چھوٹا بھائی اسد اچانک بیمار ہو گیا۔ اس کو تین روز تک دست آتے رہے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا مگر افاقہ نہ ہوا اور چوتھے روز اس نے اماں کی جھولی میں لیٹے ہوئے دم توڑ دیا۔ اماں نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر بچے کی لاش کو چارپائی پر ڈال دیا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے مگر صبر کا ایسا عالم تھا کہ اماں کے منہ سے کوئی چیخ نہ نکلی اور کوئی واویلا نہ اٹھا۔ میں نے بڑے سے بڑے صدمے کے وقت اماں کو بے قابو ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آگے چل کر ہمارے چھوٹے بھائی رفیق احمد نے نہ صرف اسد کی جگہ لے لی بلکہ اس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر رفیق احمد اسد بن گیا۔

قادیان کی زندگی

قادیان کی زندگی کی جو تصویر میری یادداشت پر مرتسم ہے وہ ایک ایسے معاشرے کی ہے جس میں جماعتِ احمدیہ کی ذیلی تنظیمیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ مردوں کو عمروں کے اعتبار سے تین تنظیموں میں تقسیم کیا گیا تھا: سولہ سال کی عمر تک کے بچے ''مجلسِ اطفال الاحمدیہ'' میں شامل تھے۔ سترہ سے چالیس سال کی عمر تک کے جوان ''مجلس خدام الاحمدیہ'' میں منظّم تھے۔ اکتالیس سال سے بڑی عمر کے احمدی ''مجلس انصار اللہ'' کے ممبر تھے۔ عورتوں کی تنظیمات الگ تھیں۔ سولہ سال تک کی بچیاں ''ناصرات الاحمدیہ'' میں اور اس سے بڑی عمر کی مستورات ''لجنہ اماء اللہ'' میں شامل تھیں۔ مرکزی طور پر ان تنظیموں کے دفاتر قادیان میں تھے البتہ ہر جگہ، جہاں پر جماعتِ احمدیہ قایم تھی، اوپر بیان کردہ ذیلی تنظیمیں پائی جاتی تھیں۔ مقامی طور پر قادیان کے ہر محلے میں ان تنظیموں کی شاخیں قایم تھیں جن کی اپنی مجلسِ عاملہ ہوتی تھی جو ایک قاید کے تحت کام کرتی تھی۔ مرکزی طور پر ہر ذیلی تنظیم کا صدر ہوتا تھا۔ مقامی طور پر ہر مجلس دس دس افراد کے احزاب میں تقسیم تھی جو ایک ناظم حزب کے تحت ہوتی تھی۔ ہر حزب کی طرف سے مقامی مساجد میں نمازوں میں شامل ہونے پر حاضری لگتی تھی۔ ہر ماہ مقامی طور پر ایک دن فلاحی کام کے لیے منایا جاتا تھا جس کو ''وقارِ عمل'' کا نام دیا جاتا تھا۔ اس روز تمام ممبران مل کر کوئی اجتماعی خدمت، مثلاً: گلیوں کی صفائی یا سڑکوں کی مرمت، کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ اسی طرح ہر ماہ ایک دن تبلیغِ احمدیت کے لیے وقف ہوتا تھا، جس کے لیے ممبران کے گروپ گردونواح کے دیہات میں پھیل جاتے تھے اور وہاں کی مقامی آبادی کو تبلیغ کرتے تھے۔ ہمارے قادیان میں قیام کے دوران ایک تبلیغی پارٹی پر قادیان کے ایک نواحی گاؤں بھامڑی میں مقامی لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کیا اور بہت سے احمدی خدام کو زخمی کیا تھا۔ احمدی بھی نہتے نہیں تھے، کیونکہ ہر خادم کے لیے لازمی تھا کہ وہ ایک چھ فٹ کی لاٹھی اپنے پاس رکھا کرے۔ ابتداء میں خدام کی اپنی خاص وردی بھی ہوتی تھی، جو فوجی وردی کے مشابہ تھی، جس میں ایک طرف نیکر شامل تھی تو دوسری طرف پگڑی۔

میں جب جرمنی آیا اور یہاں پر میں نے نازی پارٹی کے طور طریقوں کا مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ جماعتِ احمدیہ کی ذیلی تنظیموں کا بلیو پرنٹ عین مین وہی تھا، جو جرمنی میں ہٹلر کی پارٹی کا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر ڈاکٹر خلیل احمد ناصر سے کیا، جب وہ ایک بار امریکہ سے میرے پاس ہمبرگ تشریف لائے تھے۔ وہ لمبے عرصے تک جماعتِ احمدیہ کے امریکہ میں مبلغ رہ چکے تھے۔ وہ ''خدام

الاحمدیہ'' کے بنیادی ممبروں میں سے تھے اور اس کی پہلی مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ یورپ کی فاشسٹ پارٹیوں، بالخصوص جرمنی کی نازی پارٹی، کا مطالعہ مرزا ناصر احمد نے، جو مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور جن کو ان کا جانشین بننا تھا، اپنے قیامِ یورپ کے دوران کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے خاص طور پر جرمنی گئے تھے جہاں کی ایک انڈسٹریل فیملی کروپ **(Krupp)** کا لڑکا ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ یہ فیملی نازی حکومت کی دستِ راست تھی۔ وہاں سے مرزا ناصر احمد جو لٹریچر ساتھ لائے تھے اس کا مطالعہ ''خدام الاحمدیہ'' کی مجلسِ عاملہ کے ہر ممبر کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔ یہ بات کچھ ایسی عجوبہ نہیں ہے کیونکہ علامہ مشرقی کی ''خاکسار تحریک'' بھی انھیں خطوط پر قایم کی گئی تھی۔ علامہ مشرقی نے البتہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ اصل بلیو پرنٹ انھوں نے تیار کیا تھا اور ہٹلر کو جرمنی میں ایک ملاقات کے دوران اپنی اسکیم سے آگاہ کیا تھا جس پر اس نے اپنی تنظیم بنائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاکساروں اور نازی پارٹی کے ورکروں کی قمیصیں ایک جیسی تھیں اور دونوں بیلچہ اٹھا کر مارچ کرتے تھے، جس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ وہ خدمتِ خلق کے لیے ہر وقت مستعد ہیں مگر ساتھ ہی اپنے دشمنوں کو یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ وہ بیلچے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

قادیان کے باسی مرزا محمود احمد کے ہاتھوں میں کٹ پتلیوں کی طرح تھے جن کو وہ جس طرح چاہتے نچا سکتے تھے۔ جماعتِ احمدیہ کے آرگن روزنامہ ''الفضل'' میں پہلے صفحے پر ''حضور ایدہ اللہ بنصرہ العزیز'' کی صحت کے بارے میں خبر چھپتی تھی جس میں اکثر ناسازیِ طبع کا ذکر ہوتا تھا۔ پورے سال کی اخباریں نکال کر دیکھیں تو نوے فیصد یہی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا کیموفلاج تھا۔ جو شخص دائمی بیمار ہو اس سے کوئی شخص توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ویسی جنسی فتوحات کی طاقت رکھتا ہے، جس کے الزامات اس پر لگائے جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف نے سات عورتوں کے ساتھ قانونی طور پر نکاح کیا اور عام طور سے ہمیشہ بیک وقت چار بیویاں رکھتے تھے۔ ہمارے قادیان میں قیام کے دوران امِ طاہر فوت ہوئیں، جو خلیفہ چہارم مرزا طاہر احمد کی والدہ تھیں، تو فوراً مرحومہ کی بھتیجی سے نکاح پڑھوا لیا جو آگے چل کر مہر آپا کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ اس نکاح کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنی پھوپھی کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں گی، جب کہ وہ پھوپھی کے بیٹے سے دو چار سال ہی بڑی تھیں۔ عام طور سے مرزا محمود احمد کہا کرتے تھے کہ ان عورتوں سے نکاح کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں تربیت دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ جماعت کی عورتوں کی تربیت کر سکیں۔ پتا نہیں کہ وہ یہ خدمت بجا لائیں یا نہیں انھوں نے مرزا محمود احمد کے اکیس یا بائیس بچوں کو ضرور جنم دیا، جن میں سے چند ایک کے ساتھ آگے چل

کر میری دوستی ہوئی، جس کا ذکر دوسری جگہ پر آئے گا۔

مرزا محمود احمد اپنے گھر کے پہلو میں واقع مسجد مبارک میں مغرب کی نماز کے بعد ''مجلسِ عرفان'' لگاتے تھے جس میں قادیان کے مومن شامل ہوتے تھے۔ میں بھی چند ایک بار گھر کے کسی بزرگ کی معیت میں وہاں پر گیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور نماز مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی تھی، جس کے بعد مرزا محمود احمد نمازیوں کی طرف رخ کر کے محراب میں اور سارے حاضرین ان کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے اب یاد نہیں ہے کہ ان محفلوں میں، جن میں میں شریک ہوا تھا، گفتگو کا موضوع کیا تھا، بس اتنا یاد ہے کہ ''مجلسِ عرفان'' عشاء کی نماز تک جاری رہتی تھی۔ نمازِ عشاء کی ادائیگی کے بعد گھر کے راستے میں گھپ اندھیرا ہوتا تھا۔ اس مجلس کی رپورٹ باقاعدگی کے ساتھ ''الفضل'' میں چھپتی تھی۔

ایک دفعہ میرا دوست فاروق میرے ساتھ گیا۔ ہم مغرب کی نماز سے بہت پہلے مسجد مبارک میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ مسجد کی چھت پر مرزا محمود احمد کے صاحبزادے اظہر احمد پتنگ اڑا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے پتنگ کو اتارنے کی کوشش کی اور جلد بازی کی وجہ سے پتنگ ایک مکان کے چھجے سے اٹک گئی۔ لگتا تھا کہ وہ مکان بھی ان کے خاندان کا تھا، جس کی طرف گھر کے اندر سے راستہ کھلتا تھا۔ وہ ہمیں کھڑا چھوڑ کر ادھر گئے۔ ان کی ڈور مسجد کے فرش پر بکھری پڑی تھی۔ وہاں پر میرے اور فاروق کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مرزا اظہر احمد اس دروازے سے اندر گئے، جس میں سے مرزا محمود احمد نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں آیا کرتے تھے۔ ان کے آنکھوں سے اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ فاروق نے جھپٹ کر ساری ڈور سنبھالی اور دم دبا کر بھاگ نکلا۔ میرے لیے یہ چیز بالکل غیر متوقع تھی اور میرا لوٹی ہوئی ڈور میں سے حصہ لینے کا ارادہ بھی نہ تھا۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فاروق کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاؤں۔ ہم ریتی چھلے تک پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بغیر دوڑتے چلے گئے۔ وہاں پر اندرونی شہر کی آبادی ختم ہوتی تھی اور باہر کے محلے شروع ہوتے تھے۔ وہاں پر پہنچ کر ہم نے سانس لیا اور میں نے فاروق سے کہا کہ یہ کام سراسر چوری کے مترادف تھا مگر اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی۔

قادیان میں بچوں کو پتنگ اڑانے کی اجازت نہ تھی اس لیے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ مرزا محمود احمد کا بیٹا مسجد میں کھڑا ہوا پتنگ اڑا رہا تھا۔ یوں تو پنجاب میں کھیلی جانے والی بہت سی کھیلیں قادیان میں کھیلی جاتی تھیں مگر وہاں پر بچوں میں دو ایسی کھیلیں بہت مقبول تھیں جو میں نے اس کے بعد کسی دوسرے شہر میں نہیں دیکھیں۔ پہلی کھیل کا نام پٹھو تھا، جس میں مقابلہ دو ٹیموں کے درمیان ہوتا تھا۔ ٹوٹے ہوئے گھڑے کی چھ سات چھوٹی چھوٹی گھڑی ہوئی ٹھیکریاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی جاتی تھیں، جن کو چند گز کے فاصلے سے ایک گیند کے ذریعے گرانا ہوتا تھا۔ اس بات کا فیصلہ، کہ کون سی ٹیم پہلے کھیلے گی،

ٹاس سے ہوتا تھا۔ دوسری ٹیم کے کھلاڑی، جن کو فیلڈ کرنی ہوتی تھی، ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے تھے کیونکہ ان کو گیند کیچ کرنا ہوتا تھا، جس کے ذریعے کھیلنے والی ٹیم کے کھلاڑی ٹھیکریوں کے مینار کو باری باری گرانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر کھلاڑی اتنی دیر تک کھیلتا تھا جب تک اس کا بال کیچ نہ کر لیا جاتا تھا۔ اگر کسی کھلاڑی کو ٹھیکریوں کا مینار گرانے میں کامیابی ہو جاتی تھی تو اس کی ٹیم کے ممبروں کو ٹھیکریاں جمع کر کے ایک دوسرے پر رکھنا ہوتا تھا اور اس سارے عرصے کے دوران ان کو گیند سے بچ کر رہنا ہوتا تھا جو دوسری ٹیم کے پاس ہوتا تھا اور جس کی کوشش ہوتی تھی کہ کھلاڑی ٹیم کے کسی ممبر کو گیند لگ جائے۔ اس دوران میں اگر کھلاڑی ٹیم کو ٹھیکریوں کا مینار مکمل کرنے میں کامیابی ہو جاتی تھی، تو وہ ''پٹھو'' کا نعرہ بلند کرتے تھے، اس کے بعد کھیل نئے سرے سے شروع ہو جاتا تھا جس میں کھلاڑی ٹیم کے ممبر باری باری مینار کو گرانے کی کوشش کرتے تھے۔

دوسری کھیل کا نام میروڈبا تھا، جس کی وجہ تسمیہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس کھیل کا نام گیند بلا بھی ہو سکتا تھا مگر کوئی اسے اس نام سے یاد نہیں کرتا تھا۔ عام طور سے مشہور تھا کہ وہ کھیل کسی احمدی مبلغ کی ایجاد تھا جس نے امریکی بیس بال کے کھیل میں رد و بدل کر کے اس کو اپنے ہاں کے ماحول کے مطابق ڈھالا تھا۔ (عین ممکن ہے کہ یہ کام مولوی محمد دین نے سرانجام دیا ہو، جو امریکہ میں مبلغ رہ چکے تھے اور وہاں سے واپسی پر تعلیم الاسلام ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر لگے تھے) میروڈبا میں بھی مقابلہ دو ٹیموں کے درمیان ہوتا تھا جس کے ممبروں کی تعداد پانچ سے دس تک ہو سکتی تھی۔ اس کھیل کے لیے عام طور سے ہاکی یا فٹ بال کی گراونڈ درکار ہوتی تھی، جس کے ایک سرے پر ایک لکیر کھینچی جاتی تھی، جس کے پیچھے اُس ٹیم کو کھڑا ہونا ہوتا تھا جس کی کھیل کی باری ہوتی تھی۔ اس لکیر کا خاتمہ ایک بڑے دائرے پر ہوتا تھا، جس میں ان کھلاڑیوں کو جانا ہوتا ہے جو اپنی کھیل کی باری بھگتا چکے ہوتے تھے۔ میدان کے دوسرے سرے پر ایک لکیر کھینچ کر ایک پول بنایا جاتا تھا، جس تک دوڑ کر جانا ہوتا تھا۔ جو کوئی اس لکیر کو ہاتھ لگا کر واپس لوٹ آتا تھا، بغیر اس کے کہ راستے میں اس کو دوسری ٹیم کا کوئی فرد گیند سے ضرب لگائے، تو اس کو دوبارہ کھیلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ فیلڈ کرنے والی ٹیم کے افراد سارے میدان میں پھیل جاتے تھے۔ ان کو گیند پکڑنا ہوتا تھا۔ جس ٹیم کی باری کھیلنے کی ہوتی تھی اس کے افراد کو باری باری ایک ڈنڈے سے گیند کو ضرب لگانی ہوتی تھی۔ گیند ان کے سامنے کھڑا، فیلڈ کرنے والی ٹیم کا ایک فرد، ہوا میں اچھالتا تھا۔ ہر کھلاڑی اپنی باری بھگتانے کے بعد گول دائرے کی جیل میں چلا جاتا تھا۔ اس کو دوبارہ کھیلنے کی اجازت صرف اس صورت میں ملتی تھی کہ وہ میدان کے دوسرے سرے پر بنائے ہوئے پول کو ہاتھ لگا کر واپس آ جائے۔ جب باری والی ٹیم کے سارے کھلاڑی جیل میں بند ہوتے تھے، تو فیلڈ کرنے والی ٹیم کے

دو کھلاڑی میدان کے دونوں سروں پر کھڑے ہو کر گیند کو ایک دوسرے کی طرف پھینکتے تھے۔ اس دوران میں باری والی ٹیم کے کھلاڑی کوشش کرتے تھے کہ گیند کی ضرب سے بچ بچا کر دوسرے سرے تک پہنچیں اور واپس لوٹیں۔ جس کو اس میں کامیابی ہو جاتی تھی اس کو نئے سرے سے کھیلنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اب وہ گیند کو زور سے ضرب لگا کر اس قدر دور پھینکنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی ٹیم کے افراد دوسرے سرے تک جانے اور واپس لوٹنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ کھیل کئی گھنٹوں تک جاری رہتا تھا۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول اور جامعہ احمدیہ کے طالب علم عصر کی نماز کے بعد ہاکی، فٹ بال اور والی بال کھیلتے تھے۔ گاہے بگاہے کبڈی کے بھی مقابلے ہوتے تھے۔ ہمارا مکان چونکہ کھیلوں کے میدانوں کے سامنے تھا اس لیے ہم بھی اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی نماز تک دارالعلوم محلے کے سارے میدانوں میں نوع نوع کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ مسجد نور کے پچھواڑے میں تالاب تھا جہاں پر باقاعدگی کے ساتھ پیراکی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس تالاب میں لڑکیاں بھی پیراکی سیکھتی تھیں۔ ان کے لیے خاص دن مقرر تھے۔ پھر ایک روز ایک لڑکی تالاب میں ڈوب گئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی کیونکہ وہ لڑکی اچھی خاصی پیراک تھی۔ پتا چلا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے چھوٹے بیٹے مرزا شریف احمد کی کنواری بیٹی امۃ الودود تھی۔ افواہ یہ تھی کہ وہ حمل سے تھی۔ دوسروں کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اس کو قتل کیا گیا تھا۔ یہی بات غلام رسول افغان کی بیٹی کے بارے میں مشہور تھی جو اس سے قبل قادیان کے ڈھاب میں ڈوب کر مری تھی۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ خوبصورتی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ اس کے بھائی عبدالکریم افغان سے میری دوستی کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

قادیان کے جن افراد کی یاد میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے، ان میں سے ایک مفتی محمد صادق تھے، جو مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص اصحاب میں سے تھے اور لمبے عرصے تک امریکہ میں مبلغ رہ چکے تھے۔ وہ ان معدودے چند احمدی مبلغوں میں سے تھے، جنھوں نے غیر ممالک میں قیام کے دوران اپنی تعلیم کو جاری رکھا تھا۔ مفتی صاحب نے یونیورسٹی آف شکاگو سے ڈاکٹر آف ڈیوینٹی کی اعزازی ڈگری حاصل کی تھی۔ امریکہ سے واپسی پر ان کو جماعتِ احمدیہ کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ سے مل کر کام کرنے کی ہدایت ملی تھی۔ چنانچہ وہ مسلم لیگ کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے ممبر چن لیے گئے تھے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور نوے برس کی عمر میں نئی شادی کی جس کی یادگار ایک بیٹا ہے۔ وہ بورڈنگ اسکول کے احاطے میں میجک لینٹرن کے ذریعے تصویریں دکھا کر لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں احمدیوں کو چند برس قبل سینما دیکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی مگر تصویروں کے ذریعے تبلیغ کے کام پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اب تو

جماعتِ احمدیہ نے ٹیلی ویژن کو دریافت کرلیا ہے اور دن رات چوبیس گھنٹے ان کا اپنا پروگرام جاری رہتا ہے۔ عام طور سے مفتی صاحب کے لیکچروں کا موضوع جماعتِ احمدیہ کی امریکہ میں تبلیغی مساعی کا بیان ہوتا تھا۔ تصویریں ان کے پاس زیادہ نہ تھیں اس لیے پندرہ بیس سلائیڈز کے سہارے پر وہ دو تین گھنٹوں کا لیکچر دیا کرتے تھے جس میں شرکت کے لیے سارا قصبہ ٹوٹ پڑتا تھا۔ ان کی تقریر سہل زبان میں سست روی سے چلتی تھی، جیسے کوئی شخص کسی تعلیمی ادارے میں علمی لیکچر دے رہا ہو۔

مغربی افریقہ کے ایک سابق مبلغ مولوی عبدالرحیم نیرؔ بھی، جو ہمارے محلے میں رہتے تھے اور جن کو میں صبح کے وقت چھڑی گھماتے ہوئے سیر کے لیے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا، میجک لینٹرن کے ذریعے لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا طریقِ بیان مفتی صاحب سے یکسر مختلف تھا۔ وہ بہت زور شور کے ساتھ بولتے تھے اور اپنے سامعین کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی مساعی سے گولڈ کوسٹ، جو آج کل گھانا کے نام سے جانا جاتا ہے، سیرالیون اور نائیجیریا کے ممالک کے ہزاروں باشندے احمدی ہو چکے ہیں۔ جب وہ مغربی افریقہ میں تھے تو ان کی بھیجی ہوئی رپورٹیں ''الفضل'' میں چھپتی تھیں جن میں یہ بیان ہوتا تھا کہ ہر مقام پر ان کا استقبال کرنے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑتی تھی اور ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد سب لوگ اجتماعی بیعت کر لیتے تھے۔ مرزا محمود احمد ان کی بھیجی ہوئی رپورٹوں کو اپنے خطبوں میں اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ مغربی افریقہ احمدیت کی گود میں آنے کے لیے بے قرار ہے۔ احمدیت کے پیروکاروں کے اعداد و شمار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی روایت خود بانیِ سلسلۂ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی جماعت کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ لاکھوں کو پہنچ چکی ہے، جب کہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری نے ثابت کیا تھا کہ جماعتِ احمدیہ کے ممبران کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ خلیفہ رابع مرزا طاہر احمد نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں دعویٰ کر دیا تھا کہ وہ پچھتر ملین کو پہنچ چکی ہے اور اس میں ہر سال سو فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا دو سال میں یہ تعداد ایک سو پچاس ملین ہو جائے گی، جو پاکستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ (اب تو وہ دو سو ملین کا دعویٰ کر رہے ہیں) جماعتِ احمدیہ کے سرکردہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہیں ہوا کہ ان کی اپنی جماعت کے ممبروں کے اعداد و شمار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی پالیسی احمدیوں کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو رہی، کیونکہ اس وجہ سے پاکستان میں ان کے دشمن ان پر غصہ کھاتے اور حملہ کرتے ہیں۔

میری قادیان کے زمانے کی یادوں میں دو بزرگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: پہلے نمبر پر میر محمد اسماعیل ہیں جو مرزا محمود احمد کے بڑے ماموں تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر تھے اور سول سرجن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ میں ان کو اپنے گھر سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

ان کا مکان دارالعلوم میں سڑک کے کنارے پر تھا جس کے دوسری طرف ایک ڈھاب تھی جس میں پانی کھڑا رہتا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی تھی جس میں نہایت عمدہ رنگ میں انھوں نے اپنی زندگی میں پیش آمدہ واقعات کو سبق آموز رنگ میں بیان کیا تھا۔ وہ میری زندگی کی پہلی آپ بیتی تھی جس کو میں نے خدا جانے کتنی بار پڑھا تھا۔ ان کی دوسری کتاب کا عنوان تھا: ''کر ــــ نہ کر''۔ اس میں تمام ایسی مکروہات کو جمع کر دیا گیا تھا جن سے مومن کو بچنا چاہیے اور تمام ایسے نیک کاموں کی فہرست بنا دی گئی تھی جن کے کرنے کی اسلام نے ترغیب دلائی ہے۔

دوسرے بزرگ کا نام مولوی شیر علی تھا جن کا مکان ریتی چھلہ کے قریب تھا۔ پرائمری اسکول کے پاس سے ایک گلی نکلتی تھی جو ان کے گھر کے پاس سے گزرتی تھی۔ اس گلی میں سے گزرتے ہوئے دسیوں بار میرا مولوی شیر علی صاحب سے آمنا سامنا ہوا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ ان کو پہلے سلام کروں مگر ہر بار وہ پہل کر جاتے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ قرآنِ کریم کا انگریزی ترجمہ کرنے کے کام پر مامور ہیں۔ میں ان کے لباس کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ دیسی لباس میں ملبوس پینڈو شخص کیونکر انگریزی جانتا ہے۔ سنا تھا کہ انھوں نے اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ دی تھی تاکہ وہ آپ کو خدمتِ دین سے نہ روک سکے۔ وہ ترجمے کے سلسلے میں کئی برس تک انگلستان میں مقیم رہ چکے تھے۔ ان کا ترجمہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے بدستور شایع کیا جاتا ہے اور بعض یورپی زبانوں میں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے شایع کیے جانے والے تراجمِ قرآنِ کریم اسی ترجمے کا چربہ ہیں۔ مگر دلچسپ چیز یہ ہے کہ اُن تراجم پر مترجمین کے نام نہیں دیے جاتے، جو اکثر صورتوں میں غیر مسلم تھے، جن کی خدمات دوسری عالمگیر جنگ کے دوران لندن مشن کے ذریعے ٹرانسلیشن بیورو کو معاوضہ دے کر حاصل کی گئی تھیں۔ البتہ ٹائٹل پیج پر چھپتا ہے کہ ترجمہ امامِ جماعتِ احمدیہ کی زیرِ نگرانی تیار کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کا نام لکھا ہوتا ہے اس لیے لوگ یہ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ موصوف نے ترجمہ بذاتِ خود کیا تھا۔

مرزا محمود احمد نے ۱۹۴۴ء میں اعلان کیا کہ بانیِ سلسلہِ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیشگوئی، جو موصوف نے ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کو ایک اشتہار میں شایع کی تھی اور جس میں ایک مصلح موعود کے آنے کی خبر دی گئی تھی، ان کی ذات میں پوری ہوگئی ہے۔ اس بارے میں وہ ایک عرصے سے قسطوں میں دعوے کرتے آئے تھے، جس کی مخالفت کئی ایک لوگوں کی طرف سے ہوتی رہی تھی۔ دادا جان نے بھی احمدیت سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے اس چیز کا حوالہ دیا تھا۔ مرزا محمود احمد اپنے مصلح موعود ہونے کے بارے میں اعلان کرنے کے لیے خاص طور پر لاہور سے قادیان آئے تھے، جب کہ ان کی بیوی ام طاہر اپنی آخری جان لیوا بیماری میں مبتلا تھی اور ایک ہسپتال میں پڑی تھی۔ قادیان کے چھوٹے بڑے

سب لوگ اس میں شامل ہوے۔ میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ ہر سال ۲۰ فروری کو عام چھٹی ہوتی تھی اور سب لوگوں کو ''جلسہِ مصلح موعود'' میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ قادیان کی زندگی میں جلسوں کا بہت اہم کردار تھا جو آئے دن برپا کیے جاتے تھے۔ اکثر جلسے مسجدوں میں ہوتے تھے۔ یوں بھی قادیان کی زندگی میں مسجدیں مرکزی مقام رکھتی تھیں۔ جملہ احمدی مرد نمازوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، کیونکہ ان کی حاضری لگتی تھی اور نماز باجماعت میں شامل نہ ہونے والوں کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد نور میں نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآنِ کریم ہوتا تھا جس میں مرزا محمود احمد کی ''تفسیرِ کبیر'' کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد درسِ حدیث ہوتا تھا، جب کہ مغرب کی نماز کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریرات میں سے کوئی اقتباس پیش کیا جاتا تھا۔ باجماعت نمازوں میں حاضری کے علاوہ مجلس اطفال اللہ، مجلس خدام اللہ اور مجلس انصار اللہ کے الگ الگ جلسے ہوتے تھے۔ یہی حال عورتوں کی تنظیمات ناصرات احمدیہ اور لجنہ اماء اللہ کا تھا۔ ان کے بھی علیحدہ اجلاس ہوتے تھے۔ گویا قادیان کی پوری احمدی آبادی کو مسلسل مصروف رکھا جاتا تھا۔

جب ہم قادیان میں آکر مقیم ہوے تو اس وقت ماموں احمد خان نسیم کی عمر بتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ ان کا قد سات فٹ سے ایک دو انچ زیادہ تھا۔ جب وہ کسی مجمع میں کھڑے ہوتے تھے تو کسی جھنڈے کی طرح سب سروں سے اوپر نظر آتے تھے۔ وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے مدبر انسان تھے۔ سنا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں ہاکی اور والی بال کے بہت اچھے کھلاڑی رہ چکے تھے، مگر میں نے انھیں کھیلتے ہوے نہیں دیکھا۔ البتہ کبڈی کے میچوں میں ان کو ریفری بنایا جاتا تھا۔ ان کا بیٹا ناصر احمد خان، جو ادبی دنیا میں ڈاکٹر پرویز پروازی کے نام سے جانا جاتا ہے، مجھ سے سال بھر چھوٹا ہے۔ وہ نانی کا لاڈلا تھا، جس کے سبب اس کی عادات بگڑی ہوئی تھیں۔ خالہ بیگم جی نے اس کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ وہ اکثر وقت ان کے ایپرن کو پکڑے ہوے ان کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی جو اس کے بستر پر اس کے ساتھ لگ کر سوتی تھی۔ اس کی ماں مامی رحمت بیگم نیک دل عورت تھی، جس کی گود میں اس زمانے میں چھوٹا بیٹا ہادی احمد خان تھا، جو میرے چھوٹے بھائی رفیق احمد کا ہم عمر اور سنگی تھا۔

بھائی نصیر اگرچہ عمر میں مجھ سے چھ سال بڑا تھا مگر اسکول میں وہ مجھ سے صرف دو کلاسیں آگے تھا۔ وہ اپنی جسمانی کمزوری کے سبب ہمارے ساتھ کسی قسم کی کھیل کود میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک روز، جب کہ وہ مسجد نور کے بیرونی تھڑے پر کھڑا ہوا اذان دے رہا تھا، کسی شرارتی لڑکے نے اسے پیچھے سے دھکا دیا اور وہ دو گز نیچے گلی میں گر گیا۔ اس کو بہت چوٹیں آئیں مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس کے دائیں بازو کی کہنی اتر گئی، جس کو کوئی ڈاکٹر درست نہ کر سکا۔ اس طرح نصیر بہت دنوں تک

بازو کو گلے میں لٹکائے ہوئے پھرتا رہا۔ لکھنا تو اس کو پہلے سے دشوار گزرتا تھا اب یہ کام بالکل بند ہو گیا۔ ایک روز جب کہ ہماری ٹولی گھر کے سامنے شاٹ پٹ کا آپس میں مقابلہ کر رہی تھی جس کے لیے ہم نے ایک اینٹ چن رکھی تھی۔ قیوم کی باری تھی اور وہ اینٹ کو پھینک چکا تھا جب عین اس لمحے میں اچانک نصیر اپنے خیالات میں مگن ہمارے پاس سے گزرا۔ اینٹ اس کو پیچھے سے اس کہنی پر لگی جو گرنے کے سبب ٹلی ہوئی تھی۔ اینٹ لگتے ہی اس کی کہنی اپنی قدرتی جگہ پر آ گئی اور نصیر کی بیماری کا مداوا ہو گیا۔

نصیر کی لکھائی میرے شاعر دوست ذی شان ساحل جیسی تھی، جو جسمانی طور پر نصیر کی طرح معذور ہے البتہ اس کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا اور وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ چونکہ اس کو لکھنا دشوار گزرتا تھا اس لیے وہ اکثر زبانی امتحان دیا کرتا تھا۔ اسکول میں مرزا محمود احمد کا بیٹا مرزا حنیف احمد، جس کے ساتھ میری دوستی ربوہ کے زمانے میں جا کر ہوئی، اس کا کلاس فیلو تھا۔ ابا جی کو نصیر کے بارے میں ایک ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اس کو اسکول سے اٹھا لیا جائے کیونکہ پڑھائی کے بوجھ کے سبب اس کی جسمانی ترقی رکی ہوئی ہے۔ یہ فیصلہ سراسر غلط تھا۔ نصیر کو آٹھویں کلاس سے اٹھا لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے طور پر اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ ہم بہن بھائیوں کی کورس کی کتابیں وہ ہم سے پہلے پڑھ جاتا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''پیٹر بجسل: کہانیاں، افسانے، خطبات، بوطیقا'' کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

''اس کا (پیٹر بجسل) کہنا ہے کہ ''قاری روگی ہوتے ہیں۔ قاری ہر چیز کو پڑھنے والے ہوتے ہیں۔'' بھائی نصیر بھی روگی تھا۔ وہ ہر چیز کو پڑھتا تھا، حتیٰ کہ زمین پر گرے ہوئے کاغذ کو بھی اٹھا کر پڑھتا تھا۔ میں کسی شخص کو نہیں جانتا ہوں جو اس جیسا روگی قاری ہے۔ وہ ہر کتاب اور ہر اخبار اور ہر رسالے کو اوّل سے آخر تک پڑھتا تھا۔ شہر کی کوئی لائبریری اس کی دسترس سے باہر اور اس سے محفوظ نہ تھی۔ ہم بہن بھائیوں کی کورس کی کتابیں بھی وہ بلا تکان پڑھ گیا اور اس دوران میں کئی زبانوں کا ماہر بن گیا۔''

بھائی نصیر اردو، عربی، فارسی اور انگریزی چاروں زبانیں بخوبی جانتا تھا۔ کتابوں کا تو وہ جنونی قاری تھا۔ میں نے پیٹر بجسل کی کتاب کا پیش لفظ ان الفاظ سے شروع کیا تھا:

''پیٹر بخسل کے ساتھ میرا تعارف اس کی کہانی ''غیر معمولی یادداشت والا شخص'' کے ذریعے ہوا، جس میں ایک شخص ریلوے ٹائم ٹیبل کو زبانی یاد کر لیتا ہے اور ہر گاڑی کے بارے میں مکمل معلومات دے سکتا ہے۔ میں یہ کہانی پڑھ کر حیران ہوا تھا کہ پیٹر بخسل کو میرے بھائی نصیر الدین احمد کا کیسے پتا تھا۔ بھائی نصیر نئے ٹائم ٹیبل کے نکلنے پر اس کو لینے کے لیے گھر سے پیدل چل دیتا تھا اور کم و بیش سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ریلوے اسٹیشن سے ٹائم ٹیبل کی کتاب کو، جو اس زمانے میں ایک روپے میں بکتی تھی،

لا کر پہلے صفحے سے پڑھنا یا شاید یاد کرنا شروع کرتا تھا اور آخری صفحے تک پڑھ جاتا تھا۔اس دوران میں کسی کو اس کتاب کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔رات کو وہ اسے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ جب وہ کتاب کو نگل چکنے کے بعد ہاتھ سے رکھتا تھا تو اسے ہر گاڑی کے بارے میں پتا ہوتا تھا کہ وہ کب چلتی ہے اور کب کس اسٹیشن پر پہنچتی ہے اور کس روز ناغہ کرتی ہے اور اس کا ملاپ کس جنکشن پر کس ٹرین کے ساتھ ہوتا ہے۔مگر بھائی نصیر کہانی کے ہیرو کی طرح ریلوے اسٹیشن پر نہیں گھومتا پھرتا تھا اور نہ ہی اس انتظار میں رہتا تھا کہ کوئی اس سے گاڑیوں کے وقت کے بارے میں پوچھے۔وہ ٹائم ٹیبل کو ہضم کر لینے کے بعد کسی دوسری یاد کیے جانے کے قابل کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔اسے کتابوں کے حوالے اس طرح یاد تھے کہ وہ صفحے کا نمبر اور، اگر پوچھا جاتا تو، شاید لائن تک بتا سکتا تھا۔ مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی تھی جب یہ خبر ملی کہ بھائی نصیر قرآن حفظ کر رہا تھا۔"

قادیان کے زمانے کی ایک دکھی عورت کی یاد آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔اس کا نام میں بھول چکا ہوں مگر اس کے دکھ کو میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ ہمارا اس کے ہاں آنا جانا تھا۔میری خالہ زاد بہن صغریٰ کی شادی اس کے ایک عزیز کے ساتھ ہوئی تھی۔وہ پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں معطل کیے جانے والے میجر جنرل نذیر احمد کی خالہ تھی اور ایک وسیع وعریض صحن والے مکان میں اکیلی رہتی تھی۔اس کا ایک ہی بیٹا محمد اسلم تھا، جو بی اے کر چکا تھا۔ہم اس کے گھر جایا کرتے تھے اور خرگوشوں سے کھیلتے تھے، جنھوں نے اس کے صحن میں لمبی چوڑی سرنگیں بنا رکھی تھیں۔ میں نے اس کے بیٹے کو نہیں دیکھا مگر سن رکھا تھا کہ وہ بہت تنومند اور خوبرو جوان تھا۔باپ کے اچانک وفات پا جانے کے صدمے نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا کہ وہ پاگل ہو گیا۔طبی مشورے کے تحت اس کو کشمیر بھیج دیا گیا تا کہ معتدل آب وہوا میں کچھ ماہ بسر کرے مگر وہاں پر قیام کے دوران ایک روز وہ اپنے جسم کے کپڑے پھاڑ کر بازار میں نکل گیا۔اس کو تلاش کرنے کی ساری کوششیں بے سود رہیں۔اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اگر بیٹا اس کے پاس رہتا تو وہ یقیناً ٹھیک ہو جاتا۔ اسکو یہ دکھ تھا کہ کون جانے اس کا لال کس ویرانے میں ننگا دھڑنگا پھر رہا ہوگا۔اسکے بعد سالہا سال تک، جب بھی مجھے سڑک پر کوئی ننگا پاگل گھومتا پھرتا نظر آتا تھا، تو میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کہیں اس دکھی عورت کا بیٹا محمد اسلم نہ ہو۔

خالو جان کے گھر پر دو تین مہینوں کے وقفے کے بعد ایک بوڑھا نانا جان کی "زیارت" کے لیے آیا کرتا تھا۔اس کا نام بابا عزیز مغل تھا۔وہ بھڈانہ کا رہنے والا تھا، جو گوجر خان سے ہمارے گاؤں چنگا بنگیال جانے والی سڑک پر راستے میں آتا ہے۔وہ میرے دادا جان کے ذریعے احمدی ہوا تھا اور بیسویں صدی کی پہلی یا دوسری دہائی میں اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ کر قادیان میں آن بیٹھا تھا۔اس کو دو وقت کی

روٹی لنگر خانے سے مل جاتی تھی اور سر چھپانے کے لیے مہمان خانے میں اسے ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ ہم بچوں کو اس زمانے میں یہ دیکھ کر حیرت ہوا کرتی تھی کہ اس کی پنڈلیوں کے گرد کپڑے کی لیریں لپٹی ہوتی تھیں، جن کو وہ کس کر باندھے ہوتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے سمجھ آئی کہ اس کی ٹانگوں کی رگوں میں خون جمع ہونے کے سبب خون کی گردش میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ نانا جان کے ساتھ اپنی مادری پٹھوہاری زبان میں بات کرنے کے لیے آتا تھا۔ ہمارے گھر پر سوائے خالو جان کے باقی سب افراد پٹھوہاری بولتے تھے مگر اب یہ سلسلہ اگلی نسل میں ختم ہوتا نظر آ رہا ہے کیونکہ خاندان کے بیشتر بچے اس زبان سے ناواقف ہیں۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کساد بازاری زوروں پر تھی۔ نوجوانوں کو ملازمتیں نہیں ملتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے احمدی خاندان ہجرت کر کے قادیان آتے جا رہے تھے، جسکے سبب اس قصبے میں بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ملک میں جماعتِ احمدیہ کی مخالفت کا بازار گرم تھا، جسکی رہنمائی مجلسِ احرارِ اسلام کے ہاتھوں میں تھی۔ انکا مطالبہ تھا کہ جماعتِ احمدیہ کو غیر اسلامی جماعت قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جاتا تھا کیونکہ انھوں نے اس مطالبے کے حق میں بیانات دیے تھے۔ دوسری طرف خود احمدیوں کے اندر بے چینی پائی جاتی تھی۔ مرزا محمود احمد پر جنسی بے راہروی کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دس سالہ اسکیم بنائی گئی جس کو ''تحریکِ جدید'' کا نام دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ احمدیوں کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کیا جائے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدی نوجوان اپنی زندگی تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کریں۔ اس کام پر اٹھنے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جماعت کو چندہ دینا ہوگا، جس کے لیے ضروری ہوگا کہ احمدی سادہ زندگی کو اپنائیں اور ہر قسم کی لگژری کو ترک کر دیں۔ چندہ احمدیوں کو اس سے قبل بھی دینا پڑتا تھا، جس کی شرح ماہوار آمدن کا سولھوں حصہ تھا۔ اسکے علاوہ انکو وصیت کرنے کی تحریک کی جاتی تھی، جس کے تحت ان کو اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا کم سے کم دسواں حصہ صدرِ انجمنِ احمدیہ کے نام ہبہ کرنا اور دس فیصد ماہوار آمدن کا بطور چندہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ صرف ان لوگوں کو جماعتِ احمدیہ کے قبرستان ''بہشتی مقبرے'' میں دفن کیا جاتا تھا البتہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کے لیے استثنیٰ ہے کہ اسکا ہر فرد وصیت کے بغیر بھی وہاں پر دفن کیا جا سکتا ہے۔

''بہشتی مقبرہ'' کے حوالے سے بہت سی کہانیاں سننے میں آتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہاں پر کوئی بہشت نہیں پائی جاتی تھی۔ ''بہشتی مقبرہ'' مرزا غلام احمد کے ایک خاندانی قطعۂ زمین میں بنایا گیا تھا جہاں پر آس پاس آموں کے باغ تھے۔ اس اسکیم کا مقصد صدرِ انجمنِ احمدیہ کے لیے

مستقل جائیداد پیدا کرنا تھا، جس میں کچھ ایسی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس اسکیم کا اجراء ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک رسالہ بنامی ''الوصیت'' شایع کیا۔ ۲۰۰۳ء تک اس اسکیم کے تحت تیس ہزار احمدیوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ وصیت نامے باقاعدگی کے ساتھ جماعتِ احمدیہ کے اخباروں میں چھپتے ہیں، تاکہ اگر کسی کو ان میں بیان کردہ کوائف پر اعتراض ہو تو وہ اس چیز سے نظارتِ وصیت کو مطلع کرے۔ (گزشتہ ایک دو سال کے اندر خلیفہ خامس مرزا مسرور احمد نے دنیا بھر کے احمدیوں کو نظام وصیت میں شامل کرنے کی خاص تحریک چلائی ہے، جس کے تحت دور دراز ملکوں کے احمدیوں سے فارم بھروائے جارہے ہیں، اگر چہ ان کو قادیان یا ربوہ کے بہشتی مقبروں میں دفن کیے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شاید ایسے بہشتی مقبرے ان ملکوں میں بھی قایم کیے جارہے ہیں) میرے اندازے کے مطابق ان تیس ہزار موصیوں میں سے کم و بیش نصف نے اپنی وفات سے قبل اپنی وصیت منسوخ کردی تھی یا کسی اور وجہ سے ان کی وصیت منسوخ کر دی گئی تھی۔ دادا جان نے اس بارے میں ایک اعلان ہندوستان کے اخباروں میں چھپوایا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اس سلسلے میں ان کی طرف سے ادا کی جانے والی رقوم واپس کی جائیں۔ اس پر صدرِ انجمنِ احمدیہ نے کوئی کارروائی نہیں کی، البتہ جب اباجی کو اپنے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بنک سے قرض لینا پڑا، جس پر سود ادا کرنا پڑتا تھا تو صدرِ انجمنِ احمدیہ نے اباجی کی وصیت منسوخ کر دی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ احمدیوں کو سودی کاروبار کی ممانعت ہے۔ اس کے باوجود مجھے علم ہے کہ احمدی تاجر اور دوسرے لوگ بنکوں میں اپنی رقوم جمع کراتے اور بنکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے اور مکان تعمیر کرتے ہیں۔ گویا احمدی سود لیتے اور دیتے ہیں۔ اس چیز سے مرزا غلام احمد قادیانی کی نسل مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسکے باوجود انکو بہشتی مقبرے میں دفن کیا جاتا ہے۔

جب مرزا محمود احمد نے احمدیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کریں تو میں انھی دنوں میں پیدا ہوا تھا۔ اماں نے اپنے جوشِ خلوص میں میری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی، جیسے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ بیٹے کی زندگی کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ مجھے آگے چل کر اس خلوص کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اگر اماں کو اسلام کی خدمت کرنے کا جوش تھا تو انھیں اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اماں نے ساری عمر جماعتِ احمدیہ کی خدمت کی جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

وقفِ زندگی کی تحریک پر بہت سے نوجوانوں نے لبیک کہا۔ ان میں سے جن لوگوں کو قادیان میں آکر تبلیغِ اسلام کی تربیت لینے کو کہا گیا ان میں سے اکثر کالجوں کے گریجوایٹ تھے۔ ان کو جامعہِ احمدیہ میں داخل کیا گیا، جس کا ہوسٹل ہمارے گھر کے قریب پرائمری اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے درمیان

تھا۔ہم ان کوعصر کی نماز کے بعد مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر ان کوایک وفد کی صورت میں انگلستان بھیجا گیا۔قادیان کے اکثر باسی ان کوالوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے، میں بھی ان میں شامل تھا۔وفد کے ممبران اچکن،سفید شلوار قمیص اور پگڑی پہنے ہوئے تھے۔ان کولندن میں کچھ عرصے تک قیام کرنے کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں جانا تھا۔اس وفد کے اراکین میں سے کچھ کے نام مجھے یاد ہیں: مشتاق احمد باجوہ (مبلغِ لندن)، شیخ ناصر احمد (مبلغِ سوئٹزرلینڈ)، چوہدری عبداللطیف (مبلغِ جرمنی)، حافظ قدرت اللہ (مبلغِ ہالینڈ)، محمد عثمان (مبلغِ اٹلی)، خلیل احمد ناصر (مبلغِ امریکہ)، ملک عطاء الرحمٰن (مبلغ فرانس)۔ان سب کے ساتھ مجھے برسوں کے بعد ملنے کا موقع ملا۔

قادیان کی زندگی میں شکار کی اہمیت مجھے آج تک یاد ہے۔چھوٹے بڑے سب لوگ پرندوں کا شکار کرتے پھرتے تھے۔جماعتِ احمدیہ کے چوتھے امام مرزا طاہر احمد کے پاس ایک چھرّے والی بندوق تھی جس کووہ اٹھائے اکثر گھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔بھائی جان محمد احمد نعیم بھی اپنے ایک دوست عمر حیات کوساتھ لیے ہوئے فاختائیں درختوں سے اتارتے پھرتے تھے۔ماموں احمد خان نسیم کے پاس ڈبل بیرل والی بندوق تھی اور وہ عام طور سے اڑتی ہوئی مرغابیوں کونشانہ بناتے تھے۔بچوں کے پاس غلیلیں ہوتی تھیں اور وہ چڑیوں کی جان کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔مجھے ابا جی نے میری فرمائش پر ایک غلیل بنوا کر دی جوایک ہفتے سے زیادہ ہمارے پاس نہ رہی۔میرا چھوٹا بھائی قیوم اسکواٹھائے ہوئے باہر گلی میں کھڑا تھا کہ وہاں سے دونوجوانوں کا گزر ہوا،انھوں نے جھپٹا مار کر غلیل چھین لی اور بھاگ گئے۔

جب جنگ کے خاتمے پر ابا جی کی رزمک سے راولپنڈی تبدیلی ہوئی تو یہ طے پایا کہ ہمیں وہاں پر رہائش اختیار کرنی چاہیے۔ابا جی ہمیں لینے کے لیے قادیان آئے تو ایک روز ''الفضل'' کے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے، جسکے وہ مستقل خریدار تھے،انھوں نے چاہا کہ اپنا نیا ایڈریس وہاں پر دے دیں تاکہ آیندہ پرچہ اس پتے پر بھیجا جائے۔میں بھی ابا جی کے ساتھ تھا۔ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔متعلقہ کارکن نے ابا جی سے ان کا خریداری نمبر جاننا چاہا جوانکے پاس نہیں تھا۔کارکن نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اسکوابا جی کا پتا تلاش کرنے کے لیےخریداروں کی مکمل فہرست دیکھنی پڑے گی،بہتر یہ ہے کہ ابا جی واپسی پر اخبار کے اوپر لگی ہوئی پتے کی چٹ بھیج دیں،اس طرح آسانی کے ساتھ پتا تبدیل ہوسکے گا۔ہم مایوس ہوکر کارکن کے دفتر سے باہر نکلے۔ہمیں صحن میں سے گزر کر بیرونی دروازے تک جانا تھا۔صحن میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خریداروں کے پتوں کی بہت سی چٹیں فرش پر گری پڑی تھیں۔میں نے یونہی جھک کر ایک چٹ اٹھالی جواتفاق سے ابا جی کے نام کی چٹ

تھی اور جس پر ان کا خریداری نمبر بھی درج تھا۔ ہم وہ چٹ لے کر کارکن کے دفتر میں گئے اور چند منٹوں کے اندر نیا پتا درج کر لیا گیا۔

مجھے شروع سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا، جس کی گواہی میرے بچپن کے دوست سمیع اللہ قریشی نے ذیل کے الفاظ میں دی ہے: ''منیر اور میری پڑھائی کے رویوں میں اگر کوئی فرق تھا، تو صرف یہ کہ وہ الم غلم کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ نصاب کی کتابیں بھی بری طرح چاٹ جاتا تھا اور سوادِ خط اس کا اس زمانے میں بھی ایسا عمدہ، پختہ اور نظر نواز تھا کہ استاد شاباشیاں دیتے تھکتے نہ تھے۔ سو وہ بہت کم مار کھاتا تھا۔ بس ذرا ریاضی میں اس کی کنی دبتی تھی۔ ادھر اپنا یہ حال تھا کہ قصے، کہانیاں گھر اور مدرسے میں بستے میں چھپا کر رکھتے تھے اور انھیں کو چاٹتے رہتے تھے۔ نصاب سے رشتہ کم ہی استوار ہو پاتا تھا اس لیے شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا جب مار نہ کھاتے ہوں۔ کان اور ہتھیلیاں اکثر سرخ ہی رہا کرتی تھیں۔ الف لیلہ کا ایک سڑا بسا بدخط نسخہ، جو پورا تھبّے کا تھبّا تھا اور جس میں قلم سے بنائی ہوئی ایسی تصویریں بھی ہوتی تھیں جو اس وقت تو کچھ حیران ہی کیا کرتی تھیں، ہاں مگر جب ہم دونوں عنفوانِ شباب کو پہنچنے کو ہوئے تو وہ تصویریں پھر یاد آنے لگیں اور ان کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مزیدار معنی بھی سمجھ میں آنے لگے۔ قصبے کی لائبریری کے انچارج حکیم غلام حسین ہم پر ترس کھا کر جس کتاب پر ہم ہاتھ رکھ دیتے تھے دے دیا کرتے تھے۔ پتا نہیں چھٹی جماعت تک آتے آتے ہم نے کیسی کیسی کتابیں دیکھ لیں کہ اب سوچنے پر لگتا ہے کہ ہم دونوں پر بچپن تو شاید آیا ہی نہ تھا، بس کچھ جوانی ضرور آئی مگر پھر بڑھاپے کا سلسلہ دراز ہوا تو کچھ ایسا کہ اب تک ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اب یہ کہہ دینے میں شاید کچھ حرج نہیں کہ میں اور منیر غالباً پیدائشی بوڑھے ہیں۔ سچ ہے یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔'' (''یحییٰ فضلی عرف ڈاکٹر منیر الدین احمد'' از پروفیسر سمیع اللہ قریشی)

قادیان کے مذہبی ماحول میں شعروشاعری کچھ دبی دبی رہتی تھی اگرچہ یہ ضرور تھا کہ ہر جلسے میں تلاوتِ قرآن کے بعد تقریروں سے پہلے نظم خوش الحانی کے ساتھ سنائی جاتی تھی، بس ذرا نظموں کا انتخاب محدود تھا۔ عام طور سے مرزا غلام احمد قادیانی کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ موصوف نے اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں نظمیں کہی ہیں، جو ادبی معیار کے اعتبار سے اوسط درجے کی ہیں۔ ان کی بیٹی مبارکہ بیگم البتہ اچھی شاعرہ تھیں مگر جماعتِ احمدیہ میں ان کے بھائی مرزا محمود احمد کے کلام کو ترجیح دی جاتی تھی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی تھی۔ البتہ ان کے اصل استاد قاضی ظہور الدین اکمل تھے، جن کا بیٹا شبلی بی کام ملک کے صحافتی حلقوں میں شہرت رکھتا تھا۔ میرے بچپن کے زمانے میں قادیان میں مصلح الدین راجیکی کی عشقیہ نظمیں انڈر گراؤنڈ میں سننے کو مل جاتی

تھیں، جواختر شیرانی کی رومانی نظموں کا چربہ تھیں۔ان کی نظموں میں بھی ایک سلمیٰ پائی جاتی تھی جس کے بارے میں ہم قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے کہ وہ کون لڑکی ہوگی۔انکا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

منحصر ہے ایک نظر پہ جان و دل کا فیصلہ
کون کرتا ہے محبت عہد و پیماں دیکھ کر

اس زمانے میں ظہور نظر بھی قادیان میں مقیم تھا اور مشقِ سخن کر رہا تھا۔ثاقب زیروی کو میں نے پہلی بار جماعتِ احمدیہ کے سالانہ جلسے کے اسٹیج پر نظم پڑھتے ہوے دیکھا۔اسی سال اس کی کتاب ''شاہنامہِ احمدیت'' چھپی تھی جو حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' کی طرز پر لکھی گئی تھی۔ثاقب زیروی اپنے مخصوص لحن سے جلسے پر چھا گیا۔اسکے بعد ہر سال اس کو مرزا محمود احمد کی تازہ نظم پڑھ کر سنانے کا اعزاز ملنے لگا۔سالہا سال کے بعد جب ہماری آپس میں دوستی ہوئی تو اس نے ایک بار کہا: ''یار مجھے حضرت صاحب کی پھیکی نظم پڑھنی پڑتی ہے۔اگر نہ پڑھوں تو وہ مجھے اپنی نظم سنانے سے روک دیں گے۔''

میرے لیے وہ زمانہ ابھی بچوں کے رسالے پڑھنے کا تھا، جو مجھے قادیان میں میسر نہ تھے مگر گرمیوں میں مدرسے کی تعطیلات اپنے آبائی گاؤں چنگا بنگیال (تحصیل گوجر خان) میں گزارا کرتے تھے، وہاں پر میرے تایا (عبدالرحمٰن خان) مدرسے کے ہیڈ ماسٹر تھے۔چونکہ گاؤں میں چھٹیاں ربیع اور خریف کی فصلوں کے موقعے پر سال میں دو بار ہوتی تھیں اس لیے جب ہم قادیان سے گرما کی چھٹیوں میں گاؤں میں آتے تھے تو مدرسے میں کلاسیں لگ رہی ہوتی تھیں۔جو چیز میرے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث تھی وہ یہ تھی کہ عمو جان کے گھر پر محکمہِ تعلیم کی طرف سے مدرسے کے لیے لگوائے جانے والے بچوں کے رسالوں کے سال بھر کے شمارے موجود ہوتے تھے، جن میں سے مجھے ''پھول'' اور ''تعلیم و تربیت'' کے نام اب تک یاد ہیں۔میں اور بھائی نصیر ان رسالوں کو اوّل سے آخر تک اور بعض اوقات دو تین بار پڑھا کرتے تھے۔

چنگا مسلمانوں کا گاؤں تھا، جہاں پر صرف ایک سکھ دکان کرتا تھا۔اس کا نام ملوک سنگھ تھا، جس کا ذکر میرے افسانے ''ملوک سنگھ کا پوتا'' میں ذیل کے الفاظ میں آتا ہے:

''مجھے ملوک سنگھ خوب یاد تھا۔اس کی دکان ہمارے گھر کے قریب واقع تھی۔ڈاک خانے کا انتظام اسکے سپرد تھا۔جب ہم گرمیوں میں مدرسے کی تعطیلات گزارنے چنگا جایا کرتے تھے تو اکثر مجھے سودا سلف لانے کے لیے اسکی دکان پر بھیجا جاتا تھا۔ملوک سنگھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔اگر ڈاک آچکی ہوتی تھی تو ہمارے گھر کی چٹھیاں میرے حوالے کرتا تھا یا کہتا تھا تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ، بس ڈاک آتی ہی ہوگی۔پھر کوئی اخبار یا رسالہ نکال لیتا تھا اور اس میں سے پڑھ کر سنانے کو کہتا تھا۔

اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں ابھی بجلی نہ آئی تھی ۔ ریڈیو کسی گھر میں نہ پایا جاتا تھا۔ٹرانسسٹر ریڈیو تو بہت بعد میں جا کر بننے لگے۔گاؤں میں خبریں بہت دیر سے پہنچا کرتی تھیں اس لیے جو کوئی شہر سے آتا تھا اس سے ''نویں تازی'' خبریں سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی ۔ یہ دوسری عالمگیر جنگ کے دنوں کی بات ہے،جسکو دیہاتی لام کے نام سے جانتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے بھی بہت سے جوان بھرتی ہو کر لام پر گئے ہوے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کو خط لکھتے یا لکھواتے تھے،اس لیے ان دنوں میں بہت سی ڈاک آیا کرتی تھی اور ملوک سنگھ کی دکان پر اچھی خاصی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ مرد دکان کے اندر جا کر بیٹھتے تھے اور عورتیں باہر تھڑے پر بیٹھتی تھیں۔ملوک سنگھ مجھے اکثر خط پڑھ کر سنانے کیلیے روک لیا کرتا تھا۔اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں بہت کم لوگوں کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ڈاک کھلنے پر سارے خط باری باری بلند آواز میں پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔لوگوں کا ایک دوسرے سے کوئی راز نہ تھا۔خطوں میں ایک سی باتیں ہوتی تھیں،جو اکثر اس فقرے پر جا کر ختم ہوتے تھے "سب سننے والوں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا"۔

ملوک سنگھ چنگا سے اڑھائی میل دور واقع گاؤں قاضیاں کا رہنے والا تھا اور موسم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو،موسلا دھار بارش برسے، جھکڑ آئے یا بے پناہ سردی پڑے (ہمارے ہاں کبھی کبھی پوہ کے مہینے میں برف باری بھی ہو جاتی تھی) وہ بلا ناغہ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر پہنچ جاتا تھا۔اسے گاؤں میں برادری کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا۔کسی گھر میں ماتم ہو جائے یا شادی کا موقع ہو،ملوک سنگھ کو ضرور بلایا جاتا تھا۔ اسے ہر چیز میں برابر کا شریک سمجھا جاتا تھا۔ان دنوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہندو مسلم فسادات کی خبریں آنے لگی تھیں۔ جب کبھی ملوک سنگھ کی دکان پر ان کا ذکر چل نکلتا تھا،تو لوگ کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر توبہ کرتے تھے اور اس بات کو قیامت کے قرب کی علامت قرار دیتے تھے کہ لوگوں کے دلوں سے محبت جاتی رہی تھی اور ان کا خون پتلا ہو گیا تھا۔ پھر ہر کوئی کہتا تھا کہ ہمارے علاقے میں، بالخصوص ہمارے گاؤں میں، ایسا ظلم نہیں ہوسکتا۔ چاچا شیر علی ایسے موقعوں پر اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا کرتا تھا کہ جو کوئی ملوک سنگھ پر ہاتھ اٹھائے گا اس کو شیر علی سے دو دو ہاتھ کرنے ہوں گے۔'' مگر جب ہندوستان کے بٹوارے کا اعلان ہوا تو ہمارے علاقے میں بھی ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ چل نکلا،ملوک سنگھ کو کسی نے قاضیاں جاتے ہوے راستے میں ہلاک کر دیا۔

راولپنڈی کی کہانیاں

مجھے پانچویں جماعت میں داخل ہوے ابھی تھوڑے دن ہی ہوے تھے کہ دوسری عالمگیر جنگ

کے خاتمے پر ابا جی کی تبدیلی رزمک سے راولپنڈی ہوگئی اور ہمارے خاندان کے یکجا ہونے کا امکان پیدا ہوگیا۔ ابا جی نے جنگ کا سارا عرصہ پاراچنار اور رزمک میں گزارا تھا، جو جلاوطنی کے مترادف تھا۔ بالخصوص رزمک میں، جو افغانستان کی سرحد ڈیورنڈ لائن کے قریب واقع ہے، جہاں پر پٹھان قبائلی سارا سال حکومتِ برطانیہ کے ساتھ لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ انکے سرداروں کو حکومت کی طرف سال کے سال نقدی اور انعامات ملتے تھے تاکہ وہ امن کو قایم رکھیں، جسکے لیے وہ ذمہ دار قرار دیے جاتے تھے مگر اسکے باوجود اس علاقے میں آئے دن آزاد علاقے کے قبائلیوں اور فوج کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ سرکار کا حکم صرف پختہ سڑک پر چلتا تھا۔ اگر وہاں پر کوئی واردات ہوتی تھی تو ملزموں پر سرکاری عدالت میں مقدمہ چلتا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ہونے والی وارداتوں پر برطانوی قانون لاگو نہ ہوتا تھا۔ ابا جی بتاتے تھے کہ رزمک آنے جانے کے لیے فوج کی گاڑی میں سفر کرنا ہوتا تھا، جسکی حفاظت کی خاطر آگے اور پیچھے فوجیوں کے بکتر بند دستے جاتے تھے۔ رزمک میں ملازمین کو سارا وقت قلعے کے اندر گزارنا ہوتا تھا۔ فصیل سے باہر نکلنا خطرناک تھا۔ وہاں کی زندگی قید خانے میں بند ہونے کے مترادف تھی جس سے ہر کوئی جان چھڑانے کی فکر میں رہتا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر چونکہ ہندوستان پر افغانستان کے راستے جرمن حملے کا خطرہ باقی نہ رہا تھا اس لیے فوجی دستے سرحد سے واپس بلا لیے گئے اور ابا جی کے محکمے کے لیے وہاں پر عملہ رکھنے کی ضرورت نہ رہی اس لیے ابا جی کو ہیڈ آفس میں بلا لیا گیا جو راولپنڈی میں تھا۔

ابا جی نے راولپنڈی میں ایک مکان کرایے پر لیا اور ہمیں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لانے کے لیے قادیان پہنچ گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ۱۶ اکتوبر کو قادیان سے روانہ ہو کر رات کے پچھلے پہر راولپنڈی پہنچ گئے۔ اس وقت سارا شہر سو رہا تھا اس لیے یہ طے پایا کہ بقیہ رات ویٹنگ روم میں گزاری جائے۔ اتفاق سے ہمیں دو کشادہ صوفے سونے کے لیے مل گئے، جن پر سارا خاندان مل جل کر پڑ رہا۔ صبح سویرے ابا جی اسٹیشن کے ریستوران میں ناشتے کا آرڈر دے آئے۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی بھی وہاں سے آگیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے سورج چڑھ آیا تھا اور ہمارا رات والا قلی بھی ہمیں تانگے پر چڑھانے کے لیے آن پہنچا تھا۔ ابا جی نے تانگے والے سے کرایہ طے کیا اور ہم اپنے نئے گھر کے لیے روانہ ہوے۔

اس روز میں نے پہلی بار اپنی ہوش میں یہ چیز دیکھی کہ سڑکوں پر ٹریفک پولیس کے اشارے پر چلتی تھی، اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی کہ مریڑ چوک پر کھڑے ٹریفک کے سپاہی نے یہ کیسے جان لیا تھا کہ ہمیں کس سمت میں جانا تھا کیونکہ اس کے بازو کے اشارے پر ہمارا تانگہ رکا اور پھر اسی کے اشارے پر اس کے گرد گھوم کر ایک دوسری سڑک پر مڑ گیا تھا۔ یہ سڑک مری روڈ تھی اور ہمیں نارتھ سرکلر روڈ تک جانا

تھا، جو محلّہ چوہدری وارث خان میں مری روڈ سے نکلتی تھی۔ ہمارا مکان جھنگی محلے میں تھا۔ یہ جگہ اس مقام سے زیادہ دور نہ تھی جہاں پر میرے والدین اپنے پہلے قیامِ راولپنڈی کے دوران رہائش پذیر رہ چکے تھے ۔میری اور میرے بھائی عبدالقیوم کی پیدایش وہیں کی تھی۔ چنانچہ پہلے ہی روز اباجی ہمیں اپنے ایک واقف کار بابو کالے خان کے گھر لے گئے، جو اسٹیشن ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوے تھے اور اپنے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ان کا پوتا نثار مجھ سے دو یا تین جماعتیں اوپر تھا اور آیندہ دنوں میں ہمارے بہت کام آیا۔

راولپنڈی اس زمانے میں ایک متوسط درجے کا شہر تھا جس کی آبادی تقسیمِ ملک سے قبل تین لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ فوج کا وہاں پر کمانڈ کا ہیڈکوارٹر ہونے کے سبب چھاؤنی اچھی خاصی تھی، جس میں انگریزوں کی بڑی تعداد رہتی تھی۔ صدر گویا ان کے لیے اور فوج کے افسروں کے لیے مخصوص تھا، جب کہ شہر ہندوستانی آبادی کا علاقہ تھا، جہاں پر ہندو، مسلمان اور سکھ رہتے تھے۔ اکثریت مسلمانوں کی تھی مگر دوسری طرف پنڈی کو سکھوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ بعض علاقے مخلوط آبادی کے تھے، جہاں پر تینوں مذاہب کے پیروکار رہتے تھے، جب کہ بعض محلوں میں گلیوں کی گلیاں صرف مسلمانوں، ہندوؤں یا سکھوں کی تھیں۔ ہمارے مکان کے اردگرد مسلمان رہتے تھے مگر ایک گلی آگے سکھوں کے مکانات شروع ہوجاتے تھے۔

ہمارا مکان (نارتھ سرکلر روڈ نمبر۱۰) محلّہ وارث خان اور جھنگی محلے کی درمیانی سرحد پر تھا، جہاں کی آبادی کی اکثریت کا تعلق پراچہ برادری سے تھا، جو بنیادی طور پر تاجر پیشہ قوم ہے۔ بابو کالا خان بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بہت کھلے دل کے بے تعصب انسان تھے، مگر بڑھاپے کی وجہ سے ان کا چلنا پھرنا محدود ہو گیا تھا۔ پھر بال بچوں والے جوان بیٹے کی وفات کے سبب ان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ انھوں نے برادری کی محفلوں میں جانا ترک کر دیا تھا۔ یہ محفلیں باقاعدگی کے ساتھ مہینے میں ایک بار اور ہنگامی حالات کے تحت دو یا تین بار ہمارے مالک مکان قاضی بدرالدین کے گھر پر ہوتی تھیں جو ہمارے پڑوس میں تھا۔ ہم چونکہ اوپر کی منزل پر رہتے تھے اس لیے ساتھ کے کوٹھے پر سے صحن میں منعقد ہونے والی محفل کو دیکھ سکتے تھے۔ پراچہ برادری کے ہاں یہ طریق رائج تھا کہ ایک میراثی ہر گھر کے دروازے پر جا کر محفل کے منعقد ہونے کا سندیسہ سناتا تھا۔ جہاں کہیں پراچوں کے ایک سے زیادہ مکان ساتھ ساتھ ہوتے تھے، وہاں پر وہ گلی میں سے پکار کر محفل کے انعقاد کا اعلان کرتا تھا۔ خوشی یا غمی کے موقعے پر وہی ساری برادری تک خبر پہنچاتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی لوگوں کے گھروں میں ٹیلی فون نہیں لگے تھے۔ ٹیلی ویژن تو خیر بہت بعد میں آیا لوگوں کے پاس ریڈیو سیٹ بھی شاذ و نادر

ہوتا تھا۔ اکثر لوگ خبریں سننے کے لیے ریستورانوں یا پبلک لائبریریوں میں جاتے تھے۔ شام کے وقت لبِ سڑک بنے ہوئے ہوٹلوں کے سامنے خبریں سننے کے لیے جمع ہونے والوں کا ٹھٹھ لگ جاتا تھا۔ ہمیں کہیں پر جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے ہمسائے میں بابو عبدالغنی پراچہ رہتے تھے، جن کے ہاں دن رات ریڈیو اونچی آواز میں لگا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ہمسائے تنگ آ کر انھیں کہتے تھے کہ بھونپو بند کر دیں مگر ان کی بھی مجبوری تھی۔ ان کی اہلیہ اپنے چھوٹے بیٹے کی پیدایش کے وقت سے خفقان کا شکار تھیں۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر اپنے مکان کی دیواریں دھونا شروع کر دیتی تھیں جن کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ اس کام کے دوران وہ چاہتی تھیں کہ ریڈیو کی آواز ان تک پہنچتی رہے، اس لیے والیوم کم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس بات کی ان کو بھلا کیا پروا ہو سکتی تھی کہ ہمیں گانا سننے کی ممانعت تھی۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ہندوستانی فلموں کے سارے گانے گھر بیٹھے سنتے تھے۔

دوسری طرف محلے کے بچوں نے آتے ہی ہماری ناکہ بندی شروع کر دی جس کی وجہ ہم پر واضح نہ تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ ہم دوسروں سے مختلف ہیں۔ کیا احمدی ہونا کوئی جرم ہے؟ اس محلے میں ابا جی جانے پہچانے آدمی تھے، کیونکہ وہ اس علاقے میں مقیم رہ چکے تھے۔ ابا جی کا احمدی ہونا کسی سے چھپا ہوا نہ تھا اور نہ ہی انھوں نے کبھی اس چیز کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ ہم سب بہن بھائیوں کا قد کاٹھ اس زمانے میں بہت چھوٹا تھا اس لیے محلے کے بچوں نے ہمیں "مرزائی پدوڑے" کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ پھر ہم میں سے جو کوئی اکیلا دکیلا ان کو راستے میں مل جاتا تھا اس کو مارتے یا کم سے کم مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روز ہمارے ہمسائے کا بیٹا مصور لاٹھی لے کر مجھے مارنے کے لیے لپکا۔ اس وقت نثار ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس نے مصور کی لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھین کر توڑ ڈالی اور کہا کہ اگر تم نے پھر کبھی ایسی حرکت کی تو میں تمھاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ وہ چونکہ خود پراچہ تھا اس لیے اسے مصور کے باپ کی کوئی پروا نہ تھی جو پراچوں کا اس زمانے میں سربراہ سمجھا جاتا تھا۔ نثار نے مجھے کہا کہ جب تک تم لڑکوں پر اپنا رعب نہیں جما لیتے، اس وقت تک وہ تمھارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اس کی تجویز پر باری باری سب لڑکوں کو، جب وہ مجھے اکیلے دکیلے راستے میں مل جاتے تھے، خوب رگیدا۔ تب کہیں جا کر انھوں نے ہمارا پیچھا کرنا چھوڑا وگرنہ وہ تو اس قدر نڈر ہو گئے تھے کہ جب کبھی ابا جی اور اماں گھر پر نہ ہوتے تھے تو لڑکوں کی پوری ٹولی مل کر ہمارے گھر پر پتھر پھینکتی تھی۔ میرے ڈائرکٹ ایکشن کے نتیجے میں لڑکوں نے مجھے اپنا سرکردہ مان لیا۔ چنانچہ جب بوائے اسکاوٹ کا ایک نمایندہ ہمارے محلے میں پہنچا اور اس نے چاہا کہ ہم بوائے اسکاوٹ تحریک میں شامل ہو جائیں اور اپنے محلے میں اس کی شاخ قایم کریں تو لڑکوں نے میرا نام اپنے گروپ کی سرکردگی کے لیے پیش کیا۔

میں قادیان میں اطفال الاحمدیہ کی تحریک میں رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ بچوں کی تنظیم کو کیسے چلایا جاتا ہے، اس لیے مجھے اس کام میں کوئی دقت نہ پیش آئی اور میں دو برسوں تک بوائے اسکاؤٹ کے سیکشن کا انچارج رہا۔ قادیان میں، جہاں پر ہمیں بہت سی کھیلیں سکھائی گئی تھیں، وہاں پر ہم نے تھیٹر کھیلنا بھی سیکھا تھا۔ یہ چیز میرے خوب کام آئی اور میں نے اپنے محلے کے بچوں کو تھیٹر کھیلنا سکھایا۔

ہمارے ہمسائے میں جہاں پر دو چار کھاتے پیتے گھرانے بستے تھے وہاں پر بہت سے تانگہ بان اور دہاڑی پر مزدوری کرنے والے بھی رہتے تھے۔ چند ایک گھرانے افغانستان کے سابقہ شاہی خاندان کے تھے، جو ملک بدر ہو کر پنڈی میں رہ رہے تھے۔ ان کو سرکاری پنشن ملتی تھی، جو شاید اتنی تھوڑی ہوتی تھی کہ اس سے ان کی گزر بسر نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ ان کو بعض اوقات فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں اس بات کا علم ایک بزرگ عورت کے ذریعے ہوا، جو ہمارے گھر پر بھیک مانگنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ اس کو اردو یا پنجابی نہیں آتی تھی کیونکہ اس کو بچپن میں کانوں کی تکلیف ہوئی جس کا علاج کسی نیم حکیم نے کیا تھا اور اس کے کان کے پردوں کو کسی دوائی کے ساتھ دھو دھو کر ناکارہ کر دیا تھا اس لیے وہ بہری ہو گئی تھی اور نئے ملک کی زبان نہ سیکھ سکی تھی۔ وہ اماں کے ساتھ فارسی میں بات کرتی تھی۔ ایک دوسرے افغان شاہی خاندان کا لڑکا کریم میرا کلاس فیلو تھا، جس کے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ جب ہم پنڈی سے چنگا منتقل ہو رہے تھے تو اس نے مجھے تحفے میں چاندی کا ایک قیمتی کپ دینا چاہا۔ میں نے اس کی قیمت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اسے قبول نہ کیا۔ اس پر اس کی پٹھانی جوش میں آ گئی اور ہماری دوستی کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا مکان، جو بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد افضل ظلہ نے خرید لیا تھا، مری روڈ پر تھا جہاں پر میں بعض اوقات کریم سے ملنے جاتا تھا۔ کریم کا باپ ہمارے ساتھ مل کر پتنگیں اڑایا کرتا تھا۔ ایک تیسرا افغان شاہی خاندان ہمارے قریب رہتا تھا اور ان کے لڑکے ہمارے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ان کے باپ کو آغا بابر جانتے تھے۔ اس بارے میں انھوں نے مجھے اپنے خط میں لکھا تھا: ''ایک کا نام جلال احمد تھا۔ پنڈی کلب کا ممبر تھا۔ پیتا بہت تھا۔ اس نے شادی بھی پنڈی کے کسی خاندان میں کی تھی۔ شاید محلّہ وارث خان میں رہتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی میجر امین تھا جو فوج میں تھا۔ دونوں سے ملنا جلنا تھا'' اس کی بیٹی کے ساتھ عبدالغنی پراچہ کے بڑے بیٹے عبدالصمد نے عشق لڑایا تھا۔ ان کے مکانات آمنے سامنے تھے اور ہم دونوں کو اکثر ایک دوسرے سے اشارہ بازی کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ آگے چل کر ان کی شادی ہو گئی تھی۔

سڑک کے کنارے ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کے مالک ایک حکیم صاحب تھے۔ اوپر ان کا لمبا چوڑا کنبہ رہتا تھا اور نیچے ان کی دکان تھی۔ شام کے وقت وہ چھڑکاؤ کرا کے سڑک کے کنارے محفل

لگاتے تھے۔ ان کے مکان کے سامنے سڑک کے دوسری طرف کوڑا گھر تھا، جس میں محلے بھر کے چوہڑے لیٹرینوں کا گندلا کرڈالا کرتے تھے۔ دن میں دوبار میونسپل کمیٹی کا ٹرک گندگی کو اٹھانے کے لیے آتا تھا، جس کے سبب سارے ماحول میں بدبو پھیل جاتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حکیم صاحب کیسے اس گند کے پاس محفل لگا کر بیٹھتے تھے۔ حکیم صاحب نے کبوتر پال رکھے تھے جن کو وہ صبح کے وقت اڑاتے ہوئے چھت پر دیکھے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ موصوف لونڈے باز بھی تھے۔ وہ لڑکا ان کے گھر پر رہتا تھا اور خوب گل چھرے اڑاتا تھا۔ جتنے پیسے اس کو ملتے تھے اتنے حکیم صاحب نے کبھی اپنے بیٹوں کو نہ دیے تھے۔

ان کے مکان کے نیچے ایک دکان نما کمرے میں ایک تانگہ بان رہتا تھا جو باقاعدگی کے ساتھ تھڑے پر نمازیں پڑھتا اور بہت وظیفے کرتا تھا۔ اس کے تھڑے پر ایک عورت آکر بیٹھا کرتی تھی جس کے حواس بجا نہ تھے۔ ایک صبح سب نے دیکھا کہ وہ عورت لہو میں لتھڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ رات کو تانگہ بان اسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا اور اس کے ساتھ زیادتی کی تھی، پھر صبح سویرے تانگہ لے کر نکل گیا تھا اور عورت کو اس کے حال پر چھوڑ گیا تھا۔

سردار جلال احمد کے مکان کے نیچے چار گیراج تھے۔ تین میں تانگہ بان اپنے گھوڑے رکھتے تھے اور چوتھے میں چائے خانہ تھا، جس کے مالک کے بارے میں عجیب وغریب باتیں سننے میں آتی تھیں۔ مشہور تھا کہ وہ بدمعاشوں کا سردار ہے اور اس کے چائے خانے میں صرف اس کے چیلے چانٹے جا کر بیٹھتے تھے۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ وہ ایک ہٹے کٹے بدمعاش کو ایک لاٹھی سے مار رہا تھا، جو استاد جی کو دہائی دیتے ہوئے مار کھاتا جا رہا تھا۔ استاد نے کہا کہ سامنے کھڑی گھوڑی کے چوتڑوں کو جا کر چومو، پھر میں تم کو معاف کر دوں گا۔ سب جانتے تھے کہ وہ گھوڑی کسی کو اپنے پیچھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ جو کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا تھا وہ اس کو زبردست دولتّی مارتی تھی۔ بدمعاش چیخ چیخ کر استاد جی سے معافی مانگ رہا تھا اور لاٹھیاں کھاتا جا رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد کہیں جا کر یہ ناٹک بند ہوا۔ استاد جی نے چیلے سے کہا کہ وہ کبھی بھول کر بھی ان کی نظروں تلے نہ آئے، وگرنہ اس کو گولی ماردی جائے گی۔ سب جانتے تھے کہ استاد گولی مارنے سے بھی نہ چوکتا تھا، جس کا مظاہرہ اس نے تھوڑے عرصے کے بعد ایک جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے چوہدری مولا بخش پر گولی چلا کر کیا۔ مگر گولی چوک گئی اور استاد جی کو عمر قید ہوگئی۔

سردار جلال احمد کے مکان کے پہلو میں ایک کوٹھی نما مکان میں، جو پہلے کسی ہندو کی ملکیت تھا، ایک ریٹائرڈ کرنل صاحب رہتے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے جرمنی گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کی جرمن منگیتر ساتھ آئی تھی۔ چالیس برسوں کے بعد میری ملاقات اصغر سے پاکستان

جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں ہوئی۔ میں تو اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس کو پہچان نہ سکا۔ میری یادداشت میں ایک چھریرا لمبوترا سا جوان تھا، جب کہ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا اس کی توند نکلی ہوئی تھی اور سر کے بال اڑ چکے تھے۔

ہمارے مکان کے پچھواڑے میں گوالوں کا ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا، جو بھینسیں رکھتے اور دودھ بیچتے تھے۔ ہم چھت پر سے ان کو دودھ دوہتے ہوئے دیکھتے تھے، جب کہ دودھ کے گاہک احاطے میں موجود ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے والا بالٹی میں پانی ڈال کر لے جاتا تھا اور دودھ دوہنے سے پہلے بھینس کے تھن صاف کرتا تھا۔ باقی کا پانی بالٹی میں رہتا تھا، جس میں دودھ کی دھاریں گرتی تھیں۔ گاہک یہ سمجھتے تھے کہ ان کو خالص دودھ دیا جا رہا ہے جب کہ حقیقت کچھ اور تھی۔ اس وجہ سے ہم ان سے دودھ نہیں خریدتے تھے بلکہ دو تین فرلانگ دور ایک اور گوالے سے لینے جاتے تھے۔ اس کے ہاں گاہک بھینس کے پاس کھڑا ہو کر دودھ دوہنے والے کی کارروائی کو دیکھ سکتا تھا۔ وہاں سے روزانہ دودھ لانے کی ڈیوٹی میری تھی۔ ذیل کی عبارت آپا نصیرہ کے قلم سے نکلی ہے:

" ہم اپنے گھریلو ماحول کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کے شوقین بچے تھے۔ جیب خرچ سے میگزین خریدے جاتے، کتابیں کرائے پر لا کر پڑھی جاتیں۔ منیر بھائی کی پڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس میں کچھ اور باتیں دوسرے بچوں سے مختلف تھیں۔ وہ سکول سے لائے گئے چاک کی نوک سے چھیل تراش کر مختلف صورتیں بنایا کرتا۔ ماربل کے بنے سانچے لا کر ان میں موم پگھلا کر چیزیں بناتا۔ میرے ساتھ مل کر سویٹر بننے کی مشق کرتا۔ دن کو پتنگ اڑانے کی مشق بھی کرتا۔ شام کو گھر سے دوڈھائی میل دور کمپنی باغ میں کرکٹ کھیلنے بھی جاتا۔ لیکن اس کی جو بات مجھے ہمیشہ اچھی لگی اور آج تک یاد ہے وہ اس کا احساسِ ذمہ داری ہے۔ اسے شام چار بجے گھر دودھ پہنچانا ہوتا تھا۔ وہ گھر سے جاتے ہوئے جگ اٹھا کر لے جاتا۔ اسے دودھ والے کے پاس چھوڑ جاتا اور گھر سے بھاگتا ہوا نکلتا۔ دودھ اٹھا کر گھر پہنچاتا اور پھر بھاگ کر کمپنی باغ پہنچ جاتا۔ یہ لکھنے میں تو معمولی سی بات لگتی ہے لیکن دس بارہ سال کے بچے کے سمٹنے کی بات ہے، احساسِ ذمہ داری کی بات ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں اسے تین چار میل کا فاصلہ روز طے کرنا پڑتا اور کرکٹ میں بھی وہ کلاس ون تھا۔ کھیل کے معیار میں کبھی کمی نہ آئی۔"

حیرت کی بات یہ تھی کہ محلے کے لڑکوں کے برعکس اسکول میں مجھے یا میرے بہن بھائیوں کو کسی نے احمدی ہونے کی وجہ سے تنگ نہ کیا۔ مجھے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا، جو ہمارے گھر سے کم و بیش تین میل کے فاصلے پر مریڑ حسن میں واقع تھا۔ قیوم اور رفیق کو پرائمری اسکول میں داخلہ ملا، جو تیلی محلے میں تھا۔ نصیرہ کا گرلز اسکول بھی اسی نواح میں تھا۔ صرف نصیر کو ڈاکٹری ہدایت کی روشنی میں اس کی

کمزور صحت کے باعث اسکول میں داخل نہ کرایا گیا۔ میری کلاس میں چار پانچ لڑکے محلّہ وارث خان کے رہنے والے تھے، جن کے ساتھ میری خوب بنتی تھی۔ ہم اکثر اکٹھے اسکول جاتے تھے اور گاہے بگاہے مل کر ہوم ورک کرتے تھے۔ ہماری دوستی مثالی تھی۔

میرے دوستوں میں سے مجھے اعجاز خاص طور پر بہت پسند تھا۔ ہم دونوں اور عارف کلاس میں اگلے بنچ پر بیٹھتے تھے۔ اعجاز کلاس میں ٹاپ کرتا تھا۔ وہ بے حد شرمیلا اور شریف انسان تھا۔ میٹرک کے امتحان میں وہ اوّل آیا تھا اور اس کو وظیفہ ملا تھا مگر خدا جانے کس وجہ سے وہ ایف اے کو ادھورا چھوڑ کر ائرفورس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ چند برسوں کے بعد ہمارا ملنا ہوا، تو وہ شرم کے مارے مجھے نہ بتا سکا کہ اس نے کس وجہ سے کالج کو خیر باد کہا تھا۔ جب میں جرمنی جانے سے پہلے راولپنڈی گیا تو اعجاز کے گھر پر بھی ملنے گیا تھا۔ پتا چلا کہ اعجاز خودکشی کر گیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھے اس کی کوئی وجہ نہ بتائی، شاید وہ خود بھی اس سے واقف نہ تھے۔

اسکول جاتے اور آتے ہوئے اکثر سبطین میرے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا گھر ہم سے آگے بنی کے کنارے پر تھا۔ وہ میرے گھر پر پہنچ کر آواز لگاتا تھا اور میں فوراً باہر نکل آتا تھا۔ اس کا خاندان یو پی سے تھا اور وہ ساری عمر پنجابی نہ سیکھ سکا اس لیے مجھے اس کے ساتھ اردو بولنی پڑتی تھی وگرنہ اسکول میں پنجابی چلتی تھی اور گھر پر ہماری مادری زبان پٹھوہاری بولی جاتی تھی۔ ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ ہم دونوں اقلیتی مذہبی گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں احمدی تھا اور وہ شیعہ۔ اسکول میں وقفے کے دوران اسکول کی مسجد میں ظہر کی نماز با جماعت پڑھی جاتی تھی۔ ہم دونوں اس میں شامل نہ ہوتے تھے کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہماری نماز سنّی امام کے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ ایک روز ہیڈ ماسٹر عبید الرحمٰن صاحب نے آٹھ دس لڑکوں کو نماز کے وقت میدان میں کھڑے دیکھ کر ہمیں اپنے ساتھ آنے کو کہا اور ہر کسی کے ہاتھ پر بید سے ایک ایک ضرب لگا دی۔ جب ہمیں اگلے روز پھر انھوں نے میدان میں کھڑے دیکھا تو پوچھا کہ کیا کل والی سزا کافی نہ تھی۔ ہم نے انھیں سنّی امام کے پیچھے نماز نہ پڑھ سکنے کی وجہ بتائی تو انھوں نے کہا کہ کل تم نے مجھے کیوں نہ بتایا تھا۔ تم نماز الگ سے بھی تو پڑھ سکتے ہو۔ اس کے بعد ہم علیحدہ نماز ادا کرنے لگے۔

دوستوں کا ذکر ہو رہا ہے تو کیوں نہ نصرت محمود کا بھی ذکر ہو جائے۔ وہ افسرِ مال ملک عبدالقدوس کا بیٹا تھا۔ ان کی کوٹھی ہمارے مکان کے قریب واقع تھی، جسکے سبب ہمارا ساتھ نہ صرف کلاس میں تھا، جہاں پر ہم ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے، بلکہ چھٹی ہونے کے بعد بھی ہمارا بہت سا وقت اکٹھا گزرتا تھا۔ اس کے ساتھ میری دوستی ٹوٹنے کی داستان بھی عجیب ہے۔ ششماہی امتحان میں اس نے میرے جغرافیے کے پرچے کو ہو بہو نقل کیا۔ جب نتیجہ نکلا تو وہ کلاس میں پہلے نمبر پر آیا اور میں دوسرے نمبر پر۔

مجھے حیرانی ہوئی اور میں نے اپنے پرچے کی پڑتال کی تو پتا چلا کہ ایک سوال کے لیے دیے جانے والے نمبر ٹوٹل میں جمع نہیں کیے گئے تھے۔ میں نے اپنا پرچہ لے جا کر ماسٹر صاحب کو دکھایا اور انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے میرے نمبر بڑھا دیے۔ اس طرح میں کلاس میں اول آ گیا اور نصرت دوم۔ اس بات پر وہ مجھ سے بگڑ گیا اور اس نے میرے ساتھ بول چال بند کر دی۔ وہ زندگی میں پہلی بار کلاس میں اوّل آیا تھا اور میں نے اسکی خوشی کو برباد کر دیا تھا۔

ایک ماسٹر محمد دین تھے، جن کو لڑکوں نے خدا جانے کیوں ''کتی لگ'' کا نام دے رکھا تھا۔ وہ بہت تند مزاج آدمی تھے جس کا مجھے بھی ایک بار تجربہ ہوا۔ ایک روز وہ کلاس میں داخل ہوئے۔ میرا ڈسک دروازے کے سامنے تھا۔ سب لڑکے ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میرے ہاتھ میں ایک ورق تھا، جو عین اس وقت، جب ماسٹر صاحب کمرے میں داخل ہو رہے تھے، ہاتھ سے گر گیا اور میں اس کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ ماسٹر صاحب نے شاید اس چیز کو اپنی ہتک سمجھا اور میری جھکی ہوئی پیٹھ پر اپنی سوٹی سے، جو ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتی تھی، ایک زوردار ضرب لگائی۔ میں اس چیز کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور نہ ہی مجھے کبھی کسی استاد نے سوٹی سے مارا تھا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے بینچ پر کھڑا ہونے کو کہا مگر میں غصے کے مارے کلاس سے باہر چلا گیا۔ ماسٹر صاحب کو خطرہ پیدا ہوا کہ میں ان کی ہیڈ ماسٹر کے پاس رپورٹ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ انھوں نے ایک لڑکے کو میرے پیچھے دوڑایا اور واپس آنے کو کہا۔ میں نے اس کی بات نہ مانی اور گھر چلا گیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں ابا جی کو اس بارے میں بتاؤں مگر پھر میں نے سوچا کہ وہ کہیں ماسٹر محمد دین کے خلاف کچھ کر نہ بیٹھیں، اس لیے میں نے گھر میں کسی کو نہ بتایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد ایک احمدی عورت میانوالی سے راولپنڈی آئی اور اماں کو ملنے کے لیے ہمارے گھر پر آئی۔ اماں نے اسے شام کے کھانے کے لیے روک لیا اور مجھے کہا کہ کھانے کے بعد اس کو اس کے بھائی کے گھر پر پہنچانے کے لیے ساتھ جاؤں۔ جب ہم وہاں پر پہنچے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس کا بھائی ماسٹر محمد دین تھا۔ اس نے مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھایا اور میری خاطر تواضع کی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسکول کے دوسرے استاد اس کے ساتھ آئے دن مذاق کرتے رہتے تھے۔ ایک دعوت میں انھوں نے کریم رولز میں سے کریم کو نکال کر سرخ مرچوں سے بھر دیا۔ یہ کریم رولز خاص طور پر ماسٹر محمد دین کے سامنے رکھے گئے۔ سب کا خیال تھا کہ ماسٹر محمد دین رولز کو منہ میں رکھیں گے اور مرچیں لگنے پر تھوک دیں گے اور سب لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے مگر ماسٹر محمد دین رولز کو اطمینان کے ساتھ کھا گئے جیسے ان میں مرچیں نہ ہوں بلکہ شہد بھرا ہو۔

ہمارے اسکول ماسٹروں میں فارسی کے استاد محمد زمان اس زمانے میں بالکل جوان آدمی تھے۔ ان کی عمر بمشکل بیس بائیس برس تھی۔ ان جیسا استاد سارے اسکول میں نہیں پایا جاتا تھا۔ میں نے عربی لے رکھی تھی اس لیے ان کی شاگردی میں نہ آیا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا۔ میرے کلاس فیلو، جو ان کے پاس فارسی پڑھتے تھے، ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ میرا ملنا جلنا ان کے ساتھ صرف اس وجہ سے تھا کہ اسکول آتے اور جاتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ چلتے تھے کیونکہ ان کا مکان اسی سمت میں تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان دینے سے پہلے جلسہ سیرت النبیؐ کے موقع پر تقریری مقابلے میں حصہ لیا تھا جو ان کے زیرِ اہتمام ہوا تھا۔ مجھے پہلا انعام ملا تھا، جو مجھے اسکول کے سالانہ جلسے میں ملنا تھا مگر میں اس دوران میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں راولپنڈی کو خیر باد کہہ گیا تھا۔ کئی برسوں کے بعد ایک بار سرِراہے میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ میرا انعام بدستور محفوظ پڑا ہے اور میں جب چاہوں اس کو وصول کر سکتا ہوں۔ برسوں کے بعد جب میں نے جرمنی سے پاکستانی ادبی جریدوں میں لکھنا شروع کیا تو راولپنڈی سے شایع ہونے والے ''خیابان'' کے مدیر حسن عباس رضا نے مجھے ملاقات ہونے پر بتایا کہ وہ ماسٹر محمد زمان کا بیٹا ہے اور مجھے اپنے باپ کے ذریعے جانتا ہے۔

قابلِ ذکر استاد کئی ایک تھے۔ ریاضی اور تاریخ کے استاد ایم اے صاحب کہلاتے تھے جب کہ ان کا نام ماسٹر رشید احمد تھا۔ وہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے اور شاید یوپی کے رہنے والے تھے۔ بہت نفیس لباس پہنتے تھے اور پان کھاتے تھے۔ یوں تو بہت سے استاد شاگردوں کے ساتھ اردو بولتے تھے مگر وہ ہمارے اسکول کے واحد استاد تھے، جن کی مادری زبان اردو تھی۔ ہمارے ساتھ وہ بھی اس بات پر حیران ہوا کرتے تھے کہ ہمیں پاکستان بن جانے کے بعد بھی انگلستان کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔ مارٹن لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک کے بارے میں جو کچھ انھوں نے ہمیں پڑھایا تھا وہ آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

انگریزی کے استاد ماسٹر غلام محمد تھے، جو جی ایم صاحب کہلاتے تھے۔ وہ امرتسر سے آئے تھے اور ٹھگنے سے قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہمیں انگریزی ماسٹر خواجہ محمد عبداللہ پڑھاتے تھے۔ مجھے ابا جی نے بتایا تھا کہ وہ جماعتِ احمدیہ کی لاہوری شاخ کے ممبر تھے۔ تقسیمِ ملک کے تھوڑے عرصے کے بعد ماسٹر منظور احمد ہمیں اردو پڑھانے کے لیے متعین ہوئے۔ وہ پٹیالہ یا شاید انبالہ کے رہنے والے تھے اور ہمیں سنایا کرتے تھے کہ کس طرح ان کے شہر کے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے گئے تھے۔ جب وہ تقسیمِ ملک کی داستان سناتے سناتے اس مقام پر پہنچے کہ ریڈکلف نے پنجاب کی تقسیم میں دھاندلی کی تھی اور گورداسپور کو بھی ہندوستان میں شامل کر دیا تھا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے لبریز ہو گیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا

کہ کہیں موصوف احمدی تو نہیں جو قادیان کے ہاتھ سے نکل جانے پر اس قدر رنجیدہ ہیں۔ اس کی تصدیق اگلے جمعے کی نماز کے وقت ہوگئی جب میں نے انھیں جماعتِ احمدیہ کی مسجد میں دیکھا۔

ہمارے محلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ہندوؤں اور سکھوں کے اکا دکا مکان تھے۔ ایک دوسرے کے اتنا قریب رہنے کے باوجود ہمارے ہم جولیوں میں کوئی ہندو یا سکھ لڑکا شامل نہ تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہمارے اسکول ایک دوسرے سے جدا تھے۔ باوجود اس امر کے کہ ہندوؤں کا ایک اسکول ہمارے گھر کے بالکل قریب پایا جاتا تھا اور ڈی وی ہائی اسکول میرے روز کے راستے میں پڑتا تھا، مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو مسلمانوں کے مدارس میں داخل کرایا گیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس اسکول کے استاد اور طالب علم تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیتے تھے چنانچہ جب بھی مسلم لیگ کو اپنے جلسوں اور جلوسوں کے لیے رضا کاروں کی ضرورت ہوتی تھی تو ہمارے اسکول کی طرف سے انکا انتظام کر دیا جاتا تھا۔

جماعتِ احمدیہ راولپنڈی نے تیلی محلے میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جس کے نچلے حصے میں نماز ادا کی جاتی تھی اور اوپر کی منزل پر احمدی کرائے دار رہتا تھا۔ اس زمانے میں مقامی جماعت بہت تھوڑی تھی اس کے باوجود ابا جی نے تحریک چلائی کہ وہ مکان خرید لیا جائے چنانچہ اس کام کے لیے چندہ جمع کیا جانے لگا۔ کچھ رقم قادیان سے بھی آئی اور مکان خرید لیا گیا اور اس کو مسجد میں تبدیل کرنے کا پروگرام بن گیا البتہ اس پر عمل ہونے پر مزید دو دہائیاں لگ گئیں۔ اباجی اس زمانے میں جماعتِ احمدیہ راولپنڈی کے سیکرٹری مال تھے۔ ان کی کوششوں سے ایک قطعہِ زمین شہر سے باہر خریدا گیا جو کئی برسوں تک عیدگاہ کے طور پر استعمال میں آتا رہا۔ اب سنا ہے کہ وہاں پر بھی مسجد تعمیر کر لی گئی ہے۔

اماں کی ملّی خدمات

اماں نے راولپنڈی پہنچتے ہی احمدی عورتوں کی انجمن ''لجنہ اماء اللہ'' کے احیاء کے لیے کوششیں شروع کر دیں جس کو اماں نے ۱۹۳۵ء میں خود قایم کیا تھا اور جو اس دوران میں معدوم ہو چکی تھی۔ اماں نے ایک ایک احمدی گھر پر جا کر عورتوں کو شامل ہونے کی تحریک کی۔ چند ماہ کے اندر اندر یہ تحریک بھی چل نکلی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پنجاب میں اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے، جن کو آل انڈیا مسلم لیگ ہر قیمت پر جیتنا چاہتی تھی تاکہ پاکستان کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنایا جا سکے۔ اماں نے اس سلسلے میں بیگم فیروز خان نون کے ساتھ رابطہ کیا اور اپنی اور لجنہ اماء اللہ راولپنڈی کی خدمات پیش کیں،

جن کو شکریے کے ساتھ قبول کیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہونے والے سب جلسوں میں اماں کی تقریر رکھی جاتی تھی اور لجنہ اماء اللہ کی ورکر عورتیں ہر جگہ پر نمایاں کردار ادا کرتی تھیں۔ مسلم لیگ کی سب سرکردہ عورتیں باری باری شکریہ ادا کرنے کے لیے ہمارے گھر پر آتی رہیں۔ مسلم لیگ کو انتخابات میں کامیابی ہوئی، جس میں اماں کا بھی ہاتھ تھا۔

ہندوستان کی آزادی کے مراحل میں سے ہندو مسلم فسادات کا مرحلہ بہت سنگین اور دلدوز تھا۔ ٦ مارچ ۱۹۴۷ء کو میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ میں اسلامیہ ہائی اسکول مریڑ حسن میں پڑھتا تھا اور اس روز معمول کے مطابق اسکول گیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ایک استاد نے کلاس روم میں آ کر اعلان کیا کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ طالب علموں کو فوراً گروپوں کی صورت میں اپنے گھروں کے لیے روانہ ہو جانے کی تاکید کی گئی۔ ہمارے گھر کو سیدھی مری روڈ جاتی تھی۔ قدیم ہولی فیملی اسپتال کے آس پاس ہندوؤں کی آبادی تھی جس میں سے ہمیں گزر کر جانا تھا۔ اس کے بعد کمیٹی محلے سے مسلمانوں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہم ایسے سرپٹ بھاگے کہ کمیٹی محلے میں پہنچ کر دم لیا۔ اس وقت تک سڑکوں پر کوئی ہلچل نہ تھی۔ تیلی محلے میں اکا دکا مسلمان لاٹھیاں اٹھائے ہوئے چوہدری مولا داد، جن کے بیٹے پر قاتلانہ حملے سے فسادات کی پہل پڑی تھی، کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس کوٹھی کے پہلو میں ہمارے واقف کاروں کا دو منزلہ گھر تھا، جہاں پر اس روز اماں نے جانا تھا، اس لیے ہمیں وہیں پر آنے کا کہا گیا تھا۔ ہم نے چھت پر سے کوٹھی کے لان میں نگاہ ڈالی تو وہاں پر لوگوں کا اچھا خاصا مجمع جمع ہو چکا تھا اور بے حد جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔

ایکا ایکی مجمع میں ہلچل پیدا ہوئی اور کچھ نوجوان لاٹھیاں اٹھائے ہوئے سڑک کی طرف دوڑے۔ محلّہ وارث خان کی طرف سے ایک سکھ سائیکل سوار آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور سائیکل کا رخ دائیں ہاتھ کی سڑک پر موڑ دیا جو بھابڑا بازار کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر ہندوؤں کی آبادی تھی۔ ابھی اس پر لاٹھیوں کے ایک دو وار ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک ہندو مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ کھل گیا اور اسے اندر کھینچ لیا گیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی، جو اس زمانے میں بیگار کے تانگوں پر گشت کرتی تھی۔ حملہ آور فوراً آس پاس کی گلیوں میں روپوش ہو گئے اور پولیس کا دستہ رکے بغیر آگے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد تیلی محلے کی طرف سے آنے والے ایک دوسرے سکھ پر لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کر دیا مگر محلے کے کئی ایک شرفاء اس کے بچاؤ کے لیے درمیان میں کود پڑے، جس کے سبب لٹھ بازوں کو پسپا ہونا پڑا مگر سکھ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس کا سارا پنڈا خون سے لت پت تھا اور اس کی

سوکھی ہوئی زبان پانی مانگ رہی تھی۔ پاس ہی ایک نلکا تھا مگر پانی لانے کے لیے کوئی برتن موجود نہ تھا۔ ایک شخص اپنے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر نلکے سے پانی لے کر آیا، مگر سکھ گھونٹ بھرنے سے پہلے دم توڑ گیا۔

پھر ایک بار نیچے گلی میں ہجوم میں سے آوازیں بلند ہونے لگیں اور لٹھ برداروں نے اس مکان کی طرف بڑھنا شروع کیا، جس میں سکھ سائیکل سوار کو پناہ دی گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس مکان کو آگ لگانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک دکان سے مٹی کے تیل کی ایک بوتل اٹھالی تھی۔ مگر ایکا ایکی چوہدری مولا داد بھاگتے ہوئے کوٹھی سے باہر نکل آئے اور حملہ آوروں کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آواز بڑی گرج دار تھی اور آج بھی میرے کانوں میں ان کا یہ فقرہ گونجتا ہے: ''جو کوئی میرے ہمسایوں پر حملہ کرے گا اس کو میری لاش کے اوپر سے گزر کر جانا ہوگا۔'' اس پر مجمع رک گیا اور لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ جس شخص نے مٹی کے تیل کی بوتل اٹھا رکھی تھی اس نے اسے دکان پر واپس نہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ریلا رک گیا تھا مگر سیلاب نہیں ٹلا تھا۔

اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم نے اپنے گھر کی راہ لی۔ راستہ کچھ ایسا لمبا نہ تھا اور یوں بھی وہ علاقہ مسلمانوں کا تھا اور ہمارے لیے بے خطر تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے چھت پر سے اردگرد کے علاقے پر نظر ڈالی تو جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ بے شمار مکانات جل رہے تھے اور گولیاں چلنے کی آواز بھی آنے لگی تھی۔ ایک طرف اللہ اکبر کی گونج سنائی دیتی تھی تو دوسری طرف سے ست سری اکال کی۔

آیندہ دنوں میں پنڈی جلتا رہا اگرچہ پہلے روز سے ہی کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ دن میں صرف دو تین گھنٹوں کے لیے لوگوں کو سڑکوں پر آنے کی اجازت دی جاتی تھی تاکہ سامانِ خوردنی حاصل کر سکیں۔ باہر کی دنیا سے رابطہ اب صرف ریڈیو کے ذریعے قایم تھا، جو اس زمانے میں اکا دکا کسی کے گھر میں ہوا کرتا تھا۔ ہمارے ہمسایوں کے ریڈیو کی خبروں سے پتا چلتا تھا کہ سارے پنجاب میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے البتہ حکومت نے بہت حد تک حالات پر قابو پا لیا تھا۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کی طرف سے فسادات کو بند کرنے کی اپیلیں روزانہ نشر کی جاتی تھیں۔

خدا خدا کر کے امن امان ہوا اور لوگ اپنے اپنے کاموں پر جانے لگے۔ اسکول سالانہ امتحانات کے لیے پھر سے کھل گئے، مگر فضا میں کشیدگی بدستور موجود تھی۔ بڑی تعداد میں لوگ نقلِ مکانی کر کے محفوظ علاقوں میں چلے گئے۔ ہندو سکھ ان محلوں میں، جہاں پر ان کے ہم مذہبوں کی اکثریت تھی، اور مسلمان مسلم آبادی والے محلوں میں منتقل ہو گئے۔ گویا ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونے سے پہلے راولپنڈی بٹ چکا تھا۔

پھر ۳ جون کو وائسرائے نے ہندوستان کے بٹوارے کا اعلان کیا اور سارے ملک میں آگ لگ گئی۔ بالخصوص مشرقی پنجاب میں مسلمان آبادیوں پر باقاعدہ منظّم حملے ہونے لگے۔ راولپنڈی میں ہندوؤں اور سکھوں نے اپنا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ گھروں کے سامنے، گلیوں اور سڑکوں پر کرسیاں، میز اور دوسرا گھریلو سامان لگ کر بکنے لگا۔ میں بھی دوسروں کے ہمراہ اس قیامتِ صغریٰ کا نظارہ کرنے جاتا تھا۔ ایک جگہ پر مجھے دو کرسیاں اور میز پسند آ گئے اور میں ضد کر کے ابا جی کو اپنے ساتھ لے کر گیا تاکہ وہ انھیں خرید لیں۔ فروخت کرنے والے نے تینوں کی قیمت دس روپے بتائی۔ ابا جی اسے بیس روپے دینے پر مصر ہو گئے۔ بالآخر اس قیمت پر سودا ہو گیا مگر یہ بات میری سمجھ سے بالا تھی۔ اگر ابا جی نے مجھے سودا کرنے دیا ہوتا تو میں پانچ روپے میں تینوں چیزیں حاصل کر لیتا۔ جب گھر پہنچ کر میں نے امی کو ساری بات بتائی اور اپنے رنج کا اظہار کیا تو ابا جی نے صرف اتنا کہا کہ کسی شخص کی کمزوری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں، انھیں راستے میں ایک ایک پیسے کی ضرورت پڑے گی۔

جب ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونے پر فسادات کا سلسلہ چلا اور مسلمان مہاجر مشرقی پنجاب اور دوسرے علاقوں سے آنا شروع ہوئے تو انکے لیے سب سے پہلا کیمپ اسلامیہ ہائی اسکول میں ہی کھولا گیا تھا۔ جس روز پہلے پچیس مہاجروں کے پہنچنے کی خبر اخباروں میں چھپی تو اماں نے سویرے ہی سویرے مجھے اپنے ساتھ لیا اور مہاجر کیمپ میں پہنچ گئیں۔ وہاں پر عجیب بدانتظامی کا سماں طاری تھا۔ مہاجروں نے بتایا کہ انھیں چوبیس گھنٹوں سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ کیمپ میں لنگر کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ دو ایک رضا کار، جو وہاں پر موجود تھے، بالکل بے بس تھے۔ اتنے میں ڈپٹی کمشنر معائنہ کرنے کے لیے آ گئے۔ انھوں نے بھی مجبوری کا اظہار کیا کہ کھانے کا انتظام اتنی جلدی نہ ہو سکتا تھا۔ اماں نے کہا کہ کھانے کا انتظام وہ دو گھنٹوں کے اندر اندر کر دیں گی۔

ہم نے تانگہ لیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مناسب مقدار میں گوشت، سبزیوں اور دالوں کی خریداری کی گئی۔ اماں نے مجھے لجنہ اماء اللہ کی سیکرٹری کے ہاں جانے کو کہا اور پیغام دیا کہ وہ دس عورتوں تک یہ خبر پہنچا دیں کہ ہمیں دو گھنٹوں کے اندر اندر مہاجرین کیمپ میں کھانا تیار کر کے لے جانا ہو گا۔ ہر عورت کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ دس روٹیاں پکا کر لائے۔ سالن کی فراہمی کا انتظام اماں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

عین دو گھنٹوں کے اندر مہاجر بھائیوں کے سامنے کھانا لگا دیا گیا۔ لجنہ اماء اللہ کی ممبر عورتیں اپنے ساتھ کپڑے۔ لحاف اور کئی قسم کی دوسری چیزیں لے کے آئی تھیں۔ یہ چیزیں ضرورت مندوں میں تقسیم

کر دی گئیں۔ جب ڈپٹی کمشنر دوسری بار سہ پہر کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے آے، تو سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ اماں نے پیش کش کی کہ اگر لنگر کے لگنے میں دیر ہو، تو وہ دو یا تین روز تک کھانا مہیا کرنے کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے ان کا اور دوسری خواتین کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ ان کے جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے فوری طور پر لنگر لگایے جانے اور شام کا کھانا کیمپ میں تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

اماں نے لجنہ اماء اللہ کی خواتین کو اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹنے کو کہا اور مجھے ساتھ لے کر مسلم لیگ کی خواتین کی شاخ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیں۔ انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ رضا کاروں کی کمی کے سبب مہاجرین کی آبادکاری کا انتظام کماحقہ نہ ہو سکے گا۔ یہ دفتر اسلامیہ ہائی اسکول سے تھوڑے فاصلے پر مری روڈ پر ہی واقع تھا۔ جب اماں وہاں پر پہنچیں تو مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اماں نے انھیں مہاجر کیمپ کے حالات سے آگاہ کیا اور تعاون کی پیشکش کی۔ اس چیز کا اثر خواتین پر ہوا اور انھوں نے اسی اجلاس میں اماں کو اپنی مجلسِ عاملہ کا ممبر بنالیا۔ میں اس دوران میں ایک آدھ گھنٹہ گیٹ پر انتظار کرنے کے بعد گھر جا چکا تھا۔ اماں کہیں شام کے قریب گھر واپس لوٹیں۔ وہ مجلسِ عاملہ کی میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنی تنظیم کی ممبران کو جمع کرنے کے لیے چل دی تھیں اور اسی روز اپنی تنظیم کا ایک ہنگامی اجلاس کر ڈالا تھا، جہاں پر مہاجرین کے لیے امدادی پروگرام جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور فوری طور پر ضروری اشیاء کی فراہمی کا کام شروع کر دیا گیا۔

آیندہ دنوں، مہینوں اور سالوں میں اماں کی زندگی بے حد مصروف ہو گئی۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتی تھیں اور شام ڈھلے واپس لوٹتی تھیں۔ ان کے آنے سے پہلے حاجت مندوں کا اچھا خاصا جمگھٹا ہمارے گھر پر لگ جاتا تھا۔ ان کی ضروریات کی تفصیلات کو معلوم کرنے اور ان کو حل کرنے پر اتنا وقت لگ جاتا تھا کہ شام کے کھانے میں دیر ہو جاتی تھی۔ یہ کھانا اماں کا دن بھر کا واحد کھانا ہوتا تھا۔ صبح سویرے چائے کی ایک پیالی سے لے کر شام تک کچھ کھائے پیے بغیر سارا دن گزر جاتا تھا۔ جب اماں تھکی ہاری بستر پر گرتی تھیں، تو یہ واحد وقت ہوتا تھا جب ہم بچوں کو اپنی ماں سے دو باتیں کرنے کی فرصت ملتی تھی۔ ہم سب ان کے پلنگ پر بیٹھ جاتے تھے اور ان کی ٹانگوں، پاؤں، بازوؤں کو دابتے تھے اور سارے دن کی کارروائی تفصیل سے سنتے تھے۔

ہمارے گھر کے بالمقابل ایک لمبی چوڑی حویلی تھی، جس میں ایک ایک دو دو کمروں میں بہت سے کرایہ دار رہتے تھے۔ اس کی مالکہ ایک بوڑھی عورت تھی، جو دہلی میں رہتی تھی۔ اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی مگر ایک مسلمان لڑکے کی

محبت میں مسلمان ہوگئی تھی۔ پھر وہ پنڈی کو چھوڑ کر دہلی چلی گئی، جہاں پر اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ملک کے بٹوارے کے نتیجے میں اسے ہجرت کر کے پنڈی لوٹنا پڑا۔ ہماری مالکہِ مکان اس کی بچپن کی سہیلی تھی جس کے گھر پر آن کر وہ عارضی طور پر ٹھیری۔ وہ دہلی سے پنڈی تک تانگے میں آئی تھی جس کو اس کا خاوند چلا رہا تھا۔ پتا چلا کہ اس کے خاوند نے ساری عمر پیشے کے طور پر تانگہ بانی کی تھی۔ چونکہ ان کو فوری طور پر کوئی مناسب مکان نہیں مل رہا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے کچھ سوٹ کیس ہماری مالکہِ مکان کے گھر پر بطور امانت رکھوا دیے۔ دو چار ہفتوں میں انھوں نے مری روڈ پر ایک مکان خرید لیا اور اپنا سامان لینے کے لیے آئے۔ جب انھوں نے سامان کی پڑتال کی، تو ہماری مالکہِ مکان کو یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ سوٹ کیسوں میں نہایت قیمتی زیورات بھرے ہوئے تھے۔ اگر اسے اس بات کا پہلے پتا چل جاتا، تو وہ آسانی کے ساتھ ایک آدھ سوٹ کیس ادھر ادھر کرسکتی تھی مگر اب کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کا اس کو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہوگئی۔ اس کے بیٹوں کا خیال تھا کہ ان کی ماں کو جن نے اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ ماں کو کسی میڈیکل ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے انھوں نے عاملوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا، جو اپنے خاص علم کے ذریعے ان کی ماں کو جن سے نجات دلوا سکتے تھے۔ آئے دن ان کے گھر پر عاملوں کی محفلیں لگنے لگیں، جن میں قوال ساری ساری رات نعتیں گاتے تھے اور ہمارے ہمسائے میں خوب تماشا لگتا تھا۔ ہمیں اس گھر میں آنے جانے سے کوئی نہیں روکتا تھا، اس لیے میں ایک رات کو محفل دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ قوال گا رہے تھے اور عامل صاحب اپنے جنتر منتر میں لگے ہوئے تھے اور ہماری مالکہِ مکان کمرے کے عین درمیان دنیا و مافیہا کو فراموش کیے ناچ رہی تھی۔ پھر اس پر غشی طاری ہو گئی اور عامل صاحب نے جن کو حکم دیا کہ اس عورت کو آزاد کر دے۔ جن نے عورتوں والی آواز میں کہا کہ وہ حکم بجالائے گا۔ اس کے بعد کمرے کے دروازے کھول دیے گئے۔ عامل صاحب نے مریضہ کی صحت مندی کی خوشخبری سنائی اور اپنا ہدیہ لے کر چلتے بنے، مگر مریضہ اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ نہ رہ سکی۔

ہندوؤں اور سکھوں کے راولپنڈی کو چھوڑ کر چلے جانے پر حکومت نے تمام متروکہ پراپرٹی کو سیل کر دیا تھا۔ اب جب مہاجر ہمارے شہر میں پہنچ رہے تھے اور ان کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش تھا حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ چار افراد کو آبادکاری کا کمشنر بنایا جائے اور ان کے سپرد مہاجروں کو رہایش کے لیے مکانات دینے کا کام کیا جائے۔ اس سلسلے میں تین مردوں اور ایک عورت کو مقرر کیا گیا۔ تینوں مرد مجسٹریٹ تھے جب کہ عورت کا انتخاب مسلم لیگ کی خواتین کی شاخ پر چھوڑ دیا گیا۔ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے اماں کو اس کام کے لیے چنا۔ سارے شہر کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ گویا چوتھائی شہر کی آبادکاری کا کام اماں کے کندھوں پر ڈال دیا گیا، جس کے لیے اماں نے ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر لینے

سے انکار کر دیا۔

اماں صبح سویرے اپنی جیب سے کرایہ خرچ کر کے تانگے میں مقررہ جگہ پر پہنچتی تھیں جہاں پر آبادکاری کا کلرک اور پولیس کا ایک دستہ موجود ہوتا تھا۔ مکان پر قبضہ لینے کے خواہشمند مہاجروں کا جمگھٹا اس کے علاوہ ہوتا تھا۔ اماں کی موجودگی میں مکان کا تالا کھولا جاتا تھا اور گھر میں موجود ایک ایک چیز کا اندراج ایک فہرست میں ہوتا تھا۔ آبادکاری کا کلرک اماں کے سامنے قبضہ حاصل کرنے کے خواہشمندوں کی درخواستیں پیش کرتا تھا، جس میں افرادِ خانہ کی تعداد اور پیچھے ہندوستان میں چھوڑی ہوئی پراپرٹی کا کلیم ہوتا تھا۔ اماں تمام چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد کسی ایک خاندان کے حق میں فیصلہ دیتی تھیں اور مکان میں موجود سامان میں سے مناسب حد تک استعمال کا سامان ان کے حوالے کرنے کے بعد باقی سامان کو مرکزی گودام میں بھجوانے کا انتظام کراتی تھیں۔ مرکزی گودام میں سامان کی نیلامی کا کام دوسرے لوگوں کے سپرد تھا۔

اماں ہر روز پیش آمدہ دلچسپ قصے سنایا کرتی تھیں۔ ایک روز وہ اس گلی میں پہنچیں، جہاں پر پہلی شام کو کام ختم کیا تھا تو ہمسایہ مکان میں سے ایک جاٹ آن کر شکایت کرنے لگا کہ اس کے مکان میں ایک جناتی آلہ لگا ہوا ہے، جس نے اس کے خاندان کو ساری رات بے حد تنگ کیا تھا۔ اماں اس کے ساتھ اس عجوبہ روزگار چیز کو دیکھنے کے لیے گئیں، تو پتا چلا کہ شکایت کا تعلق بجلی کے پنکھے سے تھا، جسے کسی نے سوئچ آن کر کے چلا دیا تھا۔ گھر والوں کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس شیطانی چرخے کو کیسے بند کیا جائے۔ چنانچہ بچارے رات بھر لاٹھیوں کے ساتھ پنکھے کو روکنے میں لگے رہے۔

آبادکاری کے کام پر کبھی اماں اپنے گھر میں سے کسی کو ساتھ نہ لے جاتی تھیں کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ اس طرح سفارشوں کی بری رسم چل نکلے گی۔ میں نے صرف ایک بار آبادکاری کے ایک کمشنر کو اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک مکان کو حاصل کرنے کے ایک خواہشمند نے، جو اباجی کو جانتا تھا، انھیں اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کیا تھا۔ ہم وہاں پر پہنچے اور کمشنر آبادکاری نے اباجی کو پہچان لیا، تو وہ انھیں ایک طرف لے گیا اور کہا کہ وہ اگر چاہیں تو وہ اسی گلی کا ایک بہت بڑا مکان ان کے نام الاٹ کر دے گا اور تمام متروکہ سامان وہیں پر رہنے دے گا، مگر اباجی نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کسی مکان کو یا سامان کو حاصل کرنے کے خواہشمند نہ تھے۔ یہ چیزیں مہاجرین کا حق ہیں اور ہم مہاجر نہیں۔

یہ سیر چشمی میرے والدین نے ہمیشہ دکھائی۔ وہ زندگی بھر کبھی کسی چیز کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ہمارے گھر پر ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں سے ایک میز اور دو کرسیاں

تھیں جن کو ابا جی نے بیس روپے میں خریدا تھا، جب کہ ہندو مالک نے ان کی قیمت دس روپے لگائی تھی، مگر ابا جی کا کہنا تھا کہ وہ صحیح قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اماں نے اپنے چھوٹے بھائی احمد خان نسیم کے لیے، جسے مشرقی پنجاب میں بھارتی حکومت نے اس الزام کے تحت گرفتار کر لیا تھا کہ اس نے مسلمان رضا کاروں کے لیے ہتھیار مہیا کیے تھے جن کی مدد سے انھوں نے قادیان پر سکھ جتھوں کے حملے کو ناکام بنا دیا تھا، ایک فونٹین پن نیلامی میں خریدا تھا تا کہ اس کی قید و بند سے آزادی پر اس کو تحفے کے طور پر پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر پر ہندوؤں کی متروکہ اشیاء میں سے کوئی چیز نہیں آئی دراں حالیکہ اماں نے لاکھوں اور کروڑوں کی مالیت کا سامان بانٹا تھا اور نیلامی کی خاطر مرکزی اسٹور میں بھجوایا تھا۔ انھوں نے کسی گھر سے اپنے لیے ایک دوپٹہ تک نہ اٹھایا۔

آبادکاری کا سلسلہ مہینوں تک چلتا رہا، جس کے دوران ہمارے گھر پر حاجت مندوں کا ایک نہ ٹوٹنے والا ریلا لگا رہتا تھا۔ ہم بہن بھائیوں کے لیے اپنا گھر اجنبی بن کے رہ گیا تھا۔ ہم اسکول سے لوٹتے تھے تو یہی دیکھتے تھے کہ خواتین کا سارے گھر بار پر قبضہ ہے۔ میری طبیعت میں بے حد حجاب تھا اور میں عورتوں کی موجودگی میں وہاں پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا، اس لیے بستہ گھر پر رکھ کر دوپہر کے کھانے کے دو چار لقمے کھا کر گھر سے باہر چلا جاتا تھا اور اپنے دوستوں کے ہاں یا کسی اور جگہ پر وقت گزارتا تھا۔ اس بات کا اثر یقیناً میری تعلیم پر پڑا اور میرے بہن بھائیوں کو بھی اس کا بوجھ اٹھانا پڑا، بالخصوص میرے چھوٹے بھائیوں نے اسے بہت محسوس کیا کہ ان کو اماں اتنا وقت نہیں دے پاتی تھیں جتنا مائیں اپنے بچوں کو دیا کرتی ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء کے وسط میں ہمیں لاہور سے ایک تار آیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے رشتے دار قادیان سے جانیں بچا کر لاہور پہنچ گئے تھے۔ ابا جی نے اسی روز راولپنڈی کی گنک منڈی کے ایک بیوپاری سے بات کی اور اس سے ایک ٹرک کرائے پر لینا چاہا تا کہ اپنے رشتے داروں کو لاہور سے گاؤں پہنچایا جا سکے۔ بیوپاری نے فوراً ایک ٹرک کا انتظام کر دیا اور کہا کہ وہ بھی مہاجر بھائیوں کی خدمت میں شریک ہونا چاہتا ہے، اس لیے وہ نہ صرف کرایہ نہیں لے گا بلکہ لاہور آنے جانے کے جملہ اخراجات خود برداشت کرے گا۔ اس سے اگلے روز ابا جی ٹرک میں لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پر جا کر پتا چلا کہ ہمارے رشتے دار ریل گاڑی کے ذریعے روانہ ہو چکے تھے۔

گاؤں میں نانی، خالہ، خالو اور ماموں احمد خان نسیم کی بیوی اور چار بچوں کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ نانا بٹوارے سے قبل وفات پا چکے تھے اور ماموں کو مشرقی پنجاب میں پولیس نے گرفتار کر کے لدھیانہ جیل میں بند کر رکھا تھا۔ ادھر چنگا بنگیال میں مہاجر خاندان کے اپنے وطن لوٹنے

کی خوشی میں رشتہ داروں اور دوسرے قرابت داروں کے گھروں میں دعوتیں ہوئیں۔ ککڑ کاٹے گئے اور زردہ پلاؤ کی دیگیں چڑھیں۔ گاؤں میں ماموں محمد خان اپنی بیوی مامی سارہ اور بھائی لعل خان اور ان کے دو بچوں برکت اللہ اور سمیع اللہ سمیت رہتے تھے۔ ان کی زمین داری چھوٹی سی تھی، مکان کچا تھا جس میں دو کمرے رہایش کے لیے تھے، ایک بھوسا رکھنے کے لیے اور ایک بیلوں کے لیے۔ حویلی کے اندر ایک کونے میں کیکر کی شاخوں کی بھاڑ کے پیچھے بھیڑیں رکھی جاتی تھیں۔ اس چھوٹے سے کوٹھے میں آٹھ افراد کا اضافہ ہو گیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گھر بار کی قیادت، جو اس وقت تک بلا شرکتِ غیرے مامی سارہ کے ہاتھ میں تھی، اس سے چھین لی گئی تھی۔ نانی اگرچہ چلنے پھرنے سے معذور تھی مگر اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اس نے تیس برسوں تک گاؤں میں شکل تک نہ دکھائی تھی اور اب آتے ہی گھر بار کی مالکہ بن بیٹھی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مامی سارہ کی حیثیت نوکرانی کی ہو گئی تھی۔ وہ صبح سے شام تک خدمت گزاری میں جٹی رہتی تھی۔ اسکے پاس اب بچوں کے ساتھ ٹھٹھا مخول کے لیے بالکل وقت نہ تھا۔ وہ سحری کے وقت سب سے پہلے بیدار ہوتی تھی اور رات کو سارے خاندان کے سو جانے کے بعد کہیں جا کر بستر پر پڑتی تھی۔ اسکے باوجود نانی اس سے خوش نہ تھی۔ اسے مامی سارہ سرے سے بھاتی ہی نہ تھی۔

مامی سارہ ایک بے حد پیار کرنے والی عورت تھی۔ ہم بچوں کی تو وہ جیسے دیوانی تھی۔ اس کا خاوند، جو ہمارا ماموں تھا، سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ اسے اپنے زمیندارے کے سوا کسی دوسرے کام میں دلچسپی نہ تھی۔ گھر بار کا سارا کام کاج مامی سارہ کے ہاتھ میں تھا۔ ماموں سے اس کے بچے نہیں تھے البتہ اس نے اپنے دیور کے دو لڑکوں کو، جن کی ماں عرصہ ہوا مر گئی تھی، سنبھال رکھا تھا۔ ان کا گھر ہمارے گاؤں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک دوسری ڈھوک میں تھا۔ ہم بہن بھائی چونکہ گرمیوں کی تعطیلات اپنے گاؤں میں گزارا کرتے تھے اس لیے جب بھی ہمیں موقع ملتا تھا مامی سارہ کے گھر چلے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات وہیں پر رات گزارا کرتے تھے۔ یہ بات عمو جان کو بے حد چبھتی تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ہمیں اپنے گنوار ماموں کے گھر پر جا کے رہنے میں کیا مزہ آتا تھا۔ اپنی کشادہ حویلی، پکے مکانات اور صحن میں لگے ہوئے کنویں کو چھوڑ کر گنوار ماموں کے کچے کوٹھے میں جا کر رات گزارنے میں بھلا کیا تک تھی۔ اب انھیں کون بتاتا کہ ہمارے لیے ساری کشش دراصل مامی سارہ ہوا کرتی تھی۔

مامی سارہ اپنی جوانی میں ضرور خوبصورت عورت رہی ہو گی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکی تھی، مگر اس وقت بھی اس کا جسم متناسب اور چہرہ خوبصورت تھا، اگرچہ اس کا رنگ بے حد سانولا تھا۔ ٹھوڑی اور ماتھے پر سیاہ داغ گودے ہوئے تھے، جس کا رواج ہمارے ہاں نہیں پایا جاتا۔ اس

لیے میں نے اس کی وجہ جاننا چاہی۔ مامی سارہ مسکرائی اور میرے گال کی چٹکی لے کر بولی: ''تم بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔ تم سیدھے سیدھے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ مامی کیا تم سکھنی ہو؟'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ مامی سکھنی تھی۔

مسلمان وہ تب جا کر ہوئی تھی جب اس نے ماموں کے کہنے پر مالیر کوٹلے کے نوابوں کے گھروں کی نوکری کو چھوڑ دیا تھا اور اس کے ہمراہ گاؤں میں آ کر مولوی سے نکاح پڑھوالیا تھا۔ ماموں نے اس کو نماز سکھا دی تھی اور وہ پابندی کے ساتھ پانچ وقتوں کی نمازیں پڑھا کرتی تھی مگر پٹھوہاری زبان وہ ساری عمر نہ سیکھ سکی اور نہ ہی اپنا مالیر کوٹلے والا لب ولہجہ بدل سکی۔ وہ پٹھوہاری اور پنجابی کی کھچڑی سی بنا کر بولتی تھی جس کی ہم بچے نقلیں اتارا کرتے تھے مگر وہ اس بات کا برا نہ مانتی تھی بلکہ ہمارے ساتھ مل کر خوب ہنسا کرتی تھی۔

گاؤں میں زمینوں سے ان کی بس اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی مل جاتی تھی۔ گندم، جوار، باجرے اور مکئی کی پیداوار سے ضرورت کی چیزیں جنس کے بدلے میں دکان سے لی جا سکتی تھیں۔ چھوٹے ماموں کو تجارت کا چسکا اس وقت سے لگا ہوا تھا جب انھوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں دو چار سال تک ایک سیٹھ کی دکان پر کام کیا تھا۔ وہ سال میں ایک دو بار ڈنگروں کی منڈی میں کوئی چھوٹا موٹا بچھڑا بیچ آتے تھے۔ اسی طرح بھیڑوں کی اون اور بقرعید کے موقع پر قربانی کے جانور بیچ کر دو چار پیسے زاید کما لاتے تھے۔ اسکے باوجود مامی سارہ کا ہاتھ تنگ رہتا تھا۔

آٹھ زاید آدمیوں کے آ جانے کے سبب سال بھر کا غلہ دسمبر میں خلاص ہو گیا۔ نانی نے اس بات کا ذمے دار مامی سارہ کو ٹھیرایا، جو خدا جانے چوری چھپے غلہ نکال کر کس یار کو دے آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مامی سارہ کی ہر حرکت پر شبہ کیا جانے لگا۔ کہاں وہ دن تھے کہ وہ اپنے گھر میں سیاہ وسفید کی مالکہ تھی اور کہاں یہ وقت آن پہنچا تھا کہ اسے گھر سے باہر قدم دھرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لیا جائے۔

نانی اب دن رات مامی سارہ کی برائیاں کرنے لگی تھی۔ ماموں اللہ میاں کی گائے تھے۔ انھوں نے بس ایک بات سیکھ رکھی تھی کہ ماں باپ کی ہر بات آسمانی حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ان سے یہ توقع رکھنا بالکل فضول تھا کہ وہ ان مشکل حالات میں مامی سارہ کا سہارا بنیں گے۔ مامی سارہ ان سے لاکھ لاکھ کہتی تھی کہ اس طرح گزارہ نہ ہو گا مگر ماموں سنی ان سنی کر دیتے تھے۔ انھوں نے منہ کھولنا جیسے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ مامی سارہ پر ہونے والی ہر بے انصافی پر چپ سادھے رہے۔ آخر ایک روز مامی سارہ روٹھ کر گھر سے چلی گئی۔ اس نے گاؤں کے ایک دوسرے گھرانے میں ڈیرہ ڈال دیا۔

نانی کو اس وجہ سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا اور اس نے ماموں کو خوب خوب بھڑکایا کہ مامی سارہ کو منانے بالکل نہ جائیں۔ وہ دو چار روز میں بھیگی ہوئی بلی کی طرح خود گھر لوٹ آئے گی۔ پرائے لوگ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں کہاں بٹھائیں گے۔ ادھر مامی سارہ کا خیال تھا کہ ماموں اسے لینے کے لیے آئیں گے تو وہ انھیں کہے گی کہ زمینوں میں سے اپنا حصہ الگ کر لیں اور اپنا علیحدہ کوٹھا بنا لیں، مگر اس بات کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک روز سویرے سویرے مامی سارہ کو کسی کے ہاتھ طلاق نامہ بھجوا دیا گیا۔ نانی نے کہا تھا کہ اس کی زندگی میں سارہ اس گھر میں قدم نہ رکھے گی اور یہ کہ ماموں کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اپنی ماں کی اشیرباد چاہتے ہیں یا اپنی سکھنی کو بسانا۔

مامی سارہ دوڑی دوڑی آئی، ماموں کے پاؤں پکڑے، معافی مانگی مگر ماموں اس مینڈھے کی طرح تھے جو ایک بار بگڑ جائے، تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی۔ رشتہ داروں، گاؤں کے نمبردار اور دوسرے لوگوں نے لاکھ صلح صفائی کی کوششیں کیں، مگر ماموں کے سامنے کسی کی نہ چلی۔ آخر چلتی بھی کیسے۔ گھر میں دن رات نانی ان پر دباؤ ڈالتی تھی۔ اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے اپنی برادری سے کوئی سگھڑ لڑکی بیاہ کر لائے گی۔

مامی سارہ کو میں نے اس دن کے بعد نہیں دیکھا۔ سنا تھا کہ وہ تھوڑے دنوں تک گاؤں میں رہی پھر کسی دوسری جگہ پر اسے ایک گھرانے میں ملازمہ رکھ لیا گیا۔ جاتے ہوئے وہ گاؤں میں ہمارے قرابت داروں کے گھر پر ایک ٹرنک چھوڑ گئی تھی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آج تک وہیں پر پڑا ہے۔ ایک بار وہ گاؤں میں لوٹ کر آئی تھی مگر باہر باہر سے ہی واپس چلی گئی تھی۔ مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں گئی تھی اور اس کی بقیہ زندگی کیسے گزری۔

اسکے جانے کے تھوڑے عرصے کے بعد ماموں احمد خان نسیم رہا ہو کر پاکستان پہنچے۔ ان کی ساری زندگی قادیان میں گزری تھی، اس لیے انھوں نے آتے ہی احمدیوں کے نئے شہر ربوے میں مکان کا بندوبست کیا اور گاؤں سے نانی، خالہ، خالو، اپنی بیوی اور بچوں کو لے گئے۔ گاؤں میں دونوں ماموں اور چھوٹے ماموں کے بیٹے پیچھے رہ گئے۔ مامی سارہ کی غیر موجودگی میں انکے گھر کا تانا بانا ٹوٹ چکا تھا، اب وہاں پر کوئی عورت موجود نہ تھی جو اس گھر کو سنبھال سکتی۔

ماموں محمد خان کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تھا۔ وہ آپریشن کے لیے ہمارے پاس راولپنڈی آئے۔ ابا جی نے میونسپل ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے مشورہ کیا، کیونکہ وہ ماموں کو آپریشن کے لیے ٹیکسلا لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے کہا کہ وہ یہ آپریشن خود کرنے کے لیے تیار ہیں اور فیس بھی نہیں لیں گے۔ اس کے علاوہ وہ آپریشن ہمارے گھر پر کریں گے تاکہ ماموں کو ہسپتال

میں داخل بھی نہ کرانا پڑے۔ چنانچہ آپریشن ہمارے گھر پر ہوا۔ مجھے ماموں کے بستر کے پاس کھڑے ہو کر دیکھنے کی خاص اجازت ملی۔

ماموں نے آپریشن کرانے میں بہت دیر کر دی تھی اس کے باوجود وہ کامیاب رہا اور ماموں کو عینک لگ گئی جس کی مدد سے وہ تھوڑا بہت دیکھ سکتے تھے، مگر آخری برسوں میں ان کی آنکھیں جواب دے گئیں۔ ان کا گاؤں میں کوئی پرسانِ حال نہ رہا تھا۔ ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ انھوں نے کیوں نانی کی باتوں میں آکر مامی سارہ کو طلاق دے دی تھی۔ ماموں نے کہا کہ ماں کی فرماں برداری انسان پر فرض ہے، کیونکہ اس کے قدموں کے نیچے جنت پائی جاتی ہے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ شاید اس کے قدموں کے نیچے اگلے جہان کی جنت پائی جاتی ہے مگر بسا اوقات اس جہان کا جہنم بھی۔

ادب کی طرف پیش رفت

مجھے یاد ہے کہ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا جب مجھے بچوں کی کتابوں کی لائبریری بنانے کی تحریک ہوئی تاکہ ہمارے دوسرے سنگی ساتھی بھی، جن کا وقت کھیل کود میں گزرتا تھا، ان کتابوں کو پڑھ سکیں۔ چنانچہ میں نے اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا کر کتابیں خریدنی شروع کیں۔ جب ان کی تعداد بیس تک پہنچ گئی تو میں نے اپنے محلے کے بچوں میں مشہور کرا دیا کہ ان کو کتابیں پڑھنے کے لیے مفت میں مل سکتی ہیں۔ کتابیں ایک ہفتے کے لیے جاری ہوتی تھیں اور ان کا باقاعدہ رجسٹر میں اندراج ہوتا تھا۔ اس دوران میں نئی کتابیں خریدی جاتی رہیں، مگر پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور میں اپنے جیب خرچ میں سے اتنے پیسے پس انداز نہ کر سکتا تھا کہ ہر ہفتے نئی کتابیں خریدی جا سکیں اس لیے میں نے پیسے کمانے کے لیے ایک سائڈ بزنس کا اجرا کر دیا۔ میں ایک عرصے سے ڈاک کے ٹکٹ جمع کیا کرتا تھا، اب ان کو بیچنے کا اہتمام کیا جانے لگا مگر اس کام میں کچھ ایسا زیادہ منافع نہ تھا کیونکہ غیر ملکوں سے خط و کتابت پر خود میرا بہت سا خرچ اٹھ جاتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نفع بخش کاروبار پتنگیں بنا کر بیچنے کا تھا۔ بچے بازار سے بہت مہنگی پتنگیں خریدتے تھے، جس کے مقابلے میں میری پتنگیں نہ صرف کوالٹی کے اعتبار سے مقابلے کی ہوتی تھیں بلکہ بہت کم قیمت پر مل سکتی تھیں۔ یہ کام اتنا نفع بخش تھا کہ میں آسانی کے ساتھ ہر ہفتے تین چار نئی کتابیں خرید کر لائبریری میں رکھ سکتا تھا، مگر کسی طرح اس کاروبار کی بھنک، جو چھپ چھپا کر کیا جاتا تھا، اباجی کے کانوں میں پڑ گئی اور مجھے اس کام سے روک دیا گیا۔

ان دنوں میں مجھے راولپنڈی میں لکھنے والے بچوں کی ایک انجمن کے بارے میں پتا چلا جس

کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ میں اپنے کلاس فیلو محمد یونس کی ہمراہی میں وہاں پر پہنچا اور ممبر بن گیا۔ انجمن کے صدر ایوب صابر اور سیکریٹری وحید قیصر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنی کہانیاں رسالوں کو ان کی معرفت بھیجا کریں چنانچہ میں ان کو ایک کہانی دے آیا۔ جب میں دو ہفتوں کے بعد پھر وہاں پر گیا تو مجھے کہا گیا کہ میری کہانی چوری شدہ ہے۔ اس عرصے میں ''تعلیم و تربیت'' کا نیا شمارہ آیا تھا، جس میں میری کہانی سے ملتی جلتی کہانی چھپی ہوئی تھی اور لکھنے والے کو ایک انعام بھی ملا تھا۔ میرے لیے دلچسپ امر یہ تھا کہ لکھنے والا میرے کلاس فیلو رشید احمد کا بڑا بھائی تھا۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ ان کو سوچنا چاہیے تھا کہ میری کہانی رسالہ چھپنے سے پہلے ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ میں نے رشید سے بچوں کی ایک کتاب عاریۃً لے کر پڑھی تھی اور اس کے پلاٹ سے ملتا جلتا پلاٹ بنا کر خود ایک کہانی لکھی تھی۔ رشید کے بڑے بھائی نے بھی اسی کتاب کو پڑھ کر اپنی کہانی لکھی تھی، جس کے سبب ہماری کہانیوں میں مماثلت پیدا ہو گئی تھی، وگرنہ میری نظر سے رشید کے بھائی کی کہانی نہیں گزری تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس نے کوئی کہانی لکھی تھی۔ ابھی حال میں "نقوش" کے " گولڈن جوبلی نمبر۔ پچاس سالہ انتخاب" میں میری نظر سے عظیم بیگ چغتائی کا افسانہ "چینی کی انگوٹھی" گزرا ہے۔ اس میں بیان کردہ کہانی میری اس زمانے کی لکھی ہوئی کہانی سے مماثلت رکھتی ہے۔ مگر اس بات کا مجھے اس زمانے میں علم نہیں تھا۔ میں نے وہاں پر جانا چھوڑ دیا اور سوچا کہ اب میں ایک قلمی نام کے تحت لکھا کروں گا۔ اس طرح یحییٰ فضلی کا نام پیدا ہوا جس کو میں نے اپنے دادا (محمد فضل خان) اور نانا (فضل محمد خان) کے ناموں سے مشتق کیا تھا۔ میں گویا دونوں طرف سے فضلی تھا۔ اس نام کا استعمال میں صرف ان تحریروں کے لیے کرتا تھا جو چھپنے کے لیے لکھی جاتی تھیں، اسکول میں کسی کو اس قلمی نام کا پتا نہ تھا۔

میں نے خود بچوں کے لیے کتابیں لکھنے کا منصوبہ بنایا اور محمد ادریس کے ہمراہ کئی ایک پرنٹنگ پریسوں میں گیا۔ ایک پریس کے مالک نے ہمیں پرنٹنگ کے طریقِ کار سے آشنا کرایا اور بتایا کہ ہمیں پہلے کسی کاتب سے کتابت کرانی ہوگی۔ میں نے کہا کہ میرا خط بہت اچھا ہے اور میں خود کتابت کر سکتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہمیں اس کام کے لیے ایک خاص قسم کا روغن شدہ زرد کاغذ حاصل کرنا ہوگا، جس پر ایک خاص قسم کی سیاہی سے کتابت کی جاتی ہے۔ اس نے ہمیں ایک کاتب کا ایڈریس دیا، جو ایک گیراج میں رہتا تھا۔ کاتب صاحب نے ہمیں اپنے فن کی باریکیوں سے آگاہ کیا اور کتابت کے دو چار اصول بھی سمجھائے۔ ان سے میں نے روغن شدہ زرد کاغذ اور کتابت کے لیے استعمال ہونے والے روشنائی بھی خریدی، مگر پیشتر اس کے کہ کتابت کا کام شروع کیا جا سکتا اماں نے بچوں سمیت گاؤں میں جا کر رہنے کا پروگرام بنا لیا کیونکہ نانی اور دوسرے اہلِ خانہ کو چنگا میں گزر اوقات کے سلسلے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ

رہا تھا۔ مجھے قاضیاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا۔ قاضیاں ہمارے گاؤں سے اندازاً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور جانے آنے کے لیے سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بچوں کو پیدل چل کر جانا پڑتا تھا۔ قاضیاں کے اسکول کا معیار راولپنڈی کے اسکولوں کے مقابلے میں پست تھا۔ میں اور قیوم اپنی اپنی کلاسوں میں چوٹی کے طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ اس اسکول میں ہمیں خوش قسمتی سے تین غیر معمولی قابلیت کے حامل استاد ملے۔ ان میں پہلے نمبر پر آغا محمد اکرم تھے جو بی اے کا امتحان دینے کے بعد عارضی طور پر اپنے گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر لگے تھے۔ وہ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے، مگر اردو ادب سے خاص مس رکھتے تھے۔ انھوں نے ہمیں شفیق الرحمٰن کی ایک کتاب کے دو باب پڑھ کر سنائے، جو مجھے بے حد پسند آئے۔ میں نے اسی روز وہ کتاب لائبریری سے جاری کرائی اور رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹنے تک پڑھ ڈالی۔ اگلے روز میرے بستے میں شفیق الرحمٰن کی دوسری کتاب بندھی ہوئی تھی۔ میں نے باری باری لائبریری کی ساری ادبی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر میری توجہ دادا جان کی ذاتی لائبریری میں رکھی ہوئی تاریخی کتابوں کی طرف پھر گئی کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ ہمیں اسکول میں ہندوستان کی تاریخ اس طرح نہیں پڑھائی جاتی، جس طرح پڑھائی جانی چاہیے۔ چنانچہ میں نے خود ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، جس کا نام ''تاریخِ منیری'' قرار پایا۔ میں ہر روز اسکول سے واپسی پر تین چار گھنٹے اس کتاب کی تصنیف پر لگاتا تھا۔ پہلے ساٹھ صفحے لکھے جا چکے تھے جب اماں نے، جن کے عزیز اس دوران میں ربوے منتقل ہو گئے تھے، راولپنڈی واپس جانے کا پروگرام بنایا۔ میرے تایا زاد فضل الرحمٰن کی زبانی، جو میرا کلاس فیلو تھا، ہمارے ٹیچر انچارج محمد اعظم صاحب کو ''تاریخِ منیری'' کا پتا چلا اور انھوں نے اس کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس طرح میرا مسودہ ان کے ہاتھ لگا اور ان کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اسے میرے ہم جماعتوں کو املاء کرانا شروع کر دیا۔ عین ان دنوں میں ہماری راولپنڈی واپسی ہوئی اور میرا مسودہ ان کے پاس رہ گیا۔

کچھ برسوں کے بعد ہفتہ وار ''قندیل'' میں ایک کالم چھپنا شروع ہوا، جس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا، البتہ موضوع یہ تھا کہ اس شخص نے مجھے متاثر کیا اور میں اس کو نہیں بھلا سکتا، میں نے ایک مضمون ماسٹر محمد اعظم کے بارے میں لکھا۔ کسی ذریعے سے وہ مضمون ان تک پہنچا۔ ان کو چونکہ علم نہ تھا کہ یحییٰ فضلی کے نام سے کون لکھتا ہے اس لیے وہ قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ اس نام کے پیچھے کون پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ میرا ماموں زاد ناصر احمد خان تعطیلات میں ان کو خاص طور سے ملنے کے لیے گیا تو اس نے بتایا کہ مضمون نگار کون تھا۔ جرمنی آنے کے بعد میں نے سنا کہ ان کی شنوائی جاتی رہی تھی۔ میں نے ابا جی کو، جو اس دوران میں چنگا میں مقیم تھے، لکھا کہ ماسٹر محمد اعظم کے بارے میں پتا چلائیں کہ کیا ان کو آلۂ

صوت چاہیے۔ میرا ارادہ ان کو ایک ایسا آلہ بھیجنے کا تھا۔ ابا جی کی طرف سے جواب آیا کہ ماسٹر محمد اعظم کے پاس ایسا آلہ موجود ہے۔

تیسرے استاد کا نام عزیز بھٹی تھا۔ یہ نوجوان آدمی تھے اور ہمارے اسکول میں تھوڑے عرصے تک رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے بہت ترقی کی۔ گوجر خان کے اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور غالباً اسمبلی کے ممبر بنے۔ وہ بھڈانہ کے ہمسایہ گاؤں بھٹیاں کے رہنے والے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کے روز قائدِاعظم محمد علی جناح کی وفات کی خبر آئی تو ہم اپنی کلاسوں میں بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ اسکول کے اسٹاف نے ایک تعزیتی جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں استادوں کے علاوہ کسی طالب علم کو بھی تقریر کرنی تھی۔ ماسٹر عزیز بھٹی ہماری کلاس میں آئے اور مجھے باہر بلا کر کہا کہ مجھے تقریر کرنی ہو گی۔ میں فوراً اس کے لیے تیار ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل تحصیل گوجر خان کے اسکولوں کا ایک جلسہ قاضیاں میں منعقد ہوا تھا، جس میں مختلف اسکولوں کے طالب علموں کے درمیان تقریری مقابلہ ہوا تھا۔ میں اپنے اسکول کی طرف سے اس میں شامل ہوا تھا اور مجھے پہلا انعام ملا تھا۔

میرے والدین نے دادا جان کی فرمایش پر چنگا میں مکان بنایا تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں ہم ایک آدھ ماہ کے لیے وہاں پر جا کر ٹھیرا کرتے تھے، مگر اس سے قبل ہمیں لمبے عرصے تک وہاں پر رہنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس گھر میں کراکری سے لے کر کرسیوں میزوں، دریوں، قالینوں، بستروں اور کھانے پکانے کے برتنوں تک ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ اسی حویلی میں عمو جان کا بھی مکان تھا اس لیے جب بھی ہم میں سے کوئی چنگا آتا تھا، تو ہمیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ایک آدھ رات عمو جان کے گھر پر رہنے کے بعد ہم اپنے گھر میں منتقل ہو جاتے تھے، جہاں پر ہمیں ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں پکانا پڑتا تھا کیونکہ رشتہ دار باری باری ہمیں اپنے ہاں کھانے کے لیے بلاتے تھے۔ ناشتہ ایک فیملی کے ہاں ہوتا تھا تو دوپہر کا کھانا دوسری کے ہاں اور شام کا کھانا تیسرے گھرانے میں۔ اپنے گاؤں میں اس کا سلسلہ ختم ہوتا تھا تو ساتھ کی ڈھوک حیات بخش سے، جہاں پر ہمارا ننکانہ تھا، دعوتوں کے سندیسے ملنے لگتے تھے۔ میرے والدین کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ تھا اس لیے سارے کنبے کے ساتھ ان کا ملنا جلنا تھا۔ ایک بہت اچھی رسم ہمارے خاندان میں یہ تھی کہ عید کی نماز پڑھنے کے بعد سارے چھوٹے بڑے مل کر جلوس کی صورت میں گاؤں کی طرف لوٹتے تھے۔ نمازیوں کی یہ پارٹی اجتماعی صورت میں اپنے رشتے داروں کے راستے میں پڑنے والے سب سے پہلے مکان میں داخل ہوتی تھی، جہاں پر اس کی خاطر تواضع شیرینی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ایک دو لقمے کھانے کے بعد پوری پارٹی رشتے داروں کے اگلے مکان میں جانے کے لیے اٹھ جاتی تھی۔ کسی گھر کا استثنا نہ کیا جاتا تھا اور نہ ہی کوئی شخص پارٹی کے ساتھ چلنے سے انکار کرتا تھا۔ اس

طرح سال کے دوران پیدا ہونے والے جھگڑے خاموشی کے ساتھ نپٹا دیے جاتے تھے۔ چونکہ آدھے گاؤں کے ساتھ ہمارا قریبی رشتہ تھا اس لیے عید والے روز سارے گھروں کا چکر لگانے میں پورا دن لگ جاتا تھا۔ البتہ یہ پارٹی مردوں پر مشتمل ہوتی تھی کیونکہ صرف مرد عید گاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ عورتوں کو گھروں میں کھانا تیار کرنا ہوتا تھا اس لیے ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی عید پارٹی کے ساتھ چلتی تھی۔ اماں کا استثنا اس وجہ سے ہوتا تھا کیونکہ وہ مستقل طور پر چنگا میں نہیں رہتی تھیں۔

جب ہم کئی ماہ تک چنگا میں رہنے کے لیے آئے اور میرے بہن بھائیوں کو گاؤں کے اسکولوں میں داخل کرا دیا گیا تو ہم وہاں کے ماحول کا حصہ بن گئے۔ پہلی بار ابا جی نے اپنی زمینوں میں پیدا ہونے والی کاشت میں سے حصہ لیا، وگرنہ اس وقت تک انکا حصہ بھی عمو جان کو ملتا تھا۔ ہم نے کھیتوں میں ہل تو نہیں چلایا، کیونکہ ہماری زمینیں دوسروں کے پاس تھیں، البتہ عمو جان کے ڈنگروں کے لیے گھاس کاٹنے ہم بھی جاتے تھے اور اپنے گاؤں کی شاملات میرا سے کیکر کی لکڑی سر پر اٹھا کر لاتے تھے۔ اماں کو مکئی کی فصل بہت پسند تھی۔ ہر روز عصر کے وقت ہم میں سے کوئی بچہ کلوں کے گھر کی بھٹی سے مکئی کے دانے بھنوانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اماں مکئی کی روٹی بھی شوق سے کھاتی تھیں بالخصوص اگر ساگ کا سالن اسکے ساتھ ہوتا تھا۔ آئے دن ہمارے رشتے داروں کے گھروں سے ہمیں مکئی کی روٹی اور ساگ کا سالن بھیجا جاتا تھا۔ ابا جی کے ماموں مردان علی نے اماں کے لیے مکئی کا ایک پورا کھیت مختص کر رکھا تھا۔ ہمیں اجازت تھی کہ اس کھیت سے جس قدر چاہیں مکئی کے بھٹے توڑیں۔ جب فصل پک گئی تو اجی مردان علی نے سارے کھیت کی فصل لا کر ہمارے گھر میں ڈال دی، جس سے ایک پورا کمرہ بھر گیا۔ انھوں نے کہا: اب جی بھر کر مکئی کھاؤ۔

ہمارے گھر پر شام کے وقت بہت سے رشتے دار جمع ہو جاتے تھے کیونکہ میں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر تھیٹر کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے پہلی بار قادیان میں تھیٹر دیکھا تھا، جس نے ہم پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ بھائی نصیر اور قیوم وہاں پر دیکھی ہوئی ایک کہانی کو بدل بدل کر کھیلتے تھے جب کہ میں نے ایک نئی کہانی گھڑ لی تھی، جس میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ میں ریڈیو کھیلتا تھا جس کی خبریں اور دوسرے فیچر بہت دلچسپی سے دیکھے اور سنے جاتے تھے۔ اس بارے میں آپا نصیرہ نے ذیل کی تحریر لکھی تھی:

"موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں اور روزانہ شام کو ہمارے گھر کے کھلے دالان اور صحن میں چھڑکاؤ کیا جاتا۔ کرسیاں اور میز لگائے جاتے۔ چارپائیاں بچھتیں، ہلکے پھلکے بستر بچھائے جاتے، تکیے لگائے جاتے۔ پہلے تمام محلے کے بچے اکٹھے ہوتے پھر ارد گرد کی رشتے دار خواتین آ جاتیں اور منیر بھائی کی ڈرامیٹک کلب کے پروگرام شروع ہو جاتے۔ اور تو کچھ زیادہ ذہن میں باقی نہیں رہ گیا لیکن جو ایک بات

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ منیر کا ریڈیو پاکستان تھا۔ ایک میز، جس کے نیچے اوپر دو حصے تھے، اس پر بڑی چادریں ڈال کر زمین تک ڈھک دیا جاتا۔ بیچ میں منیر بھائی بیٹھ جاتے۔ چار بجے مل کر اس ریڈیو کو اٹھا کر لاتے اور منیر بھائی کی خود ساختہ خبریں نشر ہونی شروع ہو جاتی تھیں۔ سبھی سنتے، ہنستے اور انجوائے کرتے لیکن مجھے اس میں یاد رہ جانے والی بات ریڈیو کے کمرے میں واپسی پر منیر بھائی کی پسینے میں ڈوبی ہوئی اور لال سرخ صورت ہے۔ اس کی خوشی کی انتہا گرمی کو پسِ پشت ڈال دیتی اور وہ دوسرے ایٹم کے لیے تیار ہو جاتا۔ اور یہ اس کی شخصیت کا لازمی جزو ہے، جو آج تک اسے سوئی کی گھڑی جیسی پابندی سے دن رات کے پروگرام تشکیل دینے پر کمر بستہ رکھتی ہے اور آیندہ آنے والی زندگی میں اس کے ادب اور لکھنے پڑھنے کی لائن سے وابستہ ہونے کا اظہار تھا۔'' (شاہدہ عزیز: منیر کا تعارف۔ منیر الدین احمد کے افسانے۔ تنقیدی جائزہ از مقصور حسنی۔ پنجاب بک ڈپو، لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔ صفحہ ۵)

چنگا میں ہمارا قیام چند ماہ سے زیادہ نہ تھا مگر اس نے مجھ پر دیرپا اثر چھوڑا۔ مجھے اس عرصے میں گاؤں کی زندگی کا تجربہ ہوا، جس کی اقدار شہر کی زندگی سے مختلف ہیں۔ میری ملاقات وہاں پر کئی ایک کرداروں کے ساتھ ہوئی، جو آگے چل کر میرے افسانوں میں اہمیت کے حامل بنے۔ ان میں مولوی سعید ہے جس کی کہانی میں نے ''لینڈ لیڈی'' میں سنائی ہے۔ فضل خان عرف پھجو جھلا ہے جس نے ''رتے کنویں کے سائے میں زندگی'' گزار دی تھی۔ جیون خان ہے، جس کا نام اس کی کہانی کا عنوان بن گیا ہے۔ اسی کہانی میں سجاول ڈاکو کا کردار ہے، جس کے ساتھ میری ملاقات سچ مچ ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ جس شخص نے مجھے متاثر کیا وہ منشی ننھا خان تھا۔ اس کا اصل نام غلام رسول تھا اور وہ ڈھوک حیات بخش کا رہنے والا اور ہمارا دور کا رشتے دار تھا۔ وہ بونے قد بت کا منحنی سا آدمی تھا جس کے ساتھ ہم بچے کھڑے ہو کر اپنا قد ناپا کرتے تھے۔ دس بارہ سال کی عمر میں میرا قد اس سے بڑا ہو گیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ بہت نڈر اور صاحب الرائے انسان تھا۔ اس کی آواز اگرچہ پتلی سی تھی، مگر جب وہ بولتا تھا تو بڑے بڑے جغادری چپ ہو کر اس کی بات سنتے تھے۔ اس سے مشورہ لینے والوں کی اس کی دکان پر قطار لگی ہوتی تھی۔ وہ بہت مجلسی آدمی تھا اور صاحبِ علم لوگوں کی قدر کرتا تھا۔

عمو جان راجہ عبدالرحمٰن گاؤں کے مدرسے میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب ہم قادیان سے گرما کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو مدرسے میں کلاسیں لگ رہی ہوتی تھیں۔ میں اپنی مرضی سے کلاس میں جا کر بیٹھتا تھا اور جب کبھی شور مچانے پر یا کسی اور وجہ سے پوری کلاس کو مرغا بننا پڑتا تھا تو میں بھی سزا پانے والوں میں شامل ہوتا تھا۔ کتنی ہی بار میں نے عمو جان سے بید کی سزا پائی۔ عمو جان کی پیدائش ۱۸۹۴ء کی تھی اور ابا جی سے عمر میں چھ سال بڑے تھے۔ انھوں نے میٹرک کرنے کے بعد ایس وی کیا تھا اور کئی

جگہوں پر اسکول ٹیچر رہے تھے۔ پھر دادا جان کی خواہش پر اپنی تبدیلی چنگا کرالی کیونکہ دادا جان چاہتے تھے کہ ان کا ایک بیٹا انکے پاس مقیم رہے۔ عمو جان کی طبیعت میں سختی تھی جسکے سبب ہر کوئی ان سے کتراتا تھا۔ اپنے بچوں کو بہت نصیحتیں کیا کرتے تھے جس کا اثر اکثر الٹا ہوتا تھا۔ بچوں کو چھوٹی سی لغزش پر بہت بے دردی سے سزا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ بھی سختی سے پیش آتے تھے، اس وجہ سے بچے ان سے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جس روز ان کو صبح کی سیر کے دوران دل کا دورہ ہوا اور وہ راستے میں گر گئے، تو ان کی بیٹی خالدہ کو، جس نے انھیں ایک کھیت کے کنارے زمین پر لیٹے ہوے دیکھا تھا، جرأت نہ ہوئی کہ ان سے جا کر پوچھتی کہ وہ کس وجہ سے زمین پر پڑے ہوے ہیں۔ وہ ڈر کی ماری چپکے سے کھسک گئی اور گھر پر بھی کسی کو نہ بتایا (یہ بات خالدہ نے مجھے پینتالیس برسوں کے بعد بتائی، جب وہ اپنے خاوند محمد عظیم خالد کے ساتھ یہاں پر جرمنی میں ہمارے پاس آئی تھی)۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب کسی نے ان کو زمین پر پڑے ہوے دیکھا اور اٹھا کر گھر پہنچایا تو ٹھنڈ لگنے سے غالباً نمونیا ہو چکا تھا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ یہ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ بے جی اقبال بیگم نے بیوگی کا لمبا عرصہ گزارا، جسکے دوران انھوں نے اپنے گھر بار کو بہت سلیقے اور ہوشیاری کے ساتھ چلایا۔ وہ عمو جان کی ضد تھیں: نرم دل اور زبان کی میٹھی۔ انھوں نے خاندان کے سب بچوں کے ساتھ بہت پیار محبت کا سلوک کیا، جس کے سبب ہم میں سے ہر کوئی یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس کو دوسروں سے بڑھ کر چاہتی ہیں۔ بے جی نے ۱۹۷۴ء میں وفات پائی۔

عمو جان کے گھر کے ایک حصے میں دادا جان کی مسجد تھی، جہاں پر بیٹھ کر انھوں نے معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کی تھیں۔ وہاں پر ہی انکی لائبریری پائی جاتی تھی، جس میں کتابیں اسی طرح دھری تھیں، جیسی وہ دادا جان کی زندگی میں رکھی ہوئی تھیں۔ انکی وفات کو دس برس گزر چکے تھے، دادا جان کی اپنی تصنیف کردہ کتابوں کے نسخے بدستور ایک بڑی میز پر پڑے تھے۔ انکو محفوظ کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ آئے دن ہندوستان کے دور دراز کونوں سے دادا جان کی کتابوں کے آرڈر آتے تھے۔ عمو جان وی پی پارسل بھیج دیتے تھے، ان کو اس سے زیادہ ان کتابوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ مسجد میں شاید کسی نے کبھی صفائی نہیں کی تھی، میں نے چنگا میں قیام کے دوران اس طرف توجہ دینی شروع کی۔ نصیر کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، اس لیے وہ اپنی پسند کی کتابیں اٹھالاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دوسرے زائرین اور مہمان بھی مسجد میں سے دادا جان کی کتابیں لے جاتے تھے، اس لیے میں نے چاہا کہ اس لائبریری کی باقاعدہ فہرست بنائی جائے اور کتابوں کو باہر نکال کر ان کو دھوپ دکھائی جائے۔ بعض کتابوں کو دیمک لگ چکی تھی، دوسری کتابیں بھی اچھی حالت میں نہ تھیں۔ اس کام میں میرا ہاتھ میرا چچا زاد بھائی عزیز الدین احمد بٹایا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے ایک برس چھوٹا تھا اور عام طور سے ہر کام میں میرے ساتھ شریک

ہو جاتا تھا۔ پہلے ہی روز ہمارا سامنا مسجد میں ایک سانپ سے ہوا، جسے ہماری سرگرمی بالکل پسند نہ تھی۔ وہ ہم سے اور ہم اس سے ڈر کر بھاگے۔ عمو جان ہمارا شور سن کر موقع پر پہنچ گئے اور ہم پر بہت ناراض ہوے۔ سانپ مسجد سے باہر نکل گیا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہاں پر صرف ایک سانپ رہتا تھا یا اسکا پورا کنبہ رہایش پذیر تھا۔ عمو جان نے ہمیں مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا البتہ وہ بھی سانپ کے ہمسائے میں نہیں رہنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے بیٹوں عبدالحنان اور بشیرالدین احمد کے سپرد مسجد کی صفائی کا کام کیا، گویا عین وہ کام جو میں اور عزیز کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

اس مسجد کا ذکر میرے افسانے ''مامی سارہ'' میں ذیل کے الفاظ میں آیا ہے:

''تین روز تک موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان کے بند کھول دیے گئے ہوں۔ آدھا گاؤں ڈھے گیا۔ پہلے روز کچے کوٹھے گرے، پھر نیم پختہ مکانوں کی چھتیں بیٹھنے لگیں۔ تیسرے روز دادا جان کی مسجد نے گھٹنے ٹیک دیے۔ مسجد کیا گری دادا جان کی عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر گیا۔ انھوں نے اپنی عمر کتابیں جمع کرنے، پڑھنے اور لکھنے میں صرف کر دی تھی اور ساری کتابیں مسجد میں دھری تھیں۔ دادا جان کو آنکھیں بند کیے ہوے بہت دن ہو گئے تھے مگر اس روز تک ان کی مسجد میں ہر چیز ویسے ہی رکھی ہوئی تھی جیسے ان کی زندگی میں۔ ان کا تخت پوش بدستور محراب میں بچھا ہوا تھا البتہ محراب کی کھڑکی، جو گلی میں کھلتی تھی، اب بند رہتی تھی۔ دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی تھیں۔ جب چھت کی کڑیاں ٹوٹیں تو الماریاں بھی زمین بوس ہو گئیں۔ کتابوں کو پانی اور کیچڑ میں سے نکالنا آسان کام نہ تھا۔ میرے سپرد بچی کھچی کتابوں کو گھر کے محفوظ حصوں میں منتقل کرنا تھا، جب کہ میرے تایازاد بھائی، جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے، گھٹنوں تک پانی اور کیچڑ میں دھنسے ہوے تھے اور ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو اٹھانے اور کتابوں کو الماریوں میں سے نکالنے میں لگے ہوے تھے۔ ساری کوششوں کے باوجود بہت تھوڑی کتابیں بچائی جا سکیں۔''

جب اماں کی والدہ اور دوسرے عزیز چنگا کو خیرباد کہہ کر ربوہ چلے گئے تو اماں نے راولپنڈی لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی میں مجھے اسلامیہ ہائی اسکول میں دوبارہ داخلہ مل گیا، بلکہ مجھے اپنے سابقہ ہم جماعتوں کے ساتھ ایک ہی سیکشن میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی البتہ اس دوران میں اے اور بی سیکشنوں کے لائق طالب علموں کے نام بورڈ آف ایجوکیشن کی طرف سے لیے جانے والے ورنیکلر مڈل کے امتحان کے لیے بھیجے جا چکے تھے، جس میں کامیابی کی بنا پر حکومت کی طرف سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ان طالب علموں کی علیحدہ کلاس بنا دی گئی، جس میں مجھے بھی شامل کر دیا گیا کیونکہ میرا نام قاضیاں سے بھیجا جا چکا تھا۔ کلاس کے لیے علیحدہ کمرہ اسکول میں موجود نہ تھا اس لیے ہماری کلاس کمپنی باغ کے درختوں کے

نیچے لگتی تھی۔ انچارج ایک ایسا استاد تھا، جو ادب کا شائق اور خود بھی شاعر تھا۔ وہ ہمیں غالب، اکبرالہ آبادی، حالی اور اقبال کی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ پتا نہیں میرے دوسرے ہم جماعتوں کو وہ متاثر کر سکا یا نہیں، میرے اندر اس نے ادب کے لیے جلنے والی چنگاری کو مزید جلا بخشی۔ ان دنوں کا ایک واقعہ میرے ذہن میں ابھی تازہ ہے۔ ایک امتحان میں اردو کا پرچہ لکھے جانے کے بعد ہم کوئی دوسرا پرچہ لکھ رہے تھے کہ میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ ان کے کمرۂ امتحان میں ماسٹر طوطی صاحب (منظور احمد) نے میرے پرچے کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ منیر کے اندر ایک ادیب چھپا بیٹھا ہے جو ایک روز باہر نکل آئے گا۔

ورنیکلر مڈل کی تیاری دو تین مہینوں تک جاری رہی، جس کے دوران ہم سب طالب علم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور ہم نے اپنی کرکٹ ٹیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ کھیل کے لیے ضروری سامان مثلاً بلّے، گیند، وکٹ، پیڈ وغیرہ ہمیں اسکول کی طرف سے مہیا کیے گئے۔ کمپنی باغ کی انتظامیہ نے ہمیں کھیل کے لیے گراونڈ الاٹ کر دی۔ یہ ٹیم، جس میں ہماری کلاس کے چوٹی کے طالب علم شامل تھے، آئندہ دو برسوں تک باقاعدگی کے ساتھ ہر اتوار کو پریکٹس کرتی اور دوسری ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلتی رہی۔ ہم سب اس سے پہلے بھی ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے مگر ہمارے درمیان دوستی کا وہ رشتہ پیدا نہ ہوا تھا جو کرکٹ ٹیم میں کھیلنے سے پیدا ہوا۔ میٹرک کرنے کے بعد، جب میں پنڈی کو خیر باد کہہ گیا اور صرف تعلیمی اداروں کی تعطیلات کے دوران وہاں پر آتا تھا، مجھے پتا تھا کہ میں اپنے ہم کلاس دوستوں سے کہاں پر مل سکتا ہوں۔ سالہا سال تک یہ ٹولی شام سے پہلے کمپنی باغ میں ملتی اور گپ بازی کرتی تھی۔

اماں نے چنگا سے پنڈی واپس لوٹنے کے بعد پھر سے لجنہ اماء اللہ کی ذمے داری سنبھال لی اور مسلم لیگ کی طرف سے آبادکاری کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اماں کی صحت پر کام کا بے حد اثر پڑا۔ انھیں دمے کا مرض بہت عرصے سے تھا جس میں ہر قسم کے علاج کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ اب کھانے کی بے قاعدگی اور کام کی زیادتی کے سبب، جس میں مہینوں تک ایک دن کا بھی وقفہ نہ پڑتا تھا کیونکہ اماں اتوار کو بھی چھٹی نہ کرتی تھیں، ان کا وزن گرنے لگا اور کمر میں درد رہنے لگا۔ ایک روز مسلم لیگ کی خواتین کی شاخ کی مجلسِ عاملہ نے مری کا تفریحی سفر کرنے کا پروگرام بنایا اور اماں کو اصرار کر کے اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کیا۔ اس روز مری میں موسمِ سرما کی پہلی برف باری ہوئی تھی، جس سے سبھی بے حد محظوظ ہوئے مگر واپسی کے سفر پر بس کی بریکیں جواب دے گئیں۔ دو تین میل کی اترائی سب پر قیامت ڈھا گئی مگر خدا نے رحم کیا اور راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئی اور حادثہ نہ ہوا۔ بس کو اگلے موڑ پر اونچائی کا سامنا کرنا پڑا تو خود بخود رک گئی۔

اس رات جب اماں گھر پہنچیں تو ان کا کمر درد ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اگلے روز وہ بستر پر سے اٹھنے کے قابل نہ تھیں۔ چند روز تک گھر پر علاج کرانے کے بعد اماں کو ہولی فیملی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا، جہاں پر ڈاکٹروں نے انکی کمر اور پیٹ پر ایک پلستر لگا دیا، جس کے سبب انکی ریڑھ کی ہڈی جکڑ کر رہ گئی۔ خیال تھا کہ اس طرح ریڑھ کی ہڈی کو سکون ملے گا، مگر درد بدستور قایم رہا اور جب دو ماہ کے بعد پلستر اتارا گیا، تو اماں کے جسم کا نچلا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔

اس عرصے میں پاکستان اور ہندوستان کے مابین ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے طرفین کو مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے سرکاری وفد بھجوانے کی اجازت تھی۔ حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ اس کام کے لیے عورتوں میں سے بھی کمشنر بنا کر بھجوائے جائیں کیونکہ عورتیں ان معاملات کو، جو عورتوں سے متعلق ہوں، زیادہ بہتر طریق سے سمجھ اور سلجھا سکتی ہیں۔ مسلم لیگ کی طرف سے، جو نام پیش کیے گئے، ان میں اماں کا نام بھی شامل تھا۔ جب ان سے اس بارے میں مشورہ کیا گیا تو اماں نے فوراً یہ ذمے داری اٹھانے کی ہامی بھر لی اور کہا کہ اگر ان کی صحت نے اجازت دی تو وہ ضرور اس مستحسن کام میں شریک ہوں گی مگر یہ خدمت اماں کی قسمت میں نہ لکھی تھی۔ ڈاکٹروں نے غلط علاج کے ذریعے ان کو چلنے پھرنے سے معذور بنا دیا تھا۔ اماں نے اپنی زندگی کے آخری دو سال بسترِ علالت پر گزارے۔ اس حالت میں بھی ان کے پاس آنے والی حاجت مند عورتوں کا سلسلہ دن رات جاری رہتا تھا اور اماں حتی الامکان ان کے مسایل کو حل کرنے کی سعی کرتی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے پاس لامتناہی دولت تھی جس کو وہ دونوں ہاتھوں سے لٹا سکتی تھیں، ان کو اللہ نے ایمان اور توکل کی دولت سے مالا مال کیا تھا اور کردار کی سلامتی سے نوازا تھا۔

میرے اندر ادب کا شوق قاضیاں کے اسکول کے دنوں سے پیدا ہو چکا تھا۔ راولپنڈی آ کر اس شوق کو پورا کرنے کا سامان پیدا ہو گیا۔ ''کتاب گھر'' نامی دکان سے ادبی کتابیں کرایے پر لی جا سکتی تھیں۔ بھائی نصیر ہر دوسرے تیسرے روز وہاں سے ناول لانے لگا، جو اس کے علاوہ میرے اور نصیرہ کے مطالعے میں آتے تھے۔ اس کے علاوہ جدید شاعر جمیل ملک ہمارے ہمسائے میں رہتے تھے، وہ ترقی پسند تحریک میں شامل تھے اور ان کے پاس ہندو پاک سے بیشتر ادبی رسایل آتے تھے، جن کو میں پڑھنا چاہتا تھا۔ جمیل ملک کے بھائی کلیم ملک کی سالی عزیزہ بی بی ہماری ہم عمر تھی۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، میں تم کو رسالے لا دیا کروں گی، تم پڑھنے کے بعد واپس کر دینا، میں ان کو چپکے سے جمیل بھائی کی الماری میں پہنچا دیا کروں گی۔ اس طرح میرا تعارف ترقی پسند ادب سے ہوا، یہاں تک میں خود بھی اپنے آپکو ترقی پسندوں میں شمار کرنے لگا۔

بھائی نصیر کے بارے میں میں نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ اس سے شہر کی کوئی لائبریری محفوظ نہ

تھی۔اس کا دن بھر کا پروگرام ہم سب سے مختلف تھا۔اس کو راولپنڈی آنے کے بعد اسکول میں داخل نہ کرایا گیا تھا،اس لیے وہ صبح سویرے اخباریں پڑھنے کے لیے ایک قریبی لائبریری کا رخ کرتا تھا، جہاں پر کتابیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ صرف ڈیلی اخباریں رکھی جاتی تھیں،جن کو پڑھنے کے لیے محلے کے سفید پوش وہاں پر جا کر بیٹھتے تھے۔بعض لائبریریوں میں ریڈیو سیٹ بھی پائے جاتے تھے اور دن میں دو تین بار خبریں سننے کے لیے کافی خلقت جمع ہو جاتی تھی۔نصیر کو پتا تھا کہ کس لائبریری میں کون سی اخبار مل سکتی ہے اس لیے وہ ایک خاص پروگرام کے تحت ان کا چکر لگاتا تھا۔اس کی عادت تھی کہ گھر میں جمع شدہ اخباریں اور رسالے ردی میں بیچ کر تھوڑی سی پونجی پیدا کر لیتا تھا۔ یہ چیز ایک بار اس کو تھانے میں پہنچانے کا باعث بن گئی۔ ہوا یہ کہ اس نے ایک لائبریری کی پرانی اخباریں جمع کر کے بیچنی شروع کر دیں۔لائبریری کے کرتا دھرتا خود دکاندار تھے۔انھوں نے دیکھا کہ ان کی ردی غایب ہونے لگی ہے۔ ایک روز انھوں نے نصیر کو اس کے تھیلے سمیت پکڑ لیا اور تھانے میں لے گئے،جو ہمارے گھر کے قریب واقع تھا۔تھانیدار نصیر کو جانتا تھا،اس نے اباجی کو بلا بھیجا کہ بیٹے کو سمجھا دیں کہ یہ چیز چوری کے مترادف ہے۔اس طرح یہ بات آئی گئی ہوگئی۔نصیر نے یہ کام تو چھوڑ دیا مگر لائبریریوں کا روز کا چکر اس سے ساری عمر نہ چھوٹ سکا۔

راولپنڈی سے ان دنوں میں روزنامہ ''تعمیر'' نکلنا شروع ہوا تھا،جس کی ادارت میں نسیم حجازی شامل تھے۔وہ ایک تاریخی کالم کے انچارج تھے۔میں نے اس کالم میں مضامین لکھنے کا ارادہ باندھا۔ جب میں پہلی بار ایک مضمون لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا،تو انھوں نے اس کو غور سے پڑھا،میری طرف دیکھا اور کہا: ''برخوردار،تمھارا نہ صرف خط اچھا ہے بلکہ تم لکھتے بھی بہت خوب ہو۔'' اگلے روز میرا مضمون اخبار میں چھپا ہوا تھا۔پھر جب تک میں راولپنڈی میں رہا باقاعدگی کے ساتھ میرے مضامین وہاں پر چھپتے رہے۔

اماں نے ہمارے لیے ڈاک کے ٹکٹوں کا ایک البم نیلامی میں خریدا تھا،جس میں کسی ہندو لڑکے نے تین سو کے قریب دنیا کے مختلف ملکوں کے ٹکٹ چسپاں کر رکھے تھے۔وہ پنڈی کو چھوڑتے ہوئے البم ساتھ نہ لے جا سکا تھا جس کو ''دشمن کی پراپرٹی'' قرار دے کر نیلام کر دیا گیا تھا۔انھی دنوں میں ہمارے ایک ہمسایہ خاندان کے لڑکے سلطان محمود نے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کے کام کو کاروباری پیمانے پر چلانے کی بنیاد ڈالی۔اس کی قلمی دوستی بہت سے ملکوں میں ٹکٹ جمع کرنے والوں کے ساتھ تھی جن کے ساتھ وہ ہندوستانی اور پاکستانی ٹکٹوں کا تبادلہ کیا کرتا تھا۔اس نے ''کتاب گھر'' سے اجازت لے کر وہاں پر ٹکٹوں کے پیکٹ فروخت کے لیے رکھنے شروع کر دیے۔اس کے ساتھ میری دوستی یہ رنگ لائی کہ

میں بھی ٹکٹ جمع کرنے والوں کے کلبوں کا ممبر بن گیا اور بیرونی ممالک سے میرے نام خطوط آنے لگے۔ تبادلے کے لیے ہندوستانی اور پاکستانی ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے میں نے دہلی سے شایع ہونے والے بچوں کے رسالے ''کھلونا'' میں ایک اشتہار چھپوایا، جس میں یہ درج تھا کہ مقامی ٹکٹوں کے بدلے میں مجھ سے غیر ملکوں کے ٹکٹ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اشتہار چھپنے کی دیر تھی کہ میرے نام ہر روز بیس پچیس خط آنے لگے، جو ہمارے چھوٹے سے لیٹر بکس کو بھر دیتے تھے۔ ابا جی سے یہ چیز کئی ماہ تک پوشیدہ رہی کیونکہ ڈاک ان کی غیر حاضری میں آتی تھی، مگر کسی طریق سے یہ راز ظاہر ہو گیا اور ابا جی نے مجھ سے باز پرس کی، کیونکہ انکو صاف نظر آ رہا تھا کہ میں دن کا بہت سا وقت خط و کتابت اور ٹکٹوں کے تبادلے پر صرف کر دیتا تھا۔ ابا جی نے سختی سے مجھے اس کام سے روکا اور البم کو آگ کی نذر کر دیا

ملک کی آزادی کے بعد اکا دکا انگریز پاکستان میں رہ گئے تھے، جن کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ نہیں لکھا گیا۔ میں نے ایک ایسے انگریز کی کہانی اپنے افسانے ''رچرڈ رائٹ'' میں سنائی ہے جس میں سے ذیل کا اقتباس لیا گیا ہے:

''میرا اسکول عین اس سرحد پر واقع تھا، جہاں سے آگے صدر کا علاقہ شروع ہوتا تھا، جس کے ساتھ ہندوستانی آبادی کا کم ہی سروکار تھا۔ کبھی کبھار میں اپنے سنگی ساتھیوں کے ہمراہ گھومنے پھرنے کے لیے میسی گیٹ چلا جاتا تھا۔ وہاں پر انگریز میمیں اپنے مردوں کی باہوں میں باہیں ڈالے مٹر گشت کر رہی ہوتی تھیں۔ ان کی ننگی پنڈلیاں، آدھی باہوں والے بلاؤز، کٹے ہوئے بال اور لپ اسٹک سے رنگے ہوئے سرخ ہونٹ دیکھ کر راولپنڈی پر انگلستان کے کسی متوسط درجے کے شہر کا گمان ہوتا تھا، جس کے بارے میں ہم نے اپنی انگلش ریڈر میں پڑھ رکھا تھا۔ یہ بات ہندوستان کی آزادی سے قبل کی ہے جب ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ برٹش انڈیا کے دن گنے چنے ہیں۔

پھر، جیسے چڑیاں پُھر سے اڑ جاتی ہیں، اس طرح ایک روز انگریز غایب ہو گئے تھے۔ صرف اکا دکا باقی رہ گئے تھے جو ڈار سے بچھڑ جانے والے پرندوں کی طرح گو اچ ہوے لگتے تھے۔ یہ لوگ شاید کم حیثیت رکھنے والے تھے کیونکہ وہ اکثر بائیسکلوں پر سوار گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس کاریں نہیں تھیں اور نہ ہی ان کی رہایش بنگلوں میں تھی۔ ان کو دیکھ کر ہم آپس میں چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے کہ ان کا انگلستان میں شاید کوئی والی وارث نہیں ہے ورنہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ گئے ہوتے، جس کے بارے میں ہم اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ وہاں پر دولت کی ریل پیل ہو گی اور ہر شخص مزے کی زندگی گزارتا ہو گا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک اتوار کی دوپہر کو ایک سائیکل سوار انگریز ابا جی کی معیت میں ہمارے

گھر آیا تھا۔ دونوں آپس میں انگریزی بول رہے تھے مگر مجھ سے اس نے اردو میں بات کی تھی۔ اس کا تلفظ تھوڑا نامانوس تھا مگر وہ سہولت کے ساتھ اردو بول رہا تھا۔ اس کی اردو بہر صورت میری انگریزی سے بہتر تھی، جس کی اس نے خدا جانے کیوں تعریف کی تھی اور کہا تھا:

اٹنا چوٹا بابا اٹنی اچھی انگریزی بولٹا ہے۔

دوپہر کا کھانا اس نے ہمارے ہاں کھایا تھا بلکہ اس کے بعد یہ معمول بن گیا اور وہ ہر اتوار کو ہمارے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے آنے لگا۔ اباجی نے بتایا کہ وہ مسلمان بننا چاہتا ہے اور پاکستانی شہریت حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ اباجی کے ساتھ اس کا ملنا کسی دفتری کام کے سلسلے میں ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اس کی اسلام میں دلچسپی کا پتا چلا تو اباجی کی تبلیغی رگ پھڑک اٹھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہ پسند کرے تو وہ ہر اتوار کو اس کے لیے تین چار گھنٹے نکالنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر یہ طے پایا کہ وہ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھایا کرے گا۔ یہ سلسلہ دو برسوں تک جاری رہا اور اس میں شاید ہی کبھی ناغہ ہوتا تھا۔''

اس کہانی کا خاتمہ اس انگریز کے قتل پر ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کی کہانی سنا کر اس کے نام کو ادب میں محفوظ کر دوں چنانچہ کہانی کا خاتمہ اس طرح تھا:

..... رچرڈ ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنی مرضی سے راولپنڈی میں رہ گیا تھا، پاکستانی شہریت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دو برسوں تک ہر اتوار کے روز ہمارے گھر پر آیا کرتا تھا، جہاں پر اباجی اس کو اسلام کی تعلیم کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ میں نے اسے ایک بار صدر کے علاقے میں ایک انگریز عورت کے ساتھ دیکھا تھا جس کو وہ اپنی سائیکل پر بٹھا کر لے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سائیکل سے اتر گیا تھا اور اس نے کہا تھا:

''ام اس اورت کے سات شادی بنائے گا۔''

مگر بدقسمتی سے اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک شام کو، جب وہ چک لالہ سے اصغر مال روڈ کی طرف سائیکل پر جا رہا تھا، کسی ڈاکو نے اس کو لوٹنا چاہا۔ اس زمانے میں یہ سڑک بالکل سنسان علاقے میں سے گزرتی تھی۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ڈاکو نے اسے امیر آدمی سمجھتے ہوئے چاقو سے اس پر حملہ کیا، پھر اس کو زخمی حالت میں چھوڑ کر اس کی سائیکل لے کر بھاگ گیا۔ رچرڈ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے میڈیکل ایڈ ملنے سے پہلے مر گیا۔ میں بھی اباجی کے ساتھ اس کے جنازے میں شامل ہوا تھا البتہ اس کی تدفین انگریز کالونی کے اصرار پر گوروں کے قبرستان میں ہوئی تھی۔''

اماں کی بیماری کا سلسلہ لمبا ہوتا چلا گیا جس کے سبب ہمارے گھر پر حاجت مند عورتوں کے

ساتھ ساتھ بیمار پرسی کے لیے آنے والیوں کا ہجوم رہنے لگا۔اس ماحول میں ہم بچوں کے لیے گھر میں پڑھنے لکھنے کا کوئی ماحول موجود نہ تھا۔دن کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا، جب ہم اطمینان سے بیٹھ کر اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دے سکیں۔اس طرح میں نے نویں اور دسویں جماعت کا زمانہ گزارا۔میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی اس وجہ سے ٹھیک سے نہ ہوسکی۔کتنی ہی بار مجھے اماں کی طبیعت کے سخت خراب ہوجانے پر ابا جی کو دفتر سے جا کر لانا پڑا۔ابا جی نے اماں کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور اپنا سارا اثاثہ اس پر لگا دیا تھا۔مجھے نظر آ رہا تھا کہ میں ان حالات میں اپنی تعلیم کو کالج میں جاری نہ رکھ سکوں گا۔مجھے یاد ہے کہ میٹرک کے امتحان سے پہلے انگریزی کے استاد ماسٹر غلام محمد (جی۔ایم صاحب) نے ہماری کلاس میں ان طالب علموں کو ہاتھ بلند کرنے کے لیے کہا، جو میٹرک کے بعد اپنی تعلیم کو کالج میں جاری رکھنا چاہتے ہیں مگر جن کے خاندان کی مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی۔میں بھی ہاتھ کھڑا کرنے والوں میں شامل تھا۔میں نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔نتیجہ نکلنے والے روز اماں ہسپتال میں داخل تھیں۔میں ان کو یہ خبر دینے کے بعد گھر واپس لوٹا تو جماعتِ احمدیہ کا آرگن روزنامہ ''الفضل'' آیا پڑا تھا۔اس میں پہلے صفحے پر اشتہار چھپا ہوا تھا، جس میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے والوں کو زندگی وقف کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والوں کو جماعت کے خرچ پر کالج میں داخل کیا جائے گا اور انجینئرنگ کی تعلیم دلائی جائے گی۔سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں کو جامعہِ احمدیہ میں داخل کیا جائے گا۔میں نے اسی روز کسی کو بتائے بغیر ایک کارڈ ربوے لکھ بھیجا کہ اماں نے میری زندگی وقف کر رکھی ہے۔اس طرح مجھے امید تھی کہ میں کالج میں اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکوں گا۔

چند روز کے بعد مجھے ربوہ سے خط موصول ہوا کہ اپنے مقامی امیرِ جماعت سے تصدیقی چٹھی لے کر فلاں روز انٹرویو کے لیے پہنچ جائیں۔ربوے کی بستی جماعتِ احمدیہ نے چنیوٹ کے قریب دریائے چناب کے کنارے ایک بنجر زمین خرید کر بنائی تھی، جس کی تمام عمارتیں اس زمانے میں کچی تھیں۔مجھے انجمن تحریکِ جدید کے دفتر میں حاضر ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔یہ چوکور عمارت اس طرح بنی ہوئی تھی کہ چاروں طرف دفاتر کے کمرے تھے اور درمیان میں کشادہ صحن تھا۔جب میں وہاں پر پہنچا تو پہلا شخص، جس کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا، وہ پیام شاہجہان پوری تھے جو اس زمانے میں تحریکِ جدید کے کارکن تھے۔بعد میں انھوں نے ربوے کو خیر باد کہہ کر صحافت کو اپنایا اور اپنی وفات تک لاہور سے رسالہ نکالتے رہے۔میرے علاوہ چھ یا سات دوسرے نوجوان انٹرویو کے لیے آئے ہوئے تھے۔اتفاق ایسا تھا کہ ہمارا انٹرویو عین اس کمرے میں ہوا، جس میں مجھے آگے چل کر دو برسوں تک قیام کرنا تھا۔انٹرویو لینے والے بورڈ کے ممبروں میں سے مجھے تین یاد ہیں: مولوی جلال الدین شمس اور مشتاق احمد باجوہ لندن میں احمدی

مشنری رہ چکے تھے جب کہ چوہدری فقیر محمد سابق ڈی ایس پی تھے، جو لمبے عرصے تک راولپنڈی میں رہ چکے تھے اور ہمارے خاندان سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ابا جی کا نام سنتے ہی اماں کی خدمات گنوانا شروع کر دیں اور میرا انٹرویو درمیان میں ہی رہ گیا۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھا گیا۔ چند منٹوں کے بعد مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا گیا۔ باری باری سب امیدوار پیش ہوئے اور آخر میں سب کو جامعہِ احمدیہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی گئی، جہاں پر ان کو عربی کی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ میرے علاوہ مزید ایک لڑکا اس گروپ میں شامل تھا جس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہمیں اگلے روز احمد نگر میں جا کر جامعہِ احمدیہ میں داخلے کی کارروائی پوری کرنے کا حکم ہوا، جو ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ مجھے اس بات پر بہت رنج ہوا کہ اشتہار میں کچھ بیان کیا گیا تھا اور اب سب امیدواروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا تھا۔ ماموں احمد خان نسیم نے، جن کے پاس میں ٹھیرا ہوا تھا، مجھے جماعت کے فیصلے پر عمل کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اسی میں بہتری ہے۔ مجھے پتا تھا کہ اماں اور ابا جی بھی مجھے یہی مشورہ دیں گے کیونکہ دونوں اپنی روحیں جماعتِ احمدیہ کے پاس گروی رکھ چکے تھے۔ میں دل آزردہ ہو کر راولپنڈی واپس لوٹ گیا مگر میرے سامنے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

اماں ہسپتال سے گھر آ گئی تھیں۔ ان کے دھڑ کا نچلا حصہ مفلوج ہو چکا تھا مگر بالکل بے حس نہیں تھا۔ اس حصے میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جو نہایت تکلیف دہ تھا۔ ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس پھوڑے کو کس طریق سے قابو میں کیا جائے۔ ابا جی کے ایک احمدی دوست فضل محمد خان شملوی کا دعویٰ تھا کہ وہ مسمریزم کے ذریعے علاج کر سکتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کے کسی محکمے میں افسر تھے اور دفتر سے واپسی پر گھر جانے کی بجائے اپنے مریضوں کے پاس جاتے تھے۔ ہمارے گھر پر وہ شام کو آتے تھے اور اماں کے بستر پر اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر کوئی عمل کرتے تھے۔ وہ اکثر اماں سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا دن کے فلاں وقت آپ کو تکلیف تھی؟ میں نے اس کو محسوس کیا تھا اور آپ پر توجہ کی تھی اور فلاں وقت آپ کو آرام آ گیا تھا۔ مجھے انکی باتیں ہوکس پوکس لگتی تھیں مگر اس چیز کا میں نے کبھی اظہار نہ کیا۔ جہاں تک مجھے پتا ہے اماں کو انکے علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

میں اس زمانے میں ربوہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، جہاں پر جامعہِ احمدیہ کا نیا سال ستمبر میں شروع ہونے والا تھا۔ میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا جس کو اختیار کر کے میں اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکتا۔ میں اپنے والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا اس لیے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال میرے دل میں نہ آیا کہ ابا جی سے کہوں کہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مجھے کالج میں داخل کرائیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی محنت سے خود اپنا تعلیمی مستقبل بنا سکتا ہوں۔

دوسرا باب

احمد نگر کے قصّے

اواخر اگست ۱۹۵۱ء کی کسی تاریخ کو میں ربوہ جانے کے لیے راولپنڈی سے چلا۔ اس وقت مجھے پتا نہ تھا کہ یہ سفر میرے لیے اپنے خاندان سے ہمیشہ کے لیے جدائی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ میرا اثاثہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا، جس کو اٹھائے ہوے میں گھر سے نکلا تھا۔ ابا جی مجھے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار کرانے کے لیے تانگے میں میرے ساتھ آئے تھے۔ چناب ایکسپریس ابھی اس زمانے میں نہیں چلی تھی۔ مجھے وزیر آباد سے لائل پور جانے والی گاڑی لینی تھی، جو سانگلہ ہل سے گزرتی ہوئی جاتی تھی۔ مجھے چک جھمرہ جنکشن پر اتر کر سرگودھا جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ میں چونکہ اس سے قبل یہ سفر کر چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ راستے میں چنیوٹ آئے گا۔ پھر دریائے چناب کے پل کے بعد ربوہ کی ننگی چٹانوں والی پہاڑیاں آ جائیں گی، جن پر گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اگتا۔

ربوہ اس زمانے میں ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے دفاتر اور کارکنوں کے رہایشی کوارٹر، مساجد حتیٰ کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا ''قصرِ خلافت'' سب کچی اینٹوں سے بنے ہوے تھے۔ ربوہ کی آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی، جو ایک ڈیڑھ مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔ قادیان سے ہجرت کرنے کے بعد جماعتِ احمدیہ نے پاکستان میں نیا مرکز بنانے کے خیال سے حکومت سے چنیوٹ کے قریب ایک بنجر رقبہ قیمتاً خریدا تھا، جو نا قابلِ کاشت ہونے کے سبب عرصہ دراز سے ویران پڑا تھا۔ شمال کی طرف اور درمیانی علاقے میں ٹیلے تھے، جن کا سلسلہ مشرق کی طرف بہنے والے دریائے چناب تک جاتا تھا۔ دس بارہ مربع میل کا یہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا۔ زمین شورزدہ تھی، جس میں پانی نہ ہونے کے سبب کچھ نہیں اگتا تھا۔ تاہم امید کی جاتی تھی کہ زیرِ زمین گہرائی میں پانی موجود ہوگا۔ البتہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹیوب ویل لگانے سے پانی نکلا تو وہ پینے کے قابل ہوگا یا نہیں۔ میری آمد سے قبل نلکے لگ چکے تھے، جن میں سے نکلنے والا پانی کھارا ہونے کی وجہ سے نا قابلِ شرب تھا۔ مگر عوام کے لیے یہ پانی پینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان کے لیے پانی ایک قریبی گاؤں

احمد نگر سے منگوایا جاتا تھا، جو دواڑھائی میل کے فاصلے پر آباد تھا۔

اسی گاؤں میں جامعہ احمدیہ پایا جاتا تھا، جس کے لیے ہندوؤں کی ایک متروکہ عمارت حاصل کر لی گئی تھی۔ اسی گاؤں میں ایک دوسری زیادہ وسیع عمارت میں، جس میں رہایشی کمروں کے علاوہ اصطبل بھی پایا جاتا تھا، جامعہ احمدیہ کا ہوسٹل بنا ہوا تھا۔ مگر مجھے ابتدائی دنوں میں وہاں پر کمرہ نہ مل سکا اس لیے میرا قیام ماموں احمد خان نسیم کے گھر پر ربوہ میں تھا، جہاں پر اس زمانے میں ماموں کا خاندان دو کمروں میں رہایش پذیر تھا۔ اسی گلی میں خالو جان مولوی غلام نبی مصری کا مکان تھا جن کے ساتھ بھائی جان محمد احمد نعیم اپنی بیوی اور ننھے بچے منصور کے ساتھ مقیم تھے۔ دونوں مکان آمنے سامنے تھے اور ان کی مکانیت ایک جتنی تھی۔ دراصل سارے کوارٹر اسی ٹائپ کے تھے، جن میں صدر انجمن احمدیہ اور انجمن تحریکِ جدید کے کارکن رہتے تھے۔ کوارٹروں کے پہلو میں ایک چھوٹا سا بازار تھا، جہاں سے ضروریاتِ زندگی خریدی جاسکتی تھیں۔ تعلیم الاسلام ہائی اسکول اس زمانے میں ابھی چنیوٹ میں اور تعلیم الاسلام کالج لاہور میں تھے۔ البتہ بچیوں کے لیے ایک اسکول کھول دیا گیا تھا اور ربوہ کا ایک اپنا چھوٹا سا ہسپتال بھی تھا، جس کے سربراہ ڈاکٹر مرزا منور احمد تھے، جو مرزا بشیرالدین محمود احمد کے صاحبزادے تھے۔ ڈاک خانہ بھی کھل چکا تھا اور ربوہ کے عین درمیان سے گزرنے والی ریل کی پٹڑی پر ایک اسٹیشن بھی بن چکا تھا، جہاں پر سرگودھا اور لائل پور کے درمیان چلنے والی ریل گاڑی رکتی تھی۔

جامعہ احمدیہ کے کھلنے پر مجھے روزانہ پیدل احمد نگر جانا ہوتا تھا۔ صبح کے وقت تو خیر سہانا سماں ہوتا تھا مگر واپسی تپتی ہوئی دھوپ میں ہوتی تھی۔ میری کلاس میں پانچ میٹرک پاس لڑکے تھے۔ صرف ناصر احمد، جو جامعہ کے پروفیسر مولوی ظفر محمد ظفر کا بیٹا تھا، شاید مڈل پاس بھی نہیں تھا۔ ہمارا ایک کلاس فیلو پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ چوہدری فقیر محمد سابق ڈی ایس پی کا سالا ہے، جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس کی بہن کے ساتھ ان کی شادی تھوڑا عرصہ قبل ہوئی تھی۔ ان کی پہلی بیوی اور بچے بدستور راولپنڈی میں مقیم تھے۔ ہماری کلاس کو شروع ہوئے ابھی شاید ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک روز سویرے سویرے ایک ہرکارہ ربوہ سے یہ خبر لے کر پہنچا کہ چوہدری فقیر محمد ہارٹ اٹیک سے وفات پا گئے ہیں۔ ان کی بیوی نے اپنے بھائی کو بلا بھیجا تھا۔ وہ کلاس سے اٹھ کر گیا اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ وہ ایک حافظِ قرآن کا بیٹا تھا، جو شاید وفات پا چکے تھے۔ چوہدری فقیر محمد زندہ رہتے تو ان کا سالا تعلیم حاصل کر لیتا۔ ان کی وفات کے سبب اس کے سر پر اپنے خاندان کے لیے روزی پیدا کرنے کا بوجھ آن پڑا تھا جس کے سبب وہ اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکا۔

جامعہ احمدیہ میں اس زمانے میں پچاس کے لگ بھگ طالب علم پڑھتے تھے۔ ہماری کلاس

دوسری تھی، جس میں داخلے کے لیے میٹرک پاس ہونا لازمی قرار پایا تھا، وگرنہ اس سے قبل قادیان کے زمانے میں پرائمری یا مڈل پاس طالب علموں کو داخلہ مل جاتا تھا۔ سارا کورس عربی زبان اور دینی تعلیم کا تھا۔ البتہ ماسٹر غلام حیدر انگریزی پڑھانے پر مامور تھے۔ مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے ان سے کچھ سیکھا تھا۔ میرے زمانے میں جامعہ کی کل چار کلاسیں ہوتی تھیں اور آخری کلاس کو پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دینا ہوتا تھا۔ جامعہ کا ریکارڈ غیر معمولی طور پر اچھا تھا اور نہ صرف یہ کہ عام طور سے سو فیصد طالب علم پاس ہو جاتے تھے، اکثر اسی ادارے کے طالب علم یونیورسٹی کے امتحان میں اول آتے تھے۔ جامعہ احمدیہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا اور یونیورسٹی سے متعلق نہ تھا، اس لیے اسکے طالب علم بطور پرائیویٹ امیدوار کے امتحان دیتے تھے۔ جامعہ احمدیہ کے اسٹاف میں سے کوئی استاد یونیورسٹی کا ممتحن نہ تھا۔

جامعہ کے پرنسپل مولوی ابوالعطاء جالندھری تھے جو جماعتِ احمدیہ کے کامیاب مقرر اور مناظر تھے۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں فلسطین اور شام میں مبلّغ رہ چکے تھے اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ وہ اکثر صبح حاضری کی اسمبلی میں عربی زبان میں تقریر کرتے تھے اور جب ایک بار بولنے پر آتے تھے تو گھنٹوں تک بولتے چلے جاتے تھے۔ پھر وہ طالب علموں کو فی البدیہ تقریر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ سلسلہ اس قدر لمبا ہو جاتا تھا کہ دھوپ نکل آتی تھی اور جو طالب علم دھوپ میں کھڑے ہوتے تھے انھیں بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ گاہے بگاہے اس اسمبلی کی کارروائی میں آدھا دن گزر جاتا تھا اور پچھلے پہر کی چھٹی دے دی جاتی تھی۔ مولوی ابوالعطاء کو، جن کا ماں باپ کا دیا ہوا نام اللہ دتا تھا، لکھنے کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے اپنا رسالہ ''الفرقان'' نکالا، جو ان کی وفات (جون ۱۹۷۴ء) تک شایع ہوتا رہا۔ میرا مضمون ''قرانِ کریم کا اسلوبِ بیان''، جو ''نقوش'' کے ''قرآن نمبر'' میں شامل ہے، پہلی بار اسی رسالے میں چھپا تھا۔ آپ دل و جان سے خادمِ دین تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کے بچے بھی اسی راستے پر چلیں۔ آپ کے بیٹوں عطاء الکریم، عطاء الرحیم اور عطاء المجیب کو اس کی توفیق ملی۔ مؤخر الذکر بہت برسوں سے جماعتِ احمدیہ کی مسجد فضل لندن کے امام ہیں۔ آپ کی بیٹی امۃ اللہ خورشید احمدی عورتوں کے مجلّہ ''مصباح'' کی مدیرہ تھی۔ میں اس رسالے میں ایک زمانے میں باقاعدگی کے ساتھ چھپتا رہا ہوں۔

میں درجہ ثالثہ میں تھا جب مولوی ابوالعطاء کو جامعۃ المبشرین کا پرنسپل بنا کر ربوہ منتقل کر دیا گیا۔ ان کی جگہ پر مولوی ظہور حسین کو جامعہ احمدیہ کا پرنسپل بنایا گیا۔ وہ چند ماہ سے زیادہ اس عہدے سے نبرد آزمانہ ہو سکے۔ موصوف علم الصرف (عربی گرائمر) کے استاد تھے، مگر پڑھانے کا گر نہ جانتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کو روس کا مبلّغ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ویزا نہ ہونے کی بنا پر سرحد پر ہی گرفتار کر لیے گئے اور دو اڑھائی سال تک بخارا کی جیل میں قید رہے۔ پھر ملک سے نکال دیے گئے۔ ہندوستان واپس پہنچ کر

انھوں نے اپنی تبلیغی مساعی کی عجیب وغریب داستان گھڑی بلکہ ایک کتاب بعنوان ''مجاہدِ بخارا'' لکھ ڈالی۔ اس میں ایک طرف تو یہ بیان ہے کہ سارا وقت دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ ایک کمرے میں رکھے گئے، جہاں پر وہ دن رات سو نہ سکتے تھے کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ روسی محافظ ان کے کمرے میں ایسے کاغذات ڈال دیں گے، جو ان پر لگائے گئے الزاماتِ جاسوسی کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہوں۔ اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ اپنی قید کے دوران انھوں نے چالیس پچاس قیدیوں کو احمدیت میں داخل کیا تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان حالات میں آپ کیسے تبلیغ کرتے تھے تو کہا کہ میں دوسرے قیدیوں کو پکار کر احمدی ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ان کو روسی زبان نہیں آتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فارسی میں تبلیغ کرتے ہوں، جو بخارا میں بولی جاتی ہے۔ موصوف نماز بہت رقت سے پڑھتے تھے، جس کی نقل لگا کر ان کا چھوٹا بیٹا ہمیں ہنسایا کرتا تھا۔ ان کی تقریر میں کوئی اثر نہیں تھا۔

ان کی جگہ پر قاضی محمد نذیر لائل پوری کو پرنسپل لگایا گیا۔ ان کو تحقیق کا شوق تھا اور تقریر کرنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ مجھے ان کا طریقِ استدلال کچھ ایسا پسند نہ تھا، کیونکہ اس میں بے حد تکرار ہوتی تھی۔ کلاس روم میں البتہ وہ اس طریق سے کند ذہن طالب علموں کو بھی اپنی بات ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ ان کے سپرد منطق وفلسفہ کے مضامین تھے۔ جماعتِ احمدیہ کے جلسہ سالانہ میں ان کی تقریر رکھی جاتی تھی۔ آگے چل کر وہ صدر انجمن احمدیہ کے ناظرِ اشاعت رہے۔ ان کے کارناموں میں یہ چیز شامل ہے کہ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھ دیا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی سے محمدی بیگم کے سلسلے میں ہونے والے الہامات کو سمجھنے میں اجتہادی غلطی سرزد ہوئی تھی کیونکہ مرزا صاحب موصوف آخر دم تک اس دعوے پر قایم رہے تھے کہ محمدی بیگم ان کے نکاح میں آئے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

ادب کے استاد مولوی ظفر محمد ظفر تھے، جو خود بھی اردو، عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ وہ کبھی اپنے مضمون کی تیاری کر کے نہ آتے تھے اور محض اپنی یادداشت اور عربی زبان پر عبور کے بل پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کو ابوتمام کی کتاب حماسہ اور المتنبی کا دیوان قریب قریب حفظ تھا۔ کسی قصیدے کا ایک مصرع ان کے سامنے پڑھ دیا جاتا تھا، تو وہ سارا قصیدہ حافظے سے سنا دیتے تھے۔ ظفر صاحب کا ذکرِ خیر دوسری جگہ پر آئے گا۔

مولوی محمد نذیر ملتانی حدیث اور تفسیر القرآن کے استاد تھے۔ اپنی جوانی کے دنوں میں زبردست مناظر ہوا کرتے تھے۔ کسی نے ان پر چھری سے حملہ کر دیا تھا، جس کے بعد ان کی تقریر کا جوش وخروش جاتا رہا۔ طبیعت کے مسکین اور صاف دل انسان تھے۔ مطالعے کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ بہت کم اپنے مضمون کی تیاری کر کے آتے تھے۔ البتہ پڑھاتے بہت شوق سے تھے۔ علمِ کلام پر ان کو اچھا عبور حاصل تھا۔ وہ

ماموں احمد خان نسیم کے کلاس فیلو تھے۔

صاحبزادہ ابوالحسن قدسی ہمیں نثر اور نحو پڑھاتے تھے مگر طالب علموں کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ آپ صاحبزادہ عبداللطیف شہیدِ کابل کے فرزند تھے، جن کو مرزا غلام احمد قادیانی کے زمانے میں احمدیت اختیار کرنے کے الزام پر علماءِ افغانستان کے فتوے کے تحت سنگسار کر دیا گیا تھا۔ آپ کی بیوی اور بچوں کو بہت برسوں تک قید و بند میں رہنے کے بعد قادیان آنے کی اجازت ملی تھی۔ صاحبزادہ ابو الحسن قدسی فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ چنانچہ ایران کے شاہ رضا پہلوی کے پاکستان آنے پر ''نوائے وقت'' نے آپ کی نظم کو پہلے صفحے پر شایع کیا تھا۔ موصوف خاموش طبع انسان تھے۔

جامعہ کے اکثر طالب علم واقف زندگی تھے اور ان کو صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ البتہ جب میں جامعہ میں داخل ہوا تو کسی کو نقد رقم نہیں ملتی تھی۔ ہوسٹل کے اخراجات وظیفے سے کٹ جاتے تھے۔ باقی ماندہ رقم پرچی کی صورت میں ملتی تھی، جس سے مقامی دکانوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ البتہ پرچی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ جمعہ کے روز سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل ماسٹر غلام حیدر پرچیاں جاری کرتے تھے اور صرف استثنائی صورتوں میں کسی کو نقد رقم دی جاتی تھی۔ یہ کام ان کے کلرک عبدالخالق صاحب کے ذمے تھا، جو بہت زندہ دل انسان تھے۔ جب ان کا کسی نئے آدمی سے تعارف ہوتا تھا تو کہا کرتے تھے: میرا نام سیّد عبدالخالق ہے۔ البتہ سیّد میں ۱۹۴۷ء سے ہوں، اس سے پہلے شیخ ہوا کرتا تھا۔ اس پر ہر کوئی ہنس دیتا تھا اور بات ہنسی مذاق میں ٹل جاتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں پتا نہیں کہ کون ان کی اصل ذات سے واقف ہے اور کون نہیں۔ اس لیے وہ احتیاطاً تقسیم ملک کے بعد اپنا سیّد ہونا بتاتے تھے۔ مجھے انھوں نے کہا: تم دیکھ لو گے کہ میرے بچے پکے سیّد بن جائیں گے۔

انھی دنوں میں واقفینِ زندگی سے صدر انجمن احمدیہ نے اس مضمون کے اسٹامپ لکھوائے کہ تعلیم کو ادھورا چھوڑنے یا تعلیم مکمل کرنے کے بعد جماعتِ احمدیہ کی خدمت نہ کرنے کی صورت میں وظیفے کی تمام رقم واپس کرنی ہوگی۔ ماسوائے چند ایک طالب علموں کے، جو اپنے خرچ پر تعلیم حاصل کر رہے تھے، سارے باقی ماندہ طالب علم گویا جماعتِ احمدیہ کے زرخرید غلام تھے۔ حافظ بدر الدین نامی نوجوان کا، جو تھوڑا عرصہ قبل احمدی ہوا تھا اور جامعہ میں پڑھ رہا تھا، وظیفہ انھی دنوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے اسے پیش کش کی کہ میرے خرچ پر اپنی تعلیم کو جاری رکھے۔ اس طرح وہ مزید دو برسوں تک جامعہ سے منسلک رہ سکا۔ مجھے ابا جی کی طرف سے ماہوار رقم مل جاتی تھی، اس لیے مجھے وظیفہ ملنے یا نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسٹامپ لکھوانے کی کارروائی کا ایک ذیلی پہلو یہ بھی تھا کہ صدر انجمن احمدیہ اور تحریکِ جدید انجمن احمدیہ نے طالب علموں کی تقسیم کا فیصلہ کیا، جس کی کارروائی اس طرح عمل

میں آئی کہ طالب علموں کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور دونوں انجمنوں کے نمائندوں نے بھیڑوں کی طرح طالب علموں کا چناؤ کیا۔ صدر انجمن احمدیہ کے حصے میں آنے والے طالب علموں کا تقرر تعلیم کے خاتمے پر پاکستان میں بطور مربی ہونا تھا، جب کہ تحریکِ جدید انجمن احمدیہ کے حصے میں آنے والے طالب علموں کو مبلّغ بنا کر غیر ممالک میں بھیجا جانا تھا۔ میں تحریک جدید کے حصے میں آیا تھا، جو ایک طرح سے انعام سمجھا جاتا تھا۔

جامعہ کے ہوسٹل میں چالیس کے لگ بھگ طالب علم مقیم تھے۔ سنگل روم دو یا تین سے زیادہ نہ تھے اور ان میں اکثر غیر ملکی طالب علم رہتے تھے۔ ڈبل روم بھی اس سے زیادہ نہ تھے۔ باقی ماندہ کمرے بڑے تھے، جن میں پانچ سے دس تک کی تعداد میں طالب علم رہتے تھے۔ میرے ساتھ ایک چینی طالب علم عثمان چو چنگ شی کمرہ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا اور ہمیں اکٹھے ایک کمرہ ملا تھا، جس میں ہم ایک سال تک روم میٹ رہے۔ عثمان عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ وہ غیر ملکیوں کی کلاس میں ایک سال تک جامعۃ المبشرین میں پڑھنے کے بعد جامعہ احمدیہ میں آ کر داخل ہوا تھا۔ اس کا تعلق چینی مسلمانوں کے ایک گروپ سے تھا جو چیانگ کائی شیک کی فوج میں افسر تھے۔ جب چین پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا تو مسلمان افسروں کے گروپ نے کسی مسلمان ملک میں پناہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح یہ لوگ پاکستان میں پہنچے اور آتے ہی کراچی میں کسی احمدی کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس نے ان کو ربوہ جانے کا مشورہ دیا، جہاں پر ان کو وظیفہ ملے گا اور اسلامی تعلیم دلائی جائے گی۔

چند ماہ کے بعد اس گروپ کا ایک حصہ فارموسا اور دوسرا گروپ سعودی عرب چلا گیا۔ صرف تین ربوہ میں مقیم رہے، جن میں سے عثمان چو پہلا چینی طالب علم تھا، جس نے ایک ڈیڑھ سال تک اردو اور انگریزی سیکھنے کے بعد عربی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی عمر اس وقت پینتیس کے لگ بھگ تھی، گویا وہ مجھ سے دگنا بڑا تھا۔ عثمان حد درجہ محنتی اور دیانت دار انسان تھا مگر اس کا حافظہ تھوڑا کمزور تھا، جس کے سبب زبان سیکھنا اور درست تلفظ اپنانا اس کے لیے دشوار تھا۔ غیر ملکیوں کو کلاس میں اردو اور عربی پڑھائی جاتی تھی، مگر چونکہ جامعہ کے طالب علم عام طور سے آپس میں پنجابی بولتے تھے، ان کا واسطہ ایک تیسری زبان سے پڑتا تھا، جس سے ان کو بچ کر رہنے کی ہدایت تھی۔ مجھے اور عثمان کو ایک کمرے میں رکھنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں شہر کا رہنے والا تھا اور اردو روانی سے بولتا تھا جب کہ جامعہ کے بیشتر طالب علم دیہات کے رہنے والے تھے اور اردو بولنے کی مشق نہ رکھتے تھے۔

عثمان چو بہت دیندار تھا اور نماز روزے کی پابندی کرتا تھا۔ باقاعدگی سے تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا اور نفل ادا کرنے کے بعد فجر کی اذان ہونے تک قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ کلاس میں جانے سے

پہلے اور وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد سارا وقت اپنا سبق دہرانے میں مصروف رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی وقت ضایع کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ وہ ہمہ وقت پڑھنے لکھنے میں یا عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ دوسرے طالب علموں کے برعکس اسے کھیل کود میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم اس کو چینی کھیل آتے تھے چنانچہ اس نے چیل کے پروں سے بیڈمنٹن جیسی ایک کاک بنائی، جس کے ساتھ کھیلنے کے لیے ریکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ اس کو پاؤں سے کھیلتے ہیں۔ ہاتھ صرف کاک کو ہوا میں اچھالنے کے کام آتے ہیں۔ نیچے گرتی ہوئی کاک کو دوبارہ پاؤں سے اوپر کی طرف اچھالنا، اس کو کنٹرول میں رکھنا اور زمین پر گرنے سے بچانا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے دونوں پاؤں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ عثمان بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کاک اس کے سر کے اوپر سے اڑتی ہوئی اس کی پیٹھ کے پیچھے گرتی تھی، جہاں پر اس کا دایاں یا بایاں پاؤں کاک کو دیکھے بغیر وصول کرتا اور سر کے اوپر سے اچھال کر سامنے کی طرف پھینک دیتا تھا۔ عثمان بعض اوقات کاک کو صرف اس قدر اونچائی پر بھیجتا تھا کہ وہ اس کے ماتھے پر جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر وہ سر کی جنبش سے اوپر کو اچھالی جاتی تھی اور زمین پر گرنے کی بجائے اس کے پاؤں پر آ کر جم جاتی تھی۔ کچھ دنوں تک اس کو اکیلا کھیلتے دیکھنے کے بعد میں اس کھیل میں اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور آگے چل کر جب مزید دو چینی ہمارے ہوسٹل میں آ گئے تو ہم چاروں مل کر یہ کھیل کھیلنے لگے۔ کاک ایک کھلاڑی سے دوسرے کی طرف اڑتی تھی اور زمین پر گرنے سے پہلے دوسرا کھلاڑی اس کو اپنے پاؤں پر وصول کرتا تھا اور چند منٹوں تک اپنے کرتب دکھانے کے بعد اس کو تیسرے کھلاڑی کی طرف اچھال دیتا تھا۔ دراصل یہ کھیل نہیں ایک فن ہے، جس پر عبور حاصل کرنے کے لیے بہت ریاضت درکار ہے۔

عثمان کو کنفوشس میں بہت دلچسپی تھی، جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اپنے وقت کا پیغمبر تھا۔ چنانچہ وہ اس کی روایات کا مجھے ترجمہ سنایا کرتا تھا۔ اسے تقریر کرنے کا شوق تھا۔ میں اس کی تقریروں کے مسودے درست کرتا تھا، جن کو تیار کرنے پر وہ بہت محنت کرتا تھا۔

ایک سال کے بعد اسی کمرے میں دوسرا چینی ابراہیم ما میرا روم میٹ بنا تو میری فرمایش پر وہ مجھے چینی فلاسفر لاؤ تزے کی تحریریں پورا سال ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں تیسرا چینی ادریس رہتا تھا جس کو ماوزے تنگ کی شاعری میں دلچسپی تھی۔ جب تک ہم اس ہوسٹل میں مقیم رہے وہ مجھے اس کی نظمیں پڑھ کر سناتا رہا۔ تینوں کا ذکر میرے افسانے ''کیتھی چن'' میں موجود ہے۔

چینیوں سے بڑھ کر میری دوستی رضوان عبداللہ کے ساتھ تھی، جو سوڈان کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع ذہین نوجوان تھا اور میرا ہم عمر تھا۔ اسے اردو بولنے کا شوق تھا۔ چنانچہ میں اسے اردو کی مشق کراتا تھا اور خود اس سے عربی سیکھتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اس کی مدد سے عربی مجلّات ''المصور'' اور

''الہلال'' میں چھپنے والی کہانیوں کا ترجمہ کیا کرتا تھا، جو ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں شایع ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا۔ پھر جامعہ کی سالانہ پکنک کے دوران رضوان دریائے چناب میں ڈوب کر مر گیا۔ میں نے اس کے بارے میں پینتالیس برسوں کے بعد ایک افسانہ ''ولی اللہ'' لکھا، جو میری کتاب ''بچھڑی ہوئی کونج'' میں شامل ہے۔ البتہ اس کے بارے میں ایک مضمون میں نے بعنوان ''آہ، رضوان عبداللہ'' انھی دنوں میں لکھا تھا، جو ماہنامہ ''خالد'' میں شایع ہوا۔ اس مضمون کو پڑھ کر تعلیم الاسلام کالج لاہور کے ایک طالب علم سمیع اللہ قریشی نے اپنے کالج کے مجلّہ ''المنار'' میں ایک رپورتاژ چھپوایا، جس میں نہ صرف واقعات کو مسخ کیا گیا تھا بلکہ یوں دکھایا گیا تھا کہ رضوان کے دریا میں ڈوبنے کا واقعہ مصنف کا آنکھوں دیکھا تھا اور وہ خود بھی اس پارٹی کا حصہ تھا۔ میں نے اس پر احتجاجاً ایک خط مدیر ''المنار'' کو لکھا، جس میں یہ ذکر بھی تھا کہ مصنف غالباً میرا بچپن کا دوست اور ہم جماعت ہے۔ سمیع اللہ کے خط سے اس بات کی تصدیق ہوگئی اور اس نے لکھا کہ وہ بہت جلد مجھے ملنے کے لیے آئے گا۔ اس طرح ہماری دوستی کا نیا دور شروع ہوا۔

ان دنوں ہفتہ وار ''قندیل'' کے قریب قریب ہر شمارے میں میری کوئی نہ کوئی تحریر چھپتی تھی۔ اس کے مدیر شیر محمد اختر، جو بطور افسانہ نگار نام پیدا کر چکے تھے، گاہے بگاہے مجھے خط لکھ کر میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پھر جب ثاقب زیروی نے اپنا پرچہ ''لاہور'' نکالنا شروع کیا تو میں وہاں پر بھی چھپنے لگا۔ جماعت احمدیہ کے رسائل ''مصباح''، جو دراصل عورتوں کی تنظیم "لجنہ اماءاللہ" کا پرچہ تھا، اورنوجوانوں کی تنظیم ''خدام الاحمدیہ'' کے آرگن ''خالد'' کے ساتھ بھی میرا شروع سے تعلق رہا۔ روزنامہ ''الفضل'' میں میرے درجنوں مضامین شایع ہوے۔ مگر جماعتِ احمدیہ کے رسالوں میں کہانیاں نہیں چھپ سکتی تھیں، اس لیے مجھے دوسرے موضوعات پر قلم اٹھانا پڑتا تھا۔

میں جامعہ احمدیہ کے دوسرے سال میں تھا جب میں نے ایک پندرہ روزہ قلمی رسالہ ''مجموعہ'' نکالنا شروع کیا، جس کے پہلے تین یا چار شمارے بلیک بورڈ پر چسپاں کیے جاتے رہے۔ اس کے بعد آٹھ اور آگے چل کر سولہ صفحات پر مشتمل مجلّہ دو سال تک شایع ہوتا رہا جس کا واحد نسخہ جامعہ کی لائبریری میں پڑھنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ جب مولوی ظہور حسین جامعہ احمدیہ کے پرنسپل بنے تو انھوں نے رسالے کو جامعہ کی طرف سے چھاپنے کی خواہش کا اظہار کیا اور مجھ سے اس کے حقوق حاصل کیے مگر اس پر عمل درآمد اس لیے نہ ہو سکا کہ ان کو بہت جلد پرنسپل کے عہدے سے سبک دوش کر دیا گیا اور ان کی جگہ پر قاضی محمد نذیر لائلپوری کا تقرر ہو گیا، جن کو مجلّے میں دلچسپی نہ تھی۔

میں اس دوران میں جامعہ کی یونین کا جنرل سیکرٹری بن گیا تھا۔ نائب صدر کے عہدے

پر میرے کلاس فیلو مرزا رفیق احمد کا انتخاب ہوا تھا، جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے اکیس بچوں میں بیسویں نمبر پر سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کو کالج کے سیکنڈ ایر سے اٹھا کر جامعہ میں داخل کیا گیا تھا، مگر بجائے اس کے کہ ان کو پہلے درجے میں داخل کیا جاتا، ان کو براہِ راست تیسرے درجے میں بٹھا دیا گیا۔ یوں بھی صاحبزادہ صاحب کو زعم تھا کہ وہ جامعہ کی تعلیم کو دو برسوں کے اندر مکمل کر لیں گے۔ البتہ اس کام کے لیے جتنی مستعدی اور لیاقت درکار ہے ان سے موصوف عاری تھے۔ وہ احمد نگر کم ہی آتے تھے اور اکثر و بیشتر ہفتوں تک کلاس سے غیر حاضر رہتے تھے۔ کورس کی کتابوں سے ان کی شناسائی بس سرسری سی تھی۔ البتہ میرے ساتھ ان کی دوستی تھی، جس کا سبب شاید میری ادیبانہ شہرت تھی۔ میرے دل میں بہت دنوں سے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کسی طریق سے جامعہ کو احمد نگر سے ربوہ منتقل کرایا جائے، جہاں پر نیم شہری ماحول تھا اور جہاں پر جرمن محاورے کے مطابق شہنائی بجتی تھی۔

احمد نگر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس کی آبادی جھنگ کے جانگلیوں اور مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے احمدی مہاجروں پر مشتمل تھی جن کو ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات عارضی طور پر الاٹ ہوئے تھے۔ البتہ اس گاؤں کی متروکہ زرعی اراضی پر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کے خاندان نے قبضہ جما لیا تھا، جب کہ موصوف نے اپنی جماعت کے افراد کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ اپنی قادیان میں چھوڑی ہوئی املاک کے بدلے میں متروکہ جائیداد حاصل کرنے کے لیے کوئی کلیم داخل نہ کریں۔ چنانچہ میرے خالو مولوی غلام نبی مصری، جن کو تقسیمِ ملک کے بعد ہمارے گاؤں چنگا بنگیال کے ایک نواحی گاؤں میں ابا جی کی کوششوں سے متروکہ زمین الاٹ ہوئی تھی، اس کا قبضہ لینے کے لیے تیار نہ ہوئے کیونکہ خلیفۂ ثانی نے فرمایا تھا کہ ہم بہت جلد قادیان واپس لوٹ جائیں گے۔ یوں بھی قادیان کی جائیداد کا بدل انسان کو نہیں مل سکتا۔ چنانچہ خالو جان اس زمین کو اس کے حال پر چھوڑ کر ربوہ جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کی طرح ہزاروں دوسرے احمدیوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہوئے متروکہ جائیداد حاصل کرنے سے اجتناب کیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان نے پورے قادیان اور پانچ نواحی گاؤں کو اپنی ملکیت بتاتے ہوئے متروکہ جائیداد پنجاب اور سندھ میں حاصل کر لی، جس کے سبب آج اس خاندان کا شمار پاکستان کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔

احمد نگر کے باسیوں کے ساتھ جامعہ کے طالب علموں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہمیں ان کے میلوں ٹھیلوں یا قرب و جوار کے فقیروں کے مزاروں پر منائے جانے والے عرسوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم لوگ ہاکی، فٹ بال یا والی بال کھیلتے تھے، جو گاؤں کے لوگوں کے لیے بدیسی کھیل تھے۔ لے دے کے کبڈی ایک ایسا کھیل تھا، جس میں جامعہ کے طالب علموں کا مقابلہ گاؤں کے کھلاڑیوں کے ساتھ ہو

سکتا تھا۔مگر دیہاتی جن دنوں میں کبڈی کھیلتے تھے ان دنوں میں ہمارے سالانہ امتحانات سر پر کھڑے ہوتے تھے، اس لیے ہم ان کی کھیلوں میں شرکت نہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف جامعہ کے پروگراموں اور علمی بحثوں میں دیہاتیوں کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس طرح اس گاؤں میں دو متوازی دنیائیں آباد تھیں، جن کا آپس کا تعلق بے حد محدود تھا۔ یوں بھی گاؤں میں کسی قسم کی تفریح کا سامان موجود نہ تھا۔ قریب ترین سینما وہاں سے تیس میل کے فاصلے پر ایک دوسرے شہر میں تھا جب کہ جامعہ کے طالب علموں کو فلم دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اپنی جماعت کو ۱۹۳۴ء میں فلم اور تھیٹر دیکھنے کی ممانعت کر دی تھی اور ہدایت جاری کی تھی کہ اس طرح بچنے والی رقم چندے کی صورت میں جماعتِ احمدیہ کی نئی قایم کردہ "انجمن تحریکِ جدید" کو ادا کی جائے جس کے سپرد بیرونی ممالک میں تبلیغ کا کام کیا جانا تھا۔

احمد نگر کے باسیوں کے ساتھ براہِ راست تعلق نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں ان میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ بالخصوص گاؤں کی دوشیزاؤں کو ہم لوگ دور دور سے دیکھتے اور سراہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی، جو کسی بھی مقابلہِ حسن میں چنے جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی طرف سب کی نگاہیں اٹھتی تھیں۔ چنانچہ گاؤں کے ایک بااثر سیّد زمیندار نے، جو اس کے ساتھ متعہ کا نکاح پڑھوانا چاہتا تھا، اس کے باپ کو، جو اس کا مزارع تھا، کچھ زرعی زمین دینے اور قرض معاف کرنے کی پیشکش کی۔ شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دے، جس کی میعاد چھ ماہ ہوگی۔ اس مدت کے بعد وہ اس کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔ اگر اس عرصے میں اس کو حمل ٹھیر جائے تو وہ بچے کو دودھ پلانے کی عمر تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ اس دوران میں نان ونفقہ خاوند ادا کرے گا۔ اس کے بعد بچہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور بچے کی ماں جس کے ساتھ اس کا جی چاہے نکاح پڑھوا سکتی ہے۔

میرے افسانے ''ولی اللہ'' میں اس واقعے کا ذکر موجود ہے اور قاری واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ میں نکاح متعہ کو اس دوشیزہ پر ظلم کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا کو ''اوراق'' میں چھپنے کے لیے بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ کہانی ان کے گاؤں وزیر کوٹ کے ہمسایہ گاؤں احمد نگر کے بارے میں ہے جہاں پر، جیسا کہ وہ جانتے ہیں، میں سن پچاس کی دہائی میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم رہا تھا۔ موصوف نے کہانی چھاپنے سے معذوری کا اظہار کیا اور لکھا: بہتر ہوگا اگر میں مذکورہ افسانہ کسی دوسرے معاصر جریدے میں چھپنے کے لیے دوں۔ انھوں نے وجہ بیان نہیں کی، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ متعہ کے بارے میں ہلکی سی تنقید بھی چھاپنے سے ڈرتے ہیں۔ یوں بھی موصوف حد درجہ محتاط ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کے رسالے میں کوئی چیز چھپے، جو معاشرے کے کسی حصے کے جذبات کو مجروح کرنے کا

باعث بنے۔انھوں نے میرا افسانہ ’’نقد سودا‘‘ بھی، جس کی کہانی ایک اسرائیلی عورت کے گرد گھومتی ہے اور جس میں اسرائیل کی سیاست پر کڑی تنقید ہے اور میرے سفرِ اسرائیل کی روداد بیان ہوئی ہے، نہیں چھاپا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا سے میری ملاقات ۱۹۵۶ء سے ہے، جس کا ذکر دوسری جگہ پر آئے گا۔

جامعہ کے طالب علموں میں ایسی آزادی نہیں پائی جاتی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ تعلقِ خاطر قایم کرسکیں۔ وہ ان کو دور دور سے دیکھ کر آہیں بھر سکتے تھے یا جیسا کہ یار دوست کہا کرتے تھے اپنی آنکھیں سیک سکتے تھے۔ یوں بھی ہوسٹل کے اندر لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے کا رواج تھا۔عام طور سے بڑی جماعتوں کے طالب علم ایک آدھ جونیر چیلا رکھتے تھے، جس پر وہ اپنی ساری محبت نچھاور کرتے تھے۔ ہمارے سامنے مولوی ظفر محمد ظفر کی زندہ مثال موجود تھی، جو کھلے بندوں ہمارے ایک گورے چٹے کلاس فیلو امین اللہ خان سالک کے ساتھ اپنا ’’ٹھرک‘‘ پورا کرتے تھے۔ عام طور سے کہا جاتا تھا کہ موصوف اس کو شاعری سکھاتے ہیں، مگر سب لوگ جانتے تھے کہ ان کا شغف کہیں زیادہ گہرا تھا۔ان کے بارے میں یہ شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا:

کہا داور نے محشر میں کہ جو مانگو، وہ ملتا ہے
پکارا ظفر یہی ہر بار : امین اللہ خاں سالک

اب جو میں دوسروں کے رازوں پر سے پردہ اٹھا رہا ہوں تو کیوں نہ اپنا بھی بھانڈا پھوڑا جائے۔ میرا بھی ایک منظورِ نظر ہوا کرتا تھا، جس کو میں دراصل کچھ نہیں سکھا سکتا تھا، کیونکہ وہ پڑھنے لکھنے کی طرف کم توجہ دیتا تھا اور فٹ بال، والی بال اور دوسرے کھیلوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔البتہ جامعہ کے تقریری مقابلوں میں اس کی تقریریں میری لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس نے ایک بار بتایا کہ مجھ سے دوستی قایم کرنے کے پیچھے بس یہ امر کارگر تھا کہ میں اس کی طرح شہر کا رہنے والا تھا۔ فی الواقع جامعہ کے ننانوے فیصد طالب علم دیہاتی ماحول سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے اس تعلقِ خاطر کے بارے میں بھی ایک شعر کسی نے موزوں کیا تھا، جس میں شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میری نگاہِ انتخاب کسی سرخ و سفید سوہنے بالکے کی بجائے ایک گہرے سانولے رنگ والے لڑکے پر پڑی تھی:

اگر معیار پوچھا ہے تو آ کر دیکھ لو اب بھی
منیر الدین احمد کا نعیم الدین قاضی ہے

جامعہ کا ماحول عام طور سے پڑھنے لکھنے کے لیے بہت سازگار تھا۔ احمد نگر میں ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے والے لہو ولعب سرے سے پائے ہی نہیں جاتے تھے۔ جامعہ کے طالب علموں میں تاش کھیلنے کا رواج بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ڈرامے یا موسیقی کی طرف بھی کسی کی توجہ نہیں تھی۔ مولوی ظفر محمد

ظفر کے طفیل شاعری کا تھوڑا بہت چرچا تھا اور کچھ طالب علم تُک بازی کرتے تھے۔سال بھر میں منعقد ہونے والے بے شمار جلسوں میں تقریروں سے پہلے ضرور کوئی نہ کوئی نظم سنائی جاتی تھی۔تاہم اکثر و بیشتر یہ نظمیں مرزا غلام احمد قادیانی یا ان کے بیٹے اور خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ہوتی تھیں، جو اکثر حاضرین کو از بر تھیں۔کبھی کبھی ظفر صاحب کی یا کسی دوسرے احمدی شاعر کی نظم کو بھی شرفِ باریابی مل جاتا تھا۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی جامعہ میں مجلسِ مشاعرہ منعقد ہوئی ہو، اگرچہ آگے چل کر ربوہ میں مشاعرے ہونے لگے تھے۔کہانی سنانے یا افسانے لکھنے کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں جامعہ کا واحد لکھاری تھا، جس کے افسانے باقاعدگی کے ساتھ رسائل میں چھپتے تھے۔اس پر مجھے کسی استاد نے کبھی داد نہیں دی مگر مجھے کسی نے اس کام سے روکا بھی نہیں۔میں نے صرف ایک بار جامعہ کی یونین کے ماہانہ اجلاس میں ایک افسانہ سنانے کی جرأت کی اور یہ دیکھ کر بے حد مایوس ہوا کہ افسانہ سامعین کے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کہانی صرف وہاں پر سنائی جاسکتی ہے جہاں پر اس کی روایت موجود ہو۔اور جامعہ میں اس کی روایت نہیں پائی جاتی تھی۔وہاں پر صرف جماعتِ احمدیہ کے مخصوص علمِ کلام کا چرچا تھا۔اس سے ہٹ کر کبھی کسی دوسرے موضوع پر بات نہ ہوتی تھی۔حتیٰ کہ عربی زبان و بیان پر بھی کوئی تحقیقی مقالہ کبھی پیش نہ کیا گیا۔اس سلسلے میں لے دے کے ایک موضوع کبھی کبھی زیرِ بحث آتا تھا، جس کا تعلق مرزا غلام احمد قادیانی کے اس دعوے سے تھا کہ عربی ام الالسنہ ہے۔اس سلسلے میں لائل پور کے احمدی وکیل محمد احمد مظہر کی تحقیق کا چرچا ہوتا تھا، جو کسی طریق سے بھی سائنٹفک کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔مگر خالد احمد ایڈیٹر ''فرنٹیر پوسٹ'' کی رائے ان کی تحقیق کے بارے میں بہت اچھی تھی، جس کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا تھا، جب وہ جرمن حکومت کی دعوت پر جرمنی کے سفر پر آئے تھے۔

احمد نگر کی زمین بہت زرخیز ہے، جس کے سبب گاؤں کے اردگرد ہر طرف سرسبزی پائی جاتی تھی۔پانی کی فراوانی تھی۔قریب سے گزرنے والی نہر کے علاوہ دو تین رہٹ والے کنویں کافی مقدار میں پانی پینے اور کھیتوں میں لگانے کے لیے مہیا کرتے تھے۔طالب علم فالتو اوقات میں اپنا سبق دہرانے کے لیے یا اپنی تقریروں کی مشق کرنے کے لیے کھیتوں میں نکل جاتے تھے۔عصر کی نماز کے بعد فٹ بال کھیلا جاتا تھا۔ہوسٹل کے صحن میں والی بال کا نیٹ لگا ہوا تھا، جس کا وقت اور بے وقت خوب استعمال ہوتا تھا۔اسی صحن میں گرمیوں کی راتوں میں طالب علم سوتے تھے۔نماز کے اوقات پر مسجد کی اذان کے بعد گھنٹی بجتی تھی اور ہر کوئی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف چل دیتا تھا، جہاں پر باقاعدہ حاضری لگتی تھی۔نمازِ فجر کے بعد درس القرآن ہوتا تھا اور نمازِ عصر کے بعد حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔

ہوسٹل میں چونکہ کوئی میس نہیں تھا اس لیے کھانا طالب علم اپنے اپنے کمروں میں کھاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہمیں کبھی پھل یا دودھ اور دہی کھانے کو ملے ہوں۔ البتہ سال میں ایک بار گنے کے ایک پورے کھیت کی فصل خرید لی جاتی تھی اور جامعہ کے طالب علم اور اسٹاف کے ممبر وہاں پر گنے چوسنے کے لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سال ایک یا دو بار آوٹنگ کا پروگرام بنتا تھا، جو عام طور سے نہر پر منائی جاتی تھی، جہاں پر پیراکی کے مقابلے ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر بیت بازی یا فی البدیہہ تقریری مقابلے بھی رکھے جاتے تھے۔ صرف ایک بار دریائے چناب پر ہم آوٹنگ کے لیے گئے تھے، جس کے دوران میرا عزیز افریقی دوست رضوان عبداللہ ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس سانحے کی تفصیلات میرے افسانے ''ولی اللہ'' میں سے بدیں الفاظ درج ہوئی ہیں:

''رضوان کو میری طرح پیراکی نہیں آتی تھی۔ میں تو پھر بھی مینڈک کی طرح ہاتھ پاؤں چلا کر تھوڑا بہت تیر سکتا تھا، جب کہ رضوان کو پانی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی دریا میں اترنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس نے یہ بہانہ لگایا کہ اسکے پاس جانگیہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: میرے بیگ میں ایک فالتو نیکر موجود ہے، جو اسکو مل سکتی ہے مگر اس نے کپڑے نہ اتارے اور ساحلِ دریا پر کھڑا پیراکی اور کشتی رانی کے مقابلوں کو دیکھتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد علمی مقابلوں کا پروگرام تھا، جن میں مجھے حصہ لینا تھا۔ مجھے فی البدیہہ تقریر میں پہلا انعام ملا۔ البتہ بیت بازی کے مقابلے میں میری ٹیم ہار گئی۔ اس روز ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کی جانی تھیں اس لیے اذان تین بجے دی گئی۔ سب لوگ وضو کر کے نماز کی ادائیگی کے لیے صفوں میں کھڑے ہو چکے تھے کہ دریا کی جانب سے کسی نے پکار کر کہا کہ رضوان دریا میں گر گیا ہے۔ سب لوگ بھاگ کر دریا کے کنارے پہنچے مگر اس وقت تک رضوان پانی کے اندر غایب ہو چکا تھا۔ پیراکی کے ماہر طالب علم فوراً دریا میں کود گئے اور پرنسپل نے ایک قریبی گاؤں سے غوطہ خوروں کو بلانے کے لیے ایک سائیکل سوار کو بھیجا۔ دو غوطہ خور آدھ پون گھنٹے کے اندر جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ جہاں پر رضوان دریا میں گرا تھا وہاں پر پانی کی گہرائی بیس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کی مسلسل کوششوں کے بعد رضوان کی لاش کو پانی سے نکالا جا سکا۔ اس وقت تک قریبی قصبے کے ہسپتال کا میڈیکل آفیسر بھی آ چکا تھا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد رضوان کی موت کی تصدیق کر دی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ عام طور سے خیال کیا جاتا تھا کہ رضوان وضو کرنے کے دوران پاؤں دھوتے ہوئے پھسل جانے کے سبب پانی میں گر گیا تھا۔ مگر اس صورت میں اس کے پاؤں جوتوں کے بغیر ہونے چاہییں تھے، جب کہ رضوان کے بوٹوں کے تسمے بندھے ہوئے تھے۔ اکا

دکا اس شبہے کا اظہار بھی کیا گیا کہ وہ لڑکا، جس نے رضوان کے پانی میں گرنے پر الارم دیا تھا، خود رضوان کو دھکا دینے کا مرتکب ہوا تھا۔''

رضوان کی وفات کا سانحہ میرے لیے اتنا بڑا صدمہ تھا کہ میں آج بھی اس بات کو یاد کر کے مغموم ہو جاتا ہوں۔ میں نے اپنے افسانے میں اس کی بے وقت موت میں معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ رضوان افریقی طالب علموں میں سے شاید پہلا شخص تھا جو جامعہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ افریقیوں میں گھانا کا ایک نوجوان صالح ادریس تھا، جو اپنے اقارب سے لمبی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور پاگل ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ خوبصورت افریقن میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ غیر ملکی طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد اس زمانے میں جامعہ میں پڑھتی تھی۔ سری لنکا کا ایک طالب علم عبدالرحمٰن بہت بچپن میں قادیان بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے پتا نہیں ہے کہ اس کو اپنی مادری زبان آتی تھی یا نہیں، پنجابی وہ ٹھیٹھ بولتا تھا۔ اس کا ایک ہم وطن پڑھنے لکھنے میں تو پھسڈی تھا مگر گتکے کا استاد تھا۔ اس کو جسم کے ایک حصے میں پسینہ آتا تھا جب کہ دوسرا نصف بالکل خشک رہتا تھا۔ ایک وہی اعجوبہ نہیں تھا، میرے دوست قاضی نعیم الدین احمد کا دل دائیں جانب تھا اور شاید اس کا پورا اندرونی نظام دوسروں کے الٹ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ایک مضمون روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی میں لکھا تھا۔

حیدر آباد دکن کے ایک احمدی خاندان کے پانچ بچے تعلیم کے سلسلے میں بہت بچپن میں قادیان بھیج دیے گئے تھے۔ وہ تقسیم ملک کے وقت جامعہ کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی لوٹ کر اپنے وطن نہ جا سکا اور نہ کبھی ان کو اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کی توفیق ملی۔ چار لڑکے بنگال کے رہنے والے تھے، جن میں سے عبدالعزیز میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ بے حد محنتی طالب علم تھا، جو دن کا ایک ایک لمحہ پڑھنے لکھنے میں لگا دیتا تھا۔ اس کو مرگی کا مرض لاحق تھا جس کے سبب وہ آئے دن بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا۔ اس نے اپنا کامیاب علاج محض اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر کیا۔ وہ اس طرح کہ جونہی اس کو احساس ہو جاتا تھا کہ دورہ پڑنے والا ہے وہ فوراً زمین پر لیٹ جاتا تھا خواہ وہ اس وقت کسی گلی کوچے میں ہی کیوں نہ جا رہا ہو۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کی طبیعت سنبھل جاتی تھی اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ وہ سال بھر میرا روم میٹ بھی رہا تھا اور جانتا تھا کہ میں اس کے برعکس اپنے اسباق کی تیاری پر بہت کم توجہ دیتا تھا اس کے باوجود امتحانوں میں میرے نمبر ہمیشہ اس سے زیادہ آتے تھے۔ چنانچہ نتیجہ نکلنے والے روز وہ باقاعدہ سوگ مناتا اور اپنے رنج والم پر قابو پانے کے لیے باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ جتنا عرصہ ہم کلاس فیلو رہے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ وہ کسی مضمون میں مجھ سے زیادہ نمبر حاصل کرے۔ اس کے باوجود میرے ساتھ اس کی دوستی میں کبھی فرق نہ آیا۔ آگے چل کر اس کو قرآنِ کریم کا بنگالی میں

ترجمہ کرنے کی سعادت ملی۔

ہوسٹل کے بے شمار طالب علم سحری کے وقت اٹھ جاتے تھے اور تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے اسباق دہراتے تھے۔ چنانچہ جب میں نمازِ فجر کے لیے اٹھتا تو دیکھتا کہ میرا روم میٹ عبدالعزیز بنگالی کتابیں کھولے بیٹھا پڑھ رہا ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کم ازکم امتحان سے قبل ایسا کرنا چاہیے۔ ایک روز میری فرمائش پر مجھے سحری کے وقت بیدار کر دیا گیا۔ میں نے وضو کیا، دو رکعت نفل ادا کیے اور لیمپ جلا کر کتاب کھول کر پڑھنے کے لیے بیٹھا۔ مگر مجھ سے کچھ پڑھا نہ گیا، کیونکہ مجھے اس قدر شدید بھوک لگ رہی تھی کہ آنکھوں کے سامنے کتاب کی سطریں ناچنے لگیں۔ ہمارے پاس کھانے پینے کے لیے کمروں میں کچھ نہیں ہوتا تھا کیونکہ کھانا ہمیں دن میں چار بار لنگر سے ملتا تھا۔ دوپہر اور شام کے کھانے کے علاوہ صبح کے وقت اور سہ پہر کو ناشتہ دیا جاتا تھا، جو اتنا کافی ہوتا تھا کہ مجھے کبھی کوئی چیز کھانے کے لیے باہر سے نہیں خریدنی پڑی۔ دراصل میری مشکل یہ تھی کہ میری نیند پوری نہ ہوتی تھی۔ یوں بھی میں محاورے کے مطابق گھوڑے بیچ کر سوتا تھا۔

میری اس عادت کی بھی دو کہانیاں ہیں جو سنائے جانے کے قابل ہیں۔ ایک رات موسلا دھار بارش ہوئی، جس کے سبب گاؤں کے کئی کوٹھے گر گئے۔ ان میں سے ایک کوٹھا ہوسٹل کے ہمسائے میں تھا۔ زخمیوں کی آہ وزاری کو سن کے طالب علموں کی ایک پوری جماعت کمک کی خاطر وہاں پر پہنچ گئی۔ پتا چلا کہ اس مکان کے باسیوں میں سے ایک شخص بہت بری طرح زخمی ہوا تھا اور اس کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ احمد نگر میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ قریب ترین رہنے والا ڈاکٹر ربوہ میں رہتا تھا مگر زخمی کو وہاں تک پہنچانا ممکن نہ تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ کوئی شخص ڈاکٹر کو لانے کے لیے ربوہ جائے۔ اس مقصد کے لیے سائیکل درکار تھی جو سارے ہوسٹل میں صرف میرے پاس تھی اور میرے کمرے میں تھی۔ میں اور میرا روم میٹ عثمان چینی اس سارے معاملے سے بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے اور ہم نے حسبِ عادت دروازے کی اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر عثمان بیدار ہو گیا اور اس نے بھی مجھے بیدار کرانے کی خاطر آوازیں دیں، بلکہ خود اس کے بیان کے مطابق میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اٹھ کر مجھے ہلایا جلایا، مگر میں بیدار نہ ہوا۔ اس نے دروازہ کھول کر اپنی ذمے داری پر سائیکل لے جانے کی اجازت دے دی، جس پر دولڑکے سوار ہو کر ربوہ گئے اور وہاں سے ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو لائے اور پھر واپس چھوڑنے گئے۔ یہ سارا کام انجام دینے کے بعد، جس پر تین چار گھنٹے ضرور لگ گئے ہوں گے، وہ پھر ہمارے دروازے پر آئے۔ عثمان نے دوسری بار اٹھ کر دروازہ کھولا اور سائیکل کو وصول کیا۔ جب میں اگلی صبح بیدار ہوا تو مجھے رات کے ماجرے کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ عثمان نے کہا کہ

اس نے تنگ آ کر مجھے مکے بھی مارے تھے لیکن میں نے پھر بھی آنکھ نہ کھولی۔

اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ مجھے اس سے قبل پیش آ چکا تھا۔ایک بار میں نے خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع میں حصہ لیا تھا، جو تین روز تک جاری رہنے والے کیمپ کی صورت میں منعقد ہوتا تھا۔وہاں پر کئی قسم کے دلچسپ پروگرام ہوتے تھے، جن میں کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلے بھی ہوتے تھے۔میں نے بے شمار مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور کئی ایک انعامات حاصل کیے تھے۔اجتماع کے خاتمے پر میں تھکا ماندہ ماموں احمد خان نسیم کے گھر پہنچا اور کچھ کھائے پیے بغیر پلنگ پر دراز ہو کر سو گیا تھا۔جب میں بیدار ہوا تو پتا چلا کہ تیسرا دن چڑھ آیا ہے۔اماں نے بتایا کہ ہم نے تمھیں چوبیس گھنٹوں کی مسلسل نیند کے بعد زبردستی جگایا اور کچھ کھانے پینے پر مجبور کیا تھا۔اس کے بعد تم پھر نیند کی راجدھانی میں چلے گئے تھے اور اگلے چوبیس گھنٹوں تک سوئے رہے تھے۔اگر اماں نے مجھے یہ بات نہ بتائی ہوتی تو مجھے اس پر شاید اعتبار نہ آتا۔

اماں کے ذکر سے یاد آیا کہ ان برسوں میں ہمارے گھرانے میں بیماریوں کے سبب غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے، جن کا اثر بہت دیرپا ثابت ہوا۔نانی بہت دنوں سے چلنے پھرنے سے لاچار تھی اور سوکھتے سوکھتے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔پھر جب اماں کی بیماری ناقابلِ علاج قرار دے دی گئی، تو اماں نے اصرار کیا کہ ان کو ربوہ میں ان کے بھائی احمد خان نسیم کے گھر پہنچا دیا جائے، جہاں پر ان کی والدہ بھی مقیم تھیں۔ابا جی نے دفتر سے سال بھر کی تعطیل لی اور سب بچوں سمیت ربوے منتقل ہو گئے۔اماں کے لیے یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ وہ اپنی ماں اور بھائی کے پاس تھیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی بڑی بہن بیگم جی ان کی اور سوتیلی ماں کی خدمت کے لیے دن رات ان کے پاس گزارتی تھیں۔ہم بچوں کو ایک عرصے تک پتا نہ تھا کہ خالہ بیگم جی ہمارے نانا کی پہلی بیوی سے تھیں اور ماموں محمد خان اور لعل خان کی سگی بہن تھیں۔سارے بہن بھائی ایک دوسرے سے پیار اور محبت کی ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ماموں محمد خان نے اپنی سوتیلی ماں کے کہنے پر اپنی بیوی مامی سارہ کو طلاق دے دی تھی، جس کا ذکر میرے اسی نام کے افسانے میں بھی آتا ہے۔

نانی کی وفات کے بعد خالہ بیگم جی نے اماں کی خدمت میں دن رات ایک کر دیے۔پھر جیسے قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، ماموں احمد خان کی بیوی مامی رحمت اچانک بیمار ہوئی اور بستر سے لگ گئی۔اس کے چار بچے تھے، جن میں سے دونوں بچیاں جمیلہ اور نعیمہ ابھی بہت چھوٹی تھیں۔ان کو سنبھالنے کے لیے مامی رحمت کی چھوٹی بہن فاطمہ، جس کو گاؤں میں پھتاں کے نام سے پکارتے تھے، ربوہ آ گئی۔وہ شادی شدہ اور ایک بیٹی کی ماں تھی مگر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہو چکی تھی اور وہ ماں کے گھر لوٹ

آ ئی تھی۔ اس نے بہن کی دیکھ بھال کے علاوہ گھر بار کا پورا کام اپنے ذمے لے لیا۔ مامی رحمت اس بیماری سے جانبر نہ ہوسکی اور بمشکل پینتیس برس کی عمر میں وفات پا گئی۔ فاطمہ نے اپنے خاوند سے طلاق لے کر ماموں احمد خان سے شادی کر لی۔ اس طرح مامی رحمت کے بچوں کو ان کی سگی خالہ سوتیلی ماں کے روپ میں مل گئی، جس نے انکو وہی محبت دی، جس کی توقع وہ اپنی سگی ماں سے رکھتے تھے۔ ماموں احمد خان کا بیٹا نسیم مہدی اسی ماں سے ہے جو آج کل کینیڈا کا رئیس التبلیغ اور امیر جماعتِ احمدیہ ہے۔

اماں نے ۳۰ جولائی ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ عین اس زمانے میں جب احمدیوں کے خلاف پنجاب میں ایجی ٹیشن چل رہی تھی۔ بالخصوص لاہور میں احمدیوں پر حملے ہو رہے تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی اس جماعت کے ارکان محفوظ نہ تھے۔ اباجی واپس راولپنڈی چلے تو گئے مگر وہاں پر بھی حالات دگرگوں تھے اس لیے بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے اپنے گاؤں چنگا بنگیال چلے جائیں۔ آپا نصیرہ اور رفیق ابھی ربوہ میں مقیم تھے جب کہ عبدالقیوم میٹرک کرنے کے بعد واہ فیکٹری میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہ کالج میں پڑھنا چاہتا تھا، جس کی وہ قابلیت رکھتا تھا۔ اس نے میٹرک میں نہ صرف فرسٹ ڈویژن لی تھی بلکہ مجھ سے ایک سو نمبر زیادہ حاصل کیے تھے۔ مگر اماں کی بیماری پر اباجی کا سارا اثاثہ لگ گیا تھا۔ وہ اپنے اندر مزید بوجھ اٹھانے کی ہمت نہ پاتے تھے۔ قیوم کا کالج میں داخلہ ہو گیا تھا مگر اس کی توقعات جیب خرچ کے سلسلے میں اتنی اونچی تھیں کہ اباجی ان کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اماں زندہ ہوتیں تو قیوم کی کالج میں تعلیم کا بندوبست ہو جاتا۔ بہر صورت اسے مجبوراً واہ فیکٹری میں ملازمت کرنی پڑی۔ اور پھر جب اس کو بھائی عظیم نے انگلستان چلے جانے کا مشورہ دیا، جس کے لیے وہ اسے اخراجات دینے کے لیے تیار تھے، تو وہ فوراً جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ وہ ۱۹۵۸ء میں، گویا مجھ سے دو برس قبل، ولایت چلا گیا۔

جماعتِ احمدیہ کو خطرہ تھا کہ ربوے پر بھی حملہ ہو سکتا ہے اس لیے ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار کی گئی جس کو ایک سابق فوجی انسٹرکٹر شیر خان ٹریننگ دیتا تھا۔ اس کا تعلق ''فرقان فورس'' سے تھا جو جماعت کی طرف سے کشمیر کی جنگ میں حصہ لینے کے لیے ۱۹۴۸ء میں پونچھ کے محاذ پر بھیجی گئی تھی۔ ربوہ میں اس فورس کے افسروں کے لیے علیحدہ کوارٹرز بنائے گئے تھے۔ شیر خان نے پہلے نوجوانوں کو پی ٹی کی ایکسرسائز کرانی شروع کی، پھر ان کو آہستہ آہستہ آگ بجھانے اور زخمیوں کو فرسٹ ایڈ دینے اور ان کو علاج کی خاطر ہسپتال پہنچانے کی ٹریننگ دی۔ وقتاً فوقتاً اس گروپ کی طرف سے اپنی مہارت کے مظاہرات کیے جاتے تھے۔ عام طور سے طالب علموں کو اس گروپ میں شامل نہیں کیا جاتا تھا البتہ جب راتوں کو ربوہ کی سرحدوں پر حفاظتی دستے پہرہ دیتے تھے تو

وہاں پر ہماری ڈیوٹی بھی لگتی تھی۔ ہر گروپ کے سپرد ایک سوگز کا علاقہ ہوتا تھا جس کی دیکھ بھال رات پڑتے سے صبح سورج نکلنے تک کرنی ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھی بے شمار راتیں لاٹھی اٹھائے ہوئے پہرہ دیتے ہوئے گزاری تھیں۔

قریب قریب ہر سال دریائے چناب میں طغیانی آتی تھی اور سیلاب کا پانی سارے بند توڑ کر آس پاس کی زمین پر پھیل جاتا تھا۔ مگر یہ سیلاب احمد نگر کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا، کیونکہ یہ گاؤں کسی قدر اونچائی پر آباد ہے۔ ربوے کا رقبہ بھی عام سطح سے اونچا ہے، جس کے سبب وہاں پر بھی سیلاب کا پانی داخل نہیں ہو سکتا۔ احمد نگر کے اردگرد کا سارا علاقہ طغیانی کی زد میں آ جاتا تھا اور احمد نگر کسی جزیرے کی طرح باہر کی دنیا سے کٹ جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر جامعہ کے طالب علم کشتیوں میں بیٹھ کر آس پاس کے دیہات میں کسانوں کی کمک کو پہنچ جاتے تھے اور ان کے ڈھور ڈنگر بچانے اور اناج کے ذخیروں کو محفوظ جگہوں پر پہنچانے میں لگ جاتے تھے۔ اس کام کے لیے صرف ایسے طالب علموں کو جانے کی اجازت ملتی تھی جو اچھے پیراک ہوتے تھے اور جسمانی طور پر خوب تگڑے ہوتے تھے۔ میں نے اکثر نوٹ کیا کہ یہ لوگ لکھنے پڑھنے میں ناکارہ ہوتے تھے اور اکثر امتحانوں میں فیل ہو جاتے تھے۔

ایسے دیہاتی چوہدریوں کی اس زمانے میں اچھی خاصی تعداد جامعہ میں پڑھتی تھی۔ یہ لوگ کھاتے پیتے پنجابی زمینداروں کی آل اولاد تھے جن کو ماں باپ نے خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے راستے میں البتہ یہ رکاوٹ تھی کہ ان کو اس کام کے لیے عربی پڑھنی پڑتی تھی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ یہ چیز ان کے بس سے باہر تھی۔ ان بیچاروں کو تو اردو بھی اچھی طرح نہیں آتی تھی۔ وہ لوگ اکثر پرائمری پاس تھے اور ایک یا دو مڈل کا امتحان دے کر آئے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات کے بعد ہر سال ان میں سے ایک دو اپنے گاؤں میں رک جاتے تھے اور زمینداری کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ دوسرے لڑکے، جن کے خاندان کچھ زیادہ ہی مخلص واقع ہوئے تھے، کوشش کرتے تھے کہ میٹرک کا امتحان پاس کر کے کہیں ادھر ادھر نکل جائیں۔ اس زمانے میں انگلینڈ جانے کی رسم نئی نئی چل نکلی تھی، جہاں پر جا کر مزدوری کرنے کو سب لوگ اپنے لیے انعام تصور کرنے لگے تھے۔

چوہدری رشید بھی ان لوگوں میں شامل تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کم از کم میٹرک کی ڈگری حاصل کر لے۔ ہو سکتا ہے کہ انگلینڈ میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ دوسری طرف موصوف کو پتا تھا کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنا اس کے بس کی بات نہیں اس لیے اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کو، جو لکھنے پڑھنے میں ذرا ہوشیار تھا، تیار کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ میٹرک کا امتحان دے۔ واضح ہے کہ امتحان میں شامل ہونے کے لیے دونوں کا داخلہ چوہدری رشید نے ادا کیا۔ ان کا باہمی معاہدہ یہ تھا کہ وہ آپس میں

رول نمبر بدل لیں گے۔ چوہدری رشید اپنے پرچوں پر اس کا رول نمبر درج کرے گا اور وہ چوہدری رشید کا نمبر لکھے گا۔اس طرح کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ دھاندلی کی جا رہی ہے۔ پاس ہونے کی صورت میں چوہدری رشید نے اس کو دس ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا، جس میں سے پانچ ہزار پیشگی ادا کر دیے گئے۔ نتیجہ نکلا تو توقع کے مطابق چوہدری رشید پاس ہوگیا اور دوسرا فیل ہوگیا۔ چوہدری رشید کا پاسپورٹ بن چکا تھا، وہ جہاز کا ٹکٹ کٹوا کر لندن چلا گیا۔

احمد نگر کی زرخیزی کے مقابلے میں ربوہ ایک بے آب و گیاہ جگہ تھی مگر ہم طالب علموں کو بے شمار چیزیں ربوہ کی طرف کھینچتی تھیں۔ یوں بھی ہم کو آئے دن ربوے جانا پڑتا تھا۔ بالخصوص نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے احمد نگر کے سارے احمدی ربوہ جاتے تھے جس کے بعد مجھے اپنے ادیب دوستوں سے ملنا ہوتا تھا۔سید احمد سعید ہمدانی، سمیع اللہ قریشی، مرزا حنیف احمد، جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کا صاحبزادہ تھا اور ناصر احمد خان، جس نے ابھی پرویز پروازی کا ادبی نام اختیار نہ کیا تھا۔ ہمدانی کے ساتھ میرا ملنا اس طرح ہوا کہ وہ ماموں احمد خان نسیم کے گھر والی گلی میں رہائش پذیر تھا۔وہ میری تحریریں رسائل میں دیکھا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ مجھے پتا چلے کہ وہ بھی ادیب ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ پڑھنے کے لیے دیا، جو سرگودھے سے چھپا تھا اور جس پر الطاف احمد مشہدی نے پیش لفظ لکھا تھا۔

ہم لوگ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد کسی چائے خانے میں جا کر بیٹھتے تھے اور ادبی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔جس کسی نے کوئی نئی تخلیق کی ہوتی تھی وہ اس کو تنقید کے لیے پیش کرتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہماری محفلوں میں ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا مگر ہم ایک دوسرے کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے تھے اور کبھی ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ ربوہ میں ان دنوں سیلونی کا چائے خانہ آزاد منشوں کے لیے بہت کشش رکھتا تھا،مگر اس کو یہ چیز پسند نہ تھی کہ ہم لوگ گھنٹوں تک چائے کی ایک پیالی پر بیٹھے ہوئے بحث مباحثے میں لگے رہتے تھے۔ جب ہماری ٹولی اس کے چائے خانہ میں داخل ہوتی تھی تو ہمیں دور سے ہی اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی تھی: ''لو پھر آگئے یہ ادیب لوگ۔ اب یہ شام سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔'' ایک روز ایک بہت بڑی توند والا شخص ہمارے قریب بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ یہ بات اگست کے مہینے کی ہے۔ مرزا حنیف احمد کو مذاق سوجھا اور اس نے پوچھا کہ کون سا مہینہ ہے۔ جواب ملا: آٹھواں۔ مرزا حنیف احمد نے کہا: نہیں نواں مہینہ ہونا چاہیے۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو اس نے توند والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب سے اس بات کا فیصلہ کرا لیا جائے۔اس شریف آدمی نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ آٹھواں مہینہ ہے۔اس پر ایک فلک شگاف قہقہہ اٹھا، جس کی موصوف کو توقع نہ تھی۔ اسے بالکل احساس نہ ہوا تھا کہ سارا وقت دراصل اس کی توند زیرِ بحث رہی تھی۔

میں ان دوستوں سے روز روز ملنا چاہتا تھا، جو صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ جامعہ احمدیہ احمد نگر سے ربوہ منتقل ہو جائے۔

میں نے اس کام کے لیے یونین کے نائب صدر مرزا رفیق احمد کو تیار کیا، کیونکہ اس کی پہنچ صدر انجمن احمدیہ کے سرکردہ لوگوں تک تھی۔ علاوہ ازیں وہ آسانی کے ساتھ یہ بات اپنے والدِ محترم حضرت صاحب تک پہنچا سکتا تھا کہ ربوہ میں مبلّغین کے ادارے ''جامعۃ المبشرین'' کی نئی عمارت بن جانے کے بعد اس کی سابقہ عمارت خالی ہو رہی تھی، جو اتنی بڑی تھی کہ اس میں جامعہ احمدیہ اور ہوسٹل دونوں سما سکتے ہیں۔ خلافِ توقع یہ مرحلہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا اور جامعہ کو ربوہ منتقل ہونے کا پروانہ مل گیا۔

ربوہ کی باتیں

جامعہ کو ربوہ میں جو عمارت ملی وہ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، جس کے صحن میں گھاس کا ایک تنکا تک نہ اگتا تھا۔ ایک ہینڈ پمپ موجود تھا مگر اس میں سے نکلنے والا پانی بے حد کھارا تھا، جو اس قابل نہ تھا کہ پیا جا سکے کیونکہ اس میں سے ہمس آتی تھی۔ مجھے تو اس پانی سے نہاتے ہوئے بھی گھن آتی تھی۔ ہوسٹل کے کمپونڈ میں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی، حتیٰ کہ کمروں کا فرش تک شور زدہ مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں اس وقت احمد نگر بہت یاد آیا، جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں ہم لوگ گھومتے پھرتے تھے اور رہٹ والے کنویں پر جا کر ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے نہایا کرتے تھے۔ مگر اب واپسی کے راستے بند تھے۔

میں اس وقت جامعہ کے درجہ رابعہ کا طالب علم تھا اور مولوی فاضل کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کو امتحان کا داخلہ بھیجا جا چکا تھا۔ کلاسیں بند تھیں کیونکہ کورس کی پڑھائی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ طالب علموں کو اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ مجھے اپنے ایک ہم جماعت مرزا سلیم اختر کے ساتھ ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا کہ مل کر امتحان کی تیاری کی جائے۔ میری خواہش تھی کہ ہم ربوہ کے ہوسٹل سے باہر قصبے میں کوئی چھوٹا موٹا مکان یا کمرہ تلاش کر لیں، جہاں پر ہمیں طالب علموں کی گہما گہمی سے ہٹ کر سکون کے ساتھ پڑھنے کا موقع مل سکے۔

چند دنوں کے اندر اندر ہمیں کریم (افغان) پٹھان کی معرفت ایک زیرِ تعمیر مکان مل گیا، جس کے دو کمرے مکمل ہو چکے تھے اور دروازے وغیرہ لگ چکے تھے، چار دیواری بھی بن گئی تھی، مگر کسی وجہ سے تعمیر کا کام روک دیا گیا تھا۔ مالک مکان خود ربوہ میں نہیں رہتے تھے البتہ ان کا ایک ایجنٹ موجود تھا، جو ہمیں وہ مکان چند ماہ کے لیے بلا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم وہاں پر

رہیں گے تو تعمیر کے سلسلے میں جمع شدہ سامان چوری ہونے سے بچا رہے گا۔ ہوسٹل کے ساتھ یہ طے کر لیا گیا کہ ہم کھانا وہاں پر آ کر کھایا کریں گے۔ کریم چاہتا تھا کہ ہم امتحان کی تیاری میں اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ وہ ہم سے عمر میں کافی بڑا تھا اور مولوی فاضل کا امتحان سات بار دے چکا تھا۔ چونکہ اس کا باپ آخر دم تک اس بات پر قایم رہا تھا کہ اس کا بیٹا مولوی فاضل کا امتحان پاس کرے گا، اس لیے کریم اس کی روح کو خوش کرنے کے لیے آٹھویں بار امتحان میں بیٹھنا چاہتا تھا۔

نقلِ مکانی کے دوسرے یا تیسرے روز پتا چلا کہ ساتھ کے مکان میں، جہاں پر ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا، دوپہر کے وقت ایک قریبی گاؤں کی جانگلی عورت آتی ہے اور دو تین گھنٹے وہاں پر گزارتی ہے۔ کریم پٹھان نے کہا کہ اگر اس چیز کو نہ روکا گیا تو ہم پر بھی حرف آ سکتا ہے۔ اسکا خیال تھا کہ لڑکا لفنگا ہے اور منع کرنے پر باز نہیں آئے گا، اس لیے کسی طریقے سے جانگلی عورت کو ڈرا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس نوجوان کو بلا کر اسکے سامنے ایک تجویز رکھی کہ اگر وہ چاہے تو ہم اس عورت کے ساتھ ایک ناٹک کھیلیں، جسکے نتیجے میں اس پر خوب رعب پڑے گا۔ کریم پٹھان اونچے قد کاٹھ کا لحیم شحیم آدمی تھا اور عام طور سے ملیشیا کے کپڑے پہنتا تھا۔ جب وہ ہاتھ میں بید پکڑے ہوے اور سر پر پولیس والوں کی ٹوپی پہن کر نکلتا تھا تو دیکھنے والے اسکو تھانیدار یا کم از کم ہیڈ کانسٹیبل سمجھتے تھے۔ نوجوان تھوڑا سادہ لوح تھا، وہ کریم کے جھانسے میں آ گیا۔ اگلے روز کریم نے عین اس وقت جا کر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، جب نوجوان جانگلی عورت کے ساتھ مصروفِ عمل تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے کپڑے سیدھے کیے اور دروازہ کھول دیا۔ کریم کسی تھانیدار کی شان اور رعب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دونوں کو خوب جھاڑ پلائی اور کہا کہ وہ دونوں کا چالان کر دے گا۔ اس پر نوجوان نے پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق خوب واویلا کیا اور کہا کہ میرے بھائیوں کو بلاؤ۔ وہ آ کر تھانے دار کی ایسی تیسی کر دیں گے۔ ہم شور شرابا سن کر دوڑے ہوے گئے۔ تھانیدار نے یہ پوز کیا کہ وہ ہمیں جانتا ہے اور ہماری بات کو رد نہیں کر سکتا۔ وہ فوراً اس شرط پر معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے تیار ہو گیا کہ عورت یہ وعدہ کرے کہ وہ آیندہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو وہ اس کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دے گا۔ پھر اسکو کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ بے چاری جانگلی عورت سچ مچ ڈر گئی۔ وہ دودھ بیچنے کے لیے ربوہ آتی تھی۔ اس نے اپنا دودھ کا برتن اٹھایا اور پلک جھپکتے میں وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

ہم نے دیکھا کہ شور شرابا سن کر آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے اور معاملے کی نوعیت کو جان گئے تھے۔ اب خطرہ تھا کہ کہیں یہ خبر نظارت امورِ عامہ کے متعلقہ افسر بھامڑی صاحب تک نہ پہنچ جائے، کیونکہ اس کے سپرد ایسے معاملات سے نبٹنا تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے نظام میں اس کو

تھانیداروں سے بھی بڑھ کر اختیارات حاصل تھے۔ کریم پٹھان نے کہا پیشتر اس کے کہ بات بگڑ جائے ہمیں فوراً وہ مکان خالی کر دینا چاہیے۔ کریم اس زمانے میں ایک دوست کے گھر پر رہتا تھا جس کا ایک کمرہ ہمارے لیے خالی کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں دوسری بار بوریا بستر باندھ کر نقل مکانی کرنی پڑی۔

اگلے دو مہینے ہم نے امتحان کی تیاری دل لگا کر کی۔ چونکہ مرزا سلیم کو عربی ادب کے سوا کسی دوسرے مضمون میں دلچسپی نہ تھی اور وہ سارا دن دیوان المتنبی کے قصیدے پڑھنے میں گزار دیتا تھا، اس لیے میں نے ہفتے عشرے میں اپنا پروگرام علیحدہ بنا لیا اور باری باری سارے مضامین کی نوٹ بکیں پڑھ گیا جو میں نے خود لکھی تھیں یا دوسروں سے حاصل کی تھیں۔ جامعہ میں قدیم سے یہ رسم چلی آتی تھی کہ امتحان پاس کرنے والے اپنی نوٹ بکیں جونیئر طالب علموں کے حوالے کر دیتے تھے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میرے پاس پندرہ سولہ ایسی نوٹ بکیں جمع تھیں۔ کریم پٹھان اس سارے عرصے میں ہماری خاطر داری میں لگا رہا کیونکہ بقول اس کے ہم اس کے گھر پر اس کے مہمان تھے۔

امتحان کا سینٹر لائل پور میں تھا، جہاں پر ہمارے لیے گھنٹہ گھر کے قریب واقع مسجد احمدیہ میں ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں امتحان کے ہال میں سب سے آخر میں بیٹھا ہوا تھا البتہ میرے پیچھے ایک سیٹ خالی تھی۔ پرچہ شروع ہوئے شاید آدھ یا پون گھنٹہ ہوا تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے ٹھونک ماری۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو کریم پٹھان اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر وہاں پر آ کر براجمان ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ کمرۂ امتحان کا سپرنٹنڈنٹ اس کا جاننے والا نکل آیا ہے، جس نے اس کو نقل مارنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ اس نے کہا تم اپنے جوابات والے کاغذات باری باری میرے سامنے رکھتے جاؤ تاکہ میں ان کو نقل کر سکوں۔ اس نے کہا کہ تفصیلات وہ مجھے پرچہ دینے کے بعد بتائے گا۔

کمرۂ امتحان سے باہر نکل کر اس نے بتایا کہ جب اس نے پہلی بار مولوی فاضل کا امتحان دیا تھا تو وہ شخص، جو ہمارا سپرنٹنڈنٹ بن کر آیا ہے، اس کے ساتھ اسی بنچ پر بیٹھا ہوا منشی فاضل کا امتحان دے رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ایم اے کرنے کے بعد ایک کالج میں پروفیسر لگا ہوا ہے۔ اس نے کریم پٹھان کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر خود اس کے پاس آیا تھا۔ جب کریم نے اس کو بتایا کہ وہ سات بار مولوی فاضل کے امتحان میں فیل ہو چکا ہے اور یہ اس کی آخری کوشش ہے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا میں تمھیں نقل مارنے کی اجازت دیتا ہوں۔ اس طرح کریم کو میری پشت پر موجود خالی سیٹ پر جا کر بیٹھنے کی رعایت دے دی گئی اور میں اس قدر سادہ لوح یا دوسرے الفاظ میں بے وقوف تھا کہ میں اس کی باتوں میں آ گیا اور میں نے اسے اپنے سارے پرچے نقل کرنے دیے۔ کریم میں اتنی سوجھ بوجھ تو تھی

نہیں کہ وہ میرے فقروں میں ردوبدل کرتا اس لیے مجھے یقین ہے کہ میرے اور اس کے پرچے سو فیصد ایک جیسے تھے۔

میں امتحان ختم ہونے پر راولپنڈی چلا گیا اور اگلے دن روزنامہ "تعمیر" کے دفتر میں پہنچ گیا، جسکے لیے میں عرصے سے لکھتا چلا آیا تھا۔ پتا چلا کہ اس دوران میں وہاں پر ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ ادارۂ تحریر، جس میں نسیم حجازی، حافظ مظہر الدین اور عنایت اللہ شامل تھے، ''تعمیر'' کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ انھوں نے اپنا اخبار ''کوہستان'' نکال لیا تھا جسکے پہلے ایگزیکٹو ایڈیٹر جمیل پیرزادہ تھے، مگر عنایت اللہ نے بہت جلد انکا پتا کاٹ دیا اور خود انکی جگہ پر براجمان ہو گئے۔ ''تعمیر'' کے مدیر محمد فاضل تھے جنکے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی دوستی ہو گئی۔ میں ایک مضمون چھپوانے کے لیے لایا تھا۔ انھوں نے میری خوش خطی کی تعریف کی اور کہا انکا جی چاہتا ہے کہ مضمون کو میرے خط میں چھاپ دیں کیونکہ وہ انکے کاتب کے خط سے کہیں بہتر ہے۔ انھوں نے کہا اگر تم مضمون کا معاوضہ چاہتے ہو تو پھر محمد صفدر سے بات کرو جو ایگزیکٹو ایڈیٹر ہیں۔ دراصل محمد صفدر اخبار کے مالکوں میں سے تھے اور نہ صرف مالی معاملات کے نگران تھے بلکہ ادارتی فیصلے بھی خود کرتے تھے۔ محمد فاضل بس نام کے مدیر تھے۔ میں محمد صفدر سے جا کر ملا تو انھوں نے نہ صرف معاوضہ دینے کی ہامی بھری بلکہ اپنے میز کی دراز سے انگریزی مجلّوں کا ایک پلندہ نکال کر میرے حوالے کیا کہ ان رسالوں میں چھپی ہوئی کہانیوں میں سے اپنی پسند کی کہانیاں ترجمہ کر دیا کروں۔

میں وہاں سے اٹھ کر ''کوہستان'' کے دفتر میں، جو اسی سڑک پر جامعہ مسجد کے پہلو میں تھا، حافظ مظہر الدین اور نسیم حجازی سے ملنے کے لیے گیا جن کے ساتھ میری پرانی شناسائی تھی۔ حافظ مظہر الدین نے مجھے ''کوہستان'' میں لکھنے کی دعوت دی اور مدیرِ اخبار ابو صالح اصلاحی سے ملاقات کرائی، جو بیٹھے ہوئے اخبار کا اداریہ لکھ رہے تھے، اس لیے ان کے ساتھ لمبی چوڑی بات نہ ہو سکتی تھی۔ مظہر الدین کی زبانی پتا چلا کہ جمیل پیرزادہ روزنامہ ''زمیندار'' کے راولپنڈی ایڈیشن کے مدیر بن گئے تھے جس کا آفس وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

میں ''زمیندار'' کے دفتر میں پہنچا تو جمیل پیرزادہ چھٹی کرنے والے تھے۔ انھوں نے کہا: میرے ساتھ گھر چلو، میں تم سے ایک خفیہ بات کرنی چاہتا ہوں۔ راز کی بات یہ تھی کہ وہ ''زمیندار'' کو چھوڑنے والے تھے اور اپنا ذاتی ہفت روزہ ''رازدان'' نکالنا چاہتے تھے جسکا ڈیکلریشن ان کو مل چکا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم فارغ ہو تو کیوں نہ تم کو اسکا مدیر بنا دیا جائے۔ مجھے بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پہلے شمارے کے لیے مواد حاصل کر لیا گیا تھا۔ دوسرے دن سے میں ''رازدان'' کے دفتر میں جا کر

بیٹھنے لگا۔ وہاں پر راولپنڈی کے شاعر و ادیب اپنی تخلیقات چھپوانے کے لیے آتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ احمد شریف کسی ہندوستانی فلم ایکٹر کا انٹرویو لائے تھے اور چاہتے تھے کہ ''رازدان'' میں ایک کالم فلموں کے بارے میں چھپا کرے، جس کو وہ ایڈٹ کرنا چاہتے تھے۔

عین ان دنوں میں مولوی فاضل کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور میں اپنی توقعات کے برعکس تین پرچوں میں فیل ہو گیا۔ ممتحنوں نے جب میرے اور کریم پٹھان کے پرچوں کا مقابلہ کیا ہوگا، تو قرار واقعی اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ہم نے دھاندلی کی تھی، اس لیے دونوں کو فیل کر دیا گیا۔ میں نے سوچا مجھے راولپنڈی میں رہ کر امتحان دوسری بار دینا چاہیے۔ البتہ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس سلسلے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے کورس کی کتابوں کی فراہمی کا سوال تھا۔ میرے پاس ایک بھی کتاب نہ تھی کیونکہ ہمیں کتابیں جامعہ کی لائبریری سے جاری ہوتی تھیں، جو امتحان دینے کے بعد واپس کر دی گئی تھیں۔ البتہ مجھے اطمینان تھا کہ میری نوٹ بکیں، جو میں ربوے سے روانگی کے وقت ایک جونیر طالب علم مسعود جہلمی کو دے آیا تھا، مجھے مل جائیں گی۔ ان کی تعداد پندرہ یا سولہ تھی جس میں سے نصف خود میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ دوسری کاپیاں مجھے سینئر طالب علموں سے ملی تھیں۔ مسعود نے میرے خط کے جواب میں لکھا کہ میری نوٹ بکیں چوری ہو گئی تھیں۔ وہ مجھے بس دو کاپیاں دے سکتا ہے، جو چوری ہونے سے بچ گئی تھیں۔ چنانچہ اس نے مجھے دو کاپیاں واپس کر دیں، جو اچھی حالت میں نہ تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ مسعود کے پاس ساری کاپیاں محفوظ تھیں، مگر وہ میرے سامنے صاف جھوٹ بول گیا۔ برسوں بعد مجھے طالب علموں نے بتایا کہ میری کاپیاں نسل درنسل جامعہ کے طالب علموں کے استعمال میں آتی رہیں تھیں۔

میں نے سن رکھا تھا کہ جناب امیر عالم صاحب، صدر جماعتِ احمدیہ راولپنڈی، کی بیٹی مولوی فاضل کے امتحان میں ایک یا دو بار فیل ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے باپ کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر ان کی بیٹی مجھے کورس کی کتابیں باری باری تھوڑے دنوں کے لیے دینے کو تیار ہو، تو میں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں اس کی مدد کر دوں گا۔ باپ کو میری تجویز پسند آئی مگر اس نے کہا اس بارے میں فیصلہ میری بیٹی خود کرے گی۔ اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی اور کہا کہ تم براہِ راست بیٹی سے بات کرو۔ میں نے پردے کے پیچھے سے اپنی تجویز پیش کی، جس کا دوٹوک جواب یہ ملا کہ وہ میری مدد کے بغیر مولوی فاضل کا امتحان پاس کر سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے کورس کی کتابیں ایک دن کے لیے بھی عاریتاً نہیں دے سکتی۔

مجھے نظر آ رہا تھا کہ مولوی فاضل کا امتحان دینے کے لیے مجھے ربوہ لوٹنا پڑے گا مگر اس میں یہ

قباحت تھی کہ جامعہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ کیا جامعہ کا پرنسپل ایک طالب علم کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا جو نصف سال سے پڑھنے کو تیاگ کر صحافت کی وادیوں میں سرگرداں تھا؟ اباجی کا مشورہ بھی یہی تھا کہ مجھے ربوہ جا کر دوسری بار مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہیے۔ ربوہ میں جامعہ کے پرنسپل قاضی محمد نذیر لائلپوری نے کہا: آپ بہت دیر سے آئے ہیں اس لیے میں آپ کو مولوی فاضل کی کلاس میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ چونکہ مجھے تعلیمی وظیفہ تحریکِ جدید انجمن احمدیہ کی طرف سے ملتا رہا تھا، اس لیے انھوں نے مجھے وکیل التعلیم میاں عبدالرحیم احمد سے جا کر ملنے کو کہا، جو میرے تعلیمی ریکارڈ سے خوب واقف تھے۔ میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر میرا وظیفہ جاری کر دیا جائے، تو میں امتحان کی تیاری پرائیویٹ طور پر کرسکتا ہوں۔ وہ شاید اس روز اچھے موڈ میں تھے، کیونکہ وہ فوراً میرا وظیفہ چھ ماہ کے لیے جاری کرنے کو تیار ہو گئے، مگر اس شرط پر کہ مجھے اپنی رہائش کا انتظام خود کرنا ہوگا۔ البتہ کورس کی کتابیں میں جامعہ کی لائبریری سے جاری کرا سکوں گا۔

رہائش کا انتظام ایک دوست محمد اسلم فاروقی کی وساطت سے اس کے تایا محمد نذیر فاروقی کے مکان پر ہو گیا جن کی فیملی پیچھے گاؤں میں مقیم تھی اور وہ ربوہ میں اکیلے رہتے تھے۔ فاروقی صاحب اچھے انشا پرداز تھے اور عام طور سے ربوہ کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے ذریعے میرے مراسم جماعتِ احمدیہ کے آرگن روزنامہ ''الفضل'' کے مدیر روشن دین تنویر کے ساتھ بن گئے، جن کے گھر پر ہم ہر ہفتے باقاعدگی سے حاضری دیتے اور ان کا منظوم کلام سنا کرتے تھے۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں اردو کے ادبی مجلّوں میں چھپتے رہے تھے مگر ''الفضل'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد ان کا کلام صرف اس اخبار میں چھپتا تھا۔ ان کی محفلوں میں بیٹھنے کے ساتھ ساتھ میری امتحان کی تیاری زور شور سے جاری تھی۔ امتحان کے لیے داخلہ جا چکا تھا اور میں نے باری باری کورس کی ساری کتابیں از سرِ نو اوّل سے آخر تک پڑھیں اور نئے نوٹ تیار کیے۔ بلکہ عربی ادب کی ایک کتاب کا میں نے اردو میں ترجمہ کر ڈالا، جس کے بارے میں فاروقی صاحب کا خیال تھا کہ اس کو چھپوا دینا چاہیے۔ مجھے اس محنت کا صلہ اس طرح ملا کہ اس سال پہلی بار امتحان کے پرچوں کے دس سوالوں میں سے چار کے جوابات عربی زبان میں دینے کو کہا گیا تھا، جس کے لیے میری تیاری پوری تھی۔ چنانچہ میں اس برس مولوی فاضل کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آیا۔ دوسری پوزیشن جامعہ احمدیہ کے طالب علم ارشاد بشیر کے حصے میں آئی۔ جامعہ کے دوسرے سارے طالب علم فیل ہو گئے تھے۔ یوں بھی اس برس امتحان میں شامل ہونے والے اڑھائی سو امیدواروں میں سے صرف سولہ طالب علم پاس ہوئے تھے اور میرے سوا سب کی تھرڈ ڈویژن آئی تھی۔ نتیجہ نکلنے کے بعد سننے میں آیا کہ ارشاد بشیر کہتا پھرتا ہے کہ اول تو اس کو آنا تھا مگر میں

نے رشوت دے کر نتیجہ اپنے حق میں نکلوالیا تھا۔

البتہ میں بعض اوقات سوچا کرتا ہوں کہ کیا ہمارے ایک حیلے کا اثر ممتحنوں کی رائے پر پڑا تھا یا نہیں۔ پہلے یا دوسرے پرچے کے شروع ہونے سے قبل ہم امتحان گاہ کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے، جب ارشاد بشیر کو شرارت سوجھی اور اس نے کہا کیوں نہ ہم اپنے جوابات لکھتے ہوئے اپنے آپ کو عورت کے روپ میں پیش کریں۔ چونکہ پرچوں پر نام لکھنے کی اجازت نہ تھی اور صرف رول نمبر درج کیے جاتے تھے جس کے سبب پرچہ چیک کرنے والا ممتحن نہیں جان سکتا تھا کہ وہ پرچہ مرد کا لکھا ہوا یا عورت کا اس لیے اگر ہم جواب لکھتے ہوئے مثلاً کہیں کہ ہم عورتوں کی رائے میں فلاں مسئلہ یوں نہیں یوں ہے تو ممتحن چکرا جائے گا۔ ہم اس تجویز پر بہت ہنسے تھے اور میں نے کہا تھا کہ یہ محض ایک طفلانہ سی حرکت ہو گی۔ ممتحن ہمارے رسم الخط کو دیکھ کر جان جائیں گے کہ لکھنے والا مرد ہے۔ عورتوں کا خط عام طور سے مردوں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اپنے ایک یا دو پرچوں میں سچ مچ یہ حیلہ استعمال کیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کیا مجھے اس وجہ سے دوسروں سے زیادہ نمبر دیے گئے تھے اور میں یونیورسٹی میں اوّل آیا تھا یا فی الواقع میرے پرچے دوسروں سے بہتر تھے۔

امتحان سے صرف ایک ہفتہ قبل خالو جان مولوی غلام نبی مصری کی، جن کے ساتھ مجھے خاص لگاؤ تھا، وفات ہوئی۔ وہ میرے استاد، ہیرو اور ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ میں نے اسی روز بیٹھ کر ان پر ایک مضمون لکھا، جو عین ان دنوں میں روزنامہ ''الفضل'' میں تین قسطوں میں چھپا، جب ہم لائلپور میں مولوی فاضل کے امتحان کے پرچے لکھ رہے تھے۔ پرنسپل جامعہ احمدیہ قاضی محمد نذیر لائلپوری نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ میں نے امتحان کی تیاری کا حرج کرتے ہوئے وہ طویل و عریض مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے کہا مضمون امتحان کے پرچے ختم ہونے کے بعد بھی تو لکھا جا سکتا تھا۔ ان کو خالو جان کی وفات پر میرے دلی صدمے کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔

جہاں تک لکھنے لکھانے کا تعلق ہے میں نے اس مشغلے کو سارا وقت جاری رکھا تھا۔ ''رازدان'' کے اداریے میں ربوہ سے بھیجا کرتا تھا، مگر اس بات کا قاضی صاحب کو علم نہ تھا اور نہ ہی وہ جانتے تھے کہ میں کچھ عرصے سے خدام الاحمدیہ کے رسالے ''خالد'' کا نائب مدیر بھی تھا۔ چونکہ مدیرِ اعلیٰ مولوی دوست محمد شاہد، جن کے سپرد جماعتِ احمدیہ کی تاریخ لکھنے کی ذمے داری تھی، اس کام میں بے حد مصروف تھے اس لیے انھوں نے ''خالد'' کی ادارت کلی طور پر میرے سپرد کر رکھی تھی۔ مندرجات کی ایڈیٹنگ کے علاوہ پروف ریڈنگ بھی میں خود کرتا تھا۔

میں نے ''خالد'' میں محمد نذیر فاروقی کا ایک مضمون ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں چھاپا، جس

میں غدر کو جنگِ آزادی قرار دیا گیا تھا۔ یہ مضمون میر داؤد احمد کی نظر سے گزرا، جو اس زمانے میں خدام الاحمدیہ کے صدر تھے۔ وہ فوراً رسالہ اٹھا کر مرزا بشیر احمد، برادرِ خورد مرزا بشیر الدین محمود احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ ان کی رائے کو جماعتِ احمدیہ میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ دراصل مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۵۷ء کے غدر کو بغاوت کا نام دیا تھا جس میں ان کے والدِ ماجد نے پچاس گھڑ سوار انگریزی سرکار کی کمک کے لیے دہلی بھیجے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں تاریخی معاملات کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل ہے، مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے مؤقف کو غلط ماننا پڑتا تھا، جس کے لیے جماعت تیار نہ تھی۔ باہمی مشورے سے "خالد" کے مدیرِ اعلیٰ مولوی دوست محمد شاہد کی جواب طلبی ہوئی۔ پتا چلا کہ مضمون کی اشاعت ان سے مشورہ کیے جانے کے بغیر نائب مدیر کی ذمے داری پر ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں مولوی دوست محمد شاہد مجھے یہ بتانے کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے کہ مجھے ''خالد'' کی ادارت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کو خطرہ تھا کہ ان پر بھی نزلہ گرے گا، مگر وہ معزولی سے بال بال بچ گئے۔ دوسری طرف میرے دل میں جماعتِ احمدیہ کے عقاید کے بارے میں گرہ پڑ گئی، جو آگے چل کر میری اس سے جدائی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

میں پھر ایک بار راولپنڈی پہنچ گیا اور ''رازدان'' کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گیا، جس میں اب وحید قیصر میرے کولیگ تھے۔ ان کو شاید بھول چکا تھا کہ میں ایک زمانے میں بچوں کی ایک ادبی مجلس میں ان کا ساتھی رہ چکا تھا۔ چونکہ اب میں یحییٰ فضلی کے قلمی نام کے تحت لکھتا تھا، اس لیے وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ مگر تھوڑے دنوں کے اندر اندر ''رازدان'' کی اشاعت کو روک دینے کی باتیں ہونے لگیں۔ وجہ یہ تھی کہ جمیل پیرزادہ کی بیگم، جو لڑکیوں کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹرس تھیں، اچانک وفات پا گئیں۔ اس وقت تک گھر بار کو وہی سنبھالتی تھیں۔ بلکہ گھر کے اخراجات بھی ان کی تنخواہ سے نکل آتے تھے۔ اب چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالنے اور گھر کو چلانے کی ذمہ داری جمیل پیرزادہ پر آن پڑی تھی، جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھے۔ روزنامہ ''تعمیر'' کے محمد صفدر نے ان کو اپنے عملے میں لینے کی پیشکش کی، جس کو قبول کرتے ہوئے جمیل پیرزادہ نے وہاں پر کام شروع کر دیا۔ مجھے انھوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں ''رازدان'' کسی قسم کا معاوضہ لیے بغیر تمھارے سپرد کرنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے پتا تھا کہ پرچہ چلانے کے لیے بہت سا سرمایہ درکار ہوگا، جو میرے پاس نہیں تھا۔

راولپنڈی میں اس زمانے میں روزنامے تو موجود تھے مگر ہفت روزہ اخبار نہیں پائے جاتے تھے۔ صدر میں افواجِ پاکستان کے لیے ایک اخبار ''ہلال'' چھپتا تھا، جس کے چیف ایڈیٹر کرنل مسعود اور

ایڈیٹر میجر آغا بابر تھے، جو بطور افسانہ نگار اپنی پہچان رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ میری واحد ملاقات اس طرح ہوئی کہ میں ایک روز اپنے تایا زاد بھائی عزیز الدین احمد کے ساتھ، جو ''ہلال'' میں کام کرتا تھا، وہاں پر چلا گیا۔ اس کی ڈیوٹی اس روز شام کی شفٹ پر تھی اور اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دیتا تو اس روز اس کا کولیگ شفقت تنویر مرزا بھی ڈیوٹی پر تھا۔ وہ لوگ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے اور میں ایک علیحدہ میز پر بیٹھا کسی انگریزی رسالے میں چھپی ہوئی کہانی کا ''تعمیر'' کے لیے ترجمہ کر رہا تھا، جس کی فرمائش محمد صفدر نے کی تھی۔ آغا بابر کمرے میں آئے اور مجھ سے پوچھا آپ کون ہیں اور یہاں پر کیا کر رہے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں ''تعمیر'' کے لیے ایک کہانی کا انگریزی سے ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس پر انھوں نے میرے مسودے کو اٹھا کر دیکھا اور پھر مجھے واپس دے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس واقعے کے چالیس برس کے بعد ہماری آپس میں خط و کتابت شروع ہوئی، جو اس دوران کتابی صورت میں چھپنے والی ہے، تو میں نے انھیں یہ واقعہ یاد دلایا۔ اس پر انھوں نے لکھا: ''مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ آپ ''ہلال'' کے دفتر میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے اور میں نے جو کچھ پوچھا آپ نے بالکل صحیح لکھا۔ آپ کی صورت شکل قطعاً یادداشت میں محفوظ نہیں ہے۔''

''ہلال'' کے دفتر میں میرے جاننے والے محمد یونس بھی تھے، جن کی معرفت عزیز، جو اس زمانے میں ابھی گورڈن کالج کا اسٹوڈنٹ تھا، ''ہلال'' میں پہنچا تھا۔ وہ ایک زمانے میں، جب عزیز گوجر خان کے مسلم اسکول میں پڑھتا تھا، وہاں پر اس کے استاد ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یونس صاحب اس کی دعوت پر ہمارے گاؤں چنگا بنگیال بھی آئے تھے۔ میری ملاقات ان کے ساتھ وہیں پر ہوئی تھی۔ میں ان کی شخصیت اور باتوں سے بہت متاثر ہوا تھا، اگرچہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ان کی عزیز میں دلچسپی کی نوعیت کیا تھی۔ کچھ عرصے بعد ان کو اسکول کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ ان پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ لڑکوں کو اپنا جنسی پارٹنر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں لمبے عرصے تک فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ بات درست تھی یا نہیں۔ عزیز کو انھوں نے کچھ دیر تک اپنے پاس رکھا تھا، جس کی بنا پر عزیز کے بڑے بھائی عبد المنان خان کو اعتراض پیدا ہوا تھا اور انھوں نے مجھے کہا کہ وہ دونوں کے آپس کے تعلق کی نوعیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار تھے، کیونکہ یونس صاحب کا معاملہ دوسرا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس راولپنڈی کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا کہ وہ ایک مرد کے جسم میں پھنسی ہوئی عورت تھے۔ وہ اس زمانے میں اپنی ہمشیرہ کے ہاں رہتے تھے۔ دراصل ان کا کمرہ ہمشیرہ کے گھر کے بالمقابل کی بلڈنگ میں تھا جہاں پر یونس صاحب کا بیشتر وقت گھڑا بجانے اور موسیقی سننے میں گزرتا تھا۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی کا گھڑا بجانے والا استاد ہفتے میں ایک دو بار ان کے گھر پر آتا تھا اور ان کو گھڑا بجانے کا

سبق دیتا تھا۔

یونس صاحب گوجر خان کے رہنے والے تھے اور ہمارے ساتھ ٹھیٹھ پٹھوہاری بولتے تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں لاہور میں حمید نظامی کے ساتھ تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن رہ چکے تھے۔ پھر غلام احمد پرویز کے دامِ تزویر میں آئے اور دس برسوں تک ان کے رسالے ''طلوعِ اسلام'' کے مدیر رہے، کیونکہ پرویز صاحب گورنمنٹ کا ملازم ہونے کے سبب رسالے پر اپنا نام بطور مدیر نہ لکھ سکتے تھے۔ یونس صاحب کے بھائی خورشید عالم لمبے عرصے تک ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے ایگزیکٹو ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار کے بند ہو جانے کے بعد وہ دوسرے اخباروں کے ساتھ اسی حیثیت سے متعلق رہے۔ ان کا سب سے چھوٹا بھائی عنایت اللہ تھا، جس نے افسانہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ میں جن دنوں ہفت روزہ ''قندیل'' میں لکھا کرتا تھا، اس وقت عنایت اللہ اس رسالے کے ممتاز افسانہ نگار ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ پاکستان ایرفورس میں ملازم تھے۔ پھر خدا جانے ان سے کیا جرم سرزد ہوا کہ ان کو سات سال کی قید و بند کی سزا دی گئی اور ملازمت سے ریلیز کر دیا گیا۔ جیل خانے میں ان کو بے شمار قیدیوں سے ان کی کہانیاں سننے کا موقع ملا، جس کی بنا پر انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ قید سے آزادی پانے کے بعد انھوں نے اپنا رسالہ ''حکایت'' نکالا تھا، جس کی ادارت وہ آخری دم تک کرتے رہے۔ ان کا نام بطور افسانہ نگار اردو ادب میں زندہ رہے گا۔

یونس صاحب دائمی مریض تھے۔ عمر کے آخری حصے میں معدے کی خرابی کا شکار تھے، جس کے سبب ان کو سارے دانت نکلوانے پڑے تھے۔ مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت وہ تپ دق کے مریض تھے۔ ان کو ایبٹ آباد کے ایک سینی ٹوریم میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں پر میں اور عزیز ان کو دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ ایبٹ آباد میں ان کا ایک سابق شاگرد رہتا تھا، جس نے ان کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ جب کبھی مجھے پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا رہا، میں یونس صاحب سے ضرور ملنے جایا کرتا تھا۔ آخری بار میری ملاقات ان کے ساتھ ایک شاگرد کے گھر پر ہوئی تھی، جو شادی شدہ تھا۔ اس کا چھوٹا بچہ یونس صاحب کو اجی (دادا) کے نام سے پکارتا تھا۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں یونس صاحب جیسے لوگوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں افتخار نسیم شکاگو میں کھلے بندوں اپنے ''خاوند'' کے ساتھ رہ رہا ہے۔ دن بھر وہ مردوں کے کپڑوں میں اپنی جاب کرتا ہے اور شام کو گھر جا کر زنانہ لباس پہن لیتا ہے۔

عزیز گورڈن کالج سے بی اے کرنے کے بعد قانون پڑھنے کے لیے لاہور چلا گیا تھا۔ دن کے وقت وہ لاء کالج کی کلاسیں اٹنڈ کرتا تھا اور شام کو ''نوائے وقت'' میں ملازمت کرتا تھا۔ آگے چل کر اس

نے اپنی وکالت قایم کر لی تھی، جس میں وہ خاصا کامیاب تھا۔ جب ہائی کورٹ لاہور کی راولپنڈی میں عدالت کھل گئی، تو عزیز وہاں پر منتقل ہو گیا تھا۔ اس نے متعدد بار مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

راولپنڈی میں میرے ادیب دوستوں میں حمید المحامد تھا جس نے آگے چل کر حامد برگی کے قلمی نام کے تحت وزیر آغا کے مجلّے ''اوراق'' کے انشائیہ پردازوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کی۔ میں اس کے خاندان سے قادیان کے زمانے سے واقف تھا۔ اس کے والد نے پنشن لینے کے بعد بنگال واپس لوٹنے کی بجائے، جہاں کے وہ رہنے والے تھے، قادیان میں مکان بنایا تھا اور چاہتے تھے کہ ان کے بچے وہاں کے ماحول میں تربیت پائیں۔ قادیان میں ان کے بچوں کو اپنے ناموں کی وجہ سے بہت کچھ تمسخر کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے نام فی الواقع پنجابی ماحول میں بہت عجیب لگتے تھے۔ ایک بھائی کا نام تھا یمین المیامن۔ دوسرے کا کریم المکارم علیٰ ہذا القیاس۔ اسکول میں طالب علموں نے ان کے لیے ایک نام گھڑ رکھا تھا، جو سراسر بے معنی تھا۔ بچے ان کو ستانے کی خاطر ''چین الجاپانم'' کے نام سے پکارتے تھے۔ تقسیمِ ملک کے بعد یہ خاندان راولپنڈی میں آ کر آباد ہوا۔ محامد اور اس کا چھوٹا بھائی میامن اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوے، جہاں پر میں پڑھتا تھا۔ مجھے محامد نے بتایا کہ قادیان کے ماحول اور راولپنڈی میں یہ فرق تھا کہ قادیان میں بچے ان کا نام بگاڑ کر ان کو چھیڑتے تھے جب کہ راولپنڈی میں کبھی کسی نے ان کا نام نہیں بگاڑا۔ اور پھر دوسری چیز، جو اسے بہت پسند آئی، یہ تھی کہ صبح کے وقت کلاس کے شروع ہونے سے قبل ہر طالب علم اپنے ہم جماعتوں سے باری باری مصافحہ کرتا تھا۔ اس طرح ان کے اندر ایک مؤدت پیدا ہوتی تھی، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ محامد اس زمانے میں افسانہ نگاری اور تھوڑی بہت شاعری بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا رجحان فوٹو گرافی کی طرف تھا۔ اس نے گورڈن کالج سے بی اے کیا تھا اور سرکاری ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ شام کو ایم اے انگریزی کی کلاس اٹنڈ کیا کرتا تھا۔ مجھے اب یاد نہیں کہ اس نے کتنی بار یہ امتحان دیا۔ جب کبھی میں راولپنڈی لوٹتا تھا وہ امتحان دینے کی تیاری کر رہا ہوتا تھا۔ وہ متواتر فیل ہوتا رہا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ آخرِ کار اس نے ایم اے اردو اور انگریزی پاس کر لیا اور ایک ایوننگ کالج میں پڑھانے لگا۔ یہ بھی بہت ہمت کا کام تھا۔ سالہا سال تک سارا دن دفتر میں کام کرنے کے بعد شام کو پڑھانے کا کام وہی کر سکتا ہے، جس کے اندر پڑھانے کا جنون موجود ہو۔ محامد نے اس کے علاوہ سول سروس کے امتحانات پاس کیے اور اپنے محکمے میں ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچا۔

ہماری شامیں اکثر محامد کے گھر پر گزرتی تھی جو ہمارے مکان کے قریب جھنگی محلے میں تھا۔ مجھے

یاد ہے کہ اس مکان کا سابق سکھ مالک تقسیمِ ملک کے بعد بہت دنوں تک اپنے گھر میں قلعہ بند ہو کر رہا تھا۔ اس کو اپنے مکان کی چھت پر پہرہ دیتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ گلی میں سے گزرنے والوں کے ساتھ، جو اسے بتاتے تھے کہ شہر کے دوسرے ہندو اور سکھ اپنے خاندانوں سمیت ہندوستان چلے گئے ہیں، بحث کیا کرتا تھا۔ مسلمان مہاجر پنڈی کی گلیوں میں غیر مسلم پراپرٹی کی ٹوہ لگاتے پھرتے تھے۔ اس کے مکان پر بھی لوگوں کی نظریں پڑتی تھیں، مگر اس کا کہنا تھا کہ جو کوئی اس کے مکان پر قبضہ کرنا چاہے گا اسے اس کی لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ پھر ایک رات وہ چپکے سے شہر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد سب کا خیال تھا کہ ہمارے محلے میں کوئی ہندو یا سکھ باقی نہیں رہا۔ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ایک کرتار سنگھ نامی سکھ نکل آیا جو اتنے عرصے تک چھپ کر ایک گرے ہوئے مکان کے کھولے میں رہ رہا تھا۔ اس نے مسجد کے امام سے جا کر کہا کہ اس کو مسلمان بنا لیں۔ مولوی صاحب نے اس کو کلمہ پڑھایا اور اعلان کر دیا کہ وہ ان کی امان میں ہے، اس لیے کوئی اس کے ساتھ تعرض نہ کرے۔ چونکہ اسکا کوئی ذریعۂ آمدن نہیں تھا اس لیے مولوی صاحب نے اس کو مسجد کا خادم مقرر کر دیا۔ وہ ہر روز شام پڑنے پر محلے کے گھروں کا چکر لگا کر مولوی صاحب کے لیے روٹیاں جمع کیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب کا بیٹا عبدالحمید میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ کند ذہن تو نہیں تھا مگر اس کا دل پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح جیب کترا بننا چاہتا تھا۔ میرے سامنے ایک بار وہ بس میں کسی کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اسکا دوسرا بھائی عبدالخالق میرے چھوٹے بھائی عبدالقیوم کی جماعت میں تھا۔ وہ اپنے باپ کا جانشین بننا چاہتا تھا۔ وہ اتنا موٹا تھا کہ ایک بار کسی نے اسکے پیٹ میں چاقو گھونپا تو اس میں سے خون نہ نکلا، کیونکہ چربی کی تہہ اتنی دبیز تھی کہ چاقو کا پھل اس میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ عین جوانی میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا تھا۔

جامعۃ المبشرین کی کہانیاں

اس دوران میں مجھے انجمن تحریکِ جدید کی طرف سے جامعۃ المبشرین جائن کرنے کا حکم نامہ ملا۔ یہ ادارہ مبلّغین کو تیار کرنے کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ کورس دو برسوں کا تھا مگر ایک تیسرا سال طب سیکھنے کے لیے مختص کر دیا گیا تھا، جس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ مبلّغوں کو ایک سال مزید ربوہ میں روکا جا سکے۔ داخلے کی شرط یہ تھی کہ امیدوار نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا ہو یا بی اے کی ڈگری رکھتا ہو۔ اتفاق ایسا تھا کہ ہماری کلاس میں میرے اور محمد ارشاد بشیر کے ساتھ ایک تیسرے شخص کو داخلہ ملا تھا جو گوجرانوالہ سے بی اے کر کے آیا تھا۔ اس کا نام میری طرح منیر الدین احمد تھا۔ ہم سے اوپر والی کلاس

میں سات یا آٹھ طالب علم تھے۔ گویا اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد استادوں جتنی تھی۔ البتہ غیر ملکی طالب علموں کی ایک کلاس بھی اس ادارے سے ملحق تھی، جس کو ایک ریٹائرڈ شدہ ہائی اسکول ٹیچر پڑھاتا تھا۔ اس کا کام ان کو اردو زبان سکھانا اور جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر سے واقف کرانا تھا۔ دوسرے استادان کو عربی پڑھاتے اور دینی مسایل کی تعلیم دیتے تھے۔

یہاں پر پھر ایک بار میرا واسطہ مولوی ابو العطاء جالندھری سے پڑا، جو کچھ برسوں سے جامعۃ المبشرین کے پرنسپل تھے۔ ان کے خلاف لوگوں نے بہت سی غلط باتیں پھیلا رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ وہ کینہ پرور ہیں۔ مگر میں نے انھیں ایک نہایت شریف النفس انسان کے روپ میں دیکھا۔ وہ فراخ دل تھے اور بہت عمدہ حسِ مزاح رکھتے تھے جب کہ عام طور سے یہ مشہور تھا کہ وہ سوکھے ''ملاّ'' ہیں۔ وہ اپنے وقت کا نہایت عمدگی سے استعمال کرتے تھے۔ وہ ہمیں علم الکلام پڑھاتے تھے جس پر ان کو عبور حاصل تھا۔ ابا جی پنشن پانے کے بعد کچھ برسوں تک ربوے میں مقیم رہے تھے۔ اسی محلے (دارالرحمت وسطی) میں مولوی ابو العطاء جالندھری بھی رہایش پذیر تھے۔ فجر کی نماز کے بعد دونوں اکٹھے سیر کے لیے جاتے تھے۔ ربوہ کے باسیوں میں سے مولوی صاحب واحد شخص تھے جنھوں نے ابا جی کی وفات پر مجھے تعزیت کا خط لکھا تھا۔ میں اس زمانے میں جماعتِ احمدیہ کو چھوڑ چکا تھا اس لیے لوگ مجھ سے رابطہ رکھنے سے گھبراتے تھے۔ جب میں نے ڈاکٹریٹ کی تو مولوی صاحب نے مجھے مبارک باد دینے کے لیے خاص طور پر خط لکھا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں نے تعلیم کو جاری رکھا تھا۔ جب میں اس کے بعد ایک بار ربوہ گیا اور ''الفرقان'' کے دفتر میں ان کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا، تو اسکنڈے نیویا کا مبلّغ کمال یوسف وہاں پر موجود تھا۔ میں نے دونوں کا اکٹھے فوٹو لیا۔ پھر مولوی صاحب نے کمال سے کہا کہ وہ ان کا ایک فوٹو میرے ساتھ بنائے کیونکہ ''یحییٰ فضلی بھی میرے شاگرد ہیں''۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ربوہ میں جان پہچان والے لوگ مجھے سامنے سے آتا ہوے دیکھ کر فٹ پاتھ بدل لیتے تھے کہ کہیں سلام نہ کرنا پڑ جائے۔

اس بات کا تعلق جماعتِ احمدیہ کی اس پالیسی سے ہے کہ جو کوئی سلسلے سے جدا ہو جائے یا اس کو نکال دیا جائے...... عام طور سے اس کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جاتا ہے...... تو اس شخص کے ساتھ کسی کو تعلق رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے آج بھی اس بات پر بے حد شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو راولپنڈی میں اردو بازار کے پوسٹ آفس کے پاس دیکھا اور بجائے اس کے سلام کا جواب دینے کے منہ موڑ کر الٹی سمت میں چل دیا تھا۔ اس کو کچھ عرصہ قبل ربوہ سے نکال دیا گیا تھا، جس کی وجوہات سے میں ناواقف ہوں۔ جب نظارت امورِ عامہ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا

ہے کہ فلاں شخص کو جماعت سے خارج کرنے کے علاوہ اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو فوراً اسی نظارت کا محتسب (عرفِ عام میں تھانیدار) متعلقہ شخص کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ربوہ سے نکل جانے کا نوٹس دیتا ہے۔ اگر وہ خود اپنی مرضی سے نقلِ مکانی نہیں کرتا تو جماعت کے کارکن (غنڈے؟) اس کے گھر کا سامان مکان سے باہر نکال کر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ سیّد داؤد احمد انور کو ہوا تھا، جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے خلیفہ ثالث مرزا ناصر احمد کے مرنے پر جانشینی کی دوڑ میں مرزا رفیع احمد کا ساتھ دیا تھا، جو مرزا ناصر احمد کی طرح مرزا بشیر الدین محمود احمد کا بیٹا ہے، مگر ''خاندانِ نبوت'' (اس نام سے مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کو جماعتِ احمدیہ میں یاد کیا جاتا ہے) نے مرزا طاہر احمد کو جانشین بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے سیّد داؤد احمد انور جیسے سرفروشوں کو جماعت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کو راتوں رات ربوہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا، جس پر سختی سے عمل درآمد ہوا تھا۔

مگر بعض صورتوں میں جماعت کو دوسری وجوہات کی بنا پر اپنے طریقِ عمل میں تبدیلی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کی مثال ذیل کا واقعہ ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خان کے بھائی چوہدری عبداللہ خان کے بیٹے محمد نصر اللہ کا رشتہ ''خاندانِ نبوت'' کی ایک لڑکی سے طے پایا تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ جماعت کے دو سرکردہ خاندان اس رشتے کے سبب زیادہ قریب آ جائیں گے۔ رخصتی والے روز، جب مرزا فیملی کے سب لوگ ربوہ میں جمع تھے اور براتی چوہدری ظفر اللہ خان سمیت آ گئے تھے، تب پتا چلا کہ دولہا غایب ہے۔ وہ لاہور میں ہی رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا تھا کہ وہ چلے جائیں، وہ ایک دوست کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ مگر ربوہ جانے کی بجائے وہ کسی دوسری طرف نکل گیا تھا۔ وہ اس رشتے کے خلاف تھا، مگر ماں باپ کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ محمد نصر اللہ نے ''خاندانِ نبوت'' کی لڑکی کو جس طرح ٹھکرایا تھا، اس کی بنا پر باپ نے اسے عاق کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ اس کے بعد اس کا اپنے خاندان کے ساتھ کوئی معاشرتی رابطہ نہیں رہا۔ مگر بحیثیت مجموعی چوہدری ظفر اللہ خان کا خاندان جماعتی انتقام سے صاف بچ گیا تھا۔ دولہا کا بھائی حمید نصر اللہ اس کے بعد برسوں تک جماعت احمدیہ لاہور کا امیر رہا۔ اگر ان کی جگہ پر یہ معاملہ کسی دوسرے خاندان کے ساتھ پیش آیا ہوتا، تو اس کو جماعتِ احمدیہ کے روایتی بائیکاٹ اور اخراج کا سامنا کرنا پڑتا۔

وائس پرنسپل ملک سیف الرحمٰن تھے جو اس زمانے میں جماعتِ احمدیہ کے مفتی تھے اور ہمیں فقہ پڑھاتے تھے۔ وہ نوجوانی میں دینی تعلیم کسی مدرسے میں حاصل کرنے کے بعد خود سلسلہ احمدیہ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کو تحقیق کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک زمانے میں ایک مجلس بنام ''ادارۂ تالیف و

ترجمہ‘‘ بنائی تھی، جس کے مندرجہ ذیل پانچ رکن تھے: ملک سیف الرحمٰن۔سیّد عبدالحئی (جو آگے چل کر جماعتِ احمدیہ کے ناظرِ اشاعت مقرر ہوے)۔کمال یوسف (اسکنڈے نیویا کے پہلے احمدی مشنری)۔ مرزا حنیف احمد (مرزا بشیر الدین محمود احمد کے صاحبزادے) اور منیر الدین احمد (یحییٰ فضلی)۔میں اس زمانے میں ابھی جامعہ احمدیہ کے درجہ رابعہ کا طالب علم تھا اور احمد نگر میں رہتا تھا۔اس ادارے کی طرف سے صرف ایک کتاب چھپ سکی، جو ملک صاحب کی لکھی ہوئی تھی اور نماز کے بارے میں تھی۔ مجھے اس کے لیے اشتہار چھپوانے کے لیے لائل پور بھیجا گیا تھا۔دسمبر کا مہینہ تھا جس کے اواخر میں جماعتِ احمدیہ کا جلسہ سالانہ منعقد ہوا کرتا تھا۔اس موقعے پر اکثر کتابیں شایع کی جاتی تھیں، کیونکہ جلسے میں شامل ہونے والے لوگ ربوہ سے کتابیں خرید کر لے جاتے تھے۔ملک صاحب تحقیقی مزاج کے آدمی تھے اور اس کی صلاحیت بھی رکھتے تھے مگر ان کی جبلّی سستی نے ان کو کسی قابلِ ذکر تصنیف کی توفیق نہ دی۔

مولوی غلام باری سیف (جن کو یار لوگوں نے ’’غلام کھڑکی تلوار‘‘ کا نام دے رکھا تھا) ہمیں اشتراکیت پر لیکچر دیتے تھے۔ان کا شمار بھی جماعتِ احمدیہ کے جیّد عالموں اور مقرروں میں ہوتا تھا۔وہ برسوں تک رسالہ ’’خالد‘‘ کے مدیر رہ چکے تھے، جس کے لیے میں تواتر سے لکھتا آیا تھا مگر ایک واقعے کے بعد میں نے ان کو مضامین دینے بند کر دیے تھے۔انھوں نے میرا ایک مضمون، جس پر مجھے بہت فخر تھا، کیونکہ اس میں تمثیل (الیگوری) کی تکنیک کو استعمال کیا گیا تھا، میرے نام کے بغیر چھاپا تھا۔جب میں نے احتجاج کرتے ہوے مطالبہ کیا کہ اگلے شمارے میں اس غلطی کا ازالہ کر دیا جائے تو موصوف اس کے لیے تیار نہ ہوے۔ان کے نزدیک ایسی چھوٹی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔کاپی رائٹ یا ریکارڈ کو درست کرنے کے بارے میں شاید انھوں نے کچھ نہیں سن رکھا تھا۔

مولوی ابوالمنیر نورالحق (جن کو ربوہ میں ان کے چھوٹے قد اور موٹی توند کے سبب ’’مولوی پاوا‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) تفسیر القرآن کے استاد تھے۔وہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ساتھ سالہا سال تک منسلک رہے، جو ’’تفسیرِ کبیر‘‘ کے عنوان کے تحت تیس جلدوں میں چھپنے والی قرآنِ کریم کی سب سے بڑی تفسیر لکھ رہے تھے، مگر اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔چونکہ مرزا محمود احمد کو عربی بس واجبی سی آتی تھی ،اس لیے ان کو مولوی ابوالمنیر جیسے عالم کی ضرورت تھی، جو ان کے لیے عربی اور فارسی میں لکھی جانے والی تفاسیر کے متعلقہ صفحات کا ترجمہ مہیا کرے۔چنانچہ مولوی صاحب موصوف تیس چالیس سال تک اس کام میں لگے رہے۔انھوں نے کہیں کہہ دیا تھا کہ ’’تفسیر کبیر‘‘ کی تصنیف میں ان کا بھی حصہ ہے۔اس لیے جب مرزا طاہر احمد اور سیّد محمود احمد دو سال تک انگلستان میں قیام کے بعد پاکستان لوٹے تو ربوہ کے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے والوں کے سامنے مرزا طاہر احمد نے کہا تھا کہ ’’تفسیر کبیر‘‘ کے اصل مصنف مولوی نور

الحق صاحب کہاں ہیں؟ یہ بات کہنے کا مقصد مولوی صاحب موصوف کو شرمندہ کرنا تھا۔ چونکہ ''تفسیر کبیر'' کے کام کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، اس لیے مولوی صاحب کم ہی جامعۃ المبشرین میں پڑھانے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

میرا ان کے ساتھ ایک بار شدید ٹکراؤ ہوا، جس کا اثر ان پر تو شاید نہ ہوا، مگر جس نے میرے اندر بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلے میں جب تقریروں کا مقابلہ ہوا، جس میں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ربوہ کی نمائندگی کرنی تھی، تو میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ربوہ کے قاید تھے۔ مقابلہ تین سیکشنوں میں ہوا۔ میں سب سے اوپر والے سیکشن میں تھا، جب کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا پوتا مرزا انس احمد، جو مرزا ناصر احمد صدر خدام الاحمدیہ کا بیٹا تھا، تیسرے سیکشن میں تھا۔ ہر سیکشن میں شامل ہونے والوں کا علیحدہ علیحدہ مقابلہ ہوتا تھا، مگر جب مولوی صاحب نے نتیجے کا اعلان کیا، تو مرزا انس احمد کو پہلے سیکشن میں اول قرار دے دیا۔ میری پوزیشن دوسری تھی۔ گویا اس سیکشن میں ربوہ کی نمائندگی کے لیے مرزا انس احمد کو نامزد کر دیا گیا۔ میں نے اس طریقِ کار پر اعتراض کیا اور کہا کہ جس شخص نے پہلے سیکشن میں حصہ نہیں لیا، اس کو کیسے اس سیکشن کے لیے نامزد کیا جا سکتا ہے؟ مولوی صاحب نے میرے احتجاج پر بالکل کان نہ دھرا۔ وہ ''خاندانِ نبوت'' کو خوش کرنا اور اپنے نمبر بڑھانا چاہتے تھے۔ اس پر میں اس معاملے کو نائب صدر خدام الاحمدیہ چوہدری شبیر احمد کے پاس لے گیا، جو نہیں چاہتے تھے کہ میں بات کو آگے بڑھاؤں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو فیصلہ ہو گیا اس کو قبول کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ہم کمیونسٹ روس میں نہیں بلکہ ایک جمہوری ریاست پاکستان میں ہیں، جہاں پر فیصلے قانون اور قاعدے کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کو قطعاً پسند نہ آئی اور انھوں نے مجھے ایسی باتیں کرنے سے روکنا چاہا۔ چونکہ ایک طرف میرا مؤقف درست تھا اور دوسری طرف وہ امام جماعتِ احمدیہ کے پوتے کو نامزدگی سے نہ ہٹا سکتے تھے، اس لیے مجھے بھی مرزا انس احمد کے ساتھ نامزد کر دیا گیا۔ چنانچہ ہم دونوں کو سالانہ اجتماع کے موقعے پر ربوہ کی طرف سے تقریری مقابلے میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ مولوی نور الحق سخت کینہ پرور انسان تھے، مجھ سے اسکے بعد وہ ہمیشہ کنی کاٹتے تھے، جیسے وہ مجھے جانتے ہی نہ ہوں۔ سلام کا جواب تک نہ دیتے تھے۔ ربوہ میں یہ چیز بہت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ وہاں پر عام طور سے لوگ سلام کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور اس بات پر فخر کرتے تھے۔

اس اجتماع کے موقعے پر جب میری تقریر شروع ہوئی، تو اس وقت میرے والد کی چچازاد بہن کا بیٹا، جو عمر میں مجھ سے بہت بڑا تھا، مگر جس نے مجھے دیکھا نہیں ہوا تھا، اجتماع کے چائے خانے میں بیٹھا

ہوا دوستوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ جب میری آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونکا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس مقرر کے لہجے میں اس کو اپنے ماموں کی آواز کی کھنک سنائی دیتی ہے، اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر اس جگہ پر پہنچا، جہاں پر تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ جب میں تقریر کر کے سٹیج سے اترا تو وہ مجھے آ کر ملا اور اس نے پوچھا: کیا تم ماموں عبدالرؤف خان کے بیٹے ہو؟ اس کا نام فیض عالم فیض چنگوی تھا اور اس کا شمار جماعتِ احمدیہ کے نامور شاعروں میں ہوتا تھا۔ اس کا بچپن میرے دادا جان کے قدموں میں گزرا تھا، جو اس کے نانا کے بھائی تھے۔ اس کے باپ کے گھر میں پڑھنے لکھنے کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی، جب کہ فیض عالم کے سامنے میرے دادا جان کی زندہ مثال موجود تھی، جو سارا دن پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور جن کی کتابیں سارے ملک میں پڑھی جاتی تھیں۔ فیض عالم ان کی طرح علم حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کا باپ اسے اسکول میں داخل کرانے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا بیٹا کھیتی باڑی کے کام میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ دادا جان فیض عالم کی قابلیت کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس کو تعلیم دلوانے کی ایک صورت ان کو یہ نظر آئی کہ بچے کو اس کی خالہ کے ہاں بھجوا دیا جائے، جو ضلع جالندھر کے گاؤں بنگہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی ہوئی تھی۔ فیض عالم نے اپنے خالو کی مہربانی سے تعلیم حاصل کی، بلکہ آگے چل کر خالو نے اس کی شادی اپنی بیٹی کے ساتھ کر دی۔ اس کی شعر و شاعری میں دلچسپی میں سیّد ضمیر جعفری کا ہاتھ تھا، جن کے ساتھ وہ شملے میں ایک ہی مکان میں مقیم رہا تھا۔ ان کی وساطت سے فیض عالم کا تعارف ادیبوں اور شاعروں سے ہوا، جن کی محفلوں میں وہ جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ پھر وہ خود بھی شعر کہنے لگا، جس پر ابتداء میں جعفری صاحب اصلاح دیا کرتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد اس کا کلام جماعتِ احمدیہ کے رسائل و اخبارات میں باقاعدگی کے ساتھ چھپنے لگا بلکہ جب کراچی کی احمدیہ جماعت نے ایک پندرہ روزہ اخبار ''المصلح'' نکالا تو فیض عالم کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس کا دیوان چھپا ہوا ہے جس کو ڈاکٹر پرویز پروازی نے مدوّن کیا تھا۔

مولوی خورشید احمد شاد استاد الحدیث تھے۔ ان کے اندر ایک طرف ملاؤں والی خشکی پائی جاتی تھی تو دوسری طرف وہ طالب علموں کے ساتھ دوستانہ ملاپ رکھتے تھے۔ مزاج میں تھوڑا تلون تھا جس کے سبب انسان نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اگلے لمحے کیا کر بیٹھیں گے۔ سنا تھا کہ ایک بار ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ مولوی ابوالعطاء جالندھری کے داماد تھے اور عام طور سے بہت ذہین و فطین انسان گنے جاتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، جس نے ان کے بارے میں میری خوش فہمی کا خاتمہ کر دیا۔ ہم نے ایک مجلس بنائی تھی، جس کے تحت علمی تقاریر کا سلسلہ قایم کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ میں اس کا سیکرٹری تھا اور شاد صاحب صدر تھے۔ پہلا لیکچر شاد صاحب کا رکھا گیا، جو علمِ حدیث کے بارے

میں تھا۔ ''الفضل'' میں اس کا اعلان چھپ چکا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ربوہ کے علم دوست بڑی تعداد میں لیکچر سننے کے لیے آئیں گے۔ مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے دوپہر کے وقت شاد صاحب میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ ان سے مقالہ نہیں لکھا گیا اس لیے مجھے لیکچر کی منسوخی کا اعلان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: آج کا اخبار چھپنے کے بعد تقسیم ہو رہا ہے اور لیکچر والے روز اخبار کی چھٹی ہے، اس لیے سامعین تک لیکچر کی منسوخی کی خبر نہیں پہنچائی جا سکتی۔ اب ان کو لیکچر دینا ہوگا۔ یوں بھی وہ اس موضوع کے پروفیسر ہیں، اس لیے ان کو اس بارے میں بولنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے مگر شاد صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخرِ کار میں نے تجویز پیش کی کہ اگر میں کل تک ایک مقالہ لکھ دوں تو کیا وہ اس کو پڑھ کر سنانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس پر ان کی جان میں جان آئی اور انھوں نے فرمایا کہ اگر آپ مقالہ لکھ دیں تو پھر میری مشکل حل ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے رات بھر جاگ کر بیس صفحے کا مقالہ لکھا اور اگلی صبح ان کے گھر پر پہنچا دیا۔ نمازِ عصر کے بعد ہماری مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں شاد صاحب نے میرا لکھا ہوا مقالہ حرف بحرف پڑھ کر سنایا۔ صدرِ محفل مولوی ابوالعطاء جالندھری تھے۔ انھوں نے مجلس کے اختتام پر مقالہ اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنے رسالے ''الفرقان'' کے اگلے شمارے میں شاد صاحب کے نام سے چھاپ دیا۔ میں نے ان کی علمیت کا بھانڈا پھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور شاد صاحب کے اندر اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنے خسر کو بتاتے کہ مقالہ ان کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

جامعۃ المبشرین کے بیشتر اساتذہ کو تقسیمِ ملک سے پہلے جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ہندوستان کے اہم مذہبی مدرسوں میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اپنے اپنے مضامین میں خصوصی تعلیم حاصل کریں۔ وہ سب مولوی فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے بلکہ ان میں سے شاد صاحب کی طرح چند ایک یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کر چکے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعے جماعت کے اندر دینی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ چنانچہ ان کو پوسٹ گریجویٹ درجے کے ادارے میں پڑھانے کے لیے متعین کیا جانا تھا مگر یہ لوگ توقعات کو پورا نہ کر سکے۔ بالخصوص شاد صاحب کو، جو ایک تاجر فیملی سے تعلق رکھتے تھے، ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ ان کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ دراصل جماعتِ احمدیہ کے واقفینِ زندگی کو بہت معمولی الاؤنس دیا جاتا تھا، جو جرمن محاورے کے مطابق مرنے کے لیے بہت زیادہ مگر ایک پورے ٹبّر کے گزارے کے لیے کہیں کم تھا۔ شاد صاحب نے دو تین بار وقف زندگی سے جان خلاصی کی کوشش کی، مگر ہر بار ان کو واپس آنا پڑا۔ ایک بار انھوں نے ربوہ کے گول بازار میں ایک دکان کھول لی۔ اتفاق سے دو چار روز کے بعد مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کار وہاں سے گزری اور انھوں نے پوچھ لیا کہ یہ نئی دکان

کس کی ہے۔ بتایا گیا مولوی خورشید احمد شاد کی۔ اس پر حضرت صاحب نے شاد صاحب کو پیغام بھیجا کہ آپ کو اس لیے خصوصی تعلیم نہیں دلوائی گئی تھی کہ آپ بزازوں کی طرح دکان کھول کر بیٹھ جائیں۔ چنانچہ ان کو اگلے روز سے دکان بند کر کے جامعہ میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا پڑا۔ جب مرزا بشیر الدین محمود احمد پر فالج کا حملہ ہوا اور سلسلے کے کاروبار میں دخل اندازی کے قابل نہ رہے تو شاد صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک مطب کھول لیا۔ انھوں نے اپنے طور پر طب کا مطالعہ کر رکھا تھا، اس مطب کو وہ بہت کامیابی کے ساتھ اپنی وفات تک چلاتے رہے۔ سنا ہے کہ اب ان کا بیٹا باپ کے نسخوں کے مطابق بنائی ہوئی معجونیں اور دوسری دوائیاں بیچتا ہے۔ شاد صاحب کے ساتھ یہ المیہ تھا کہ ان کی پہلی بیوی امۃ اللہ خورشید سے اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس کی وفات کے بعد شاد صاحب نے دوسری شادی کی اور اولاد سے نوازے گئے۔

ان کے ساتھیوں میں مولوی محمد احمد ثاقب، مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد احمد جلیل تھے۔ آخر الذکر آگے چل کر مفتیِ سلسلہ بنے۔ وہ ایک عالمِ دین کے بیٹے اور خود بھی بلند پایہ عالم ہیں۔ میرا ماموں زاد ڈاکٹر پرویز پروازی ان کا داماد ہے۔ اس زمانے میں ان کے سپرد جماعت نے عارضی طور پر آرٹ پرنٹنگ پریس کا کام لگا رکھا تھا، جس کے لیے وہ کسی نوجوان کو ڈھونڈتے پھرتے تھے تاکہ اپنی جان اس بیگار سے بچا سکیں۔ ایک روز مجھے راستے میں مل گئے۔ کہنے لگے اگر تم پریس میں آ جاؤ تو خوب ہوگا۔ میں تم کو پریس کا منیجر بنا دوں گا۔ میں نے اس بات کا ذکر مولوی ابوالعطاء جالندھری سے کیا تو وہ بہت جز بز ہوئے۔ انھیں پسند نہ آیا کہ جلیل صاحب مجھے علمی کاموں سے دور لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پروفیسروں میں حیران کن تقرری پیر معین الدین کی تھی جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے داماد اور تعلیمی اعتبار سے ایم ایس سی (کیمسٹری) اور جماعت کے قایم کردہ ادارے ''فضل عمر ریسرچ لبارٹری'' کے ریسرچ فیلو تھے۔ چونکہ یہ ادارہ ناکام ہونے کے بعد بند ہو چکا تھا، اس لیے ان کو مصروف رکھنے کے لیے جامعۃ المبشرین میں انگریزی پڑھانے پر لگا دیا گیا۔ آدمی البتہ محنتی تھے اور اپنے لیے ایک نیا میدانِ عمل تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ''تفسیرِ کبیر'' کا، جس میں بے شمار رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے اور جو اپنی طویل کلامی کے سبب پڑھنے والوں پر ایک بار بن جاتی ہے، خلاصہ نکال کر کتابی صورت میں چھاپنا شروع کر دیا۔ اتفاق ایسا تھا کہ ان کے بڑے بھائی پیر صلاح الدین بھی، جو سول سروس کے آدمی تھے، ساری عمر فارغ اوقات میں قرآن کا اردو اور انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور اردو ترجمہ چار جلدوں میں۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کو جنرل ضیاء الحق کے زمانۂ اقتدار میں راولپنڈی میں سرِعام کوڑے مارے گئے

تھے۔ان کا راولپنڈی کے چاندنی چوک میں ایک ہوٹل تھا، جس کا انتظام ان کے بیٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہاں پر رنڈیوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا اور شہر بھر کے لفنگے وہاں پر جمع ہو کر رنگ رلیاں مناتے تھے۔ہوٹل کے مالک چونکہ پیر صلاح الدین تھے اس لیے بیٹوں کے جرم کی سزا باپ کو بڑھاپے کی عمر میں بھگتنی پڑی۔اس چیز کو وہ تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر گئے مگر ان کا ایک چھوٹا بھائی اس صدمے کے سبب ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر مر گیا۔اس بھائی کی شادی سابق امیر جماعتِ احمدیہ راولپنڈی امیر عالم صاحب کی اس بیٹی سے ہوئی تھی، جس سے میں نے مولوی فاضل کے کورس کی کتابیں عاریۃً مانگی تھیں۔بعد میں سننے میں آیا کہ محترمہ نے مولوی فاضل کا امتحان دو تین بار فیل ہونے کے بعد پاس کر لیا تھا۔پیر صلاح الدین کی بیوی مرزا بشیر الدین محمود احمد کی بیوی مریم صدیقہ کی بہن تھی۔

جامعۃ المبشرین کی عمارت ایک دو سال پہلے تعمیر ہوئی تھی مگر ہوسٹل بدستور انجمن تحریکِ جدید کے سابقہ دفتر کی کچی عمارت میں تھا۔ مجھے چونکہ فوری طور پر وہاں پر کمرہ نہ مل سکا تھا، اس لیے میں فاروقی صاحب کے کوارٹر میں مقیم رہا، جو لمبی چھٹی پر جا چکے تھے۔ان کی غیر حاضری میں ان کا مکان میرے ربوہ کے ادیب دوستوں کا اڈہ بن گیا۔البتہ سیّد احمد سعید ہمدانی اس دوران میں ربوہ سے جا چکے تھے۔دراصل ان کو صدر انجمنِ احمدیہ کی ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ان کے افسروں کو یہ چیز نہ بھاتی تھی کہ ہمدانی صاحب ربوہ کی خلافت لائبریری کی قریب قریب ساری کتابیں پڑھ گئے تھے۔بالخصوص ان کی دلچسپی اس لٹریچر میں قابلِ اعتراض جانی گئی، جو جماعتِ احمدیہ کے خلاف لکھا گیا تھا۔عبدالرحمٰن شاکر اس زمانے میں لائبریرین تھے۔وہ خود بھی شاعر تھے اور ہمارے ادیب ٹولے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔وہ ہمیں ہر کتاب جاری کر دیتے تھے، حتیٰ کہ وہ کتابیں بھی جن پر ربوہ کی انتظامیہ نے سنسر شپ عاید کر رکھی تھی۔دوسری طرف ہمدانی صاحب آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے تھے۔ وہ ایک لڑکے لیاقت علی کو ٹیوشن پڑھاتے تھے، جس کے ہمسائے میں ایک نوجوان رہتا تھا، جو بہت دل پھینک قسم کا تھا اور کسی لڑکی سے عشق کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ہمدانی صاحب کو شرارت سوجھی اور انھوں نے ایک گمنام لڑکی کی طرف سے اس کو محبت بھرے خط لکھنے شروع کر دیے۔وہ نوجوان جھانسے میں آ گیا اور باقاعدہ طور پر عاشق ہو گیا، جس کا انجام پٹائی کی صورت میں نکلا۔شاید یہ بات بھی نظارت امورِ عامہ کے محتسب عبدالعزیز بھامڑی تک پہنچ گئی، جس کی تفتیش کے نتیجے میں ہمدانی صاحب کو ربوہ سے چلے جانے کا نوٹس مل گیا۔اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جس کسی کو ایسا حکم مل جائے اس کے لیے ربوہ میں کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہتی۔ہمدانی صاحب کو بلوچستان کے کسی دور دراز علاقے میں اسکول ٹیچری کی ملازمت ملی جس کے سبب وہ جسمانی طور پر ہم سے دور ہو گئے، مگر ہمارے دلوں میں ان کے لیے دوستی

کے جذبات قایم و دایم رہے۔ وہ اس زمانے میں منشی فاضل کر چکے تھے۔مدرس بننے کے بعد ان کو یونیورسٹی کے دوسرے امتحانات دینے کی سہولت مل گئی۔اس لیے وہ پہلے سال ایف اے کا امتحان دینے کے لیے پنجاب آئے۔ دوسرے سال بی اے کی باری تھی مگر امتحان کے دنوں میں ایک صبح ان کی آنکھ وقت پر نہ کھلی اوران سے ایک پرچہ چوک گیا۔اس طرح انھیں پھر آنا پڑا۔ وہ ہمیں ملنے کے لیے ہر بار ربوہ ضرور آتے تھے۔اس طرح ہمارا آپس کا رابطہ قایم رہا۔آگے چل کر انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں میں ایم اے کیا اور پنجاب میں لیکچرار اور پھر اپنے وطنِ مالوف نوشہرہ کے کالج میں پرنسپل بنے۔ ہماری مراسلت کا مجموعہ ''حدیثِ یاراں'' چھپا ہوا ہے۔

آخرِ کار مجھے ہوسٹل میں کمرہ مل گیا، جہاں کا ماحول بہت لبرل تھا اور ہمیں بہت سی آزادیاں حاصل تھیں۔مثلاً یہ پابندی نہ تھی کہ رات کو فلاں وقت تک سب طالب علموں کو ہوسٹل میں پہنچنا ہوگا۔ ہوسٹل کا دروازہ دن رات کھلا رہتا تھا۔اگر کسی کا جی چاہے تو وہ رات ہوسٹل سے باہر گزار سکتا تھا۔اس سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی تھی مگر دوسری طرف اس عمارت میں بجلی نہ تھی، جس کے سبب گرمیوں میں برقی پنکھا تک نہ لگایا جاسکتا تھا اور رات کو پڑھنے کے لیے مٹی کے تیل کا لیمپ جلانا پڑتا تھا۔حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ہمارے ساتھ اس ہوسٹل میں غیر ملکی طالب علموں کو بھی رکھا گیا تھا جن میں یورپ اور افریقہ کے طالب علم شامل تھے۔ یہاں پر بات بجلی کی ہو رہی ہے، جس کی عدم موجودگی سب طالب علموں کے لیے ایک مسئلہ تھی۔انھی دنوں میں میری دوستی ربوہ میں محکمہ بجلی کے ایکس ای این سے ہوگئی ، جو ہماری طرح ادب دوست انسان تھے۔انھوں نے ''قندیل'' کے کالم ''ناقابلِ فراموش'' میں ایک واقعہ بیان کیا تھا، جو ان کو جرمنی کے شہر ہنوور میں پیش آیا تھا، جہاں پر وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ایک روز اچانک ان کو سڑک پر وہ لڑکی مل گئی، جس پر وہ بچپن سے عاشق تھے مگر جس کے ساتھ انھیں کبھی بات کرنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ان کا نام ''قندیل'' میں چھپا ہوا دیکھنے کے بعد ہماری ملاقات ایک مشترکہ دوست عبدالشکور کی معرفت ہوئی۔ چند روز کے بعد وہ میرے ہوسٹل میں ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے پوچھا: تمھارے ہوسٹل میں بجلی کیوں نہیں ہے؟ میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ کچی عمارتوں کو بجلی کا کنکشن نہیں دیا جاتا تھا۔انھوں نے اس بات کی تردید کی اور کہا کہ وہ فوراً کنکشن کی اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔چنانچہ وہ دوسرے روز بجلی کے کنکشن کے لیے دی جانے والی درخواست کے فارم پر منظوری کے دستخط کر کے لے آئے۔انھوں نے کہا اس فارم پر اپنے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ضروری کوائف لکھوا کر لے آؤ۔بجلی کے کنکشن کی منظوری میں پیشگی دے رہا ہوں۔ میں دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل مولوی مقبول احمد کے پاس پہنچا اور خوشخبری سنائی کہ ہمیں بجلی کا کنکشن مل سکتا

ہے۔موصوف نے جواب دیا کہ وہ بجلی کا کنکشن لے کر ہمیں مستقل طور پر اس کچی عمارت میں رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد ہوسٹل کے لیے ایک پختہ عمارت تعمیر کرائی جائے۔اس طرح میں تین برسوں تک اس کچی عمارت میں مقیم رہا اور ہر رات مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو برباد کرتا رہا۔

میرے ادیب دوستوں میں سے سمیع اللہ قریشی بی اے (آنرز) کرنے کے بعد ربوہ کے تعلیم الاسلام ہائی اسکول میں ٹیچر لگ گیا تھا۔اسی زمانے میں اس کو بی ٹی کرنیکے لیے لاہور جانا پڑا۔ پرویز پروازی تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بی اے کے آخری سال میں تھا۔اسکو سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کرنے کے بعد ایک سال تک کالج میں داخلہ نہ مل سکا تھا،اس لیے اسے ربوہ کے فضل عمر ہسپتال میں کلرکی کرنی پڑی تھی۔البتہ اسے وہاں سے جلد ہی جواب مل گیا،جسکے سبب ماموں احمد خان نسیم کو اسکی پڑھائی کے لیے اپنے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو مرزا ناصر احمد سے بات کرنی پڑی تھی، جو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرنسپل تھے۔ پروازی کو ہسپتال سے جواب اس لیے ملا تھا کہ ایک روز اسکو اپنے افسر اعلیٰ ڈاکٹر مرزا منور احمد کے دستخطوں کی نقل کرتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تھا۔اسکا کہنا تھا کہ اسکا ارادہ کسی قسم کی دھاندلی کرنے کا نہ تھا،بس یونہی بیکار بیٹھے ہوئے وہ قلم چلا رہا تھا جیسے دوسرے لوگ ایسے میں کوئی تصویر بناتے ہیں یا یونہی کاغذ پر ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچتے ہیں۔البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ اس زمانے میں ایک شخص کے زیر اثر تھا، جو صدر انجمن احمدیہ کا کارکن تھا اور حسابات میں گڑ بڑ کرنے کے سبب ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔اس نے بھی اپنے افسر اعلیٰ کے جعلی دستخطوں سے رقم غصب کی تھی.

مرزا ناصر احمد نے اپنے دوست کی درخواست کا پاس کیا اور پروازی کو اس شرط پر کالج میں داخلہ دے دیا کہ وہ محنت سے پڑھے گا اور اچھا ریزلٹ دکھائے گا۔ پروازی کی لیاقت کالج میں داخل ہونے کے بعد کھل کر سامنے آئی اور وہ ہر امتحان میں پہلے سے بڑھ کر نمبر لیتا رہا۔ پروازی کالج کے مجلّے ''المنار'' کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر رہا، جس کے سبب میرے افسانے اور سمیع اللہ قریشی کی غزلیں وہاں پر چھپتی تھیں۔ اسی کی وجہ سے ہم تعلیم الاسلام کالج کی مجلسِ اردو کے زیرِ انتظام منعقد ہونے والی سب محفلوں میں شامل ہوتے تھے۔

وہیں پر میرا تعارف ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ہوا، جو پروازی کی دعوت پر تعلیم الاسلام کالج کی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔انھوں نے متعدد بار وہاں پر مقالات پڑھے۔ایک بار میں پروازی کے ساتھ ان کی دعوت پر ان کے گاؤں وزیر کوٹ بھی گیا تھا، جو ربوہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔انھوں نے مجھے اپنا تازہ افسانہ اپنے ساتھ لانے کو کہا تھا، جو راولپنڈی کے ایک رسالے میں چھپا تھا اس لیے ان کی

نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ان کا گاؤں لالیاں سے کچھ پہلے آتا ہے۔ البتہ جرنیلی سڑک سے ہٹ کر ہے۔ ہم نے تانگہ نہر پر چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے آگے پیدل چل کران کے گاؤں تک گئے تھے۔ ہمیں دوپہر کے کھانے تک پہنچ جانے کو کہا گیا تھا مگر ہمارے وہاں پر پہنچتے پہنچتے اچانک آندھی آگئی اور گرد و غبار کے سبب ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ بمشکل اپنی بیٹھک تک ہمیں لے جا سکے۔ کھانا تیار تھا مگر ہر طرف اڑتی ہوئی ریت کے سبب لگایا یا کھایا نہ جا سکتا تھا۔ یہ کیفیت تین چار گھنٹوں تک رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا افسانہ آندھی کے تھمنے پر لیمپ کی روشنی میں پڑھا اور پوچھا: کیا وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ نفسیاتی مسایل پر لکھتے ہیں؟ پچھلے پہر کہیں جا کر گرد و غبار کی شدت کم ہوئی اور ہم کھانا کھا سکے جس میں نمک سے زیادہ ریت کا ذائقہ اور پتھریوں کی رڑک تھی۔ ہم اس روز کھل کے باتیں بھی نہ کر سکے تھے کیونکہ جو کوئی منہ کھولتا تھا اس کا منہ ریت سے بھر جاتا تھا۔

اس افسانے میں انسانوں اور کتوں کی جبلت کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اسی موضوع پر ایک افسانہ تھوڑا پہلے ربوہ کی ایک ادبی محفل میں ایک نوجوان افسانہ نگار نے پیش کیا تھا جس کا نام آغا سلیم تھا اور جو سندھ کا رہنے والا تھا۔ وہ چند ماہ سے تعلیم الاسلام کالج میں پڑھ رہا تھا مگر میری ملاقات اس کے ساتھ اس محفل میں پہلی بار ہوئی تھی۔ میں نے اس کے افسانے پر کڑی تنقید کی تھی اور اسے کہا تھا کہ میں اگلی محفل میں اسی موضوع پر ایک افسانہ پیش کروں گا، جس کا ٹریٹمنٹ تمھارے افسانے سے مختلف ہوگا مگر اگلی محفل گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد منعقد ہونی تھی۔ وہ اس دوران میں سندھ کو سدھارا اور میں راولپنڈی چلا گیا۔ چھٹیوں کے بعد وہ واپس نہیں لوٹا اور اس نے وہیں کہیں سندھ کے کسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ لمبے عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گیا تھا اور اس نے اردو اور سندھی دونوں زبانوں کے ادب میں نام پیدا کیا تھا۔

میرا متذکرہ افسانہ راولپنڈی کے رسالے ''خورشید'' میں چھپا تھا جس کا ایڈیٹر شفیع اشرف تھا۔ دراصل یہ رسالہ جماعتِ احمدیہ کی ملکیت تھا اور اس کو شایع کرنے کا مقصد ادبی حلقوں کو اپنے زیرِ اثر لانا تھا۔ مگر اس چیز کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ راولپنڈی کے لکھنے والوں میں یہ رسالہ بہت مقبول تھا۔ چنانچہ محمد منشا یاد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ابتدائی افسانے اسی رسالے میں چھپے تھے۔ میری ملاقات ''خورشید'' کے دفتر میں راولپنڈی کے ادیب و شاعر محمد زمان سے ہوئی تھی، جو باقاعدگی کے ساتھ وہاں پر آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ کیونکہ ''خورشید'' کا دفتر نارتھ سرکلر روڈ پر بنی چوک کے قریب تھا، جہاں سے گوہاٹی بازار کی سڑک نکلتی ہے، جس پر محمد زمان رہتے تھے۔ مجھے انھوں نے اپنی بے بسی کی داستان بے حد متاثر کن ڈرامائی انداز میں سنائی تھی۔ جب ان کی بیوی زچگی کے سلسلے میں ہولی فیملی ہسپتال میں داخل ہوئی اور ان کی بیٹی

مردہ پیدا ہوئی یا پیدائش کے معاً بعد مرگئی اور ہسپتال کی انتظامیہ نے بیٹی کی لاش ان کے حوالے کردی کہ اس کو دفنانے کے لیے لے جائیں۔ محمد زمان بیٹی کی لاش کو رومال میں باندھے ہوے اس طرح شام کے دھندلکے میں اپنے گھر کی جانب پیدل جارہے تھے جیسے کوئی شخص ڈیڑھ سیر گوشت خرید کر لے جارہا ہو۔

''خورشید'' کے سلسلے میں یاد آیا کہ جب ربوہ میں اس رسالے کے راولپنڈی سے نکالے جانے کی چہ میگوئیاں ہورہی تھیں، تو میں نے جامعہ کے ایک دوست محمود احمد مختار میرپوری کو، جس کے باپ امیر عالم کے نام پر رسالے کے لیے ڈیکلریشن حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی مگر کامیابی ہوتی نظر نہ آتی تھی، بتایا کہ جمیل پیرزادہ مجھے ''رازدان'' کا ڈیکلریشن بلا معاوضہ دینے کی آفر کر چکا ہے۔ محمود نے اسی روز مرزا بشیرالدین محمود احمد سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر اسے اجازت مرحمت ہو تو وہ راولپنڈی جا کر جمیل پیرزادہ سے ''رازدان'' کا ڈیکلریشن مفت میں حاصل کرسکتا ہے۔ اس کو تو نہ بھیجا گیا مگر شفیع اشرف کو ارشاد ہوا کہ جا کر ''رازدان'' کا ڈیکلریشن لینے کی کوشش کرو۔ جمیل پیرزادہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، وہ باتوں باتوں میں شفیع اشرف کا حدود اربعہ جان گیا۔ اس نے اتنی خطیر رقم معاوضے میں مانگی، جس کی ادائیگی کے لیے جماعتِ احمدیہ تیار نہ تھی۔ مجھے اس بات کا پتا اس طرح چلا کہ ملاقات ہونے پر جمیل پیرزادہ نے کہا: تم خود آتے تو میں ایک دھیلا نہ مانگتا۔

جمیل پیرزادہ کے طالب علمی کے زمانے کے عزیز دوستوں میں جماعتِ احمدیہ کا مبلّغِ امریکہ ڈاکٹر خلیل احمد ناصر شامل تھا جس کے نام پر اس نے اپنے بیٹے کا نام ناصر رکھا تھا۔ دونوں سیالکوٹ کے رہنے والے اور کلاس فیلو تھے۔ بالخصوص عربی کے مضمون میں وہ ایک دوسرے کے حریف ہوا کرتے تھے۔ بی اے میں خلیل احمد ناصر نے اس مضمون میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور جمیل پیرزادہ نے دوسری۔ بعد میں خلیل احمد ناصر نے تبلیغِ احمدیت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ وہ اس زمانے میں واشنگٹن میں جماعت کے مبلّغ تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے جمیل پیرزادہ کو احمدی بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس بارے میں جمیل کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک پیر کے بیٹے کو باپ دادا کے مسلک سے گمراہ نہیں کرسکتا۔

غیر ملکی طالب علم

ہمارے ہوسٹل میں مقیم غیر ملکی طالب علموں کی تعداد پاکستانیوں کے لگ بھگ تھی۔ شروع سے جماعتِ احمدیہ کے تعلیمی اداروں میں غیر ملکوں سے طالب علموں کو لا کر احمدیت کی تبلیغ کے لیے تیار کیا جاتا

تھا۔ قادیان کے زمانے میں مجھے بہت سے انڈونیشین طالب علموں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ربوہ میں بھی اس ملک کے طالب علم موجود تھے مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ یہاں پر یورپین اور افریقن طالب علموں کی بھر مار تھی۔ میں خاص طور پر دو جرمن نوجوانوں کا ذکر کروں گا، جن کے ساتھ مجھے آگے چل کر جرمنی میں بھی واسطہ پڑا۔ پہلے نمبر پر عبدالشکور کنزے تھا، جس کی شادی کوئٹہ کی ایک احمدی فیملی کی لڑکی قدسیہ سے ہوئی تھی۔ ربوہ کے زمانے میں میرا اس سے ملنا جلنا نہیں تھا، اس لیے میں اس کے بارے میں کوئی رائے قایم نہ کر پایا تھا۔ اس کو دینی تعلیم کے خاتمے پر شکاگو کا مبلّغ بنا کر بھیجا گیا تھا، جہاں پر وہ لمبے عرصے تک مقیم رہا۔ اس کی جرمنی میں تعیناتی کا ذکر آگے چل کر آئے گا جہاں پر میں اس کو قریب سے دیکھ پایا اور مجھ پر اس کی شخصیت کے سارے پول کھل گئے۔

دوسرے نمبر پر دتلف خالد تھا، جو بارہ تیرہ سال کی عمر میں برلن کی لاہوری احمدی جماعت کی مسجد میں جانے لگ گیا تھا۔ جب وہ سترہ برس کا ہوا تو تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں ملازم ہو گیا، جس کا ایک ذیلی آفس کویت میں تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے وہاں پر بھیج دیا جائے کیونکہ اس کو امید تھی کہ وہاں پر عربی سیکھنے کے علاوہ اسلام کی تعلیم بھی حاصل کر سکے گا مگر وہاں پر ایسا کوئی انتظام نہ تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات کویت میں مقیم ایک پاکستانی احمدی سے ہو گئی، جس نے اسے ربوہ بھجوا دیا۔ جس روز خالد ربوہ پہنچا اور اس کو ہمارے ہوسٹل میں رہایش کی خاطر لایا گیا، اس وقت میں وہاں پر موجود تھا اور اس کو خوش آمدید کہنے والوں میں شامل تھا۔ خالد چھوٹے قد کا سرخ وسفید رنگ کا چلتا پھرتا سا گڈا تھا۔ اس نے سر پر سرخ طربوش پہن رکھی تھی اور ایک نامانوس لہجے میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر وہ اردو بھی اسی لہجے میں بولنے لگا۔ یوں تو وہ بے حد زندہ دل تھا اور جب ہنسنے پہ آتا تھا تو اس کو روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بس اس میں یہ خامی تھی کہ وہ کسی قسم کے کھیل میں حصہ نہ لیتا تھا۔ ہوسٹل کے صحن میں، جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے، عصر اور مغرب کی نمازوں کے مابین ڈیک ٹینس (جس کا دوسرا نام رنگ ٹینس ہے) کھیلی جاتی تھی۔ جو کوئی اس میں شامل نہ ہوتا تھا اسکو ہم نکّموں میں شمار کرتے تھے۔ خالد دو برس تک ربوہ میں مقیم رہا اور جب وہ جرمنی لوٹنے کے لیے چناب ایکسپریس پر چڑھا، تو میں مشایعت کی خاطر اس کے ساتھ لائل پور تک گیا تھا۔ خالد کا ذکر اس کتاب میں بار بار آئے گا کیونکہ ہماری دوستی اور رفاقت آج تک چل رہی ہے، جس کی تفصیل بے حد دلچسپ ہے کیونکہ وہ ایک لحاظ سے طربیہ ہے اور دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو المیہ داستان ہے۔

ادریس چینی، جو مجھے احمد نگر کے زمانے میں ماوزے تنگ کی نظمیں ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا، وہ بھی اسی ہوسٹل میں مقیم تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر یہ تبدیلی آئی تھی کہ اب وہ عربی اور اردو سیکھنے کی

بجائے سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ''پاکستان ٹائمز'' کو پہلی سطر سے شروع کر کے آخری سطر تک بلند آواز میں پڑھتا تھا، جیسے وہ انگریزی زبان میں خبریں نشر کر رہا ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ چین واپس جا کر ریڈیو میں کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ کمیونزم کے خلاف زہر اگلا کرتا تھا مگر اب وہ کمیونسٹ نظام کے گن گاتا پھرتا تھا۔ جب ہنگری نے انٹرنیشنل فٹ بال چمپین شپ جیتی ،تو ادریس خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا۔ وہ ہر کسی کو کہتا پھرتا تھا: تم دیکھو گے کہ کمیونسٹ ممالک مغربی یورپ اور امریکہ کو ہر میدان میں ہرا دیں گے۔ پہلے بھی ماوزے تنگ بطور شاعر اس کا ہیرو ہوا کرتا تھا، اب وہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی تعریف کے پل باندھنے لگا تھا۔ کسی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کو لکھ دیا کہ ادریس چینی جامعۃ المبشرین میں کمیونزم کا پرچار کرتا پھرتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ کمیونسٹ چین کا ایجنٹ ہو۔ مولوی ابو العطاء کو حکم جاری ہوا کہ ایک انکوائری کمشن بٹھایا جائے، جو اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ مجھے بھی کمشن کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ میں نے کہا کہ ادریس اگر چین کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے تو اس چیز کے سبب اس پر کوئی الزام نہیں لگنا چاہیے۔ اسے اپنے وطن سے پیار ہے اور وہاں پر لوٹ جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ کمشن اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ کر سکا مگر اس کی بریت اوّل درجہ کی نہ تھی۔ ادریس نے اس دوران میں پوری سنجیدگی کے ساتھ چین واپس لوٹنے کی تیاری شروع کر دی مگر اس سے بھی پہلے ابراہیم ما چین واپس گیا۔ اس نے وہاں سے ادریس کو لکھا کہ حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں اس لیے تم بھی واپس آسکتے ہو۔ بہت برسوں کے بعد ڈاکٹر زین العابدین نے، جو جدہ سے مسلم اقلیتوں کے بارے میں ایک مجلّہ نکالتے تھے، مجھے ابراہیم کے بارے میں بتایا کہ وہ پیکنگ میں اسلامی سنٹر کا نائب صدر رہے۔ اس کے متعدد مضامین چین کے مسلمانوں کے بارے میں ان کے مجلّے میں چھپے تھے۔ ادریس کے بارے میں یہ سننے میں آیا کہ اس کو کسی وجہ سے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔

انھی دنوں میں سیرالیون کے ایک پیرامونٹ چیف کا بیٹا کونتے پڑھنے کے لیے ربوہ آیا اور ہمارے ہوسٹل میں آکر مقیم ہوا۔ وہ بہت مغرور اور تند مزاج جوان تھا، جس کا دماغ دن رات آسمان پر چڑھا رہتا تھا۔ اگر کوئی قسمت کی ماری مکھی اس کے کمرے میں گھس جاتی تھی، تو کونتے غصے کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور جو چیز بھی اس کے ہاتھ میں آجاتی تھی اٹھا کر مکھی پر دے مارتا تھا۔ جب ایک بار اس کا سلسلہ چل نکلتا تھا تو وہ باری باری کمرے کا سارا فرنیچر توڑ پھوڑ دیتا تھا۔ یہ تماشا ہفتے میں ایک دو بار ضرور ہوتا تھا اور جب تک کونتے کا غصہ اتر نہ جاتا تھا، کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک روز مرزا حنیف احمد میرے پاس آیا بیٹھا تھا جب پھر ایک بار کونتے کا فیوز اڑ گیا۔

اس نے پہلے کتابیں اٹھا اٹھا کر پھینکیں پھر کرسیوں اور میزوں کی باری آ گئی۔ مرزا حنیف احمد نے پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا: کونتے کے کمرے میں مکھی گھس آئی ہے، جس کے خلاف اب جنگ لڑی جا رہی ہے۔ مرزا حنیف احمد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا کونتے کے کمرے کی چک اٹھا کر اندر جا گھسا اور کونتے کو ڈانٹنے لگا، مگر پیرامونٹ چیف کا بیٹا بھلا کسی کی سنتا ہے۔ اس پر مرزا حنیف احمد نے، جو خود بھی ایک چیف کا بیٹا تھا، اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس مار کٹائی کا سلسلہ دس بارہ منٹوں تک جاری رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ کونتے دو روز تک شرم کے مارے کمرے سے باہر نہ نکلا۔ دوسرے افریقن لڑکے اس کا کھانا لے کر جاتے تھے۔ ان نے کسی ذریعے اس نے باپ کو تار دلوایا کہ اس کی واپسی کا انتظام کیا جائے۔ وہ پاکستان میں مزید ایک دن کے لیے بھی رہنے کو تیار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ جلد ہی اپنے وطن لوٹ گیا تھا۔

کونتے کے مقابلے میں دوسرے افریقن طالب علم زیادہ مہذب اور خوش خلق تھے۔ تنزانیا کا رہنے والا عمری عبیدی ربوہ آنے سے پہلے اپنے وطن میں بطور سواحیلی شاعر کے نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کے دوستوں میں جولیس نیاریرے شامل تھا، جو اپنے ملک کا پہلا صدر بنا۔ عمری عبیدی کو اس نے وطن واپس لوٹنے پر پہلے دارالسلام کا میئر بنایا، پھر اپنی کابینہ میں وزارتِ قانون کا قلم دان اس کے حوالے کر دیا۔ جامعۃ المبشرین میں قیام کے دوران عمری عبیدی اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ پڑھنے میں یا عبادت میں گزارتا تھا۔ ایک روز چائے بنانے کے لیے ابلا ہوا پانی اس کے بازو پر گر گیا، جس کے سبب اس کی کالی چمڑی اس جگہ سے اتر گئی۔ اس کے نیچے سے نمودار ہونے والی چمڑی سرخ و سفید تھی۔ عمری عبیدی نے ڈاکٹر کو، جو اس کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، سب سے پہلے سوال یہ کیا کہ زخم مندمل ہونے پر میری کالی چمڑی مجھے واپس مل جائے گی یا نہیں؟

میرے جونیر دوستوں میں گھانا کا رہنے والا عبدالوہاب بن آدم شامل تھا۔ وہ بھی بے حد محنتی اور لائق و فائق لڑکا تھا۔ وہ بہت نوعمری میں پاکستان آیا تھا۔ اردو سیکھنے کے بعد اس نے جامعہ احمدیہ کی ریگولر تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر جامعۃ المبشرین سے مبلّغ کی ڈگری (شاہد) حاصل کی اور مبلّغِ احمدیت کی حیثیت سے گھانا بھیجا گیا۔ وہ اب تک وہاں کا رئیس التبلیغ ہے۔ ہمارے درمیان ایک معمولی سی بات کے سبب ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی، جو آخر تک پاٹی نہ جا سکی۔ میں نے ایک مضمون کلاسیکی عربی شاعری کے بارے میں لکھا تھا، جس میں عرب شاعروں کے کلام کی بنا پر ان کے معیارِ حسن پر بھی بحث کی گئی تھی۔ میں عبدالوہاب سے پوچھ بیٹھا کہ اس کے ملک میں معشوق کے حسن کا معیار کیا ہے۔ اس پر وہ سخت سیخ پا ہوا۔ دراصل اس سے تھوڑا پہلے میں نے ایک جرمن سائیکل سوار کا

انٹرویو لیا تھا، جو ساری دنیا کی سیاحت پر نکلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت تک غیر شادی شدہ تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں اور کب شادی کرے گا تو اس نے جواب دیا: جب اس کو کوئی خوبصورت افریقن لڑکی مل جائے گی۔ اس انٹرویو پر مبنی میرے مضمون کا، جو روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی میں چھپا تھا، آخری فقرہ یہ تھا: ''یہ بات کہتے ہوے اس کے چہرے پر شرارت کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔'' عبدالوہاب یہ مضمون پڑھ چکا تھا اور مجھے دوستوں کی زبانی پتا چلا تھا کہ اس کے نزدیک میں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ سفید فام یورپین مرد اور کالی افریقن لڑکی کی آپس میں شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا میں افریقیوں کو کمتر نسل سمجھتا تھا۔

ان دنوں ربوہ میں کئی غیر ملکیوں کی شادیاں پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ رشید نامی سیاہ فام امریکن کی شادی مولوی محمد ابراہیم خلیل کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اسی طرح شام کے رہنے والے سلیم الجابی کی شادی مولوی عبدالواحد سماٹری کی سالی کے ساتھ ہوئی تھی۔ برسوں کے بعد میں ایک بار دمشق گیا تو سلیم نے مجھے اپنے گھر پر دعوتِ طعام دی تھی، جہاں پر میری ملاقات اس کے بیٹوں کے ساتھ ہوئی۔ شادی ہونے سے پہلے سلیم ربوہ کی مسجدِ اقصیٰ کے مینار والے حجرے میں رہتا تھا اور لاؤڈ اسپیکر پر بڑی لمبی اذان دیا کرتا تھا۔ اس کا اپنا مخصوص اسٹائل تھا جس کی نقل کسی سے نہ ہو سکی۔ بشیر احمد آرچرڈ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا جس کو میں تقسیمِ ملک سے قبل کے دنوں سے جانتا تھا۔ وہ اس زمانے میں ملٹری افسر تھا اور نیا نیا احمدی ہوا تھا۔ وہ جمعے کی نماز ادا کرنے کے لیے راولپنڈی میں مری روڈ پر واقع احمدیہ مسجد میں آیا کرتا تھا۔ چند بار ابا جی کی دعوت پر وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ اس کی شادی مرزا بشیر الدین محمود احمد کے سالے کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ہوسٹل میں سال کے خاتمے پر طالب علم ایک محفل منایا کرتے تھے، جس میں قسم قسم کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ ایک ایسی تقریب کے موقعے پر وہ میرے پاس یہ بتانے کے لیے آیا کہ وہ بھی کچھ کرتب جانتا ہے اور اگر اس کو اجازت ملے تو وہ پیش کر سکتا ہے۔ وہ حافظے میں وسعت کے سلسلے میں بہت سی مشقیں جانتا تھا جن کے توسط سے وہ ایک بار اس کے سامنے پیش کیے جانے والے ہندسوں کی لڑی کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتا تھا اور اس کو عین اسی ترتیب سے پیش کر سکتا تھا۔ اس کو جماعتِ احمدیہ کا مبلّغ بنا کر اسکاٹ لینڈ بھیجا گیا تھا، جہاں پر وہ اپنی وفات تک نصف صدی سے زیادہ عرصہ مصروفِ عمل رہا۔ میرے عرب دوست محمود شبوطی کی شادی سیّد بشیر احمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ وہ عدن کے ایک تاجر کا بیٹا تھا اور ہر سال چھٹیوں میں وطن جاتا تھا۔ واپسی پر اس کا سوٹ کیس تحفوں سے بھرا ہوتا تھا۔ وہ بہت بیبا آدمی تھا مگر جب باتیں کرنے پر آتا تھا اور جرمن محاورے کے مطابق دن لمبا ہوتا تھا تو سوچے سمجھے بغیر اوٹ پٹانگ باتیں کر جاتا تھا۔ ادریس چینی کے بارے میں

اسی نے افواہ پھیلائی تھی کہ وہ کمیونزم کا پرچار کرتا ہے۔اس سلسلے میں اس نے میرا نام بطور گواہ کے پیش کیا تھا کیونکہ میرا ادریس کے ساتھ بہت اٹھنا بیٹھنا تھا۔البتہ اس کا یہ فایدہ ضرور ہوا کہ میری گواہی کے نتیجے میں ادریس پر لگایا جانے والا الزام واپس لے لیا گیا مگر ادریس کے دل میں میری طرف سے گرہ پڑ گئی تھی جو آخر تک دور نہ کی جاسکی۔

طالب علموں کو سیاسیات میں عام طور سے دلچسپی نہیں تھی۔مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی پاکستان میں ون یونٹ بنایا گیا تھا، جس پر ہمارے بنگالی دوستوں کو سخت اعتراض تھا۔احمد محمود صادق بنگالی ان کا سرغنہ تھا۔اسے بہت بچپن میں تعلیم کی خاطر قادیان بھیج دیا گیا تھا۔وہ ہم جیسی پنجابی اور اردو بولتا تھا مگر بنگالی نہیں بھولا تھا۔اس کی رائے میں ون یونٹ کی اسکیم مشرقی پاکستان کے حقوق کو غصب کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ہوسٹل میں اردو کے دو اخبار آتے تھے جو ڈائننگ روم میں رکھے جاتے تھے،اس لیے بنگالیوں اور پنجابیوں کے درمیان بحثیں وہیں پر ہوتی تھیں۔فاروق احمد بنگالی ذرا تیز مزاج تھا اور طیش میں آ کر مسلم لیگ کی ایسی تیسی کرتا اور عوامی لیگ کے حق میں بولتا تھا۔میری دلچسپی سیاسیات میں عام طالب علموں سے کہیں زیادہ تھی۔میں بحث مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔میرے پاس ’’پاکستان ٹائمز‘‘ آتا تھا۔اس کے علاوہ میں نے ’’نیوز ویک‘‘ بھی لگوا رکھا تھا۔میرا ارادہ آگے چل کر پولیٹیکل سائنس پڑھنے کا تھا۔چونکہ یہ مضمون جامعہ میں نہیں پڑھایا جاتا تھا اس لیے مجھے اس کے لیے اپنے طور پر تیاری کرنی تھی۔

’’قصرِ خلافت‘‘ میں بھونچال

جامعۃ المبشرین میں ہماری پڑھائی شروع ہوئے ابھی چار ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ سلسلہِ عالیہ احمدیہ کی عمارت میں ایک بھونچال آ گیا۔مرزا بشیر الدین محمود احمد نے انکشاف کیا کہ خلیفہِ اوّل حکیم مولوی نور الدین کے بیٹے عبد المنان عمر نے نوجوانوں کا ایک گروپ بنا رکھا ہے، جو اس کو خلیفہ بنانے کے لیے ساز باز کر رہا ہے۔عبد المنان عمر اس وقت امریکہ گئے ہوئے تھے۔وہ وہاں سے فی الفور واپس لوٹے اور آتے ہی سیدھے ’’قصرِ خلافت‘‘ پہنچے۔ان کا خیال تھا کہ کسی غلط فہمی کے باعث ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے، جس کو دور کیا جا سکتا ہے۔مگر ’’قصرِ خلافت‘‘ کے دروازے ان پر بند رہے اور صدرِ انجمنِ احمدیہ کا کوئی ذمے دار کارکن ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔جماعتِ احمدیہ کے اخباروں میں خلافت کے حق میں مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ خلیفہ خدا تعالیٰ خود بناتا ہے، جو کوئی اس

منزلت کو دھاندلی سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اس کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

عبدالمنان عمر ایم اے (عربی) تھے اور جامعہ احمدیہ کے ٹیچنگ اسٹاف پر تھے۔ ان کا خاص مضمون حدیث تھا۔ احمد نگر کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ وہ شاید مہینہ بھر ہمیں پڑھانے کے لیے آئے تھے۔ پھر چوہدری ظفر اللہ خان کی وساطت سے ان کو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت ملی تھی جس کا کرتا دھرتا پروفیسر رچرڈ فرائی تھا، جسے برسوں کے بعد ہمبرگ یونیورسٹی میں میرا کولیگ بننا تھا۔ عبدالمنان عمر بلند پایہ عالم تھے اور جماعتِ احمدیہ کے ستونوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگی تھیں۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد پر اس سے دو سال قبل ایک ناکام قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا، جس کا ان کی صحت پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ خنجر کی نوک ان کی گردن میں اٹکی رہ گئی تھی، جس کا پتا اس وقت چلا تھا جب وہ علاج کے لیے یورپ گئے۔ مگر اس کو نکالا نہ جاسکا کیونکہ اپریشن کرنے پر ان کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ ان کی صحت مسلسل گر رہی تھی اور ''خاندانِ نبوت'' میں ان کی جانشینی کا سوال اٹھایا جا رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ خلافت کی گدی ان کے بیٹے مرزا ناصر احمد کو ملنی چاہیے، جس کو انھوں نے بچپن میں قرآن حفظ کرایا تھا، پھر جامعہ احمدیہ میں تعلیم دلا کر مولوی فاضل کی ڈگری دلوائی تھی۔ اس کے بعد اس کو پڑھنے کے لیے آکسفورڈ بھیجا تھا جہاں سے وہ بی اے کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ وہ ایم اے (آکسن) اس لیے لکھا کرتے تھے کیونکہ جو کوئی وہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دو سال تک کسی کالج میں پڑھائے اس کو ایم اے کی ڈگری دے دی جاتی تھی۔ انگلستان سے واپسی پر ان کو پہلے جامعہ احمدیہ کا، پھر تعلیم الاسلام کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس کے باوجود عام طور سے ان کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ موٹے دماغ کے آدمی ہیں۔ ان سے ایک بار دہلی کے ایک جلسے میں تلاوتِ قرآن کرائی گئی تھی، جس میں ان سے غلطی سرزد ہوئی تھی، جس کے سبب مخالفوں نے پتھراؤ کیا تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کئی بار اس واقعے کا خود ذکر کیا تھا اور اپنے بیٹے کی قابلیت کے بارے میں شک وشبہے کا اظہار کیا تھا۔ اس وجہ سے جماعت کے اندر اس خیال کا پیدا ہونا قرینِ قیاس ہے کہ ان کے مقابلے میں عبدالمنان عمر خلافت کے لیے زیادہ موزوں شخص ہیں۔ وہ بھی تو ایک بڑے عالمِ دین کے بیٹے ہیں، جو جماعت کے پہلے خلیفہ تھے۔ پھر وہ خود بھی نامور عالم تھے۔

عبدالمنان عمر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ برسوں سے مسند احمد بن حنبلؒ کی جملہ حدیثوں کو صحیح بخاری کی طرح ابواب میں ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو علمی اصطلاح میں ''تبویب'' کا نام دیتے ہیں۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے والد حکیم مولوی نور الدین نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا

کہ کیا ہی اچھا ہوا گر کوئی شخص یہ علمی خدمت بجالائے۔خلافت کے قریبی حلقوں میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ اگر عبدالمنان عمر کی کتاب چھپ گئی،تو ساری جماعت پر ان کی علمیت کا رعب پڑ جائے گا۔اس کا فی الفور تدارک ہونا چاہیے۔ چنانچہ جماعت کے مولوی حضرات نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ احمدی علماء کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو دو چار مہینوں کے اندر اندر مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا کام مکمل کرے۔جب ان کی طرف سے کتاب پہلے چھپ جائے گی،تو عبدالمنان عمر کا سارا کیا کرایا رائیگاں جائے گا۔

یہ چیز جماعتِ احمدیہ میں نئی نہیں تھی، کیونکہ اس کی ایک مثال پہلے سے پائی جاتی تھی۔ جب خلیفہِ اوّل حکیم مولوی نورالدین کی ۱۹۱۴ء میں وفات ہوئی تو صدرِ انجمنِ احمدیہ کے بنیادی اراکین کی اکثریت اس حق میں تھی کہ جماعت میں خلافت کا نظام آگے نہ چلایا جائے بلکہ اس کی جگہ پر رہنمائی کا کام ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے، جو جمہوری طرز پر جماعت کا انتظام چلائے۔مگر مرزا بشیر الدین محمود احمد چونکہ پیری مریدی کی گدی بنانی چاہتے تھے،اس لیے وہ خلافت کے جاری رکھنے کے حق میں تھے۔صدرِ انجمنِ احمدیہ کے بیشتر سینئر اراکین قادیان کو چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور انھوں نے وہاں پر اپنی جماعت بنا لی، جس کو عام طور سے ''لاہوری جماعت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس جماعت کے سرگردہ مولوی محمد علی تھے،جن کے سپرد صدرِ انجمنِ احمدیہ کی طرف سے قرآن کو انگریزی میں ڈھالنے کا کام لگایا گیا تھا۔ لاہور جاتے ہوے وہ اپنا مسودہ ساتھ لیتے گئے۔قادیان کی جماعت کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر مولوی محمد علی کا انگریزی ترجمۃ القرآن چھپ گیا تو ان کی ساکھ بندھ جائے گی،اس لیے یہ سکیم بنائی گئی کہ ان کا ترجمہ چھپنے سے پہلے قادیان کی طرف سے قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ چھاپ دیا جائے۔ چنانچہ ایک بورڈ بنایا گیا اور ایک سال کے اندر اندر ۱۹۱۵ء میں پہلے پارے کا انگریزی ترجمہ چھاپ دیا گیا۔مکمل قرآن کا ترجمہ بیس برسوں کے بعد ۱۹۳۵ء میں جا کر چھپا،جس پر مولوی شیر علی نے دن رات کام کیا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ ان کی بیٹی امۃ الرحمٰن کی شادی عبدالمنان عمر کے ساتھ ہوئی تھی۔ان دونوں میاں بیوی نے بھی آگے چل کر قرآن کا ترجمہ حکیم مولوی نورالدین کے درس القرآن کی روشنی میں انگریزی میں کیا جو ۱۹۹۱ء میں امریکہ سے شایع ہوا۔مگر اب وہ جماعتِ احمدیہ ربوہ کے رکن نہیں تھے۔اس ترجمے کے بارے میں ان سے کسی دوست نے استفسار کیا تھا کہ آپ نے حکیم مولوی نورالدین کے نام کے ساتھ ''خلیفۃ المسیح الاول'' کے الفاظ کیوں نہیں لکھے؟ تو اس کا جواب عبدالمنان عمر صاحب نے یوں دیا تھا:

''میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ ''خلیفۃ المسیح'' اپنی نیکی،تقوے،علم وفضل اور ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بنے تھے۔ان کی عظمت نے انھیں خلیفہ بنایا نہ کہ خلافت نے انھیں عظمت دی۔'' (خط مطابق ۱۵ جون

۱۹۹۳ء)

مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا فیصلہ آناً فاناً ہوا۔ جامعۃ المبشرین کے جملہ اساتذہ اور طلبہ کو حکم ہوا کہ اگلے روز سے اس کام میں لگ جائیں۔ ربوے کی خلافت لائبریری میں مسند احمد بن حنبلؒ کی صرف ایک جلد موجود تھی۔ اس زمانے میں ابھی فوٹو کاپی کی مشینیں نہیں پائی جاتی تھیں، اس لیے فیصلہ یہ تھا کہ جلد کے اجزاء الگ الگ کر لیے جائیں، اس کے بعد ساری حدیثیں الگ الگ اوراق پر نقل کی جائیں، تا کہ ماہرینِ حدیث ان کو ابواب میں ترتیب دے سکیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کی طرف کسی کی نظر نہ گئی۔ اوّل تو یہ بات قابلِ غور تھی کہ اندھا دھند نقل کرنے کے نتیجے میں غلطیاں در آئیں گی۔ پروف ریڈنگ کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ پھر سب طالب علم عربی زبان سے کما حقہ واقف نہ تھے۔ میرا ہم نام کلاس فیلو عربی سے بالکل نابلد تھا، اس لیے جتنی دیر میں وہ ایک حدیث درج کرتا تھا میں اتنی دیر میں دس حدیثیں نقل کر لیتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ہم لوگ صبح سے شام تک یہ کام نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے دو چار دنوں کے اندر حدیثوں کی تعداد مقرر کر لی گئی، جو ہر کسی کو نقل کرنی ہوتی تھیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں میرے لیے آسانی پیدا ہو گئی، کیونکہ میں اپنا کام دو تین گھنٹوں میں ختم کر لیتا تھا۔ اس کے بعد ہم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دینے کی ٹھان رکھی تھی اس لیے میں اس کے لیے مقرر کردہ کورس کی کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتا تھا۔ یوں بھی ہمارا تعلیمی پروگرام روک دیا گیا تھا۔

پھر ایک رات جامعۃ المبشرین کے آفس میں ڈاکا پڑا۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ چوروں نے تمام الماریاں چھان ماری تھیں مگر اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھے، جو ان کو نہیں مل سکی تھی۔ اگلے روز ذمہ دار حضرات اس نتیجے پر پہنچے کہ چوری کے پیچھے عبدالمنان عمر کا ہاتھ تھا، جو یہ چاہتے تھے کہ مسند احمد بن حنبلؒ کا واحد نسخہ اڑا لیا جائے۔ گویا نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط ہونے کی ہدایت کر دی گئی بلکہ فیصلہ ہوا کہ اس پروجیکٹ پر کام کرنے والے سارے عملے کو ربوہ سے باہر کسی پوشیدہ جگہ پر بھیج دیا جائے تا کہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔ مولوی خورشید احمد شاد نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے گروپ سمیت مری چلے جائیں، جب کہ دوسرے گروپ کے انچارج مولوی محمد احمد ثاقب نے لاہور کا انتخاب کیا۔ میں دوسرے گروپ میں تھا اس لیے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے اس وقت تک لاہور نہیں دیکھا تھا۔ گویا لاہوریوں کے الفاظ میں ابھی جنما ہی نہیں تھا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ میرا گائیڈ لاہور میں جامعہ احمدیہ کا ایک سابق طالب علم حافظ محمد اعظم تھا جو نابینا تھا۔ اس نے مجھے لاہور کے مال روڈ کی سیر کرائی۔ وہ مجھے بتاتا جاتا تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ پر فلاں بلڈنگ ہے اور بائیں ہاتھ پر فلاں۔ اور اگلے چوک پر ہمیں

فاطمہ جناح باغ جانے کے لیے بائیں ہاتھ کی طرف مڑنا ہوگا۔ وہ لاہور کے ٹریفک میں بہت اطمینان سے گھومتا پھرتا تھا، جب کہ میں پہلی بار ایک بڑے شہر کی گہما گہمی سے دوچار ہورہا تھا۔ راولپنڈی، جہاں کا میں رہنے والا تھا، اس زمانے میں لاہور کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا سویا ہوا سا قصبہ تھا۔ برسوں بعد مجھے جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں ایک نابینا تیونسی اسکالر سے واسطہ پڑا، جو عارضی طور پر وہاں پر آیا ہوا تھا۔ میں دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے کی خاطر باہر جارہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی دروازے سے نکل رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اسے کہاں جانا ہے اور اگر وہ چاہے تو میں اس کو راستہ دکھانے کے لیے اس کے ساتھ چلوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا جانا چاہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ وہاں تک گیا۔ اسے پتا تھا کہ مجھے ایک دوسرے ریستوراں جانا تھا اس لیے جب ہم کیفے ٹیریا میں پہنچے تو اس نے کہا: آپ بیشک مجھے یہاں پر اکیلا چھوڑ جائیں، واپسی کا راستہ میں نے نوٹ کرلیا ہے۔ میں اکیلا واپس آ جاؤں گا۔ میں حیران ہوا کہ صرف ایک بار اسے راستہ دکھانا کافی تھا جب کہ میرے دوست سیّد احمد سعید ہمدانی ہمبرگ آئے تو مجھے راستہ دکھانے کے لیے بار بار ان کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ وہ ہفتے بھر میں اس قابل نہ ہوے کہ اکیلے اپنی رہایش گاہ سے اندرون شہر جاسکیں یا میرے انسٹیٹیوٹ تک پہنچ سکیں جب کہ انھیں راستے میں صرف ایک دوبار مڑنا پڑتا تھا۔ حافظ محمد اعظم نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا اور اس زمانے میں غالباً ایم اے کی تیاری کررہا تھا۔ اپنی روزی وہ ٹیوشن پڑھا کر کماتا تھا۔ آگے چل کر اس کو پشاور میں اندھوں کے ایک تعلیمی ادارے میں پروفیسر شپ مل گئی تھی۔

لاہور کے اس سفر کی یادگار یہ امر بھی تھا کہ سمیع اللہ قریشی کی دعوت پر، جو وہاں پر بی ٹی کرنے کے سلسلے میں مقیم تھا، میں زندگی میں پہلی بار فلم دیکھنے کے لیے ایک سینما ہاؤس میں گیا تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے اراکین کو ۱۹۳۴ء سے فلم دیکھنے کی ممانعت کردی گئی تھی، اس کے باوجود ہم نے لاہور میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ جس میں جینا لولو بریجیڈا نے لیڈنگ رول ادا کیا تھا اور اسکی تصویر دیکھ کر سمیع اللہ اس پر دل وجان سے عاشق ہوچکا تھا۔ فلم کا نام تھا۔

The Hunchback of Notre Dame

ہم لاہور سے واپس لوٹے تو ایک نئی خبر ہماری راہ تک رہی تھی۔ ہماری غیر حاضری میں جامعۃ المبشرین کو جامعہ احمدیہ میں مدغم کر دیا گیا تھا اور مولوی ابو العطاء جالندھری کو تعلیم الاسلام کالج میں ڈیپوٹیشن پر بھیج کر پروفیسر مقرر کردیا گیا تھا۔ اگرچہ موصوف نے ابھی بی اے (انگریزی) کا امتحان پاس نہیں کیا تھا، جس میں وہ ایک یا دوبار بیٹھ چکے تھے۔ ان کی جگہ پر میر داؤد احمد کو، جو مرزا بشیرالدین محمود احمد کے ماموں زاد اور داماد تھے، پرنسپل بنا دیا گیا تھا۔ موصوف نے فیصلہ کیا کہ ان کے پاس جامعۃ المبشرین

کی کلاسوں کو جاری رکھنے کے لیے اسٹاف ناکافی ہے، اس لیے ہمیں آتے ہی کہہ دیا گیا کہ ہمیں سارا کورس خود پڑھنا ہوگا۔ گویا ہمیں آیندہ جامعہ میں حاضر ہونے کی پابندی سے آزاد کیا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ بات ایک خوشخبری کے مترادف تھی کیونکہ میں ایف اے اور اسکے بعد بی اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اب تو جماعت احمدیہ کی گزشتہ کئی برسوں سے یہ پالیسی ہے کہ واقفینِ زندگی کو یونیورسٹی کے امتحانات میں بیٹھنے نہ دیا جائے، یہاں تک کہ مولوی فاضل کا امتحان بھی نہیں دلوایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب یہ لوگ بی اے اور ایم اے کر لیتے ہیں، تو ان کو آسانی کے ساتھ جماعت سے باہر تعلیمی اداروں میں ملازمت مل جاتی ہے اور وہ اپنے وقفِ زندگی کے عہد کو بھول جاتے ہیں جبکہ مجھے اس زمانے میں بالکل مختلف تجربہ ہوا تھا۔ میں ایک روز اپنی کلاس کو چھوڑ کر ماسٹر محمد علی، جو بی ٹی صاحب کے نام سے مشہور تھے، کی انگریزی کلاس میں شامل ہونے کے لیے جا رہا تھا، جو جامعۃ المبشرین میں ایف اے کا انگریزی کورس پڑھاتے تھے۔ راہداری میں میرا آمنا سامنا پرنسپل مولوی ابوالعطاء جالندھری سے ہوا۔ انھوں نے پوچھا: آپ تفسیر القرآن کی کلاس کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا: بی ٹی صاحب کی کلاس میں شامل ہونے کے لیے، کیونکہ میں ایف اے کے امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا: آپ اس وقت اپنی کلاس کی طرف لوٹ جائیں۔ میں آپکے لیے بی ٹی صاحب سے بات کر کے پرائیویٹ ٹیوشن کا انتظام کرا دوں گا۔ اس پر اٹھنے والا خرچ جامعہ ادا کرے گا اور ایف اے کے امتحان کے لیے آپکا داخلہ بھی جامعہ کی طرف سے بھیج دیا جائے گا۔

مسند احمد بن حنبلؒ کی تمام جلدوں کی نقل کا کام دنوں کی بجائے مہینوں پر پھیلتا چلا گیا۔ تبویب کی اسکیم بنانے والوں نے کہا تھا کہ سارا کام دو تین ماہ میں اختتام کو پہنچ جائے گا۔ آخرِ کار جب ساری کتاب نقل ہو چکی تو ہمارا کام ختم ہو گیا اور احادیث کی تبویب کا کام ایک بورڈ کے سپرد کر دیا گیا، جس کے اہم رکن مفتی سیف الرحمٰن اور مولوی خورشید احمد شاد تھے۔ ان لوگوں نے مزید دو تین سال لگا دیے۔ تب کہیں جا کر پہلی جلد ''کتاب الصلوٰۃ'' چھاپی جا سکی۔ مجھے علم نہیں ہے کہ یہ کام آگے چلایا گیا یا نہیں۔ قرینِ قیاس ہے کہ پہلی جلد چھپ جانے کے بعد مسودہ کہیں غایب کر دیا گیا ہوگا۔ یوں بھی اس دوران میں مرزا بشیر الدین محمود احمد پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور عبدالمنان عمر جماعتِ ربوہ سے کٹ کر لاہوری جماعت میں جا ملے تھے۔ (تاہم عبدالمنان عمر صاحب نے اپنے خط بمطابق ۱۵ جون ۱۹۹۳ء مجھے لکھا تھا: ''قریباً ربع صدی سے ہمارا جماعتِ ربوہ یا جماعتِ لاہور کی تنظیموں سے کوئی تعلق نہیں'') گویا ان کی طرف سے مرزا ناصر احمد کی خلافت کو کوئی خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا کام اس

سے قبل مصری عالم احمد عبدالشاکر کر چکے تھے اوران کی کتاب مکّے کا ایک پبلشر چھاپ رہا تھا۔اس زمانے میں چھپ جانے والی چودہ جلدیں ربوہ کی خلافت لائبریری میں موجود تھیں۔اس وجہ سے ربوہ میں کیے جانے والے کام کا جواز ختم ہوجاتا تھا مگر وہاں پر مقصد علمی کام کرنا تو تھا ہی نہیں،بس عبدالمنان عمر کے کام کی اہمیت کو گھٹانا تھا۔

ہمیں چونکہ حکم تھا کہ مبلّغین کے امتحان ''شاہد'' کی تیاری اپنے طور پر کریں اس لیے میرا تعلق جامعہ احمدیہ کے ساتھ بس اتنا رہ گیا تھا کہ عصر کی نماز کے بعد پرنسپل جامعہ میر داؤد احمد کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے وہاں پر جاتا تھا۔باقی وقت کے درست استعمال یا ضیاع کا میں خود ذمے دار تھا۔میں نے دل لگا کر ان دو برسوں میں انگریزی زبان کا مطالعہ کیا، یہاں تک کہ جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے مسجدِ اقصیٰ میں جاتا تھا تو ''پاکستان ٹائمز'' کا تازہ شمارہ ساتھ لے کر جاتا تھا اور خطبہ شروع ہونے کے انتظار کے لمحات اخبار پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔اس طرح میری انگریزی پر گرفت بہتر ہوتی گئی اور میں نے ''پاکستان ٹائمز'' کے خطوط کے کالم میں لکھنا شروع کیا۔اس زمانے میں اس کالم میں اسلام میں عورتوں کے حقوق اور اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے مقام پر طویل بحثیں جاری تھیں، جو مہینوں تک چلتی رہیں۔میرے اس سلسلے میں چھپنے والے خطوط نے اپنوں اور غیروں میں میری ساکھ قایم کر دی تھی۔ چنانچہ مجھے بے شمار خطوط قارئین کی طرف سے ملنے لگے۔ایک صاحب نے لکھا کہ وہ نوے برس کی عمر کو پہنچ رہے ہیں اور ایک زمانے میں ترکی میں کمال اتاترک کے مترجم رہ چکے ہیں۔انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا قرآن میں کوئی پیشگوئی اس بارے میں موجود ہے،جس کی روشنی میں کہا جاسکے کہ فلسطین کسی زمانے میں پھر عربوں کو مل جائے گا اور یہودی صیہونی ریاست کا خاتمہ ہوجائے گا۔میں نے اس کے جواب میں ایک لمبا چوڑا مضمون اردو میں لکھا تھا،جس کا بنیادی مأخذ مرزا بشیرالدین محمود احمد کی ''تفسیرِ کبیر'' تھی۔یہ مضمون خدام الاحمدیہ ربوہ کے مجلّہ "خالد" میں چھپا تھا۔ایک اور مضمون لکھنے کی تحریک مجھے لندن سے ڈاکٹر عبدالسلام،جن کو آگے چل کر نوبل پرائز ملا تھا، کے والد محمد حسین صاحب کی طرف سے ملی تھی، جو وہاں پر ایک علمی حلقے کی میٹنگوں میں جایا کرتے تھے، جہاں پر انسانی روح کے بارے میں مقالات پڑھے جاتے تھے۔انھوں نے لکھا کہ ان کو اس بارے میں اسلامی تعلیم پیش کرنے کی دعوت ملی ہے مگر ان کا مطالعہ ناکافی ہے،اس لیے اگر میں ان کو ایک مضمون لکھ کر بھیجوں تو وہ اسے میری طرف سے جا کر پیش کریں گے۔یہ مضمون ان کو بھیج دیا گیا تھا،جس کے جواب میں انھوں نے خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آیا یہ مضمون کہیں پر چھپا تھا یا نہیں۔

بیگار کی مشقت

مرزا حنیف احمد اس دوران میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی یونین کے صدر بن گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے صدارت کے زمانے میں علمی مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہماری ادیبوں کی ٹولی کو ایک شبینہ محفل میں مقالات پیش کرنے کی دعوت دی۔ میرا مقالہ عربی شاعری کے بارے میں تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ سمیع اللہ قریشی اور پرویز پروازی نے کس بارے میں لکھا تھا۔ ہماری توقعات کے برعکس ربوہ کے جملہ ادب نواز اس روز کالج کے ہال میں جمع تھے۔ بالخصوص اس محفل میں مستورات کی گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میرے مقالے پر، جو بعد میں ''قندیل'' لاہور میں چھپا، غیر معمولی طور پر بہت داد دی گئی۔ جماعتِ احمدیہ کی مجالس میں مردوں کو تالیاں بجانے کی اجازت نہیں البتہ عورتیں تالیاں بجاتی ہیں۔ اس روز اتنی تالیاں بجیں کہ مردوں کی طرف سے پکارے جانے والے مرحبا کی آوازیں دب گئیں۔ محفل کے خاتمے پر جب معززین اور مقررین کو چائے اور پیسٹری کی میز کی طرف بلایا گیا، تو سب سے پہلے پرنسپل جامعہ احمدیہ میر داؤد احمد میری طرف آئے۔ انھوں نے میرے مقالے کی تعریف کی مگر محفل میں ٹوپی کے بغیر آنے پر جرمانہ بھی کر دیا۔ جامعہ احمدیہ کے طلبہ کو سرِ عام ننگے سر پھرنے کی ممانعت تھی۔ جو کوئی پکڑا جاتا تھا اس کو چار آنے جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز ایک بڑی خوبصورت آٹھ نو سالہ بچی میری کھڑکی کے سامنے آ کر رکی۔ اس نے کہا: باجی نے پوچھا ہے کہ کیا آپ ان کے لیے کالج میں ہونے والے تقریری مقابلے میں پیش کرنے کی خاطر تقریر لکھ دیں گے؟ میں نے کہا: ضرور لکھ دوں گا۔ مگر مجھے کچھ پتا نہیں کہ تمھاری باجی کون ہیں اور ان کو کس موضوع پر تقریر کرنی ہے۔ بچی نے جواب دیا: میری باجی ہر روز آپ کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتی ہیں۔ آپ نے ان کو ضرور دیکھا ہوگا۔ نام بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ تقریر کے لیے موضوع آپ خود چن سکتے ہیں۔ میں کل تقریر لینے کے لیے آؤں گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ کالج کی شبینہ محفل کا یہ پہلا پھل ہے۔ میری کھڑکی کے سامنے سے کالے برقعوں میں ملبوس لڑکیوں کی ڈاریں گزرا کرتی تھیں جن کو دیکھنے کے لیے میرے ادیب دوست کالج میں چھٹی ہونے کے وقت پر جمع ہو جایا کرتے تھے، مگر ہم لوگ بہت شریفانہ انداز میں لڑکیوں کو تاڑتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے نہ کبھی کوئی آوازہ کسا تھا نہ آنکھ ماری تھی۔ بس ہمارا دوست سعید رحمانی، جو حال میں ہی آڈیٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے، وہ ان دنوں نیا نیا تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کا پروفیسر لگ کر آیا تھا اور ہم سے زیادہ

بولڈ تھا۔ وہ پروازی کا تعلیم الاسلام ہائی سکول میں کلاس فیلو رہ چکا تھا اور اس نے میٹرک کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اوّل ان کا دوسرا کلاس فیلو منور چونڈا آیا تھا، جس کے بارے میں بعد میں کچھ سننے میں نہیں آیا کہ وہ کدھر گیا اور اس نے علمی میدان میں کیا فتوحات کیں۔ سعید رحمانی میرے کمرے میں بیٹھ کر بلّھے شاہ کی کافی ''ویہڑے آوڑ ساڈے بھانویں جان نہ جان'' گایا کرتا تھا، مگر ربوہ کی لڑکیاں بڑی پردہ دار ہوا کرتی تھیں، وہ ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتی تھیں۔ بس شام کو وہاں سے گزرنے والیاں جب میرے میز پر مٹی کے تیل کے دو لیمپ رکھے ہوئے دیکھتی تھیں تو کچھ اس قسم کے فقرے سننے میں آتے تھے کہ ساٹھ واٹ کے بلب کے برابر روشنی تو ہو جاتی ہوگی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ اس بچی کی باجی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے پردے کا پلو سرکا کر اپنے موہنے چہرے کا دیدار کرانے لگی۔ میں اس عنایت پر دل بہلا لیتا تھا اور جب بھی تقریر کا مطالبہ آتا تھا تو اپنے سارے ضروری اور غیر ضروری کام روک کر اس کے لیے تقریر لکھنے بیٹھ جاتا تھا مگر میں نے کبھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش نہ کی نہ ہی اس نے کبھی مجھے کوئی رقعہ بھیجا۔

تقریریں لکھ کر دینے کے مطالبات لڑکوں کی طرف سے بھی آتے تھے بلکہ بعض اوقات باقاعدہ طور پر میرے جاننے والوں کی سفارشوں کے ساتھ آتے تھے۔ مولوی بشارت احمد بشیر انجمن تحریکِ جدید کے نائب وکیل التبشیر تھے، ایک بار مجھے ان کا رقعہ ملا کہ میرے سالے ہدایت اللہ کے لیے، جو اپنے اسکول کے تقریری مقابلے میں شامل ہونا چاہتا ہے، ایک تقریر لکھ کر بھیجیں۔ ایک بار تو حد ہی ہوگئی۔ ایک لڑکے کا خط منٹگمری سے آیا۔ وہ اس سے قبل ربوہ میں طالب علم رہ چکا تھا۔ اس نے لکھا کہ اسے ویسی تقریر لکھ کر بھیجوں جیسی میں قاضی نعیم کے لیے لکھا کرتا تھا۔

چھوٹی موٹی تقریریں لکھنے میں وقت ہی کتنا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مجھے کالج کے ایک دوست الیاس بشیر کے اس مطالبے نے اچھی خاصی مشکل میں ڈال دیا کہ اس کو سوشل اسٹڈی کے اضافی پرچے کے لیے ایک پوری نوٹ بک لکھ کر دوں، جس میں مختلف اداروں (جیل، پاگل خانے وغیرہ) کی وزٹ کے کوائف درج ہوں۔ اس کاپی کے بغیر وہ اپنا امتحان پاس نہیں کر سکے گا۔ میں اس کو امتحان میں فیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

جامعۃ المبشرین میں میرے کلاس فیلو سے، جو اتفاق سے میرا ہم نام تھا، ''شاہد'' کی ڈگری کے لیے لکھا جانے والا مقالہ نہ لکھا جا سکا۔ اس کو تو یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ذمے لگائے جانے والے موضوع کا مطلب کیا ہے۔ وہ مقالہ جمع کرانے کی تاریخ سے بیس پچیس روز قبل میرے پاس اپنا رونا رونے کے لیے آیا۔ میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس موضوع کو کس کس پہلو سے دیکھا جا

سکتا ہے اور کس طریق سے اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے مگر بات اس کے پلے نہ پڑی۔ اس نے کہا: یار تم مجھے پچاس ساٹھ صفحے لکھ دو تو میرا کام بن جائے گا۔ یہاں بھی میری دوستی کی رگ پھڑک اٹھی اور میں نے ہفتے بھر میں اس کا مقالہ لکھ دیا جس کی بنا پر اس کو پاس کر دیا گیا۔

مگر جس بارے میں میں اب لکھنے لگا ہوں اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں اس زمانے میں کیوں اتنا رقیق القلب تھا کہ دوسروں کی مدد کرنے کی خاطر ایک جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ہمارے ہوسٹل میں ایک نیا طالب علم یوسف ایاز آ کر داخل ہوا، جس کے بارے میں عام طور سے مشہور تھا کہ وہ بی اے ہے۔ وہ اکثر میرے پاس آ کر بیٹھتا تھا بلکہ خود ہی وقت بے وقت میرے کام آنے لگا۔ اس نے میرے لیے لائبریری سے کتابیں لانے اور انھیں واپس پہنچانے کی ذمے داری اٹھالی۔ ہوسٹل میں صبح کا ناشتہ اور دو وقت کا کھانا تو مل جاتا تھا مگر ہمیں چائے خود بنانی پڑتی تھی۔ وہ دن میں دو تین بار مجھے چائے بنا کر دینے لگا۔ میں عام طور سے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک چائے خانے میں جا کر بیٹھا کرتا تھا، جہاں پر دو تین روزنامے پڑھنے کو ملتے تھے۔ یوسف میرے ساتھ وہاں پر جانے لگا اور خود ہی چائے خانے کی ساری میزوں پر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس روز کا تازہ اخبار مہیا کرنے لگا۔ جب میں ایک اخبار ختم کر لیتا تھا تو وہ دوسرا اخبار اٹھا لاتا تھا مگر خود وہ ہمیشہ ایک روز پرانا اخبار پڑھتا تھا۔ میں پوچھتا تھا کہ تم تازہ اخبار کیوں نہیں پڑھتے ہو تو یوسف جواب دیتا تھا: میں نے ابھی کل کا اخبار نہیں پڑھا۔ جب تک ہمارا اس ہوسٹل میں ساتھ رہا وہ یہ لیٹ نہ نکال سکا۔

ایک روز اس نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ وہ دو بار بی اے کے امتحان میں فیل ہو چکا ہے۔ اس نے مجھ سے مشورہ مانگا کہ کیا اسے تیسری بار امتحان دینا چاہیے۔ میں نے اس کی ہمت بڑھائی اور کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں تمھاری مدد کروں گا۔ اس پر یوسف نے امتحان کے داخلے کی فیس بھیج دی۔ میں ان دنوں میں بی اے کرنے کے علاوہ "شاہد" کا امتحان بھی پاس کر چکا تھا۔ میرے پھوپھا راجہ فضل الٰہی نے مجھے اپنے مکان میں ایک کمرہ دینے کی پیشکش کی، جہاں پر مجھے گھر جیسی سہولتیں ملتی تھیں، اس لیے میں ہوسٹل چھوڑ کر ان کے ہاں جا کر رہنے لگا۔ مگر ہوسٹل کے دوستوں کی ہمراہی میں چائے خانوں کے طوافوں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں گاہے بگاہے یوسف سے پوچھ لیتا تھا کہ اس کے امتحان کی تیاری کیسی چل رہی ہے کیونکہ اس نے کبھی مجھ سے اپنی پڑھائی کے سلسلے میں کوئی مدد نہ مانگی تھی، جب کہ میں اس کی خاطر ایک دو گھنٹے ہر روز نکالنے کے لیے تیار تھا۔ یوسف مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ تیاری ٹھیک ہو رہی ہے، تم بالکل کوئی فکر نہ کرو۔ جب امتحان میں دو ماہ باقی رہ گئے تو ایک روز یوسف اپنے کورس کی ساری کتابیں اٹھا کر میرے گھر پر آن نکلا۔ میں نے فی الفور اپنے کمرے کی ایک الماری

اس کی کتابوں کے لیے خالی کر دی اور ایک زاید چار پائی اپنے کمرے میں ڈلوا دی تا کہ یوسف بوقتِ ضرورت اس پر استراحت کر سکے۔ اسکے مضامین انگریزی، عربی، اسلامیات اور اردو (آپشنل) تھے۔

اس کے بعد دن اور ہفتے گزرتے گئے اور یوسف نے کبھی میرے گھر پر آ کر پڑھائی نہ کی۔ میں حیران ہوتا تھا کہ یوسف کتابوں کے بغیر، جو میرے کمرے میں پڑی تھیں، کیسے امتحان کی تیاری کرتا ہوگا۔ امتحان کی مقررہ تاریخ سے پندرہ روز قبل یوسف میرے گھر پر آیا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ امتحان دینا اس کے بس کی بات نہیں اور بی اے کی ڈگری کے بغیر اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے کیونکہ اس کو کوئی نوکری نہیں مل سکتی اور اگر نوکری نہ ملی تو اس کی شادی بھی نہ ہو سکے گی۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ وہ خودکشی کر لینے کی ٹھان چکا ہے۔ میں نے اس سے قبل ایسی مایوسانہ باتیں یوسف کے منہ سے نہ سنی تھیں، اس لیے گھبرا گیا کہ وہ کہیں سچ مچ خودکشی نہ کر لے۔

میں نے پوچھا کہ کیا کوئی طریق موجود نہیں ہے، جسکو اختیار کرنے سے اسکو اس مایوس کن صورتِ حال سے بچایا جا سکے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو امتحان کا مرحلہ طے کیا جا سکتا ہے۔ اسکا طریق یہ ہوگا کہ تم میری جگہ پر جا کر امتحان کے سینٹر میں پرچے دے آیا کرو۔ اس زمانے میں امیدواروں کی تصویر کمرۂ امتحان میں ڈیسک پر نہیں لگائی جاتی تھی، نہ ہی شناختی کارڈ کا سسٹم جاری ہوا تھا۔ امیدوار یونیورسٹی کی طرف سے جاری کردہ کارڈ کے ذریعے اپنی شناخت کراتے تھے، جس پر انکا صرف رول نمبر درج ہوتا تھا۔ ایسا کارڈ کوئی شخص بھی لے جا کر دکھا سکتا تھا۔ عام طور سے ناموں کی پڑتال کا رواج نہیں تھا، بلکہ کمرۂ امتحان میں استعمال ہونے والے رول نمبر پرچہ جمع کرانیکے بعد ممتحن کو بھیجنے سے قبل بدل دیے جاتے تھے، تا کہ ممتحن یہ نہ جان سکے کہ وہ کس امیدوار کا پرچہ دیکھ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یوسف کا امتحانی مرکز لائل پور کا ایک کالج ہے، جہاں پر مجھے کوئی نہیں جانتا اس لیے رسک اتنا بڑا نہیں ہے۔ چنانچہ میں یوسف کی زندگی اور اسکا مستقبل بچانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں یہ کام روپے پیسے کے لالچ میں نہیں کروں گا، نہ کسی دوسری چیز کی طمع میں اس لیے اگر یوسف کو بی اے کی ڈگری مل جائے تو کسی کا نقصان ہوگا نہ کسی کا حق مارا جائے گا۔

امتحان کی تاریخ سے ایک روز قبل میں لائل پور پہنچا۔ گھنٹہ گھر کے چوک میں ایک نیا ہوٹل کچھ عرصہ قبل کھلا تھا جس کے رہائشی کمروں اور کھانوں کی بہت تعریفیں سننے میں آئی تھیں، اس لیے میں اس ہوٹل میں کمرہ لینے کے لیے پہنچا اور ابھی ریسیپشن پر کھڑا اپنی باری آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ کہیں سے میرا دوست ناصر خالد آن ٹپکا، جو اس زمانے میں کسی فرم کا سفری ایجنٹ تھا۔ پتا چلا کہ وہ دو ماہ سے اس ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ اس کے پاس ایک کشادہ کمرہ تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ

ٹھیروں۔ اس نے ہوٹل کے ملازم سے اپنے کمرے میں میرے لیے ایک چارپائی ڈلوالی۔ مگر اس کے ساتھ ٹھیرنے میں یہ قباحت تھی کہ میں اس کی موجودگی میں کورس کی کتابیں نہیں پڑھ سکوں گا، جن کو میں پرچہ دینے سے پہلے ایک نظر دیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ناصر کو بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں وہاں پر یوسف کی نیابت میں امتحان دینے کے لیے آیا ہوں۔ اس دوران میں ناصر نے اگلے روز کے لیے سیر و تفریح کا پروگرام بنانا شروع کر دیا تھا جب کہ مجھے صبح سات بجے پرچہ دینے کے لیے امتحان کے سنٹر میں پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے چھ بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر اور ناصر سے پیچھا چھڑا کر ہوٹل سے نکل جانا ہو گا۔ مجھے پتا تھا کہ اتنی صبح اٹھنے اور اکیلے باہر نکل جانے کے لیے مجھے کوئی کہانی گھڑنی ہو گی تاکہ ناصر کے دل میں شبہے کا بیج نہ پڑے۔

شام کے کھانے تک میری کہانی تشکیل پا چکی تھی۔ میں نے ناصر کو رازدارانہ انداز میں بتایا کہ میرے لائل پور آنے کا سبب یہ ہے کہ وہاں کی ایک فیملی کے ہاں میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک ہفتے کے لیے لائل پور آنے کو کہا ہے تاکہ وہ مجھے اچھی طرح پرکھ سکیں اور میں بھی لڑکی کے بارے میں رائے قایم کر سکوں۔ چونکہ بات ابھی ابتدائی مرحلے پر ہے اس لیے میں نے ان کے گھر پر ٹھیرنے کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ ان کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں ایک ہوٹل میں ٹھیروں۔ البتہ ان کے ساتھ یہ طے ہوا ہے کہ مجھے صبح کا ناشتہ ان کے ہاں کرنا ہو گا اور دوپہر تک وہاں پر ٹھیرنا ہو گا۔ اس کے بعد میں بیشک اپنے ہوٹل میں چلا جایا کروں۔ اس پر ناصر نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو اس کو کوئی اعتراض نہیں۔ ناشتہ میں بے شک اس فیملی کے ہاں جا کر کیا کروں مگر دوپہر اور شام کا کھانا مجھے اس کے ساتھ کھانا ہو گا۔ اس طرح یہ مشکل مرحلہ طے ہو گیا اور میں اگلے روز سویرے سویرے ناشتہ کیے بغیر ہوٹل سے نکل گیا۔ ناشتہ راستے میں پڑنے والے ایک ریستوراں میں کیا گیا۔

میں پہلا پرچہ دینے کے بعد ہوٹل میں واپس لوٹا تو وہاں پر قاضی نعیم الدین آیا بیٹھا تھا۔ اس کو بھی ناصر خالد نے اپنے کشادہ کمرے میں ٹھیرا لیا تھا۔ اس کو بھی وہی کہانی سنائی گئی مگر وہ اصرار کرنے لگا کہ وہ اس فیملی کے گھر تک میرے ساتھ جائے گا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ بمشکل تمام اس کو فلم دکھانے کا لالچ دے کر اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح مجھے امید تھی کہ وہ لیٹ شو دیکھنے کے بعد صبح اتنی جلدی بیدار نہیں ہو گا، مگر اس کا یہ مطلب تھا کہ جب تک وہ لائل پور میں ٹھیرے گا مجھے بھی ہر روز اس کے ساتھ فلم دیکھنی ہو گی۔ پورا ہفتہ ہم لوگ فلم ختم ہونے کے بعد رات کے ایک دو بجے سے پہلے ہوٹل میں واپس نہ لوٹتے تھے اور اگلی صبح مجھے پرچہ دینا ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا، جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ پرچے ٹھیک ہو گئے تھے۔ میں نے یونہی مذاق میں یوسف کو کہہ دیا

کہ وہ کہیں یونیورسٹی میں اول نہ آجائے۔اس پر یوسف دوسرے ہی روز فوٹو بنوانے کے لیے لاہور چلا گیا تاکہ نتیجہ نکلنے پر اخبارات کو اپنی تصویر چھاپنے کے لیے مہیا کر سکے۔ وہ اوّل تو نہ آسکا مگر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔جب اس کے باپ نے، جو پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا، بیٹے کی لیاقت دیکھی تو اس نے اسے لاء کالج لاہور میں داخل کرادیا۔بدقسمتی سے وہاں پر یوسف کو مجھ جیسا کوئی دوسرا بے وقوف نہ مل سکا جو اس کے لیے امتحان دیتا اس لیے دو برسوں تک وقت ضایع کرنے کے بعد اس نے حبیب بنک میں ملازمت اختیار کرلی۔ میں برسوں کے بعد ایک بار پاکستان گیا تو وہ راولپنڈی میں ایک برانچ آفس کا منیجر تھا۔اس کی شادی بھی ہوگئی تھی اور وہ دو بچوں کا باپ تھا۔گویا اس کی زندگی سنور گئی تھی مگر مجھے پتا ہے کہ میں نے اس کی جگہ پر امتحان دے کر ایک ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا، جس پر میں آج تک شرمندہ ہوں۔مگر اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ جوانی کے بارے جو کہا جاتا ہے کہ وہ اندھی ہوتی ہے، وہ درست ہے۔یہی نہیں وہ بیوقوف بھی ہوتی ہے اور ناعاقبت آشنا۔

میرے شب و روز

ہوسٹل میں قیام کے دنوں کی ایک اور دوستی کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ ہر رات کو عین دس بجے میری کھڑکی پر دستک ہوتی تھی اور میں کتابیں ٹھپ کر گیٹ کی طرف چل دیتا تھا، جہاں پر مرزا خلیل احمد میرے انتظار میں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے صاحبزادے اور حکیم مولوی نورالدین خلیفہ اول کے نواسے تھے۔ان کا گھر ہوسٹل کے بالمقابل تھا اور وہ اپنے گھر کی کھڑکی میں سے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔انھیں پتا تھا کہ میں سارا دن کتابوں میں غرق رہتا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ وہ مجھے ایک دو گھنٹوں کے لیے کتابوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے آتے ہیں، مگر حقیقت اس سے تھوڑی مختلف تھی۔ میں جانتا تھا کہ راتوں کی مٹر گشت مرزا خلیل احمد کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ سارا دن اپنے گھر میں گھسے خدا جانے کیا کرتے رہتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی دن کے وقت کہیں پر آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ان کو نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں دیکھا ہو، جو ان کے گھر کے پہلو میں واقع تھی۔ان کے کمرے کی کھڑکی کے پردے دن چڑھے تک بند رہتے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ گیارہ بارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کرتے تھے۔ایک دو بار وہ دوپہر کے وقت سونے کے لباس میں ملبوس مجھ سے چائے کی پتّی مانگنے کے لیے آئے تھے جو ان کے گھر میں ختم ہوگئی تھی اور نوکر بازار سے لانا بھول گیا تھا۔ان کے اس طرح گھر میں بند ہو کر رہنے کے پیچھے یہ چیز پوشیدہ تھی کہ

ان کی بیوی نے ، جو ان کے چچا مرزا بشیر احمد کی بیٹی تھی، خلع لے لی تھی۔ وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی تھی کہ ان کا رشتہ لاولدر رہا تھا۔ ان کی بیوی ہر قیمت پر بچے جننا چاہتی تھی۔ اس کی دوسری شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی اور وہ صاحبِ اولاد بنی تھی۔ اس چیز نے مرزا خلیل احمد کی خودداری پر ایسا گہرا زخم لگایا تھا کہ وہ اس کے بعد کسی راہب کی طرح گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ صرف رات کے وقت باہر نکلتے تھے اور ربوہ کی سنسان گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ عام طور سے ربوہ کے باسی عشاء کی نماز کے بعد بہت جلد سو جاتے تھے کیونکہ ان کو سحری کے وقت اٹھنا ہوتا تھا۔ صرف مرزا خلیل احمد جیسے راہب اور مجھ جیسے پڑھاکو راتوں کو ہوا کھانے کے لیے باہر نکلتے تھے۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ مرزا خلیل احمد کی بڑی بہن امۃ القیوم ان کی سابقہ بیوی کے بڑے بھائی ایم ایم احمد (مرزا مظفر احمد) کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی اور ان کا رشتہ بھی لاولدر رہا تھا۔ ان کو بھی یقیناً اس بات کا رنج ہوگا مگر ان کے بارے میں سننے میں نہ آیا کہ وہ اس وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بابت سوچ رہے ہیں۔

عبدالمنان عمر، جن کو خلافت سے دور رکھنا مقصود تھا، وہ مرزا خلیل احمد کے، جو اس زمانے میں اپنی دوسری بہن امۃ الرشید زوجہ میاں عبدالرحیم احمد (وکیل التعلیم) کے ساتھ رہتے تھے، ماموں تھے۔ عبدالمنان عمر کی بہن امۃ الحیٔ کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے خلیفہ بنتے ہی اس لیے شادی کی تھی کہ اس طرح ان کا خلافت پر دعویٰ مضبوط ہوتا تھا۔ وہ اگر ایک طرف بانیِ جماعتِ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کے فرزند تھے تو دوسری طرف خلیفہ اوّل حکیم مولوی نورالدین کے داماد بھی تھے۔

ہماری شبینہ سیر و سیاحت کا آخری اڈہ گول بازار کا ایک چائے خانہ تھا، جو ہمارے انتظار میں آدھی رات تک کھلا رہتا تھا۔ جب ہم چائے پی کر اٹھتے تھے تو خواجہ عبداللہ دکان بند کر دیتا تھا۔ مرزا خلیل احمد کے گھر کے آس پاس ہمیں اکثر پراسرار افراد نظر آیا کرتے تھے، جن کو وہ نظارت امورِ عامہ کے ''لونڈے'' کا نام دیتے تھے۔ یہ لوگ ساری رات ان کے گھر پر پہرہ دیتے تھے، کیونکہ ''قصرِ خلافت'' کو شبہ تھا کہ رات کے اندھیرے میں عبدالمنان عمر اپنے بھانجے اور اس کی بہن سے ملنے کے لیے آتے ہوں گے۔ عام طور سے مرزا خلیل احمد بہت محتاط تھے مگر میرے سامنے کبھی کبھی وہ اپنے رنج و غصے کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ ہماری سیر کے راستے میں نواب محمد احمد (مرزا بشیر الدین محمود احمد کی بہن مبارکہ بیگم کا بیٹا) کا بنگلہ آتا تھا جہاں پر ''خاندانِ نبوت'' کے لڑکے لڑکیاں مل کر موسیقی سنتے اور ڈانس کیا کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں یہ بنگلہ بیرونی چار دیواری کے بغیر تھا، اس لیے جو کوئی وہاں سے گزرتا تھا وہ ان لوگوں کو رنگ رلیاں مناتے اور ہلڑ بازی کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

ان دنوں ربوہ میں ایک رپورٹ نے بہت ہلچل مچا رکھی تھی جو کسی نے لندن کے سفر سے واپسی

پر لکھی اور مرزا بشیر الدین محمود احمد کو بھیج دی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ انکا صاحبزادہ مرزا طاہر احمد، جو آگے چل کر خلیفہ المسیح الرابع بنا، اور اسکا ساتھی میر محمود احمد ناصر مسجد فضل لندن کے فلیٹ میں راتوں کو پارٹیاں دیتے ہیں، جن میں موسیقی سنی جاتی ہے، شراب چلتی ہے اور لڑکے لڑکیاں مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفتیش کی خاطر ایک کمیشن بٹھایا گیا، جس نے تمام الزامات کو غلط قرار دیا اور دونوں صاحبزادگان کو بری کر دیا۔ میں نے مرزا خلیل احمد سے پوچھا کہ وہ اپنے والدِ ماجد کے ساتھ لندن جانے والے گروپ میں شامل تھے اور وہاں کے حالات سے خوب واقف ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رپورٹ بالکل بے بنیاد ہے؟ اس پر انھوں نے جواب دیا: تم ہر روز میرے ساتھ نواب محمد احمد کے بنگلے میں منائی جانے والی رنگ رلیاں دیکھتے ہو، کیا تم تصور نہیں کر سکتے کہ طاری (مرزا طاہر احمد کا گھریلو نام) لندن میں عیش نہیں کرتا ہوگا۔ اس بات کی تصدیق چند برس ہوئے مرزا طاہر احمد نے خود کر دی۔ انھوں نے ایک مجلس میں، جو احمدیہ ٹیلی ویژن پر ساری دنیا میں دیکھی گئی، بیان کیا کہ جب وہ طالب علمی کے زمانے میں لندن میں مقیم تھے تو اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ پوری پوری رات جاری رہنے والی مجلسوں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ جو کوئی یورپ کے حالات سے واقف ہے اس کو پتا ہے کہ یہ رات رات بھر جاری رہنے والی مجلسیں شبینہ پارٹیاں ہوتی ہیں، جنمیں موسیقی بجائی جاتی ہے، شراب پانی کی طرح بہتی ہے اور ڈانس ہوتا ہے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ مرزا طاہر احمد اور میر محمود احمد لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مرزا خلیل احمد نے اس بارے میں مجھے اس وقت کہہ دیا تھا: یہ لوگ وہاں پر عیش کر رہے ہیں اور تم دیکھ لوگے کہ وہ بی اے کی ڈگری بھی لیکر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اوپر والی محفل میں مرزا طاہر احمد نے خود بیان فرمایا تھا کہ وہ درسی تعلیم سے زیادہ معاشرتی مطالعے میں دلچسپی رکھتے تھے اس لیے کلاسیں اٹنڈ نہیں کرتے تھے بلکہ یورپ کی سیر و سیاحت کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

میرا واسطہ ''خاندانِ نبوت'' کے بعض نوجوانوں سے بھی پڑتا تھا، جو ہم جیسے عامیوں کے سامنے بہت محتاط رہتے تھے۔ مرزا رفیق احمد کے ساتھ میں مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں ''قصرِ خلافت'' میں بھی جاتا رہا۔ پھر جب میں نے بی اے میں پولیٹیکل سائنس کا مضمون چنا تو مجھے اس مشکل کا سامنا کرنا پڑا کہ میں نے اس مضمون کا ایک بھی لیکچر نہیں سنا تھا۔ میرا علم سارے کا سارا کتابوں کے مطالعے پر مبنی تھا۔ اس بات کا ذکر میں نے مرزا حنیف احمد سے کیا تو انھوں نے کہا: میں تمھارا تعارف مرزا غلام احمد (ابنِ مرزا عزیز احمد) سے کرادوں گا۔ اس کا بھی یہی مضمون ہے اور اس نے بھائی جان مرزا ناصر احمد کے لیکچر سن رکھے ہیں۔ اس کے پاس ان لیکچروں کے نوٹس ہوں گے۔ میں نے اس وقت تک اس

مضمون پر ربوہ کی لائبریریوں میں ملنے والی ساری کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ البتہ ایک کتاب کی بہت تعریف سنی تھی، جو کسی کے پاس نہیں تھی۔ مرزا حنیف احمد نے کہا: یہ کتاب اکمل برادرز میں موجود ہے۔ تم جا کر میرے حساب میں لے لو اور امتحان دینے کے بعد مجھے واپس لوٹا دینا۔ اس طرح وہ آخری کتاب مرزا حنیف احمد کی مہربانی سے میرے مطالعے میں آئی۔ مرزا غلام احمد کے گھر پر چار دوستوں کے ساتھ مل کر ہم نے چند راتوں میں سارے کورس کو دہرایا۔ البتہ پینے کے لیے ہمیں ساری رات کڑک چائے ملتی رہی۔ پھر جب بی اے کا نتیجہ نکلا تو سب یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ میرے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی اور میرے اور اس سال یونیورسٹی میں اوّل آنے والے کے درمیان صرف بیس نمبروں کا فرق تھا۔ بعد میں یوسف ایاز نے میرے نمبر پنجاب یونیورسٹی سے نکلوائے تو پتا چلا کہ میں پولیٹیکل سائنس اور عربی دونوں مضمونوں میں یونیورسٹی میں اوّل آیا تھا، مگر چونکہ میں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے امتحان دیا تھا اس لیے مجھے وظیفہ نہیں مل سکتا تھا۔

جب میری بی اے میں کامیابی کی خبر مرزا بشیر احمد تک پہنچی، تو انھوں نے مجھے ایک خط لکھ کر مبارک باد دی اور لکھا: اب آپ کسی اسکول یا لائبریری میں اپنا نام لکھوا کر ایم اے کا امتحان دیں۔ مرزا بشیر احمد کے ساتھ میرا تعارف پرویز پروازی نے کرایا تھا۔ وہ ان کے پاس باقاعدگی سے جایا کرتا تھا اور ان کی ڈاک کی نکاسی کے سلسلے میں مدد کرتا تھا۔ چونکہ وہ خود اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے کرنے کے لیے جا رہا تھا اس لیے اس نے میرا تعارف مرزا بشیر احمد سے کرا دیا۔ اب اس کی جگہ پر میں ان کی ڈاک کی نکاسی کی خدمت بجا لانے لگا۔ اس کا طریق یہ تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں خطوط کا جواب بولتے جاتے تھے، جو میں ساتھ کے ساتھ لکھتا اور ان کے دستخطوں کے لیے سامنے رکھتا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اگر ایم اے عربی یا اسلامیات کرنا چاہوں تو مجھے اس میں آسانی رہے گی کیونکہ میں مولوی فاضل کر چکا تھا اور ان مضامین میں اچھی خاصی مہارت رکھتا تھا۔ مگر ربوہ کی خلافت لائبریری کے انچارج مولوی محمد صدیق خود اس زمانے میں ایم اے کا امتحان دینا چاہتے تھے اس لیے ان کو تیار نہ کیا جا سکتا تھا کہ میرا نام بطور معاون لائبریری درج کرلیں۔ رہا تعلیم الاسلام ہائی اسکول ربوہ، تو وہاں پر مرزا طاہر احمد اور میر مسعود احمد کے نام بطور ٹیچر درج ہو چکے تھے۔ دونوں بی اے کا امتحان دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر محمد ابراہیم جمونی کو مزید ایک استاد کا نام درج کرنے پر اعتراض تھا، جو اسکول میں نہیں پڑھاتا۔ یوں بھی میں ان کے لیے غیر اہم آدمی تھا۔ اگر میرا تعلق ''خاندانِ نبوت'' سے ہوتا تو بات دوسری تھی۔ اس لیے مجھے کوئی متبادل طریق اختیار کرنا تھا۔

جب بی اے کا نتیجہ نکلا تو میں راولپنڈی گیا ہوا تھا۔ وہاں پر قیام کے دوران ایک روز

میں جماعتِ احمدیہ کے مقامی مبلّغ مولوی دین محمد اور ایک دوسرے دوست نذیر احمد کے ساتھ شام کے وقت کمپنی باغ میں سیر کے لیے گیا، تو ایک شخص نے مولوی دین محمد کو سلام کیا اور پوچھا کہ وہ کب قاضیاں کے اسکول میں اپنی ڈیوٹی بطور ٹیچر شروع کر رہے ہیں۔ میرے لیے یہ خبر نئی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ مولوی دین محمد کو ایم اے کا امتحان دینے کی خاطر نو ماہ کے لیے مبلّغی سے چھٹی مل گئی تھی۔ اس نے کہا تم کو بھی چھٹی مل سکتی ہے۔ رہی کسی اسکول میں تقرری تو اس کا بھی انتظام ہوسکتا ہے۔ انسپکٹر آف اسکولز کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ایک احمدی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس کے ذریعے ڈسٹرکٹ بورڈ کے کسی اسکول میں تمھاری تقرری کرا سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ اگلے روز مجھے اس شخص کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا کہ گوجر خان کے ایک قریبی گاؤں گلیانہ کے ہائی اسکول میں انگریزی کے ٹیچر کی اسامی خالی ہے۔ میں اس پر آپ کی تقرری کر دوں گا۔ اتفاقیہ طور پر اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک احمدی ہے، جو آپ کی طرح جامعہ احمدیہ کا پڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے تقرری کی چٹھی مل گئی۔

مجھے سوموار تک گلیانہ پہنچ کر انگریزی کے سابقہ استاد سے چارج لینے کی ہدایت تھی۔ میں اتوار کے روز دوپہر کے وقت راولپنڈی سے روانہ ہو کر نمازِ عصر کے لگ بھگ وہاں پر پہنچ گیا۔ تانگے والے نے مجھے اسکول کے سامنے اتار دیا، جو اس وقت بند تھا۔ اسکول کے بالمقابل ایک کریانے کی دکان کھلی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی رہائش گاہ کا پتا جاننا چاہا۔ بتایا گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول کے ایک کمرے میں رہتے ہیں، مگر اس وقت راولپنڈی گئے ہوے ہیں۔ وہ ہفتے کے روز اسکول میں چھٹی ہونے کے بعد چلے جاتے تھے اور اتوار کی شام کو واپس لوٹتے تھے۔ راولپنڈی میں ان کا کوئی ہم وطن دوست رہتا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ وہاں پر جایا کرتے ہیں۔ گویا مجھے شام تک ان کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اس لیے میں نے دکاندار سے پانی مانگا۔ وہ اٹھ کر دکان کے پیچھے اپنے گھر میں گیا اور تھوڑی دیر میں دودھ سے لبالب بھرا ہوا چھنّا لے کر حاضر ہوا۔ اس نے کہا آپ ہمارے گاؤں کے اسکول میں استاد لگ کر آئے ہیں اس لیے میں آپ کو پانی کی بجائے دودھ پینے کے لیے پیش کرتا ہوں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ گاؤں کا ایک دکاندار اپنے گاؤں میں آنے والے استاد کی اس طرح تعظیم کرے گا۔ اس نے کہا میری بیوی نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر ماسٹر صاحب کو بھوک لگ رہی ہے، تو وہ میرے لیے پراٹھا بنا کر بھیج سکتی ہے۔ میں نے تہِ دل سے میاں بیوی کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ دودھ پینے سے نہ صرف میری پیاس بجھ گئی ہے بلکہ بھوک کا بھی مداوا ہو گیا ہے۔

شام پڑنے تک ہیڈ ماسٹر فضل جلیل صاحب آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔

ان کے پاس اسکول کا ایک خاصا بڑا کمرہ تھا، جس میں دو بستر بچھے ہوے تھے۔ انھوں نے کہا: آپ جب تک چاہیں اس کمرے میں میرے ساتھ رہایش رکھ سکتے ہیں۔ وہ بھیرہ کے رہنے والے اور امریکہ کے پہلے احمدی مبلّغ ڈاکٹر مفتی محمد صادق صاحب کے عزیز تھے۔ انھیں کی وساطت سے انھوں نے قادیان میں جامعہ احمدیہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مولوی فاضل کرنے کے بعد انھوں نے میری طرح پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے بی اے کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے بی ٹی کی ڈگری لی اور عرصہِ دراز سے مفصلات میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں پہلے انگریزی ٹیچر رہے، پھر ہیڈ ماسٹر بنا دیے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے اسکول میں عربی کے ٹیچر مولوی نور الٰہی صاحب بھی جامعہ احمدیہ کے سابق طالب علم اور فاضل عربی ہیں۔ اگلے روز انھوں نے صبح کی اسمبلی میں میرا تعارف کرایا اور سابق استاد انگریزی سے چارج دلوایا، جن کے پاس اسکول کی لائبریری کا انتظام و انصرام بھی تھا۔ لائبریری کی جملہ کتابیں دو بکسوں میں بند تھیں اور لگتا تھا کہ کسی نے کبھی کوئی کتاب جاری نہ کرائی تھی۔

میرے اسکول جائن کرنے والے ہفتے کے اختتام پر گرما کی تعطیلات ہو رہی تھیں اس لیے میں وہاں سے سیدھا ربوے چلا گیا، جہاں سے میں عارضی چھٹی لے کر آیا ہوا تھا۔ وہاں پر میں نے کسی کو نہ بتایا کہ مجھے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی ہے البتہ خفیہ طور پر میں نے اس بارے میں معلومات لینی شروع کر دیں کہ اگر میں چند ماہ کے لیے چھٹی لینا چاہوں تو میری درخواست منظور کی جائے گی یا نہیں۔ پتا چلا کہ اس بارے میں کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جب میں نے قایم مقام وکیل التبشیر مولوی بشارت احمد بشیر سے بات کی، جن کے ساتھ میری بے تکلفی تھی (کیونکہ ان کی بیوی مجھے بچپن سے جانتی تھی، جب ان کا خاندان قادیان میں ہمارے ہمسائے میں مقیم رہا تھا، اس کی میری بہن نصیرہ کے ساتھ دوستی تھی اور ہم ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے) تو انھوں نے میری ہمت بڑھائی بلکہ کہا کہ وہ خود ذاتی طور پر مجھے چھٹی دلانے کی کوشش کریں گے اور بہت پر امید ہیں کہ ان کی بات مانی جائے گی۔ جب گلیانہ کے اسکول کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں تو انھوں نے کہا کہ تم اس مضمون کی درخواست لکھ کر دو اور جواب کا انتظار کرنے کے بغیر چلے جاؤ۔ میں تمھاری غیر حاضری میں تمھارا کیس لڑوں گا اور تم کو چھ سات ماہ کی چھٹی دلوا دوں گا البتہ تم وعدہ کرو کہ ایم اے کا امتحان دینے کے بعد واپس آ جاؤ گے۔

مجھے گلیانہ میں اسکول دوبارہ جائن کیے ابھی دو یا تین ہفتے ہوے ہوں گے کہ ابا جی کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ مجھے انجمن تحریکِ جدید نے یہ اطلاع دینے کے لیے تار بھیجی ہے کہ میری درخواست نامنظور کر دی گئی ہے اس لیے مجھے فوراً ربوہ لوٹنا ہوگا۔ ابا جی نے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ میں جماعت کے حکم کی نافرمانی کروں۔ ہیڈ ماسٹر فضل جلیل کا بھی یہی مشورہ تھا اس لیے مجھے مجبوراً محکمہِ تعلیم کو

استعفیٰ بھیجنا پڑا، جو منظور کر لیا گیا۔

ربوہ میں میری تقرری انجمن تحریکِ جدید کی وکالت دیوان میں ہوئی، جس کے سربراہ یوں تو حافظ عبدالسلام صاحب تھے مگر جملہ فیصلہ جات ان کے نائب وکیل میر مسعود احمد کرتے تھے۔ پتا چلا کہ میری درخواست کی نامنظوری میں ان کا ہاتھ تھا۔ موصوف اس سے قبل دو تین بار بی اے میں فیل ہو چکے تھے اور میری کامیابی ان کو بالکل نہ بھاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان سے پہلے ایم اے کر جاؤں۔ وہ مجھے اپنی نگرانی میں رکھ کر میری سرگرمیوں کو قابو میں رکھنا چاہتے تھے مگر وکالتِ دیوان میں میرے لیے یا دوسرے واقفینِ زندگی کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ ہم دفتر میں جاتے اور چھٹی ہونے تک گپیں ہانکتے رہتے تھے۔ ہر دو گھنٹوں کے بعد چائے آ جاتی تھی اور باری باری ہر کسی کو پیسٹریوں سے دوسروں کی ضیافت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے اس بات سے بہت الجھن ہوتی تھی مگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

پھر ایک دن راولپنڈی کے سابق امیرِ جماعتِ احمدیہ چوہدری احمد جان سرکاری نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد انجمن تحریکِ جدید کے وکیل المال بن کر ربوہ آ گئے۔ وہ مجھے پنڈی کے زمانے سے جانتے تھے۔ انھوں نے مجھے وکالتِ دیوان میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو سیدھے میرے پاس آئے اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ کسی سے پوچھے بھالے بغیر انھوں نے مجھے اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ مجھے صبح ٹھیک آٹھ بجے ان کے دفتر میں حاضر ہونا ہوتا تھا اور وہ نہایت سرعت کے ساتھ خطوط ڈکٹیٹ کراتے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر پچیس تیس خط لکھے جاتے تھے، جس کے بعد مجھے چھٹی مل جاتی تھی۔ یہ سلسلہ پانچ چھ ماہ تک چلتا رہا۔ پھر انھوں نے مجھے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ۱۹۳۴ء میں چلائی جانے والی ''تحریکِ جدید'' کے مطالبات میں سے مطالبہ ''سادہ زندگی'' کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کو کہا۔ جماعتِ احمدیہ کے اراکین کو تحریک کی گئی تھی کہ وہ اپنے اخراجات کو کم کرنے کی خاطر سادہ زندگی کو اپنائیں اور اس طرح جو رقم بچے گی وہ چندے میں دیں تاکہ بیرونی ممالک میں احمدی مشن کھولے جا سکیں۔

کتاب دو تین ہفتوں میں مکمل ہو گئی۔ چوہدری احمد جان نے اس پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا کہ اس کا پورا متن حافظ مختار احمد شاہجہان پوری کو سنایا جائے اور ان سے اس پر اصلاح لی جائے۔ حافظ صاحب امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے اور خود بھی ان کا شمار استادوں میں ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد ربوہ آ گئے تھے اور اپنے ایک عزیز عبدالباسط کے گھر پر فروکش تھے جو جامعۃ المبشرین کے ہوسٹل کے پہلو میں تھا۔ گویا وہ میرے ہمسائے میں رہتے تھے مگر میں اس وقت تک کبھی ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ میں نے جا کر ان سے عرض کیا کہ میں ایک کتاب کا مسودہ

ان کی خدمت میں برائے اصلاح پیش کرنے کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے کتاب کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد فرمایا: میں اس کو پڑھ نہیں سکتا۔ البتہ آپ ہر روز آ کر دو تین صفحے سنا دیا کریں تو میں اصلاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طرح چوہدری احمد جان کے لیے زود نویسی کے علاوہ میرے فرائض میں حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کتاب کا متن پڑھ کر سنانے کا اضافہ ہو گیا۔ البتہ اس کا یہ فایدہ ضرور ہوا کہ حافظ صاحب کتاب کی زبان کے ساتھ ساتھ میرا تلفظ بھی درست کرتے گئے۔ اس طرح مجھے حافظ صاحب کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی۔ البتہ جب کتاب چھپ کر آئی تو اس پر مصنف کا نام چوہدری احمد جان لکھا ہوا تھا۔

اس دوران میں سمیع اللہ قریشی بی ٹی کرنے کے بعد لاہور سے واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ امرتا پریتم کی کتاب ''نویں رت'' لایا تھا۔ اس نے ہمارے ادیب ٹولے کو جمع کیا اور کہا کہ اس کتاب میں ایک الہامی نظم ہے جس کو سننے کے لیے ہمیں اس کے ساتھ ربوہ سے باہر کسی ویرانے میں چلنا ہوگا۔ پھر جب اس نے ہمیں ''وارث شاہ'' سنانی شروع کی تو ہمیں یہ لگا کہ امرتا نے ہمارے دلوں میں برچھی گھونپ دی ہے، بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھے تو ہمارا صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں کِتے قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی ، توں لِکھ لِکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں ، تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ دردمنداں دیا دردیا ، اُٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں ، تے لہو دی بھری چناب

ہم نے یہ نظم اتنی بار پڑھی کہ ہمیں یاد ہو گئی۔ اس کا ایک حصہ مجھے اب تک ازبر ہے۔ اس نظم کے زیرِ اثر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں پنجابی میں بھی لکھنا چاہیے۔ سمیع اللہ قریشی نے تجویز پیش کی کہ گورمکھی رسم الخط سیکھا جائے۔ چنانچہ ہمیں ربوہ میں ایک استاد مل گئے، جنھوں نے جوانی میں سکھوں کے لیے تبلیغی لٹریچر پیدا کرنے کی خاطر گورمکھی لپی سیکھی تھی۔ ہم ان کے گھر پر اپنی درخواست لے کر حاضر ہوے۔ موصوف صدر انجمنِ احمدیہ کی ایک کلیدی پوسٹ پر فائز تھے اور بے حد مصروف شخصیت تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ہمیں وقت دینے کی حامی بھر لی۔ مگر بدقسمتی سے ایک دو بار سے زیادہ اسباق نہ دے سکے، جس کے سبب ہماری دلچسپی میں کمی آ گئی۔ صرف سمیع اللہ قریشی نے پنجابی ادب کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوطی سے باندھے رکھا۔ اس نے پنجابی میں بھی ایم اے کیا اور اس وقت سے پنجابی میں شعر کہتا اور

تنقیدی مضامین لکھتا آیا ہے۔ اس کے پنجابی مضامین کی کتاب ''لیکھے جوکھے''، جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور نے چھاپا ہے، مجھے انھی دنوں میں ملی ہے اور میں ہجے کر کے اسے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے اس زمانے میں، جب ہم سب نے پنجابی میں لکھنے کا ارادہ باندھا تھا، اس زبان میں دو افسانے بھی لکھے تھے جو ''امروز'' کے پنجابی صفحے پر چھپے تھے اور مجھے ان کا معاوضہ ملا تھا مگر پنجابی لکھنے پڑھنے کی مشق نہ ہونے کے سبب مجھ سے خود نہ پڑھے جاتے تھے۔ اس کے بعد میں نے پنجابی میں لکھنا چھوڑ دیا، جس پر اب پچھتاتا ہوں۔ مجھے ایک بار دہلی میں امرتا پریتم کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح اس کی نظم نے ہم سب میں پنجابی ادب کے لیے محبت پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے بتایا کہ فیض صاحب نے اسے کہا تھا کہ جب تمھاری نظم لاہور میں پہنچی تو اس شہر کے ادیب وشاعر اس کو پڑھتے اور روتے تھے۔

ہمارے ادیب ٹولے نے ربوہ میں ایک ادبی انجمن ''بزمِ خیال'' بنائی تھی، جسکے اجلاس کچھ عرصے تک باقاعدگی کے ساتھ ہوتے رہے۔ حلقہ اربابِ ذوق کی طرح ''بزمِ خیال'' میں نظم ونثر کے ادب پارے پیش کیے جاتے تھے اور ان پر کھل کر تنقید ہوتی تھی۔ اسکے اجلاسوں میں بہت سے غیر ادیب لوگ بھی شامل ہوتے تھے، جو خود تو کچھ نہیں لکھتے تھے مگر ادب نواز تھے۔ ہمارے لیے بہت خوش کن امر یہ تھا کہ مبشر احمد راجیکی بھی، جو اردو اور فارسی کے استاد شعراء میں شمار ہوتے تھے، ہماری محفلوں میں شمولیت کرنے لگے تھے۔ مگر ان پر اخلاص کا دورہ پڑا اور وہ ''وقفِ جدید'' کی تحریک میں شامل ہو کر مانسہرہ کے مربی بن کر چلے گئے۔ اس تحریک کا مقصد پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں تبلیغِ احمدیت کا جال پھیلانا تھا۔ میں اور سمیع اللہ قریشی ایک بار انکو ملنے کے لیے مانسہرہ بھی گئے تھے، جہاں پر وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو اس قصبے میں شاعروں کی محفل میسر نہ تھی اس لیے بہت جلد وہاں کی زندگی سے بیزار ہو کر ربوہ واپس لوٹ آئے تھے مگر اس دوران میں ہماری محفلیں ٹوٹنے لگی تھیں۔ سمیع اللہ قریشی بہاول نگر کے کالج میں لیکچرر بن کر چلا گیا تھا۔ پروازی البتہ لاہور سے لوٹ آیا تھا اور تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں اردو پڑھانے پر متعین ہوا تھا۔

میرے بارے میں یہ افواہ گرم تھی کہ مجھے بہت جلد کسی بیرونی ملک میں مبلّغ بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ لاٹری کس ملک کے نام پر پڑے گی۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ مجھے کینیا بھیجا جائے گا، جہاں سے میرے لیے ویزا منگوایا جا رہا تھا۔ پھر اچانک جرمن مشن میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمبرگ مشن کے نائب مبلّغ مرزا لطف الرحمٰن کی تبدیلی ٹوگو کر دی گئی اور ان کی جگہ پر میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ البتہ اس وقت تک میرا پاسپورٹ نہیں بنا تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ بننے پر ایک ڈیڑھ

سال لگ جاتے تھے اور عام طور سے رشوت دینی پڑتی تھی۔ جب نائب وکیل التبشیر حسن محمد خان عارف، جن کے سپرد پاسپورٹ بنوانے کی ذمے داری تھی، پاسپورٹ فارم پر میرے کوائف لکھنے بیٹھے تو میں نے ان سے کہا کہ میرے عزیز وزارتِ خارجہ میں ملازم ہیں، اس لیے اگر مجھے ایک ماہ کے لیے کراچی بھیج دیا جائے تو میں وہاں پر آسانی کے ساتھ پاسپورٹ بنوا سکتا ہوں۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوے اور ان کی سفارش پر مجھے ایک ماہ کے لیے کراچی جانے کی اجازت مل گئی۔

کراچی میں میرا استقبال میرے پھوپھی زاد بھائی محمد عظیم خالد نے کیا جو دو کمروں کے ایک مختصر سے فلیٹ میں اپنی ملائن بیوی اور والدہ کے ساتھ مقیم تھے۔ مجھے پتا تھا کہ پھوپھی ایمنہ ایک عرصے سے دنیا جہان سے تعلق توڑ چکی تھیں اور اپنے خیالات میں گم رہتی تھیں۔ مگر مجھے انھوں نے پہچان لیا اور بوسہ دیا۔ بیٹے نے پوچھا: بے جی آپ کس کو بوسہ دے رہی ہیں؟ پھوپھی نے کہا: لالہ عبدالرؤف کے بیٹے منیر کو۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پھوپھی جان کے ہوش و حواس درست ہیں جب کہ ایک زمانے میں وہ اپنے بیٹے کے سوا کسی کو نہیں پہچانتی تھیں۔ بھائی جان عظیم کو جب پہلے پہل کراچی میں ملازمت ملی تو ان کو یہ چیز نہ بھاتی تھی کہ ماں گاؤں میں اکیلی رہے۔ پھوپھا فضل الٰہی نے اپنی بیوی کو شروع سے گاؤں میں رکھا تھا۔ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ پہلی بار سات برسوں کے بعد کراچی سے واپس لوٹے تھے۔ اس دوران میں ان کا بیٹا چھ برس کا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ سالوں تک خبر نہیں دیتے تھے، جس کے نتیجے میں پھوپھی نے اپنی ساری جوانی ان کی راہ تکتے ہوے گزار دی تھی۔ بھائی جان عظیم نے ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کا عزم کر رکھا تھا، اس لیے نوکری ملتے ہی ماں کو کراچی لے گئے۔ مگر انھوں نے ایک چیز کو ملحوظ نہ رکھا تھا۔ گاؤں میں پھوپھی اپنے جانے پہچانے ماحول میں رہتی تھیں، جہاں پر ان کے آس پاس رشتے دار بستے تھے، جن کی موجودگی کے سبب انھوں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کیا تھا۔ کراچی میں ان کا جاننے والا کوئی نہیں تھا اس لیے جب بیٹا نوکری پر چلا جاتا تھا تو وہ سارا دن اس کی سلامت واپسی کی راہ تکتے ہوے گزارتی تھیں۔ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھتے تھے۔ کون جانے اس کو راستے میں کیا حادثہ پیش آ جائے۔ جب تک وہ واپس گھر نہ لوٹتا تھا ان کی جان عذاب میں مبتلا رہتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ماں بیٹے کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ مہینوں تک جاری رہنے والے اندرونی کرب کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھوپھی کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ ان کو ہر طرف دشمن نظر آنے لگے، جو ان کے بیٹے کی جان لینے کو پھرتے تھے۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا تو بھائی جان عظیم ماں کو آبائی گاؤں چنگا بنگیال چھوڑ آئے، جہاں پر رشتے داروں نے پھوپھی کی دیکھ بھال کی ذمے داری اٹھائی۔ وہاں پر ان کی صحت کچھ ٹھیک ہوئی مگر دماغی بیماری سے نجات

نہ مل سکی۔ برسوں کے بعد بھائی عظیم پھر ماں کو اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے۔اس دوران میں انھوں نے ملایا کی رہنے والی ایک عورت سے شادی کر لی تھی، جوان کی ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار تھی۔

دوسری طرف پھوپھا فضل الٰہی پنشن پانے کے بعد کچھ برسوں سے ربوہ میں مقیم تھے، جہاں پر انھوں نے تین مکان خرید لیے تھے۔ چونکہ ان کا رشتہ پھوپھی ایمنہ کے ساتھ بس نام کا رہ گیا تھا اس لیے انھوں نے ماموں احمد خان نسیم کی وساطت سے جھنگ مگھیانہ کی ایک مطلقہ عورت کے ساتھ دوسری شادی کر لی تھی۔ چونکہ ان کو خطرہ تھا کہ اباجی کو اس شادی پر اعتراض ہو گا اس لیے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ جھنگ مگھیانہ چلنے کے لیے تیار کیا تھا تاکہ میں نکاح پڑھے جانے والی محفل میں موجود ہوں۔تاکہ اگر لالہ عبدالروف اعتراض کریں تو کہا جا سکے کہ آپ کا بیٹا نکاح پڑھائے جانے کے وقت محفل میں موجود تھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر جب شاہد کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے ہوسٹل کا کمرہ خالی کرنا تھا تو انھوں نے مجھے اپنے گھر کے ایک کمرے کی پیشکش کی۔ پھوپھا فضل الٰہی کی دوسری بیوی ستاں نے مجھے کراچی کے لیے روانگی کے موقعے پر خاص طور پر کہا تھا کہ پھوپھی کو اپنے ساتھ لیتا آؤں۔ وہ ان کو اپنے پاس رکھنا اور ان کی خدمت کرنا چاہتی تھیں۔ بھائی جان عظیم نے کہا کہ وہ خود ربوہ آ کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہاں کا ماحول ان کی ماں کے لیے سازگار رہے یا نہیں۔

جب ہم پاسپورٹ کے لیے فارم پُر کرنے بیٹھے تو پتا چلا کہ میں میٹرک کی سند اپنے ساتھ لانا بھول گیا تھا جو پاکستان میں برتھ سرٹیفکیٹ کا کام دیتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس پر میری تاریخِ پیدایش غلط لکھی ہوئی ہے۔ تاریخ مجھے یاد تھی مگر مہینے کے بارے میں اشتباہ تھا۔ اس لیے اٹکل سے ہم نے ۳۰ جولائی ۱۹۳۶ء کا اندراج کیا جب کہ سند پر ۳۰ اگست ۱۹۳۶ء لکھا ہوا ہے۔ مجھے بعد میں برسوں کے بعد بون میں پاکستانی سفارت خانے سے اپنی تاریخِ پیدایش درست کرانی پڑی۔ اگرچہ وہ بھی درست نہ تھی البتہ اب میرے پاسپورٹ اور تعلیمی ریکارڈ میں ایک ہی تاریخ درج تھی۔ مجھے پتا تھا کہ دادا جان نے اپنی ڈائری میں اپنے بچوں کی اولاد کی تاریخ ہائے پیدایش درج کر رکھی تھیں۔ اس فہرست کے مطابق میری پیدایش ۲۲ نومبر ۱۹۳۴ء کی ہے۔ جب میں پنشن کی عمر کو پہنچا تو میں نے راولپنڈی کی میونسپل کمیٹی کا ریکارڈ نکلوا کے اپنی تاریخِ پیدایش درست کرا لی تھی۔ یہ کام میرے بھانجے نعمان عزیز کے ذریعے ہوا، جس نے بتایا کہ متعلقہ کلرک نے آٹھ سو روپے لے کر نہ صرف درست برتھ سرٹیفکیٹ بنا کر دیا بلکہ اس نے رجسٹر میں درج شدہ نام ''محمد یحییٰ'' کو مٹا کر میرا موجودہ نام ''منیر الدین احمد'' اس قدر صفائی کے ساتھ درج کیا کہ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ پہلے دوسرا نام لکھا ہوا تھا۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ نہ ملتا تو مجھے ایک سال اور آٹھ ماہ تک مزید کام کرنا پڑتا کیونکہ جرمنی میں ۶۵ سال کی عمر میں پنشن ملتی ہے۔

میں پاسپورٹ لے کر ربوہ پہنچا تو وہاں پر میری جرمنی میں تعیناتی کے بارے میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ غیر ممالک میں روانگی سے دو تین ماہ قبل مبلّغوں کو ایک تیاری الاؤنس ملتا ہے، تا کہ وہ مناسب کپڑے بنوالیں اور دوسری ضروری اشیاء خرید لیں، جن کی ان کو نئے مقام پر ضرورت پڑے گی۔ میں لاہور سے ایک سوٹ بنوانے کے علاوہ دو اچکنوں (سلیٹی اور کالی) کے لیے کپڑا خرید کر لے آیا۔ قمیصوں اور سفید شلواروں کے لیے آرڈر ربوہ کے ایک درزی کو دے دیا گیا مگر مجھے دونوں مقامات میں اچکنوں کو سینے کے لیے کوئی مناسب درزی نہ مل سکا۔ مجھے چونکہ اپنے خاندان سے رخصت ہونے کی خاطر راولپنڈی جانا تھا اس لیے سوچا کہ وہاں پر جا کر کوئی درزی تلاش کروں گا۔

ابھی میں ان کاموں میں لگا ہوا تھا کہ ایک روز اچانک بھائی جان عظیم اپنی ماں سمیت ربوہ میں آ نکلے۔ وہ بھی اپنے باپ کی نئی بیوی ستاں کے حسنِ اخلاق سے بے حد مرعوب ہوئے اور انھوں نے ماں کو وہاں پر چھوڑ جانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ میں راولپنڈی جا رہا تھا اس لیے وہ بھی میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کو اپنے گاؤں گئے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور چاہتے تھے کہ وہاں پر اپنے گھر بار پر نظر ڈالیں اور آبائی املاک کی دیکھ بھال کے لیے کوئی مستقل انتظام کریں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ چنگا بنگیال جانے کا ارادہ باندھا، جہاں پر مجھے اپنے قرابت داروں سے رخصت ہونے کے لیے یوں بھی جانا تھا مگر میں پہلے راولپنڈی جا کر اچکنوں کی سلائی کے لیے درزی تلاش کرنا چاہتا تھا

یہ کام میری توقع سے بڑھ کر آسان نکلا۔ روزنامہ ''تعمیر'' کے مدیر محمد فاضل سے میں نے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا: میں تمھیں اپنے درزی کے پاس لے چلتا ہوں۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتا۔ اس طرح ہم اسی روز پرانے قلعے پر دونوں اچکنیں سلنے کے لیے دے آئے۔ درزی نے کہا: آپ تین روز میں آ کر ٹرائی کرا لیں۔ اچکنیں آپ کو ایک ہفتے میں مل جائیں گی۔

مجھے دو قراقلی ٹوپیاں بھی بنوانی تھیں، جو راولپنڈی میں بہت عمدہ بنتی تھیں مگر مجھے پتا تھا کہ ٹوپیاں بنانے والے دھاندلی کرتے ہیں اس لیے میں نے مشہور کشمیری لیڈر خواجہ غلام نبی گلکار سے مدد چاہی۔ گلکار صاحب کے ساتھ میری راولپنڈی میں قیام کے زمانے سے دوستی تھی۔ ان کا تعارف یہ ہے کہ انھوں نے آزاد کشمیر حکومت قایم کی تھی اور اس کے پہلے صدر تھے مگر یہ اعلان کرنے کے بعد وہ سری نگر چلے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیری عوام ان کی حکومت کا خیر مقدم کریں گے، مگر ڈوگرا شاہی نے ان کو آتے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ حکام پر یہ امر نہ کھل سکا تھا کہ آزاد کشمیر کا صدر ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس لئے چنداں بعد ان کو قید سے رہائی مل گئی تھی۔ البتہ اس عرصے میں حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے لئے ایک نئی حکومت بنا لی تھی، جس کا صدر سردار محمد ابراہیم خان کو بنایا گیا تھا، جو گلکار

کے برعکس کشمیر کو پاکستان کا جزو بنانا چاہتے تھے، جب کہ گلکار کشمیر کو ایک آزاد ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ راولپنڈی میں قراقلی ٹوپیوں کا کاروبار کشمیریوں کے ہاتھ میں تھا۔ گلکار صاحب مجھے اپنے ایک دوست کی دکان پر لے گئے، جس نے تین روز کے اندر میری مطلوبہ سلیٹی اور کالی ٹوپیاں بنا دیں، جو سالہا سال تک میرے سر کی زینت رہیں اور جرمنی کا سرد موسم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

روزنامہ ''تعمیر'' کے مدیرِ انتظامی محمد صفدر کو جب پتا چلا کہ میں جرمنی جا رہا ہوں تو اس نے کہا: میں تم کو جرمنی میں ''تعمیر'' کا نمایندہ مقرر کرتا ہوں۔ اس کا تمھیں معاوضہ ملے گا۔ مگر تم جانتے ہو کہ ہم فارن کرنسی میں رقم ادا نہیں کر سکتے، اس لیے اگر تم چاہو تو ہم تمھارے والد صاحب کو ماہوار منی آرڈر کے ذریعے مقامی کرنسی میں رقم بھیج دیا کریں گے۔ تمھیں ہمارے لیے ہفتہ وار ''جرمنی نامہ'' لکھنا ہوگا۔ اس سے زیادہ کی ہم توقع نہیں رکھتے۔ تم پر اس کے علاوہ کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ چنانچہ اسی وقت میرے لیے ''تعمیر'' کے نمائندے کا شناختی کارڈ تیار کیا گیا، جس کی بنا پر میں نے جرمنی پہنچ کر غیر ملکی صحافیوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا تھا۔

اس زمانے میں جماعتِ احمدیہ راولپنڈی کے امیر میاں عطاء اللہ تھے، جو میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے اس لیے جب کبھی میں وہاں پر ہوتا تھا وہ میری تقریر اپنے جلسوں میں رکھا کرتے تھے۔ جب ان کو پتا چلا کہ میں تبلیغ کے لیے جرمنی جا رہا ہوں، تو وہ ایک روز مجھے مغرب کی نماز کے بعد اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہ مجھے اکثر نصیحت کیا کرتے تھے۔ ان کو بالخصوص یہ امر نہ بھاتا تھا کہ میں کہانیاں لکھتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں، اس لیے اس کام سے انسان کو بچنا چاہیے۔ وہ مجھے تبلیغ کرنے کے گر بتاتے رہے۔ جرمن قوم کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ قوم بہت جلد اسلام قبول کر لے گی۔ ان کے مقابلے میں اباجی کو اس بات کی تشویش تھی کہ میں ایک تقسیم شدہ ملک اور ایک شکست خوردہ قوم کے پاس جا رہا تھا، جسکے حصے بخرے کیے جا چکے ہیں۔ انھیں اس قوم کی نفسیاتی صحت مندی پر شبہ تھا اور یہ احساس تھا کہ اس معاشرے کے اندر پیدا ہونے والے مسایل کے نتیجے میں جرمنی میں زندگی کرنا بے حد دشوار ہوگا کیونکہ جرمن قوم دو جنگوں میں شکست کھانے کے بعد پارہ پارہ ہو چکی تھی اور اسکا حوصلہ گر چکا تھا اور اس قوم میں کجی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں مجھے جرمنی میں ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑے گا جسکی ذہنی حالت بہت دگرگوں ہے۔

راولپنڈی میں اپنے کاموں سے فارغ ہو کر میں چنگا بنگیال چلا گیا، جہاں پر بھائی عظیم اس دوران میں زمینداری کے انتظامات کر چکے تھے۔ اسی روز پچھلے پہر ہمیں پٹھوہار کے مشہور ڈاکو سجاول کا پیغام ملا کہ وہ ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا آبائی گاؤں کنیال ہمارے گاؤں کے پہلو میں ہے مگر ہمیں

پتا نہیں چل رہا تھا کہ اسے ہم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ پیغام لانے والے نے ہمیں عشاء کی نماز کے بعد تیار رہنے کے لیے کہا تھا۔ سجاول کا آدمی ہمیں لینے کے لیے آئے گا۔ اس ملاقات کا ذکر میرے افسانے "جیون خان" میں موجود ہے، جہاں سے یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

''عشاء کی اذان کے بعد، جب کہ خاصا اندھیرا پڑ چکا تھا، سجاول کا آدمی ہمیں لینے کے لیے آیا اور گاؤں کی گلیوں میں گھماتا پھراتا ہوا ایک حویلی میں لے گیا، جس کے دیوان خانے میں سجاول اپنا دربار لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اونچے قد کاٹھ کا ایک مضبوط آدمی تھا۔ میرے ساتھ وہ بہت توجہ اور دوستی سے پیش آیا۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا: کیا تمھیں پتا ہے کہ میں نے تمھاری اماں سے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا؟

میں اس بات سے واقف تھا۔ اماں نے ہمیں کئی بار سنایا تھا کہ جب میرے دادا جان نے اپنی حویلی میں بچیوں کو پڑھانے کے لیے مدرسہ کھولا، کیونکہ اس وقت تک لڑکیوں کی تعلیم کا ہمارے گاؤں میں کوئی انتظام نہ تھا، تو سجاول کی ماں اس کو اماں کے پاس لے کر آئی اور کہا: میرے بیٹے کو پہلی جماعت میں داخل کرلیں۔ اماں نے کہا: تم اس کو لڑکوں کے مدرسے میں کیوں داخل نہیں کراتی ہو؟

اس نے جواب دیا: میرا سجاول لڑکیوں کی طرح شرمیلا ہے۔ وہ لڑکوں کے ساتھ نہ چل سکے گا۔

پھر سجاول نے سنایا کہ ایک دفعہ اس کے ٹولے کے لوگوں نے ایک مکان میں سینڈھ لگانے کا ارادہ کیا، جس کے بارے میں انھیں پتا چلا تھا کہ وہاں پر عمدہ ترین کراکری، فرنیچر، قالین، گھڑیاں اور دوسرا سامان رہایش و آرایش بھرا پڑا ہے اور مالکانِ مکان خود شہر میں رہتے ہیں۔ سجاول کو ان لوگوں کا نام نہیں بتایا گیا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ مکان چنگا میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ لوگ ایک کھیتی میں داخل ہوئے، جس کے ساتھ ہماری حویلی کی بیرونی دیوار لگتی ہے، تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے مکان میں سینڈھ لگانا چاہتے ہیں۔ اس وقت تک دو تین ڈاکو دیوار کے اوپر چڑھ چکے تھے۔ سجاول نے بتایا کہ اس نے اپنا پستول نکال کر ان کی طرف تان کر کہا کہ فوراً دیوار سے نیچے اتر جاؤ۔ بدبختو، میں نے اس گھر میں آنکھوں کی روشنی پائی تھی، اس لیے میں اس گھر پر نہ تو خود ڈاکا ڈالوں گا اور نہ کسی اور کو ڈاکا ڈالنے دوں گا۔ یہ بات بہت جلد علاقے بھر میں پھیل گئی کہ سجاول نے چنگا کو اپنی امان میں لے لیا ہے۔ اس دن کے بعد جب تک سجاول زندہ رہا چنگا میں ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی۔''

سجاول نے بتایا کہ جب ایوب خان نے مارشل لاء لگایا، تو اس وقت وہ پولیس سے چھپتا پھرتا تھا۔ عین اس دن جب ملک میں ملٹری نقلاب برپا ہونے کی خبر آئی، وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ایک لاری میں بیٹھا ہوا سانگلا ہل کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے خبر سنتے ہی اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب ہمیں کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔ چلو واپس گوجر خان چلتے ہیں۔ اس کے تعلقات ملٹری افسروں کے ساتھ بہت

اچھے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے گاؤں میں آ کر کھلے بندوں رہنے لگا، بلکہ جب ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام چلایا، تو اس نے بھی انتخابات میں حصہ لیا تھا اور انتخابات میں جیت کر اپنے علاقے کا نمایندہ بنا تھا۔ اس وقت سے پولیس نے اس کے ساتھ تعرض نہ کیا تھا۔

آخرِ کار وہ اس بات کی طرف لوٹا، جسکی خاطر اس نے ہمیں بلایا تھا۔ اس نے کہا کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ ہوسکتا کہ کل کلاں کو پھر اس پر اور اس کے آدمیوں پر پاکستان کی دھرتی تنگ ہو جائے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اسکے پاس پاسپورٹ ہونے چاہییں تا کہ بوقتِ ضرورت وہ ملک کو چھوڑ کر مثلاً ایران کی طرف نکل جائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بھائی عظیم اس کے آدمیوں کے لیے پاسپورٹ بنوا کر دیں۔ راولپنڈی سے پاسپورٹ بنوانے میں بہت سی مشکلات تھیں مگر اسے یقین تھا کہ کراچی میں کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ سجاول کون ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ آیا بھائی عظیم نے اس کی خواہش کو پورا کر دیا تھا یا نہیں۔ میں نے کبھی ان سے اس بارے میں نہیں پوچھا۔

بھائی عظیم کے ذاتی ارادوں کا علم مجھے اس وقت ہوا جب انھوں نے چنگا سے روانگی کے وقت چچا غلام حسن سے کہا کہ ان کے لیے بڑے ماموں (عموجان عبدالرحمٰن خان) کی بیٹی خالدہ سے رشتے کی بات پکی کر لیں۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے کیونکہ خالدہ بچپن سے میری منسوبہ تھی۔ خالدہ کی طرح، جو اپنے ماں باپ کی واحد بیٹی تھی، میری بہن نصیرہ بھی ہماری اکیلی بہن تھی۔ اس کا رشتہ بچپن میں عموجان کی بیوی بے جی اقبال نے اپنے بڑے بیٹے بھائی جان عبدالمنان کے لیے مانگ لیا تھا۔ اس کے بدلے میں اس نے خود ہی تجویز کیا تھا کہ اس کی بیٹی خالدہ کی شادی میرے ساتھ ہو۔ یہ باقاعدہ منگنی تو نہ تھی مگر ہمارے خاندان میں یہ بات طے شدہ مانی جاتی تھی۔ البتہ کچھ برسوں سے ہمارے خاندان میں ناچاقی پیدا ہو گئی تھی، جس کے نتیجے میں کسی قسم کا جھگڑا تو کھڑا نہیں ہوا تھا، مگر یہ طے تھا کہ بھائی جان عبدالمنان کا رشتہ نصیرہ سے نہیں ہو گا۔ اور اگر انکا رشتہ نہ ہوا، تو واضح ہے، میرا رشتہ بھی خالدہ سے نہیں ہو سکے گا۔

قصور سارا بھائی جان کا اپنا تھا۔ وہ میٹرک کرنے کے بعد ایئر فورس میں ملازم ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے پر وہ کراچی میں تھے مگر جلد ہی ان کو ریلیز کر دیا گیا۔ انھوں نے عموجان کو لکھا کہ وہ کراچی میں پولیس کے محکمے میں منتقل ہو گئے ہیں اور ان کو سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کا عہدہ دیا گیا ہے۔ پھر وہ جلد ہی راولپنڈی منتقل ہو گئے جہاں پر، ان کے کہنے کے بموجب، ان کو کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کی سفارش پر ملٹری میں کمیشن دیا جائے گا۔ وہ کمیشن کے امتحان میں دو بار بیٹھے مگر دونوں بار فیل ہو گئے۔ اس کا ذمے دار وہ جنرل رضا کو ٹھیراتے تھے، جو بقول ان کے جنرل گریسی سے عداوت کی بنا پر ان کو پاس

نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جنرل گریسی کے بنگلے میں ہر روز جاتے ہیں اور ان کی آپس میں گہری دوستی ہے۔ یہ باتیں اتنی بے سروپا تھیں کہ اباجی نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر اچانک عمو جان کی وفات ہوگئی۔ سچی بات یہ تھی کہ بھائی جان بے روزگار تھے اور ان کا کہیں پر پاؤں نہیں ٹک رہا تھا۔ اگر انھوں نے اتنا بے محابا جھوٹ نہ بولا ہوتا تو اباجی ان کی مدد کرتے اور شاید نصیرہ سے شادی کی بات بھی خطرے میں نہ پڑتی۔ پھر ان کو واہ آرڈیننس فیکٹری میں ٹرانسپورٹ آفیسر کے عہدے پر ملازمت مل گئی مگر ان پر اباجی کو اعتبار نہیں رہا تھا۔ بھائی جان پہلے ایک بیوہ عورت کے کرایہ دار بن کر اس کے مکان پر رہنے لگے اور آہستہ آہستہ اس کے بچوں کے سرپرست بن گئے۔ آخرِ کار ان کی شادی سر سیّد پبلک اسکول برائے خواتین کی پرنسپل محمودہ کے ساتھ ہوگئی، جو ان کے ایرفورس کے زمانے کے ایک دوست کی ہمشیرہ تھیں۔ اس طرح ان کی کشتی کنارے لگ گئی مگر ہمارے خاندان کے اندر ہونے والے رشتے ٹوٹ گئے۔ نصیرہ کی شادی خاندان سے باہر البتہ اپنی برادری میں ہوگئی۔ بھائی جان سے ہمارا تعلق تھوڑا عرصہ منقطع رہنے کے بعد پھر قایم ہو گیا تھا۔ جب بھائی عظیم نے خالدہ سے شادی کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے سر پر سے بوجھ اٹھ جائے گا اس لیے میں نے اس تجویز کی مخالفت نہ کی۔ ان کا رشتہ ہوا اور دونوں نے خوش وخرم زندگی بسر کی۔

ہم ربوہ واپس لوٹے تو پتا چلا کہ بھائی عظیم کی غیر حاضری میں پھوپھی جان کی بیماری عود کر آئی تھی۔ پھوپھا فضل الٰہی نے کہا کہ وہ ان کی بات بالکل نہیں سنتی ہیں اور دن رات پریشانی کے عالم میں صحن میں گھومتی پھرتی ہیں اور اپنے بیٹے کو ڈھونڈتی ہیں۔ تم ان کو لاہور کے پاگل خانے میں چھوڑ آؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں پر ان کا علاج ہو سکے۔ ربوہ میں ان کے علاج معالجے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ بھائی عظیم چونکہ اپنی ملائن بیوی سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور وہ سنگاپور چلی گئی تھی اس لیے وہ ماں کو اپنے ساتھ کراچی نہیں لے جا سکتے تھے۔ پھر ان کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لاہور چلنے کے لیے تیار کیا۔ وہاں کے پاگل خانے میں ایک احمدی ڈاکٹر کام کرتا تھا، جس کا پتا ہمیں کسی ذریعے سے مل گیا تھا۔ اسے خط لکھ دیا گیا کہ ہم فلاں روز مریضہ کو لے کر آ رہے ہیں اور ان کی رائے جاننا چاہتے ہیں کہ ہمیں پھوپھی جان کو وہاں پر چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں۔ چونکہ ہمیں بہت سویرے آنے کو کہا گیا تھا اس لیے ہم شام کے وقت لاہور پہنچ گئے اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھوپھی جان کو پاگل خانے میں داخل کرا دیا جائے، اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ ہم پہلے اکیلے جا کر ڈاکٹر سے ملیں اور اس کی رائے معلوم کریں۔ اب سوال یہ تھا کہ پھوپھی جان کو کہاں پر چھوڑا جائے۔ میں لاہور کی ایک تاجر فیملی کو جانتا تھا، جن کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ہم ان کی دکان پر پہنچے، جس کے پیچھے ان کا

رہائشی مکان تھا۔ میرے دوست ارشد محمود کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہم پھوپھی جان کو دو تین گھنٹوں کے لیے ان کے ہاں چھوڑ جائیں۔

جب ہم پاگل خانے میں پہنچے تو احمدی ڈاکٹر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تمام کوائف سننے کے بعد کہا: مریضہ بالکل پاگل نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو یہاں پر چھوڑ گئے تو وہ ضرور پاگل ہو جائے گی اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ساتھ ربوہ واپس لے جائیں۔ مریضہ یوں بھی بے ضرر لگتی ہے، اس لیے کسی کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

ہم ان کا شکریہ ادا کر کے ارشد محمود کی دکان پر لوٹے اور اس کو بتایا کہ ہم پھوپھی جان کو پاگل خانے میں چھوڑنے کی بجائے اپنے ساتھ ربوہ لے جا رہے ہیں۔ ارشد کو یہ جان کر خوشی ہوئی مگر اس نے بتایا کہ ہماری غیر حاضری میں اس کے گھر میں اچھا خاصا ڈراما ہو گیا تھا۔ جب وہ پھوپھی جان کو اپنے گھر میں چھوڑ کر دکان پر آ گیا، تو پھوپھی جان نے اس کی چھوٹی بہن سے پوچھا کہ وہ لوگ کب سے اس پاگل خانے میں بند ہیں؟ بچی یہ بات سن کر ایسی ڈری کہ خوف کے مارے بیہوش ہو گئی۔

گویا ہماری کوشش کے باوجود، کہ پھوپھی جان کے سامنے پاگل خانے کا نام نہ لیا جائے، انکو سارا وقت معلوم تھا کہ ہم انکو پاگل خانے میں چھوڑنے کے لیے لاہور لائے ہیں۔ یہ جان کر ہمیں بے حد شرمندگی ہوئی، مگر انکو ربوہ واپس لے جاتے ہوئے ہمیں خوشی ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر نے ہمیں بروقت ایک غلط قدم اٹھانے سے روک دیا تھا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ پھوپھی ایمنہ نے مجھے اور اپنے بیٹے کو معاف کر دیا تھا یا نہیں البتہ اسکے بعد انھوں نے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ سارا دن بیٹھی ہوئی فضا میں گھورتی رہتی تھیں۔ کسی نے کچھ کھانے کے لیے سامنے رکھ دیا تو کھا لیا، نہ رکھا تو کبھی مطالبہ نہیں کرتی تھیں۔ ان کی وفات برسوں بعد میری پاکستان سے غیر حاضری کے دوران ہوئی۔

چونکہ میرے سفر کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے اپنی کتابیں محفوظ کرنے کی فکر تھی۔ میرے پاس دادا جان کی چھپی ہوئی کتابوں کے علاوہ ان کی ایک ایسی کتاب کا مسودہ تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ چھپی ہوئی کتابوں کی ایک ایک جلد میں نے ربوہ کی خلافت لائبریری میں جمع کرا دی تھی۔ باقی ماندہ کتابیں میں نے ماموں احمد خان نسیم کے گھر پر چھوڑیں، اس امید کے ساتھ کہ جب میں دو چار برسوں کے بعد واپس لوٹوں گا تو ان کو صحیح سالم پاؤں گا۔ مجھے کچھ خبر نہیں ہے کہ ان کتابوں کے ساتھ کیا بیتی۔ البتہ غیر مطبوعہ کتاب ''ہدایات الزوجین'' کا مسودہ میں نے چوہدری احمد جان کے سپرد کیا کہ جب وہ راولپنڈی جائیں گے تو اسے ابا جی کے حوالے کر دیں۔ مگر انھوں نے امانت میں خیانت کی اور اس نہایت اہم کتاب کا مسودہ ان کی لاپرواہی کے سبب تلف ہو گیا۔ میں برسوں کے بعد پاکستان گیا تو خاص

طور پر راولپنڈی میں ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ مجھے امید تھی کہ انھوں نے کتاب کا مسودہ سنبھال کر رکھا ہو گا، مگر پتا چلا کہ انھوں نے کتاب کو پڑھا ضرور تھا اور اس کو بہت مفید پایا تھا، البتہ انھیں بالکل یاد نہیں تھا کہ مسودے کے ساتھ کیا بیتی۔ اس طرح دادا جان کی یہ نہایت قیمتی کتاب ضایع ہو گئی، جس کا مجھے بے حد رنج ہے۔ اس کتاب میں دادا جان نے قرآن، حدیث اور دوسری اسلامی کتب کو مدِّ نظر رکھ کر میاں بیوی کے آپس کے تعلقات پر روشنی ڈالی تھی۔ برسوں کے بعد میری نظر سے مولانا مودودی کی کتاب ''ہدایات الزوجین'' گزری تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مودودی صاحب نے عین اسی رنگ میں اپنی کتاب لکھی تھی، جیسی دادا جان نے ان سے پہلے مرتب کی تھی۔ مودودی صاحب کی کتاب اسلامی تعلیمات کے اس نہایت اہم پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور دادا جان کی گم شدہ کتاب کا بدل ہے۔

تیسرا باب

جرمنی کے لیے روانگی

میری جرمنی جانے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ وکالت التبشیر کی طرف سے ہوائی ٹکٹ خریدا جا چکا تھا۔ میرے ساتھ روم تک اسی جہاز میں بشیر احمد شمس کو جانا تھا، جس کی تعیناتی نائیجیریا میں ہوئی تھی۔ ہمیں اب صرف آخری ہدایات لینی تھیں، جس کے لیے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی خدمت میں حاضری کی تاریخ کا انتظار تھا۔ آخر خدا خدا کر کے روانگی سے ایک روز قبل دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں حاضر ہونے کا ارشاد ہوا۔ دو تین گھنٹوں تک انتظار کرانے کے بعد آخر حضرت صاحب کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ ہمیں یہ تو پتا تھا کہ موصوف بیمار ہیں، مگر ہم نہ جانتے تھے کہ وہ اس درجہ دنیا جہان سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ ہمیں ان کی خدمت میں پیش کیا گیا، مگر بجائے ہمیں ہدایات دینے کے انھوں نے کسی غیر متعلقہ امر کے بارے میں دو چار باتیں کیں اور ہمیں اٹھ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ہم وکیل التبشیر کے دفتر میں مرزا مبارک احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف نے کچھ اس قسم کی ہدایات دیں کہ زبان سیکھنے کی طرف توجہ دیں۔ مرکز کے احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کریں۔ رئیس التبلیغ کے احکام کی پیروی نہایت ضروری ہے۔ انتشار پیدا کرنے اور جھگڑے فساد سے بچیں۔ اخلاق سوز باتوں سے پرہیز کریں، مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ مجھے دو تین ماہ تک ڈنمارک تبدیل کر دینے کے امکانات ہیں، اس لیے مجھے جرمن کے ساتھ ساتھ ڈینش بھی سیکھنی ہوگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مبلّغوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح کبھی ایک جگہ پر کبھی دوسری جگہ پر رکھنے کے عادی تھے۔ تھوڑا عرصہ پہلے مجھے کینیا بھیجا جا رہا تھا، اب میں جرمنی جا رہا تھا اور کل کو ڈنمارک کی طرف دھکیل دیا جاؤں گا۔ مجھے اس میں کوئی واضح پالیسی لائن نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بیک وقت دو زبانیں سیکھنے میں بھلا کیا تک تھی؟

جرمنی پہنچنے پر مجھے مرزا بشیر احمد کا خط ملا، جس کو یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

”عزیزم مکرم و محترم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے منزلِ مقصود پر چلے گئے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ آپ کو بہترین خدمت کی توفیق دے اور آپ کے علم وعمل میں اضافے کا راستہ کھولے۔ میں علی الصباح سفر پر جا رہا ہوں، لہٰذا اس وقت آپ کے لیے میری نصیحت یہی ہے کہ اوّل قرآنی آیت : **ادعو الیٰ ربک بالحکمة والموعظة الحسنه وجادلهم بالتی هی احسن** (ترجمہ از ناقل: اپنے رب کی طرف بلاؤ حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ۔ اور ان کے ساتھ ایسے طریق سے بحث کرو جو احسن ہو)۔ اور دوسری یہ نصیحت ہے کہ اسلام اور احمدیت کا بہترین نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ اچھے نمونے کے بغیر محض قول (کی) تبلیغ کچھ اثر نہیں رکھتی۔ بلکہ بسا اوقات الٹا اثر پیدا کرتی ہے۔ تیسری نصیحت یہ ہے کہ خلافت مرکز کے ساتھ ہر حال میں پختہ اور مخلصانہ تعلق رکھیں۔ اور دوسرے مبلغوں کے ساتھ کامل تعاون اور محبت کا سلوک کریں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ مغربی ممالک میں آپ کو بہت سی اچھی باتیں نظر آئیں گی۔ اسے پورے امتحان کے بعد **کلمة الحکمة ضالة المؤمن** (ترجمہ از ناقل: حکمت کا کلمہ مؤمن کی گمشدہ شئے کی طرح ہے) کے طور پر قبول کریں۔ مگر ہوشیار رہیں کہ کوئی دجل والی بات دھوکے میں نہ ڈالے اور کسی اسلامی صداقت کے مقابلے میں کسی مغربی بات سے مرعوب نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ والسلام۔ عزیز احمد (برائے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب)''

اب ہماری روانگی میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو چناب ایکسپریس میں، جو صبح کے وقت ربوہ سے گزرتی تھی، ہمارے لیے دو سیٹیں سیکنڈ کلاس میں ریزرو تھیں۔ مبلّغوں کی آمد و روانگی کے موقعے پر ربوہ کی آبادی کو ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے کا اعلان مساجد میں اور روزنامہ ''الفضل'' میں اشتہار کے ذریعے کر دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف ربوہ میں آئے دن سارے پاکستان سے احمدیوں کی لاشیں بہشتی مقبرہ میں تدفین کی خاطر لائی جاتی تھی، جس کے سبب ربوہ کے باسی دن رات ان کا جنازہ پڑھنے کی خاطر اور ان کی تدفین کے لیے قبرستان کی طرف بلائے جاتے تھے یا مبلّغوں کو ہار پہنانے کے لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف۔ ہمیں الوداع کہنے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ بہت ہوا تو دو درجن لوگ ہوں گے اور ان میں بھی اکثریت دوستوں اور قریبی رشتے داروں کی تھی۔ مجھے اس وقت پتا نہ تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے ربوہ کو خیر باد کہہ رہا ہوں اور یہ کہ میں وہاں پر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔

ہمارے ڈبے میں دو افراد پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک امریکہ کا رہنے والا تھا، جو عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں پاکستان میں آیا تھا اور ان دنوں راولپنڈی میں مقیم تھا۔ اس نے کہا یہ بھی خوب بات ہے کہ میں یہاں پر عیسائیت کا پیغام لے کر آیا ہوں اور آپ یورپ میں تبلیغ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ دونوں اطراف بحث مباحثہ کے موڈ میں نہ تھے، اس لیے سال ٹاک ہوتی رہی۔ ملتان کے اسٹیشن پر شفیع اشرف، جو ایک زمانے میں راولپنڈی سے نکلنے والے ادبی مجلّے ''خورشید'' کے مدیر تھے،

ہمیں الوداع کہنے کے لیے مقامی جماعت کا ایک وفد لے کر آئے ہوئے تھے۔ وہاں پر چونکہ گاڑی گھنٹہ بھر رکتی تھی اس لیے ہمارے اعزاز میں ایک عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں درجن بھر افراد نے حصہ لیا۔ بہاول نگر کے اسٹیشن پر گاڑی آدھی رات کے لگ بھگ پہنچی، اس لیے مجھے امید نہ تھی کہ سمیع اللہ قریشی، جو ان دنوں وہاں کے کالج میں تعینات تھا، اسٹیشن پر آسکے گا، مگر وہ موجود تھا اور اس کے ساتھ ہمارا ربوہ کے زمانے کا ایک دوست محمد ادریس، جو شاعر تو نہیں تھا، مگر جس کو ہم نے ''مجلسِ خیال'' کا سیکرٹری بنایا تھا، آیا تھا۔ سمیع اللہ نے میری پاکستان سے روانگی پر ایک نظم لکھ رکھی تھی، جو ہمیں سنائی گئی اور اس کا مسودہ پیش کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے یہ مسودہ بعد میں گم ہو گیا تھا۔

کراچی میں ہمارے قیام کا انتظام وہاں کی مقامی جماعت نے کر رکھا تھا، مگر میں نے بھائی جان عظیم کے ہاں رات گزارنے کو ترجیح دی۔ اگلی صبح البتہ مجھے اس فیصلے پر افسوس ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں ہوائی اڈے کے لیے ٹیکسی نہ ملتی تھی۔ سب ٹیکسیاں پیچھے سے بھری ہوئی آتی تھیں۔ مجھے سڑک پر کھڑے ایک گھنٹہ ہو چلا تھا، جب میں نے زندگی میں پہلی بار ہچ ہائیکنگ کرنے کی ٹھانی۔ چند منٹوں میں ایک کار رک گئی، جس کے ڈرائیور کو میں نے اپنی مشکل بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے اگلے ٹیکسی اسٹینڈ تک لے چلے، وگرنہ خطرہ ہے کہ میں اس روز ہوائی جہاز نہ لے سکوں گا۔ وہ شریف آدمی مجھے لفٹ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر اتارا، جہاں سے مجھے آسانی کے ساتھ ٹیکسی مل گئی اور میں وقت پر ہوائی اڈے پر پہنچ سکا۔ اس طرح میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو پاکستان کو خیر باد کہہ کر اسی رات کو ہمبرگ میں پہنچا۔

کراچی سے ہمارا جہاز صبح کے دس اور گیارہ بجے کے درمیان روانہ ہوا۔ میرے لیے ہوائی جہاز میں پرواز کرنے کا پہلا موقع تھا۔ اکتوبر کا تیسرا عشرہ شروع ہو رہا تھا اور ابھی پاکستان میں اچھی خاصی گرمی پڑ رہی تھی، مگر بھائی عظیم نے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ اکتوبر کے اواخر تک جرمنی میں سردی پڑنے لگتی ہے۔ میرے پاس گرم کپڑے سرے سے نہیں تھے۔ یورپی فیشن کے اوورکوٹ پاکستان میں اس زمانے میں ابھی نہیں ملتے تھے، اس لیے بھائی عظیم کے مشورے سے کراچی میں ایک اونی کمبل خریدا گیا کہ اگر ہمبرگ پہنچنے پر سردی کا سامنا کرنا پڑا تو کمبل اوڑھ لوں گا۔ اس طرح عارضی طور پر سردی سے بچاؤ ہو جائے گا۔ میں یہ کمبل روم پہنچنے پر افراتفری میں پی آئی اے کے جہاز میں ہی بھول گیا تھا۔ اس سفر کا ذکر میرے افسانے " کچا علم " میں موجود ہے۔

میرا جہاز کراچی سے لیٹ آیا تھا۔ ہمبرگ جانے والی فلائیٹ تیار کھڑی تھی۔ صرف میرا انتظار ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کا جہاز رکتے ہی لفت ہانزا کا ایک کارکن تیر کی طرح ہمارے طیارے کی سیڑھیوں

پر چڑھا۔ سواریاں ابھی اپنی سیٹوں سے نہ اٹھی تھیں۔ اس نے ہمبرگ جانے والی سواری کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اپنا بازو ہوا میں لہرادیا۔ پھر سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے اپنی کمر کو سیدھا کیا اور بشیر احمد شمس سے لمبا معانقہ کیا، جسے روم سے نائیجیریا جانے والی فلائیٹ لینی تھی۔ لفت ہانزا کے کارکن کو ہماری الوداعی رسم کی لمبائی شاید پسند نہ آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور پوچھا: "آپ کا بیگ کون سا ہے؟"

میں نے اپنا بیگ اگلی سیٹ کے نیچے سے نکالا اور پیشتر اس کے کہ میں اپنے دوست سے باضابطہ رخصت لیتا، لفت ہانزا کا آدمی مجھے اپنے پیچھے کھینچتا ہوا جہاز سے باہر نکلا۔ رن وے پر پہنچ کر اس نے میرا بیگ تھام لیا اور کہا کہ ہمیں لفت ہانزا کے طیارے تک، جو وہاں سے اندازاً ایک سوگز کے فاصلے پر کھڑا تھا اور جس کے انجن اسٹارٹ کیے جا چکے تھے، دوڑ لگانی ہوگی۔ اس نے کہا: "آپ کا باقی ماندہ سامان اگلی فلائیٹ میں آجائے گا۔"

مجھے ایک ادھیڑ عمر جرمن جوڑے کے پہلو میں فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی، جو شاید اس طیارے کی واحد خالی سیٹ تھی۔ مرد تو خیر ہر بات پر مسکرا دیتا تھا، کیونکہ میری بات اس کے پلے نہ پڑتی تھی، مگر عورت کو انگریزی اچھی خاصی آتی تھی۔ وہ ہمارے درمیان مترجم بن گئی۔ اس کا خاوند پیشے کے اعتبار سے سرجن تھا اور روم میں ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد اپنے شہر لیوبک لوٹ رہا تھا، جو ہمبرگ کے قریب واقع ہے۔

"کیا یہ آپ کا جرمنی کا پہلا سفر ہے؟" ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے پوچھا۔ وہ میری باتوں سے جان چکے تھے کہ میں ہمبرگ سے ناواقف تھا اور ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ انھوں نے کہا کہ انکا بیٹا کار لے کر آیا ہوگا۔ اگر دن کا وقت ہوتا، تو وہ مجھے میری رہائش گاہ تک پہنچانے کے لیے تیار تھے، مگر ہم رات کے دس بجے پہنچیں گے اور انھیں اپنے شہر لیوبک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو جائے گی۔

میں نے کہا: "اگر انسان کے منہ میں زبان موجود ہو اور اس کی جیب میں ایک واقف کار کا پتا محفوظ ہو تو پھر بھلا کیا مشکل پیش آسکتی ہے؟"

ڈاکٹر ہوڈوفسکی کی بیوی مارگٹ نے بتایا کہ ان کے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا یورگ میری عمر کا ہے، جب کہ دوسرا بیٹا کارل ہائی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ ان کی بیٹی ایویلین ابھی بمشکل سات برس کی ہے۔ یورگ اچھی خاصی انگریزی بول لیتا ہے۔ اسے مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ وہ یوں بھی دوسرے ملکوں میں دلچسپی لیتا ہے اور دنیا جہان کے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا ہے۔

"ڈاک کے ٹکٹ میں بھی ایک زمانے میں جمع کیا کرتا تھا۔ کچھ ٹکٹ تو اب بھی میرے بیگ میں پڑے ہیں، جن کا میں یورگ کے ساتھ تبادلہ کروں گا"۔

"ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق مجھے بھی رہا ہے۔" ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے کہا ''مگر دوسری عالمگیر جنگ میں میرا البم جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس مشغلے کی طرف رجوع نہیں کیا۔ یوں بھی جنگ کے بعد ہمیں از سرِنو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیے بہت تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ یورگ کی نسل کے بچے اس چیز کو بھلا کیا جانیں۔''

"تمھاری ہر بات کی تان جنگ پر آن کر ٹوٹتی ہے"۔ مارگٹ نے جھنجھلا کر کہا، "یہ ہماری نسل کی میراث ہے۔ بچوں کو اس میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی موجودہ زمانے کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں، جس میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق پورا کیا جا سکتا ہے"۔

"معاف کیجیے میری بیوی جنگ کے بارے میں تھوڑی الرجک ہے"۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور میرے خاوند کو جنگ کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو کے لیے نہیں سوجھتا"۔ مارگٹ نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔

"میں جنگ کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا۔ " کیا یہ سچ ہے کہ جرمنی نے ایٹم بم بنالیا تھا مگر اس کی تباہ کاری کے پیشِ نظر ہٹلر نے اس کے استعمال کی اجازت نہ دی تھی؟"

"یہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ اگر ہٹلر کے ہاتھ میں ایٹم بم آ جاتا تو وہ شکست سے بچنے کے لیے یقیناً سارے یورپ کو تباہ کر دیتا"۔ مارگٹ نے اپنے خاوند کے منہ کھولنے سے پہلے یہ بات کہہ دی۔ چونکہ اس کے پلے کچھ نہ پڑا تھا، اس لیے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے کیا کہا تھا۔ مجبوراً مارگٹ کو اسے یہ بات جرمن میں بتانی پڑی۔

"ہٹلر کے بارے میں تو ہم محض قیاس کر سکتے ہیں، مگر امریکیوں نے اسے استعمال کر کے دکھا دیا"۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"آج کل امریکہ اور سوویٹ یونین ایک دوسرے کو کھلم کھلا ایٹم بم کے استعمال کی دھمکیاں دے رہے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"سرد جنگ میں ہر چیز ممکن ہے۔ اگر ایٹم بم کے استعمال تک نوبت آ گئی، تو اس کا سب سے پہلا نشانہ جرمنی بنے گا۔ روس مغربی جرمنی کو تباہ کر دے گا اور امریکہ مشرقی کو۔ اس کے بعد شاید دونوں مل کر اپنی فتح کا جشن منائیں گے"۔

مارگٹ نے ڈاکٹر ہوڈوفسکی کی بات کا ترجمہ تو کر دیا، مگر اس کے چہرے بشرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کو یہ بات پسند نہ آئی تھی۔

"سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو وہ بھلا کیوں قربان کرنے لگے؟" میں نے کہا۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ انھیں شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں ان کے جذبات کو سمجھتا تھا اور ان سے متفق تھا۔ انھوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر مجھے دیا۔

"میں آپ کو کسی ویک اینڈ پر اپنے گھر آنے کی دعوت دوں گا۔ ہم آپ کو اپنا شہر لیوبک (Lübeck) دکھائیں گے اور بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت کریں گے"۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی دعوت کو قبول کیا۔

اس دوران میں ہمارا طیارہ ہمبرگ کے ہوائی اڈے پر اترنے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمبرگ کا جگمگاتا ہوا اور حدِ نظر تک پھیلا ہوا شہر ہمارے قدموں میں پڑا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے قصبے سے آیا تھا، جہاں پر زندگی سست روی کی عادی تھی۔ اس کے برعکس بیس لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں ہر طرف بھاگ دوڑ کا نظارہ تھا۔ ٹیکسیوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ اس کا آخری سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو احمدیہ مسجد کا پتا دیا۔ مجھے امید تھی کہ چوہدری عبداللطیف ٹیکسی کا کرایہ ادا کر دیں گے۔ خود میری جیب میں ایک مارک بھی نہ تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی ضرور تھی مگر یخ بستگی کا عالم نہ تھا، جس سے مجھے چلنے سے قبل جرمنی سے واقفیت رکھنے والے دوستوں نے یہ کہہ کر ڈرایا تھا کہ اکتوبر کے اواخر میں شمالی جرمنی ٹھنڈی ہواؤں کے پنجے میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک میرے ذہن میں یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ اگر لطیف صاحب اس شام گھر پر نہ ہوے، تو میں ٹیکسی کا کرایہ کیسے ادا کروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

جماعتِ احمدیہ کے ہمبرگ مشن کے مبلّغ چوہدری عبداللطیف تھے، جو ۱۹۴۸ء سے جرمنی میں مقیم تھے۔ میرے گھنٹی بجانے پر انھوں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک چھوٹے قد اور اکہرے بدن والا شخص کھڑا تھا، جسکی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں تھی، نہ ہی اسکے لب و لہجے میں خلوص کی لہر تھی۔ انھوں نے اس امر پر قدرے ناگواری کا اظہار کیا کہ میں ہوائی اڈے سے ٹیکسی پر آیا تھا، جب کہ انسان وہاں سے بس اور انڈر گراؤنڈ میں سفر کر سکتا ہے، جس پر بہت کم پیسے لگتے ہیں۔ مجھے انکی بات پر حیرت ہوئی کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ وہ مجھے ہوائی اڈے پر لینے کے لیے آئیں گے، مگر انکا عذر تھا کہ ان کو علم نہیں تھا کہ میں کس جہاز میں آ رہا ہوں۔ اگر اتفاقیہ طور پر میرے پاس مشن کا ایڈریس نہ ہوتا، تو مجھے وہاں تک

پہنچنے میں مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ چونکہ آدھی رات کا وقت تھا، اس لیے مجھے میرا کمرہ دکھانے کے لیے موصوف بنفسِ نفیس مشن ہاؤس کے تہ خانے میں اترے، جس میں سے ہمس آ رہی تھی۔ تہ خانے میں چار کمرے تھے، جن میں سے ایک اسٹور کے کام آتا تھا۔ دوسرا کمرہ مہمانوں کے رہنے کے لیے تھا، مگر ایسی حالت میں تھا کہ محکمہ صحت کو اس کے بارے میں پتا چل جاتا، تو وہاں پر کسی کو ٹھیرانے کی اجازت نہ مل سکتی تھی۔ میری رہائش کے لیے تیسرا کمرہ تھا، جس کی دیواروں اور چھت پر پلاسٹک کی فوم لگا کر تہ خانے کی سردی کو کم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ تہ خانے میں ہیٹنگ کا انتظام نہیں تھا۔ صرف میرے کمرے میں بجلی کا ہیٹر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ بیک وقت باورچی خانے اور حمام کے کام آتا تھا۔ باتھ روم البتہ صرف اوپر کی منزل پر پایا جاتا تھا۔ اس کمرے کی نصف کھڑکی، جو میرے کندھوں کی اونچائی میں شروع ہوتی تھی اور نصف میٹر سے زیادہ نہ تھی، باغ کی طرف کھلتی تھی۔ چونکہ ہم زیرِ زمین تھے اس لیے اس کھڑکی کے سامنے ایک گڑھا سا کھدا ہوا تھا، جس میں سے روشنی چھن کر کمرے میں آتی تھی۔ البتہ آسمان کو دیکھنے کے لیے انسان کو فرش پر لیٹنا پڑتا تھا۔ چارپائی شاید جنگ سے پہلے کی تھی، جو کروٹ بدلنے پر چرچراتی تھی۔ میں بے حد تھکا ہوا تھا، اس لیے لیٹتے ہی سو گیا۔ البتہ فجر کی نماز کے وقت میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اوپر جا کر مسجد میں اذان دے دی۔ میرا خیال تھا کہ انسان مسجد میں رہتا ہو، تو پھر ساری نمازیں باجماعت ادا کی جانی چاہییں، مگر یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چوہدری عبداللطیف شب خوابی کے کپڑوں پر لمبا کوٹ پہنے ہوئے باہر نکلے اور گلہ کیا کہ میں نے ان کو بے وقت جگا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ صبح کی نماز آپ اکیلے ادا کر لیا کریں۔

آٹھ بجے ناشتہ کر کے ہم دفتر میں جا کر بیٹھے۔ لطیف صاحب ایک بھاری بھرکم رائٹنگ ٹیبل کے پیچھے اور میں ان کے بالمقابل ایک چھوٹی میز کے پہلو میں۔ مجھے بہت کچھ جاننے کا شوق تھا، اس لیے سوالات کا سلسلہ میری طرف سے چلتا رہا، مگر لگتا تھا کہ وہ کسی سوال کا جواب کھلے بندوں دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ بارہ برسوں سے جرمنی میں تبلیغ کر رہے تھے اور میں "الفضل" میں ان کی فتوحات کا حال پڑھتا رہا تھا، اس لیے مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ کتنی نیک روحیں ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے جماعت میں داخل ہوئی تھیں۔ دیر تک دائیں بائیں پہلو بدلنے کے بعد آخر ان کو کہنا پڑا کہ جرمنی بھر میں ایک سو افراد ہوں گے۔ ان میں سے ہمبرگ یا گردونواح میں کتنے رہتے ہیں؟ مگر وہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ہمبرگ میں نوجوانوں کی ایک جماعت نے اپنے طور پر اسلام کا مطالعہ کر کے ایک انجمن بنائی تھی۔ ان کی طرف سے ایک خط قادیان بھی گیا تھا کہ ان کو اسلام کے بارے میں لٹریچر بھیجا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جنگ کے بعد جماعتِ احمدیہ نے یورپ

کے ممالک کے لیے مبلّغوں کی ایک پوری جماعت روانہ کی، تو ان میں سے ایک کو ہمبرگ جا کر مشن کھولنے کا حکم ملا تھا۔ ابتدا میں شیخ ناصر احمد کو بھیجا گیا تھا، مگر جلد ہی ان کی تبدیلی سوئٹزرلینڈ کر دی گئی تھی اور ان کی جگہ پر لطیف صاحب کو بھیجا گیا۔ مگر جرمن نومسلموں اور جماعتِ احمدیہ کے درمیان بہت جلد اختلافات پیدا ہو گئے تھے، جن کے سبب وہ لوگ احمدیہ مشن سے الگ ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی۔ اب لطیف صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ ہمبرگ کے مشن کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کی تعداد بیس کے قریب تھی، مگر جب تک میں مشن سے وابستہ تھا، میری ملاقات آٹھ افراد سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہوئی۔ البتہ جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے پندرہ بیس پاکستانی اور ترک مسلمان مسجد میں آ جاتے تھے۔ مگر یہ لوگ جماعتِ احمدیہ کے ممبر نہ تھے۔ اس زمانے میں ابھی ہمبرگ میں کوئی دوسری مسجد موجود نہ تھی۔ شیعوں کی ایک مسجد آلسٹر جھیل کے کنارے تعمیر ہو رہی تھی، جس کے لیے قطعۂ زمین ہمبرگ سینٹ کی طرف سے شاہِ ایران کو ان کی ہمبرگ آمد کے موقع پر بطور تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ البتہ مسجد بنانے والی کمیٹی آیت اللہ بروجردی کی زیرِ نگرانی کام کر رہی تھی۔ یہ مسجد آگے چل کر ان کے قایم مقام آیت اللہ روح اللہ خمینی کے زیرِ اثر آ گئی۔ چنانچہ ان کی طرف سے ہمبرگ بھیجے جانے والے امام الصلوٰۃ آیت اللہ بہشتی اور آیت اللہ خاتمی نے آگے چل کر ایران کی انقلابی حکومت میں اہم کردار ادا کیے۔

مجھے بتایا گیا کہ مجھے گزارے کے لیے ماہوار پندرہ پونڈ ملیں گے۔ یہ رقم اس زمانے میں ۱۶۵ جرمن مارک کے برابر تھی، جس میں سے مجھے پندرہ مارک چندے کے دینے ہوں گے اور اگر میں کھانا ان کے ساتھ کھانا چاہوں، تو مجھے ۷۵ مارک اس کے لیے ادا کرنے ہوں گے۔ باقی رقم سے مجھے اپنے لیے کپڑے اور دیگر ضرورت کی اشیا خریدنی ہوں گی۔ ہیلتھ انشورنس کا کوئی انتظام نہیں تھا اور بیماری کی صورت میں مجھے اسی رقم میں سے اخراجات ادا کرنے ہوں گے۔

دوسرے روز لطیف صاحب میرے لیے کچھ اشیاء خریدنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ شہر لے کر گئے۔ ہمبرگ کے موسم کے پیشِ نظر ہم نے ایک چھتری خریدی اور ایک اوورکوٹ۔ ان پر اٹھنے والے اخراجات مجھے پیشگی ملنے والی رقم سے ادا کیے گئے۔ گویا پورے مہینے کے لیے اب میرے پاس ایک مارک بھی نہ تھا۔ یہ پہلی اور آخری بار تھی کہ لطیف صاحب مجھے شہر دکھانے کے لیے لے کر گئے تھے۔ یوں بھی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ نہ دکھایا جائے اور کسی قسم کی معلومات نہ دی جائیں۔ مجھے ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھنی پڑتی تھی۔ اس بات کا بھی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا کہ مرزا لطف الرحمٰن کو جرمنی سے ٹوگو تبدیل کرنے کی وجہ کیا تھی۔ انھیں جرمنی میں آئے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا اور انھوں نے اس دوران میں جرمن زبان سیکھی تھی۔ میرے نزدیک یہ امر جماعت اور مشن کے مفاد کے خلاف تھا کہ

ایک مبلغ کو، جس نے محنت کر کے جرمن سیکھی تھی، ایک ایسے ملک میں بھیج دیا جائے، جہاں پر یہ زبان اس کے کام نہیں آ سکتی۔ گویا ڈیڑھ سال کی محنت رائیگاں گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمبرگ کا مشن اس کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ لطیف صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان کا اس فیصلے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ وکالت التبشیر کا تھا، اس لیے اس کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔ مگر مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ فیصلہ ان کے ایما پر ہوا تھا، جس کی تفصیل دوسری جگہ پر درج کی جائے گی۔

جب میں نے لطیف صاحب سے مشن میں میرے سپرد کیے جانے والے کام کے بارے میں پوچھا تو کہا گیا کہ آپ فی الحال زبان سیکھیں، جس کا انتظام ہمبرگ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ البتہ اس دوران میں آپ کو مسجد کی صفائی اور باغ کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ مشن کے کاموں کے سلسلے میں انھیں میری مدد کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ الٹا مجھے یہ احساس دلایا گیا کہ میں ان پر بوجھ تھا، جس کو وہ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر انھوں نے کیوں ایک مددگار بھیجے جانے کے لیے وکالت التبشیر کو لکھا تھا؟ دراصل نائب بھیجے جانے کا مطالبہ کر کے مرکز کو یہ احساس دلانا مطلوب تھا کہ جرمن مشن کامیابی کی طرف گامزن تھا۔

ہمبرگ یونیورسٹی کا سرما کا سمسٹر یکم نومبر سے شروع ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا نام بطور مہمان طالب علم کے وہاں پر درج کرایا اور جرمن زبان کی کلاسوں میں جانے لگا، جو ہفتے میں دو روز لگتی تھیں۔ یونیورسٹی میں نام درج ہو جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ دس مارک کے عوض مہینے بھر کا ٹریفک کا ٹکٹ مل جاتا تھا، جس پر میں ٹراموں اور بسوں میں گھوم پھر سکتا تھا۔ میرا باقی وقت مشن ہاؤس میں گزرتا تھا، جہاں پر میں صبح سے شام تک جرمن کے اسباق دہرانے میں لگا رہتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو خرید لیا تھا، جو بجلی یا بیٹری کے بغیر چلتا تھا۔ اس پر میں خبریں سن لیتا تھا۔ پھر اخبار میں ان خبروں کی تفصیل ڈکشنری کی مدد سے پڑھتا تھا۔ مجھے ربوہ سے روانگی کے وقت رفیق احمد ثاقب نے ایک چھوٹی سی جرمن۔ انگریزی ڈکشنری تحفے میں دی تھی، جو ہمبرگ میں میرے کام آئی۔ میرا معمول تھا کہ سات آٹھ گھنٹے لگا کر پورا اخبار پڑھ جاتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ انگریزی زبان کا اخبار نہیں خریدوں گا اور جرمن زبان پر انحصار کروں گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری جرمن زبان پر گرفت دن بدن بہتر ہوتی گئی، مگر ساتھ کے ساتھ انگریزی سے دوری پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ جب مجھے پروفیسر شپولر نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ انگریزی میں لکھنے کا مشورہ دیا، تو میں انگریزی سے اس قدر دور جا چکا تھا کہ مجھے انگریزی نئے سرے سے سیکھنی پڑی۔ یہاں پر میں اپنے افسانے " کچا علم " کا ایک اقتباس درج کر رہا ہوں جس میں تین ناموں کو درست کر دیا گیا ہے۔

"وسط دسمبر میں ڈاکٹر ہوڈوفسکی کا فون آ گیا۔مگر چونکہ ان سے براہِ راست بات نہ ہو سکتی تھی اس لیے مارگٹ ہمارے درمیان ٹیلی فون ایکسچینج کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔انھوں نے پوچھا کہ کیا میں کرسمس کا تہوار ان کی فیملی کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار ہوں۔میری معلومات کرسمس کے بارے میں بہت محدود تھیں،البتہ میں نے سن رکھا تھا کہ جرمنی میں یہ تہوار خالص فیملی افیر ہے،جس میں باہر کے کسی شخص کو شامل نہیں کیا جاتا۔

میں نے کہا:"یہ تو آپ کا فیملی تہوار ہے،میں کسی دوسرے موقع پر آ جاؤں گا۔"

مگر پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر ہوڈوفسکی میری بات کا جواب دیتے،مارگٹ نے کہا:"ہم جرمنی میں تمھاری فیملی ہی تو ہیں۔"

واضح ہے کہ اس فقرے کے بعد میں ان کی دعوت کو رد نہ کر سکتا تھا۔

انھوں نے کہا کہ میں ۲۴ دسمبر کی سہ پہر تک پہنچ جاؤں تو خوب رہے گا،کیونکہ اس روز ان کے بیٹے گرہارڈ کی سالگرہ ہے۔میں نے آنے کی ہامی بھر لی،مگر مجھے بالکل پتا نہ تھا کہ مجھے گرہارڈ کے لیے سالگرہ کا کیا تحفہ لے جانا ہوگا اور کیا مجھے خاندان کے دوسرے افراد کے لیے کرسمس کے تحائف لے جانے چاہییں یا نہیں۔

لطیف صاحب نے کہا کہ مجھے بہانہ بنا کر شامل ہونے سے انکار کر دینا چاہیے۔"یہ امیر لوگ ہیں،آپ ان کے لیے کیا تحفہ لے جا سکتے ہیں؟"

مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا۔میں نے سوچا کوئی چھوٹی موٹی کتاب کہیں نہ کہیں سے ہاتھ لگ جائے گی۔پھر سچ مچ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دکان میں مجھے بالزاک (Balzac) کی ایک کتاب کا جرمن ترجمہ مل گیا،جس کا اس وقت تک کسی نے کور بھی نہ کھولا تھا۔یہ کتاب،جسے دراصل میں خود پڑھنا چاہتا تھا،میں نے گرہارڈ کے لیے مخصوص کر دی۔دیگر افرادِ خانہ کے لیے بھی اسی دکان میں نہایت عمدہ نئی نکور کتابیں کوڑیوں کے مول مل گئیں۔سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ مجھے جرمن ادیب وولفگانگ بورشرٹ (Wolfgang Borchert) کے افسانوں کا مجموعہ مل گیا۔اس وقت مجھے ابھی پتا نہ تھا کہ بورشرٹ جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے جرمن ادب کا اولین نام تھا۔اس کی کہانی "اس منگل کے روز" میرا جرمن ادب سے پہلا ترجمہ تھا،جسے میں نے جرمنی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اردو میں ڈھالا تھا اور جسے ہفتہ وار "قندیل" لاہور نے خاص نوٹ دے کر چھاپا تھا۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی اپنی بیوی مارگٹ اور بیٹی ایویلین کی ہمراہی میں مجھے لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ایویلین سچ مچ ایک خوبصورت گڑیا تھی۔انھوں نے کہا:

"گھر جانے سے پہلے ہم آپ کو لیوبک کے اہم حصوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔"

لیوبک کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ تھوماس من (Thomas Mann) اس شہر کا نامور سپوت تھا۔ میں نے اس وقت تک اس کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر اس کے ناول "بڈن بروکس" (Buddenbrooks) کے نام سے واقف تھا، جس پر اسے نوبل پرائز ملا تھا۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے کہا: "کیوں نہ ہم اس عمارت کو دیکھتے چلیں جو "بڈن بروکس" کا لوکیل ہے اور جس میں تھوماس من کا خاندان رہائش پذیر تھا۔"

قدیمی عمارتیں، شہر کے ساتوں گرجا گھر اور زمانہ ہائے وسطیٰ کی تنگ گلیاں مجھے جادو کے زور سے بنائی ہوئی لگتی تھیں۔ پرانے وقتوں کے گھر اتنے چھوٹے تھے، جیسے انسانوں کے لیے نہیں بالشتیوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ ان میں بدستور لوگ بستے ہیں۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے مجھے اوپر کی منزلوں کی کھڑکیوں میں لگے ہوئے آئینوں کی طرف متوجہ کیا، جو اس طرح لگائے گئے ہیں کہ انسان کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے کہ نیچے سڑک پر سے کون گزر رہا ہے۔ انھوں نے کھڑکیوں میں رکھی ہوئی گدیاں دکھائیں، جن پر گھر کے باسی کہنیاں ٹیک کر گھنٹوں تک کھڑے رہتے ہیں اور گلی کی زندگی کا نظارہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی کا بنگلہ ایک پارک نما علاقے میں تھا، جس کے پچھواڑے میں ایک ندی گزرتی تھی۔ اس سال جرمنی میں کرسمس سے پہلے ہی سردی کی لہر آ گئی تھی۔ متواتر کئی روز سے درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے دس پندرہ ڈگری نیچے چل رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمبرگ کی جھیل آلسٹر کا پانی جمنے لگا تھا۔ ایویلین نے کہا کہ ندی پر یخ کی سطح اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ انسان اس پر چل سکتا ہے۔ اسے امید تھی کہ وہ کرسمس کے دنوں میں اس پر اسکیٹنگ کر سکے گی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: "کون جانتا ہے کہ اس برس سانتا کلاؤس ایویلین کے لیے کیا تحفے لائے گا؟"

اس عرصے میں ہم ان کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ یورگ اور گرہارڈ دروازے پر میرا استقبال کرنے کے لیے کھڑے تھے۔

یورگ یونیورسٹی میں قانون پڑھتا تھا اور کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اسے انگریزی بولنے کا شوق تھا، جب کہ میں جرمن بولنے پر مصر تھا۔ یہ بات گرہارڈ کو اچھی لگی، کیونکہ اس کی انگریزی میری جرمن کی طرح ناپختہ تھی۔ اسے خوشی تھی کہ میں اس کی سالگرہ میں شامل ہونے کے لیے آیا تھا۔ وگرنہ کرسمس کی وجہ سے ہر سال اس کی سالگرہ کی تقریب کو بھلا دیا جاتا تھا۔ اس روز البتہ یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ سالگرہ کی تقریب الگ منائی جائے گی۔ چنانچہ ہمیں اس کے اپارٹمنٹ میں جمع ہونے کو کہا

گیا، جو بنگلے کے شرقی حصے میں تھا۔ گرہارڈ کو تحفوں سے لاد دیا گیا۔ وہ ابھی ان کو کھولنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے سامنے ایک فولکس واگن کار آ کر رکی۔ کاروں کی ایک مقامی فرم کا کارندہ اتر کر آیا اور اس نے گرہارڈ کو کار کی چابیاں اور کار کی ملکیت کے کاغذات پیش کیے۔ اس روز گرہارڈ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور ماں باپ نے اس کو کار تحفے میں دی تھی۔ یہ چیز اگرچہ متوقع تھی اس کے باوجود گرہارڈ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ دوسرے سارے تحفوں کو چھوڑ کر کار میں جا بیٹھا۔ اس نے مجھے اور ایویلین کو شہر کی سیر کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے گرہارڈ سے آدھ گھنٹے میں واپس آ جانے کا وعدہ لے کر ہمیں جانے دیا۔

ہم واپس لوٹے تو بنگلے کے ہال میں کرسمس کا درخت سجایا جا چکا تھا۔ اس پر رنگا رنگ کے چاند، ستارے، دیومالائی کہانیوں کے کردار، فرشتے، حوریں اور قسم قسم کے کھلونے لٹک رہے تھے۔ اس پر مستزاد سرخ و سفید موم بتیاں لگی ہوئی تھیں، جو ہمارے کمرے میں داخل ہونے پر روشن کر دی گئیں۔ مکان کے اندر درخت کا لگایا جانا اور اس کا کسی دلہن کی طرح سجایا جانا میرے لیے نئی چیز تھی۔ کرسمس کے درخت کے نیچے خاندان کے ہر فرد کے لیے تحفوں کا الگ الگ ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مجھے بھی خاندان کے جملہ افراد کی طرف سے تحفے دیے گئے تھے۔ ایویلین کو اس کی توقع کے مطابق اسکیٹنگ سیٹ ملا تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اگر باہر اندھیرا نہ چھا گیا ہوتا تو وہ اسی وقت ندی کے یخ بستہ پانی پر اسکیٹنگ کے لیے جانے کو تیار تھی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی اتنے میں پیانو پر کرسمس کی دھنیں بجا رہے تھے۔ چند منٹوں کے اندر سارا خاندان مل کر کرسمس کے گیت گا رہا تھا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی، مگر اس بات کا افسوس ہوا کہ میں ان میں سے کوئی گیت نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا تو میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، کیونکہ مجھے سرے سے گانا نہیں آتا۔"

کرسمس کے دو روز لیوبک میں گزارنے کے بعد میں تحفوں سے لدا پھندا ہمبرگ واپس لوٹا۔ لطیف صاحب نے وہاں کے پورے کوائف سننے کے بعد کہا: "ان لوگوں کے ساتھ آپ کی دوستی زیادہ دیر تک نہ چل سکے گی۔ جرمن اس سلسلے میں کچھ ایسے باذوق نہیں ہیں۔"

ان کے اندازے کے الٹ ہماری دوستی لمبے عرصے تک قایم رہی۔ وہ مجھے بار بار اپنے ہاں بلاتے رہے البتہ ڈاکٹر ہوڈوفسکی اور مارگٹ کے درمیان ایک نوجوان نرس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے، جس کے نتیجے میں طلاق تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔

ہمبرگ کے میئر کی طرف سے سال کے پہلے ہفتے میں شہر کے باسیوں کو ٹاؤن ہال، جس کو "راٹ ہاؤس" **(Rathaus)** کہتے ہیں، آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس موقع پر ہزاروں شہری

میئر کو نئے سال کی مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ایک لمبی قطار میں لگ کر باری باری میئر سے مصافحہ کرتے ہیں۔ لطیف صاحب اس موقع پر مجھے بھی ساتھ لے کر گئے تھے اور میئر سے میرا تعارف کرایا، جس نے مجھے ہمبرگ آنے پر خوش آمدید کہا۔

جنوری کے اواخر میں پاکستان کے ملٹری حاکم جنرل ایوب خان جرمنی کے دورے کے دوران ہمبرگ بھی تشریف لائے۔ لطیف صاحب نے ان کو قرآن کا جرمن ترجمہ بطور تحفہ دینے کا پروگرام بنایا۔ ان کی گاڑی دوپہر کے قریب ہمبرگ ریلوے اسٹیشن پر پہنچی، جہاں ان کو خوش آمدید کہنے والے خاصی بڑی تعداد میں جمع تھے۔ جب جنرل ایوب خان ہمارے پاس سے گزر رہے تھے، تو لطیف صاحب نے قرآن کا نسخہ، جو ایک قیمتی کاغذ میں لپٹا ہوا تھا، ان کو پیش کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر سیکیورٹی والے سخت گھبرائے اور ان میں سے ایک نے لپک کر پیکٹ لطیف صاحب کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اگر لطیف صاحب نے قرآن کا تحفہ پیش کرنا تھا، تو ضروری تھا کہ پہلے سے پروٹوکول سے اس کی اجازت حاصل کر لیتے۔ اب وہ بہت پچھتائے کہ ان کا تحفہ رائیگاں گیا۔ جنرل ایوب خان کے وفد میں ڈاکٹر عبدالسلام بھی شامل تھے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا تو فوراً ہماری طرف آئے۔ معانقہ کیا اور کہا کہ آپ اس ہوٹل میں آ جائیں، جہاں پر ہمیں ٹھیرایا جائے گا۔ ہوٹل اٹلانٹک ریلوے اسٹیشن کے پہلو میں ہے، اس لیے ہم چند منٹوں کے اندر وہاں پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے ہمارا استقبال کیا اور اپنے کمرے میں لے گئے، جہاں پر ہمبرگ یونیورسٹی کا فزکس کا پروفیسر بھی موجود تھا، جو ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ لطیف صاحب جاننا چاہتے تھے کہ قرآن کے نسخے کا کیا بنا۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے کہا اس بارے میں ہمیں جنرل ایوب کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب سے بات کرنی چاہیے، جنکا کمرہ پہلو میں تھا۔ ہم نے انکے دروازے پر جا کر دستک دی۔ آواز آئی "Come in"۔ ہم اندر داخل ہوے، تو انکے باتھ روم کے ٹب میں پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شہاب صاحب ننگے دھڑنگے باہر نکل آئے۔ مگر ہمیں دیکھ کر سخت گھبرائے اور باتھ روم میں واپس لوٹ گئے۔ ہم ان سے کچھ پوچھے بغیر واپس آ گئے۔ جب میں نے برسوں کے بعد شہاب صاحب کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ آغا بابر کو لکھ بھیجا تو انھوں نے اس کے جواب میں لکھا: "شہاب صاحب کا ننگ دھڑنگ باہر نکل آنا بہت اچھا لگا۔ صوفی صاحب نے سمجھا ہوگا کوئی جرمن عورت، کوئی جرمن خاتون دروازے پر ہے۔ **come in** کہا کہ آئے گی، ہمیں دیکھ کر لجائے گی، ہم خوش ہوں گے۔ واہ واہ۔"

شام کو میئر کے آفس سے فون آیا کہ آپ کی طرف سے پیش کیا جانے والا قرآن کا تحفہ جنرل ایوب خان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

تیسرے سمسٹر سے میں نے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، کیونکہ اس طرح میری ہیلتھ انشورنس ہو جاتی تھی۔ اس کے بغیر مجھے بیماری کی صورت میں تمام اخراجات خود برداشت کرنے پڑتے، جس کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ لطیف صاحب نے اپنی فیملی کی ہیلتھ انشورنس کرا رکھی تھی، جس کے لیے انھوں نے حکومت کے محکمہ سوشل سیکیورٹی کو درخواست دی تھی کہ ان کی آمدن اتنی تھوڑی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے خود کفیل نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ بات مرکز سے پوشیدہ رکھی گئی تھی، کیونکہ ربوہ کی طرف سے سوشل سیکیورٹی سے امداد لینے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا یونیورسٹی کا طالب علم بن جانا مشن کے کام میں ممد تھا، کیونکہ اس طرح میرے لیے علمی اداروں کے دروازے کھل گئے تھے۔ میں یونیورسٹی کے سمینار برائے تاریخ وثقافتِ اسلامیہ کے لیکچروں میں جانا اور وہاں پر پڑھانے والے مستشرقین کے ساتھ تعارف پیدا کرنا چاہتا تھا۔ آخر میرے یورپ بھجوائے جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہاں کے علمی حلقوں میں احمدیت کی نمائندگی کی جائے۔

ہمبرگ میں پڑھانے والے پروفیسر برتھولڈ شپولر (Bertold Spuler) کا شمار چوٹی کے مستشرقوں میں ہوتا تھا۔ میں ان سے جا کر ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ انھوں نے مجھے اپنے سمیناروں میں آنے کی دعوت دی اور اپنے ساتھی ڈاکٹر ہربیرٹ بسے (Heribert Busse) کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اس سمسٹر میں قرآن پر لیکچر ہو رہے تھے۔ پروفیسر شپولر نے قرآن کی ترتیب اور آیات کی تعداد پر اعتراض کیا اور طالب علموں کو بتایا کہ قرآن کی موجودہ ترتیب نہ تو نزول کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی قرآن کی عبارت میں ربط موجود ہے۔ سورتوں کو محض لمبائی کے اعتبار سے آگے پیچھے جوڑ دیا گیا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ آج تک مسلمان قوم آیاتِ قرآن کی گنتی کا مسئلہ حل نہیں کر سکی، جسکے نتیجے میں قرآن کی آیات کی گنتی ساری مسلم دنیا میں ایک جیسی نہیں ہے۔ بعض فرقے بسم اللہ کو پہلی آیت مانتے ہیں اور دوسرے نہیں مانتے۔ جو پہلی آیت مانتے ہیں وہ اس کا شمار کرتے ہیں، دوسرے نہیں کرتے۔ اسکے علاوہ بھی بعض آیتیں ایک یا دو شمار کی جاتی ہیں۔ میں نے اسکا جواب دینا چاہا، مگر انگریزی بولنے کی اجازت مانگی کیونکہ ابھی میری جرمن زبان پر دسترس اتنی اچھی نہ تھی کہ ایسے اہم سوال کا کماحقہ جواب دے سکوں۔ پروفیسر شپولر نے اس پر خوشی کا اظہار کیا، مگر کہا کہ اس روز انکے لیکچر کا وقت ختم ہو چکا ہے، اس لیے وہ مجھے اگلے ہفتے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر میں پسند کروں تو وہ مجھے اس روز اپنے سمینار کا پورا وقت دے سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے پروفیسر شپٹالر (Spitaler) کی کتاب پڑھنے کے لیے دی، جو اس موضوع پر تھی۔

میں نے مشن ہاؤس میں آکر لطیف صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ پروفیسر شپولر نے مجھے اگلے ہفتے

سمینار میں لیکچر دینے کی دعوت دی ہے۔ یہ بات سن کران کا چہرہ مرجھا گیا۔انھوں نے مجھے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی اور کہا کہ اگر پروفیسر شپولر نے تقریر کروانی ہے،تو اسے چاہیے کہ انھیں دعوت دے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر پروفیسر شپولر کو خط لکھ دیا۔ مجھے پتا تھا کہ موصوف ایسے موضوعات پر بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ان کو عربی زبان سرے سے نہیں آتی۔انھوں نے بی اے کرنے کے بعد زندگی وقف کی تھی، جس کے بعد ان کو جامعہ احمدیہ میں بہت سرسری سی تربیت دی گئی تھی۔ان کا اسلامی لٹریچر کا مطالعہ ناقص تھا اور ایسے موضوعات پر ان کی اپنی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چونکہ مجھے پروفیسر شپولر کے سمینار میں جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی،اس لیے میں اگلے ہفتے وہاں پر نہ جا سکا۔

اس سے اگلے روز مجھے پروفیسر شپولر کا خط ملا، جس میں لکھا تھا کہ لطیف صاحب نے ان کو اطلاع دی ہے کہ مجھے ان کے سمینار میں جانے کی ممانعت ہے،مگر وہ مجھے بتانا چاہتے ہیں کہ میں ان کے سمینار میں جب چاہوں آ سکتا ہوں۔اگر میں لیکچر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں،تو وہ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ میں نے لطیف صاحب سے کہا کہ اب وہ خواہ سر کے بل کھڑے ہو جائیں میں اگلے ہفتے پروفیسر شپولر کے سمینار میں تقریر کرنے کے لیے جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے یہ تقریر انگریزی میں کی،جس کے نوٹس پروفیسر شپولر نے لیے اور میرا شکریہ ادا کیا۔ بلکہ اس کے بعد جب میں با قاعدہ طور پر ان کے شعبے کا طالب علم بن گیا،تو انھوں نے مجھے یہ حق دے رکھا تھا کہ سمسٹر میں ان کے چودہ لیکچروں میں سے تیرہ لیکچر ان کے ہوں گے اور آخری لیکچر میرا ہوا کرے گا۔ چنانچہ جب تک میں ان کے شعبے کا طالب علم رہا انھوں نے اس معاہدے کی پاسداری کی۔ بلکہ اس وجہ سے میرے ساتھ پڑھنے والوں کا خیال تھا کہ میں پروفیسر شپولر کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ نہ لکھ سکوں گا، کیونکہ میں ان کی علمیت کو متواتر چیلنج کرتا آ رہا تھا۔مگر میں نے دیکھا کہ میرے لیکچروں میں لیے گئے نوٹس کو پروفیسر شپولر نے اپنے بعض مضامین میں میرے حوالے کے ساتھ استعمال کیا۔ پھر پروفیسر شپولر نے میری طالب علمی کے زمانے میں میرا پبلک لیکچر ہمبرگ یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں کرایا۔ یہ اعزاز مجھ سے پہلے کبھی کسی دوسرے طالب علم کو نہیں ملا تھا۔

انھی دنوں میں ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ میں شروع سے ایسے علمی اداروں کی تلاش میں تھا، جہاں پر سمینار منعقد ہوتے تھے، تا کہ ان کو اسلام پر لیکچروں کی پیش کش کر سکوں۔ مجھے گوٹنگن (Götingen) کے قریب پہاڑی علاقے میں واقع صحت افزا مقام سانت اندریاز برگ (St. Andreasberg) کے ایک ادارے کا پتا چلا، جہاں پر ایسے علمی موضوعات پر سمینار ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا، جس میں اپنا تعارف کرایا اور ان سے مستقبل قریب میں ہونے والے سمیناروں

کے پروگرام منگوائے۔ انھوں نے مطلوبہ معلومات بھیجیں اور مجھے ایک سیمنار میں تقریر کرنے کی دعوت دی، جس کا عنوان انھوں نے یہ تجویز کیا: "اسلام ایک زندہ مذہب"۔ میں نے جب یہ خط لطیف صاحب کو دکھایا تو ان کو آگ لگ گئی، کیونکہ میں نے ان سے اجازت حاصل کیے بغیر اس ادارے سے رابطہ قایم کیا تھا۔ پھر انھوں نے کہا کہ آپ کو تو ابھی جرمن نہیں آتی، آپ کیسے وہاں جا کر جرمن میں تقریر کر سکتے ہیں؟ دوسرے روز وہاں سے خط آ گیا کہ ہمیں اپنی غلطی کا احساس خط بھیجنے کے بعد ہوا کہ آپ کو جرمنی میں آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے، اس لیے آپ شاید جرمن میں تقریر نہ کر سکیں گے۔ آپ بیشک اپنی تقریر انگریزی میں کریں، ہمارے ہاں ترجمے کا انتظام موجود ہے۔ ہم آپ کو اس تقریر کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔ لطیف صاحب نے مجھے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی، جس کے پیچھے شاید معاوضے کی رقم کی پیش کش کا بھی ہاتھ تھا۔ پھر انھوں نے اس ادارے کو خط لکھا کہ اگر آپ تقریر کرانی چاہتے ہیں، تو وہ یہ خدمت بجالانے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر ان کو وہاں سے جواب آیا کہ ہم آپ کو تقریر کرنے کی دعوت نہیں دے سکتے۔ ہماری دعوت ذاتی طور پر منیر صاحب کے لیے تھی۔

میں اسلام کی تبلیغ کے لیے آیا تھا اور بہت سی امیدیں اور امنگیں اپنے دل میں رکھتا تھا۔ دن رات میرا وقت اس فکر اور تلاش میں گزرتا تھا کہ تبلیغ کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ میں ہمبرگ شہر میں اسلام پر ہونے والے ہر لیکچر میں پہنچ جاتا تھا اور حتی الامکان اعتراضات کا جواب دیتا تھا۔ میں نے ہمبرگ میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قایم کیا اور بالخصوص ترکوں کو قرآن عربی میں پڑھانے کی ذمے داری اٹھالی۔ اخبار نویسوں کے ساتھ ملاقات اور تعارف کے مواقع پیدا کیے، جس میں اس امر نے میری مدد کی کہ میں روزنامہ "تعمیر" کا جرمنی میں نمائندہ تھا۔ مزید برآں میں اسلام پر لکھے جانے والا جرمن لٹریچر لائبریری سے لا کر اس کا مطالعہ کرتا تھا، تا کہ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی باتوں کا جواب دیا جا سکے۔ مگر ہر قدم پر لطیف صاحب نے میرے راستے میں روڑے اٹکائے۔ میری ہر تجویز کو رد کیا۔ وہ ایک پنشنر کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو میری گہما گہمی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے طور پر تبلیغ کے مواقع پیدا کروں، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ تبلیغ اسلام کے بالکل اہل نہیں تھے۔ ان کا جرمن زبان کا لہجہ بے حد کھردرا تھا اور بولنے کا انداز پنجابی دیہاتیوں والا تھا، جس میں جرمنی میں لمبا قیام کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا تھا۔

ان کے پاس چار تقریریں لکھی ہوئی رکھی تھیں، جن کے موضوعات پر سردیوں کے مہینوں میں چار لیکچر دیے جاتے تھے، جو مسجدِ احمدیہ میں ہوتے تھے۔ حاضری پندرہ اور بیس افراد کے قریب ہوتی تھی۔ لطیف صاحب کا تقریر کرنے کا انداز اناڑیوں جیسا تھا اور سوال و جواب کا سیشن ایسا ہوا کرتا تھا

جیسے وہ کسی سے جھگڑ رہے ہوں۔ انکو شاید اس بات کا علم نہ تھا کہ قرآن میں ایسے طریق سے تبلیغ کرنے کا حکم آیا ہے جو احسن ہو اور جسکے نتیجے میں کسی کی دلآزاری نہ ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کے کسی لیکچر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے اس کی تعریف کی ہو۔ جو کوئی ایک بار ان کا لیکچر سن جاتا تھا وہ لوٹ کر نہیں آتا تھا۔ اور لطیف صاحب خود کبھی کسی محفل میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی اخبار میں چھپنے والے اسلام دشمن مضمون کا جواب نہیں لکھا تھا، نہ ان کا کوئی مضمون کبھی کسی اخبار میں شایع ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے جلتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ میری سرگرمیوں کے سبب ان سے بھی مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اس طریقِ کار کو اختیار کریں۔

میں نے ہمبرگ پہنچنے پر برلن میں جرمن نومسلم دتلف خالد (Detlev Khalid) سے رابطہ کیا ، جو میرے طالب علمی کے زمانے میں جامعۃ المبشرین میں پڑھتا تھا۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ سال پہلے جرمنی واپس لوٹ گیا تھا۔ وہ مجھے ملنے کے لیے ہمبرگ آیا اور مشن ہاؤس میں دو روز تک ٹھیرا۔ اس نے پاکستان سے واپس آنے کے بعد ایوننگ اسکول میں داخلہ لے کر جمنازیم کا آخری امتحان پاس کیا تھا اور ان دنوں برلن یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز پڑھ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ برلن میں مسلمانوں کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا ہوگئی ہے، جس میں عرب طالب علموں کے علاوہ جرمن نومسلموں کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔ وہ لوگ عام طور سے اس کی امامت میں نمازیں ادا کرتے تھے، مگر عرب طالب علم اس کے خلاف ہوگئے تھے، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر مسلمان ہیں اس لیے اسلام کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔ خالد کا دعویٰ تھا کہ اس کا قرآن وحدیث اور سنت کا علم عرب طالب علموں سے کہیں بہتر تھا۔ لیکن اس کو بول چال کی عربی نہیں آتی تھی، اس لیے وہ ان کا منہ بند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا ارادہ ایک دو سال کے لیے بون یونیورسٹی چلے جانے کا تھا، جہاں پر عربی زبان سکھانے کا انتظام تھا۔ میں نے کہا محض عربی بولنے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ پھر تم خواہ کوئی بھی زبان کیوں نہ بولو، تمھارا تلفظ ایسا ہے کہ ہر کوئی آسانی سے تمھاری قومیت جان سکتا ہے۔ اس نے کہا اس بات کا حل بھی اس نے ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ لوگوں کو بتایا کرتا ہے کہ اس کا باپ دراصل مراکو کا رہنے والا تھا، جس کو ایک جرمن فیملی نے متبنیٰ بنالیا تھا۔ چونکہ مراکو کے رہنے والوں کا تلفظ عام طور سے عربوں کے لیے بھی اجنبی ہے، اس لیے اسے امید ہے کہ جب وہ بون سے لوٹ کر آئے گا اور فرفر عربی بولے گا، تو لوگ اس کے تلفظ کے باعث اس بات کو تسلیم کرلیں گے کہ اس کا تعلق مراکو سے ہے۔ میں نے کہا اگر کسی نے تمھاری ماں سے جاکر اس بارے میں پوچھ لیا، تو کیا تمھارا راز افشا نہ ہوجائے گا۔ اس نے کہا میری ماں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔

اس کے پاس ایک دوسرے جرمن نومسلم کا پتا تھا، جو ہمبرگ میں رہتا تھا، مگر مسجد میں کبھی نہیں

آتا تھا۔ اس کا نام ناصر نیکولسکی (Nasir Nikolski) تھا، جو اس زمانے میں، جب ہم دونوں ربوہ میں ہوتے تھے، وہاں پر پاکستان کی سیاحت کرتا ہوا آیا تھا اور سات آٹھ ماہ تک گیسٹ ہاؤس میں مقیم رہا تھا۔ خالد نے اسے فون کیا تو اس نے ہم دونوں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ وہ ایک عورت کے ساتھ رہ رہا تھا، جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ اس کی لینڈ لیڈی ہے مگر اس سے کرایہ نہیں لیتی۔ وہ یوں بھی اکثر غیر ملکوں کی سیاحت پر نکل جاتا ہے اور سال دو سال کے بعد واپس لوٹتا ہے۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مسلمان ملکوں میں جا کر مسلمان بن جاتا تھا اور لوگوں کی مہمان نوازی سے خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ہندوستان میں ہندو اور کمبوچیا میں بدھ مت کا پیرو بن جاتا ہو۔ مجھے یاد تھا کہ وہ ربوہ میں بہت لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ خالد نے کہا پتا نہیں وہ نمازوں میں کیا پڑھتا ہوگا، کیونکہ اسے نماز کا متن سرے سے یاد نہیں ہے۔

ہمبرگ کے علاوہ جماعتِ احمدیہ نے ایک مسجد فرینکفرٹ میں بھی بنائی تھی، جس کا امام جرمن احمدی عبدالشکور کنزے (Abdul Shakoor Kunze) تھا، جس کو میں نے ربوہ کے زمانے دیکھا تھا۔ اسے وہاں سے شکاگو بھیجا گیا تھا، جہاں پر کچھ برسوں تک کام کرنے کے بعد اس کو جرمنی بلا لیا گیا۔ ابتدا میں اس کو کچھ عرصے تک ہمبرگ میں لطیف صاحب کے ساتھ مشن ہاؤس میں رہنا پڑا تھا، کیونکہ فرینکفرٹ میں بنائی جانے والے مسجد ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ دونوں خاندان صاحبِ اولاد تھے اور مشن ہاؤس کی مکانیت بہت محدود تھی۔ لطیف صاحب نے کنزے صاحب کی فیملی کو تہ خانے میں رکھنا چاہا تھا، مگر وہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوے اور انھوں نے مشن ہاؤس کے چار کمروں میں سے دو کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر عین انھیں دنوں میں مرزا لطف الرحمٰن کو ہمبرگ میں متعین کر دیا گیا۔ ان کا بستر مسجد کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا، جس کے سامنے پردہ ڈال کر اس کو نماز ادا کرنے والے حصے سے جدا کیا گیا تھا۔ جب خدا خدا کر کے فرینکفرٹ کی مسجد بن گئی اور کنزے صاحب کو وہاں کا مبلغ بنا کر بھیج دیا گیا، تو مرزا لطف الرحمٰن کو کہا گیا کہ وہ تہ خانے کے اس کمرے میں چلے جائیں، جہاں پر بعد میں مجھے رکھا گیا تھا۔ ان کو یہ چیز پسند نہ تھی اس لیے وہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر ان دو کمروں میں سے ایک کمرے میں جا گھسے، جو کنزے فیملی نے خالی کیے تھے۔ لطیف صاحب کو یہ چیز بالکل پسند نہ آئی اور انھوں نے وکالت التبشیر کو شکایت کا خط لکھا کہ مرزا لطف الرحمٰن کے اس طرح ان کی فیملی کے درمیان آ کر مقیم ہو جانے کے سبب ان کی بیوی کی پردہ دری ہوتی ہے۔ پھر ان کی بیٹی امۃ المجیب بلوغت کو پہنچ رہی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مرزا صاحب کی وجہ سے کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ نیز مرزا صاحب ان کے احکام کی پابندی کرنے سے انکاری ہیں۔ جب مرزا صاحب سے جواب طلبی ہوئی، تو انھوں نے لکھا کہ وہ نزلہ وزکام کے دائمی

مریض ہیں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر ان کی رہائش کا تہ خانے سے باہر انتظام نہیں ہوسکتا، تو خطرہ ہے کہ ان کی بیماری بڑھ کر سل کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اس لیے وہ لطیف صاحب کا حکم ماننے سے قاصر ہیں۔ اس پر ربوہ کی طرف سے ان کے ٹوگو (Togo) تبدیل کیے جانے کا حکم آ گیا اور وہ خاموشی سے ادھر چلے گئے۔

میرے ہمبرگ آنے کے کچھ عرصے بعد فرینکفرٹ مشن سے تشویش ناک خبریں آنے لگیں۔ کنزے کی بیوی قدسیہ نے اپنے خاوند کو عین مسجد کے اندر ایک مرد کے ساتھ مجامعت کرتے ہوے پکڑ لیا تھا۔ اس نے شور مچایا کہ اس کا خاوند ہم جنس پرست ہے۔ یہ بات البتہ شکاگو کے زمانے سے اس کے علم میں تھی۔ ہمبرگ میں بھی کنزے کا اٹھنا بیٹھنا ہم جنس پرستوں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس کے ذریعے مسلمان ہونے والا امین والٹر ہم جنس پرست تھا۔ جب وہ ایک بار ہمبرگ مشن ہاؤس میں ہمیں ملنے کے لیے آیا، تو میں پہلی ہی نظر میں جان گیا تھا کہ اس کا جسم مردانہ تھا مگر اس کی روح زنانہ تھی۔ لطیف صاحب بھی کنزے کی ہم جنس پرستی سے خوب واقف تھے۔ جب کنزے کی بیوی نے شور مچایا اور اپنے خاوند کو دھمکایا کہ وہ اس کی پولیس کے پاس رپورٹ کر دے گی، کیونکہ وہ لونڈوں کو مسجد میں لا کر ان کے ساتھ لواطت کرتا ہے تو بات بڑھ گئی۔ میاں بیوی کے درمیان چپقلش پہلے سے چل رہی تھی۔ اب رپورٹیں ربوہ تک پہنچ گئیں۔ وہاں سے ایک نیا مبلّغ بھیجے جانے کی خبر آ گئی۔

یہ نیا مبلّغ مسعود احمد جہلمی تھا، جس کو کچھ عرصہ پہلے ہالینڈ بھیجا گیا تھا۔ اس کو حکم ملا کہ ہمبرگ چلے جاؤ۔ اس کی ہمبرگ میں تقرری کا حکم نامہ بھی پہنچ چکا تھا۔ میرے بارے میں ربوہ نے لکھا کہ مجھے فرینکفرٹ بھیج دیا جائے، کیونکہ میں اس دوران میں اچھی خاصی جرمن سیکھ چکا تھا، اس لیے اگر فرینکفرٹ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، تو میں ان سے نپٹ سکوں گا۔ مگر لطیف صاحب کی بیوی نے، جن کے بارے میں میرا مضمون "مصباح" میں چھپا تھا، جس میں بیان ہوا تھا کہ مبلّغوں کے پہلو بہ پہلو ان کی بیویوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ ان کی قربانی اپنے خاوندوں سے کم نہیں ہے، کہا کہ منیر صاحب کے ساتھ اب ہمارا گزارہ اچھا خاصا ہو رہا ہے، خدا جانے مسعود جہلمی کیسا آدمی نکلے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو آگے فرینکفرٹ بھیج دیا جائے اور منیر صاحب یہیں رہ جائیں۔ میرے لیے ان کے چنگل سے نکلنے کا سامان پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شاید قسمت کو یہی منظور تھا اور اسی میں بہتری تھی۔

مسعود احمد جہلمی کو میں احمد نگر کے زمانے سے جانتا تھا اور اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا، جو اپنے باپ کو بھی بیچ کر کھا جائے۔ بہر صورت اس نے کنزے کا خوب مقابلہ کیا اور مسجد کو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا، وگرنہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ کنزے کسی دوسرے گروپ کے ساتھ

گھ جوڑ کر کے مسجد کو اپنے قبضے میں کر لے گا۔ اس جھگڑے میں ثالثی کے لیے ہالینڈ کے مبلّغ حافظ قدرت اللہ کو جرمنی بھیجا گیا تھا، جن کی رپورٹ پر کنزے کو مسجد سے نکل جانے کا نوٹس دیا گیا تھا۔

وکیل التبشیر مرزا مبارک احمد گرمیوں میں یورپ آئے، جس کو جماعت کے مشنوں کے کام کی پڑتال کا نام دیا جاتا تھا، مگر جو فی الواقع موصوف کی سالانہ یورپ یاترا ہوتی تھی جس کا مقصد سیر و سفر اور خریدِ اشیا تھا۔ میں اس کا ہمبرگ میں عینی شاہد ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ لطیف صاحب سے اور مجھ سے ہمبرگ میں تبلیغی سرگرمیوں کی روداد جاننا چاہیں گے مگر ہوا اس کے الٹ۔ اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کیا گیا۔ ان کو مشن کے خرچ پر ہمبرگ کے مہنگے ترین ہوٹل میں ٹھیرایا گیا۔ وہ دو بار مشن ہاؤس میں ایک دو گھنٹوں کے لیے آئے، جس کے دوران کھانا کھایا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ مشن کے کام اور تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں ایک بھی سوال نہ کیا گیا۔ لطیف صاحب ان کے ساتھ بازار میں خریداری کے لیے گئے اور چونکہ ایک پرفیوم ان کو پسند نہ آئی تھی، اس لیے مجھے وہ پرفیوم واپس کرنے کے لیے بازار بھیجا گیا۔ کیا میری غیر حاضری میں ان کو لطیف صاحب نے مشن کے کام کی رپورٹ پیش کی تھی؟ مجھ سے کیوں کوئی سوال نہ کیا گیا؟ کیا ان کو مشن کے کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی؟

تھوڑے دنوں کے بعد روزنامہ "تعمیر" کے مدیرِ منتظم محمد صفدر جرمن حکومت کی دعوت پر جرمنی کے دورے پر آئے۔ یہ دعوت ان کو میرے " مکتوبِ جرمنی " کی وجہ سے ملی تھی، جو میں باقاعدگی سے ہفتہ وار لکھ رہا تھا، مگر جس کے لیے مجھے کوئی معاوضہ ادا نہ کیا گیا تھا۔ محمد صفدر نے مجھ سے یہ طے کر رکھا تھا کہ معاوضہ میرے والد صاحب کو ملتا رہے گا، مگر ان کو صرف "تعمیر" کا شمارہ ملتا تھا۔ منی آرڈر ایک بار بھی نہ ملا۔ اس وجہ سے میں نے صفدر صاحب کو صاف صاف جواب دے دیا اور " مکتوبِ جرمنی " کا سلسلہ روک دیا۔ مجھے ایک ایسا تجربہ روزنامہ " شہباز" پشاور کے سابق ایڈیٹر شریف فاروق کے ساتھ بھی ہوا، جنکے ساتھ میرا تعارف انکے دورۂ جرمنی کے دوران ہوا تھا۔ انھوں نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر میں ان کے رسالے " جہاں نما" میں " مکتوبِ جرمنی " کا سلسلہ جاری کروں، تو وہ اسکے لیے معاوضہ ادا کریں گے۔ وہ بھی اپنا وعدہ پاکستان جانے کے بعد بھول گئے تھے، اس لیے میں نے دو یا تین مکتوبات چھپنے کے بعد یہ سلسلہ روک دیا تھا۔

مشن ہاؤس میں ایک روز ایک جرمن لڑکی ڈگمار کلاہر (Dagmar Klahr) آئی، جو اپنی تعلیم کے سلسلے میں ایک سال لندن میں قیام کے بعد ہمبرگ واپس لوٹی تھی۔ وہ ہمبرگ یونیورسٹی کی طالبۂ علم تھی۔ اس کو اسلام کے بارے میں جاننے کا شوق تھا، مگر اس سے بھی زیادہ اس کو اردو زبان سیکھنے میں دلچسپی تھی۔ میرے ساتھ اس نے طے کیا کہ وہ ہر جمعرات کی شام کو مشن ہاؤس میں آ جایا کرے گی۔ ایک گھنٹہ میں اس

کو اردو پڑھاؤں گا اور ایک گھنٹہ وہ مجھے جرمن زبان سکھایا کرے گی۔ دوسری یا تیسری ملاقات میں اس نے بتایا کہ اس کی ملاقات لندن میں ایک پاکستانی لڑکے کے ساتھ ہوئی تھی، جس سے اس کو محبت تھی۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی، اس لیے اردو سیکھ رہی تھی تا کہ تعلیم کے اختتام پر پاکستان جا کر رہ سکے۔ اس لڑکے کے ماں باپ چاہتے تھے کہ وہ واپس آ کر خاندانی کاروبار کو سنبھالے۔ ڈگمار میرے لیے نہ صرف جرمن زبان کی بہترین استانی ثابت ہوئی، بلکہ اس نے مجھے یورپ کی تہذیب سے متعارف کرایا۔ وہ میرا تلفظ درست کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی تھی کہ یورپ میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، میل ملاقات کے آداب کیا ہیں۔ اس نے مجھے یورپی موسیقی، آرٹ اور کلچر کے بارے میں بنیادی باتیں بتائیں جن سے میں بالکل ناواقف تھا۔ وہ میرا شاگرد ہونے سے زیادہ میری استانی تھی۔ وہ نہ ہوتی تو میں بھی شاید لطیف صاحب کی طرح یورپ کی تہذیب کو سمجھنے سے عاری رہتا۔ وہ آگے چل کر کچھ عرصے تک جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں میری کولیگ بھی رہی۔ ہماری دوستی اتنی پاکیزہ تھی جیسی بہن بھائیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ہم برسوں تک باقاعدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے رہے، مگر کبھی بھول کر بھی ہمارے درمیان بوس و کنار کی نوبت نہ آئی۔ میں اس کے بارے میں ایسے خیالات دل میں لا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی شادی اس کے پاکستانی دوست کے ساتھ نہ ہو سکی، کیونکہ اس نے اس کی لندن سے غیر حاضری کے دوران کسی دوسری لڑکی کو تلاش کر لیا تھا۔ ڈگمار نے کبھی اس بات کا گلہ نہ کیا۔ اس کی نظر میں اس کے دوست کی محبت اتنی گہری نہ تھی، جتنی خود اس کی، جو آخر تک اس سے محبت کرتی رہی تھی۔ جب اس نے ایک جرمن لڑکے سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تو مجھے اس سے ملنے کے لیے بلایا۔ اس روز اس نے پلاؤ پکایا تھا۔ اس موقع پر اس کا بھائی بھی موجود تھا، جو پیشے کے اعتبار سے جج تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بہن میرا ذکر اپنے گھر میں کیا کرتی تھی اور بتاتی تھی کہ میں نے اسے اسلامی تعلیمات سے نہ صرف متعارف کرایا تھا بلکہ اس کے دل میں اسلام کے لیے محبت ڈال دی تھی۔ ان کی فرمائش پر اس روز ہم سب نے پلاؤ کو انگلیوں سے کھایا تھا کیونکہ یہ چیز ان کے لیے نئی تھی اور وہ لوگ پاکستانی کھانے کو پاکستانی انداز میں کھانا چاہتے تھے۔

ایک اور لڑکی ایلیزابتھ موہر (Elisabeth Mohr) بھی مشن ہاؤس میں میرے پاس آیا کرتی تھی، جس کو انگلستان میں قیام کے دوران اسلام میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ملاقات برائٹن (Brighten) کے مقام پر ایک پاکستانی حافظِ قرآن سے ہوئی تھی، جو سمندر کے کنارے مونگ پھلیاں بیچا کرتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اکثر نوجوان لڑکیوں کو پھانس لیا کرتا تھا مگر اس کی اپنی تعلیم اتنی نہ تھی کہ ان کو اسلام کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ ایلیزابتھ اس وجہ سے ہمبرگ واپس لوٹنے پر مشن

ہاؤس میں آنے لگی اور چاہتی تھی کہ میں اسے اسلام کی تعلیم سے متعارف کراؤں۔مگر وہ جلد ہی لندن چلی گئی تھی اور جب برسوں کے بعد ایک بار میری اس کے ساتھ لندن میں ملاقات ہوئی تو وہ ان دنوں سا ین ٹالوجی (Scientalogy) کا کورس کررہی تھی، البتہ اس کی اسلام میں دلچسپی بدستور قایم تھی اور وہ لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں داخلہ لے کر اسلامک اسٹڈیز پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ایک روز ہمبرگ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں ایک جرمن طالب علم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اسے عربی پڑھا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں عربی جانتا ہوں اور اسے پڑھا سکتا ہوں، مگر وہ مجھ سے اردو کیوں نہیں سیکھتا۔اس پر اس نے بتایا کہ وہ قانون پڑھ رہا ہے اور تعلیم کے خاتمے پر فارن سروس میں جانا چاہتا ہے۔اس نے سوچا تھا کہ عربی سیکھ کر ایک زاید کوالیفی کیشن پیدا کی جائے۔اسکو پتا تھا کہ اردو کا چلن صرف برِصغیر ہندو پاک میں ہے، جہاں پر یوں بھی ہر کوئی انگریزی بولنے کو ترجیح دیتا ہے، جب کہ عرب ملکوں کی تعداد بیس بائیس کے لگ بھگ ہے اور وہاں پر لوگوں کو انگریزی کم ہی آتی ہے۔ میں نے اسکو عربی پڑھانے کی ہامی بھرلی مگر اس شرط پر کہ وہ بدلے میں میرے جرمن مضامین کی درستی کیا کرے گا۔ہم ہفتے میں ایک روز ملتے تھے۔ پہلے عربی سبق ہوتا تھا پھر اسے میرا اس ہفتے میں لکھا جانے والا مضمون دیکھنا ہوتا تھا۔مگر وہ زبان سیکھنے کی حد تک کند ذہن واقع ہوا تھا۔اس نے عربی رسم الخط سیکھنے میں مہینے لگا دیے، جبکہ میری دسترس جرمن زبان پر دن بدن بہتر ہوتی جارہی تھی۔ میں جرمن زبان کی کلاسیں اٹنڈ کرتا تھا۔ریڈیو کی نشریات کو باقاعدگی کے ساتھ سنتا تھا۔زبان سیکھنے کے سلسلے میں ٹیلی ویژن بہت حد تک ممد ثابت ہوسکتا ہے مگر ان دنوں ٹیلی ویژن میری پہنچ سے باہر تھا۔یوں بھی اس زمانے میں ٹیلی ویژن اکادکا گھروں میں پائے جاتے تھے، جن میں بلیک اینڈ وائٹ فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ میں نے اسکے متعلق ایک افسانہ "آنے والا ماضی" لکھا تھا، جو میری کتاب "بچھڑی ہوئی کونج" میں شامل ہے۔

مگر ایک اور شخص آرنولڈ اولبرش (Arnold Olbrich) کی کہانی اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھی، جس کے ساتھ میری ملاقات ابتدائی دنوں میں ہوئی تھی۔اس کی شخصیت اور پیچیدہ زندگی کو سامنے رکھ کر میں نے ایک افسانہ "پہلا مقدمہ" لکھا تھا، جو میری کتاب "شجرِ ممنوعہ" میں شامل ہے۔اس کی زندگی بہت الجھی ہوئی تھی۔اس کی ماں نے اس کی گرل برینڈ روزے ماری کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا جب کہ وہ حمل سے تھی۔ اس چیز کو وہ معاف نہیں کرسکتا تھا۔اس کی ماں کے نزدیک اس کے بیٹے کے نفسیاتی روگ کا سبب روزے ماری تھی۔ میں نے ماں بیٹے کے تعلقات میں پیدا ہوجانے والی مشکلات کی بنا پر یہ افسانہ لکھا تھا، جس کے کردار تو موجود تھے مگر بات کو اس کے فطری انجام تک پہنچانے کے لیے مجھے کہانی گھڑنی پڑی تھی۔

اولبرش کے ساتھ میرا ملنا ربوہ کے ایک پرانے دوست اسحٰق خلیل کی معرفت ہوا تھا، جو نائیجیریا میں جماعتِ احمدیہ کا مبلّغ بن کر گیا تھا، مگر کسی وجہ سے اس کو واپس بلا لیا گیا تھا۔ اس نے واپسی کے راستے میں روم میں قیام کیا اور ربوہ جانے کی بجائے ریل گاڑی پکڑی اور اپنے دوست کمال یوسف کے پاس کوپن ہیگن چلا گیا، جو اس زمانے میں ڈنمارک میں جماعتِ احمدیہ کا مبلّغ تھا۔ چونکہ اسحٰق کا ارادہ واپس جانے کا نہیں تھا اور کمال یوسف نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوپن ہیگن میں رہے کیونکہ اس طرح اس پر الزام آ سکتا تھا کہ اس نے اپنے دوست کو ربوہ کی مرضی کے خلاف اپنے پاس رکھ لیا تھا، اس لیے کمال یوسف نے اسے ہمبرگ جانے کا مشورہ دیا، جہاں پر اس زمانے میں ہر کسی کو آسانی کے ساتھ رہایش کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس نے آتے ہی ہمبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور میرے ساتھ جرمن زبان کا کورس کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے اور لطیف صاحب کے تعلقات کشیدہ ہیں، تو وہ ان کو میرے خلاف مواد مہیا کرنے لگا۔ چنانچہ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، تو اس نے فوراً ان کے پاس جا کر رپورٹ کی اور کہا کہ انھیں اس بات کی اطلاع ربوہ بھیجنی چاہیے۔ جس پر لطیف صاحب نے فوراً عمل کیا۔ اس بات کا علم مجھے کمال یوسف کی زبانی ہوا، جو ان دنوں ہمبرگ آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ میرے خلاف کیس بنایا جا رہا ہے۔ کوپن ہیگن واپس جاتے ہوئے وہ مجھے دعوت دے گیا کہ کرسمس کے دنوں میں یوں بھی جرمنی میں پبلک لائف بالکل تھم جاتی ہے اور ہمبرگ مشن میں کوئی کام نہیں ہوتا، اس لیے اگر میں اس کے پاس آ جاؤں تو خوب ہوگا۔

میں نے لطیف صاحب سے کرسمس کے دنوں میں کوپن ہیگن جانے کی اجازت چاہی، تو انھوں نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ میں نے کہا کہ کرسمس کے دنوں میں یوں بھی مشن کا کام بند ہو جاتا ہے اس لیے اگر میں تین چار روز کے لیے کمال یوسف کے پاس چلا جاؤں، تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ انھوں نے کہا کہ مرکز کی اجازت کے بغیر ہم اپنی ڈیوٹی کے ملک کو نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر میرے اصرار پر بالآخر انھوں نے مجھے اس شرط پر اجازت دے دی کہ میں سفر اپنے خرچ پر کروں گا۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہ تھی، کیونکہ میں ہچ ہائیکنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ذیل کی عبارت میرے افسانے "بے روزگار" سے درج کی جاتی ہے جہاں پر اس سفر کا حال بیان ہوا ہے:

"ریل گاڑی کے کرائے پر اٹھنے والے پیسے بچانے کی خاطر میں نے سفر ہچ ہائیکنگ کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس سے قبل ہچ ہائیکنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ سردیوں میں ہچ ہائیکنگ کا رواج نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے آٹوباہن پر جا کر کھڑے ہونے کے بعد ہوا۔ دور دور تک سڑک پر میں اکیلا کھڑا تھا۔ کئی روز سے دھیمی دھیمی برف باری ہو رہی تھی اور قریب قریب ایک

فٹ برف پڑ چکی تھی۔ میرے لیے برف باری سے نبرد آزما ہونے کا نیا نیا تجربہ تھا۔ میں نے ہاف بوٹ پہن رکھے تھے، جو اس زمانے میں میرا بوٹوں کا واحد جوڑا تھا، جو راولپنڈی سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اور واضح ہے کہ اسے برف باری کا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ میرے پاؤں یخ ہو رہے تھے اور مجھے خطرہ تھا کہ آدھ پون گھنٹے تک مجھے وہاں پر انتظار کرنا پڑا، تو میرے پاؤں کی انگلیاں ٹھٹھر کر جم جائیں گی، اس لیے میں مسلسل ناچنے ٹاپنے میں لگا ہوا تھا تا کہ خون کی گردش جاری رہے۔ میں اس اچھل کود میں اس درجہ مصروف تھا کہ مجھے ایک کار کے رکنے کی خبر تک نہ ہوئی، جو ستر اسی گز کے فاصلے پر جا کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔"

وہ مجھے بحری فیری تک پہنچا آیا تھا، جس میں ریل گاڑی بھی سفر کرتی ہے۔ جہاز میں میرا تعارف ایک ڈینش نوجوان سے ہوا جو مجھے کوپن ہیگن تک اپنی کار میں لے کر گیا۔

میرے پیچھے پیچھے اسحٰق خلیل بھی کوپن ہیگن پہنچ گیا مگر صرف ایک روز ٹھیرنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ اس کی باتیں سن کر کمال کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کہا تمھارے ہمبرگ لوٹنے سے پہلے تمھاری رپورٹ ربوہ بھیجی جا چکی ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ میں لطیف صاحب کی اجازت سے آیا ہوں، اس لیے رپورٹ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مگر کمال ان کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ میری واپسی کے دس بارہ روز بعد ربوہ سے جواب طلبی کا خط آ گیا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کیوں مبلّغ انچارج کی اجازت کے بغیر ملک سے باہر گئے تھے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے جانے سے پہلے لطیف صاحب سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ کرسمس کے دنوں میں جرمنی میں ہر قسم کی سرگرمیاں بند ہو جاتی ہیں، اس لیے مشن کے کام کا کوئی حرج نہیں ہوا۔ پھر وکیل التبشیر نے آخری ملاقات میں مجھے ہدایت کی تھی کہ کوپن ہیگن جانے کے لیے تیار رہوں اور ڈینش زبان سیکھوں، اس لیے میرا جانا وہاں کے حالات سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے تھا۔ یہ خط مجھے براہِ راست ربوہ بھیجنے کی اجازت نہ تھی، کیونکہ جماعتی نظام میں تمام خط و کتابت مبلّغ انچارج کی وساطت سے کی جاتی ہے، جس کو تمام خطوط کھلے ہوئے دینے پڑتے ہیں۔ لطیف صاحب نے میرا خط پڑھا اور روہانسی شکل بنائے ہوئے تہ خانے میں میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا اگر یہ بات وکالت التبشیر کے علم میں آ گئی کہ میں نے آپ کو کوپن ہیگن جانے کی اجازت دے دی تھی، تو میری شامت آ جائے گی، اس لیے مجھ پر رحم کھاتے ہوئے یہ فقرہ کاٹ دیں اور لکھیں کہ آیندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میں ان کی باتوں میں آ گیا اور میں نے سچ مچ اجازت ملنے والی بات کو کاٹ کر لکھ دیا کہ آیندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

ہفتے عشرے میں ربوہ سے ایک دوست سلیم صدیقی نے مجھے لکھا کہ تمھاری تبدیلی نائیجیریا کی جا

رہی ہے اور یہ قدم اس لیے اٹھایا جا رہا ہے کہ تم نے نظامِ سلسلہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں نے مرزا رفیق احمد کو خط لکھا کہ اس بارے میں تحقیق کر کے بتائیں کہ یہ بات درست ہے یا نہیں؟ انھوں نے اپنے بڑے بھائی مرزا مبارک احمد سے، جو وکیل التبشیر تھے، اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ یہ خبر غلط ہے، مگر اس خط کے ساتھ ہی ایک خط وکالت التبشیر کا ملا، جس میں پوچھا گیا کہ اس شخص کا نام بتاؤں، جس نے مجھے میری تبدیلی کے بارے میں اطلاع بھیجی تھی۔ گویا یہ خبر ایک راز افشا کرنے کے مترادف تھی۔ پھر چند دنوں کے بعد خط آیا کہ آپکی تبدیلی پہلے فیصلے کے مطابق نائیجیریا کر دی گئی ہے اس لیے آپ وہاں پر جانے کے لیے تیار رہیں اور ٹکٹ ملتے ہی اس ملک چلے جائیں۔ آپکے لیے ویزا بنوالیا گیا ہے۔ میں نے جواباً لکھا کہ یہ تبدیلی چونکہ سزا کے طور پر کی جا رہی ہے، اس لیے مجھے صفائی کا حق ملنا چاہیے۔ اسکا جواب آیا کہ آپ حکم عدولی کر رہے ہیں، جسکی سزا میں آپ کو وقف سے خارج کرنے کے علاوہ سلسلۂ عالیۂ احمدیہ سے نکالا جا سکتا ہے

میرے نزدیک یہ حکم سراسر ناجائز تھا اور میں کسی صورت میں اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ میں ایسے نظام کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔ اگر آج نہیں تو کل کو یہ لوگ مجھے نکال دیں گے۔ میں اگر اب ستائیس برس کی عمر میں جدا ہو جاؤں، تو تعلیم مکمل کر کے اپنا مستقبل بنا سکتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے دس برسوں کے بعد خارج کیا گیا تو کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ میرے سامنے ان بے شمار احمدی مبلّغوں کی مثالیں تھیں، جن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا تھا اور جو جماعت سے نکالے جانے کے بعد روٹی کے ٹکڑوں کو محتاج ہو گئے تھے۔ ان حالات میں میرے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ مشن ہاؤس کو خیر باد کہہ دوں۔ اس وقت تک میں نے جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ البتہ واضح تھا کہ یہ مرحلہ جلد یا بدیر آنے والا ہے، کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار جماعت کے عقاید کو تنقیدی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

مشن ہاؤس سے علیحدگی

مشن ہاؤس کو چھوڑنے کا فیصلہ تو میں نے کر لیا تھا، لیکن میری جیب میں اس وقت صرف بیس مارک تھے اور مجھے نظر آ رہا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے کچھ سرمایہ درکار ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ قدرت ایسے موقعوں پر خود کوئی انتظام کر دیتی ہے۔ میں مچھلی کے ایک ریستوراں میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گیا، تو وہاں پر میری ملاقات ایک پاکستانی تاجر سے

ہوئی، جس کے جرمنی آنے کا مقصد مرسڈیز کار اور الیکٹرک کا سامان خریدنا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ اسے اس سلسلے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں، کیونکہ دکانوں میں کسی کو انگریزی نہ آتی تھی اور ان کی جرمن اس کے پلے نہ پڑتی تھی۔ اس نے پوچھا کیا میں اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس خدمت کے لیے تیار تھا۔ اس نے مجھے مرسڈیز کاروں کا ایک شوروم دکھایا، جہاں پر اسکی پسند کی کار کھڑی تھی۔ میں نے مالک دکان سے بات کی اور کہا کہ میرا دوست فلاں کار خریدنی چاہتا ہے اور میں سودا کرا سکتا ہوں، مگر میری شرط یہ ہے کہ قیمتِ خرید میں سے مجھے کمیشن ملے۔ وہ فوراً اس کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ جھٹ پٹ کار کا سودا ہو گیا۔ اسکے بعد میں پاکستانی تاجر کو الیکٹرک سامان کی دکان میں لے گیا، جہاں پر اس نے ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور فوٹو کاپی کی مشین، جو نئی نئی آئی تھی، اور دوسرا بہت سا سامان خریدا۔ ہر جگہ پر مجھے کمیشن ملتا گیا۔ شام تک میری جیب میں اتنے مارک ہو گئے کہ میں دو چار مہینوں کے لیے خود کفیل ہو گیا۔ اب میرے لیے مشن ہاؤس کو خیر باد کہنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

اب مناسب رہائش گاہ حاصل کرنے کا مرحلہ تھا۔ اس بارے میں تفصیل میرے افسانے "رچرڈ رائٹ" میں درج ہے، جسے یہاں پر تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ درج کیا جاتا ہے:

"اتفاقاً میری ملاقات یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں ایک تیونسی طالب علم سے ہوئی، جو اپنا کمرہ چھوڑ رہا تھا اور اسے کھٹی بیئر کی طرح کسی مستحق کو دینا چاہتا تھا۔ اس نے کسی عرب واقف کار کی معرفت دوسرا ٹھکانہ تلاش کر لیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کمرہ چاہیے خواہ وہ سائبیریا میں ہی کیوں نہ ہو۔ تیونسی نے مجھے اپنے لینڈ لارڈ ہربرٹ کا فون نمبر دیا اور کہا: "اسے کہہ دینا کہ مجھے اپنے ملک واپس لوٹنا پڑ گیا ہے اس لیے میں تمھیں اپنی جگہ پر بھیج رہا ہوں۔" وہ کمرہ ہمبرگ کے بے حد پھیلے ہوئے شہر کے دور ترین علاقے میں تھا، جہاں سے یونیورسٹی آنے جانے کا ایک طرف کا سفر کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ دراصل سیگی اور اس کے خاوند ہربرٹ نے اپنے بیٹے کے امریکہ چلے جانے کے بعد سوچا کہ والٹر کا کمرہ کرائے پر چڑھا دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی غیر ملکی طالب علم ان کے پاس آ کر رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح گھر میں تھوڑی بہت رونق لگی رہے گی، وگرنہ کرایے کی رقم اتنی معمولی تھی کہ اس سے زاید آمدنی پیدا کرنے کی بات نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ ان کا مکان یونیورسٹی سے بہت دور شہر کے بیرونی علاقے میں واقع تھا، اس لیے انھیں امید نہیں تھی کہ کسی طالب علم کو وہاں پر آ کر رہنے میں دلچسپی ہو گی۔ مگر اعلان چھپنے والے روز ہی ایک تیونسی طالب علم کا فون آ گیا، جسے فوری طور پر کمرہ درکار تھا۔ جب اس کو ہر روز اتنا لمبا سفر کر کے شہر جانا پڑا، تو اس نے دو ہفتوں میں ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے ہربرٹ کو فون پر یہ بات بتائی اور پوچھا کہ کیا مجھے اس کے مکان میں کمرہ مل سکتا ہے۔ اس نے مجھے کمرہ دیکھنے کے لیے بلایا۔ یقیناً وہ اور اس کی

بیوی مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے راستہ بہت لمبا لگا، مگر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہربرٹ کے پاس قطعۂ زمین تو اچھا خاصا تھا، مگر مکان بہت مختصر تھا۔ سیگی نے خاص طور پر کافی تیار کر رکھی تھی، جس کے ساتھ کیک بھی کھانے کو دیا گیا۔ مجھے کمرہ پسند آیا اور ہربرٹ نے اس کے لیے جو کرایہ مانگا وہ بھی مناسب تھا۔ میں نے پوچھا کیا میں اسی روز منتقل ہو سکتا ہوں۔ انھیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہربرٹ نے کہا مجھے اس مہینے کا کرایہ نہیں دینا پڑے گا، کیونکہ تیونسی پورے مہینے کا کرایہ ادا کر چکا ہے۔ ہربرٹ نے مکان کی ایک چابی میرے حوالے کی اور کہا کہ میں جب چاہوں سامان لے کر آ سکتا ہوں۔

مجھے ہمبرگ واپس جانے اور مشن ہاؤس سے سامان لے کر لوٹنے میں آدھا دن لگ گیا۔ جب میں ہربرٹ کے مکان پر پہنچا، تو رات ہو چکی تھی۔ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ہربرٹ نے بتایا تھا کہ وہ اور سیگی شام کو اپنے دوستوں کے گھر تاش کھیلنے جائیں گے اور آدھی رات کے بعد واپس لوٹیں گے۔ گھر کی چابی میرے پاس تھی مگر دروازے کے پیچھے ان کا شیفر کتا جیکی کھڑا غرّا رہا تھا۔ جب میں پہلی بار اس گھر میں آیا تھا، تو کتا اس کمرے میں موجود تھا، جس میں میرا استقبال کیا گیا تھا، مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے مالکانِ مکان کی غیر موجودگی میں گھر میں داخل ہونے دے گا۔ کتوں سے مجھے ہمیشہ سے ڈر لگتا آیا ہے۔ اس کا سبب ہمارے گاؤں کے کتے تھے، جن کے ساتھ میرا بچپن میں واسطہ پڑا تھا۔ چونکہ ہم بھائی بہن سال دو سال کے بعد چھٹیوں میں گاؤں جاتے تھے اور کتے ہمارے لیے اور ہم کتوں کے لیے اجنبی ہوتے تھے، اس لیے ہم اندھیرا پڑنے کے بعد کتوں سے ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ وہ کتے یوں بھی ایسے وحشی تھے کہ ہر آنے جانے والے پر لپک پڑتے تھے۔ اس زمانے میں مجھے یورپ کے کتوں کا کچھ ایسا تجربہ بھی نہ تھا، جن کو خاص تربیت دی جاتی ہے۔ میں ہمت کر کے دروازے پر جاتا تھا اور جیکی کو نام لے کر پچکارتا تھا، مگر جواب میں اس کی غضبناک غرّاہٹ کو سن کر پچھلے پاؤں بھاگنا پڑتا تھا۔ تو کیا مجھے ساری رات دروازے پر کھڑا رہنا پڑے گا؟ ہمسائے میں دو مکان پائے جاتے تھے، مگر وہاں پر کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اس امید میں جا کر باری باری دونوں مکانوں کی گھنٹی بجائی کہ شاید وہ میری مدد کر سکیں گے۔ مگر وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔ گھنٹہ بھر سڑک پر کھڑا رہنے کے بعد میں نے ایک تجربہ کرنے کا ارادہ کیا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ میں تالا کھولنے کے بعد دروازے کی ہتھی کو مضبوطی سے پکڑے رکھوں گا اور جیکی کا ردِعمل دیکھوں گا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا، تو میں دروازے کو کھینچ کر بھیڑ دوں گا، وگرنہ اس کو پچکارتا ہوا اندر داخل ہو جاؤں گا۔ یہ اسکیم کارگر ثابت ہوئی۔ دروازہ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ جیکی نے مجھے پہچان لیا تھا اور بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے وہ ڈیوڑھی میں سیگی کے جوتوں کو لیے بیٹھا تھا۔ وہ بیچارہ سیگی کی جدائی پر غم زدہ تھا۔ اس نے میرے مکان میں داخل ہونے کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا۔ میری جان میں جان آئی

اور میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ اگلی صبح میں نے سیگی اور ہربرٹ کو رات کا ماجرا سنایا تو وہ بہت ہنسے۔ انھیں یہ بات بالکل نہ سوجھی تھی کہ میں جیکی سے ڈر کے مارے گھنٹہ بھر سڑک پر کھڑا رہوں گا۔"

اب میرے لیے اپنے گزارے کی خاطر آمدن پیدا کرنے کے لیے سوائے جسمانی مزدوری کے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ کیونکہ مجھے ابھی اتنی جرمن نہ آتی تھی کہ کسی دفتر میں لکھنے پڑھنے کا کام مل سکتا۔ جرمن زبان کی کلاسیں شام کو لگتی تھیں۔ چنانچہ دن بھر کارخانے میں مزدوری کرنے کے بعد شام کو میں وہاں سے سیدھا یونیورسٹی چلا جاتا تھا، جہاں پر میزا میں کھانا کھا کر مجھے کلاس اٹنڈ کرنی ہوتی تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ وہاں سے فارغ ہو کر میں انڈر گراؤنڈ ریل میں گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ ریل گاڑی کے آخری اسٹیشن سے مجھے بس لینی ہوتی تھی، جو ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چلتی تھی۔ جب میں گھر پہنچتا تھا تو اکثر رات کے بارہ بج چکے ہوتے تھے۔ ہربرٹ اور سیگی سو رہے ہوتے تھے اور صرف جیکی میرا استقبال کرتا تھا۔ مگر اب وہ مجھ پر نہیں بھونکتا تھا۔ اس نے مجھے گھر کے ایک فرد کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا تھا۔ اگلی صبح ہربرٹ شیو کرنے اور نہانے دھونے کے بعد مجھے جگا دیتا تھا۔ مکان میں باتھ روم ایک ہی تھا اس لیے ہم اسے باری باری استعمال کرتے تھے۔ جب میں باتھ روم سے فارغ ہو کر نکلتا تھا تو سیگی نے میری چائے کا پانی ابال رکھا ہوتا تھا۔ میں کھڑے کھڑے ناشتہ کرتا تھا اور اکثر لیٹ ہونے کی وجہ سے مجھے بس اسٹینڈ تک کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنا پڑتا تھا۔ سنیچر کے روز اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی آ جاتی تھی، کیونکہ مجھے کام پر نہیں جانا ہوتا تھا اور نہ ہی اس روز یونیورسٹی کی کلاسیں لگتی تھیں۔ ہربرٹ مجھے نو دس بجے جگاتا تھا اور میں ناشتہ کرنے کے بعد شہر چلا جاتا تھا، جہاں پر گھومنے پھرنے کے بعد مجھے میزا میں اپنے دوستوں سے ملنا ہوتا تھا۔ ہفتے میں بس یہی ایک شام ہوتی تھی جب میں دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاتا تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے علاقے میں ایک سینما ہاؤس پایا جاتا تھا جس کی ہر سیٹ کا ٹکٹ ایک مارک میں ملتا تھا۔ وہاں پر اکثر پرانی فلمیں لگتی تھیں مگر میرے لیے وہ نئی ہوتی تھیں کیونکہ ان میں سے کوئی فلم میری دیکھی ہوئی نہ تھی۔"

تھوڑے دنوں میں یونیورسٹی کا سرما کا سمسٹر ختم ہو گیا۔ ڈگمار نے، جس کے ساتھ میرا رابطہ بدستور قایم تھا، گھر جاتے ہوئے مجھے ہنوور کی سیر کے لیے آنے کی دعوت دی جو ہمبرگ سے ایک سو پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس سفر کا حال میرے افسانے "ہنوور کا سفر" میں درج ہے:

"ڈگمار نے مجھے اپنا شہر دکھانے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں ڈگمار میرے لیے ایک گائیڈ کا درجہ رکھتی تھی۔ جرمن معاشرے کو سمجھنے اور یہاں کی زندگی کے اصولوں کو جاننے کے لیے مجھے اس سے بہتر رہنما نہیں مل سکتا تھا۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ تیسری دنیا سے آنے والوں کا جب

یورپ میں ایک یکسر اجنبی ماحول سے واسطہ پڑتا ہے، جس کی قدریں مختلف ہوتی ہیں اور جہاں کے باسیوں کا رہن سہن، سوچ بچار اور معاملہ کرنے کے اصول دوسرے ہوتے ہیں، تو ان کو ایک ثقافتی دھچکا لگتا ہے جس کے اثرات بڑے دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ میں پاکستان کے ایک چھوٹے قصبے سے آیا تھا جہاں کی زندگی میں ایک قسم کا ٹھیراؤ تھا۔ تیز رفتاری نام کو نہ تھی۔ لوگوں کا آپس میں تعلق انسیت اور مؤدت کا تھا۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی محض دکھاوے کی چیز نہ تھی، بلکہ اس کا عملی اظہار قدم قدم پر ہوتا تھا۔ نمائش کی بجائے لوگ اخفا کو پسند کرتے تھے۔

جرمنی میں ہر چیز مختلف تھی۔ رات بھی دن کی طرح روشن تھی۔ چیزوں کی چمک دمک کے سبب انسان کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ ساری زندگی ایک نمایش کے مترادف تھی۔ دکانیں ہر قسم کے سامان سے لدی پھندی تھیں اور لوگ سامانِ آسایش و رہایش خریدنے میں اس قدر منہمک تھے، جیسے اس سے بڑی عبادت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ بازاروں اور دکانوں میں اس قدر بھیڑ ہوتی تھی کہ لگتا تھا سارا شہر وہیں پر امڈ آیا ہے۔ ہر چیز نئی تھی۔ یوٹیلیٹی اسٹور میرے لیے نمایش گھر تھے۔ میں بھی دوسروں کے ساتھ اپنے خالی اوقات کو دکانوں میں گھوم پھر کے گزارتا تھا، اگرچہ میری جیب میں پیسے اتنے تھوڑے ہوتے تھے کہ سوائے کھانے کے سامان کے میں اور کوئی چیز نہیں خرید سکتا تھا۔ میں جب لوگوں کو خریداری کرتے ہوئے دیکھتا تھا اور ان کے خوشی و مسرت کے سبب تمتماتے ہوئے چہروں کو تکتا تھا تو سمجھتا تھا کہ جرمن لوگ خوش و خرم زندگی بسر کررہے تھے۔ مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ اس مال و متاع کے حصول کی خاطر لوگ دن رات جان ماری کرتے تھے اور یہ کہ ان کی خوشیاں کتنی کھوکھلی اور عارضی ہوتی تھیں۔

ڈگمار کی زبانی مجھے نوجوان نسل اور اس کے والدین کے درمیان پائی جانے والی خلیج کا پتا چلا۔ دوسری عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے ابھی پندرہ برس ہی ہوئے تھے اور نازی پارٹی کے چیلے چانٹے معاشرے میں ہر طرف پائے جاتے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں سے ہر کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کا تعلق نازی پارٹی کے ساتھ کبھی رہا ہی نہ تھا۔ نوجوان نسل جب ان سے استفسار کرتی تھی کہ نازیوں کے انسانیت سوز جرایم کے خلاف تم نے کیا عملی قدم اٹھایا تھا، تو اکثر یہ جواب ملتا تھا کہ ہمیں ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ ڈگمار کا کہنا تھا کہ اس کا باپ نازی عہد میں سرکاری وکیل تھا۔ کم از کم اس کو پتا ہونا چاہیے کہ اس کے بچے اس جواب سے مطمئن نہ کیے جاسکتے تھے۔ ڈگمار کے الفاظ میں اس کے باپ کی نسل نے ایک عالمی جنگ ہار کر بھی کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اس کے باپ کو پتا تھا کہ ڈگمار ایک پاکستانی طالب علم سے محبت کرتی تھی اس لیے وہ بار بار کہا کرتا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی کو داماد کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں ایک ایسے ماحول سے آیا تھا جہاں پر بچے ماں باپ کے فیصلوں کی خلاف

ورزی کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔اب میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جرمن لڑکی کی زبانی سن رہا تھا کہ اسے نہ صرف اپنے باپ کی بات سے اختلاف تھا بلکہ وہ اسے اپنی زندگی میں دخل انداز ہونے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھی۔

ڈگمار ایک بالغ نظر لڑکی تھی اور اس کے ساتھ دوستی خود میری اپنی ذہنی ترقی میں بے حد ممد ثابت ہوئی۔ ہمارے درمیان کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر پوری آزادی کے ساتھ بات نہ کی جا سکتی ہو۔ میں نے دیکھا کہ جرمن عورتوں میں اپنے آپ پر حد درجہ اعتماد پایا جاتا تھا۔ ڈگمار شرم و حیا کا مرقع تھی۔ اس اعتبار سے وہ سراسر ایک مشرقی عورت لگتی تھی جس کو مغرب کی بے راہ روی جیسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔

یوتھ ہوسٹل میں ٹھیرنے کا انتظام کرنے کے بعد میں ڈگمار سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ اس روز ڈگمار کے علاوہ صرف اس کی ماں گھر پر تھی اور اس نے ہماری خاطر خاص طور پر ایک کیک تیار کر رکھا تھا۔ بالکل ایسا کیک وہ ہر ہفتے ڈگمار کو پارسل کے ذریعے بھیجا کرتی تھی، جس کا ایک ٹکڑا ڈگمار میری آمد والے دن تک بچا کر رکھا کرتی تھی۔ ہم ہفتے میں دو روز ملتے تھے اور گھنٹوں تک اکٹھے گزارتے تھے۔ دنیا جہاں کے موضوعات پر بحثیں کرتے تھے۔ لمبی سیریں کرنے نکل جاتے تھے اور گاہے گاہے اوپیرا یا تھیئٹر میں جاتے تھے۔ جرمن زبان کا جو لہجہ ہنوور میں بولا جاتا ہے اسے اس زبان میں اسٹینڈرڈ لہجہ قرار دیا جاتا ہے ۔اس طرح مجھے ڈگمار کی صورت میں بہترین استانی ملی تھی جس نے میرا لہجہ درست کرنے میں بے حد مدد کی۔"

مشن سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد مجھ پر سفر کرنے کی کوئی پابندی نہ تھی اس لیے میں چاہتا تھا کہ جرمنی کے مختلف شہروں اور یورپ کے ملکوں کی سیاحت کروں۔ اس سلسلے میں جرمن حکومت کی طرف سے طالب علموں کے لیے سیر و تفریح کا پروگرام میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا جس کا حال میرے افسانے "رچرڈ رائٹ" میں درج ہے اور یہاں پر تھوڑے ردوبدل کے ساتھ درج کیا جاتا ہے:

"ہر سمسٹر میں ایک گروپ کو برلن کی سیر کرائی جاتی تھی۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ طالب علموں کو دکھایا جائے کہ جمہوریت میں انسان کو کس قدر آزادی میسر ہے اور اس کے مقابلے میں مشرقی جرمنی کی اشتراکی حکومت کیسے انسانوں کو جکڑ کر رکھتی ہے۔ طالب علموں کو اس سیاسی پروپیگنڈے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ ان کو ایک ہفتہ مفت میں برلن کی سیر کرائی جاتی تھی جس کے دوران ان کو اونچے درجے کے ہوٹلوں میں ٹھیرایا جاتا تھا، اچھا کھانا کھلایا جاتا تھا، تھیئٹر اور اوپیرا کے شوز دکھائے جاتے تھے، اس لیے اگر ایک آدھ لیکچر جمہوریت کی افادیت پر بھی سننا پڑے تو بھلا کیا حرج ہے۔

اس سفر کے دوران میری ملاقات ایک انگریز لڑکی کیرول سے ہوئی، جو جرمن زبان میں مہارت

پیدا کرنے کے لیے لندن سے آئی ہوئی تھی، جہاں پر وہ یونیورسٹی آف لندن میں جرمن اور فرانسیسی پڑھ رہی تھی۔ مغربی برلن کی راتیں اس زمانے میں لمبی ہوتی تھیں، جن کو طالب علم ڈانسنگ باروں میں گزارتے تھے۔ میری اس وقت تک کسی لڑکی کے ساتھ دوستی نہ رہی تھی، اس لیے میں نہ تو لڑکیوں کے چونچلوں سے واقف تھا اور نہ ہی مجھے پتا تھا کہ فلرٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ شاید یہی میری ناتجربہ کاری کیرول کو بھا گئی تھی اور اس نے میرا قرب تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے تھیٹر میں جانے کی بجائے موسیقی کے پروگرام کا انتخاب کیا، تو وہ بھی اسی گروپ میں شامل ہوگئی۔ دوسرے روز میں نے آرٹ گیلری پر قدیم مصری تہذیب کے میوزیم کو ترجیح دی، تو وہ میرے پہلو بہ پہلو چلنے لگی۔ تیسرے روز تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہماری پسند ایک جیسی ہے اور کیرول مجھے اچھی لگنے لگی۔

ہمارے گروپ میں انگریز لڑکے لڑکیوں کا ٹولہ چھ افراد پر مشتمل تھا، جو دوسروں سے گردے کی بوٹی کی طرح الگ تھلگ رہتا تھا۔ یہ لوگ اکثر وقت آپس میں انگریزی بولتے تھے، جب کہ دوسرے غیر ملکی اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے کام چلاتے تھے۔ کیرول کی وجہ سے میں انگریزی ٹولے کا حصہ بن گیا۔ یہ لوگ چونکہ برطانیہ کے مختلف حصوں سے آئے تھے اور اپنے اپنے علاقے کا لہجہ بولتے تھے یا کم سے کم اپنے ہاں بولا جانے والا تلفظ استعمال کرتے تھے، اس لیے میرے لیے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا انگریزی سیکھنے کی حد تک خاصا نفع بخش ثابت ہوا۔

ہمبرگ واپس لوٹنے کے بعد میرا بہت سا وقت کیرول کے ساتھ گزرنے لگا، جو یونیورسٹی کے قریب مقیم تھی۔ اس زمانے میں میری کسی لڑکی سے دوستی نہ تھی۔ ہربرٹ کہا کرتا تھا کہ تمھاری کولھو کے بیل جیسی زندگی میں کسی لڑکی کے لیے گنجایش بھی تو نہیں ہے۔ پھر جب میں برلن کے سفر سے واپس لوٹا اور گاہے بگاہے کیرول کے فون آنے لگے تو ہربرٹ کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے تم نے برلن کے سفر کے دوران کسی انگریز لڑکی کا دل جیتا ہے۔ اس کو کسی اتوار کو یہاں پر لاؤ تاکہ ہم بھی تمھاری پسند کی داد دے سکیں۔"

شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کہیں غلط ہاتھوں میں تو نہیں پھنس گیا۔ سفر سے واپسی کے بعد میں ہفتے اور اتوار کو سویرے سویرے گھر سے نکل جاتا تھا اور کہیں آدھی رات کو لوٹتا تھا، جب کہ اس سے قبل میں اتوار کے روز دوپہر تک سویا رہتا تھا اور چونکہ آس پاس کوئی ریستوران نہ پایا جاتا تھا اس لیے پنیر کے ساتھ روٹی کھا کر اور چائے پی کر صبر شکر کر لیتا تھا۔ سگی کو یہ چیز اچھی نہ لگی اور اس نے کہا:

"ایک نوجوان آدمی کو ہفتے میں دو تین بار پیٹ بھر کر گوشت کھانا چاہیے۔"

پھر اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ وہ ہر اتوار کو مرغ پکا کر مجھے کھانے میں شریک کیا کرے گی۔ یہ

سلسلہ میرے برلن کے سفر تک چلتا رہا مگر وہاں سے واپسی پر اس میں یہ تبدیلی آ گئی کہ میں سویرے سویرے کیرول سے ملنے کے لیے نکل جاتا تھا اور سارا دن اس کی معیت میں باہر گزار دیتا تھا۔

جب مجھے سیگریڈ اور ہربرٹ کے ہاں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چلے، تو اچانک ان کے بیٹے والٹر نے امریکہ سے لکھا کہ وہ ہمبرگ واپس لوٹ رہا ہے۔ میں اس کے ماں باپ کے مکان پر اس کے کمرے میں رہتا تھا، مگر پیشتر اس کے کہ مجھے اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا جاتا سیگریڈ نے اس بارے میں اپنی بہن ایرنا سے بات کی جس کو ہر کوئی ٹانٹے (خالہ) ایرنا کے نام سے یاد کرتا تھا۔ دونوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ آپس میں طے کر لیا کہ والٹر کی واپسی پر مجھے ٹانٹے ایرنا کے ہاں کمرہ مل جائے گا۔ ٹانٹے ایرنا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی اور قد کاٹھ میں بھی دوسروں سے ممتاز تھی۔ اس جیسی شرافت کی پتلی اور ہر قسم کے ہیر پھیر سے پاک عورت میں نے اپنی ساری عمر میں کہیں نہیں دیکھی۔

جون کا پورا مہینہ اور جولائی کے دس دن کسی خواب کی طرح گزرے۔ میں نے کیرول کی معیت میں ہمبرگ اور اس کے گرد و نواح کے قابلِ زیارت مقامات کی جی بھر کر سیر کی۔ چونکہ ہم دونوں محبت کے میدان میں نئے نئے وارد ہوئے تھے، اس لیے اپنی جرأت سے خود ڈرتے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے، چومنے اور گاہے گاہے بغل گیر ہونے سے آگے بڑھنے سے ڈرتے تھے۔

سمسٹر ختم ہو رہا تھا اور کیرول کے انگلستان واپس جانے کی تاریخ قریب تر آ رہی تھی۔ حسنِ اتفاق سے انھی دنوں میں میری نظر سے نوٹس بورڈ پر ایک اعلان گزرا، جس میں انگلستان میں وسط جولائی سے وسط اگست تک منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمینار میں شمولیت کے لیے درخواستیں بھیجنے کی دعوت تھی۔ میرے خط کا جواب چند روز کے اندر آ گیا اور مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ جرمنی کے لیے تین سیٹیں رکھی گئی تھیں، جن میں سے ایک میرے حصے میں آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ انگلستان کے سفر پر کیرول کا ساتھ رہے گا۔ اس نے مجھے اپنے شہر گلوسٹر چلنے کی دعوت دی۔ وہ چاہتی تھی میں اس کے ماں باپ سے ملوں تاکہ میں ان کے اور وہ میرے بارے میں خود رائے قایم کر سکیں۔

اس زمانے میں تعطیلات کے دنوں میں طالب علموں کے لیے اسپیشل ٹرینیں چلتی تھیں، جن کا کرایہ رعایتی ہوتا تھا۔ ہم نے بھی ایک ایسی ٹرین میں سفر کرنے کا پروگرام بنایا، جو ہک فان ہالینڈ سے ایک فیری بوٹ میں چلی جاتی تھی۔ فیری نے ہمیں اگلی صبح انگلستان کے ساحلی مقام ڈوور پر پہنچا دیا۔ وہاں سے ٹرین لندن کے وکٹوریا اسٹیشن تک جاتی تھی۔ جب ہم لندن پہنچے تو کیرول کے شہر جانے والی بس چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے چار روز تک لندن میں قیام کے بعد بولٹن جاتے ہوئے راستے میں ایک رات کے لیے کیرول کے ماں باپ کے ہاں ٹھیرنے کا پروگرام بنایا۔

ان کا گھر ویسا ہی تھا، جیسے قطار وار بنے ہوے لاکھوں دوسرے گھر جن کے باسی اپنے گھر کو دوسروں کے گھروں سے ممتاز کرنے کے لیے اپنے دروازے پر اپنی پسند کا رنگ و روغن کر دیتے ہیں۔ کیرول کی ماں نے میرا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ کیرول کے باپ نے کھانے کے دوران مجھے انگلستان کے معاشرے کی کلاسوں میں تقسیم پر اچھا خاصا لیکچر دیا۔ وہ خود ٹیکنیشن تھا اور اپنی کلاس پر بے حد فخر مند۔ عام مزدور اور دیہاڑی کرنے والے لوگ اس کی نظر میں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرا خاندان کس کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے بتایا کہ ہم لوگ حکومت کے گوشواروں میں زمیندار گنے جاتے ہیں، کیونکہ باپ دادا کے وقتوں سے زمین کے مالک ہیں البتہ ابا جی گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ اس سے اس کی تسلی ہوگئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہندوستان میں ذات پات کی لعنت ہے اور انگلستان میں کلاس سسٹم کی بے ہودگی۔

اس سے اگلے روز کیرول مجھے اپنے شہر کی سیر کرانے کے بعد مانچسٹر جانے والی کوچ میں سوار کرا آئی، جہاں سے مجھے بولٹن جانے کے لیے ٹرین لینی تھی۔ مجھے سیمینار میں شرکت کے بعد جرمنی واپس لوٹ جانا تھا، جہاں پر میں نے ابھی صرف جرمن زبان کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہائر ایجوکیشن کا مرحلہ میرے سامنے تھا، جسکے اختتام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حصول تھا۔ کیرول کے سامنے استانی کا کیرئر تھا ،جسکے لیے اسے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایجوکیشن ڈپلوما لینا تھا۔ اس کا پیشہ ورانہ مستقبل انگلستان میں تھا، جب کہ میں اس زمانے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تعلیم کے خاتمے پر کس ملک میں رہایش اختیار کروں گا اور کون سا پیشہ اپناؤں گا۔ اس وجہ سے میرا خیال تھا کہ ہم اپنی مختصر داستانِ محبت کے نقطۂ اختتام پر آن پہنچے ہیں۔"

بولٹن میں اس زمانے میں میرا بھائی عبدالقیوم ناظر رہتا تھا، جو مجھ سے دو برس چھوٹا ہے، مگر مجھ سے دو برس قبل اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر انگلستان آ گیا تھا، جہاں پر اس کو ٹیکسٹائل ملز میں کام ملا تھا۔ اس نے یہ ہوشیاری کی کہ مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ٹریڈ کی ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ دی اور ایوننگ کلاسیں اٹنڈ کرتا رہا۔ اس کا فایدہ اسے یہ پہنچا کہ جلد ہی اس کا شمار اختصاصی علم رکھنے والوں میں ہونے لگا اور اس کے لیے اپنے پیشے میں ترقی کے راستے کھل گئے ،جس سے اس نے بھرپور فایدہ اٹھایا۔ مگر اس زمانے میں، جب میں اسے ملنے کے لیے بولٹن گیا تھا، وہ ابھی مزدوری کر رہا تھا اور بمشکل اتنی روزی کما سکتا تھا کہ اپنی بیوی برینڈا اور بچے پاؤل کے ساتھ دو وقت کی روٹی کھا سکے۔

قیوم مجھے لینے کے لیے بولٹن ریلوے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی برینڈا اس کے ساتھ نہ آئی تھی کیونکہ ان کے دو سالہ بچے کو سلانے کا وقت ہو گیا تھا۔ قیوم نے انگلستان پہنچنے کے بعد اتنے

تھوڑے عرصے میں شادی کر لی تھی، جیسے بریںڈا کبھی کی اس کی راہ تک رہی تھی۔ بریںڈا کا کہنا تھا کہ قیوم کو اس سے زیادہ شادی کرنے کی جلدی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ قیوم میں نرگسیت پیدا کرنے کی ذمے داری کس کی تھی۔ اس کا خیال تھا امی کے لاڈ پیار نے اس کی عادات کو بگاڑا ہوگا۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ قیوم کو اماں مرجو کی محبت لے ڈوبی تھی، جس نے قیوم کو اس کی پیدائش کے وقت سے گود لے لیا تھا اور اس کو اپنا بیٹا قرار دے دیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی اس نے کسی کو قیوم کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ اماں مرجو کی ٹہل سہل کا نتیجہ یہ تھا کہ قیوم اپنے حق میں امتیازی سلوک کو نہ صرف جائز سمجھتا تھا، بلکہ اسکا مطالبہ کھلم کھلا کرنے لگا۔ ہمارے اسکول کے دنوں میں یہ دستور تھا کہ جب کلاسیں بدلتی تھیں تو بچے اپنے کورس کی کتابیں دوسروں کے پاس بیچ دیتے تھے اور خود اگلی کلاس کی کتابیں اسی طرح سیکنڈ ہینڈ خرید لیتے تھے۔ میں نے مدرسے کی تعلیم کے دوران ہمیشہ اس پر عمل کیا اور شاذ و نادر ہی میرے والدین کو میرے لیے کوئی کتاب نئی خریدنی پڑی، جبکہ قیوم کے لیے کورس کی ساری کتابیں نئی خریدی جاتی تھیں۔ اسی طرح اس نے میری اترن کے کپڑے پہننے سے ہمیشہ انکار کیا جبکہ دوسرے بہن بھائیوں کے لیے یہ چیز کوئی مسئلہ نہ تھی۔

بولٹن کے آس پاس ہمارے گاؤں کے بے شمار لوگ آباد تھے۔ ایک روز قیوم مجھے "لٹل چنگا" دکھانے کے لیے مانچسٹر لے گیا۔ وہاں پر ایک تین منزلہ مکان کے سات آٹھ کمروں میں ہمارے گاؤں کے چوبیس افراد رہائش پذیر تھے۔ چونکہ یہ لوگ شفٹوں میں کام پر جاتے تھے، اس لیے وہ بستروں میں بھی شفٹوں کے حساب سے سوتے تھے۔ مجھے ان کی ایک بات کو جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ان میں سے ہر کوئی ہفتے میں ایک پونڈ چنگا کے پرائمری اسکول کی عمارت کی مرمت کے لیے دیتا تھا۔ البتہ مجھے علم نہیں ہے کہ یہ پیسے وہاں پر پہنچ بھی پائے تھے یا نہیں۔

تین روز وہاں پر ٹھیرنے کے بعد میں نے ریلوے اسٹیشن کی انکوائری سے اسٹڈلے کے بارے میں پوچھا، جہاں پر مجھے اسی ہفتے میں شروع ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں حصہ لینے کے لیے جانا تھا۔ اس سفر کا حال میرے افسانے "پچیسویں سالگرہ" میں درج ہے:

" کلرک نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں انگلستان کے کسی مقام کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا بلکہ دنیا کے کسی دور دراز جزیرے کا اتا پتا جاننا چاہتا تھا۔ اتفاقی طور پر مجھے علم تھا کہ وہ جگہ شیکسپیئر کی جنم بھومی اسٹریٹفورڈ اپون ایون (Stratford-upon-Avon) کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ یہ سنتے ہی کلرک کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے بتایا کہ وہاں پر پہنچنے کا سہل طریق کوچ سے سفر کرنا ہے، جو مجھے راستے میں دو جگہوں پر بدلنی پڑے گی۔ جب میں اسٹڈلے (Studly) والی بس میں

سوار ہوا، تو کنڈکٹر نہ صرف میرا ہم وطن بلکہ گرائیں نکل آیا۔ بس میں سوار ہونے سے قبل میں نے تصدیق کرانا چاہی تھی کہ کیا اس کی بس فی الواقع اسٹڈلے سے گزرے گی۔ اس نے جان لیا کہ میں اس ملک میں اجنبی تھا، اس لیے اس نے مجھ سے میرا اتا پتا پوچھا۔ اس کی اردو کا مخصوص پٹھوہاری لہجہ سن کر میں جان گیا کہ وہ میری طرح راولپنڈی کے گردونواح کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پہلو والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا تاکہ راستے میں گپ شپ ہو سکے۔ دوسری سواریوں کو ٹکٹ دینے کے بعد وہ میری طرف لوٹا اور اس نے میرے لیے ٹکٹ کاٹا، مگر مجھ سے کرائے کے پیسے لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ میں نے بہتیرا زور دیا مگر اس کے خلوص کے سامنے میری ایک نہ چلی۔

اسٹڈلے آنے پر بس نے جہاں پر مجھے اتارا تھا، وہاں پر دور و نزدیک کوئی شخص نہ تھا، جس سے اسٹڈلے کالج کا راستہ پوچھا جا سکتا۔ سورج ڈھل چکا تھا مگر شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ مجھے بس اسٹینڈ پر کھڑے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کالج کی بس آ گئی۔ پتا چلا کہ وہ سارا دن ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چلتی تھی۔ کالج وہاں سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس روز صبح سے مہمان سیمینار میں شمولیت کے لیے آ رہے تھے۔ تیس چالیس تو ضرور پہنچ چکے ہوں گے۔ کالج دراصل گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھا اور ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو گئی ہوئی تھیں۔ کیا مجھے پتا نہیں ہے کہ اسٹڈلے گرلز کالج ہے؟ پھر ڈرائیور کو شرارت سوجھی اور اس نے آنکھوں کو مچکا کر کہا کہ جو بستر ہمیں سونے کے لیے دیے جائیں گے وہ لڑکیوں کے بستر ہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا: کنواری لڑکیوں کے بستر۔ ابھی وہ اسٹڈلے کالج کا صرف اسی قدر تعارف کرا پایا تھا کہ کالج کی بلڈنگ آ گئی، جو وکٹورین اسٹائل کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ ڈرائیور مجھے استقبالیہ کی ڈیسک پر چھوڑ آیا، جہاں پر میرا استقبال ایک خاصی دلفریب سوئس لڑکی نے کیا، جو کاغذی کارروائی کے بعد مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے کے لیے گئی۔ راستے میں وہ مجھے کالج کے قواعد وضوابط بتاتی گئی۔ ڈائننگ ہال دکھایا اور کھانے کے اوقات سے آگاہ کیا۔ پانچ بجے کی چائے کا وقت ہو رہا تھا، جس میں شامل ہونے کے لیے جلدی کرنے کی وہ مجھے تاکید کرتی گئی۔

چائے کی گھنٹی بجنے پر میں دوسروں کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال میں پہنچا، جو چائے اور تازہ کیک کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ٹی بیگ سے چائے بنانے کی بیہودہ رسم نہ پڑی تھی۔ اتفاق سے مجھے استقبالیہ والی ایوون کی میز پر اس کے پہلو میں جگہ ملی۔ کالج کی سپرنٹنڈنٹ مسز ونٹر نے ہمیں سب سے پہلے کالج اور اس کی بلڈنگ سے متعارف کرایا، جو پہلے وقتوں میں ایک امیر کبیر خاندان کا رہایشی مکان رہ چکی تھی۔ وہ لوگ مر کھپ تو نہیں گئے مگر انھوں نے وہاں سے نقلِ مکانی کر لی تھی۔ البتہ ان کے جدِّ امجد کی روح وہیں پر رہ گئی تھی، جو راتوں کو کوریڈوروں اور ہالوں میں بھٹکتی ہوئی

پائی گئی تھی۔ جن لوگوں کا اس سے آمنا سامنا ہوا ہے ان کا کہنا ہے کہ بالکل بے ضرر ہے بلکہ اس نے ان کی موجودگی کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا تھا۔ اگر ہم میں سے کسی کو وہ راتوں کو نظر آ جائے تو اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کے پاس سے گزر جائیں۔

چائے کے بعد سمینار کا پہلا تعارفی اجلاس ہوا جس میں منتظمین نے اپنے بارے میں بتایا اور سمینار منعقد کرنے والی فرینڈز سوسائٹی کا تعارف کرایا۔ عرفِ عام میں ان کو کوئیکرز (Quakers) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی عقاید کی بنا پر یورپ بالخصوص انگلستان سے ان کو ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ امریکہ میں انھوں نے ایک صلح کل پالیسی کو اپنا لیا اور اس بات کا پرچار کرنے لگے۔ سمینار کا مقصد یہی تھا کہ دنیا کے مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں کے لوگوں کو یکجا کر کے ان کے باہمی مناقشات کا تجزیہ کیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ جنگ سے دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہر جنگ نئی بے انصافیوں کو جنم دیتی ہے اور انسانوں کے مابین فاصلوں کو بڑھاتی ہے جبکہ سارے مسائل صلح و آشتی کے ساتھ حل کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔

سمینار میں پینتیس ملکوں کے نمائندے شامل تھے، جن میں سے اکثر میری طرح یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ہندوستان کی نمائندگی جوشی کر رہا تھا، جو اس زمانے میں ہالینڈ میں پڑھتا تھا۔ وہ مغربی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ تقسیمِ ملک کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان گیا تھا۔ وہ مجھے ذاتی طور پر اچھا آدمی لگا، مگر ہمارے درمیان کشمیر حایل تھا اور ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا تھا۔ ہم سے زیادہ مشکل صورتِ حال کا سامنا اسرائیل سے آئے ہوئے ڈان اور جورج کو کرنا تھا۔ ڈان یہودی تھا، چیکوسلاواکیہ میں پیدا ہوا تھا اور ماں باپ کے ساتھ ہجرت کر کے اسرائیل میں جا کر آباد ہوا تھا، جب کہ جورج فلسطینی عیسائی عرب تھا، جس کا خاندان صدیوں سے اس ملک میں آباد تھا اور اسرائیل کے قیام کے بعد اس کو دوسرے درجے کی شہریت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جہاد سلامہ ایک فلسطینی مسلمان لڑکی تھی، جس کا خاندان ہجرت کر کے لبنان میں پناہ گزین ہوا تھا۔ وہ اس زمانے میں قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کی طالبہِ علم تھی اور اپنی خوبصورتی کے باعث ملکہِ سمینار تھی۔ اس کے ہمراہ قاہرہ سے فواد رمضان آیا ہوا تھا، جو اپنی تعلیم کے خاتمے پر صحافت میں ابتدائی تجربہ حاصل کر رہا تھا۔ گویا عرب کیمپ خاصا مضبوط تھا، مگر اسرائیل کے حامیوں کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہ تھی، کیونکہ دو یہودی، ایک امریکن اور دوسرا کینیڈین، سمینار میں موجود تھے۔ افریقہ کے کئی ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے، جن میں گھانا کی میری اور نائیجیریا کی روزی نمایاں تھیں۔ پہلی میٹنگ میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ روڈیشیا کا ایڈوارڈ اور جنوبی افریقہ کا جونزسن کلونیل ازم اور نسلی امتیاز کے خلاف

خوب معرکے ماریں گے۔ امریکہ کی سفید فام نسل کی نمائندگی ایڈتھ کررہی تھی، جب کہ سیاہ فام رچرڈ نہ تو باکسر تھا اور نہ ہی اتھلیٹ۔ وہ فلاسفی کا طالب علم تھا اور ہر بات کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔ کمیونسٹ یورپی ملکوں سے صرف دو نوجوان آئے ہوئے تھے، جن کا تعلق پولینڈ سے تھا اور ان کے اندازِ تقریر سے صاف لگتا تھا کہ پارٹی کے ممبر بلکہ شاید خفیہ پولیس کے کارکن تھے۔ مغربی یورپ کے تقریباً ہر ملک کے نمائندے موجود تھے، جن کی دلچسپیاں زیادہ تر ان سرگرمیوں تک محدود تھیں، جو سمینار کے پروگرام سے باہر تھیں۔ انھیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ شاموں کو موسیقی اور ناچ کا کیا انتظام ہے اور کب اور کن جگہوں کے تفریحی سفروں کا اہتمام کیا جائے گا۔

ابتدائی دنوں میں ہر کوئی اپنے اپنے مؤقف پر یوں اڑا ہوا تھا، جیسے اس سے ایک قدم ادھر یا ادھر ہونے سے دنیا ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ سمینار کا ڈائرکٹر مسٹر اوورا سٹریٹ بہت ہوشیاری کے ساتھ مباحثوں میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتا تھا اور بہت دھیرے دھیرے فریقین کو اس مقام پر لے جاتا تھا، جہاں پر پہنچ کر شرکائے بحث کو تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ مسئلے کا حل اس صورت میں ممکن نہیں ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے مؤقف پر اڑا رہے۔ البتہ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے چار ہفتوں کے دوران کشمیر، اسرائیل اور روڈیشیا سے لے کر جنوبی افریقہ تک سارے مسائل کو حل کر ڈالا تھا۔ ہم نے صرف یہ سیکھا تھا کہ دوسروں کے مؤقف کو بھی اسی سنجیدگی کے ساتھ پرکھنا چاہیے، جسکی توقع ہم دوسروں سے رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے مؤقف کے ساتھ برتیں گے۔"

میرے انگلستان سے واپس لوٹنے کی کہانی میرے افسانے " گوہلکے " میں درج ہے:

" میری ہمبرگ سے غیر حاضری کے دوران میرا سامان ٹانٹے ایرنا کے گھر پہنچا دیا گیا۔ مجھے پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ انگلستان کے سفر سے واپسی پر مجھے سیدھا وہیں پر جانا ہوگا۔ پورے ایک مہینے کا کرایہ مجھے نہ سگریڈ کے ہاں ادا کرنا پڑا اور نہ ٹانٹے ایرنا نے لینا پسند کیا۔ میں نے اس وقت تک ٹانٹے ایرنا کو بس دو تین بار دیکھا تھا، جب وہ اتوار کا دن اپنی بہن اور بہنوئی کے ہاں گزارنے کے لیے آئی تھی اور جب سگریڈ نے اس کا جشن منایا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بہت خاموش طبع اور انصاف پسند عورت تھی۔ اس کی ہر بات نپی تلی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے ہاں کمرہ دینے کا فیصلہ خدا جانے اس نے مجھ میں کیا دیکھ کر کر لیا تھا۔ اس بات کا علم مجھے بعد میں جا کر ہوا کہ اسے اپنے فلیٹ میں کرایہ دار رکھنے کی اجازت نہ تھی، البتہ اس کا ذاتی مہمان وہاں پر تین ماہ تک قیام کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا فلیٹ صرف تین کمروں پر مشتمل تھا اور جس کمرے میں مجھے رکھا جانا تھا وہ اس کی بیٹی ہیلگا کا تھا، جو اس زمانے میں پیرس میں پڑھتی تھی اور گاہے بگاہے ماں کو ملنے کے لیے ہمبرگ آیا کرتی تھی۔ گویا وہ کمرہ مجھے محض اس لیے دیا جا رہا

تھا کہ ٹانٹے ایرنا کو میری مدد کرنا مقصود تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ میں انگلستان کے سفر پر جانے سے پہلے اتنے تھوڑے نوٹس پر کہاں کمرہ تلاش کرتا پھروں گا، البتہ وہاں سے واپسی پر اس کام کے لیے میرے پاس تین ماہ کا عرصہ ہوگا۔

میں انگلستان کے سفر سے واپس لوٹا، تو مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ ٹانٹے ایرنا کے ہاں میرا کمرہ کیسا ہوگا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا، بلکہ مجھے کبھی اس محلے میں بھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا، جہاں پر ٹانٹے ایرنا رہتی تھی۔ بہرصورت میں پوچھتا پاچھتا وہاں پر پہنچ ہی گیا۔ اس کا فلیٹ ایک تین منزلہ سرخ بلڈنگ میں تھا۔ آس پاس ویسی ہی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ جگہ سٹی ٹرین کے اسٹیشن سے چھ سات سو میٹر کے فاصلے پر تھی، جہاں سے ہر پانچ منٹ کے بعد ریل گاڑی شہر کے مین اسٹیشن کے لیے ملتی تھی، جو وہاں سے صرف تین اسٹیشن دور تھا۔ چونکہ یونیورسٹی شہر کے مرکز میں تھی اس لیے مجھے یونیورسٹی آنے جانے کی آسانی ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ ٹانٹے ایرنا اس بات پر خوش تھی کہ اب اسے اکیلے ناشتہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ تو میرے لیے شام کا کھانا بھی پکانے کے لیے تیار تھی، مگر میں شام کو یونیورسٹی کے میزا میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے کو ترجیح دیتا تھا۔ بلکہ اب میرے لیے یہ ممکن ہوگیا تھا کہ شام کے وقت تھئیٹر میں جاسکوں، جس کے لیے طالب علموں کو ٹکٹ سستے داموں بلکہ اکثر مفت میں ملتے تھے۔ میں ان دنوں جرمن زبان کا امتحان پاس کرنے کے بعد باقاعدہ طور پر اپنے تعلیمی کورس کا آغاز کر رہا تھا۔

ٹانٹے ایرنا کے ہاں گزرنے والے تین ماہ بہت خاموشی اور اطمینان سے بسر ہوئے۔ میں نے کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔ مجھے اس کے اصولوں کا پتا تھا، جن میں سے پہلے نمبر پر یہ تھا کہ کوئی لڑکی میرے پاس شب بسری کے لیے نہیں آئے گی۔ دن کے وقت گھڑی کی گھڑی ملنے کے لیے کوئی آنا چاہے تو اس پر پابندی نہ تھی۔ اتوار کے روز دوپہر کا کھانا ہم اکٹھے کھاتے تھے، کیونکہ اس روز یونیورسٹی کا کیفے ٹیریا بند ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان ٹانٹے ایرنا خرید کر لاتی تھی اور مجھ سے صرف ان چیزوں کے پیسے لیتی تھی، جو میرے استعمال میں آتی تھیں۔ اس نے ازخود میرے کپڑے بھی دھونے شروع کر دیے۔ اس طرف سے بےفکر ہو کر میں سارا وقت اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے صرف کرسکتا تھا۔ مجھے یہ لگتا تھا جیسے میں اپنی ماں کے پاس رہ رہا ہوں، جسے اس زمانے میں مرے ہوئے ایک دہائی ہوچکی تھی۔ ٹانٹے ایرنا مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھی، جس کی اس کے دل میں ہمیشہ خواہش رہی تھی۔"

ٹانٹے ایرنا کو چونکہ اپنے پاس مہمان کو صرف تین ماہ تک رکھنے کی اجازت تھی، اس لیے مجھے اس مدت کے خاتمے سے پہلے دوسرا کمرہ تلاش کرنا تھا۔ میں نے دو تین ہوسٹلوں میں درخواست دے رکھی تھی، مگر کسی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہیں مل رہا تھا۔ پھر ایک کیتھولک ہوسٹل کی طرف سے، جو مردوں

کے لیے مخصوص تھا، ڈبل روم میں ایک سیٹ کی پیشکش ہوئی۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور وہاں پر منتقل ہو گیا۔ یہ ہوسٹل یونیورسٹی کے علاقے میں تھا، جس کے سبب مجھے لیکچروں میں جانے کی آسانی ہو گئی۔ اس لیے میں نے ڈبل روم میں رہنا قبول کر لیا اگر چہ عرصہ ہوا میں نے کسی کے ساتھ کمرہ شیئر نہیں کیا تھا۔ عام طور سے جرمن ہوسٹلوں میں کھانے کا انتظام نہیں ہوتا، مگر اس ہوسٹل میں دوپہر کا کھانا ملتا تھا جو یونیورسٹی کی کینٹین سے بدرجہا بہتر ہوتا تھا۔ میں نے جرمن زبان کا امتحان تو پاس کر لیا تھا، مگر میری دسترس زبان پر ابھی اتنی اچھی نہ تھی کہ کسی آفس میں کام کر سکتا۔ البتہ میں نے انگریزی کی ٹیوشن پڑھانے کے لیے اخبار میں اشتہار دینے شروع کیے۔ اس میں یہ فایدہ تھا کہ میں اپنے کام کے اوقات خود مقرر کر سکتا تھا اور آمدنی بھی اچھی ہو جاتی تھی۔ اس ہوسٹل میں ایک خاص چیز یہ تھی کہ اگر کوئی ملاقاتی لڑکی آئے تو اس امر کی رپورٹ کرنی پڑتی تھی، جس کا طریق یہ تھا کہ ایک کاغذ پر اپنا نام اور روم نمبر درج کر کے لکھنا ہوتا تھا کہ فلاں وقت میرے کمرے میں ملاقاتی لڑکی آ رہی ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ یہ چٹھی دیکھتے ہی فوراً متعلقہ کمرے میں پہنچ جاتا تھا، مگر پوز یہ کیا جاتا تھا کہ وہ محض اتفاقی طور پر ادھر نکل آیا تھا۔ ہوسٹل کا سارا عملہ پادریوں اور ننوں پر مشتمل تھا، جن کو شادی کرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ پھر ایک روز سپرنٹنڈنٹ کے بارے میں خبر نکلی کہ اس نے شہر میں ایک داشتہ رکھی ہوئی ہے، جس سے اس کے دو بچے بھی ہیں۔ چنانچہ اس کو فوری طور پر چرچ سے خارج کر کے نوکری سے نکال دیا گیا۔"

میں جس کمرے میں رہتا تھا اس میں دوسرا بستر کچھ عرصے سے خالی پڑا تھا۔ ایک شام کو سپرنٹنڈنٹ میرے پاس یہ خبر لے کر آیا کہ انھیں یونیورسٹی کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ ہاؤسا زبان کا لیکچرر اگلے روز ہمبرگ پہنچ رہا ہے، جس کو عارضی طور پر اس ہوسٹل میں ٹھیرایا جائے گا، اس لیے آیندہ دو تین ہفتوں کے لیے مجھے ایک افریقن مسلم کے ساتھ کمرہ شیئر کرنا ہو گا۔ میں دوسرے روز یونیورسٹی میں ایک لیکچر سننے کے بعد واپس لوٹا تو ایک ساٹھ سالہ معزز شخص کو اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا پایا۔ پتا چلا کہ مسٹر ابراہیم نارتھ نائیجیریا کی سٹیٹ میں وزیرِ تعلیم ہیں۔ ان کو عارضی طور پر گورنر احمد او بیلو کے حکم پر آنا پڑا تھا کیونکہ ہمبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر ہان نے ان کو بتایا تھا کہ ہمبرگ یونیورسٹی میں ڈیڑھ سال سے ہاؤسا زبان پڑھانے والے لیکچرار کی آسامی خالی پڑی ہے۔ یہ سن کر گورنر احمد او بیلو نے اپنے وزیرِ تعلیم کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ جب تک ہمیں کوئی دوسرا مناسب لیکچرر نہیں مل جاتا آپ ہمبرگ چلے جائیں اور یہ خدمت بجا لائیں۔ جونہی ہمیں آدمی مل گیا ہم آپ کو واپس بلا لیں گے۔

مسٹر ابراہیم بہت نفیس انسان تھے۔ انھوں نے مجھے افریقہ میں اسلام کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچائیں۔ ہم آدھی رات تک ایک دوسرے سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔

پھر ایک روز میں نے ان کے منہ سے سنا کہ ان کو دوسری بیوی بہت یاد آ رہی ہے۔ میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کو پہلی بیوی کیوں یاد نہیں آتی؟ انھوں نے کہا کہ وہ عمر رسیدہ عورت ہے۔ اس کے بچے اور پوتے پوتیاں ہیں۔ وہ ان کے درمیان خوش ہے جب کہ دوسری بیوی صرف بیس برس کی ہے اور ہماری شادی کو ابھی تین ماہ بھی نہیں ہوے۔ میں نے حیرانی کا اظہار کیا کہ انھوں نے اتنی کم عمر کی عورت کے ساتھ شادی کی تھی، جب کہ وہ خود ساٹھ سال کے ہیں۔ میں یہ بھی کہہ بیٹھا پتا نہیں کیوں مسلمان شادیوں پر شادیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس پر مسٹر ابراہیم چونکے اور انھوں نے کہا اس لیے کہ ہمیں قرآن میں چار شادیاں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ چیز فرض نہیں ہے بلکہ مخصوص حالات میں اس کی استثنائی طور پر اجازت دی گئی ہے۔ اس پر انھوں نے کہا مجھے آپ کے ایمان کے بارے میں شبہ ہے اس لیے میں کل اس کمرے کو چھوڑ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اگلے روز کمرہ خالی کر کے ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔

اس دوران میں میری تعلیمی سرگرمیاں زور شور پر تھیں۔ جرمن زبان پر میری دسترس دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے سمینار کا ایک سینئر طالب علم ایک سال کے لیے امریکہ جا رہا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کی غیر حاضری میں جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں اس کی جگہ پر ریسرچ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی اور وہاں پر کام شروع کر دیا۔ اتفاق ایسا تھا کہ مجھے ڈاکٹر ہانس کورنرومپف (Hans Kornrumpf) کی ذات میں ایک نفیس کولیگ ملا، جو طالب علمی کے زمانے میں مسلمان ہو گیا تھا اور ایک وقت میں، جب برلن مسجد کا کوئی امام نہیں تھا، اس مسجد کا متولی رہ چکا تھا۔ تعلیم کے خاتمے پر وہ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے مصر میں ڈیڑھ سال تک جرمن زبان کا لیکچرر رہا، مگر پھر ایک طالب علم نے اس پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ جرمنی واپس لوٹ گیا تھا اور اس کی مسلمانی کمزور پڑ گئی تھی۔ میرے حق میں اس کی دوستی بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس کو جرمن زبان پڑھانے کا تجربہ تھا اور میں نے اس کی قابلیت سے بھرپور فایدہ اٹھایا۔ اتفاق ایسا تھا کہ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر میسر شمیت (Messerschmidt) پاکستان میں مقیم رہ چکے تھے اور انھوں نے پاکستان پر جرمن زبان میں پہلی کتاب لکھی تھی۔ وہ میرے کام سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ میں مستقل طور پر انسٹیٹیوٹ میں رہ جاؤں مگر میرا پروگرام دوسرا تھا۔ میں نے ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا اور چاہتا تھا کہ مالی طور پر کوئی سہارا مل جائے تو میں کل وقتی طور پر اس کام پر لگ جاؤں۔ آٹھ نو ماہ میں یہ مرحلہ آ گیا اور میں انسٹیٹیوٹ کو چھوڑ کر یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا۔

ہوسٹل میں مجھے کئی ماہ تک انتظار کرنے کے باوجود الگ کمرہ نہیں مل سکا تھا، اس لیے میں نے وہاں سے نقلِ مکانی کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ جب ٹانٹے ایرنا کو اس بات کا پتا چلا، تو اس نے اپنے طور پر اپنی

نند مائیکے کے ہاں میرے لیے کمرے کی بات کر لی۔ وہ لوگ مجھے نہیں جانتے تھے، اس لیے مجھے ایک اتوار کی سہ پہر کو مائیکے کے خاوند گوہلکے کے حضور انٹرویو کے لیے حاضر ہونے کو کہا گیا۔ ٹانٹے ایرنا نے چلتے ہوئے مجھے کہا کہ گوہلکے ذرا اکھڑ آدمی ہے اور پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی بات کو رد کرے حتیٰ کہ اس کی بیوی کو بھی اس کے سامنے جھک کر رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اسے گوہلکے بالکل پسند نہیں ہے، مگر آدمی کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ میں گوہلکے کے سامنے کسی قسم کی شوخی کا اظہار نہ کروں، جس کے نتیجے میں وہ مجھے کمرہ دینے سے انکار کر سکتا ہے۔ تفصیل میرے افسانے "خود غرض عورت" میں پائی جاتی ہے:

"میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ گوہلکے کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو جوانی کے زمانے میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ اس کے نقش و نگار بے حد دلکش تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر تناؤ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا، جہاں پر گوہلکے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کمرے کے عین درمیان رکھی ہوئی ایک میز کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میز پر تین پیالیاں پڑی تھیں اور گوگل ہوپف کیک رکھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس دوران میں کافی کی چینک لانے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ میں اس کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار کرنے لگا۔ اسے یقیناً ٹانٹے ایرنا نے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور کب سے جرمنی میں ہوں اور کیا پڑھتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر میرے بارے میں بھلا جاننے کو کیا رکھا تھا؟

گوہلکے نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ وہ کارل مائی کی تصنیف ہے اور کردستان کے بارے میں ہے۔ پھر اس نے کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کیا، جس میں ایک جیسی مجلد کتابوں کی چالیس پچاس جلدیں رکھی تھیں۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس کارل مائی کی کتابوں کا مکمل سیٹ موجود ہے، جس کو اس نے بچپن میں پہلی بار پڑھا تھا اور اب چوتھی بار پڑھ رہا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے بیکر ماسٹر اور کچھ ایسا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ شاید وہ مجھے یہ جتانا چاہتا تھا کہ میں اسے ان پڑھ مزدور نہ جانوں۔ وہ قاری ہے جو کارل مائی کی ساری کتابیں پڑھ چکا ہے۔

کارل مائی ان غیر معمولی مصنفوں میں سے ہے، جس نے انیسویں صدی میں مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں اور امریکہ کے ریڈ انڈین کے بارے میں ایڈونچرس ناول لکھے، جو جرمنوں کے ہاں بے حد مقبول ہیں۔ جس زمانے میں اس نے یہ کتابیں لکھیں وہ دھوکے بازی کے جرم کے تحت جیل خانے میں قید کی

سزا کاٹ رہا تھا۔ اس نے اس وقت تک جرمنی کی سرحدوں سے باہر قدم نہ دھرا تھا۔ جو کچھ تھوڑا بہت وہ ان ملکوں کے بارے میں جانتا تھا وہ دوسروں کی کتابوں سے ماخوذ تھا، بلکہ بیشتر چیزیں اس کے اپنے دماغ کی ایجاد تھیں۔ جرمنوں کے اندر عربوں، کردوں، ترکوں اور امریکہ کے ریڈ انڈین کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں اسی کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ آج تک اس کی کتابیں ہر جرمن طالب علم بچپن میں پڑھتا ہے اور ساری عمر ان کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ کارل مائی جرمن زبان کا سب سے بڑا بیسٹ سیلر مصنف ہے، جس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر جرمن گھروں کی زینت بنتی ہیں اور نسل در نسل جرمن قوم کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مگر یہ باتیں اس زمانے میں ابھی میرے علم میں نہ آئی تھیں۔ میں نے اس کی کتابوں کی بنا پر بنائی جانے والی چند فلمیں دیکھی تھیں جو ریڈ انڈینز کے بارے میں تھیں۔ چونکہ میں ابھی ہالی وڈ کی فلم انڈسٹری پر پوری طرح ایمان نہیں لایا تھا، اس لیے کارل مائی مجھے ریڈ انڈینز کے بارے میں زیادہ مستند لگتا تھا۔ اس کی کہانیوں میں ریڈ انڈینز اپنی بات کے پکے، بہادر اور نڈر ہوتے تھے جو سفید چمڑی والوں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چونکہ وہ لوگ ہیر پھیر نہیں جانتے تھے اس لیے ان کو دھوکا دے کر مارا جاتا تھا۔ کہانی کے قاری کے دل میں ان کے لیے عزت اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے جرمن بچے عام طور سے جنگی کھیلوں میں بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے لیے ریڈ انڈین نام اختیار کرتے ہیں، جو عام طور سے کارل مائی کی کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں جرمن بچے کرسمس یا برتھ ڈے پر ماں باپ سے تحفے میں ریڈ انڈین لباس، جن میں پرندوں کے رنگ برنگے پر لگتے ہیں، اور ان کے جنگی ہتھیار دیے جانے کی فرمایش کرتے تھے۔

پتا نہیں کیسے ہماری گفتگو کا رخ کارل مائی کی کتابوں سے ہٹ کر دوسری عالمگیر جنگ کی طرف مڑ گیا، جس کو ختم ہوئے سولہ سال ہو چکے تھے، مگر جس کے اثرات جرمن معاشرے میں قدم قدم پر ملتے تھے۔ گو ہلکے نے کہا کہ وہ پہلے دن سے آخری دن تک جنگ کے محاذ پر پہلی صف میں لڑا تھا، مگر اسے یقین تھا کہ اس کی بندوق سے کوئی انسان نہیں مارا گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس طرح ممکن تھا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ ہوا میں گولیاں چلاتا رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کا رخ دشمن کے مورچوں کی طرف ہوتا تھا، مگر اس کی چلائی ہوئی گولیاں دشمن فوجیوں کے سروں کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ میں نے کہا کہ شاید اسی وجہ سے جرمن فوج کو اسٹالن گراڈ میں منہ کی کھانی پڑی تھی۔ گو ہلکے میرے طنز کو خاموشی سے پی گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی بات بودی تھی اور مجھے پتا تھا کہ جنگ کے محاذ پر انسان اپنی جان بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ اگر وہ دشمن کو نہیں مارتا تو خود مارا جاتا ہے۔ اور کون اس طرح مرنا چاہتا ہے

گوملکے جنگ کے خاتمے پر پانچ برسوں تک روسی جنگی قید میں رہا تھا، جس کے دوران اسے سائبیریا کے علاقے میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنا پڑا تھا، جن کی سرنگیں اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ ان میں گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے پرسے، جس پر دائمی سوجن رہتی تھی، پتلون کو اوپر اٹھا کر دکھایا کہ کوئلہ اس کی جلد میں دھنس گیا تھا۔ وہیں پر وہ گنٹھیا کی بیماری کا شکار بنا تھا۔ اس کے بدن کے جوڑوں میں مستقل درد رہتا تھا، بالخصوص جب موسم بدلتا تھا اور ہوا میں خنکی بڑھ جاتی تھی۔ ان کو اس سارے عرصے میں کبھی بیگار سے چھٹی نہ ملتی تھی یہاں تک کہ بیماری کی حالت میں بھی ان کو کوئلے کی کان میں اترنا پڑتا تھا۔ ایک بار اس کی حالت بہت خراب تھی اور اسے سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ کیمپ کی لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ اسے دوروز کا ریسٹ ملنا چاہیے، مگر بدقسمتی سے اس روز کے لیے بیماروں کا کوٹہ پورا ہو چکا تھا۔ ایک مقررہ تعداد سے زیادہ قیدیوں کو بیماری کی چھٹی نہیں دی جا سکتی تھی۔ گوملکے نے کہا کہ ان کو کھانے کے لیے اتنا کم راشن ملتا تھا کہ ایک بچہ بھی اس راشن پر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس وجہ سے بے شمار قیدی ہر روز مرتے تھے، جن کو بے پرواہی سے کسی گڑھے میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ جب پانچ برسوں کے اس عذاب کے خاتمے پر اس کو جرمنی واپس بھیجا گیا تو اس کا وزن بمشکل ایک تہائی رہ گیا تھا۔ اس کی بیوی اسے لینے کے لیے قیدیوں کے کیمپ میں آئی تو اسے پہچان نہ سکی۔ وہ خود اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا گیا تھا اور جب اس نے مائیکے کا نام لے کر پکارا تو وہ اسے دیکھ کر یوں آنکھیں پھاڑے ہوئے کھڑی رہ گئی تھی جیسے وہ اپنے خاوند کو نہیں کسی بھوت کے ہیولے کو دیکھ رہی ہو۔

گوملکے اونچے قد کا آدمی تھا، جس کو گنٹھیا کی بیماری نے وقت سے پہلے نڈھال کر دیا تھا۔ ٹانٹے ایرنا نے مجھے بتایا تھا کہ گوملکے اپنے کام کے سوا کسی چیز سے واسطہ نہیں رکھتا۔ اس کا کسی کے ہاں آنا جانا نہیں تھا حتیٰ کہ اس نے اپنی بیوی کو ٹانٹے ایرنا کے ہاں سال بھر میں ایک بار ہونے والی سالگرہ کی پارٹی میں بھی شامل ہونے سے منع کر رکھا تھا۔ جب تک ٹانٹے ایرنا کا خاوند ایریش زندہ تھا، وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے ان کے گھر چلا جاتا تھا مگر گوملکے کبھی ان کے گھر نہیں آتا تھا۔ اس کا بہانہ یہ تھا کہ اس کے بیکری میں کام کے اوقات ایسے بے ہودہ ہیں کہ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔

گوملکے نے کہا کہ اس کو پسند نہیں ہے کہ اس کے فلیٹ میں کسی قسم کا شور شرابا ہو بالخصوص شام پڑنے کے بعد کوئی ملاقاتی وہاں پر نہیں آ سکتا، کیونکہ دروازے کی گھنٹی بجنے سے اس کی نیند میں خلل پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں جرمنی میں قانونی طور پر ذیلی کرائے داروں کو ملنے کے لیے آنے والے مہمان رات کے دس بجے تک ان کے پاس ٹھیر سکتے تھے۔ اگر کوئی مہمان دس بجنے کے بعد تک رک جاتا تھا، تو اس بنا پر ذیلی کرائے دار کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دیا جا سکتا تھا۔ گوملکے سرِشام

مرغیوں کی طرح دڑبے میں بند ہو کر سو جاتا تھا۔ اسے بہت سویرے کام پر جانا ہوتا تھا۔ بیکری میں کام رات کے اڑھائی تین بجے شروع ہوتا تھا تاکہ لوگوں کے بیدار ہونے اور کام پر جانے سے پہلے ان کے ناشتے کے لیے بن، ڈبل روٹی اور جرمنی کی خاص گول روٹی، جس کو بروئٹ شن (Brötchen) کہتے ہیں اور جو کسی تکڑے آدمی کی بند مٹھی کے برابر ہوتی ہے، تازہ تازہ تیار ہو کر دکانوں میں پہنچا دی جائیں۔

اس زمانے میں بیشتر گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ لگ چکے تھے، صرف گوہلکے کے ہاں اس کی آمد پر پابندی تھی۔ اس کی بیوی کو شام پڑنے کے بعد ریڈیو سننے کی بھی اجازت نہ تھی، کیونکہ گوہلکے کا کہنا تھا کہ ریڈیو کی برقی لہریں اس کی نیند میں حرج پیدا کرتی ہیں۔ مگر اس بات کا علم مجھے اس وقت جا کر ہوا جب میں گوہلکے کی ساری شرائط کو قبول کرنے کے بعد اس کے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ ہم سب جنوں کے نہانے کے لیے اتوار کا دن مقرر تھا جب گوہلکے کی بیوی پانی کا حمام گرم کرتی تھی۔ فلیٹ میں سنٹرل ہیٹنگ نہیں تھی البتہ سب کمروں میں کوئلے کے اوون رکھے ہوئے تھے، جو بوقتِ ضرورت جلائے جاتے تھے۔ شام کو میرے یونیورسٹی سے گھر لوٹنے کے وقت سے آدھ پون گھنٹہ قبل گوہلکے کی بیوی میرے کمرے کے اوون میں کوئلہ ڈال کر اس میں آگ سلگا دیتی تھی۔ میری واپسی تک کمرہ اچھا خاصا گرم ہو جاتا تھا اور تین چار گھنٹوں تک گرم رہتا تھا۔ البتہ سونے کا وقت آنے تک وہ پھر سے ٹھنڈا ٹھار ہوتا تھا۔ اس کا یہ فایدہ ضرور ہوا کہ مجھے ٹھنڈے کمرے میں سونے کی عادت پڑ گئی۔ دوسری طرف راہداری اور باتھ روم میں اتنی ٹھنڈک ہوتی تھی کہ انسان کی روح تک کانپ جاتی تھی۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ گوہلکے نے ٹیلی فون لگوا رکھا تھا جس کو میں بیس پینی فی لوکل کال ادا کر کے استعمال کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک ڈبہ ٹیلی فون کے پہلو میں رکھا ہوا تھا، جس میں مجھے مقرر شدہ شرح کے حساب سے پیسے ڈالنے ہوتے تھے۔ پہلا مہینہ ختم ہوا تو گوہلکے نے ٹیلی فون کا بل آنے پر پیسے گنے اور مجھے بتایا کہ میں نے اپنی کالوں کے حساب سے بالکل درست پیسے ڈبے میں ڈالے تھے۔ پھر اس نے مجھے مشورہ دیا کہ خود لوگوں کو فون کرنے سے بہتر یہ ہے کہ دوسروں کو فون کرنے کو کہا جائے۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ لڑکیوں سے ڈیٹ لینے کے لیے انسان کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے اور کتنے فون کرنے پڑتے ہیں۔"

گرمیوں کے سمسٹر میں ایک بڑی سوہنی لڑکی باربرا کی آمد سے ہمارے سمینار میں، جو اس وقت تک محض پڑھاکو قسم کے افراد پر مشتمل تھا، چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جنوبی جرمنی سے تھی اور خاصی زندہ دل تھی۔ ہمبرگ اور گردونواح سے تعارف پیدا کرنے کے لیے اس نے مجھے اپنا گائیڈ بنایا۔ میں تو پہلے دن سے اس پر جان دیتا اور اس کی قربت حاصل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ آگ ادھر بھی لگی ہوئی تھی کیونکہ اس نے اپنا لیکچروں کا پروگرام اس طرح بنا رکھا تھا کہ اس کی اور میری فرصت کے

اوقات آپس میں مناسبت رکھتے تھے۔اس طرح ہمارا دن رات کا ساتھ رہنے لگا مگر مجھے یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ یہ کب تک ممکن ہو سکے گا۔ یوں کہنے کو تو وہ مجھے اپنی سب سے بڑی محبت قرار دیتی تھی مگر مجھے پتا تھا اس کے کیتھولک ماں باپ کو یہ کیسے پسند آئے گا کہ ان کی بیٹی ایک مسلمان کو دل دے بیٹھی ہے۔ چنانچہ اس کی بڑی بہن ہمبرگ کی سیاحت کے بہانے سے آ کر مجھے دیکھ گئی تھی اور بار بر انے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ ان کے گھر کی سی آئی ڈی حرکت میں آ چکی ہے اور اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ گویا ہماری دوستی کے دن گنے چنے تھے۔

دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک شام کا ذکر ہے مجھے پہلی بار ہمبرگ یونیورسٹی کے شعبۂ "مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ و ثقافت" کے سمینار میں ہر سال منائی جانے والی کرسمس کی تقریب میں شامل ہونے کا اتفاق ہو رہا تھا۔اس شام کھانا ایک شامی طالب علم نے تیار کیا تھا جو بے حد مزیدار تھا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ موسیقی کے ایک پروفیسر نے ، جو لمبے عرصے تک عرب ممالک میں قیام کر چکا تھا، موسیقی کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ اس نے عرب موسیقی کے ارتقا پر اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ وہ کئی ایک آلاتِ موسیقی ساتھ لایا تھا اور انھیں بجا کر سناتا رہا۔ پھر اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ساتھ فرعونوں کے زمانے کا ایک آلۂ موسیقی لایا ہے جو توت انخ آمون کے مقبرے سے ملا تھا اور جس کو بجانے کا ڈھنگ لوگ بھول چکے ہیں۔اس نے یہ آلۂ موسیقی جب پہلی بار ریڈیو قاہرہ پر بجایا تو ایک مشہور عالمِ دین نے اسے قیامت کی نشانی قرار دیا تھا۔اس شام اس نے اس آلے کو بجا کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔اس کے بعد پروفیسر باربرا فلیمنگ نے اپنے سفرِ ترکی کے احوال سنائے اور رنگین سلائیڈز دکھائیں۔

یہ ثقافتی پروگرام کہیں نصف شب کو جا کر ختم ہوا اور میزوں پر موم بتیاں جلا کر لگائی گئیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی پسند کا مشروب لے کر اپنے ہمسایوں سے باتیں کرنے لگا۔ میرے پہلو میں ڈاکٹر ہری برٹ لسبے بیٹھے ہوئے تھے۔انھوں نے پوچھا کہ کیا میں نے ڈاکٹریٹ کے لیے کوئی موضوع چن لیا ہے۔ میں نے بتایا کہ موضوع کی تلاش کے سلسلے میں مجھے کیا کچھ پڑھنا پڑا تھا اور کون کون سے انکشافات مجھ پر ہوئے تھے۔مثلاً السمعانی کی ’’کتاب الانساب‘‘ میں الحاکم النیسابوری کی کتاب کے حوالے اس کثرت سے آتے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو الحاکم کی کتاب کا، جو بدقسمتی سے معدوم ہو چکی ہے، ایک معتد بہ حصہ تیار کیا جا سکتا ہے۔انھیں یہ سن کر حیرت اور مسرت ہوئی اور انھوں نے کہا کہ چلو مجھے لائبریری میں اس کی کچھ مثالیں نکال کر دکھاؤ۔ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر سمینار کی لائبریری میں جا بیٹھے جو اسی منزل پر تھی۔ہم دیر تک ’’کتاب الانساب‘‘ میں الحاکم کی کتاب کے حوالوں کو تلاش کرتے اور پڑھتے رہے۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے سلسلے میں اس طرف مزید توجہ نہ دے سکا کیونکہ چند

برسوں کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ فرائی (Richard Frey)ایک سال کے لیے ہمبرگ آئے تو انھوں نے بتایا کہ وہ اس کام کو مکمل کر چکے ہیں۔ چنانچہ انکی کتاب جلد ہی چھپ کر آ گئی۔

ڈاکٹر ہسے ابھی ''کتاب الانساب'' کی ورق گردانی میں مشغول تھے کہ میں ایک اور کتاب کی جلدیں اٹھا لایا۔ میں نے کہا کہ میرا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اس کتاب کی روشنی میں لکھا جائے گا۔ یہ " تاریخِ بغداد " تھی جس کی چودہ جلدیں ہیں اور جس کو الخطیب البغدادی نے پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں تصنیف کیا تھا۔ بادی النظر میں انسان کتاب کے عنوان سے قیاس کرتا ہے کہ اس کا موضوع بغداد کی تاریخ ہے مگر یہ بات صرف جزوی طور پر درست ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب کے پہلے سو صفحوں میں شہر بغداد کی تعمیر و ترقی کا بیان رقم کیا ہے۔ اسلامی تاریخی کتابوں میں اس سے بڑھ کر کسی دوسرے شہر کے تفصیلی کوائف نہیں ملتے۔ ''تاریخِ بغداد'' کا اصل موضوع دراصل اس شہر کے علماء وفضلاء کی سوانح حیات کے کوائف ہیں۔ یہ اچھوتا خیال آگے چل کر رواج پا گیا اور دوسرے شہروں کی تاریخیں بھی اسی طرز پر لکھی جانے لگیں۔ ''تاریخِ بغداد'' میں آٹھ ہزار آٹھ سو اکتیس افراد کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ ان میں بتیس عورتیں بھی شامل ہیں۔ یہ وہ عالم و فاضل لوگ تھے، جو بغداد یا اس کے گرد و نواح میں پیدا ہوئے یا ان کا اس شہر میں آنا ہوا اور ان کا وہاں پر درس دینا ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ ہر سوانح عمری میں متعلقہ افراد کے استادوں، شاگردوں، تعلیمی سفروں کے بارے میں تفصیلات درج ہیں، اس لیے میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس کتاب میں سے ایسا مواد نکالا جائے، جو اسلامی تاریخ کے پہلے ساڑھے چار سو سال کے نظامِ تعلیم کے بارے میں ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت کے معاشرے میں علماء کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے۔

ڈاکٹر ہسے کو یہ منصوبہ بہت پسند آیا اور ہم دیر تک لائبریری میں بیٹھے ہوئے اس پر غور و خوض کرتے رہے۔ جب ہم بالآخر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف لوٹے تو پروفیسر شپولر نے، جو خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے ہوئے بیٹھے تھے، جاننا چاہا کہ ہم اتنی دیر تک لائبریری میں کیا خفیہ منصوبے بناتے رہے تھے۔ میں نے جرمن محاورے کا سہارا لے کر جواب دیا کہ منصوبوں پر ایک رات سوئے بغیر بات نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم مجھے پتا تھا کہ میرے مقالے کا نگران پروفیسر شپولر کو بننا تھا اس لیے اگلے ہی روز ان کو بھی اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔

کرسمس کی چھٹیوں میں عام طور سے جرمن طالب علم اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور پیچھے صرف غیر ملکی رہ جاتے تھے، جن کا ملک میں کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا تھا۔ مقامی جرمن فیملیوں کی طرف سے اس قسم کے اشتہار دیکھنے میں آتے تھے کہ وہ کرسمس کے موقع پر کسی غیر ملکی طالب علم کو اپنے گھر آنے کی

دعوت دینا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی طرف سے بھی کرسمس کے تہوار اور نئے سال کے درمیان پڑنے والے ہفتے میں کوئی نہ کوئی پروگرام رکھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے دسمبر ۱۹۶۳ء میں ایک ایسا پروگرام بریمن جانے کا بنایا گیا تھا، جس میں پچاس ساٹھ طالب علم شامل ہوے تھے۔ ہماری بس آٹھ بجے چل کر نو ساڑھے نو بجے بریمن پہنچ گئی تھی۔ دوپہر کے کھانے تک تاریخی عمارتوں کا دکھایا جانا تھا۔ جب ہم وہاں سے فارغ ہوکر آئے تو بلدیہ کی مرکزی عمارت کے آس پاس ایک مارکیٹ لگی ہوئی تھی۔ ہمیں بھی اس کا ایک چکر لگانے کی اجازت دے دی گئی مگر ساتھ ہی بتا دیا گیا کہ عین بارہ بجے فلاں ریستوران میں ہمارا کھانا ہوگا، اس لیے ہمیں پندرہ بیس منٹوں سے زیادہ وقت مارکیٹ میں صرف نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں سے فارغ ہوکر ہم ریستوراں میں پہنچے۔ کھانا بے حد لذیذ تھا اور سب نے سیر ہوکر کھایا۔ اس افراتفری میں کسی کو خبر نہ ہوئی کہ ہماری پارٹی کے دو افراد غائب تھے۔ ان کو ہم نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بس کے پاس کھڑے ہوے پایا۔ وہ مارکیٹ میں عینک صاف کرنے والی ایک نئی ایجاد کو دیکھنے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انھیں دوسروں کے وہاں سے چلے جانے کی خبر نہ ہوئی۔ چونکہ ان کو ریستوران کا نام اور پتا معلوم نہ تھا اس لیے وہ پارٹی کو تلاش نہ کر پائے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھا سکے تھے۔ ان میں سے ایک میرا واقف کار سین تھا جو ہندوستان کا رہنے والا تھا مگر اس سے زیادہ مجھے اسکی ساتھی لڑکی اوتا پر ترس آیا جو چلّی کی رہنے والی تھی۔ وہ اپنے ساتھ گھر سے کیک لائی تھی، جو اس نے سین کے ساتھ بانٹ کر کھایا تھا۔ مجھے اس پر ترس ہی نہیں اسکی سادگی پر پیار بھی آیا تھا اور میں نے دل میں سوچا کہ اس کے ساتھ تعارف ہونا چاہیے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لائے ہوے سیبوں میں سے ایک سیب کھانے کے لیے پیش کیا۔

جب کبھی میں شام ڈھلے کوئی لیکچر سننے یا تھئیٹر میں ڈراما یا سنیما میں فلم شو دیکھنے کے بعد گھر واپس لوٹتا تھا تو گوملکے اپنے شب خوابی کے کمرے میں غائب ہو چکا ہوتا تھا، البتہ اس کی بیوی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی سوئٹر، جرابیں یا کوئی دوسری اونی چیز بن رہی ہوتی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اندر میں نے دیکھا کہ وہ مکمل ہو جانے والی چیزیں ادھیڑ کر نئے سرے سے بننا شروع کر دیتی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ ان چیزوں کی مانگ نہیں رہی۔ اس کے رشتہ داروں اور واقف کاروں میں کوئی شخص باقی نہیں بچا جس کے لیے وہ کچھ بن سکے۔ یوں بھی سب لوگ مشین کی بنی ہوئی چیزیں پہننا پسند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ساری شام بیکار نہیں بیٹھ سکتی، اس لیے چیزیں بنتی، ادھیڑتی اور پھر بنتی رہتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا وہ شام کو ریڈیو سننا پسند کرے گی؟ اس نے شب خوابی کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا میرا خاوند مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میرے پاس اس زمانے میں ایک مُنا ساٹرانزسٹر ریڈیو تھا، جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تھا اور صرف ائیرفون کو کان پر لگا کر سنا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس ریڈیو سے برقی

لہریں نہیں نکلتیں، کیونکہ وہ بیٹری کے سیل اور بجلی کے بغیر چلتا ہے۔ ریڈیو پروگرام کو ریسیو کرنے کے لیے اتنا کافی تھا کہ اس کے اینٹنے کی تار کو کسی دھات کے لیمپ یا سنٹرل ہیٹنگ کے پائپ سے جوڑ دیا جائے۔ مکان میں سنٹرل ہیٹنگ تو نہیں تھی مگر اتفاق سے ایک ایسا ٹیبل لیمپ اس کمرے میں موجود تھا اور اس کام آ سکتا تھا۔ چند منٹوں کے اندر اینٹنے کی تار کو ٹیبل لیمپ سے جوڑ دیا گیا اور ہمبرگ کے مقامی ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام بالکل صاف سنائی دینے لگا۔ گو ملکے کی بیوی کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر پھیل گئی۔ اگلی صبح اس نے بتایا کہ وہ آدھی رات تک ریڈیو سنتی رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اب اس کی شامیں دلچسپ گزرا کریں گی۔

ہفتے عشرے کے بعد گو ملکے کی نظر ٹیبل لیمپ سے جڑے ہوئے اینٹنے پر پڑی، تو وہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے پوچھے بھالے بغیر اینٹنے کی تار کو کھینچ کر الگ کر دیا اور اپنی بیوی کو برا بھلا کہا، جس نے مجھے ایسا بیہودہ کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس نے بہتیرا کہا کہ میں نے یہ سب کچھ اس کی خاطر کیا تھا اور اب وہ شام کے وقت ریڈیو سن سکتی ہے مگر گو ملکے نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں شام کو گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ریڈیو سیٹ میرے کمرے کی میز پر دھرا تھا۔ میں نے گو ملکے کی بیوی سے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا خاوند نہیں چاہتا کہ اینٹنے کی تار اسکے ٹیبل لیمپ کے ساتھ جوڑی جائے۔ میں نے کہا کہ میں خود اس کے خاوند سے اس بارے میں بات کروں گا، مگر اس نے گڑگڑا کر کہا کہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ میرے خاوند کی خدائی میں صرف اسی کی بات چلتی ہے۔ کہیں وہ تمھیں کمرہ خالی کرنے کا نوٹس نہ دے دے۔

مجھے اس چیز نے بہت بے چین کیا اور میں نے اس بارے میں ٹانٹے ایرنا کی رائے جاننا چاہی۔ اس نے کہا کہ گو ملکے کو اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کا کوئی پاس نہیں ہے۔ وہ شروع سے ایسا روکھا اور غیر مہذب انسان تھا۔ مائیکے کا بھائی ایریش اپنی بہن کو یہ کہتا کہتا مر گیا کہ اس جنگلی آدمی میں ساری عمر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی بہتر یہ ہے کہ تم اس سے طلاق لے لو مگر مائیکے نے بھائی کی بات مان کر نہ دی۔ تم نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ تمھاری زبان میں اللہ میاں کی گائے کا محاورہ پایا جاتا ہے۔ مائیکے پر یہ محاورہ صادق آتا ہے۔ وہ ساری عمر دکھ سہتی رہی ہے مگر کیا مجال ہے کہ اس نے کبھی اپنا منہ کھولا او راحتجاج کیا ہو۔ اس کا خاوند اسکی اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے ریڈیو سیٹ کے ذریعے اس پر باہر کی دنیا کی طرف ایک کھڑکی کھول دی تھی، جہاں پر موسیقی کے پروگرام، ڈرامے اور فیچر نشر ہوتے ہیں۔ شاید گو ملکے کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اسکی بیوی کے دل میں بغاوت کے جراثیم نہ پیدا ہو جائیں۔ میں اگر مائیکے کی جگہ پر ہوتی تو کبھی کی اس اکھڑ انسان کو وہاں پر بھیج چکی ہوتی جہاں پر فلفل اگتا

ہے اور ہوٹن ٹوٹن جنگلیوں کا قبیلہ بستا ہے۔

سرما کا سمسٹر ختم ہو رہا تھا۔ باربرا کے گھر والوں نے اسے یونیورسٹی بدلنے کو کہا تھا اور وہ چھٹیوں کے بعد میونخ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے پیچھے یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ اسے مجھ سے جدا کیا جائے۔ ہمارے ملنے جلنے پر پابندی تو نہیں لگائی گئی تھی مگر باربرا کو ہدایت تھی کہ مجھے کم سے کم ملے۔ اس کے باوجود اس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ میرے گھر پر الوداع کہنے کے لیے آئے گی۔ چنانچہ میں ساری شام اس کی راہ تکتا رہا تھا۔ جب وہ بالآخر آئی تو گھڑی پر نو بج رہے تھے ۔میرے کمرے میں مہمان کو دس بجے کے بعد ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب جدائی کے غم میں دونوں طرف دل پاش پاش ہو رہے ہوں، تو گھڑی کی طرف کون دیکھتا ہے۔ چنانچہ باربرا اس روز گیارہ بجے تک میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی اور میری بدقسمتی کا ماتم کرتی رہی۔ میرے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ ہمیں چومنے چاٹنے سے آگے جانا چاہیے، کیونکہ میں اس سے محبت کرتا تھا اور اگر حالات اجازت دیتے تو ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

جب میں باربرا کو انڈرگراؤنڈ کے اسٹیشن پر گاڑی میں چڑھا کر واپس لوٹا تو گوہلکے کوریڈور میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اس ماہ کے اواخر تک کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا، کیونکہ کرایے نامے کی رو سے میرے پاس کوئی مہمان دس بجے کے بعد تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس زمانے میں اس معاہدے کی خلاف ورزی پر فی الفور کمرہ خالی کرنا پڑتا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اس شام میری محبت کا آبگینہ ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے یونیورسٹی کے مختلف ہوسٹلوں میں درخواستیں بھیج رکھی تھیں جہاں پر طالب علموں کو اچھی خاصی مراعات ملتی تھیں اور انھیں بے شمار قسم کی آزادیاں حاصل تھیں، جو پرائیویٹ گھروں میں میسر نہ تھیں۔ اسی ہفتے میں ایک ہوسٹل سے مجھے انٹرویو کے لیے بلاوا آ گیا، جس کا پیٹرن ان چیف پروفیسر زیگفریڈ لانڈز ہوٹ **(Siegfried Landshut)** سیاسیات کا پروفیسر تھا اور جو خود بھی جنگ کے زمانے میں جلاوطنی کی زندگی گزار چکا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے دل میں غیر ملکی طالب علموں کے لیے خاص ہمدردی پائی جاتی ہے۔ چونکہ سیاسیات بطور ضمنی مضمون کے میرے تعلیمی پروگرام میں شامل تھا، اس لیے مجھے اس کے پاس یوں بھی ایک روز جانا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک پتھر سے دو شکار کیے جائیں۔ چنانچہ انٹرویو کے دوران میں بات کو گھما پھرا کر سیاسیات کے مضمون کی طرف لے گیا اور بتایا کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے سیاسیات میں بی اے کر رکھا ہے، جہاں پر پڑھایا جانے والا کورس آکسفورڈ یونیورسٹی کے پیٹرن پر بنایا گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ پروفیسر لانڈز ہوٹ آکسفورڈ کے ایک

کالج میں یہ مضمون پڑھاتا رہا تھا۔اس کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ ہمارے کورس میں کون کون سی کتابیں رکھی گئی تھیں اوران کے علاوہ میں نے اس مضمون کے سلسلے میں کیا کچھ پڑھ رکھا تھا۔اس نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں اس کا لیکچر سننے اوراس کی سمیناروں میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔اس گفتگو کے بعد مجھے کمرہ ملنا یقینی ہوگیا تھا،جس کی تصدیق تیسرے روز موصول ہونے والے خط سے ہو گئی۔اس میں لکھا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزروکرلیا گیا تھا،جسکا قبضہ مجھے اگلے روزمل سکتا ہےلیکن اگرمیں کسی وجہ سےفوراًقبضہ نہیں لیتا تو کمرہ کسی دوسرے طالب علم کودے دیا جائے گا۔

میں دوسرے روز ہوسٹل میں منتقل ہوگیا،جہاں پر مجھے اگلے اڑھائی برسوں تک رہنا تھا۔باربرا جا چکی تھی اورمیری زندگی میں ایک خلا آ گیا تھا جس کو پورا کرنے کے لیے میں ڈاکٹریٹ کے مقالے پر زورشور سے کام شروع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سمینار کی لائبریری سے "تاریخِ بغداد" کی ساری جلدیں اٹھالایا۔مگرپیشتر اس کے کہ میں اس کام میں ڈوب جاتا میری نظرسے برلن کی بلدیہ کا اشتہارگزرا جس میں طالب علموں کےایک گروپ کوبرلن کی سیر کے لیےآنے کی دعوت دی گئی تھی۔میں اس سےقبل ایسا سفرکرچکا تھامگرسوچا کہ دوسری بار جانے میں کیا حرج ہے۔چنانچہ میں نے بھی اپنا نام لکھوا دیا اور روانگی والے روز ریل گاڑی کے اسٹیشن پر پہنچ گیا جہاں پرگروپ کے ارکان جمع ہورہے تھے۔میری نظرچلّی کی رہنے والی لڑکی اوتا پر پڑی جو بریمن کے سفر پر ہمارے ساتھ گئی تھی اور مارکیٹ میں عینک صاف کرنے والی نئی ایجاد کے دیکھنے میں مشغولیت کے سبب گروپ کا ساتھ کھوبیٹھی تھی۔اسے بھی یادتھا کہ میں نے اسکے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھااوراسکواپنے ساتھ لائے ہوئے سیبوں میں سےایک سیب کھانے کے لیے پیش کیا تھا۔میں نے کہا برلن کے سفرکے دوران میں تم پرخاص نظررکھوں گا اورگم نہیں ہونے دوں گا۔میں نے یہ وعدہ آج تک ایفا کیا ہےاوراوتا کواپنی آنکھوں سےاوجھل نہیں ہونے دیا۔

اوتا کی کہانی

اوتا(Uta) کےساتھ اس کی سہیلی سبینے ہورل(Sabine Horl) تھی،جوامیر ماں باپ کی بیٹی تھی۔دونوں سہیلیاں ہسپانوی ادبیات کی طالبات تھیں۔ ان کی تیسری ساتھی کرسٹا (Christa) میڈیکل میں پڑھتی تھی۔ان کی آپس کی بےتکلفی کےسبب ایک دلچسپ ماحول پیدا ہوگیا، جو مجھےان کے قریب لانے کا موجب بنا۔جرمن زبان پرمیری گرفت اس دوران میں اتنی اچھی ہوچکی تھی کہ میرا درست تلفظ اورزبان پرعبورا کثرلوگوں کوحیران کردیتا تھا۔ان کا خیال تھا کہ میں بہت بچپن

میں جرمنی آ گیا ہوں گا، وگرنہ اتنی ٹھیٹھ زبان نہ بول سکتا۔ میں نے یونہی ذرا ان کو چکر دینے کے لیے کہہ دیا کہ جرمن دراصل میری مادری زبان ہے، کیونکہ میری ماں جرمن تھی۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اس کو انھوں نے سچ مچ قبول کر لیا اور جب میں نے اس بات کی تصحیح کرنا چاہی تو کوئی اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

سبینے ہورل نے آگے چل کر ایک نامور وکیل سے شادی کی اور اس کے ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قایم کیا، جس کا شمار آج کل جرمنی کے اہم ترین پبلشروں میں ہوتا ہے۔ سبینے کے اندر ایک خاص قسم کا مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جس کے لیے جرمن زبان میں "خشک مزاح" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ مزاح ایسا ہے جو بالکل سرا ہے اور غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو جرمن زبان کی باریکیوں پر نظر رکھتا ہو۔ سبینے بولتی تھی تو سوائے اس کی زبان اور ہونٹوں کے اس کے جسم کا کوئی دوسرا حصہ حرکت میں نہ ہوتا تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں اوتا بات کرتی تھی تو اس کی آنکھیں، ہونٹ، ہاتھ بلکہ جسم کے دوسرے اعضاء گویا ایک تصویر بنانے میں مشغول ہوتے تھے۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکا کہ تم دیکھنے میں جرمن مگر باتیں کرنے میں اطالوی لگتی ہو۔ سبینے نے کہا شاید تمھیں پتا نہیں ہے کہ پولیتا (Polita) (اوتا کی سہیلیوں نے اسے یہ نام دے رکھا تھا جو دراصل "کاسموپولیتا " (Cosmopolita) یعنی بین الاقوامی کا مخفف تھا) کی پیدایش آسٹریا کی ہے، بچپن اٹلی میں گزرا ہے اور نوجوانی جنوبی امریکہ میں، اس لیے اس کے اندر مختلف ملک اور وہاں کی زبانیں اور تہذیبیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ اس کی بولی جرمن ہے مگر اس کی جسمانی حرکات اطالوی ہیں اور اگر تمھیں ہسپانوی زبان آتی تو تم جان لیتے کہ وہ یہ زبان بولنے میں چلی (Chile) کے کسی بھی ریڈ انڈین ماپوچھوے (Maputche) کو مات کرتی ہے۔ یہ سن کر اوتا میری نظروں میں زمین سے دو چار فٹ اوپر اٹھ گئی۔ میں اس کی خوبصورتی، سادگی اور خوش دلی کا پہلے ہی قایل تھا، اب میری دلچسپی اس میں فزوں تر ہو گئی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے برعکس کسی قسم کا میک اپ نہیں کر رکھا تھا نہ ان جیسے بڑھیا کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ اس کے باوجود اس کا قدرتی حسن اسے دونوں سے ممتاز کرتا تھا۔

میں چونکہ پہلے سفر کے دوران برلن کی سیاحت کر چکا تھا، اس لیے سرکاری پروگرام سے بچ نکلنے والے وقت میں ان کا گائیڈ بن گیا۔ ایک شام سبینے اور اس کی سہیلی ڈانسنگ بار میں جانا چاہتی تھیں، جہاں پر کانوں کو پھاڑ دینے والی موسیقی بجتی ہے اور سگریٹ کا دھواں اتنا کثیف ہوتا ہے کہ تلوار سے کاٹا جا سکتا ہے۔ میں نے جرمن محاورے سے مدد لیتے ہوئے کہا کہ مجھے تین گھوڑے بھی کھینچ کر وہاں نہیں لے جا سکتے۔ پھر میں یہ جان کر حیران ہوا کہ اوتا بھی وہاں پر جانے کے حق میں نہ تھی۔ وہ بھی میری طرح

سگریٹ کے دھوئیں سے دور بھاگتی تھی۔ اسے مغربی برلن کی زرق برق راتوں کی رونق دیکھنے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں اس شہر کی حیثیت جمہوری دنیا کے شوکیس کی تھی۔ سب کو یہ دکھانا مطلوب تھا کہ مشرقی جرمنی کے سوشلسٹ اندھیارے کے مقابلے میں مغربی جرمنی کی راتیں جگ مگ کرتی ہیں۔ ہم گھومتے گھماتے ایوروپا سنٹر (Europa-Center) کے ایک کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھے، جہاں پر زائرین کافی پینے کے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کو دیکھنے اور اپنے آپ کو دکھانے کے لیے جاتے تھے۔ مگر میری آنکھیں اوتا پر مرکوز تھیں اور میں اس کی زندگی کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ مجھے صرف اس قدر پتا تھا کہ اس کا خاندان جنگ سے پہلے آسٹریا کے دارالحکومت ویانا (Vienna) میں مقیم تھا، اس لیے میں نے قیاس کیا کہ اس کی پیدائش ویانا کی ہوگی۔

"نہیں میں وہاں پر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ چیز میرے باپ کو پسند نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے اس شہر میں پیدا ہوں، جس کے باسیوں کی بول چال کا انداز اسے اچھا نہ لگتا تھا اور جن کے مصنوعی ادب آداب کا وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس نے میری ماں کو میری پیدائش سے چنداں پہلے اپنے آبائی شہر گراتز (Graz) بھیج دیا تھا تا کہ اس کا بیٹا وہاں پر پیدا ہو۔ ایک بیٹی اسکی پہلے سے تھی اس لیے وہ بیٹے کی توقع رکھتا تھا۔ اور بیٹے کو گراتز میں پیدا ہونا چاہیے، جو اسکی نظروں میں ایک مہذب شہر تھا۔"

"پھر تو اسے دوسری بیٹی کی پیدائش پر بہت مایوسی ہوئی ہوگی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ضرور ہوئی ہوگی۔ مگر اس چیز کا اظہار اس نے کبھی نہیں کیا۔ مجھے اس نے لڑکا بنانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ البتہ میرے کھبے پن کو بدلنے کے لیے ہر جتن کیا گیا۔ میں آج دائیں ہاتھ سے لکھتی اور دوسرے سارے کام کرتی ہوں، مگر بعض اوقات لاشعوری طور پر بائیں ہاتھ کو استعمال کرنا چاہتی ہوں، جیسے یہ قدرتی امر ہو۔ شاید میں فطری طور پر کھبی ہوں۔" اس نے بائیں بازو کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی خوب ہے کہ تمھارے کھبے پن کو بدلا گیا اور میں نے بچپن میں شعوری طور پر کھبے پن کو اختیار کرنا چاہا۔ چنانچہ میں نے اسکول کے زمانے میں بائیں پاؤں سے فٹ بال کھیلنا سیکھا حالانکہ میں فطری طور پر دائیں پن کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ آج میں دونوں پاؤں سے ایک جیسی مہارت کے ساتھ فٹ بال کھیل سکتا ہوں اور بائیسکل پر دائیں اور بائیں طرف سے سوار ہوتا اور اترتا ہوں۔" میں نے گویا اپنے کندھے پر خود ہی تھپکی دی۔

" مگر کیا اس عمل سے تمھارے دماغ میں پائے جانے والے زبانوں کے مرکز نے کوئی اثر قبول کیا تھا؟" اوتا نے پوچھا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا تمھارے دماغ پر اس عمل کا کوئی اثر پڑا تھا کہ تمھارے

ماں باپ نے تمھارے کچے پن کو بدلا تھا؟" میں نے اس کے سوال کے جواب میں خود سوال کر ڈالا۔

"ضرور پڑا ہوگا۔ مجھے احساس ہے کہ بالخصوص جرمن زبان پر میری گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے۔ آخر جرمن میری مادری زبان ہے۔ شاید اس کے پیچھے اس چیز کا بھی ہاتھ ہے کہ مجھے ہر چند برسوں کے بعد نئی زبان سیکھنی پڑی تھی اور میرا واسطہ نت نئی ثقافتوں سے پڑتا رہا تھا۔"

"جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں تم آسٹرین ہو۔"

"نہیں، میں جرمن ہوں۔ البتہ میرا باپ آسٹریا کا رہنے والا تھا۔ مگر اس نے ہٹلر کی طرح جرمن قومیت اختیار کر لی تھی۔ دراصل میری ماں جرمن ہے اور مشرقی پروشیا کی رہنے والی ہے، جو آج کل پولینڈ کے قبضے میں ہے۔ جب اس کی میرے باپ سے شادی ہوئی، تو وہ ابھی ہٹلر کی نازی پارٹی کا کلیدی ممبر تھا، مگر اس کی آنکھیں بہت جلد کھل گئی تھیں اور وہ جان گیا تھا کہ ہٹلر کی سیاست جرمن قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے، اس لیے وہ پارٹی سے جدا ہو گیا تھا اور اس نے براؤن وردی اتار دی تھی۔ اس چیز کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ اس کا کاروبار ضبط کر لیا گیا اور اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں پر وہ سال بھر قید میں رہا تھا۔ پھر اسے کسی طریق سے جیل خانے سے بھاگ نکلنے میں کامیابی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ جنگ کے خاتمے تک انڈرگراؤنڈ چھپا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو ماں مجھے اور میری بڑی بہن انگرِیڈ (Ingrid) اور چھوٹے بھائی والٹر (Walter) کو لے کر ویانا کی ایک خاص سڑک پر سیر گشت کے لیے جاتی تھی۔ میرا باپ وہاں پر کسی جگہ پر چھپ کر رہتا تھا۔ ہم اس سے نہیں مل سکتے تھے مگر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے ہمیں دیکھ سکتا تھا۔"

"یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"جنگ کے خاتمے تک۔ جب ویانا پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ گھر لوٹ آیا تھا۔ مگر اس وقت تک شہر بمباری کے سبب تباہ ہو چکا تھا۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ ہم کس قیامت میں سے گزرے تھے۔ دن رات ہوائی حملوں کے سبب سائرن کا بجنا اور سب لوگوں کا بھاگ کر تہہ خانے میں پناہ لینا جہاں پر ہیٹنگ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ پھر بموں کا گرنا، دھماکے اور بے پناہ شور شرابا۔ میں نے لوگوں کو مکھیوں کی طرح مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میری ماں کیسے ہم تینوں بچوں کو اپنے ساتھ جنگ میں سے بچا کر نکال لائی تھی، اس بات کو میں اب تک نہیں جان پائی ہوں۔"

"میں سچ مچ اس بات کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں نے جنگ نہیں دیکھی۔ میں نے ہوائی جہازوں کو بستیوں پر حملہ آور ہوتے اور بم گراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ ہی میں نے شہروں کو تباہ ہوتے اور انسانوں کو مکھیوں کی طرح مرتے ہوئے دیکھا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"میں نے ویانا شہر کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمام عمارتیں گری ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر ہر طرف پتھر اور اینٹیں اور کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ ہمارے مکان کا بھی ایک حصہ گر گیا تھا۔ پھر ہمارے فلیٹ میں حکومت کے حکم سے غیر لوگوں کو رہایش کے لیے جگہ دینی پڑی تھی۔ ہمارے پاس بس دو کمرے رہ گئے تھے جب کہ اس سے پہلے اس فلیٹ میں چھ کمرے ہوتے تھے۔ میرے باپ کا جنگ سے پہلے خاصا بڑا کاروبار تھا، جس کو نازیوں نے ضبط کر لیا تھا کیونکہ اس پر غداری کا الزام لگایا گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر آسٹریا روسیوں کے قبضے میں تھا، اس لیے میرے باپ کو خدشہ تھا کہ وہ لوگ اس ملک کو اپنے ماتحت رکھنے کی خاطر وہاں پر کمیونسٹ حکومت قایم کریں گے۔ وہ نازیوں کی بربریت سے بچ نکلنے کے بعد کمیونسٹوں کی غلامی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے جلد سے جلد آسٹریا سے نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ ایک عرصے سے جنوبی امریکہ ہجرت کر جانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے قید کے زمانے میں ہی ہسپانوی زبان سیکھنی شروع کر دی تھی، مگر ہمیں اس بات کا علم نہ تھا۔"

"کیا تمھارا خاندان جنگ کے فوراً بعد جنوبی امریکہ چلا گیا تھا؟"

"آسٹریا سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا، کیونکہ اس امر کی اجازت نہ تھی۔ پھر میرے باپ کے پاس سارے خاندان سمیت اتنے مہنگے سفر پر جانے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ وہ پہلے اکیلا چھپ چھپا کر اٹلی چلا گیا تھا، جہاں سے اس کو چلی جانے والا بحری جہاز مل سکتا تھا، مگر جہاز کی روانگی سے ایک ہفتہ قبل کسی نے اس کی جیب کاٹ لی تھی، جس میں اس کے پیسے اور جہاز کا ٹکٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جیب کترا بیشک ساری رقم رکھ لے، مگر اس کو جہاز کا ٹکٹ واپس کر دے تاکہ وہ سفر پر روانہ ہو سکے۔ دوسرے روز اس کے ہوٹل میں کوئی شخص اس کی غیر حاضری میں آ کر ٹکٹ واپس دے گیا تھا۔ اس زمانے میں جیب کترے بھی مہذب ہوا کرتے تھے۔"

"تمھاری ماں کب تک بچوں سمیت ویانا میں مقیم رہی تھی؟"

"بہت دنوں تک نہیں۔ ہم بھی بہت جلد وہاں سے نکل آئے تھے۔ میرے باپ نے اٹلی کو چھوڑنے سے قبل میری ماں کو پیغام بھیجا تھا کہ ہمیں آسٹریا سے نکلنے کے لیے کیا طریق اختیار کرنا ہو گا۔ میری بڑی بہن کو دادی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی اور میرا بھائی چھ برس کا تھا۔ ہم دونوں کو اکیلے اٹلی جانے والی ریل گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ہمارے پاس کسی قسم کے شناختی کاغذات نہیں تھے مگر راستے میں چیکنگ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سارا وقت اپنے بھائی والٹر کا ہاتھ تھامے رکھا تاکہ وہ کہیں گھبرا کر رونے نہ لگے۔ سرحد پار کرنے کے بعد اٹلی کے پہلے ریلوے اسٹیشن پر میرے باپ کا ایک روسی دوست ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ ہمیں اب ماں

کے آنے کا انتظار کرنا تھا جو دوسرے یا تیسرے روز ہم سے آ ملی تھی۔ اس نے ریل گاڑی میں سفر نہیں کیا تھا بلکہ آسٹریا اور اٹلی کے درمیانی علاقے ٹیرول (Tirol) کے پہاڑوں میں پائی جانے والی سرحد کو رات کے اندھیرے میں پیدل چل کر پار کیا تھا۔"

"یہ تو خاصی مہماتی داستان ہے۔ پھر تم لوگ وہاں سے آگے چلی چلے گئے تھے۔" میں نے قیاس لگایا۔

"چلی جانے کے لیے ہمیں پورے سات برس تک اٹلی میں انتظار کرنا پڑا تھا۔ ابتداء میں کچھ ماہ تک ماں نے ہمیں اسکول میں داخل نہ کرایا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہم بہت جلد چلے جائیں گے، مگر جب دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے تو پہلے مجھے پھر میرے بھائی کو اطالوی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ہم گینوا (Genoa) کے قریب ایک ساحلی مقام نروی (Nervi) کے ایک ہوٹل میں رہائش پذیر تھے۔ اس گاؤں میں ایک جرمن خاتون رہتی تھی، جس کا اطالوی خاوند بحری جہاز کا کپتان تھا۔ اس عورت کے ساتھ میری ماں کی دوستی ہو گئی تھی، جس کے سبب اس کا دل وہاں پر لگ گیا تھا۔ باپ کی طرف سے پیسے آتے تھے مگر بے قاعدگی کے ساتھ اور ہمارا گزارہ بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں کیسی غربت کا سامنا کرنا پڑا تھا، مگر ہمیں پتا تھا کہ ایک روز ہمارے لیے چلی سے جہاز کے ٹکٹ آ جائیں گے اور ہم وہاں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ البتہ اس دن کے انتظار میں سات لمبے برس گزر گئے تب کہیں جا کر وہ گھڑی آئی تھی۔"

"اتنے برسوں تک اٹلی میں رہنے کا مطلب ہے کہ تم نے وہاں پر مڈل اسکول ختم کر لیا ہوگا؟"

"میں نے مڈل اسکول ختم کرنے کے بعد ٹیکنیکل اسکول میں داخلہ بھی لے لیا تھا جہاں پر فیس نہیں لگتی تھی۔ میری استانی خاص طور پر میری سفارش کرنے کے لیے ہمارے گھر آئی تھی کہ مجھے ہائی اسکول میں داخل کرایا جائے، کیونکہ میں اپنی کلاس میں ہمیشہ اول آتی تھی۔ مگر ماں نے کہا ہم کسی بھی روز یہاں سے چلے جانے والے ہیں اور پھر اس کے پاس مجھے ہائی اسکول میں داخل کرانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ استانی نے کہا کہ وہ پیسوں کا انتظام کر لے گی۔ اس کی شاگردوں میں سے اگر کسی کو آگے پڑھنا چاہیے تو آپ کی بیٹی اوتا کو۔ مگر ہماری غربت کا یہ حال تھا کہ میرے پاس صرف ایک بلاوز اور ایک اسکرٹ تھا۔ جب کپڑے دھوئے جاتے تھے، تو مجھے ان کے سوکھنے تک گھر پر رہنا پڑتا تھا۔ نئی کلاس کے لیے کتابیں استانی مجھے مہیا کرتی تھی، جس کے لیے وہ متمول لوگوں سے چندہ اکٹھا کرتی تھی۔ اس جیسی استانی مجھے اس کے بعد نہیں ملی۔ وہ ایک عیسائی معبد خانے کی نن (Nun) تھی اور غربت میں زندگی بسر کرنے کا عہد کیے ہوئے تھی۔"

" پھر تو تمھاری بچپن کی یادیں بہت تکلیف دہ ہوں گی؟"

" وہ یادیں تکلیف دہ ہیں کیونکہ ہمارا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا، مگر دوسری طرف ہم سمندر کے ساحل پر رہتے تھے اور ہمیں لگتا تھا کہ ہم بے حد امیر ہیں۔ ہمارے پاس دنیاوی مال نہیں تھا مگر ہمارے پاس ایک ایسی قدرتی نعمت تھی، جس کا بدل کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہم کھلے ماحول میں رہتے، سمندر میں پیرا کی کرتے اور ساحلی باغات میں کھیلتے تھے۔ میں اور میری سہیلی اوریتا (Orietta) مل کر ہوم ورک کرتی تھیں۔ اس کو اطالوی زبان خوب آتی تھی اور میں ریاضی کی ماہر تھی۔ وہ مجھے پڑھاتی تھی اور میں اسے۔ ہماری گویا ایک ٹیم تھی جس کی اسکول میں چھوٹے بڑے سب عزت کرتے تھے۔ اوریتا جیسی سہیلی مجھے پھر کہیں نہیں ملی۔ ایک روز ہماری آپس میں لڑائی ہوگئی، جیسے بچوں میں چھوٹی سی بات پر اکثر ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز اوریتا مجھے ملنے کے لیے آگئی۔ میں نے کہا ہماری بول چال بند ہے، کیونکہ ہمارے درمیان لڑائی ہے۔ اوریتا نے کہا وہ تو کل کی بات تھی۔"

" آسٹریا میں تم نے گھر پر اور اسکول میں جرمن پڑھی تھی۔ اٹلی میں اطالوی زبان سیکھی تھی اور چلی میں ہسپانوی زبان سے واسطہ پڑا ہوگا۔"

" ہسپانوی میرے لیے تیسری زبان تھی۔ جب ہم چلی کے شہر سنتیاگو (Santiago) میں پہنچے تو میری عمر پندرہ برس تھی مگر مجھے پانچویں کلاس میں داخلہ ملا تھا، کیونکہ مجھے ہسپانوی نہیں آتی تھی۔ میں نے ایک سال میں دو اور تین کلاسیں پاس کیں اور اٹھارہ برس کی عمر میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی کلاس میں جا پہنچی تھی۔ البتہ مجھے تین بار اسکول بدلنے پڑے تھے۔ ابتداء میں مجھے جرمن اسکول میں داخل کرایا گیا ،جس کا ماحول مجھے پسند نہ آیا۔ اس لیے دوسرے ہی سال میری فرمائش پر باپ نے مجھے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہاں بھی میں نے صرف ایک سال گزارا۔ تیسرے سال مجھے اطالوی اسکول میں بٹھا دیا گیا، جہاں کا ماحول مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس اسکول سے میں نے اول درجے میں بکالوریا (Baccalaureate) کیا تھا اور اپنے اسکول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔"

"اس کے بعد تم نے یونیورسٹی جائن کر لی ہوگی؟"

" تمھارا قیاس درست نہیں ہے۔ میرے باپ کا کاروبار بہت مندا جا رہا تھا اس لیے میں نے ایک فرم میں ملازمت کر لی تھی مگر وہاں پر مجھے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ پھر میرا باپ اپنے کاروبار کے سلسلے میں جنوبی امریکی ملک پیرو (Peru) چلا گیا۔ اس نے مجھے وہاں بلا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی فرم کے لیے کام کروں مگر میرے ارادے دوسرے تھے ،اس لیے میں نے اپنے لیے دوسری جگہ پر ملازمت تلاش کر لی۔ یوں بھی میرے باپ کو تھوڑے عرصے کے بعد ارجنٹائن (Argentine) جانا

پڑا تھا۔ میں نے پیرو میں صبح اور شام دو تجارتی اداروں میں کام کیا اور ویک اینڈ پر امیر لوگوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بے بی سٹر (Baby sitter) بن جاتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرے پاس تھوڑا سا سرمایہ جمع ہو جائے۔ ایک جرمن تاجر نے مجھے راستہ دکھایا اور کہا کہ تم جرمنی جا کر یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر سکتی ہو۔ اسی نے مجھے ہمبرگ یونیورسٹی سے پراسپکٹس منگوا کر دیے اور جرمنی کے حالات سے آگاہ کیا۔ میں نے پیرو میں دو سالہ قیام کے دوران بہت سے امریکی ڈالر جمع کر لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جرمنی پہنچ کر میں چار چھ ماہ تک گزارہ کر سکوں گی۔"

"کیا جرمنی میں تم کسی کو جانتی تھیں، جس کے پاس جا کر تم ٹھیر سکتی تھیں؟"

"میں کسی کو نہیں جانتی تھی۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے سیدھی یونیورسٹی میں گئی تھی۔ وہاں پر کسی نے مجھے ایک عورت کا پتا دیا جو کمرہ کرائے پر دیتی تھی۔ اس کے پاس میں مہینہ بھر رہی تھی پھر مجھے دوسری جگہ پر بہتر کمرہ مل گیا تھا۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے مجھے جمنازیم کا آخری امتحان "ابیٹور" (Abitur) پاس کرنا پڑا تھا جو خاصا مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ میرا جمع شدہ سرمایہ دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا اس لیے مجھے مزدوری تلاش کرنی پڑی، جس کے سلسلے میں مجھے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ بیچنے کے لیے اٹلی جانا پڑتا تھا۔ دراصل وہ فرم جنوبی امریکہ کے بحری جہازوں پر کام کرنے والے ملاحوں کے پاس یہ سامان بیچتی تھی۔ مجھے چونکہ ہسپانوی اور اطالوی زبانیں آتی تھیں اس لیے مجھے بھیجا جاتا تھا۔ اس طرح مجھے اپنی اطالوی سہیلی اوریتا سے ملنے کا موقعہ مل جاتا تھا مگر دوسری طرف میری پڑھائی کا حرج ہوتا تھا۔ پھر مجھے ایک وظیفہ مل گیا، جس کی مالیت بہت تھوڑی تھی۔ میں اب بھی پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شعبے کی لائبریری میں کام کرتی ہوں۔ اگر نہ کروں تو اس مہنگے ملک میں میرا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔"

"یہ بات تم کس کو کہہ رہی ہو۔ میں بھی اس بارے میں ایک پورا قصیدہ سنا سکتا ہوں۔"

ہمیں باتیں کرتے ہوئے پتا ہی نہ چلا تھا کہ آدھی رات ہونے کو تھی۔ برلن کی اومنی بسوں اور انڈر گراؤنڈ ریل گاڑی کی سروس کے بند ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ ہمیں بمشکل آخری بس میں جگہ ملی، جو سارڈین (Sardine) مچھلی کے ڈبے کی طرح مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اوتا کو بتایا کہ میں اس کی زندگی کی کہانی سے بہت مرعوب ہوا تھا۔ مجھے اس سے پہلے اس جیسی مہم جو لڑکی نہ ملی تھی۔ کہاں چلی کا ملک اور کہاں ہمبرگ کی یونیورسٹی، جہاں پر وہ اکیلی پڑھنے کے لیے آ نکلی تھی۔

ہمبرگ واپس لوٹنے کے بعد ہم یونیورسٹی کے میزا (Mensa) میں دوپہر کے کھانے پر باقاعدگی سے ملنے لگے۔ اوتا ایک فیملی کے پاس رہتی تھی، جہاں پر اس کو ہر روز دو گھنٹے ان کی خط و کتابت

کا کام کرنا پڑتا تھا۔ معاوضے میں اس کو نصف کرایہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے اس سے بہتر کام دلوا سکتا ہوں۔ ایک یوٹیلیٹی اسٹور میں مجھے ہر سنیچر کے روز نصف دن بطور سیلز مین کام ملتا تھا۔ وہاں سے ملنے والے معاوضے کو میں ہفتے بھر کے لیے سامانِ خورد و نوش خریدنے پر خرچ کرتا تھا۔ اس کا دوہرا فایدہ یہ ہوتا تھا کہ مجھے چیزوں کی خریداری پر دس فیصد چھوٹ مل جاتی تھی۔ گویا میری رقم میں دس فیصد اضافہ ہو جاتا تھا۔ پھر اتفاقی طور پر مجھے اس اسٹور میں قالینوں کے سیکشن میں رکھ لیا گیا، جس کا کاروبار بہت مندا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بیشتر قالین چھ ماہ اور اس سے زیادہ عرصے سے اسٹاک میں پڑے ہوے تھے، جس کے سبب ان کی قیمتِ فروخت پر سیلز مین کو دس فیصد کمیشن ملتا تھا۔ جب گاہک مشینی قالین خریدنے کے لیے آتے تھے تو میں ان کو بتاتا تھا کہ اس قیمت میں ان کو بہترین اورینٹل کارپٹ مل سکتا ہے۔ پہلے پہل تو ان کو اعتبار نہ آتا تھا مگر جب میں ان کو قالین دکھاتا تھا تو اکثر لوگ ان کو خریدنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ اگلے ہفتے دوسرا اور تیسرا اورینٹل قالین خریدنے کے لیے آتے تھے، بلکہ اپنے واقف کاروں اور رشتہ داروں کو ساتھ لاتے تھے۔ اس طرح ہر ہفتے مجھے معاوضے کے علاوہ اچھا خاصا کمیشن ملنے لگ گیا، جسکے سبب مجھے دوسری جگہوں پر کام کرنے کی حاجت نہ رہی۔ میرا مہینے بھر کا خرچ دو سو پچاس مارک میں پورا ہو جاتا تھا، اس لیے میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ میں مہینے میں اس سے زیادہ رقم نہیں کماؤں گا۔ جونہی میری جیب میں اتنی رقم آ جاتی تھی میں مزدوری کا کام روک دیتا تھا اور پورا مہینہ اپنی پڑھائی پر صرف کرتا تھا۔

میں نے سمینار کے انچارج پروفیسر شپولر سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کی منظوری چاہی تو انھوں نے کہا کہ وہ مجھے وظیفہ دلوانا چاہتے ہیں تاکہ تحقیق کا کام پوری توجہ سے کیا جا سکے۔ انھوں نے اس بارے میں جرمن حکومت کے متعلقہ ادارے کو لکھا، جہاں سے مجھے خط آیا کہ میری طرح پانچ دوسرے پاکستانیوں کو وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جن کے کیس جرمنی کی مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں، البتہ کاغذی کارروائی کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم ان کی طرف سے بھیجے جانے والے فارم بھریں، جن پر حکومتِ پاکستان سے منظوری حاصل کرنے کا کام وہ خود سر انجام دیں گے۔ تین چار ماہ کے بعد مجھے اس ادارے کی طرف سے معذرت کا خط ملا کہ وظیفہ ہمیں نہیں دیا جا سکتا کیونکہ حکومتِ پاکستان نے چھ نئے طالب علم جرمنی بھیج دیے ہیں، جو ایک روز اچانک ان کے آفس میں پہنچ گئے تھے۔

اگلے سمسٹر سے اوتا اسی ہوسٹل میں منتقل ہوگئی، جہاں پر میں رہتا تھا۔ اس زمانے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی رہایشی عمارتیں جدا جدا تھیں۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس سلسلے میں بہت جلد ایک انقلاب آنے والا ہے۔ جب ہم دو سال کے بعد ہوسٹل کو چھوڑ گئے تو طالب علموں نے اس نظام کو بدلنے

کا فیصلہ کیا، چنانچہ ایک رات کے اندر اندر لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کمروں کا تبادلہ کیا اور سارے ہوسٹل میں مخلوط آبادی کا نظام رائج ہو گیا۔ اس وقت سے ہوسٹلوں میں لڑکے اور لڑکیاں پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔

اوتا کے ہوسٹل میں آ جانے کے سبب ہمیں ایک دوسرے کو ملنے کے لیے آدھے شہر کا سفر نہیں کرنا پڑتا تھا۔ میری دیکھا دیکھی اوتا نے بھی ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کر دیا تھا، جس میں آمدن اچھی ہو جاتی تھی اور ہمیں کم وقت دینا پڑتا تھا۔ مگر اس چیز میں کوئی شک نہیں کہ جرمن ہوسٹلوں میں طالب علم پارٹیاں دینے، موسیقی سننے اور ڈانس کرنے پر زیادہ اور پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ اوتا کو یہ شکایت رہنے لگی کہ راتوں کو اس کی عمارت میں رہنے والی لڑکیاں اتنی بھاگ دوڑ کرتی اور شور مچاتی ہیں کہ وہ سو نہیں سکتی۔ اس وجہ سے وہ ہوسٹل کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ ہمیں اس کے کمرے میں دوہرا دروازہ لگوانا پڑا، تب کہیں جا کر وہ راتوں کو اطمینان سے سو سکی اور اس نے نقلِ مکانی کا ارادہ بدل دیا۔ اوتا کو میری طرح ان رنگ رلیوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ایرانی طالب علم نے ایک روز مجھ سے معذرت چاہتے ہوے، کہ وہ اس رات منائی جانے والی پارٹی میں کچھ زیادہ ہی شراب پی گیا تھا، کہا کہ ایسی حرکات کا ارتکاب اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والوں سے بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا تعلق اچھے خاندان سے نہیں ہے اس لیے مجھ سے یہ کچھ کبھی سرزد نہیں ہوا۔ اس دن کے بعد سے اسکی کوشش ہوتی تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔

یونیورسٹی کی زندگی

ہمبرگ یونیورسٹی میں طالب علموں کی یونین بہت اہم رول ادا کرتی تھی، اس لیے جب اس کے سالانہ انتخابات آئے، تو میں نے بھی ان میں حصہ لینے کا ارادہ کیا۔ مجھ سے پہلے کبھی کسی غیر ملکی طالب علم نے یہ جرات نہ کی تھی، اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مجھے کتنے ووٹ ملیں گے۔ میرا کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے پروگرام کو بلیک بورڈ پر لگنے والے ایک اشتہار کی صورت میں پیش کیا تھا، جس پر میری تصویر لگی ہوئی تھی اور میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ نہ تو میں نے کوئی جلسہ کیا، نہ کسی پارٹی کی طرف سے مجھے کنویسنگ میں کوئی امداد ملی، اس کے باوجود مجھے انتخابات میں سب امیدواروں سے زیادہ ووٹ ملے۔ اسٹوڈنٹ پارلیمنٹ میں البتہ بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کا زور تھا۔ انھوں نے مجھے یونین میں غیر ملکی طالب علموں کے معاملات کا چارج

لینے کی دعوت دی، مگر تھوڑے دنوں کے اندر اندر میرے کام میں روڑے اٹکائے جانے لگے۔ پتا چلا کہ اسٹوڈنٹ پارلیمنٹ محض دکھاوے کی چیز تھی۔ اصل کام جرمن سیاسی پارٹیوں کے ایما پر ہوتا تھا اور تمام فیصلے یونیورسٹی سے باہر طے پاتے تھے۔ یوں بھی طالب علموں کے اندر سیاست کے معاملے میں ایک قسم کی بیزاری پائی جاتی تھی۔ میں نے دو تین ماہ تک اس ناٹک کو دیکھنے کے بعد اسٹوڈنٹ پارلیمنٹ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت مجھے یا کسی دوسرے سیاسی مبصر کو خبر نہ تھی کہ آیندہ دو تین برسوں کے اندر طالب علم یونیورسٹیوں میں ایک انقلاب برپا کرنے والے تھے، جس کے اثرات سارے جرمن معاشرے پر بہت گہرے ہوں گے۔

ہمبرگ یونیورسٹی کے شعبہ "ثقافت اور تاریخِ شرق اوسط" میں ان دنوں سکّہ شناسی پر ایک خاص سمینار منعقد ہوا، جس میں لیکچر دینے کے لیے ماہرینِ مسکوکات مختلف ملکوں سے باری باری آتے رہے۔ ان کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ شمالی یورپ میں اسلامی سکے اتنی بڑی تعداد میں ملے ہیں، جس کی نظیر خود اسلامی ممالک میں نہیں پائی جاتی۔ یہ سکے سکنڈے نیویا کی وائیکنگ قوم کے ملاحوں کے ذریعے یہاں پر پہنچے تھے۔ وہ لوگ شمالی یورپ سے اون، ریچھ اور دوسرے جانوروں کی کھالیں، سفید چمڑی والے غلام، سنہری بالوں والی لونڈیاں اور دوسری اشیاء مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں لے جا کر بیچتے تھے اور وہاں سے گرم مسالہ، تلواریں، دمشق کے بنے ہوئے کپڑے اور دھات کے برتن وغیرہ لا کر یورپی ممالک میں فروخت کرتے تھے۔ ان کے ذریعے اسلامی ممالک کی کرنسی (بالخصوص چاندی کے درہم) بہت بڑی تعداد میں یہاں پر پہنچی۔ اس زمانے میں چونکہ یورپ کے ممالک میں اپنے سکے رائج نہیں تھے، اس لیے اسلامی سکے یہاں پر تجارتی حلقوں میں اور امیر گھروں میں استعمال ہوتے تھے۔ ایک لیکچر ہمبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر برائے ماقبل از تاریخ کا بھی رکھا گیا تھا، جس نے لیکچر دینے سے پہلے سامعین کو بتایا کہ اس کی معلومات اسلام اور اسلامی تاریخ کے بارے میں بہت تھوڑی ہیں۔ جن چند باتوں کو جاننے کا اس نے دعویٰ کیا وہ ساری کی ساری غلط تھیں۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے پروشیا کے علاقے میں، جو آج کل پولینڈ کے تحت ہے، قدیمی تاریخی آثار کی کھدائی کے دوران ہزاروں اسلامی سکے اس کے ہاتھ لگے تھے۔ جن کو اس نے ایک میوزیم کے تہہ خانے میں رکھوا دیا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ جنگ ختم ہونے پر کسی ایسے ماہر سے ان سکوں پر تحقیق کرائی جائے، جو اسلامی تاریخ پر نظر رکھتا ہو۔ پھر جب جنگ کے آخری دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ وہ علاقہ، جہاں پر کھدائی کے دوران اسلامی سکے ملے تھے، جرمنی کے ہاتھ سے نکل جائے گا، تو اس نے اس سارے خزانے کو وہاں سے نکلوا کر شٹراہلزونڈ (Strahlsund) کے میوزیم میں محفوظ کرا دیا تھا۔ اس خزانے کا علمی دنیا میں کسی کو علم نہیں تھا

۔اس پر کسی قسم کا تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔خطرہ اس بات کا تھا کہ اگر پولینڈ کی حکومت کو پتا چل گیا کہ وہ خزانہ اس علاقے میں ملا تھا، جواب پولینڈ کے تحت ہے تو اس ملک کی حکومت اس خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ بین الاقوامی قانون کی رو سے اس کا موقف درست ہوگا اور مشرقی جرمنی کی حکومت کو، جس کے علاقے میں شراہلزونڈ واقع تھا، وہ خزانہ پولینڈ کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جرمنی بھر میں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ لاکھوں اسلامی سکے کس مقام پر چھپا کر رکھے گئے تھے۔ وہ لیکچر والے روز اپنے ساتھ ڈیڑھ دو سو سکوں کی تصویریں لایا تھا، جو اتنی صاف تھیں کہ ہم آسانی کے ساتھ ان پر مرقوم عبارت کو پڑھ سکتے تھے، جس کے نتیجے میں ان سکوں کے ڈھالے جانے والے عہد کا پتا چلتا تھا۔اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر ہم میں سے اسلامی تاریخ کا کوئی طالب علم اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہو، تو وہ اس کو اپنے اگلے سفر کے دوران ساتھ لے جائے گا۔ میں نے اس کام میں دلچسپی کا اظہار کیا۔اس نے میرے لیے مشرقی جرمنی کی حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی ذمہ داری اٹھائی، جو بہت جلد مل گئی۔ میں نے اسے بتا رکھا تھا کہ مجھے کوئی وظیفہ نہیں ملتا اور مجھے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مزدوری کرنی پڑتی ہے، اس لیے اگر وہ میرا تعاون چاہتا ہے، تو اس کو میرے لیے کہیں سے مالی گرانٹ حاصل کرنی ہوگی۔اس سلسلے میں اس نے مغربی جرمن ادارہ برائے تحقیق کو درخواست دے رکھی تھی۔ایک روز مجھے اسکا فون آیا کہ گرانٹ مل گئی ہے اور ہم اگلے ماہ سفر پر جا سکتے ہیں، مگر گرانٹ کی رقم بہت کم ہے اور صرف اسکے لیے کافی ہوگی۔ مجھے بہر صورت اپنے خرچ پر جانا ہوگا۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ اسے جواب دینا پڑا، کیونکہ میرے لیے نہ صرف مالی طور پر یہ گھاٹے کا سودا تھا بلکہ میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر تحقیق کا حرج کرنے کا مرتکب ہوتا۔ پروفیسر موصوف وفات پا چکے ہیں اور مجھے علم نہیں ہے کہ ان سکوں پر کسی دوسرے محقق نے کام کیا یا نہیں۔

ڈاکٹریٹ کے مقالے پر میرا کام جاری تھا۔مقالے کی ترقی کا جایزہ لینے کے لیے پروفیسر شپولر کا طریقِ کار یہ تھا کہ مجھے ہر ماہ کی ایک مقرر تاریخ پر مقالے کا ایک باب پیش کرنا ہوتا تھا۔اس روز دوپہر کا کھانا ہم اکٹھے ایک ریستوران میں جا کر کھاتے تھے اور میں انھیں اس ماہ کے دوران کی جانے والی تحقیق کے اہم پہلوؤں سے آگاہ کرتا تھا۔جب ہم اگلے مہینے ملتے تھے تو وہ مجھے سابقہ ماہ پیش کیا جانے والا باب واپس دیتے تھے۔ سارے مقالے میں صرف دو مقامات ایسے آئے، جہاں پر انھوں نے میرے پیش کردہ متن میں معمولی ترمیم کرنے کا مشورہ دیا، وگرنہ پورا مقالہ عین اسی صورت میں قبول کر لیا گیا، جس رنگ میں ان کے سامنے رکھا جاتا رہا۔گویا انھیں میری تحقیق اور اس کو پیش کرنے کے انداز پر کوئی اعتراض نہ تھا۔لیکن مجھے اس وقت پتا نہ تھا کہ ان کے اس اعتماد کا مجھے بہت جلد مثبت رنگ میں پھل

ملنے والا ہے۔ ایک روز اچانک فولکس واگن فاؤنڈیشن کی طرف سے مجھے خط ملا کہ ہمبرگ یونیورسٹی نے میرا نام تحقیقی گرانٹ کے لیے پیش کیا ہے، کیونکہ میرے مقالے کے ذریعے علمی تحقیق کے نئے راستے کھلنے کا امکان نظر آ رہا ہے۔ اگلے ماہ سے مجھے ماہوار ایک معقول رقم ملنے لگی اور میں مالی طور پر بے فکر ہو کر اپنے مقالے کی تکمیل میں لگ گیا۔

جرمن نظامِ تعلیم میں فلسفے کے شعبے میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے میرے وقتوں میں ضروری تھا کہ ایک کلاسیکی زبان، مثلاً: لاطینی، عربی یا سنسکرت میں مہارت کا ثبوت مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے ایک خاص امتحان دینا پڑتا تھا، جس کا شمار مشکل ترین امتحانوں میں ہوتا تھا۔ میں نے پروفیسر شپولر سے کہا کہ میں پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی کا امتحان پاس کر چکا ہوں، اس لیے اس امتحان کو عربی میں مہارت کے امتحان کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کو میری عربی دانی پر اس درجہ اعتماد تھا کہ انھوں نے کہا اگر آپ آدھے گھنٹے کے لیے میرے آفس میں آ جائیں، تو ہم یہ امتحان ابھی کر لیتے ہیں۔ انھوں نے اسسٹنٹ پروفیسر کو بلا بھیجا۔ نصف گھنٹے کے امتحان کے بعد مجھے "عرابیکم (Arabicum": ماہرِ علومِ عربی زبان) کی ڈگری مل گئی۔ مجھے علم تھا کہ متعدد عرب طالب علموں نے لمبی چوڑی تیاری کے بعد یہ امتحان دیا تھا اور پاس نہ کر سکے تھے۔ میرے مصری دوست احمد عبدالحمید کو اس وجہ سے لاطینی سیکھنی پڑی تھی، جس پر اس کے دو برس لگ گئے تھے۔ وہ ہیگل کے فلسفے پر ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔

جرمن یونیورسٹیوں کی ایک دوسری خصوصیت سے انھی دنوں میں متعارف ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹریٹ کے امیدواروں کو اس مضمون کے علاوہ، جس میں وہ اپنا مقالہ لکھتے تھے، دو مزید مضامین ایم اے کے لیول تک پڑھنے پڑتے تھے۔ جس مضمون میں مقالہ لکھا جاتا تھا اس میں ایک گھنٹے کا زبانی امتحان شامل تھا، جو مقالے کے دفاع کے لیے تھا۔ دوسرے دونوں مضامین میں امتحان زبانی دینا ہوتا تھا، جو نصف گھنٹے کا ہوتا تھا۔ میرے اضافی مضامین سیاسیات اور علم تربیت کا تقابلی مطالعہ تھے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جس ہوسٹل میں مجھے کمرہ ملا تھا اس کا سرپرست پولیٹکل سائنس کا پروفیسر تھا، جو جنگ کے زمانے میں آکسفورڈ کے ایک کالج میں استاد رہ چکا تھا۔ اس کا علمی اختصاص ریاستوں کے قوانینِ اثاثی تھا، جن کے بارے میں میرا سابقہ مطالعہ میرے کام آ سکتا تھا، اس لیے میں اس کے شعبے میں جانا چاہتا تھا۔ مگر عین ان دنوں میں اس کو ایک موذی مرض لگ گیا اور اس کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینی پڑی۔ مجھے مجبوراً اس کے کولیگ پروفیسر ویلہلم ہینیس (Wilhelm Hennis) کے پاس جانا پڑا، جس کی تخصیص قانون اور بیوروکریسی کے علوم میں تھی۔ وہ مجھے اپنے شعبے میں لینے کے لیے تیار ہو گیا، مگر اس شرط پر کہ میں کم از کم چار سمسٹروں تک اس کے لیکچروں میں شامل ہونے کے علاوہ شعبے کے سمیناروں

میں دو تحقیقی مقالے پیش کروں۔ اس نے کہا اگر آپ اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے، تو میں آپکا ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں ہونے والا امتحان لینے کے لیے تیار ہوں گا۔

چنانچہ مجھے ہر ہفتے اس کے سمیناروں میں جانا پڑا، جن میں کم و بیش ۸۰ طالب علم شرکت کرتے تھے۔ مقالوں کے سلسلے میں طالب علموں کے درمیان مسابقہ ہوتا تھا، کیونکہ ایک ہی موضوع پر دس بارہ طالب علم مقالہ لکھتے تھے، جن میں سے اوّل آنے والا مقالہ سمینار میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا، جب کہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے مقالوں کو صرف جزوی طور پر پیش کرنے کی اجازت ملتی تھی۔ میرے دونوں مقالے اول آئے اور سمینار میں پڑھ کر سنائے گئے۔ اس وجہ سے میرا شمار پروفیسر ہینیس کے معتمد طالب علموں میں ہونے لگا۔ عین ان دنوں میں خبر آئی کہ پروفیسر ہینیس کو جنوبی جرمنی کی یونیورسٹی آف فرائی برگ (Freiburg) کی طرف سے ایک آفر ملی ہے، جس میں بہتر تنخواہ کے علاوہ ایک انسٹیٹیوٹ کی ڈائرکٹری اور ریسرچ کے لیے بڑے پیمانے پر مہیا کیے جانے والے فنڈز شامل ہیں۔ طالب علموں کو خطرہ تھا کہ پروفیسر ہینیس اس آفر کو قبول کرلیں گے اور بہت جلد ہمبرگ کو خیر باد کہہ جائیں گے۔ اس صورت میں میری طرح بے شمار طالب علموں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کو دوسرے پروفیسروں کے پاس جانا پڑے گا اور نئے سرے سے انکی اختصاصی لائن آف اسٹڈی کا مطالعہ کرنا پڑے گا، جس پر مزید وقت لگ جائے گا۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے یونیورسٹی کی طرف سے متعلقہ پروفیسر کو اسپیشل آفر کی جاتی ہے تاکہ وہ یونیورسٹی بدلنے کا خیال دل میں نہ لائے۔ طالب علم بھی اس سلسلے میں جلسے جلوس برپا کرتے ہیں اور یونیورسٹی پر زور ڈالنے کے علاوہ متعلقہ پروفیسر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کو چھوڑ کر نہ جائے۔ اس سلسلے میں طالب علم ایک مشعل بردار جلوس بھی نکالتے ہیں۔ ہمارا جلوس، جس میں دو سو کے لگ بھگ طالب علموں نے حصہ لیا تھا، ایک شام پروفیسر ہینیس کے ہمبرگ کے مضافاتی قصبے بیر گے ڈورف (Bergedorf) میں اسکے گھر پر جا کر ختم ہوا تھا، جہاں پر اس نے جلوس کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریر کی، جس میں طالب علموں کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اسکا فرائی برگ جانا طے پا چکا ہے، مگر اس نے کہا کہ وہ آیندہ دو برسوں تک امتحان لینے کے لیے ہمبرگ آتا رہے گا۔ میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی، کیونکہ مجھے امید تھی کہ میرا مقالہ دو برسوں کے اندر مکمل ہو جائے گا اور میں پولیٹکل سائنس کے مضمون کا امتحان اسکے پاس دے سکوں گا۔

میرا دوسرا اضافی مضمون علم تربیت کا تقابلی مطالعہ میرے لیے نیا تھا۔ البتہ میں شروع سے علمِ تربیت کے لیکچروں میں شرکت کرتا آیا تھا، کیونکہ ان دنوں یورپ کی یونیورسٹیوں میں بائیں بازو کے طالب علموں میں اس موضوع پر بحث مباحثہ چل رہا تھا کہ انسانوں کے اندر پائے جانے والے جبلی

رجحانات کوتربیت کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے یا نہیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہوگا اگر عملِ تربیت ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر انگلستان کے مدرسے سمر ہل (Summer Hill) کی مثال پیش کی جاتی تھی، جہاں پر طالب علموں کو ہر قسم کی آزادیاں حاصل تھیں۔ اوتا کی سہیلی کارن (Karen) کے باپ نے اپنی پوتی کو سمر ہل اسکول میں داخل کرا رکھا تھا اور ہمیں آزادانہ تربیت کے بارے میں لیکچر دیا کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اوتا کی دوسری سہیلی جولیانے (Juliane) کے باپ کا خیال تھا کہ انسانوں کے جینز کے اندر پائی جانے والی موروثی خصوصیت زیادہ اہم ہے، کیونکہ وہی بچوں میں اس کے نمو کا سبب بنتی ہے۔ اس میں آزادانہ تربیت کسی قسم کا فرق پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ بحث نجی پارٹیوں میں ہی نہیں چل رہی تھی بلکہ ملک کے اخباروں میں بھی گرم تھی۔ اس موضوع پر آئے دن نت نئی کتابیں چھپ رہی تھیں۔ یونیورسٹیوں میں آزادانہ تربیت کے حق میں اور اس کے خلاف لیکچروں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ علم عمرانیات کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ میری دلچسپی اس میں اتنی گہری تھی کہ میں پوری سنجیدگی کے ساتھ عمرانیات کو بطور ذیلی مضمون اختیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ یوں بھی میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ایک پہلو عمرانیات سے تعلق رکھتا تھا، جس کے سبب مجھے اس مضمون کا بہرصورت مطالعہ کرنا تھا۔

ان دنوں طالب علموں کے اندر ویت نام کی جنگ کے سبب امریکہ کی جارحیت کے خلاف احتجاج کی رو چل نکلی تھی، جس کا ایک پہلو آمریت پسندی کی مخالفت تھا۔ اس کے ڈانڈے تحکم پسند تربیت کے بالمقابل آزادانہ تربیت سے جا کر ملتے تھے۔ نوجوانوں نے زندگی کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کرانے کا تہیہ کر رکھا تھا، جس کا پہلا شکار معاشرے کی جنس پر لگائی جانے والی قیود بنیں۔ اس چیز کا اظہار رسالوں میں چھپنے والی ننگی تصویروں اور فلموں اور تھیٹرز میں توڑے جانے والے معاشرتی ضوابط کے ذریعہ ہونے لگا تھا۔ عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جانے کی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ تھی۔ طالب علم معاشرے کے نظام کو بدلنے کے خواب دیکھ رہے تھے، جس کے نتیجے میں حاکم اور محکوم، افسر اور ماتحت کا اختلاف مٹ جائے گا۔ یونیورسٹی کے نظام کو جمہوری طرز پر چلائے جانے کے مطالبات کا مطلب یہ تھا کہ پروفیسروں کی بالادستی ختم کردی جائے گی اور ان کو یونیورسٹی میں پڑھنے والوں اور انتظامیہ کے ساتھ اپنے اختیارات کو بانٹنا ہوگا۔

اتفاقی طور پر علمِ تربیت کے تقابلی مطالعے کی واحد چیئر ہمبرگ یونیورسٹی میں تھی۔ میرا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اسلامی معاشرے کے ابتدائی زمانے میں رائج نظامِ تعلیم کے بارے میں تھا، اس لیے ضروری سمجھا گیا تھا کہ میں دوسرے نظام ہائے تعلیم سے واقفیت پیدا کروں، تا کہ ان کے ساتھ موازنہ و مقابلہ کیا

جا سکے۔ اس مضمون کے پروفیسر ڈاکٹر ہاؤسمن (Hausmann) تھے، جو بیس برسوں تک ترکی میں جرمن اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے، جن کو نازی پارٹی کے زمانے میں جرمنی کو چھوڑنا پڑا تھا اور جن کو ترکی میں پناہ ملی تھی۔ وہ اسلامی نظامِ تعلیم کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ جب انھیں پتا چلا کہ میں اس نظام کے ابتدائی زمانے پر تحقیق کر رہا ہوں، تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اپنے سمینار میں آنے کو کہا، جس کا سیشن ہر ہفتے ہوتا تھا۔ اس میں صرف ان طالب علموں کو داخلہ ملتا تھا، جو ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کر رہے ہوتے تھے۔ باری باری سب کو اپنے ریسرچ پروجیکٹ پر روشنی ڈالنے کی دعوت ملتی تھی۔ یہ سمینار صحیح معنوں میں محققوں کی تربیت گاہ تھی، جہاں پر کھلے بندوں تحسین وتنقید کی اجازت تھی۔ اس سمینار میں میرے ساتھ بیٹھنے والے طالب علم آگے چل کر پارلمان کے رکن، جج، وکیل، محقق، پروفیسر، صحافی، ادیب وغیرہ بنے اور ان کا شمار جرمنی کی نامور شخصیتوں میں ہوا۔ میرے تعلقات ان کے ساتھ آج تک قایم ہیں۔

جرمن یونیورسٹوں کے طریقِ کار اور اسلامی نظامِ تعلیم میں ایک دلچسپ مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں گزشتہ برسوں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہیں، مگر میرے زمانہِ طالب علمی میں اس کا اظہار قدم قدم پر ہوتا تھا۔ دونوں میں کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ بالخصوص پروفیسروں کے لیکچروں میں کیا مبتدی اور کیا ڈاکٹریٹ کا امیدوار ہر کوئی شامل ہوسکتا تھا۔ اس کا بہترین مظاہرہ پروفیسر فان وائس ایکر (von Weizsäcker) کے لیکچروں میں ہوتا تھا، جس میں شامل ہونے والوں کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی، جس کے سبب ان کا لیکچر یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہوتا تھا۔ یوں تو ان کا شمار دنیا کے نامور ماہرینِ فزکس میں ہوتا ہے اور وہ ان سائنسدانوں میں سے ہیں، جن کو نازی جرمنی کے زمانے میں ایٹم بم بنانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی، مگر میرے زمانہِ طالب علمی میں وہ فلسفہ پڑھاتے تھے۔ ان کو پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو آسان اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کا گر آتا ہے۔ میں چار سمسٹروں تک ان کے ہر لیکچر میں شامل ہوتا رہا، جو جمعرات کی شام کو یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہوتے تھے۔ انھوں نے باری باری سارے نامور یونانی فلسفیوں کا تعارف کرایا اور ان کے پیش کردہ فلسفے پر روشنی ڈالی، مگر جب زمانہِ قدیم کا ذکر ختم ہوا تو موصوف نے یکدم چھلانگ لگائی اور سیدھے سولھویں صدی پر پہنچ گئے، جیسے درمیانی زمانہ اور مسلمان اور یہودی فلاسفر، جن کے ذریعے یورپ تک یونانی فلسفہ پہنچا تھا، پائے ہی نہیں جاتے۔ میں نے اور میرے مستشرق دوستوں نے اس کے بعد ان کے لیکچروں میں جانا چھوڑ دیا۔

ہماری خوش نصیبی سے اس زمانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھانے والے پروفیسر رچرڈ والزر (Richard Walzer) ہر سال سردیوں کے سمسٹر میں چھ ہفتوں کے لیے ہمبرگ آجاتے تھے۔

وہ اسلامی فلسفہ کے استاد تھے اور ان یہودی محققوں میں سے تھے، جن کو نازی جرمنی سے جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔ وہ جرمن زبان کے رسیا تھے اور یہ زبان بولنے اور سننے کی خاطر بے چین رہتے تھے۔ وہ ہمارے سمینار میں اسلامی فلسفے پر ہفتے میں دو لیکچر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی طالب علم ان کو سارا دن گھیرے رہتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ بحث مباحثے میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ بھی میرے تحقیقی کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ میرے ذریعے ان کو بغداد کی علمی اکاڈمیوں کے بارے میں نئی معلومات ملیں۔

انگلستان سے ایک اور یہودی پروفیسر ڈاکٹر باگے بوہر (Bagebuhr) سال کے سال دو تین ماہ کے لیے آتے تھے۔ ان کا خاص موضوع اندلس کے یہودیوں کا ادب اور فلسفہ تھا۔ مجھے ان کے لیکچروں میں بیٹھنے کے نتیجے میں اندلس کی عربی شاعری کا مطالعہ کرنے کی تحریک ہوئی۔ ڈاکٹر باگے بوہر بتایا کرتے تھے کہ ان کی بیوی کا پہلا خاوند ڈاکٹر کرامت اللہ پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار ہوا کرتا تھا۔ میرے میٹرک کے سرٹیفکیٹ پر ان کے دستخط ہیں۔ ان کے علاوہ مجھے مصری محقق ڈاکٹر حسین مونس کی شاگردی کا فخر بھی حاصل ہوا، جنھوں نے ساری عمر اندلس کے عربی ادب پر کام کرنے میں گزاری تھی۔ وہ آگے چل کر عرب لیگ کی طرف سے میڈرڈ میں قایم کی جانے والی انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوے۔ مجھے ان کے علاوہ جن استادوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان میں تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ذبیح اللہ صفا شامل تھے، جنھوں نے "تاریخِ علومِ عقلی در تمدنِ اسلامی" لکھی ہے۔ وہ بار بار آتے رہے اور بالآخر جرمنی کے ہی ہو کے رہ گئے، جہاں پر انھوں نے شادی کی اور وہیں پر لمبے عرصہ تک قیام کے بعد چند برس ادھر وفات پائی۔ پروفیسر وائیس ایکر سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے خاص طور پر ان کی طرف رجوع کیا تھا۔ وہ پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔

سب سے زیادہ استفادہ میں نے پروفیسر فرٹز کرنکو (Fritz Krenkow) سے کیا، اگرچہ ان کے ساتھ میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ ایک جرمن کاروباری فیملی کے سپوت تھے۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہو گئی تھی، جس کے سبب ان کو والدہ نے اسکول سے اٹھا لیا تھا اور کاروبار میں لگا دیا تھا۔ انھوں نے کسی یونیورسٹی میں ایک دن کے لیے بھی تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر انیسویں صدی کے آخری برسوں میں وہ انگلستان چلے گئے، جہاں پر انھوں نے ٹیکسٹائل فیکٹری قایم کی اور ایک انگریز عورت سے شادی کر لی۔ وہ اپنے ذاتی مطالعہ سے عرب شاعری اور دوسرے فنون کے ماہر بن گئے تھے، جس کا چرچا بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نکولسن (Nicholson) نے ان کا اپنی ایک کتاب میں، خاص طور پر عربی شاعری کے سلسلے میں، رہنمائی کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا تھا۔ تیسری دہائی کے اواخر میں ان کو علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی ادب کا پروفیسر مقرر

کیا گیا، مگر وہ دوسال سے زیادہ وہاں پر نہ رہ سکے کیونکہ ان کی اہلیہ کو ہندوستان کی آب وہوا راس نہ آئی تھی۔ پھر ان کو جرمنی کی بون یونیورسٹی میں پروفیسر بنانے کی تجویز پیش ہوئی، چونکہ ان کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ تھی، جس کے بغیر جرمنی میں یونیورسٹی میں پروفیسرشپ نہیں مل سکتی اس لیے ان کو ہالے (Halle) کی یونیورسٹی نے آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ مگر وہ جرمنی میں بھی اپنی بیوی کی بیماری کے سبب زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اور انگلستان چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا اصل سبب غالبًا یہ تھا کہ وہ یہودی ہوتے ہوئے نازی جرمنی میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی تجویز پر ڈاکٹر اوٹو شپیس (Otto Spies) کو، جو بون میں ان کے طالب علم رہ چکے تھے، علی گڑھ میں عربی ادب کا پروفیسر بنا دیا گیا تھا۔ برسوں کے بعد میری ملاقات پروفیسر شپیس کے ساتھ بون میں ہوئی اور انھوں نے مجھے علی گڑھ میں اپنے قیام کی باتیں سنائیں۔ انھوں نے ہندوستان سے واپسی پر اردو گرائمر کی ایک کتاب بھی چھاپی تھی، مگر اس دوران میں وہ اردو قریب قریب بھول چکے تھے۔ پروفیسر کرنکو کو جب دوسری جنگِ عظیم کے بعد پتا چلا کہ ہمبرگ یونیورسٹی کے اورینٹل سیمینار کی ساری کتابیں بمباری کی نذر ہوگئی ہیں، تو انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری کی پانچ ہزار نہایت قیمتی کتابیں ہمبرگ بھیج دی تھی۔ میں نے ان کتابوں سے بھرپور فایدہ اٹھایا، جن میں اکثر اس مراسلت کی اصل کاپیاں رکھی ہوئی تھیں، جو ان کے اور پبلشروں کے درمیان ہوتی رہی تھی۔ بہت سی کتابوں کے مسودات انھوں نے مہیا کیے تھے اور کئی ایک کتابوں میں رہ جانے والی خامیوں کی طرف انھوں نے توجہ دلائی تھی۔ "تاریخِ بغداد" کے چھپنے پر اس میں چار سو علماء کی سوانح حیات کے رہ جانے کا سراغ بھی انھوں نے لگایا تھا اور اصل مسودہ مہیا کیا تھا جس کی مدد سے اس غلطی کا ازالہ کیا جا سکا تھا۔ پروفیسر کرنکو اپنے عرب مراسلہ نگاروں کے نام خط لکھتے ہوئے اپنا نام "سلیم کرنکو" لکھا کرتے تھے، جو ان کے جرمن نام "فرٹز" (Fritz) کا عربی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس وجہ سے بعض لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔

یہی صورت حال پروفیسرانے ماری شمل (Anne-Marie Schimmel) کے بارے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسلامی دنیا میں عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگئی تھی اور اس نے اپنے لیے جمیلہ کا نام چنا تھا، مگر غیر مسلموں کے سامنے وہ اپنے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ جب میری اس کے ساتھ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں ورتزبرگ (Würzburg) کے مقام پر منعقد ہونے والی جرمن مستشرقین کی کانفرنس کے موقع پر ملاقات ہوئی، تو ہم دونوں نے سیب کے جوس کے گلاس ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے، جب کہ دوسرے شرکاءِ کانفرنس انگور کی شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ انے ماری شمل نے مجھے مخاطب کر کے کہا: "ہم مسلمانوں کو جرمنوں کی شراب نوشی میں بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔" مگر

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عام طور سے شراب نوشی سے پرہیز کرتی تھی۔ ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ چونتیس برسوں پر محیط تھا، جس کے دوران بہت سے ایسے مواقع آئے، جب میری موجودگی میں اس کو شراب پیش کی گئی اور اس نے قبول کی۔ دوسری طرف میں کتنے ہی مسلمانوں کو جانتا ہوں، جو نہ صرف شراب پیتے ہیں بلکہ اس امر پر فخر کرتے ہیں۔ اس لیے کسی کے شراب پینے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگر فی الواقعہ انے ماری شمل مسلمان ہوگئی تھی تو اس کو اس بات کا اقرار غیر مسلمانوں کے سامنے بھی کرنا چاہیے تھا، جس کے مواقع میری موجودگی میں پیش آتے رہے، مگر وہ کھل کر ان کے سامنے یہ بات کہنے کے لیے تیار نہ تھی۔ دوسری طرف اس نے ایک ترک مسلمان کے ساتھ شادی بھی تو کی تھی۔ البتہ میرا احساس تھا کہ وہ اس شادی کو اپنی نوجوانی کی حماقتوں میں شمار کرتی تھی اس لیے اس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ جرمنی میں کنواری عورتوں کو ان کے خاندانی نام اور "فراولائن" (Fräulein) (لفظی ترجمہ: چھوٹی عورت) کے اضافہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جرمن مستشرقین کے حلقوں میں وہ "فراولائن شمل" کے نام سے پکاری جاتی تھی۔

اس زمانے میں اس کو جرمنی میں مستقل پروفیسر شپ نہیں مل سکی تھی اور جب تک وہ بون یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی وہ سمینار کی جونیئر اسٹاف ممبر تھی۔ اس کا تعلق بون یونیورسٹی کے لینگویج اسکول سے تھا، جو جرمنی کے سفارت کاروں کے لیے کھولا گیا تھا اور جہاں پر مختلف زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ شمل عربی زبان کی انسٹرکٹر تھی۔ ۱۹۶۷ء میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک اسامی کے لیے جگہ نکلی ،جس کی داستان میں نے اپنے کولیگ ڈاکٹر رچرڈ فرائی کی زبانی سنی، جو اس زمانے میں ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔ ان کو ایک روز یونیورسٹی کے ایک سابق طالب علم James Cherry کا فون آیا کہ اس کے ایک کروڑ پتی کلائنٹ نے اپنی جائیداد کا معتد بہ حصہ اردو شاعر غالب کے کلام کو انگریزی میں ڈھالنے کے لیے چھوڑا ہے۔ اس نے پوچھا کیا اس کا انتظام ہارورڈ یونیورسٹی کے ذریعے ہوسکتا ہے؟ یہ کروڑ پتی وہی عطاء اللہ اوزئی درانی تھے، جنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک پروفیسر شپ اسی مقصد کے لیے قایم کی تھی، جس پر آل احمد سرور کا تقرر ہوا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ جب برسوں کی تاخیر کے بعد درانی صاحب کو غالب کے کلام کا جزوی ترجمہ پیش کیا گیا، تو وہ اس کے ناقص معیار کے سبب اتنے ناراض ہوئے کہ سرور صاحب کے خلاف قانونی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ عطاء اللہ درانی غالب کے عاشقوں میں سے تھے۔ انھوں نے امریکہ میں مشہورِ عالم "منٹ رائس" (Minute Rice) ایجاد کیا تھا۔ چاول، جو پلاسٹک کی تھیلی میں بند ہوتے ہیں، ان کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے، تو وہ لمحوں میں پک جاتے ہیں اور ان کا ایک ایک دانہ الگ الگ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرائی نے کہا کہ اس سرمائے

سے ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک فیلوشپ ہندوستانی مسلم ثقافت کے بارے میں قایم کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ہی انے ماری شمل کا نام پیش کیا، جن کے بارے میں ان کو حسنِ ظن تھا کہ وہ غالب کے کلام کو انگریزی میں ڈھالنے کا کام بخوبی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اس نے غالب پر پہلی کتاب ۱۹۷۱ء میں چھپوادی تھی جس میں فارسی اور اردو کلام کے تراجم شامل ہیں۔ غالب پر اس کی دوسری کتاب ۱۹۷۹ء میں نئی دہلی سے چھپی تھی۔ آگے چل کر اس فیلوشپ کو لیکچرر کا نام دے دیا گیا، مگر آخر تک اس کو پروفیسر شپ میں نہ ڈھالا جاسکا۔ البتہ شمل کو پروفیسر شپ مل گئی تھی۔ دراصل درانی فاونڈیشن کی سالانہ آمدن اتنی نہ تھی کہ پورے شعبے کے اخراجات ادا کیے جاسکتے۔

شمل کو سال بھر میں صرف پانچ ماہ کی تنخواہ ملتی تھی، اس لیے وہ فروری سے جون تک پانچ مہینے امریکہ میں گزارتی تھی اور باقی وقت بون میں تالیف وتصنیف پر لگاتی تھی۔ جب ایک بار انے ماری کی زبانی یہ تفصیل سننے کے بعد میں نے اس کی آمدن کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا، تو اس نے جواب دیا کہ اسے ذاتی طور پر یہ انتظام پسند ہے، کیونکہ اس کو اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر لکھنے کا وقت مل جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ کتابوں کی رائلٹی اور تقریروں کے معاوضے کے سبب اس کا اچھا خاصا گزارہ ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کے گھر بار کا کام اس کی بوڑھی ماں کرتی تھی، جس کے اشتراک سے انے ماری اپنی کتابوں کی پروف ریڈنگ کیا کرتی تھی۔ اس بات پر وہ بے حد فخر کرتی تھی کہ اس کی ماں اسی برس کی عمر میں پروف ریڈنگ جیسا باریک کام کرلیتی ہے۔ خود شمل بھی بیاسی سال کی عمر میں اپنی وفات تک لکھنے پڑھنے کا کام بخوبی کرتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی عینک کے شیشے ۱۳-۱۴ نمبر کو پہنچ چکے تھے اور اس کو کتاب ناک تلے رکھ کر پڑھنی پڑتی تھی۔ آخری برسوں میں اس کی گردن مڑ گئی تھی، جس کے سبب اس کو اپنے مقابل کی طرف دیکھنا دشوار لگنے لگا تھا۔ یوں بھی تقریر کرتے ہوے وہ آنکھیں بند کرلیتی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی غیر مرئی مسودے کو پڑھ کر سنا رہی ہے۔ میں نے اسے علاج کرانے کا مشورہ دیا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ گردن ٹیڑھی ضرور ہوگئی ہے مگر چونکہ درد نہیں اٹھتا اس لیے علاج معالجے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے ٹائپ رائٹر پر لکھنے میں دقت پیش نہیں آتی؟ اس پر اس نے کہا میں کون سا دیکھ کر لکھتی ہوں۔ جب میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو اندھا دھند ٹائپ کرتی چلی جاتی ہوں۔ اگر کوئی غلطی رہ گئی تو اسے بعد میں درست کیا جاسکتا ہے۔ جب میں نے بتایا کہ میں کمپیوٹر پر لکھتا ہوں، تو اس نے کہا ان نئے زمانے کی چیزوں کو وہ اب سیکھنے سے رہی۔ مگر جب امن انعام ملنے پر اس کے خلاف تحریک چلی اور ہر روز اس کو بے شمار فون آنے لگے تو اسے ٹیلی فون کا جواب دینے والی مشین لگانی پڑی۔ مجھے اس نے کہا یہ نئے زمانے کی آخری ایجاد ہے، جس سے وہ دوستی کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔

شمل کے بارے میں مجھے پہلی بار ممتاز حسن نے بتایا، جب وہ ۱۹۶۳ء میں جرمنی آئے تھے۔ میں اس زمانے میں جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں ریسرچ فیلو تھا، جہاں پر مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے تمام اہم لوگ حاضری دیا کرتے تھے۔ میں نے ان کی ملاقات ہمبرگ کی مقامی "پاکستانی مجلس" کے صدر فرخ ملک سے کرائی، جو ہمیں شہر کی مشہورِ زمانہ ہیرامنڈی "ریپر باہن" دکھانے کے لیے لے گئے جہاں پر عورتیں بکتی ہیں۔ کہنے کو تو ان کے شو میں ڈانس ہوتا ہے مگر اس کا بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ عورت مرد تماشائیوں کے سامنے بھاؤ دکھا دکھا کر دھیرے دھیرے اپنے کپڑے اتارے اور مردوں کے جنسی جذبات کو ابھارے۔ پتا نہیں ممتاز حسن اس ناٹک سے محظوظ ہوئے یا نہیں، میرے لیے اس بازار کی وہ پہلی اور آخری یاترا تھی۔ اس کے بعد اگر کسی مہمان نے اس بازار کی سیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں انھیں وہاں جانے والی بس میں بٹھا دیا کرتا تھا کہ جو کچھ دیکھنا یا کرنا کرانا ہے وہ میری غیر حاضری میں اپنی ذمے داری پر کریں۔ مگر اکثر لوگ اکیلے وہاں جانے سے گھبراتے ہیں کہ کہیں کوئی رنڈی ان کی مردانگی پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ شفیع عقیل البتہ اکیلا گھوم پھر آیا تھا اور ایک سیکس شاپ سے مختلف قسم کی کریمیں بھی اٹھا لایا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ویاگرا (Viagra) ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ممتاز حسن سے ملاقات سے اگلے روز سمینار کی لائبریری میں انے ماری شمل کی کتابیں تلاش کیں، تو اس کی پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگی وہ ابنِ خلدون کے مقدمہ کے چنیدہ ابواب کا ترجمہ تھا۔ انھی دنوں میں اس کی کتاب "بالِ جبریل، سر محمد اقبال کے مذہبی خیالات کا مطالعہ" انگریزی میں ہالینڈ سے شایع ہوئی مگر پاکستان کے بارے میں اس کی جرمن کتاب "پاکستان، ہزار دروازوں والا محل"، جس کا ذکر ممتاز حسن نے خاص طور پر کیا تھا، دو برسوں کے بعد چھپی۔ دوسری کتاب، جس کا انھوں نے ذکر کیا تھا اور جو سندھ میں جرمن مشنری ارنسٹ ٹرومپف (Ernst Trumpf) کے بارے میں تھی، اورینٹ انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں سے نکل آئی۔ ٹرومپف نے سندھی رسم الخط کی تشکیل کا کام کیا تھا اور شاہ لطیف بھٹائی کا دیوان مدون کیا تھا۔ اسکے بعد اس نے کچھ عرصہ گرنتھ صاحب پر بھی تحقیق کی تھی اور پنجابی گورمکھی لپی میں ردوبدل کے سلسلے میں تجاویز پیش کی تھیں۔ پھر برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اس کو پشتو زبان کے رسم الخط کو مدون کرنے پر لگایا گیا تھا۔ البتہ اسکا سندھی زبان پر کام اسکی دائمی شہرت کا باعث بنا تھا۔

سپین اور پرتگال

۱۹۶۵ء کی گرمیوں کا سمسٹر اوتا نے اٹلی کی پیروجا (Perugia) یونیورسٹی میں گزارنے کا ارادہ

باندھا، جس کے لیے اسے وظیفہ مل گیا تھا۔ یوں تو وہ ہسپانوی ادبیات کی طالبہ تھی، مگر اطالوی اور پرتگالی زبان وادب اس کے اضافی مضامین تھے، اس لیے اس کا کسی اطالوی یونیورسٹی میں ایک دوسمسٹروں کے لیے جانا ضروری تھا۔ میں چونکہ اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھا، اس لیے اس کے ساتھ اٹلی نہ جا سکتا تھا۔ البتہ یہ طے پایا کہ جب وہ اگلے برس ایک سمسٹر کے لیے پرتگال جائے گی تو میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔ مجھے امید تھی کہ اس کا پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں پر عبور وہاں پر میرے کام آئے گا۔ میرے مدِنظر ان ممالک میں اسلامی تاریخی آثار سے واقفیت پیدا کرنا تھا، جس کے لیے مجھے ہر قدم پر ترجمان کی ضرورت پڑے گی۔ دوسری طرف مجھے عربوں کی تاریخ سے اچھی خاصی واقفیت تھی اور میں عربی زبان کے کتبوں کو پڑھنے کی مہارت رکھتا تھا اور اوتا کے لیے گائیڈ کے فرائض سرانجام دے سکتا تھا۔

اوتا کی ہمبرگ سے لمبی غیر حاضری کے دوران میں نے اس کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں اس کے ساتھ صرف طالب علمی کا زمانہ ہی بسر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی ہمراہی میں پوری زندگی گزارنی چاہتا ہوں۔ مگر میں اسے یہ بات خط میں لکھنے کی بجائے بالمشافہ کہنا چاہتا تھا۔ پھر کون جانتا ہے کہ وہ خود اس بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کی اٹلی سے واپسی پر میں نے اسے اپنے عندیے سے مطلع کیا، تو اس نے کہا کہ وہ اس بات کی توقع رکھتی تھی اور اسے دل سے قبول کرتی ہے۔ چونکہ ہماری پہلی ملاقات اس کی سالگرہ کے روز ہوئی تھی، اس لیے طے پایا کہ ہم اس برس اس کی سالگرہ کے روز اپنی منگنی کا اعلان ایک سادہ سی تقریب میں کریں گے۔

ابا جی نے اس امر کی اطلاع ملنے پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا، مگر ساتھ ہی لکھا کہ ہمیں منگنی کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھے سبھاؤ شادی کر لینی چاہیے۔ دوسری طرف اوتا کے ماں باپ کا ردِعمل ہمارے خدشات کے عین مطابق منفی تھا۔ اس کے باپ نے میرے بارے میں فارن پولیس سے معلومات مہیا کیے جانے کی درخواست کی اور جرمن حکومت کو اس سلسلے میں ملوث کرنے کی کوشش کی، جس کے سبب مجھے متعلقہ آفس میں یہ تسلی دلانے کے لیے بلایا گیا کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، جس میں جرمن حکومت دخل اندازی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ پھر اوتا کو ایک مقامی وکیل کی طرف سے اس کے باپ کی قایم مقامی میں اس مضمون کا خط ملا کہ وہ اس کے ساتھ ہماری منگنی کے سلسلے میں بات کرنی چاہتا ہے۔ اوتا نے اسے جواب دیا کہ اسے ایک بالغ عورت کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا قانونی طور پر کوئی حق نہیں پہنچتا، اس لیے وہ اس کے ساتھ ملاقات نہیں کرے گی۔ تیس برسوں کے بعد اوتا کو اس وکیل کی طرف سے دوسرا خط ملا، جس میں اس نے لکھا کہ اب جب کہ وہ اپنی وکالت کی پریکٹس کو ختم کر رہا ہے وہ اوتا سے معافی مانگنی چاہتا ہے۔ یہ بات ان سارے برسوں کے دوران اس کو ستاتی رہی ہے کہ اس نے

اوتا کے سراسر ذاتی معاملے میں دخل اندازی کرنا چاہی تھی جو اسے اخلاقی طور پر نہیں کرنی چاہیے تھی۔

۲۸ دسمبر ۱۹۶۵ء کو اوتا کی چھبیسویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر ہم نے ایک دوسرے سے انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا، جو جرمنی میں منگنی کی نشانی کے طور پر بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ساتھ والی انگلی پر پہنی جاتی ہیں۔ شادی ہونے پر وہ بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ اوتا کے ماں باپ نے اس دوران میں اس کو عاق کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات ختم کر دیے تھے۔ یہ صورتِ حال برسوں تک قایم رہی۔ مگر یہ بھی نہیں تھا کہ ہمیں ان کی طرف سے اور ان کو ہمارے بارے میں کوئی خبر نہ ملتی تھی۔ ان کے ساتھ مراسلت بند ہونے پر اوتا کے بہنوئی خوسے نے، جو چلی کے شہر سنتیاگو کا رہنے والا تھا، ہمارے ساتھ رابطہ قایم رکھا۔ پھر اس دوران میں اوتا کا بھائی والٹر جرمنی آ گیا تھا جو ماں باپ کو، جو اس عرصے میں کولمبیا منتقل ہو گئے تھے، اپنے خطوں میں اوتا کی خبریں بھیجتا رہتا تھا۔

مگر والٹر کی قسمت میں لمبی عمر نہ لکھی تھی۔ وہ کار کے ایک حادثے کا شکار ہو گیا، جس کے بارے میں ہمیں آج تک شبہ ہے کہ حادثہ اتفاقی نہ تھا۔ اس کا ایک شام ڈانسنگ پارٹی میں چند نوجوانوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا، جس کے سبب اسے وہاں سے جانا پڑا تھا۔ البتہ اس نے رخصت کے وقت کہا تھا کہ وہ چرچ کے انچارج پادری کے پاس شکایت کرنے جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ پیدل پادری کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ جھگڑنے والے نوجوان بھی ایک کار میں اسی سمت میں روانہ ہو گئے۔ والٹر ان کی کار سے ٹکرایا اور سڑک پر ہی جان بحق ہوا۔ جب ہم والٹر کے جنازے پر شامل ہونے کے لیے اس گاؤں میں گئے اور ہم نے حادثے کی تفصیلات جاننا چاہیں، تو ہمیں پورے گاؤں میں چپ کی ایک دیوار کا سامنا کرنا پڑا۔ تھوڑے عرصے کے بعد مجھے یونیورسٹی میں اپنے ایک شاگرد کے بارے میں پتا چلا کہ اس کی فیملی اسی گاؤں کی رہنے والی ہے البتہ وہ لوگ وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ میں نے اسے اس حادثے کے بارے میں اپنے رشتہ داروں سے استفسار کرنے کو کہا۔ وہ بھی اس بارے میں کوئی سراغ نہ لگا سکا۔ جرمنی میں گاؤں کی مافیا کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی۔

۱۹۶۶ء کی گرما کا سمسٹر اوتا پرتگال کی لزبن (Lisbon) یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے جا رہی تھی جس کے اختتام پر مجھے وہاں پر پہنچنا تھا۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ہم پرتگال اور اسپین کے تاریخی مقامات کی سیاحت اکٹھے کریں گے۔ میں نے یہ سفر "یورپ بس" میں کیا جو جرمنی کے شہر میونسٹر (Münster) اور سپین کے دارالحکومت میڈرڈ (Madrid) کے درمیان چلتی تھی۔ پوری بس ہسپانوی مزدوروں سے ٹھنسی ہوئی تھی، جو جرمنی میں کام کرتے تھے اور اپنی سالانہ تعطیلات وطن میں گزارنے کے لیے جا رہے تھے۔ مسافروں میں مجھ سمیت ایک جرمن لڑکا اور لڑکی غیر ہسپانوی تھے۔ بس میں ہسپانوی

زبان کا راج تھا۔ یوں بھی اکثر ہسپانویوں کو جرمن نہیں آتی تھی اور یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ کئی برسوں سے جرمنی میں رہنے اور کام کرنے کے باوجود ان لوگوں کو اس ملک کی زبان کی الف بے بھی نہ آتی تھی۔ سب سے بہتر زبان ایک نوجوان لڑکے کو آتی تھی، جو اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ لوگ اندلس کے رہنے والے تھے، جو دراصل اسپین کے ایک جنوبی صوبے کا نام ہے۔ لڑکا باپ اور بھائی کو ملنے کے لیے آیا تھا اور اس نے صرف تین ماہ کے قیام کے دوران ٹوٹی پھوٹی جرمن سیکھی تھی۔ وہ دراز قد اور نیلی آنکھوں والا خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اس کا بیٹا جرمن لڑکیوں میں بہت مقبول ہے اور ان کی مدد سے اتنی تھوڑی مدت میں اس نے زبان سیکھ لی ہے۔ بدقسمتی سے لڑکے کو اپنے خوش گلو ہونے کا بھی زعم تھا۔ وہ سارا راستہ گلا پھاڑ پھاڑ کر اندلس کے فوک گیت گاتا رہا اور ساری بس کورس میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

ہم تینوں غیر ہسپانویوں کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ میرے پہلو والی سیٹ پر جرمن لڑکی کرستینا بیٹھی تھی، جو پہلی بار اکیلی جرمنی سے باہر جا رہی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک آرکیٹیکٹ بیورو میں کام کرتی تھی اور جرمنی کے موسم سے سخت نالاں تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر اسپین کا موسم ویسا نکلا، جیسا سب لوگ بیان کرتے ہیں، تو وہ اسی ملک میں رہ جائے گی اور بھول کر بھی جرمنی واپس لوٹنے کا نام نہ لے گی۔ نیلی آنکھوں والے لڑکے نے یہ بات سنی تو جھٹ اسے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دے دی۔ دیکھا دیکھی ہر کوئی اسے اپنے ہاں آنے کو کہنے لگا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کرستینا کو ان دعوتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

جرمن لڑکا کلاؤس میرے برابر دائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ میری طرح یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور گرمیوں کی تعطیلات مراکو میں گزارنے کے لیے جا رہا تھا۔ اسے مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں خصوصی دلچسپی تھی اور اس سے قبل کئی ملکوں کی سیاحت کر چکا تھا۔ بدقسمتی سے اس کا چہرہ مہاسوں کے داغوں سے بری طرح مسخ ہو چکا تھا اور ہر دیکھنے والے کو اس کے چہرے میں ان بدمعاشوں کی جھلک نظر آتی تھی، جن کی تصویریں پولیس چوکیوں پر ٹنگی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر سرحدی چوکی پر ساری بس میں سے اس اکیلے کو کاغذات کی خصوصی تفتیش کے لیے نیچے اتارا جاتا اور اس کا سامان کھول کر دیکھا جاتا تھا۔ اس بات پر وہ بے حد مغموم تھا۔ برسوں بعد ایک اخبار میں یہ خبر میری نظر سے گزری کہ جرمن حکومت کی طرف سے ایک ایسے شخص کو سرٹیفکیٹ جاری کیا گیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ یہ شخص معصوم ہے، اس کے ساتھ پولیس تعرض نہ کرے۔ شاید وہ کلاؤس ہی تھا۔

پہلے چوبیس گھنٹوں کے دوران سوائے مختصر وقفوں کے ہماری بس مسلسل چلتی رہی۔ پھر ایک

رات کے لیے ہمیں ایک ہوٹل میں ڈالا گیا، جہاں پر نیلی آنکھوں والے اندلسی لڑکے کے گانوں اور بھاگ دوڑ نے ذرہ بھر آنکھ نہ لگنے دی۔ اس اودھم بازی کا مقصد کرستینا کا قرب حاصل کرنا تھا، جسے دو ہسپانوی عورتوں کے ساتھ ایک کمرے میں ٹھیرایا گیا تھا۔ آدھی رات کو کرستینا بھاگ کر ہمارے کمرے میں آ کر مدد کی خواستگار ہوئی۔ وہ غصے کے مارے لال بھبھوکا ہو رہی تھی اور اس کا پنڈا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اگلی صبح ہمیں چھ بجے جگا دیا گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر ناشتہ کر کے تیار ہو جانے کو کہا گیا۔ فرانسیسی بیرا بھی ایک ہی مسخرا نکلا، جو ہر کسی کے سامنے کافی کا ایک ایک کپ اور کرواساں رکھتا جاتا تھا۔ یہ تھا کل ناشتہ۔ میں سمجھا کہ یہ مذاق صرف ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے مگر جب میں نے ہوٹل کے دوسرے فرانسیسی مسافروں کی میزوں پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہ کرواساں کو کافی کے کپ میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔ پتا چلا کہ سارا ملک یہی کرتا ہے۔ مگر یہ جان کر بھی ہمارا معدہ نہیں بھرا۔ کرستینا کو کافی کا ایک کپ بھی نصیب نہ ہوا۔ وہ سب سے آخر میں اپنے کمرے سے نکلی۔ شاید اس نے سارا وقت بناؤ سنگھار میں لگا دیا تھا۔ جب وہ ناشتے کے کمرے میں پہنچی تو سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر بس کی طرف جا رہے تھے اور ہمارا ہسپانوی ڈرائیور ٹریفک پولیس کے کسی سپاہی کی طرح ان کو جلد جلد چلنے کے اشارے کر رہا تھا۔ ہوٹل کے دروازے کے ساتھ والی بیکری سے میں جلدی سے بگیٹ روٹی خرید لایا جو پوری ایک گز لمبی ہوتی ہے۔ اس کو آپس میں بانٹ کے ہم تینوں نے ناشتے میں رہ جانے والی کسر نکالی۔

بس سارا دن اور رات بھر کلو میٹر نگلتی رہی۔ رات کے دو بجے کے لگ بھگ، جب کہ سارے مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر اونگھ رہے تھے، بس برگس (Burgus) کے مقام پر جا کر رکی۔ دو چار مسافروں کو وہاں پر اترنا تھا۔ ان کا سامان ہسپانوی ڈرائیور نے نکال کر سڑک کے کنارے رکھا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔ سارا شہر سو رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ سڑکیں ویسی ہی تھیں جیسی اتنی رات گئے کسی بھی مضافاتی قصبے کی ہوا کرتی ہیں۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں مسافر پھر نیند کی راجدھانی میں پہنچ گئے۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب ہماری بس میڈرڈ کے شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ کرستینا نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے مطلع کیا کہ اسکے خوابوں کی منزل آ گئی ہے۔ اس خوشخبری پر اس نے میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔

بس اتوچھا ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی تو پو پھٹ رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نام کو بھی نہ تھا۔ اسٹیشن کے چوک پر ٹریفک کا سپاہی دونوں ہاتھوں سے اخبار کو پھیلا کر پڑھ رہا تھا اور اکا دکا کاریں اس کے اشاروں کا انتظار کیے بغیر گزر رہی تھیں۔ بس کے مسافر رتجگے کے باعث ابا سیاں لیتے ہوئے بس میں

سے اترتے اور اپنے اپنے سامان کو وصول کر رہے تھے، جسے دونوں ڈرائیور بے دردی کے ساتھ سڑک پر پھینک رہے تھے۔ میرا اور کرستینا کا سامان تو مل گیا مگر کلاؤس کا بغچہ، جو اسے راستے میں ہر سرحدی چوکی پر کھول کر دکھانا پڑا تھا، غائب تھا۔ ہسپانوی ڈرائیور کو یاد آیا کہ اس نے برگس میں دوسرے سامان کے ساتھ ایک بغچہ بھی اتارا تھا۔ تو گویا کلاؤس کا بغچہ وہاں پر سڑک کے کنارے پڑا رہ گیا تھا۔

ہم نے ہسپانوی ڈرائیور سے اس بارے میں کہا، مگر شاید اسے ہماری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ زبان نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہسپانوی ہم سفر، جو اب تک ہمیں بے زبان لگ رہے تھے کیونکہ انھیں جرمن نہیں آتی تھی، اس قدر مہارت اور روانی کے ساتھ اب کلاؤس کی وکالت کر رہے تھے جیسے وہ پیدائشی وکیل ہوں۔ ان میں سب سے پیش پیش خوسے تھا، جس کو اسی صبح الیکانتے جانے والی بس لینی تھی مگر اس نے کہا کہ جب تک کلاؤس کے سامان کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا وہ ہمارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ جب بس ڈرائیوروں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی، تو اس نے جا کر اسٹیشن ماسٹر کو بستر پر سے اٹھایا۔ وہ بیچارہ آنکھیں رگڑتا ہوا آیا اور برگس ٹیلی فون کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دو چار کوششوں کے بعد اسے "یورپ بس" کا نمایندہ مل گیا اور یہ خوشخبری بھی مل گئی کہ ایک بغچہ رات کو زاید اتر گیا تھا، جسے صبح سویرے ایک مسافر آ کر دے گیا تھا۔ کلاؤس کی جان میں جان آئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود پہلی بس میں بیٹھ کر اپنا سامان لینے کے لیے برگس جائے گا۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ پرادو (Prado) میوزیم میں گزارا، جس کا شمار دنیا کی بہترین آرٹ گیلریوں میں ہوتا ہے۔ بعد از دوپہر دو گھنٹوں کا وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران گیلری بند رہتی ہے۔ مجھ جیسے بے وطن یہ وقت کسی باغ کے بینچ پر گزارتے ہیں جب کہ ہسپانوی دوپہر کے قیلولے کے لیے اپنے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باغ میں جگہ جگہ کرسیاں خالی پڑی ہیں۔ دوسری طرف گنتی کے چند بنچوں پر لوگ ایک دوسرے کے کندھوں سے کندھے جوڑ کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ایک قریبی بیکری سے کھانے پینے کا سامان لے کر آیا اور سیدھا ایک کرسی پر جا کر براجمان ہو گیا۔ مجھے وہاں پر بیٹھے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک محافظ رسید بک اٹھائے ہوئے مجھ سے فیس لینے آ پہنچا۔ اب مجھ پر یہ بات کھلی کہ بینچوں پر انسان مفت میں بیٹھ سکتا ہے جب کہ کرسیوں پر ٹکٹ لگتا ہے۔ میں کھا پی چکا تو سوچا کہ اب کسی دوسری جگہ پر جا کر بیٹھا جائے۔ میں پھرتا پھراتا ایک تالاب کی طرف نکل گیا جہاں پر ایک سایہ دار بینچ خالی پڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک حسینہ میرے پہلو میں آن بیٹھی اور اس نے جرمن زبان کا قاعدہ کھول لیا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی خوب ٹھیری کہ اتنے دور آ کر بھی جرمن زبان انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پتا چلا کہ وہ فرانس کی رہنے والی ہے اور جرمن زبان کا امتحان

دینے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ تین چار ماہ تک میرے شہر ہمبرگ میں مقیم رہ چکی تھی۔ دن کا باقی ماندہ حصہ اس حسینہ کی معیت میں گزرا، جس کے دوران اس کی جرمن بولنے کی خوب مشق ہوتی رہی۔ وہ میڈرڈ سے خوب واقف تھی اس لیے میری گائیڈ بن گئی۔

شام کے قریب مجھے خیال آیا کہ جماعتِ احمدیہ کے مبلغ کرم الٰہی ظفر سے ملاقات کی جائے جو میڈرڈ میں رہتا تھا۔ مجھے جامعہ کے زمانے میں احمد نگر میں اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، جب وہ شادی کرنے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ وہ مبلغوں کے اس گروپ میں شامل تھا، جس کو ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر لندن بھیجا گیا تھا۔ ان لوگوں کو یورپ کے مختلف ملکوں میں جا کر تبلیغ کے مراکز قایم کرنے تھے۔ کرم الٰہی ظفر کے ساتھ خاص طور پر یہ طے پایا تھا کہ وہ اپنے اخراجات تجارت کا پیشہ اختیار کر کے خود کمائے گا۔ چنانچہ وہ بازار میں چھابڑی لگا کر عطر بیچا کرتا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیض کے اوپر اچکن پہنتا تھا اور سر پر بھاری بھرکم پگڑی باندھتا تھا۔ یہ لباس اس کو بازار میں دوسروں سے ممتاز کرنے کے لیے کافی تھا اور بے شمار لوگ اس کے اسٹینڈ پر جمع ہو جاتے تھے، جن کو وہ عطر کا تحفہ پیش کرتا اور پڑھے لکھے لوگوں کو اسلام کے بارے میں لٹریچر دیتا تھا۔ خود حاکمِ وقت جنرل فرانکو بھی اس کے اسٹینڈ پر آ چکا تھا۔ آئے دن اس کی تصویریں ملک کے اخباروں میں چھپتی تھیں، مگر ملک میں اسلام کی تبلیغ کی کھلے بندوں اجازت نہیں تھی۔ میں نے اس کے گھر کا اتا پتا لگانا چاہا تو پتا چلا کہ وہ اتوچھا ریلوے اسٹیشن کے پہلو میں پائی جانے والی گلی میں رہتا ہے اور یہ جگہ وہاں سے بہت قریب تھی جہاں پر میں کھڑا تھا۔ میں اس کے گھر پر گیا تو وہ اتفاق سے تھوڑی دیر پہلے گھر لوٹ آیا تھا کیونکہ اس روز اس کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ بیٹے کو دواخانے سے اپنے لیے دوائی لانے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا مگر اس کی جیب خالی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تمھارے پاس بیس ڈالر مجھے دینے کے لیے ضرور موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کا طلب کا خاص انداز تھا کیونکہ جب میں دوسری بار ۱۹۸۵ء میں اس کے گھر پر ملنے کے لیے گیا تو پلمبر مکان کا ہیٹنگ سسٹم ٹھیک کرنے کے بعد مزدوری کی وصول یابی کے انتظار میں دروازے پر کھڑا تھا۔ ظفر صاحب نے مجھے سیڑھیوں پر سے اوپر آتے ہوئے دیکھا تو سلام کرنے سے بھی پہلے کہا: تمھاری جیب میں ضرور تیس ڈالر ہوں گے جو مجھے پلمبر کو دینے کے لیے درکار ہیں۔

رات کی گاڑی سے میں لزبن کے لیے روانہ ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بعد اوتا کا سمسٹر ختم ہو رہا تھا اس لیے مجھے پورا ہفتہ لزبن کی سیر و سیاحت کے لیے مل گیا، مگر میں یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ اس شہر میں عربوں کے زمانے کی یادگاریں موجود نہ تھیں، کیونکہ یہ شہر اس وقت محض چھوٹا سا قصبہ تھا۔ قریب ترین مقام، جہاں پر عربوں کے آثار دیکھے جا سکتے تھے، وہ سنترا (Cintra) تھا، جہاں پر عربوں کے قلعے کے

کھنڈرات پائے جاتے ہیں جو آٹھویں اورنویں صدی میں اس علاقے میں ان کا مضبوط ترین دفاعی مقام تھا۔ یہ قلعہ چودہ سوفٹ کی بلندی پر پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا، جہاں سے انسان وادی میں دور دور تک دیکھ سکتا ہے۔ چونکہ قلعے کے اندر معدنی چشمہ پایا جاتا تھا اس لیے محاصرہ ہونے کی صورت میں لمبے عرصے تک اس کا دفاع کیا جا سکتا تھا۔ قلعے کی دیواریں کھڑی ہیں مگر عمارتیں معدوم ہو چکی ہیں۔ صرف ایک مستطیل عمارت بیرونی گیٹ کے قریب موجود تھی، جس کو ہم نے جا کر دیکھا تو دیواروں پر عربی رسم الخط میں عبارتیں نظر آئیں، جو جگہ جگہ سے مٹ چکی تھیں، اس لیے کسی مقام پر بھی پورے حروف پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ اس کمرے کے اندر ہمیں ایک محراب نما دکھائی دیا جس کا رخ کعبے کی طرف تھا جو وہاں سے مشرق میں پایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ قلعے کی مسجد رہی ہوگی۔ جب ہم دوسری بار اٹھارہ برسوں کے بعد اس کو دیکھنے کے لیے گئے تو عربی عبارتیں معدوم ہو چکی تھیں۔

اوتا کی پرتگالی سہیلی ماریا اورا (Maria-Aura)، جس نے آگے چل کر پرتگال میں انقلاب برپا کرنے والے سات فوجی افسروں میں سے ایک کے ساتھ شادی کی، یونیورسٹی کی تعطیلات میں اپنے گاؤں ارمساؤں دے پیرا (Armacao de Pera) جا رہی تھی، جو Algarve میں سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ اس نے ہمیں وہاں پر آنے کی دعوت دی۔ عربوں کی حکومت اس علاقے میں، جس کو وہ آج بھی الغرب کے نام سے یاد کرتے تھے، چار سو سال تک قایم رہی تھی۔ ان کا دارالحکومت سلوش (Silves) تھا جو دو دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے اور جس کو "شاعروں کا شہر" کہتے تھے۔ عربوں کے قلعے کے آثار موجود ہیں اور ایک ساٹھ میٹر گہرا پانی کا حوض، جو اب تک استعمال کیا جاتا ہے۔ مسجد کی بنیادوں پر چرچ تعمیر کیا گیا تھا۔ عربوں کے وقتوں کی اکثر عمارتیں ۱۷۵۵ء میں آنے والے زلزلے کے سبب تباہ ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ ارمساؤں دے پیرا سے زیادہ دور نہ تھی۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کی اور جب وہاں جانے کے لیے ریل گاڑی کا ٹکٹ لینے گئے، تو مجھے نقشے میں ایک مقام Alvito نظر آیا، جو ہمارے راستے میں پڑتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دراصل البیت (مسجد) کی بگڑی ہوئی صورت ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہاں پر کوئی اہم مسجد پائی جاتی ہو۔ ہم نے اس مقام پر دو تین گھنٹوں کے لیے گاڑی سے اترنے کا ارادہ کیا جس کے بعد ہم قریبی شہر بیجا (Beja) چلے جائیں گے، جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہاں پر عربوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد ہم رات کی گاڑی سے اپنے سفر کو جاری رکھیں گے۔

الویتو کا اسٹیشن آیا تو اس کی ویرانی کو دیکھتے ہوئے اوتا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس علاقے میں کبھی آبادی رہی ہوگی۔ چونکہ میں وہاں پر اترنے پر مصر تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ اسے گاڑی سے اترنا

پڑا۔ اسٹیشن ماسٹر ایک کچی کوٹھڑی میں بیٹھا تھا اور آس پاس کسی قصبے کا نام ونشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ قصبہ وہاں سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتفاق سے ایک گدھا گاڑی اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی، جو کسی کی بلٹی لینے کے لیے آئی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کی فرمائش پر گدھا گاڑی والا ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گیا، مگر اس نے خاصی رقم بطور کرایہ مانگی۔ ہم نے اس کی شرط منظور کر لی اور گدھا گاڑی پر سوار ہو گئے۔ اس نے بطورِ خاص اپنی چھتری کھول کر ہمارے سروں پر لگا دی تاکہ دھوپ سے تھوڑا بچاؤ ہو جائے۔ اس نے کہا کہ عربوں کے زمانے کی کسی عمارت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ قصبے میں ایک ریستوراں پایا جاتا ہے جہاں پر ہم دوپہر کا کھانا کھا سکیں گے۔ اس نے ہمیں دو گھنٹوں کے قیام کے بعد واپس اسٹیشن پر پہنچانے کی ذمے داری اٹھائی اور کہا کہ وہ جانے آنے کا ایک جتنا کرایہ لے گا۔ اس نے ہمیں ریستوراں کے سامنے اتارا، جس کا نام بجائے خود ہمیں عربی سے ماخوذ لگا۔ اس پر یہ نام لکھا تھا: ابن ارقیق ریکس (Ibn Erkik Rex)۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ مسجد کے بارے میں ہمیں چرچ میں جا کر پوچھنا چاہیے۔ کھانا ہمیں ایک گھنٹے میں پیش کیا جائے گا، اس دوران میں ہم پادری سے جا کر مل لیں۔ پادری نے بتایا کہ ایک پرانی تاریخی عمارت وہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر پائی جاتی ہے اور چرچ کے مینار پر سے دیکھی جا سکتی ہے مگر اس طرف کوئی سڑک نہیں جاتی۔ ہم مینار پر چڑھنے والے تھے کہ گدھا گاڑی والا ہمیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آن نکلا۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں اسٹیشن تک صرف اس صورت میں پہنچانے کے لیے آئے گا اگر ہم اسے چھ گنا رقم ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اس کی سودے بازی پر بہت غصہ آیا اور میں نے اسے جواب دے دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی متبادل انتظام ہو جائے گا۔ چرچ کے مینار پر سے ایک عمارت تو نظر آتی تھی مگر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ فی الواقعہ مسجد تھی۔ ہمارے پاس اب وہاں تک جا کر لوٹنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ ہمیں اگلی گاڑی لینی تھی جو ڈیڑھ گھنٹے میں الویتو سے روانہ ہونی تھی۔ ریستوراں کی مالکہ نے اپنے بیٹے کو بلوا بھیجا جو ہمیں اپنی گھوڑا گاڑی میں اسٹیشن تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب ہم بروقت وہاں پر پہنچ گئے تو اس نے اس سروس کے لیے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا کہ اگلی گاڑی، جس میں ہمیں سوار ہونا تھا، دراصل مال گاڑی ہے۔ اس میں ایک بوگی مسافروں کے لیے لگا دی جاتی ہے۔ عام طور سے یہ گاڑی الویتو کے اسٹیشن پر نہیں رکتی صرف اس کی رفتار کم کر دی جاتی ہے اور مسافر سرکتی ہوئی گاڑی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس دو سوٹ کیس ہیں اور پھر اوتا کو چلتی گاڑی پر چڑھنے میں دقت ہو گی۔ اس نے کہا اس کا انتظام کر لیا جائے گا۔ گاڑی شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ مسافروں کی بوگی عین درمیان میں تھی۔ اس گاڑی میں

مزدور دیہاڑی ختم کرنے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ ان میں سے چار نوجوان ہماری خاطر چلتی ہوئی گاڑی میں سے اتر گئے۔ دو نے ہمارے سوٹ کیس تھام لیے اور دو ہمیں گاڑی میں چڑھانے میں مددگار بنے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم کیسے الویتو جیسے گاؤں میں آن نکلے تھے۔ اگر ہمیں تاریخی آثار دیکھنے کا شوق ہے تو پھر ہمیں بیجا (Beja) میں اترنا چاہیے۔ ایک نوجوان نے، جو بیجا کا رہنے والا تھا، ہمیں اپنا شہر دکھانے کی پیشکش کی۔ جب ہم نے بتایا کہ ہمیں عربوں کے آثار دیکھنے کا شوق ہے تو اس نے کہا کہ اس بارے میں اس کی معلومات بہت تھوڑی ہیں مگر آثارِ قدیمہ کے میوزیم کا ڈائریکٹر ضرور ہماری رہنمائی کر سکے گا۔

میوزیم میں عربوں کے زمانے کی کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہ تھی۔ ڈائریکٹر نے بتایا کہ اس شہر کا گرجا گھر عربوں کی جامع مسجد میں تبدیلی کر کے بنایا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ عمارت کا پچھلا حصہ جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ بیجا میں ایک مکان کی چمنی عربوں کے وقت کی بنی ہوئی ہے اور ایک شراب خانے کی عمارت اس زمانے کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ ایک عمارت ایسی بھی پائی جاتی ہے جس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ مسجد رہی ہوگی۔ وہ یہ آثار دکھانے کے لیے خود ہمارے ساتھ گیا۔ چمنی والے مکان کے باسیوں نے ہمیں خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ مکان میں ردوبدل ضرور ہوتی رہی ہے مگر چمنی والا کمرہ بدستور عربوں کے وقتوں سے اپنی اصلی ہیئت میں چلا آ رہا ہے۔ شراب خانے میں ہمیں عربوں کے زمانے کا حصہ دکھایا گیا، جس میں وہ لوگ شراب کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ میں نے پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا کہ وہ عمارت کسی زمانے میں مسجد رہی ہوگی جس کی محراب اپنی اصلی حالت میں موجود تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ہمیں اس عمارت کو دیکھ کر ہوئی، جو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر اکیلی دکیلی کھڑی تھی۔ میوزیم کا ڈائرکٹر وہاں تک ہمارے ساتھ نہ آیا تھا اس لیے ہم عمارت کو اندر سے نہ دیکھ سکتے تھے مگر اس کا نقشہ ہو بہو کسی مسجد والا تھا۔ یہ جگہ شہر کی فصیل سے باہر تھی اس لیے اس کی حفاظت کی خاطر اس کو قلعے کی صورت دے دی گئی تھی۔

ہمیں شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے شام ہوگئی تھی۔ سارا وقت گاڑی والا دوست ہمارے ساتھ رہا تھا۔ وہ ہمیں شام کے کھانے کے لیے ایک ریستوراں میں چھوڑ گیا اور ہمارے اصرار کے باوجود ہمارے ساتھ کھانا کھانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی کھانا پکا کر گھر پر اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ جب ہم ریستوراں سے سیر ہو کر نکلے تو ہماری گاڑی کے آنے میں ابھی چار گھنٹے پڑے تھے۔ ایک اشتہار کی بنا پر ہم بھی دوسروں کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے چلے گئے، جو مکانوں کے بیچوں بیچ ایک اوپن ایر سینما میں دکھائی جا رہی تھی۔ فلم آدھی رات تک چلتی رہی۔ جب ہم نے ریلوے اسٹیشن کا راستہ

جاننا چاہا تو ایک صاحب ہمیں اپنی کار میں لفٹ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ میرے دل میں اس شہر کے باسیوں کے لیے دوستی کے جذبات آج بھی موجزن ہیں۔

اگلی صبح ہم ارمساؤں دے پیرا میں پہنچے تو اوریتا نے ہمیں اپنی پھوپھی کے مکان پر ٹھیرایا جو خالی پڑا تھا۔ خود اس کا قیام اپنے نانا کے ہاں تھا، جو پیشے کے اعتبار سے مچھیرا تھا مگر ایک عرصے سے اس نے مچھلیاں پکڑنے کے دھندے کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس کا مکان بے حد مختصر تھا مگر ہر چیز صاف ستھری تھی۔ جب ہم اگلی بار اٹھارہ برسوں کے بعد اس گاؤں میں آئے تو ہمیں اس مکان کی جگہ پر ایک تین منزلہ عمارت کھڑی نظر آئی اور وہ مکان، جس میں ہمیں ٹھیرایا گیا تھا، ایک ماڈرن بنگلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر یہ بعد کی باتیں ہیں، جب مچھیروں کا گاؤں ایک ماڈرن ٹورسٹ ٹاؤن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہماری پہلی آمد کے وقت وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں ابھی ایک بار بھی نہیں کھلی تھی۔ ساحل کے کنارے پر دو تین کھوکھے رکھے ہوئے تھے، جہاں سے کوکا کولا، چاکولیٹ اور دوسری چھوٹی موٹی کھانے پینے کی اشیاء خریدی جاسکتی تھیں۔ میلوں تک پھیلا ہوا ساحل خالی پڑا تھا۔ بندرگاہ میں مچھیروں کی دو چار کشتیاں کھڑی تھیں اور بس۔ سمندر کی لہروں کے مدوجزر کے سوا کسی قسم کا شور شرابا سننے میں نہیں آتا تھا۔ اس گاؤں میں انسان صرف سمندر میں پیراکی کر سکتا تھا، جس کے لیے ہم دو تین دن سے زیادہ وقت نہ نکال سکتے تھے۔ اسپین میں عربوں کے آثار ہمیں اپنی طرف بلا رہے تھے۔

القنطریہ (Alcantarilha) سے ریل گاڑی ہمیں فارو (Faro) لے آئی، جہاں پر مرکزی کتھیڈرل عربوں کی جامع مسجد میں ردو بدل کر کے تعمیر کیا گیا تھا، جیسا کہ اکثر مقامات کے چرچوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ عربوں نے ۱۲۴۹ء تک چار سو سال وہاں پر حکومت کی مگر ملک کے باسیوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا۔ اس صلح کل پالیسی کے نتیجے میں جب ان کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو اسلام کے نام لیوا اس ملک میں اقلیت میں تھے، ان کو ہجرت کرنا پڑی یا عیسائیت قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔

پرتگال کے ایک چرچ کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک قبر ہم نے دیکھی، جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس میں مدفون عورت عرب خاندان سے تھی، ایک پرتگالی بادشاہ کے ساتھ بیاہی گئی تھی مگر آخر تک مسلمان رہی تھی۔ اس کے شوہر کو چرچ کے اندر دفن کیا گیا تھا اور اس کی قبر کو بیوی کی قبر کے برابر چرچ کے اندر بنایا گیا تھا۔ اگر دونوں کے درمیان حایل دیوار کو نکال دیا جائے تو دونوں قبریں پہلو بہ پہلو بنی ہوئی ہیں۔ پھر ایک عرب امیر کی کہانی سنی، جس نے ایک عیسائی شہزادی سے شادی کی تھی، جو شمالی پرتگال کی رہنے والی تھی، جہاں پر سردیوں میں برف باری ہوتی ہے، جب کہ جنوبی پرتگال میں برف نہیں

گرتی۔ اس کے عرب خاوند نے پوری وادی میں بادام کے پودے لگوا دیے، جن پر لگنے والے پھول موسم بہار میں پوری وادی کو برف کی طرح سفید رنگ سے ڈھک دیتے تھے۔ شمالی پرتگال کے کوئمبرا کے ایک شہزادے کی محبت کی داستان بھی سنائے جانے کے قابل ہے۔ اس کو ایک لڑکی سے محبت تھی، جس کے ساتھ اس کے باپ نے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کو قتل کروا دیا۔ شہزادے نے تخت نشینی کے بعد اپنی محبوبہ کی لاش کو قبر سے نکلوا کر اپنے برابر تختِ شاہی پر بٹھایا اور درباریوں کو حکم دیا کہ ملکہ کے سامنے کورنش بجالائیں اور اس کے ہاتھ کو چومیں۔ آج اس ملکہ کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔

ولاریال دوسانتو انتونیو (Vila Real de Santo Antonio) پرتگال کا سرحدی شہر ہے۔ ریل گاڑی وہاں پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ مسافروں کو دریائے گوادیانا (Guadiana) کے پل کو پیدل چل کر پار کرنا پڑتا تھا، جس کے دوسری طرف ہسپانوی شہر آیامونتے (Ayamonte) آباد ہے۔ وہاں پر ہسپانوی گاڑی تیار کھڑی تھی، جس کی ساری بوگیاں چوتھے درجے کی تھیں اور کسی پرانی ٹرام کی طرح ہر طرف سے کھلی تھیں، جب کہ ہم نے چار ہزار کلو میٹر کی مسافت کے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خرید رکھے تھے۔ آیندہ چار ہفتوں تک سارے اسپین کے سفر کے دوران ہمیں ایک بار بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ اکثر و بیشتر تھرڈ کلاس پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

اندلس کا مشہورِ عالم شہر سویا (Sevilla) وہاں سے اندازاً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ عربوں کے زمانے میں اس کی گلیوں میں راتوں کو روشنی کا انتظام تھا اور اس کی آبادی یورپ کے کسی بھی شہر سے زیادہ تھی۔ السکوندی نے لکھا تھا کہ اگر کوئی شخص اس شہر میں پرندوں کا دودھ حاصل کرنا چاہتا تو اس کی خواہش پوری کی جا سکتی تھی۔ جامع مسجد کا مینار، جس کی بلندی ۹۸ میٹر ہے، آج تک کھڑا ہے البتہ اب وہ عیسائی چرچ کا حصہ ہے۔ اس کے اندر سیڑھیاں نہیں ہیں بلکہ ایک سلوپ کی صورت میں اوپر کو اٹھتی ہوئی گلی بنی ہوئی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر گھوڑا چڑھ سکتا ہے۔ انسان اس پر بغیر کسی قسم کی تھکاوٹ محسوس کرنے کے چلتا ہے۔ نیچے سے اوپر تک بجلی کی روشنی کی ضرورت نہیں پڑتی، کیونکہ جگہ جگہ پر کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں اور باہر کی طرف دیکھنے کے لیے پلیٹ فارم بنائے گئے ہیں، جس کے سبب ہوا اور روشنی اندر باہر ایک جیسی پھیلی ہوتی ہے۔ مینار کا بالائی حصہ بعد میں بنایا گیا جس پر ایک مجسمہ لگا ہوا ہے، جو دراصل بادنما ہے، جس کو ہسپانوی میں خیرالدا (Giralda) کہتے ہیں۔ اس کی رعایت سے مینار کا یہی نام پڑ گیا۔ ہمیں پتا تھا کہ اس کے علاوہ بھی وہاں پر عربوں کے بہت سے آثار پائے جاتے تھے، اس لیے ہم نے پورا ہفتہ وہاں پر گزارنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

شام کے وقت ہم فلامنکو ڈانس دیکھنے کے لیے گئے، جس کے دو دو گھنٹے کے شو ہوتے ہیں۔ گانے

والی کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔اس کی شکل وصورت اور جسم کی بناوٹ بہت دلکش تھی اوراس کی آواز میں غضب کا لوچ تھا۔عام طور سے ہسپانوی ناچنے والوں کے چہروں پر بہت تناؤ ہوتا ہے، جس کا سبب دراصل یہ ہے کہ ان کو بے حد کنسنٹریشن کرنی پڑتی ہے، بالخصوص مردوں کو جسم اکڑانا پڑتا ہے۔عورتوں کے چہرے پر بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں، مگر اس روز ناچنے والی کے چہرے پر ایک سکون تھا اور ایک موہنی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو بہت اچھی لگ رہی تھی۔اس ڈانس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جپسی (Gypsy)، ہمارے ہاں کے ڈوم، اس کو ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے اور یہ کہ اس کے ڈانڈے کتھک ڈانس کی روایت سے جا ملتے ہیں۔ایک نئی بات کا ہمیں وہاں پر علم ہوا کہ سویا (اشبیلیہ) کا تلفظ مقامی طور پر سویجا ہے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ قرطبہ (Cordoba) تھا، جہاں پر مشہور عالم مسجد ہے، جس کی بنیاد اموی خلیفہ عبدالرحمٰن اوّل نے آٹھویں صدی کے وسط میں رکھی تھی، مگر جس کی تکمیل وتوسیع میں دو صدیاں لگ گئی تھیں۔اس سے پہلے یہاں پر وسگوتھک (Wisgothic) چرچ کھڑا تھا جس کی بعض دیواریں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔اس سے بھی پہلے اسی جگہ پر رومن مندر پایا جاتا تھا، جس کی بنیادوں پر بعد کی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔عربوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد مسجد کے عین بیچوں بیچ ایک عیسائی چرچ بنا دیا گیا تھا۔مسجد کا صرف قدیمی حصہ باقی ہے، جس میں دنیا کی خوبصورت ترین محراب شامل ہے۔ایک ہزار ایک ستون یوں ایستادہ ہیں جیسے پریاں اپنے پر پھیلائے ہوئے ایک پاؤں پر کھڑی ہوں۔اب یہ عمارت ایک میوزم ہے البتہ مقامی عیسائی خاموشی کے ساتھ ایک طرف عبادت کرتے ہیں صرف مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنے کی جگہ معین نہیں۔دراصل وہاں پر نماز پڑھنے کی ممانعت ہے مگر میں نے ایک کونے میں دو نفل پڑھے۔علامہ اقبال شاید اپنے ساتھ جائے نماز لے کر گئے تھے، مجھے ایک صاف ستھرا اخبار بچھانا پڑا۔جب میں دوسری بار ۱۹۸۵ء میں وہاں پر گیا تو میں نے عین محراب کے سامنے نفل ادا کیے تھے اور مسجد تعمیر کرنے والوں کے حق میں دعا کی تھی۔میری توقع کے برعکس مجھے کسی نے روکا ٹوکا نہیں۔مسجد کی تاریخ کا علم کتبوں سے ہوتا ہے، جن میں سے ایک مسقّف حصے میں جانے والے گیٹ کے پہلو میں لگا ہوا ہے۔دوسرے چرچ کے اندر کی دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔یہی قدیم ترین عربی حصہ ہے اور اپنے نقش ونگار کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے۔مسجد کا اپنا مینار شاید گر گیا تھا۔اب جو مینار کھڑا ہے وہ بعد میں عیسائیوں نے تعمیر کیا تھا۔البتہ مسجد کے صحن میں لگے ہوئے سنگتروں کے باغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عربوں کے وقتوں سے چلا آتا ہے۔

قدیمی شہر کی تنگ گلیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں پر یہودیوں کی آبادی تھی۔مکانوں

کے صحن میں نظر ڈالی جائے تو رنگ برنگے پھولوں اور پھل دار درختوں کے سبب ایک سماں بندھا ہوا ملتا ہے۔ان مکانوں کے باسی کھلے دل سے ٹورسٹوں کو اپنے صحن میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔اوتا کی زبان دانی کے صدقے ہمیں بہت سے گھروں میں داخلہ ملا جہاں پر ہماری مہمانداری کی گئی۔ایک گلی میں ہمیں یہودی فلاسفر میمونیدس (Maimonides) کی یادگار دیکھ کر خوشی ہوئی جو ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا ہے۔کسی عرب فلاسفر یا شاعر کی ایسی یادگار اس زمانے میں موجود نہ تھی۔

قرطبہ سے باہر کچھ فاصلے پر مدینۃ الزہراء کے کھنڈرات کھڑے ہیں، جہاں پر ٹورسٹ کم ہی پہنچ پاتے ہیں۔میں نے تاریخ میں اس کی تعریفیں پڑھ رکھی تھیں، اس لیے وہاں پر جانے کے لیے بے تاب تھا۔ایک ٹیکسی ہمیں وہاں لے گئی۔محلات کا یہ شہر، جس کا رقبہ ایک ڈیڑھ مربع کلومیٹر سے زیادہ نہ تھا، ایک پہاڑی کے پہلو میں آباد تھا۔پانی ایک پہاڑی چشمے سے آتا تھا۔مرکزی محل کے صرف تین ہال کھڑے تھے البتہ ہر قسم کے نقش ونگار سے عاری تھے، جن کے ہزاروں ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔صرف ایک آدمی ان کو ترتیب دینے میں لگا ہوا تھا۔مجھے یقین تھا کہ وہ بیس برس میں بھی یہ کام مکمل نہ کر پائے گا۔محل کے پہلو میں واقع مسجد کی بنیادیں اور ایک پانی سے خالی تالاب دیکھے جا سکتے تھے۔مدینۃ الزہراء کی تباہی الموحدون کے ہاتھوں انجام پائی تھی، جو اسکو عیش وتفریح کا مقام قرار دیتے تھے، جس کی گنجایش ان کے سخت گیر اسلام میں نہیں پائی جاتی تھی۔ ہمارے لیے وارڈن نے خاص طور پر دروازہ کھولا اور ہمارے ساتھ ساتھ گھومتا پھرا، مگر اس کا علم اس قدر محدود تھا کہ وہ ہمارے کسی سوال کا جواب نہ دے پایا۔پھر جب ہم رخصت ہونے لگے تو اسے ہماری پیش کردہ ٹپ کی رقم بہت تھوڑی لگی۔اب اسے کون بتاتا کہ ہم عرب شیخ نہیں غریب طالب علم ہیں۔

اب ہمارا رخ غرناطہ (Granada) کی طرف تھا، جو سپین کی سیاحت کا سب سے اہم مقام ہے۔ہم سویرے سویرے الحمراء کے گیٹ پر پہنچ گئے، جہاں پر ہم سارا دن بسر کرنا چاہتے تھے۔یہ جگہ فی الواقع جنتِ ارضی ہے۔مجھے اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں علم نہیں تھا اور سمجھتا تھا کہ شاید اس کو سرخ پتھروں کے سبب یہ نام دیا گیا ہے، جو اس کی تعمیر میں استعمال ہوے ہیں۔پتا چلا کہ اس کے تعمیر کرنے والے نظاری بادشاہ کا نام الحمر تھا، جس نے ۱۲۳۸ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔مگر اس کی موجودہ عمارتوں کے بنانے والے یوسف اوّل اور اس کا بیٹا محمد پنجم تھے۔اس محل کے ایوانوں میں کیے گئے نقش ونگار اپنی نظیر نہیں رکھتے۔جگہ جگہ عربی اشعار منقش ہیں۔مشہور ترین سلوگن، جو وہاں پر جگہ جگہ لکھا ہوا ملتا ہے: **ولا غالب الا اللہ** ہے۔اس کے علاوہ بیشمار دوسرے نعرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں، مثلاً: **الحمد للہ علیٰ نعمۃ الاسلام ۔ اللہ خیر حفظاً و هو ارحم الراحمین۔و ما بہ من نعمۃ فمن اللہ ۔**

الـعـزۃ لـلّٰـہ ۔ہم نے یہی ایک دن وہاں پر نہیں گزارا، بلکہ دوسرے اور تیسرے روز بھی اس محل کے ایوانوں اور باغات میں گھومتے پھرے۔ ہمارا دل تھا کہ سیر ہی نہ ہوتا تھا۔اس شہر میں ایک مدرسے کی عمارت بھی پائی جاتی ہے اور ایک کارواں سرائے کے کھنڈرات بھی موجود ہیں۔البتہ الـقیـصریہ نام کی مشہور مارکیٹ عربوں کے وقتوں کی نہیں ہے کیونکہ وہ دوسوسال قبل جل کر تباہ ہوگئی تھی۔اس کی جگہ پر نئی مارکیٹ بنا کر اس کو سابقہ نام دے دیا گیا تھا۔

عربوں کے آثار دیکھنے کے بعد ہم نے ماڈرن سپین کی روایات سے تعارف پیدا کرنے کی خاطر بل فائٹ (Bull Fight) دیکھنے کا ارادہ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس روز پنڈال میں سارا شہر امڈ آیا تھا۔ہم نے ہمنگ وے (Hemmingway) کی کتابوں میں بل فائٹنگ کا احوال پڑھا تھا اور اس سے متعلق فلمیں بھی دیکھ رکھی تھیں،مگر اس روز جو کچھ دیکھنے میں آیا اس کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔سب سے پہلے بل فائٹر اپنا مخصوص لباس پہنے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئے۔اپنی ٹوپیاں اتار کر حاضرین اور بالخصوص مہمانِ خصوصی کو سلام کیا۔ پھر اجازت پا کر بیلوں کو پنڈال میں لایا گیا تا کہ تماشائی دیکھ لیں کہ ان کا مقابلہ کیسے وحشی بیلوں سے ہوگا۔ پورے پنڈال میں ایک لکڑی کی دیوار بنی ہوئی تھی، جس میں جگہ جگہ پر دروازے تھے مگر بہت تنگ اور اس طرح بنے ہوئے تھے کہ بیل اس میں داخل نہ ہوسکیں۔ وہاں سے بل فائٹروں کے مددگار پنڈال میں داخل ہوتے اور بیلوں کو اکساتے ہوئے بھاگ کر کسی دروازے میں غائب ہو جاتے تھے۔ پھر دو گھڑ سوار داخل ہوئے،جن کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ چونکہ بیل ان کے گھوڑوں پر حملہ آور ہوتے تھے اس لیے گھوڑوں کے پیٹوں کے گرد حفاظتی لحاف سے لٹک رہے تھے،وگرنہ خطرہ ہوتا ہے کہ بیل اپنے سینگوں سے گھوڑوں کے پیٹ کو چھید ڈالیں گے۔گھڑ سوار بیلوں کے گرد اپنے گھوڑوں کو دائرے میں دوڑاتے تھے اور جونہی انھیں موقع ملتا تھا بیلوں کی پیٹھ میں اپنی برچھیاں گاڑ دیتے تھے۔اس کے نتیجے میں بیل اور بھی زیادہ جوش سے حملہ آور ہوتے تھے۔دوسری طرف اس طریق سے بیلوں کی طاقت کو کم کرنا اور ان کو تھکانا ہوتا ہے۔تب کہیں جا کر بل فائٹر اپنا سرخ کپڑا لیے ہوئے،جس کے اندر تلوار چھپی ہوتی ہے، پنڈال میں داخل ہوتا ہے۔بیل اس پر حملہ آور ہوتے ہیں اور وہ اس کی توجہ سرخ کپڑے کی طرف مبذول کر دیتا ہے،جس کو وہ بیل کے سامنے رکھتا ہے۔ جونہی بیل اس میں اپنے سینگ گاڑنے کی خاطر حملہ آور ہوتا ہے بل فائٹر ایک طرف ہو جاتا ہے اور سرخ کپڑے کو بھی بچا کر نکال لیتا ہے۔اب بیل گھوم کر دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے اور اس کے ساتھ پھر وہی ناٹک کھیلا جاتا ہے، یہاں تک کہ بیل تھک جاتا ہے،اب بل فائٹر مہمانِ خصوصی سے اجازت لے کر اپنی تلوار تان کر بیل کے سامنے آ جاتا ہے۔جب بیل اس پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اپنی تلوار

کواس طرح اس کے بدن میں گاڑ دیتا ہے کہ وہ اس کے دل تک پہنچ کر بیل کو مار ڈالتی ہے۔ جب بیل مر کر گرتا ہے تو بل فائٹر اس کا کان کاٹ کر مہمانِ خصوصی کو پیش کرتا ہے۔اس روز پانچ بیل مارے گئے مگر یہ بھی ہوا کہ ایک بل فائٹر کو بیل نے اپنے سینگوں پر اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔تین بار بل فائٹر کی تلوار بیل کے دل میں نہ اتری اور اس کو دوسری اور تیسری بار یہ عمل دوہرانا پڑا۔ مجھے یہ سارا کھیل بے حد وحشیانہ لگا۔اوتا نے بتایا کہ جنوبی امریکہ میں بیلوں کو نہیں مارتے، بلکہ زندہ رہنے دیتے ہیں۔

ہماری چھٹیاں اختتام کو پہنچ رہی تھیں مگر ہم طلیطلہ (Toledo) کو دیکھے بغیر واپس نہ جا سکتے تھے۔ یہ شہر میڈرڈ سے، جہاں سے ہمیں واپسی کے لیے بس لینی تھی، ستر کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ہم نے اسپین میں اپنے قیام کا آخری دن طلیطلہ کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ یہ شہر علم و ہنر کا شہر ہے۔عرب علوم کی کتابوں کے تراجم اسی شہر میں کرائے گئے تھے۔عربوں نے وہاں پر بے شمار آثار چھوڑے ہیں، بالخصوص دونوں مسجدیں شاہکار ہیں۔ چھوٹی مسجد کی مینا کاری اینٹوں کے ذریعے کی گئی تھی، یہاں تک کہ عربی عبارتیں بھی اینٹوں سے لکھی گئی ہیں۔

اس سے اگلے روز ہم بس میں بیٹھے ہوئے جرمنی کی سمت میں جا رہے تھے، جہاں پر میرا مقالہ لکھے جانے کا انتظار کر رہا تھا اور اوتا کو نئے سمسٹر میں ہونے والے لاطینی زبان کے امتحان (Latinikum) کی تیاری کرنی تھی، جس کو پاس کیے بغیر وہ ڈاکٹریٹ نہیں کر سکتی تھی۔

شادی خانہ آبادی

جب ہم نے شادی کرنے کی ٹھانی اور اسٹوڈنٹ ہوسٹل کو خیر باد کہنے کا ارادہ باندھا اور شہر میں فلیٹ تلاش کرنے لگے، تو ہمیں بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔اس زمانے میں ہمبرگ میں فلیٹ اتنی آسانی سے نہ ملتے تھے جتنے آج کل۔ اکثر و بیشتر ایک ایک فلیٹ میں دو اور تین فیملیاں رہائش پذیر تھیں۔ہمیں اکثر جگہوں پر محض اس وجہ سے جواب دے دیا جاتا تھا کہ ہم یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور لگی بندھی آمدنی نہیں رکھتے تھے۔ مالکانِ مکان کو شاید یہ خطرہ تھا کہ ہم کرایہ باقاعدگی سے ادا نہ کر سکیں گے۔اوتا کا خیال تھا کہ شاید اس میں اس بات کا بھی ہاتھ ہو کہ ہم دونوں غیر ملکی تھے۔

اوتا کی سہیلی کارین کو پتا چلا تھا کہ ایوون، جو اسکول کے زمانے میں اس کی ہم جماعت رہ چکی تھی، اپنا پرانا فلیٹ چھوڑ کر ایک نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس کی سفارش پر ایوون نے ہمیں اپنا

فلیٹ دلوانے کی ہامی بھری اور ہمیں اتوار کے روز فلیٹ دیکھنے کے لیے آنے کو کہا، جب اس کا خاوند گونتھر گھر پر موجود ہوگا۔ وہ میڈیکل ڈاکٹر تھا اور امتحان پاس کرنے کے بعد نیا نیا ایک کلینک میں تعینات ہوا تھا۔ خود ایوون کو بھی ایک اسکول میں ٹیچنگ اپرنٹس شپ مل گئی تھی۔ اس طرح ان کی آمدنی اتنی معقول ہو گئی تھی کہ وہ ایک مہنگے فلیٹ میں منتقل ہو سکتے تھے، جو بلاشرکتِ غیرے ان کا اپنا ہوگا اور ایوون کے الفاظ میں: "جس کا باتھ روم ان کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا پڑے گا۔" دراصل اس فلیٹ کا، جس کو وہ چھوڑ کر جا رہے تھے، صرف نصف حصہ ان کے پاس تھا اور اگر فلیٹ کے مالک نے ہمیں کرایہ دار بنانا منظور کرلیا تو یہی نصف حصہ ہمیں مل سکے گا۔ اس زمانے میں جرمنی بھر میں کرائے کے مکانوں کی قلت تھی، اس لیے اکثر گھروں میں دو اور تین فیملیاں مل جل کر رہتی تھیں۔

ہمیں سب سے پہلے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ مکان، جس میں فلیٹ پایا جاتا تھا، ایک ایسی جگہ پر واقع تھا، جو شہر کے عین درمیان پائی جانے والی آلسٹر جھیل کے پہلو میں تھی۔ وہاں سے یونیورسٹی آنے جانے میں بہت سہولت تھی، جو جھیل کے دوسری طرف واقع تھی۔ وہاں پر جانے والی ٹرام مکان کے سامنے رکتی تھی۔ اس زمانے میں ہمبرگ کے شہر میں ٹرامیں چلتی تھیں بسوں کا رواج بہت بعد میں جا کر ہوا۔ سردیوں کے موسم میں جب جھیل کا پانی منجمد ہو جاتا تھا تو انسان اس کے اوپر سے پیدل چل کر دوسری طرف جا سکتا تھا۔ البتہ فلیٹ ایک پرانی چھ منزلہ بلڈنگ کی سب سے اوپر والی منزل پر چھت کے نیچے تھا، جہاں تک پہنچنے کے لیے نوے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ہم جوان تھے اور یہ چیز ہمارے راستے میں روک نہ تھی۔ ہم نے سوچا فلیٹ مل جائے تو دن میں ایک یا دو بار اتنی سیڑھیاں چڑھنے میں بھلا کیا حرج ہے۔ ہم اس کو روز کی ورزش سمجھ لیں گے۔ ہمیں اس وقت ابھی پتا نہ تھا کہ فلیٹ میں سنٹرل ہیٹنگ نہیں ہے اور ہمیں اوون میں مٹی کا تیل جلانا پڑے گا، جس کے بیس بیس لٹر کے کنستر مجھے اٹھا کر اوپر لے جانے ہوں گے۔ اس مکان میں لفٹ نہیں تھی۔ ایک فلیٹ ملنے کی خوشی کے موقع پر ایسی باتوں کے بارے میں بھلا کون سوچتا ہے؟

ایوون اور اس کے خاوند نے ہمارا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ فلیٹ کو دو حصوں میں اس طرح بانٹا گیا تھا کہ اس کے دو کمرے، جو سڑک کی طرف کھلتے تھے، ایک نوجوان عورت کے پاس تھے، جو سارا ہفتہ اپنی ماں کے پاس رہتی تھی اور صرف ویک اینڈ وہاں پر گزارنے کے لیے آتی تھی۔ دراصل اسے وہاں اپنے دوست کے ساتھ دو راتیں بسر کرنی ہوتی تھیں۔ مگر اس بات کا ہمیں اس وقت علم نہ تھا۔ فلیٹ کا دوسرا حصہ، جس میں ایک خاصا بڑا ہال نما کمرہ، باورچی خانہ اور ڈائننگ روم شامل تھے، وہ ایوون اور اس کے خاوند کے پاس تھا۔ یہ حصہ خود کفیل تھا اور فلیٹ کے اندر ایک فلیٹ کی طرح تھا، جس

میں داخل ہونے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کے بعد یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا بھی آس پاس فلیٹ میں موجود ہے۔ بس باتھ روم اور ٹائیلٹ دونوں حصوں کے ساجھے تھے۔ ہمیں اسٹوڈنٹ ہوسٹل کی زندگی کا تجربہ تھا، جہاں پر سوائے دو کمروں کے، جو ہوسٹل کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے، کچھ بھی ہمارا اپنا نہ تھا۔ وہاں پر ہم اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ باورچی خانہ، باتھ روم اور ٹائلٹ بلکہ کامن روم، لائبریری، ٹیلی فون، غرض ہر چیز ہمیں دوسروں کے ساتھ بانٹنی پڑتی تھی، اس لیے ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا کہ فلیٹ میں ہمیں ایک نوجوان عورت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

ایوون اور گونتھر نے کہا کہ انھوں نے اپنے نئے فلیٹ کے لیے فرنیچر خرید لیا ہے، اس لیے اگر ہم چاہیں تو وہ اپنا پرانا فرنیچر فلیٹ میں ہی چھوڑ جائیں گے۔ ہمیں اس پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، جب کہ ہمارے پاس پچاس ساٹھ کتابوں، دو سوٹ کیسوں، بوٹوں کے دو دو جوڑوں اور اپنے پہننے والے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردے بھی وہیں پر چھوڑ جائیں گے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے پاس ایک بھاری بھرکم صوفا سیٹ تھا، جو دن کے وقت بیٹھنے کے کام آتا تھا اور رات کو سونے کے لیے ایک پلنگ میں ڈھل جاتا تھا۔ ڈائننگ روم میں میز اور چھ کرسیاں رکھی تھیں، جو البتہ ہماری ضرورت سے بڑھ کر تھیں۔ اس بارے میں انھوں نے کہا کہ کرسیوں سے جان چھڑانی چنداں مشکل نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں ان کو سڑک پر رکھ دیں، ضرورت منداسی روز اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ صرف رائٹنگ ٹیبل اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے کیونکہ وہ گونتھر کے باپ کی نشانی تھا، جس کی تھوڑا عرصہ قبل وفات ہوئی تھی۔

فلیٹ کا کرایہ مناسب تھا اور ہمارے لیے اس کی ادائیگی ممکن تھی۔ ہمیں تین ماہ کا پیشگی کرایہ بطور گارنٹی ادا کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا، جس کا ذکر ایوون نے باتوں باتوں میں کیا تھا، البتہ اسے خطرہ تھا کہ مالک مکان کرایہ بڑھا سکتا ہے۔ یہ چیز ان کے ساتھ بھی پیش آئی تھی مگر اس وقت تک کسی نے فلیٹ کے مالک سے بات نہ کی تھی اور ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ہمیں بطور کرایہ دار قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہوگا یا نہیں۔ ایوون نے تجویز پیش کی کہ ہم چاروں اس سے ملنے کے لیے گارڈن کالونی میں جائیں، جو ہمبرگ کے مضافات میں واقع تھی۔ اس کو امید تھی کہ ان کی موجودگی میں وہ ہمیں کرایہ دار بنانے سے انکار نہیں کر سکے گا۔ ٹیلی فون پر اس کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی گئی مگر گونتھر نے جان بوجھ کر اسے نہ بتایا کہ وہ نقلِ مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس بات کا اس کو پتا چل گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود ان کے جانشین تلاش کر لے اور ہم خالی ہاتھ رہ جائیں۔

راستے میں گونتھر نے بتایا کہ ہم جس شخص کے پاس جا رہے ہیں اس کی زندگی کی کہانی بہت الجھی

ہوئی اور دکھی ہے۔ وہ یہودی ہے جس کو نازی جرمنی کے عہد میں قید و بند کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اس فلیٹ کا مالک نہیں کرایہ دار ہے، البتہ اس کو بہت تھوڑا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے فلیٹ کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے اور دونوں ذیلی کرایہ داروں سے اپنے کرائے سے بڑھ چڑھ کر رقم وصول کرتا ہے۔ مالک مکان اس بات کو جانتا ہے مگر اس بارے میں دخل اندازی سے باز رہتا ہے ، کیونکہ اس کو خطرہ ہے کہ یہودی لابی کہیں اس کے پیچھے نہ پڑ جائے، جو جنگ کے بعد پھر ایک بار سر اٹھا رہی تھی۔ یہودیوں کے ہاتھ میں یہ آسان نسخہ آ گیا تھا کہ جو کوئی ان میں سے کسی فرد کے مفاد کے خلاف کچھ کہے یا کرے اس پر یہودیت دشمنی کا الزام لگا دیا جاتا تھا، جس کو جرمنی کے قانونِ اساسی میں قابلِ سزا جرم قرار دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ جس کسی پر ایسا الزام عاید کر دیا جاتا تھا اس کو عدالت کا منہ دیکھنا پڑتا تھا اور اس بات کا اخباروں میں چرچا ہوتا تھا، جس سے سب لوگ ڈرتے تھے۔

ہمیں گارڈن کالونی میں اس کا ٹھکانہ تلاش کرنے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر شہر کے مضافات میں ایسی آبادیاں عارضی طور پر قایم کی گئی تھیں تاکہ لوگ وہاں پر اپنے ذاتی استعمال کے لیے چھوٹی موٹی سبزیاں، ٹماٹر اور آلو وغیرہ اگا سکیں۔ اس غرض سے بلدیہ کی طرف سے ان کو چھوٹے چھوٹے قطعاتِ زمین معمولی سالانہ لگان کے عوض دیے گئے تھے۔ لوگوں نے وہاں پر پھل دار پودے لگا لیے تھے اور لکڑی کے چھوٹے موٹے کیبن تعمیر کر لیے تھے، جن میں ہیٹنگ کا انتظام تھا اور مالکان سردیوں کا موسم بھی وہاں پر گزار سکتے تھے۔ اس طریق سے وہ چاہتے تھے کہ ان کو زمین کی ملکیت کے حقوق مل جائیں۔ فلیٹ کا مالک بھی اسی امید پر وہاں دھرنا مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ کام وام تو شاید وہ کچھ نہیں کرتا تھا اس کی آمدنی کا انحصار فلیٹ کے کرائے پر تھا۔ جب ہم آخرِ کار اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور وہ جان گیا کہ ہم اس کے فلیٹ کا نصف حصہ کرائے پر لینے کے لیے آئے ہیں تو اس نے بیوپاریوں کی طرح نرخ بڑھانے کی کوشش کی۔ گونتھر نے اسے کہا کہ وہ اتنی اونچی پرواز کے لیے پر نہ تولے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ خود کس قدر کرایہ ادا کرتا ہے اس لیے دس بیس مارک سے زیادہ اس کو کرایہ بڑھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد ہم نے اسے پچاس مارک زیادہ دینے کی ہامی بھر لی اور اس سے کرائے نامے پر دستخط کرا لیے جو ہم تیار کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔

دو ہفتوں میں ایوون اور گونتھر اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہے تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے ہمیں فلیٹ کے دوسرے نصف حصے میں رہنے والی نوجوان عورت سے متعارف کرا دیا۔ ایوون نے اس کی الہڑ جوانی اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے ہمیں خوش آمدید کہا مگر اس انداز میں جس سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اوپر جبر کر رہی تھی۔ اس بات سے ہم جان گئے

کہ اس کے تعلقات ایوون اور گونتھر کے ساتھ کچھ ایسے خوشگوار نہ تھے۔ جرمنی میں عوام الناس تعلیم یافتہ لوگوں کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس بات کا احساس انسان کو قدم قدم پر ہوتا ہے۔ شاید اس کے پیچھے احساسِ کہتری کا ہاتھ ہے، جس کا شکار عام طور سے عامی لوگ ہیں، جو ان کو اکیڈمک طبقے سے دور رکھتا ہے۔ دونوں طبقوں کی پسند اور ناپسند، زبان اور طور اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، یہاں تک کہ کپڑے پہننا تک جدا جدا ہے۔

فلیٹ کے خالی ہونے تک ہمیں بہت ساری چیزوں کا بندوبست کرنا تھا۔ سب سے اہم ہماری شادی کا مرحلہ تھا، جس کو طے کیے بغیر ہم اپنے اندر فلیٹ میں جا کر اکٹھے رہنے کی جرات نہ پاتے تھے۔ ہمارے بعد آنے والی نسل نے اس سلسلے کے سارے اہتمامات کو یکسر ایک طرف دھکیل کر آزادروی کو اپنا لیا ہے۔ آج کل شاذ و نادر ہی کوئی جوڑا شادی کرتا ہے، اور اگر شادی کرتا ہے تو سالہا سال تک اکٹھے رہنے اور ایک دو بچے پیدا کرنے کے بعد۔ ہم نے رجسٹریشن آفس میں شادی کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ وہاں سے تاریخ ملنے پر ہم دو گواہوں (ٹانٹے ایرنا اور سبینے ہورل) کی معیت میں حاضر ہو گئے اور پندرہ بیس منٹوں کے اندر سرکاری طور پر ایک جوڑا بن گئے۔ اوتا کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہمارا نکاح مسجد میں پڑھا جائے، جہاں پر میرے دوستوں کے علاوہ اس کی تینوں سہیلیاں موجود تھیں۔ ہماری شادی خانہ آبادی پر نہ کوئی ڈھول بجا، نہ گیت گائے گئے یا ڈانس ہوا۔ اوتا کے کمرے میں گنتی کے چند مہمانوں کی چائے اور کافی سے ضیافت کی گئی۔ اس سے اگلے روز ہمارا مختصر سا سامان ایک دوست کی کار میں لد کر ہمارے نئے گھر میں پہنچ گیا اور ہماری شادی شدہ زندگی کا نیا باب کھل گیا۔

ایک دو روز کے اندر تمام سامان مہیا کر لیا گیا جو ایک خود کفیل گھر چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والی کراکری اور دیگچیاں اور دیگر بھانڈے ٹینڈے تک دوستوں اور واقف کاروں کی عنایت سے ہمیں مل گئے۔ صرف ایک رائٹنگ ٹیبل مجھے خریدنا پڑا تا کہ میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کو جاری رکھ سکوں جو آخری مراحل میں تھا۔ آگے چل کر یہ میز سال ہا سال تک ہمارے پاس رہا اور ہم ایک نقل مکانی سے دوسری تک اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرے۔ اس رائٹنگ ٹیبل کے حوالے سے میں نے ایک افسانہ " زرد ستارہ" لکھا تھا، جو میرے افسانوں کے اسی نام کے مجموعے میں شامل ہے۔ وہاں پر یہ بیان ہوا ہے کہ مجھے اس میں سے ایک یہودی کا خط ملا تھا جو اس کے بیٹے کے نام تھا۔ درحقیقت مجھے خط نہیں ملا تھا بلکہ ایک مشہور جرمن ادیب ڈہمل (Dehmel) کا وزٹنگ کارڈ ملا تھا، جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس میز کا پہلا مالک تھا۔

ہم چونکہ ایک ہوسٹل سے اٹھ کر آئے تھے، جہاں پر طالب علموں کی سرگرمیوں کے سبب ہمہ

وقت اچھی خاصی گہما گہمی رہتی تھی اور انسان کو اطمینان سے راتوں کو سونے تک کی مہلت نہ ملتی تھی، اس لیے ہمیں یہ بات بہت اچھی لگی کہ ہمارے نئے فلیٹ میں باہر کی دنیا سے کسی قسم کا شور شرابا سننے میں نہ آتا تھا۔ مکان کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر چلنے والی ٹرام کی آواز ہمارے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ ہمیں اس پہلو سے اپنی خوش قسمتی پر اچھا خاصا ناز ہونے لگا تھا اور ہم نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی کہ اس فلیٹ میں پڑھنے لکھنے کے لیے مکمل سکون مل سکے گا، جس کی ہمیں ایک مدت سے تلاش تھی۔

چوتھے یا پانچویں روز ہمیں فلیٹ کے دوسرے حصے سے، جس کا کمرہ ہمارے سونے والے کمرے سے ملحق تھا، بلند ہونے والی چیخ پکار نے آدھی رات کو اچانک گہری نیند سے بیدار کیا۔ میں نے جانا کہ کوئی شخص ہماری ہمسائی کی جان لے رہا تھا، اس لیے میں اسے بچانے کے لیے ادھر جانے کو بستر سے کود کر اٹھا۔ مگر اوتا نے جلدی سے میرے پاجامے کو پیچھے سے پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اب جو ہم نے کان لگا کر سنا تو پتا چلا کہ عورت جماع کی لذت کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی اور بے اختیار ہو کر اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایسا ناٹک ہم نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ ہمارا رات کا سکون برباد ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس ڈرامے پر ہنسیں یا روئیں۔ کیا ہمیں ہفتے کے ہفتے ویک اینڈ کی راتیں اپنی ہمسائی کی شہوت آگیں چیخیں برداشت کرنی اور راتیں آنکھوں میں بتانی ہوں گی؟

دوسرے روز میں نے رات کا ماجرا یونیورسٹی میں دوستوں کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں آن اٹکے ہیں۔ ایک دوست نے کہا اس بات کا بہت آسان حل موجود ہے۔ جب تمھاری ہمسائی اگلی بار شہوت کے عروج پر پہنچی ہوئی ہو، تو دروازے پر زور سے دستک دے کر "خاموشی" پکار دینا، پھر دیکھنا کس طرح جھاگ کی طرح اس کی اور اس کے یار کی ساری شہوت جاتی رہے گی۔ کسی اور نے کہا، دیکھنا کہیں حفظِ حیوانات والے تم پر مقدمہ نہ دائر کر دیں۔ مقدمہ تو خیر کسی نے دائر نہ کیا مگر ہمسائی ہم سے آنکھیں ملانے کے قابل نہ رہی۔ ساتھ کے ساتھ اس نے ہمارے خلاف جنگ کا محاذ کھول دیا، جس کا اسے اچھا خاصا تجربہ تھا۔ میں تو خیر اس صورتِ حال سے نپٹ لینے کے لیے تیار تھا مگر اوتا کی نازک طبیعت پر یہ چیز بار بن گئی۔ اس کو یہ بھی خیال تھا کہ ہماری ہمسائی خدا جانے کیسے کیسے چور، اچکے اور بھڑوے اپنے ساتھ لاتی ہو گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم جلد از جلد اپنے لیے دوسرا فلیٹ تلاش کریں۔ یہ سوال اپنی جگہ پر تھا کہ ایک علیحدہ فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے کے لیے ہم پیسے کہاں سے لائیں گے؟

مجھے فولکس واگن فاونڈیشن کی طرف سے ڈاکٹریٹ کے لیے ملنے والی گرانٹ ختم ہونے والی تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے امتحان کی تیاری کے لیے وظیفہ ملنے کی امید تھی، مگر اس وقت تک اس

بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹیوشن پڑھانی بند کر رکھی تھی، کیونکہ مجھے اکثر خود طالب علموں کے گھروں پر جانا پڑتا تھا اور جانے آنے پر بہت وقت لگ جاتا تھا، جس کے سبب میں ہفتے میں دو تین روز مقالے پر کام نہ کر سکتا تھا۔ اوتا بھی ایک جگہ پر ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ عین ان دنوں میں اسے وہاں سے اچانک جواب مل گیا۔ وہ شام کو گھر لوٹی تو میں نے دیکھا کہ وہ سخت پریشان تھی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ہم اگلے ماہ کا کرایہ ادا نہ کر سکیں گے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود کہیں پر کام تلاش کروں، خواہ اس کے نتیجے میں مقالے کی تکمیل میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح میں جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ کے دفتر میں جانے کے لیے گھر سے نکلا، جہاں پر میں کئی برس قبل کچھ عرصہ بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ کام کر چکا تھا اور اچھا نام پیدا کیا تھا، پھر اپنی تعلیم کی تکمیل کی خاطر اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ وہاں پر کوئی اسامی خالی بھی ہے یا نہیں مگر پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے پر کوریڈور میں انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر میسر شمیت **(Messerschmidt)** کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی دونوں بازو ہوا میں لہرا دیے اور آگے بڑھ کر مجھے کلابے میں جکڑ لیا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، کیونکہ انسٹیٹیوٹ میں چند ماہ قبل کھولے جانے والے ڈاکومنٹیشن سنٹر کے ڈائرکٹر کو یونیورسٹی میں پروفیسر شپ مل گئی تھی اور وہ دو ہفتوں میں انسٹیٹیوٹ کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے کہا تم کب تک چارج لے سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے ابھی ڈاکٹریٹ کرنے میں کم و بیش چھ ماہ لگیں گے، اس کے بعد میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس نے کہا تم یہ چھ ماہ یہاں پر انسٹیٹیوٹ میں بھی تو گزار سکتے ہو۔ تم بیشک اپنا مقالہ یہاں پر آفس میں بیٹھ کر لکھو۔ اس طرح مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ تم ہماری ٹیم میں شامل رہو گے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے آفس میں لے گیا۔ اس نے اپنی سیکرٹری سے میرے لیے اپوائنٹمنٹ لیٹر تیار کرنے کو کہا۔ اس میں میرے لیے مقرر کی جانے والی تنخواہ اتنی زیادہ تھی، جس کا میں نے اس زمانے میں خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس بارے میں سیکرٹری سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ ڈائرکٹر نے مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو شاید اسے خطرہ پیدا ہوا کہ میں کہیں انکار نہ کر دوں۔ اس نے کہا ڈاکٹریٹ کر لینے پر اس میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

میں گھر پہنچا تو اس روز کی ڈاک میں ایوون اور گونتھر کی طرف سے ان کے نئے فلیٹ کے لیے دی جانے والی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ آیا پڑا تھا۔ اوتا نے کہا ہمیں اس میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری نئی ملازمت کے پیش نظر وہ نئے فلیٹ کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ ایوون نے اپنے مکان کی تصویر بھیجی تھی۔ بلڈنگ بالکل نئی تھی۔ اوتا نے کہا ہو سکتا ہے کہ ابھی

سارے فلیٹ کرائے پر نہ چڑھے ہوں۔ کیوں نہ ہم لگے ہاتھوں وہاں پر مالک مکان سے بات کر کے ایک فلیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس زمانے میں کرائے پر چڑھائے جانے والے مکانات تیزی سے بن رہے تھے، مگر فلیٹ حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور عام طور سے لوگوں کو نئے فلیٹ کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔

پارٹی میں شامل ہونے والوں میں سے اکثر لوگ ہمارے لیے اجنبی تھے۔ وہ یقیناً ایوون اور گونتھر کے کولیگ ہوں گے۔ ایوون نے ہمارا تعارف سب لوگوں سے کرایا۔ ان میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی شیلا بھی شامل تھی، جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ ایوون اور گونتھر کی سب سے زیادہ قریبی دوست ہے۔ پتا چلا کہ وہ اسی بلڈنگ میں رہتی تھی، بلکہ اسی نے ان کو اس مکان میں فلیٹ دلوایا تھا۔ وہ میرے لیے خاص طور پر سیب کے جوس کا گلاس لے کر آئی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمارے فلیٹ سے خوب واقف ہے، کیونکہ جب وہ اپنے بیٹے فرانک کے حمل سے تھی تو اسے وہاں پر دو مہینوں تک رہنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے وہ اسٹوڈنٹ ہوسٹل میں رہتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ وہاں پر کسی کو پتا چلے کہ وہ حمل سے ہے اس لیے گونتھر نے اسے کہا کہ وہ ان کے ہاں آ جائے۔ ایوون کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس کے علاوہ اسے پتا تھا کہ گونتھر طبی طور پر اس کی وہاں پر دیکھ بھال کر سکے گا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر تھی اور گونتھر کے ساتھ مل کر اس نے ایک ریسرچ پروجیکٹ پر کام کیا تھا، جس کی بنا پر دونوں کو ایک ہی روز ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ اسی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ جرمنی میں طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو کسی ریسرچ پروجیکٹ پر کام کرنا پڑتا ہے، جس میں کامیابی کے بغیر ان کو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی میں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو میڈیکل میں بیچلر کی ڈگری پانے والے بھی ڈاکٹر کہلاتے ہیں اور ریسرچ پروجیکٹ پر شاذ و نادر ہی ان میں سے کوئی کام کرتا ہے۔

اوتا کے پوچھنے پر شیلا نے بتایا کہ ان کی بلڈنگ میں سب فلیٹ کرائے پر لگ چکے تھے البتہ اسے امید تھی کہ اگر ہم اس بلڈنگ کی بنانے والی فرم سے رابطہ کریں، جو بہت سی نئی بلڈنگیں تعمیر کر رہی تھی، تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں ان کی کسی دوسری بلڈنگ میں فلیٹ مل سکے۔ اس فرم کی شہرت اچھی تھی۔

چنانچہ دوسرے روز اوتا نے فرم کے ہیڈ آفس سے بات کی تو پتا چلا کہ ان کی ہمبرگ میں آئندہ کئی ماہ تک مکمل ہونے والی بلڈنگوں کے سارے فلیٹ کرائے داروں کے لیے ریزرو ہو چکے تھے اور لوگوں نے چھ چھ ماہ کا کرایہ بطور گارنٹی ادا کر دیا تھا، البتہ اگر ہم ہمبرگ کے مضافات میں بنائے جانے والی کسی بلڈنگ میں فلیٹ حاصل کرنا چاہیں، تو امیدواروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا سکتے ہیں۔ اوتا چاہتی تھی کہ ہم خود بلڈنگ بنائی جانے والی جگہ کو اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھیں، اس لیے اس نے فرم

سے ہمبرگ سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں تھیس ڈورف (Thesdorf) میں بنائی جانے والی بلڈنگ کا پتا چانا چاہا۔فرم کے نمائندے نے ہمیں اس نام کے اسٹیشن تک سٹی ٹرین میں سفر کرنے کو کہا، جہاں پر اسکیم کی پہلی بلڈنگ بنائی جا چکی تھی۔اس نے کہا وہاں سے مشرق کی طرف تین سوگز کے فاصلے پر، جہاں مٹی اور پتھروں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے، ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ تعمیر کی جائے گی، جس کی تکمیل ایک سال کے عرصے میں ہوگی۔اگر ہم پسند کریں تو وہ ہمارے لیے اس بلڈنگ میں فلیٹ ریزرو کر سکتا ہے۔اوتا نے مجھے بتائے بغیر فہرست میں نام درج کرا دیا۔اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ چانس بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔شام کو گھر لوٹنے پر اوتا نے مجھے اس بارے میں بتایا تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسی دور دراز جگہ پر، جہاں پر ہسپانوی محاورے کے مطابق شیطان نے اپنا پونچھ کھو دیا تھا، جا کر رہنے میں کیا تک ہے؟ مجھے خطرہ تھا کہ ہم ہمبرگ شہر کی گہما گہمی اور وہاں پر آئے دن ہونے والے بے شمار ثقافتی پروگراموں سے کٹ جائیں گے مگر اوتا کی ہٹ دھرمی کے آگے میری ایک نہ چلی۔ہم نے ویک اینڈ پر وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔اوتا نے کہا کہ اگر وہ جگہ ہمیں پسند نہ آئی تو ہم اپنا نام کرایہ داروں کی فہرست سے کٹوا سکتے ہیں۔ایسی فہرستوں میں درج کروانا مشکل تھا، نام کٹوانا آسان تھا۔یوں بھی ہم نے اس وقت تک کوئی پیشگی رقم ادا نہیں کی تھی اس لیے ہمیں کوئی حرجانہ بھی نہیں ادا کرنا تھا۔اس وقت تک ہم نے بھول کر بھی کبھی تھیس ڈورف کا رخ نہ کیا تھا۔ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ جگہ ہمبرگ سے کتنے فاصلے پر ہے اور جانے آنے پر کتنا وقت لگتا ہے۔

تھیس ڈورف ایک چھوٹا سا خوابیدہ گاؤں تھا، جہاں پر اس زمانے میں انسانوں سے زیادہ ڈھور ڈنگر پائے جاتے تھے۔البتہ وہاں پر سٹی ٹرین کا اسٹیشن بن چکا تھا، جسکے سبب ہمبرگ کا شہر سرک کر نزدیک آ گیا تھا۔ریل گاڑی میں شہر کے مرکز تک سفر کرنے پر بیس منٹ لگتے تھے اس سے زیادہ وقت ہمیں اپنے سابقہ اسٹوڈنٹ ہوسٹل سے شہر کے مرکز تک جانے پر لگ جاتا تھا۔اوتا کو تھیس ڈورف کی کھلی فضا دوسری ساری باتوں سے زیادہ بھاتی تھی۔اس نے ٹرین سے اترتے ہی، بلکہ اس جگہ پر نظر ڈالنے سے پہلے جہاں پر وہ بلڈنگ تعمیر کی جانی تھی، جس میں ہمیں ایک سال کے بعد فلیٹ ملنے کی امید دلائی گئی تھی، یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم وہاں پر جا کر بسنا چاہتے ہیں۔

میرے مقالے کا آخری تہائی حصہ جرمن اوریئنٹ انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے کے دوران چھ ماہ کے عرصے میں لکھا گیا۔یہ نصف سال مجھ پر بہت بھاری تھا، کیونکہ میں سارا دن انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچتے ہی مقالے کے مسودے پر کام شروع کر دیتا تھا، جو آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔میں نے ڈاکٹر میسرشمت کی پیشکش سے فایدہ اٹھانا مناسب نہ سمجھا، جس کی رو سے مجھے انسٹیٹیوٹ

میں کام کے اوقات میں مقالہ لکھنے کی اجازت تھی۔ مقالہ مکمل ہونے کے بعد میں نے مقالے کی منظوری ملنے کے بعد لیے جانے والے زبانی امتحان کی تیاری شروع کی تو سب سے عمدہ طریق یہ نظر آیا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی جلدوں کی ورق گردانی کر لی جائے، جس کا پہلا جرمن ایڈیشن انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں موجود تھا۔ نئے انگریزی ایڈیشن کی اس زمانے میں ابھی ایک ہی جلد چھپی تھی۔ اس کام میں میرے ساتھ پڑھنے والی ثریا فاروقی بھی شامل ہوگئی جو میری طرح مقالہ جمع کرا چکی تھی۔ ہمارا زبانی امتحان ایک ہی روز ہونا تھا۔ ثریا کے والد عبدالقدوس فاروقی دوسری عالمگیر جنگ سے قبل میڈیسن پڑھنے کے لیے جرمنی آئے تھے۔ نازی جرمن حکومت کے کارندوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ موصوف نسلاً آریہ نہ تھے وگرنہ ان کو ایک جرمن دوشیزہ کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ وہ شادی کرنے کے بعد جرمنی کے ہی ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو میری فرمایش پر ان کی اہلیہ نے مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ ثریا فاروقی ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد دس بارہ برسوں تک امریکی یونیورسٹیوں میں پڑھاتی رہی، پھر اس کو ترکی میں پروفیسر شپ مل گئی۔ تیرہ چودہ برسوں سے وہ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں ترک علوم (Turkology) پڑھا رہی ہے۔ اس کے بھائی ہارون فاروقی کا شمار جرمنی کے اہم ترین فلم ڈائرکٹروں میں ہوتا ہے۔

عین اسی مہینے میں، جس میں مجھے ڈاکٹریٹ ملی، جماعتِ احمدیہ کے خلیفہِ ثالث مرزا ناصر احمد اپنے یورپ کے دورے کے دوران ہمبرگ بھی تشریف لائے۔ ان کے ساتھ اپنے خرچ پر سفر کرنے والوں میں ایک شخص مستری فضل دین مجھے احمد نگر کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ مجھے آ کر ملا اور اس نے کہا کہ حضرت صاحب نے اسے خاص طور بتایا ہے کہ ہمبرگ میں جماعت سے بھاگے ہوے منیرالدین احمد نے ایک بے نکاحی جرمن عورت کو گھر میں ڈال رکھا ہے اور اس سے اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ موصوف نے اسے مجھ سے ملتے ہوے محتاط رہنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ میں یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ مرزا ناصر احمد اس قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد میں نے پاکستان کی یونیورسٹیوں کو، وہاں پر جا کر پڑھانے کے مواقع کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر، خطوط لکھے۔ کچھ عرصہ پہلے حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک وفد یورپ بھجوایا گیا تھا جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور علامہ علاء الدین صدیقی، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی پر مشتمل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد پاکستان لوٹ کر آئیں اور وہاں کی درسگاہوں میں پڑھائیں اور تحقیق کے مراکز قایم کریں۔ اورینٹل کالج، لاہور کے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے لکھا کہ اگر آپ کو یورپ یا امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کا کام مل جائے تو پاکستان

واپس آنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر جلبانی نے لکھا کہ ملکی یونیورسٹیوں میں تحقیق کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے، جو کوئی اس طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے اس کا راستہ روکا جاتا ہے۔ وہ خود پاکستان لوٹنے پر سخت متاسف ہیں، اس لیے ان کا مشورہ یہ ہے کہ ان کی غلطی کا اعادہ نہ کروں۔

میں نے امریکا کی یونیورسٹیوں سے رابطہ قایم کیا تو تین جگہوں سے اسسٹنٹ پروفیسر شپ کی پیشکش ہوئی۔ مجھے ذاتی طور پر کیلیفورنیا کی لاس اینجلس یونیورسٹی کی آفر میں دلچسپی تھی۔ وہاں پر اس زمانے میں پروفیسر گریونے باؤم (Grünebaum) سیمینار کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ خود آسٹریا میں پیدا ہوے تھے اور اپنے ہاں تحقیق کی جرمن روایات کو ترویج دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے خط میں اپنی بیماری کا بھی ذکر کیا، جو جلد بعد ان کی وفات کا باعث بنی۔ دوسری طرف جب اوتا کو پتا چلا کہ میں امریکہ جانے کی سوچ رہا ہوں تو اس نے اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ اگر دنیا کے کسی ملک میں جا کر رہنے کے لیے تیار نہیں تھی تو وہ امریکہ ہے۔ آخر اس نے نوجوانی کا زمانہ جنوبی امریکہ کے ملکوں چلی اور پیرو میں گزارا تھا، جہاں پر امریکہ کے خلاف لوگوں کے دلوں میں سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ پھر اوتا ابھی اپنی تعلیم سے فارغ نہ ہوئی تھی۔ اس نے تو ابھی اپنے ڈاکٹریٹ کے پروجیکٹ پر کام بھی شروع نہیں کیا تھا۔

پروفیسر شپولر کو پتا چلا کہ میں کسی امریکی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے جانا چاہتا ہوں، تو انھوں نے کہا کہ اگر آپ کو یونیورسٹی میں پڑھانے کا شوق ہے تو اس کے لیے آپ کو ہمبرگ کو چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی جرمنی بھر میں اس زمانے میں کسی یونیورسٹی میں ہندوپاک میں اسلام کی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ یہ مضمون ہمبرگ یونیورسٹی میں پڑھا سکتے ہیں۔ جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ یوں تو ایک خالص تحقیقاتی ادارہ ہے مگر ریسرچ فیلوز کو جز وقتی طور پر یونیورسٹی میں پڑھانے کی اجازت ہے۔ چنانچہ میں نے ۱۹۶۸ء سے وہاں پر ہفتے میں ایک لیکچر دینے کا سلسلہ جاری کر دیا جو پچیس سال تک جاری رہا۔ میرے شاگردوں میں سے کئی ایک اس دوران میں جرمنی کی مختلف یونیورسٹیوں میں یہ مضمون پڑھا رہے ہیں۔ گویا وہ پودا، جس کو میں نے لگانا چاہا تھا، جڑیں پکڑ چکا ہے۔

ہمبرگ یونیورسٹی کا شعبۂ فارسی ادبیات کچھ عرصے سے خالی تھا، جس پر کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسر کی تقرری کی شرط لگائی گئی تھی۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ فرائی نے ایک سال کے لیے ہمبرگ آنے کی دعوت قبول کر لی اور اس طرح وہ میرے کولیگ بن گئے۔ البتہ انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنی کرسی کو خالی نہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شیراز (ایران) میں قایم کردہ امریکن انسٹیٹیوٹ برائے ایران شناسی کے بھی ڈائریکٹر تھے۔ چنانچہ وہ ہر ہفتے دو دن ہمبرگ میں گزارنے کے

بعد دو تین روز کے لیے بوسٹن چلے جاتے تھے اور ویک اینڈ پر شیراز میں ہوتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا تعارف ہوا تو پاکستان کے حوالے سے انھوں نے چوہدری ظفر اللہ خان کا ذکر چھیڑ دیا، جن کو وہ ۱۹۵۲ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی طرف سے منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں ملے تھے۔ میں نے بتایا کہ چوہدری صاحب ہیگ (ہالینڈ) میں ہوتے ہیں اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے صدر ہیں اور اسی سال جولائی کے مہینے میں ہمبرگ آئے تھے۔ میری ان کے مراسلت تھی، مگر ہماری اس موقعے پر ملاقات کسی وجہ سے نہ ہو سکی تھی۔ پروفیسر فرائی نے کہا کیوں نہ ہم انھیں ہمبرگ یونیورسٹی میں تقریر کے لیے بلائیں۔ انھی دنوں میں چوہدری صاحب کی کتاب "اسلام اور حقوقِ انسانی" چھپ کر آئی تھی۔ ہم نے انھیں اسی موضوع پر تقریر کرنے کی دعوت دینے کا ارادہ کیا۔ جرمن پاکستان فورم کے صدر ڈاکٹر ٹروچلر (Trütschler) سے، جو پاکستان میں جرمنی کے سفیر رہ چکے تھے، میں نے اس بات کو ذکر کیا تو انھوں نے کہا یہ بہت نادر موقع ہے اور وہ جرمنی کے تین چار شہروں میں چوہدری صاحب کی تقریر کا انتظام کرا سکتے ہیں۔ میں نے چوہدری صاحب کی خدمت میں خط لکھا اور تقریروں کے منصوبے کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اگلے برس اپریل یا مئی کے مہینوں میں چار روز کے لیے جرمنی آسکیں گے اور تین مختلف شہروں میں تقریر کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ہم ان کے لیے بہت اچھا مترجم مہیا کر سکیں۔

میری کتاب "اسلامی نظامِ تعلیم" نئی نئی چھپی تھی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ چوہدری صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جس پر ان کا جوابی خط اس قابل ہے کہ اس کا ایک حصہ یہاں پر محفوظ کر لیا جائے۔ آپ لکھتے ہیں:

"آپ کی تصنیف کا نسخہ بھی آج ہی مل گیا ہے۔ جزاکم اللہ۔ میں نے تھوڑی سی ورق گردانی کی ہے۔ آپ کی محنت اور کاوش کی داد دیتا ہوں۔ آپ کا موضوع خالص تاریخی اور تحقیقی ہے۔ اس کی قدر کا تو میں اندازہ کر سکتا ہوں لیکن کسی رائے کے اظہار کا میں اہل نہیں۔ ایک لطیفہ بیان کر دیتا ہوں۔ صفحہ ۲۷ پر آپ نے امام غزالیؒ کی نہایت صائب رائے کا ذکر کیا ہے کہ ایسے مسایل پر مناظرہ نہیں ہونا چاہیے جو ناممکن الوقوع ہیں، مثلاً: یہ کہ عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہو جائے اور غروب ہو جانے کے بعد مغرب سے پھر طلوع کرے تو کیا عصر کی نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی یا اگر پہلی بار غروب ہونے پر مغرب کی نماز پڑھی گئی تو دوبارہ طلوع کے بعد پھر غروب ہونے پر مغرب کی نماز کیا دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ یہ مسئلہ امام غزالیؒ کے زمانے میں اور اس زمانے میں بھی محالات میں سے ہے لیکن عنقریب ممکنات میں سے ہو جائے گا۔ پانچ سال سے کم عرصے میں یہ صورت پیدا ہو جائے گی کہ مثلاً ایک supersonic ہوائی

جہاز لندن سے آٹھ بجے صبح (طلوعِ آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد) روانہ ہو کر نیویارک کی سمت میں پرواز کرے گا۔ جیسے یہ جہاز مغرب کی طرف بڑھے گا سورج پیچھے رہنا شروع ہو گا اور مشرق کی سمت میں پھر غائب ہو جائے گا۔ دو گھنٹے بعد جہاز نیویارک پہنچ جائے گا۔ اس وقت ابھی نیویارک میں ۵ بجے قبل فجر کا وقت ہو گا۔ دو گھنٹے بعد آفتاب پھر طلوع کرے گا۔ کیا ایک مسلمان مسافر نیویارک پہنچنے کے بعد وہاں فجر کا وقت ہونے پر فجر کی نماز میں دوبارہ شامل ہو؟ یا اگر طیارہ شام کے ۸ بجے غروبِ آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد لندن سے روانہ ہوا اور جیسے مغرب کی طرف پرواز ہوتی گئی سورج مغرب سے پھر بلند ہوتا گیا اور نیویارک پہنچنے پر وہاں ابھی عصر کا وقت ہوا تو غروبِ آفتاب پر کیا ایک مسلمان مسافر وہاں پھر مغرب کی نماز میں شامل ہو گا؟ میرے لیے یہ مسئلہ کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا، لیکن فقہا کے لیے بحث کا موضوع ضرور رہے گا!"

چوہدری صاحب کی تینوں تقریریں بہت کامیاب رہیں۔ بالخصوص وکیل اور جج حضرات اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ یونیورسٹی کے ہال کی کوئی سیٹ خالی نہ رہی۔ ہمبرگ میں آپ کا قیام دو روز کے لیے تھا۔ دوسرے روز پاکستان کے قونصل جنرل بنڈر صاحب (Binder) نے اپنی کار ڈرائیور سمیت ہمارے سپرد کر دی کیونکہ چوہدری صاحب نے ایسٹ سی (East Sea) دکھائے جانے کی فرمائش کی تھی اور مجھے اور ہمبرگ میں احمدیہ مشن کے انچارج چوہدری عبداللطیف کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ راستے میں جب چوہدری صاحب نے مجھ سے جاننا چاہا کہ میں نے کن وجوہات کی بنا پر مشن سے علیحدگی اختیار کی تھی، تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا ہمبرگ آنا دراصل مجھ پر کورٹ آف انکوائری کے مترادف تھا۔ ان کی جرح نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جیسے میرا فیصلہ درست نہ تھا اور میں نے جماعت کے نظام کی خلاف ورزی کی تھی۔ ان کی زبانی میں نے پہلی بار سنا کہ مرزا بشیرالدین محمود احمد کی زندگی کے آخری چار پانچ برسوں میں، جب وہ خلافت کے کاروبار کو چلانے کے قابل نہ رہے تھے، جماعت نے ایک نگران کمیٹی مقرر کی تھی، جس کے ممبروں میں چوہدری صاحب بھی شامل تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اپنی شکایت نگران کمیٹی کو بھیجنی چاہیے تھی۔ دوسری طرف میں اس عرصے میں جماعتِ احمدیہ سے مکمل علیحدگی کا فیصلہ کر چکا تھا، جس کو سننے کے بعد چوہدری صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ بلکہ رخصت کے وقت مجھ سے مصافحہ تک کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

یونیورسٹی کے اکیڈمک سال کے افتتاحی جلسے کی کارروائی اس طرح ہوتی تھی کہ بڑے ہال کے بھر جانے کے بعد پروفیسر حضرات کالے چوغوں میں ملبوس اور سر پر کالے ہیٹ رکھے ہوئے دورویہ قطار میں بطخوں کی چال چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوتے تھے، جس کا استقبال حاضرین تالیاں بجا کر کرتے

تھے۔اس سال جب جلوس ہال میں داخل ہونے لگا تو بائیں بازو کے دو طالب علم دروازے پر ایک بینر لیے ہوئے کھڑے تھے، جس پر لکھے ہوئے سلوگن کو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ فوراً جلوس کے آگے آگے چلنے لگے۔ان کے بینر پر لکھا ہوا تھا: "چوغوں میں بند، ہزار سال کا گند"۔ واضح ہے کہ اس سلوگن کو پڑھ کر ہال میں ہنسی اور ٹھٹھے کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ پروفیسر شپولر سے نہ رہا گیا اور وہ پکار اٹھے کہ ان لوگوں کو گیس چیمبر میں ڈالا جانا چاہیے۔اس وقت تو یہ بات شور شرابے میں ڈوب گئی مگر وہاں پر موجود صحافی اس کو لے اڑے۔ اگلے روز اخباروں کی سرخی تھی: "نازی پروفیسر طالب علموں کو گیس چیمبر میں ڈال کر جان سے مارنا چاہتا ہے۔" وہ تو خیر ہوئی کہ تقریب کے فوراً بعد پروفیسر شپولر نے خود اپنے خلاف انکوائری کیے جانے کی درخواست دے دی تھی، جس کی بنا پر وہ معزولی سے بچ گئے مگر ان کے اچھے نام پر داغ لگ گیا، جس کو وہ آخر تک نہ دھو سکے۔

میں اس زمانے میں "پاکستانی مجلس" کا صدر تھا جس کے سالانہ اجلاس میں پروفیسر شپولر کی تقریر رکھی گئی تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے ہمیں اس کے لیے فنڈز ملتے تھے۔طالب علموں کی مجلسِ عاملہ نے ان کو روک لیا۔اس سے قبل بھی ایک بار ہمارے خلاف شکایت پیدا ہو چکی تھی، جس کا سبب پاکستان کے سفیر عبدالرحمٰن خان بنے تھے۔ انھوں نے ہماری ایک محفل میں ہٹلر اور نازی پارٹی کے بارے میں تعریفی کلمات کہے تھے۔ ان کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ جرمنی میں موسم بدل چکا تھا اور لوگ نازی پارٹی کے ساتھ تعلق توڑ چکے تھے۔ ایسی باریک باتیں ہمارے سفیر حضرات کو شاید بتائی نہیں جاتی تھیں۔ البتہ مجھے جرمنی میں پہلے پاکستانی سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا، جو نازی حکومت کے زمانے میں جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا شمار پہلے جرمن چانسلر آڈیناور (Adenauer) کے ذاتی دوستوں میں ہوتا تھا جو جرمن کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے اور ڈاکٹر عمر حیات ملک کے ساتھ بلاتکلف جرمن میں بات کر سکتے تھے۔

مجھے جرمنی میں رہتے ہوئے نو برس ہو چلے تھے اور میں ایک بار بھی لوٹ کر پاکستان نہیں گیا تھا۔ اس دوران میں ابا جی ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کو دل کا دورہ پڑنے کے سبب وفات پا گئے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں یقیناً ان کو ملنے کی خاطر اس سے قبل جاتا۔ آپا نصیرہ ورسک میں اور چھوٹا بھائی رفیق راولپنڈی میں مقیم تھے۔ بھائی نصیر کو آپا نصیرہ نے اپنے پاس رکھ لیا تھا جس کے سبب میں اس کا اور بہنوئی عزیز الرحمٰن کا شکر گزار تھا۔ میں ماہوار بھائی نصیر کے لیے اخراجات بھیج دیتا تھا مگر چاہتا تھا کہ خود جا کر اپنی شکر مندی کا اظہار کروں۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں پاکستان یاترا کا اہتمام ہو گیا۔ عین ان دنوں میں پاکستان کی وزارتِ اطلاعات کے چار افراد جرمن حکومت کی دعوت پر ٹریننگ کے لیے آئے۔ اس

سلسلے میں انھیں ایک ہفتے کے لیے ہمبرگ بھی آنا تھا، جہاں پر مجھے ان کے پروگرام کا انچارج بنایا گیا تھا۔اس گروپ میں مغربی پاکستان سے منیر احمد شیخ اور جنید اقبال اور مشرقی پاکستان سے دو افراد شامل تھے، جن کے نام میں بھول گیا ہوں۔جنید اقبال اس زمانے میں پاکستان کونسل کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے، انھوں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو پاکستان کے سفر کے دوران راولپنڈی، ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں لیکچر دینے کی دعوت دلا سکتا ہوں۔اس طرح میرے لیے مشرقی پاکستان جانے اور وہاں کے حالات کا جایزہ لینے کا سبب پیدا ہو گیا۔

ان دنوں اوتا ہسپانوی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہی تھی، جس کا موضوع ''کالدیرون (Calderon) کے ڈراموں میں Coento (حکایات) کا تفاعل'' تھا۔اس سلسلے میں اسے دو تین ماہ کے لیے اسپین جانا پڑا، جہاں کی لائبریریوں میں متعلقہ لٹریچر ملنے کی امید تھی۔اوتا نے اس مقالے پر ایم اے کی ڈگری کے لیے کام شروع کیا تھا، جو چھ ماہ کے عرصے میں لکھنا ہوتا ہے۔جب اس نے اپنا مقالہ پیش کیا تو نگران پروفیسر نے کہا کہ یہ مقالہ اس قدر وقیع ہے کہ اسے اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل سکتی ہے۔اس نے مشورہ دیا کہ مقالے کا اسکوپ کسی قدر بڑھا دیا جائے اور وہ Coento پر لکھے جانے والے لٹریچر کا مکمل طور پر احاطہ کرے۔چونکہ یہ لٹریچر جرمنی میں میسر نہ تھا، اس لیے یونیورسٹی کی طرف سے اسے میڈرڈ جانے کے لیے گرانٹ مل گئی۔مجھے پاکستان جانے کا شوق ضرور تھا مگر اوتا کا مقالہ اس سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔میں اس کی مقالے کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا مگر یہ ضرور کر سکتا تھا کہ اس کو گھر بار کے کاموں سے آزاد رکھوں اور اگر اسے جرمنی سے کسی قسم کا لٹریچر درکار ہو تو وہ مہیا کر سکوں۔اس لیے مجھے پاکستان کے سفر کو اوتا کی اسپین سے واپسی تک کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔

چوتھا باب

پاکستان کا پہلا سفر

بالآخر دسمبر ۱۹۶۹ء میں نو برسوں کے بعد میں پہلی بار لوٹ کر پاکستان جا رہا تھا۔ مجھے پوری طرح علم نہیں تھا کہ وہاں پر کیا کچھ تبدیلیاں آ چکی ہوں گی۔ پورا طیارہ پاکستانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی نے ملک شام کی Syrian Arab Airways کا ایک پورا جہاز بک کرا لیا تھا۔ میرے ہمسفروں میں سے اکثر میری طرح لمبی غیر حاضری کے بعد وطن جا رہے تھے، جہاں پر اس دوران میں ایوب خان نے عنانِ حکومت جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی "پاکستان پیپلز پارٹی" کے حامی جرمنی میں بھی پیدا ہو چکے تھے۔ انھی دنوں میں ڈاکٹر محمد امیر حسین ملک کی تحریک پر جرمنی بھر سے پاکستانی بون (Bonn) میں جمع ہوے تھے، جہاں پر میری صدارت میں اجلاس ہوا تھا، جس میں پاکستان میں جمہوری نظامِ حکومت قایم کیے جانے کے بارے میں قراردادیں پاس ہوئیں تھیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کے چھ نکاتی مطالبات کے حامی جرمنی میں بھی پائے جاتے تھے۔ عام طور سے یہ لوگ مشرقی پاکستان کے رہنے والے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے ایک نوجوان نے کہا کہ اسے کسی کو یہ بتاتے ہوے بے حد ندامت محسوس ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کا شہری ہے۔ جرمنی میں مقیم پاکستانیوں کی اکثریت کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اور ان کے نزدیک عوامی لیگ کے مطالبات درست نہ تھے۔ مگر عام طور سے لوگوں کو پاکستان کے حالات کی کچھ ایسی خبر نہ تھی۔ ہماری جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں پاکستان سے "ڈان" اور "مارننگ نیوز" دو انگریزی اخبار آتے تھے، جن کے مطالعے کے سبب مجھے کسی حد تک مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین پیدا ہو جانے والے معاشی اور معاشرتی بعد کا اندازہ تھا۔ مگر جو کچھ میں نے وہاں پر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کو شاید میں ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا اگر کوئی دوسرا شخص مجھے اس بارے میں بتاتا۔

اسلام آباد میں میری ملاقات "اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ" میں اپنے قدیمی نومسلم جرمن

دوست دتلف خالد (وہ بعض اوقات اپنا نام دطلف خالد بھی لکھتا تھا) سے ہوئی، جو "ایشیا فاؤنڈیشن" کے وظیفے پر آیا ہوا تھا۔ میرا تعارف اس کے ساتھ انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر صغیر حسین معصومی صاحب نے "مراکشی عالم" کہہ کر کرایا، جو جرمنی کی برلن یونیورسٹی سے احمد امین پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہیں۔ میں نے علیحدگی میں خالد سے پوچھا کہ یہ کیا کہانی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس نے اپنے آپ کو "مغربی" کہا تھا، کیونکہ وہ یورپ کا، گویا مغرب کا رہنے والا ہے۔ اگر ڈاکٹر معصومی (جن کو وہ "معدومی" کا نام دیتا تھا) نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ مراکو کا رہنے والا ہے تو اس میں اس کا بھلا کیا قصور ہے؟ میں نے کہا جہاں تک مجھے علم ہے تمھارا ڈاکٹریٹ کا مقالہ برلن یونیورسٹی نے نامنظور کر دیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ برلن یونیورسٹی میں اس کا واسطہ ایک متعصب پروفیسر سے پڑا تھا، جو ایک نومسلم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کے مقالے کا انگریزی ترجمہ انسٹیٹیوٹ کے رسالے "اسلامک اسٹڈیز" میں چھپ رہا ہے۔ اگر خالد نے آتے ہی انسٹیٹیوٹ میں یہ بات بتا دی ہوتی تو اس کو وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسی مقالے پر مل سکتی تھی۔ چونکہ ہیر پھیر کرنا اس کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس لیے اس سے یہ توقع رکھنا بیکار ہے کہ وہ کوئی کام درست طریق سے کرے گا۔ تھوڑا عرصہ پہلے اس کی جرمن بیوی اس کو چھوڑ کر جرمنی واپس لوٹ گئی تھی اور نوزائیدہ بچے ہارون کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں نے اس کی وجوہات کے بارے میں پوچھا تو خالد نے کہا کہ وہ اس کو اسلام آباد میں ویسی لگژری کی زندگی نہیں دے سکتا تھا جیسی اس کی ماں اسے برلن میں دے سکتی تھی، جس کی بوتیک خوب چلتی ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ اس کا اصل سبب یہ چیز بنی تھی کہ خالد نے مراکو کے سفارت خانے کے کسی ڈپلومیٹ کی ملازمہ پر ڈورے ڈال کر کسی مولوی سے اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا تھا۔ شاید وہ اس طرح اپنا رشتہ مراکو کے ساتھ پکا کرنا چاہتا تھا۔ پولیس نے لڑکی کو چار روز کی تلاش کے بعد برآمد کر لیا تھا۔ چونکہ سفارت خانہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بات کا چرچا اخباروں میں ہو اس لیے چپکے سے لڑکی کو مراکو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ خالد اس بات پر خوش تھا کہ اس کے خلاف درج کی جانے والی **FIR** واپس لے لی گئی تھی۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں جماعتِ احمدیہ کا سالانہ جلسہ ربوہ میں منعقد ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ قدیمی دوستوں سے ملنے کا اچھا موقع ہے۔ تاہم مجھے پتا تھا کہ لوگ وہاں پر مجھ سے سرِعام ملنے سے کترائیں گے۔ چنانچہ بے شمار لوگوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ البتہ جامعہ احمدیہ کے وائس پرنسپل ملک سیف الرحمٰن نے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ مرزا حنیف احمد نے بھی ناشتے پر بلایا۔ مگر جب میں مقررہ وقت پر آٹھ بجے پہنچا تو موصوف ابھی نیند سے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ مرزا رفیق احمد نے مجھے

سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا۔ کار رکوا کر اترا اور گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ پھر اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ گھر میں تاش کی بازی چل رہی ہے۔ مجھے اپنے باغ کے ایک کنج میں لے جا کر بٹھایا۔ مگر آدھ گھنٹے میں ہی ملازم بیگم صاحبہ کا پیغام لے کر آ گیا کہ ان کے بغیر تاش کی بازی رکی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا جرمنی کے کسی کاروباری سے رابطہ کرادوں، جس کے ساتھ وہ تجارت کر سکے۔ اتفاق سے مجھے ایک کمپنی کا پتا تھا جو پاکستان سے جوار کی فصل درآمد کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ میں نے مرزا رفیق احمد کو کہا موقع اچھا ہے، تم اپنی زمینوں میں جوار بونی شروع کر دو۔ وہ مجھے اپنا پارٹنر بنانا چاہتا تھا مگر میں اس کے ساتھ تجارتی اشتراک کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں اس کی متلون مزاجی کو جانتا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ اس کی تجارت جرمن کمپنی کے ساتھ بہت دنوں نہ چل سکے گی۔ مرزا خلیل احمد کی کوٹھی بن چکی تھی اور اس کی دوسری شادی بھی ہو گئی تھی۔ میں اس کے گھر پر پہنچا تو وہ بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ میں نے کہا یہ بھی خوب رہی۔ جب میں نو برس قبل گیا تھا تو تم کو چائے پیتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ اور اب اتنے دنوں کے بعد لوٹا ہوں اور تم چائے کی پیالی کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھے ہو۔ گھر سے باہر نکل کر دیکھو دنیا بدل چکی ہے۔ میں نے اس سے ملتی جلتی بات مرزا حنیف احمد سے بھی کہی تھی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ اسے ربوہ سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی زمینوں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ باہر تو وہ لوگ جائیں جنھوں نے نوکری کرنی ہے۔ سنا تھا کہ "خاندانِ نبوت" کے افراد کو جماعت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے جو اس آمدنی کے علاوہ ہوتا ہے جو وہ خود پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی نے اپنے گھر پر ایک مشاعرہ منعقد کرایا، جس میں جلسہ پر آئے ہوئے تمام معروف احمدی شعراء کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں بھی وہاں پر موجود تھا مگر ہر کوئی ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کرنے سے گھبراتا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا مشاعرہ سنتا رہا۔ حاضرین نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ دوسرے یا تیسرے روز میں وکیل التعلیم کے دفتر میں یہ پوچھنے کے لیے گیا کہ مجھے کب تک جامعۃ المبشرین کا فائنل امتحان "شاہد" پاس کرنے کی سند جاری کی جائے گی، جس کے لیے میں نے بہت دنوں سے درخواست دے رکھی تھی۔ یہ عہدہ اس زمانے میں سابق مبلغ مغربی افریقہ نسیم سیفی کے پاس تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر اور نفیس انسان تھے۔ آگے چل کر ان کو جماعتِ احمدیہ کے روزنامہ "الفضل" کا مدیر مقرر کیا گیا تھا۔ اس روز وہ پرویز پروازی کے گھر پر ہونے والے مشاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے معذرت چاہی کہ انھوں نے اس روز دوسروں کی دیکھا دیکھی مجھ سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے میں شامل ہونے والے سب شاعروں کو پتا تھا کہ میں کون ہوں مگر سبھی مجھ سے مصافحہ کرنے سے گھبراتے تھے کہ کہیں ان پر حرف نہ آ جائے۔

جہاں تک "شاہد" کی سند کا سوال تھا، وہ مجھے یہ سند جاری کرنے کے حق میں تھے۔ انھوں نے ایک فائل کھول کر مجھے سند دکھائی جوان کے کہنے پر تیار کی گئی تھی مگر اس کو جاری کرنے کے لیے ان کو جماعتِ احمدیہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد کی منظوری درکار تھی۔ جب متعلقہ فائل موصوف کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے اپنے قلم سے اس پر لکھا کہ سند جاری نہ کی جائے۔ انھوں نے مجھے وہ کاغذ دکھایا، جس پر یہ فقرہ درج تھا۔ مجھے اس سند کی ضرورت اس لیے تھی کہ جرمنی میں ہر کارکن کو اپنی نوجوانی کے ہر سال کے بارے میں دستاویزی ثبوت پیش کرنا ہوتا ہے، جس سے ثابت کیا جاسکے کہ اس نے وہ سال کہاں پر تعلیم حاصل کرنے میں یا کوئی پیشہ سیکھنے کے لیے ٹریننگ لیتے ہوئے گزارے تھے۔ پھر یہ ثبوت مہیا کرنا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے تعلیمی کورس کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ پنشن کے لیے صرف ان برسوں کا شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں کاغذی ثبوت مہیا کیا جاسکے۔ میرے پاس یونیورسٹی کی ڈگریاں تو موجود تھیں مگر جامعۃ المبشرین میں گزارے ہوئے تین برسوں کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہ تھا۔ میں نے اس بارے میں برسوں کے بعد چوتھے خلیفہ مرزا طاہر احمد کو لکھا، جس میں بین السطور یہ بات واضح کی گئی تھی کہ اگر مجھے سند جاری نہ کی گئی تو میں اس سلسلے میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ مجھے اس اقدام پر مجبور نہیں کریں گے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور مجھے سند جاری کر دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ جامعۃ احمدیہ کے پرنسپل میر محمود احمد ناصر نے، جن کے ساتھ میری ملاقات اسپین کے ایک سفر کے دوران ہو چکی تھی، جو اس زمانے میں وہاں پر مبلغ تھے، انھیں سند جاری کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ اس ملاقات کا حال دوسری جگہ پر درج ہوگا۔

پاکستان کونسل کے زیرِ اہتمام میری تقریر راولپنڈی میں ہوئی، جس کی صدارت ڈاکٹر صغیر حسین معصومی نے کی۔ تقریر کا موضوع "یورپ میں اسلام" تھا۔ مجھے خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے۔ مگر جب میں ڈھاکہ میں تقریر کرنے کے لیے پہنچا، تو خود پاکستان کونسل کے نمائندے کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ یورپ میں عوامی لیگ کے موقف کے بارے میں سیاسی حلقوں کی رائے کیا ہے۔ صدارت کے لیے ابوالہاشم کو دعوت دی گئی تھی جو پرانے مسلم لیگی تھے۔ ان کی آنکھیں جواب دے گئی تھیں مگر تحریکِ پاکستان کے لیے ان کا جوش وخروش بدستور موجود تھا۔ ان کے صدارتی ریمارکس عوامی لیگ کے خلاف تھے۔ انھوں نے کھل کر کہا کہ اگر عوامی لیگ کے چھ نکات کو تسلیم کر لیا گیا تو پاکستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ چند نوجوانوں نے ان کے خیالات کو چیلنج کیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ ابوالہاشم صاحب کی سابقہ ملی خدمات کی قدر کرتے ہیں۔ اس ماحول میں میری تقریر بھلا کیسے غیر سیاسی ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پروگرام میں مقرر شدہ دو گھنٹوں کی

بجائے ہم لوگ چار گھنٹوں تک بحث مباحثے میں مشغول رہے۔

تیسری تقریر چٹا گانگ میں رکھی گئی تھی، جہاں پر عوامی لیگ کے حامیوں کی تعداد حاضرین میں اچھی خاصی تھی۔ البتہ انھوں نے ڈھاکہ کے طالب علموں کی طرح جارحانہ رویہ اختیار نہ کیا۔ وہاں پر گفتگو بہت حد تک مثبت انداز میں ہوئی۔ لیکچر ہال کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے ایک اچکن پوش صاحب میری توجہ کا مرکز بنے۔ ان کا اندازِ گفتگو بے حد سلجھا ہوا تھا اور ملکی اور بین الاقوامی حالات پر ان کی نظر گہری تھی۔ میں نے سوالات و جوابات کے سیشن میں محسوس کیا کہ ہماری سوچ بہت ملتی جلتی ہے۔ چائے کے وقفے میں ہم ایک دوسرے کے اور بھی زیادہ قریب آ گئے۔ اجلاس کے اختتام پر انھوں نے مجھے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی، جہاں پر میری ملاقات محمد موسیٰ عارف کی اہلیہ نیر جہاں اور ان کی تین بچیوں سے ہوئی۔ یہ وہی آپا نیر جہاں ہیں، جو اب لاس انجلیز میں رہتی ہیں اور ان کا قایم کردہ "اردو مرکز" مغرب میں اردو ادب کی ترویج کا اہم ادارہ بن چکا ہے۔ جرمنی لوٹنے کے بعد عارف صاحب سے مراسلت کا سلسلہ قایم رہا اور جب مجھے دس ماہ کے بعد پھر ایک بار مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے لکھا کہ آپ چٹا گانگ ضرور آئیں۔ اس سفر کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

ملک کے دونوں حصوں میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں معاشی اور معاشرتی ترقی کی رفتار سابقہ ۲۳ برسوں میں اس درجہ متفاوت رہی تھی کہ وہ دو مختلف ملک لگتے تھے۔ سارے ڈھاکہ میں مجھے ایک بھی ٹیکسی نظر نہ آئی تھی۔ وہاں پر اس زمانے میں ابھی موٹر رکشا بھی نہیں آیا تھا۔ اس شہر میں صرف سائیکل رکشا ملتا تھا۔ عوام کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ جب کہ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے شہروں میں لوئر مڈل کلاس کے پیدا ہونے کے آثار دیکھنے میں آتے تھے۔ ٹیلی فون ابھی یہاں پر بھی سب گھروں میں نہیں لگے تھے، مگر جس کو دیکھو وہ ٹیلی فون کرتا نظر آتا تھا۔ سب لوگ کسی نہ کسی شخص کو جانتے تھے، جو کسی ٹیلی فون ایکسچینج میں کام کرتا تھا اور مفت میں ان کی بات کرا سکتا تھا۔ آپا نصیرہ کے ہمسایوں کے گھر پر فون لگا ہوا تھا، جس کی غیر سرکاری ایکسٹنشن آپا نے لگا رکھی تھی۔ چونکہ اس آلے کی گھنٹی نہیں بجتی تھی اس لیے جب آپا کے لیے فون آتا تھا تو ہمسائے دیوار کے اوپر سے آواز دے دیتے تھے کہ آپ کا فون آیا ہے۔ اکا دکا گھرانوں میں سیکنڈ ہینڈ کاریں بھی آ چکی تھیں جب کہ مشرقی پاکستان میں جس کسی کے پاس سائیکل ہوتی تھی اس کا شمار رئیسوں میں ہوتا تھا۔

"سیرین عرب ایرویز"، جس میں ہم سفر کر رہے تھے، آتے اور جاتے ہوئے دمشق میں رکتی تھی۔ پاکستان جاتے ہوئے وہاں پر ہمارا قیام صرف چند گھنٹوں کا تھا، مگر واپسی کے سفر پر ہمیں اگلی فلائیٹ تیسرے روز جا کر ملنی تھی۔ میں نے ایک ٹورسٹ ایجنسی سے جا کر بات کی اور ان کے ساتھ طے کیا کہ وہ

ہمارے گروپ کو دمشق کی سیر کرا دیں۔ گائیڈ نے پانچ گھنٹوں میں ہمیں اہم مقامات دکھائے۔ اگلے روز کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں نے سویرے سویرے جرمن سفارت خانے میں فون کیا، تو قایم مقام سفیر ڈاکٹر ایرنسٹ (Dr. Ernst) نے خود فون اٹھایا۔ انھیں یاد تھا کہ جب ان کی دمشق میں تقرری ہوئی تو وہ بریفنگ کے لیے جرمن اور رینٹ انسٹیٹیوٹ میں آئے تھے اور ہمارا آپس میں تعارف ہوا تھا۔ انھوں نے میرا نام سنتے ہی کہا: "آپ کہاں پر ہیں؟ میں ابھی فلاں ریستوراں میں ناشتہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ وہاں آ جائیں۔ مگر ٹھہریں، آپ کہاں اس ریستوراں کو تلاش کرتے پھریں گے۔ میں آپکے ہوٹل میں ٹیکسی بھیج رہا ہوں۔ ڈرائیور آپ کو وہاں پر لے آئے گا۔" اس زمانے میں جرمنی اور شام کے سفارتی تعلقات منقطع تھے۔ فرانس کا سفارت خانہ جرمنی کے معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔ جرمن سفارت خانے کا عملہ واپس بلا لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایرنسٹ ان دنوں اکیلے وہاں پر ہوتے تھے۔ میں ریستوراں میں پہنچا تو ڈاکٹر ایرنسٹ نے ٹیکسی کو رکوا لیا۔ انھوں نے جاننا چاہا کہ میں نے دمشق کے کون کون سے تاریخی آثار دیکھ لیے ہیں۔ تفصیل سننے کے بعد انھوں نے کہا: "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتا ہوں، وہ آپ کو باقی کے تمام اہم مقامات دکھانے کے لیے لے جائے گا۔ آپ اس ٹیکسی کو بلا کھٹکے شام تک اپنے پاس رکھیں۔ اس پر اٹھنے والے تمام اخراجات میں ادا کروں گا۔ میں آپ کو جرمن سفارت خانے کا سرکاری مہمان قرار دیتا ہوں۔ شام کا کھانا ہم چھ بجے اسی ریستوراں میں اکٹھے کھائیں گے۔" اس طرح مجھے دمشق شہر اور گرد و نواح میں واقع اہم تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ سب سے آخر میں ٹیکسی ڈرائیور مجھے مشہور صوفی ابنِ عربیؒ کے مزار پر لے گیا، جہاں پر جانے اور فاتحہ پڑھنے کی خواہش اس وقت سے میرے دل میں پنپ رہی تھی، جب ان کی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" کا اردو ترجمہ میں نے پڑھا تھا، جو میرے دادا جان مولوی محمد فضل خان نے کیا تھا۔ اس کی جلدوں کا ہمارے گھر میں ڈھیر لگا ہوا تھا۔

میں نے بچپن میں قادیان کے قیام کے دوران ایک شامی شخص کو دیکھا تھا، جو سرخ طربوش پہنتا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دمشق کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام منیر الحصنی تھا۔ وہ کئی ماہ تک قادیان میں مقیم رہا تھا۔ اب چونکہ میں اس کے شہر میں تھا اس لیے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے تلاش کروں۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے خاندان کے افراد کی دکانیں سوق مدحت باشا میں تھیں۔ شام کے وقت میں نے بازار میں جا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ منٹوں کے اندر مجھے اس کے عزیزوں کی دکان پر پہنچا دیا گیا۔ وہ لوگ مجھے اس کے مکان پر چھوڑ آئے جو شہر کی قدیمی آبادی میں تھا۔ وہاں پر اس وقت جماعتِ احمدیہ دمشق کے پندرہ بیس افراد نماز باجماعت پڑھنے کے لیے جمع تھے۔ منیر الحصنی نے، جو تھوڑی بہت اردو جانتے تھے، مجھے اپنے دیوان خانے میں لے جا کر بٹھایا جس کے نقش و نگار کے بارے

میں بتایا گیا کہ وہ سات سو سال پرانے ہیں۔ الحصنی دمشق کا ایک معزز علمی خاندان ہے جو سات آٹھ سو سال قبل ماوراء النہر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ ان کا خاندانی کتب خانہ بہت بڑا تھا۔

میرا تعارف وہاں پر ایک پاکستانی نوجوان مرزا منصور احمد سے ہوا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ جماعتِ احمدیہ پنجاب کے صدر مرزا عبدالحق کا بیٹا ہے۔ وہ جامعہ احمدیہ کا فارغ التحصیل تھا اور عربی کی مزید تعلیم کی خاطر شام آیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جماعت احمدیہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ایک نے اپنے بیٹے کی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کی تھی وگرنہ عام طور سے واقفینِ زندگی عامیوں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ منصور احمد مجھے ہوٹل تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کا اپنے باپ کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا۔ اس نے باپ کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ اس کو جماعت کا مبلغ بنانا چاہتا ہے، تو اسے اس کے مالی مستقبل کو مضبوط بنانے کے لیے اپنی ساری جائیداد اس کے نام کرنی ہوگی۔ جب تک یہ بات طے نہیں ہو جاتی وہ اپنی عربی تعلیم کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھوڑے عرصہ تک قاہرہ جانے کا تھا جہاں پر وہ الازہر یونیورسٹی میں داخلہ لے گا۔ وہ میرے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ رکھنا چاہتا ہے، اس لیے اس نے مجھے قاہرہ میں جماعتِ احمدیہ کے صدر الاستاذ محمد البسیونی کا پتا دیا، جن کی معرفت اسے وہاں پر خط مل جایا کریں گے۔

تہران میں سمینار

مجھے جرمنی واپس لوٹے دو تین ماہ ہی ہوے تھے کہ اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے برائے صنعتی ترقی یونیڈو (UNIDO) کی طرف سے ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء کو تہران میں منعقد ہونے والے ایک سمینار میں بطور ایکسپرٹ ایڈوائزر شامل ہونے کی دعوت آ گئی۔ یہ سمینار ایشیائی ممالک کے صنعتی ڈاکومنٹیشن سنٹروں کے عہدے داروں کے لیے تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر تہران تک جانا ہے تو کیوں نہ دوسری بار پاکستان کا ایک چکر لگا لیا جائے۔ جرمن حکومت کا ایک ادارہ پاکستان میں لائبریریوں کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ انھوں نے مجھے اس بارے میں ایک جائزہ لینے کے لیے کہا۔ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کراچی اور ڈھاکہ نے مجھے اپنے ہاں لیکچر دینے کی دعوت دے دی۔ چٹاگانگ تو خیر مجھے عارف صاحب سے کیے ہوے وعدے کے مطابق جانا ہی تھا۔

اس زمانے میں مشرقی جرمنی کی ایرلائنز انٹر فلوگ (Inter-Flug) کا ٹکٹ بہت سستا ملتا تھا۔ البتہ ان کی سروس تہران نہیں جاتی تھی، جہاں پر مجھے پندرہ روز تک ٹھہرنا تھا۔ ان کی ایجنسی نے میرے

لیے جو روٹ بنایا وہ بہت دلچسپ تھا۔ میرا پہلا پڑاؤ بیروت تھا، جہاں پر ایک روز کے قیام کے بعد مجھے جاپان ایر لائنز تہران لے جائے گی اور ایران میں سمینار کے خاتمے پر افغان ایر لائنز کے ذریعے میں کابل پہنچوں گا۔ وہاں پر بھی میں ہفتہ بھر رکنا چاہتا تھا۔ چونکہ آپا نصیرہ اور بھائی عزیز اس زمانے میں وارسک میں مقیم تھے، جو افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر واقع ہے، اس لیے میرا ارادہ کابل سے بس میں پشاور جانے کا تھا۔ میری واپسی بھی کابل کے راستے ہونی تھی، البتہ سویت یونین کی ایر لائنز آ ایرو فلوٹ (Aeroflot) کے ذریعے، جو مجھے کابل سے ماسکو لے جائے گی۔ وہاں سے آگے برلن کے لیے مجھے پھر ایک بار انٹرفلوگ لینی تھی، جو مجھے مشرقی برلن پہنچائے گی۔

بیروت کے ہوائی اڈے پر میرا یونیورسٹی کے زمانے کا ہم سبق اور کولیگ ڈاکٹر ویرنر اینڈے (Werner Ende)، جسکا شمار آج کل اہم ترین مستشرقین میں ہوتا ہے، مجھے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ اس زمانے میں جرمن مستشرقین کی طرف سے اس شہر میں قایم کردہ اورینٹ انسٹیٹیوٹ کے اسٹاف پر تھا۔ اس نے میری رہائش کا انتظام اسی ادارے کے مہمان خانے میں کرا رکھا تھا۔ وہاں پر ہماری ہمبرگ کی انسٹیٹیوٹ کا بھی ایک کارکن فولکہارڈ ونڈفوہر (Volkhard Windfuhr) ہوتا تھا جو آگے چل کر جرمنی کے مشہورِ عالم رسالے ڈیر شپیگل (Der Spiegel) کا مصر میں نمائندہ بنا اور آج تک اسی سلسلے میں قاہرہ میں مقیم ہے۔ دونوں نے مجھے بیروت کی سیر کرائی اور میری ملاقات اس شہر کے بہت سے اہم لوگوں سے کرائی، جن میں انسٹیٹیوٹ کے ممبروں کے علاوہ لبنانی شاعر و ادیب بھی شامل تھے۔

تہران میں چونکہ منتظمینِ سمینار کو اطلاع نہ تھی کہ میں کب اور کس فلائیٹ سے آ رہا ہوں اس لیے کوئی مجھے لینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ آگے چل کر پتا چلا کہ اسی میں بہتری تھی کیونکہ سمینار میں شامل ہونے والوں کو شہر سے بیس کلو میٹر باہر نمائش گاہ کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا، جہاں سے ہر روز شہر آنا جانا دشوار تھا، جب کہ میرا ارادہ اندرون شہر میں ٹھہرنے کا تھا تاکہ فرصت کے اوقات میں شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھوموں پھروں اور تہران کے باسیوں کی زندگی کو قریب سے دیکھوں۔ میرے پاس "جرمن ہوٹل" کا پتا موجود تھا جو عین شہر کے اندر واقع تھا۔ منتظمینِ سمینار کو میں نے اگلے روز اپنی رہائش گاہ کے بارے میں بتایا۔ ان کے ساتھ یہ طے پایا کہ ان کا ڈرائیور مجھے ہر روز وہاں سے آ کر لے جائے گا اور سمینار کے اجلاس کے خاتمے پر واپس چھوڑ جائے گا۔ مجھے علم نہیں کہ دوسرے شرکاءِ سمینار فرصت کے اوقات میں کیا کرتے تھے۔ میرا وقت شہر کے بازاروں، گلیوں، مسجدوں اور مدرسوں کی سیاحت میں گزرتا تھا۔ مجھے فارسی بولنے کی کچھ ایسی مشق نہ تھی البتہ میں لوگوں کی باتیں خوب سمجھتا تھا۔ اس کا سبب یہ امر تھا کہ میرا فارسی کا استاد ڈاکٹر عبدالجواد فلاطوری ہمیں تہران کے لہجے میں پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے روز

میں بھی تہرانیوں کی طرح فارسی بولنے لگ گیا۔ایک روز ایک دکان میں پرانی کتابوں کے اوراق دیکھنے کا اتفاق ہوا، جن پر بہت عمدہ تصویریں بنی ہوئی تھی۔ میں نے ان تصویروں کا متن کے ساتھ مقابلہ کیا تو پتا چلا کہ ان کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ دکاندار ان تصویروں کو قدیمی کتابوں کے مصور اوراق بتا کر بیچ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اس مصور سے مل کر اس کے آرٹ کی داد دینی چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ کئی صدیاں قبل وفات پا چکا ہے۔ میں نے اسے اس صفحے پر لکھے ہوے متن کا ایک حصہ سنا کر کہا کہ اس کا اس تصویر کے ساتھ اگر کوئی جوڑ ہو تو مجھے سمجھائے۔ اس پر وہ مسکرا دیا اور اس نے کہا کہ مصور ایک نوجوان شخص ہے جو تہران میں ہی رہتا ہے۔ وہ ہر ہفتے دو تین درجن تصویریں بنا کر اس کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ٹورسٹ ان کو بہت شوق سے خریدتے اور منہ مانگے دام ادا کرتے ہیں۔

سمینار کا پروگرام یونیڈو کی طرف بھیجے گئے چاروں ماہرین باری باری چلاتے تھے۔ جب کہ ایرانی حکومت کی طرف سے وزیرِ صنعت کو خصوصی نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے ہم چاروں کو ایک شام اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ ان کی کوٹھی شاہی محل کے پہلو میں تھی، جس کے آس پاس کوئی پرندہ تک نہ پھٹک سکتا تھا۔ ہمیں حکومت کی خاص گاڑی ہوٹل سے لینے کے لیے آئی اور دعوت کے اختتام پر واپس چھوڑ گئی۔ وزیرِ صنعت لمبے عرصے تک امریکہ میں مقیم رہے تھے اور ایک امریکی خاتون کے ساتھ بیاہے ہوے تھے۔ اس زمانے میں ایران صنعتی میدان میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، جس کے سبب اس کو تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ایک مثالی ملک قرار دیا جاتا تھا۔ وزیرِ صنعت اس بات پر بے حد فخر مند تھے ۔ انھوں نے کہا کہ جب آپ لوگ اگلی بار ایران لوٹ کر آئیں گے تو اس ملک میں آنے والے صنعتی انقلاب کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ اسی دہائی کے اواخر تک ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہونے والا تھا۔

سمینار معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ شرکاء اپنے اپنے ملک کی حکومت کی صنعتی پالیسی کے حق میں بیانات دے رہے تھے۔ صرف تھائی لینڈ کا وفد نہیں پہنچا تھا، جس کے سبب اس ملک کے سفارت خانے کا ایک کارکن اپنے ملک کی نمائندگی کر رہا تھا۔ تیسرے یا چوتھے روز ان کا وفد بالآخر آن پہنچا، جس کی قیادت وزیرِ صنعت خود کر رہے تھے۔ ان کے پہلو میں ایک قیامت خیز حسینہ بیٹھی ہوئی تھی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ان کی سیکرٹری ہے۔ اس جیسی خوبصورت عورت میں نے اس سے پہلے یا اس کے بعد نہیں دیکھی۔ دونوں صرف دو روز کے بعد آگے لندن چلے گئے۔ سمینار میں شرکت یورپ کی سیاحت کا محض ایک بہانہ تھی۔

سمینار کے بعد مجھے مزید ایک ہفتہ تہران میں ٹھہرنا تھا۔ میرے ہوٹل میں نارتھ آئرلینڈ کی ایک

حسینہ ٹھہری ہوئی تھی جس کے ناشتہ کرنے کے اوقات وہی تھے جو میرے تھے۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ کیوں نہ شہر کی آوارہ گردی بھی مل کر کی جائے۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ اسے گھر سے نکلے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے، جس کے دوران وہ ہندو پاک کی سیاحت کرنے کے بعد مہینہ بھر افغانستان میں رہی تھی۔ ایک روز کابل شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے اسے حاجت رفع کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ مل پائی۔ اس نے ہمت کر کے ایک گھر کا دروازہ جا کر کھٹکھٹایا۔ گھر والوں نے اس کا نہایت دوستانہ رنگ میں استقبال کیا اور اپنا پاخانہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ جب وہ فارغ ہو کر جانے لگی تو انھوں نے اسے کھانا کھانے کے لیے ٹھہرنے کو کہا، مگر اس نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ وہ بے شک ان کے میز پر دھرے ہوئے پھلوں میں سے اپنی پسند کا پھل ساتھ لیتی جائے۔ اس نے ایک پھل اٹھالیا جس سے وہ بالکل ناواقف تھی۔ پھر گھر والوں کے سامنے وہ پھل کھا گئی جس کا مزہ بہت کسیلا سا تھا۔ اس میں ذرہ بھر مٹھاس نہ تھی مگر وہ اپنے اوپر جبر کر کے پورا پھل کھا گئی۔ بعد میں اسے کسی نے بتایا کہ وہ پھل کی بجائے اس روز ایک ترکاری کھا گئی تھی جس کا نام بینگن ہے اور جو کچا نہیں کھایا جاتا۔ اس نے بتایا کہ اس روز سے اسے پیچش لگی ہوئی تھی جس سے اس کا چھٹکارا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے سے ڈرتی تھی کہ خدا جانے وہ کتنے پیسے مانگے گا۔ میں اصرار کر کے اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے دوائی دی اور فیس لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔

تہران اس زمانے میں بھی بہت فیشن ایبل شہر تھا۔ انگریزی سے زیادہ وہاں پر فرانسیسی چلتی تھی۔ گاہے بگاہے جرمن جاننے والے لوگ بھی مل جاتے تھے۔ اگر ایک طرف عورتیں اپنے ملکی لباس میں نظر آتی تھیں تو دوسری طرف ان عورتوں کی بھی کمی نہ تھی جو یورپ کے تازہ ترین فیشن میں ملبوس ہوتی تھیں۔ پھر ایک تیسری قسم ان عورتوں کی دیکھنے میں آتی تھی، جو اپنے لباس کے اوپر سفید یا کالی چادر اوڑھ کر نکلتی تھیں۔ بعض اوقات چادر کے نیچے سے انسان ان کے فیشن ایبل کپڑے دیکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں یورپ میں منی اسکرٹ کا رواج نیا نیا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بعض اوقات نوجوان لڑکیوں کی چادر میں سے چھنتا ہوا منی اسکرٹ دیکھا جا سکتا تھا۔

شراب کا عام رواج دیکھنے میں آتا تھا۔ ملک میں بیئر بنانے کا کارخانہ کسی جرمن نے لگایا تھا۔ اس کی بیئر کے اشتہار دیواروں پر جگہ جگہ دیکھے جا سکتے تھے۔ پھر سہ پہر کے وقت سڑکوں پر نوجوان ٹولیوں کی صورت میں نکلتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بیئر کی بوتلیں دکھائی دیتی تھیں۔ جتنے دنوں تک میں وہاں رہا ہر روز کسی نہ کسی بازار میں شراب کے نشے میں دھت آپس میں لڑتے ہوئے نوجوان دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایرانی اپنی شامیں اکثر باغوں میں گزارتے ہیں۔ پوری فیملی کھانے پینے کا ساز و سامان لے کر کسی باغیچے

میں جا کر بیٹھتی ہے۔ شام کا کھانا وہاں پر کھاتے ہیں اور دیر تک محفل لگاتے ہیں۔ لڑکے بالے آس پاس گھومتے پھرتے ہیں اور لڑکیوں کو تاڑتے ہیں۔ آنے جانے والوں کے درمیان بعض اوقات اکیلی دکیلی عورتیں بھی مل جاتی تھیں جو پاس سے گزرتے ہوئے پوچھ لیتی تھیں: "آغا صیغہ می کنی؟" (جناب کیا آپ متعہ کرنا پسند فرمائیں گے؟)

افغانستان میں چند روز

کابل کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال گونتھر کنابے (Günter Knabe) نے کیا، جو آج کل جرمن ریڈیو "ڈوئچے ویلے" (Deutsche Welle) کے ایشیائی پروگرام کا ڈائریکٹر ہے۔ وہ اس زمانے میں کابل یونیورسٹی میں اکنامکس پڑھاتا تھا۔ دراصل وہ کولون یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور جرمنی کی طرف سے ایڈورکر کی حیثیت سے کابل بھیجا گیا تھا۔ اس کی طرح جرمن طالب علموں کا ایک پورا گروپ کابل یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ ان کو چونکہ پشتو یا فارسی نہیں آتی تھی اس لیے ان کو مترجم رکھنے پڑتے تھے۔ گونتھر کی بیوی ایریکا (Erika) علم البشریات (Anthropology) کی طالبہ علم تھی اور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کر رہی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر پر ٹھہرایا، جہاں پر ایریکا کی سہیلی کارین (Karin) اور اس کا منگیتر یورگ (Jörg) بھی قیام پذیر تھے۔ دونوں ایک فولکس ویگن میں سفر کر رہے تھے، جس کی سیٹیں نکال دی گئی تھیں۔ اس طرح اگر انھیں راستے میں کہیں پر ہوٹل نہ ملتا تھا، تو وہ اسی کار میں شب بسری بھی کرتے تھے۔ میری آمد سے اگلے روز وہ لوگ بامیان جا رہے تھے، جہاں پر مہاتما بدھ کے دو بت کھڑے تھے، جن کو آگے چل کر طالبان نے توڑ دیا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی، جسے میں نے فوراً قبول کر لیا۔ ایسا موقع بھلا پھر کب ہاتھ آنا تھا۔ ان کا ارادہ بامیان سے آگے بند امیر نامی جھیل تک جانے کا تھا۔ راستے میں دوسری جھیلیں بھی آتی تھیں، جن کے بارے میں ہم نے سن رکھا تھا کہ ہر جھیل کے پانی کا رنگ الگ ہے۔ وہ بھی خوش تھے کہ انھیں ایک ساتھی مل گیا ہے، جو فارسی جانتا ہے۔ اس زمانے میں افغانستان میں انگریزی سے کام نہیں چلتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بازاروں میں اردو چل جاتی تھی۔ سکھ دکان داروں کے ساتھ تو خیر میں پنجابی میں بات کر لیتا تھا جو اس بات پر بہت خوش ہوتے تھے۔

کابل سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر پکی سڑک ختم ہو گئی۔ وہاں سے آگے کچی سڑک جاتی تھی، جو

پتھروں سے اٹی پڑی تھی۔ دراصل وہ گدھوں اور اونٹوں کے کاروانوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ دور دور تک ہماری کار کے سوا کوئی دوسری گاڑی نظر نہ آتی تھی۔ یورگ نے پٹرول کی ٹینکیاں بھر کر ساتھ رکھ لی تھیں۔ اس کے علاوہ ایریکا کی باورچن نے زادِ سفر کے طور پر کھانا پکا کر دیا تھا۔ ابلا ہوا پانی بھی ہم نے وافر مقدار میں بھر لیا تھا۔ گونتھر نے کہا تھا کہ تمھیں راستے میں سڑک کے کنارے چائے خانے ملیں گے، جہاں پر تم بلا خوف و خطر چائے پی سکتے ہو۔ یہ لوگ چائے کو صرف ابالتے ہی نہیں اس کو دیر تک جوش دیتے ہیں۔ مجھے یاد تھا کہ پاکستان میں پٹھان ڈرائیوروں کے لیے جو چائے بنائی جاتی تھی وہ " گولی مار چائے " کہلاتی تھی۔ البتہ اس میں پانی سے زیادہ دودھ ڈالا جاتا تھا۔ اس کو کم و بیش آدھ گھنٹے تک جوش دیا جاتا تھا۔ چار کونوں میں گڑے ہوئے بانسوں پر ایک ترپال ڈال کر اس کے سایے میں چھوٹا موٹا چولھا بنا کر ایک کیتلی آگ پر رکھنے سے چائے خانہ بن جاتا تھا۔ اکثر جگہوں پر کرسیاں یا میز رکھنے کا تکلف دیکھنے میں نہ آیا۔ گاہک آس پاس پڑے ہوئے پتھروں یا اینٹوں پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے اور سگریٹ سلگا لیتے تھے یا چائے خانے کے حقے پر سوٹا لگاتے تھے۔

راستے میں چھوٹے موٹے مکان، اکا دکا گاؤں اور قلعہ نما حویلیاں اس بات کا ثبوت مہیا کرتی تھیں کہ ہم ویرانے میں سے نہیں گزر رہے۔ کبھی کبھار کوئی کسان کھیتی میں کام کرتے ہوئے دکھائی دیتا تھا ۔ مگر قصبوں کا دور دور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ چرواہے البتہ اکثر مل جاتے تھے، جن کی بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ پہاڑوں کے آس پاس اگنے والے درختوں کا صفایا کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جو چیز ہمیں ہر موڑ پر نئے سرے سے حیران کر دیتی تھی وہ پہاڑوں کے نت نئے رنگ تھے۔ لگتا تھا کہ قدرت نے ان کے اتنے شیڈ بنا ڈالے ہیں کہ انسان ان کو گن بھی نہیں سکتا۔ پھر اِکا دُکی پہاڑوں کے درمیان پائی جانی والی وادیوں میں بہتی ہوئی ندیوں کے پانی کے سبب ہرے بھرے کھیت آ جاتے تھے۔ یہ نظارہ بھی عجیب تھا۔ دونوں طرف ہزاروں میٹر اونچے خشک پہاڑ اور ان کے قدموں میں سرسبز وادیاں، جہاں پر ہر قسم کے پھل دار پودے اگتے ہیں اور جملہ قسم کی ترکاریاں بوئی جاتی ہیں۔

ہم ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بامیان کی وادی کی طرف بڑھ رہے تھے جب اچانک ایک ویران شہر کے گرے ہوئے مکان اور فصیل کی دیواریں ہمارے سامنے آ گئیں۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کو قبرستان میں بدل دینے کا حکم چنگیز خان نے دیا تھا، جس کا پوتا شہر پر حملے کے دوران مارا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس شہر میں کوئی ذی نفس زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس دن سے اس کا نام "شہرِ غلغلہ" پڑ گیا ہے۔ یہ کشان شہر اپنے وقتوں میں بدھ مت کا مرکز تھا، جس کا ذکر چینی سیاح ہزوان تزنگ (Hsuan Tsang) نے کیا ہے، جو چھٹی صدی میں وہاں پر آیا تھا۔ شہر ایک پہاڑی پر آباد تھا، جس کے

قلعے کی فصیل اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔شہر پناہ میں داخلے کے گیٹ کے سامنے ایک چوبی پل بنا ہوا تھا ،جو شام پڑنے پر اور دشمن کے حملہ کے وقت اوپر کھینچ لیا جاتا تھا۔دوسری اطراف سے بھی قلعے میں داخلہ مشکل تھا۔کہتے ہیں کہ حملہ آوروں کے جاسوسوں کو اس چشمے کا پتا چل گیا تھا،جس کے پانی پر اس شہر کے باسیوں کا انحصار تھا۔اس میں زہر ڈال کر ان کو باہر نکلنے اور کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔چنگیز خان کی فوجوں نے شہر کو زیر کرنے کے بعد نہ صرف وہاں کے باسیوں کا قتلِ عام کیا بلکہ اس شہر کے جملہ مکانوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔یورگ پر اس ویران شہر کی کہانی نے ایسا اثر کیا کہ اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔وہ وہاں پر رکنا اور ماتم کرنا چاہتا تھا۔وہ کار کو ایک طرف کھڑا کر کے ایک مکان کے کھنڈر پر جا کر بیٹھ گیا۔کارین نے کہا کہ یورگ کا ڈپریشن تازہ ہو گیا ہے،اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ دیں۔ایک دو گھنٹوں میں اسکی طبیعت سنبھل جائے گی۔میں اس دوران میں کھنڈرات میں گھومتا پھرا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بعض مکانوں کی چھتیں گنبد نما تھیں اور ان کی محرابیں بدستور کھڑی تھیں۔دروازے کھڑکیاں لوگ نکال کر لے گئے تھے مگر پکی اینٹوں سے بنے ہوئے گنبد اپنی جگہ پر کھڑے تھے،جن میں سوراخ بنے ہوئے تھے جن میں سے چھن کر سورج کی شعاعیں کمروں کے اندر آتی تھیں۔اسی طرح تازہ ہوا کی آمد اور استعمال شدہ ہوا کی نکاسی کا انتظام دیکھا جا سکتا تھا۔مکانات کی طرزِ تعمیر سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہوگا۔

بامیان کی وادی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔گوتم بدھ کے دونوں بت، جو چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں،ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر علیحدہ علیحدہ کھڑے نظر آتے تھے۔اپنے عروج کے زمانے میں اس شہر کے روابط ایک طرف ہندوستان اور چین سے اور دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ قایم تھے۔عرب آج بھی بھنڈی توری کو "بامیان" کے نام سے پکارتے ہیں۔شاید یہ سبزی وہاں سے آئی تھی۔یہی نہیں عباسی خلافت کے زمانے میں بویا وزیروں کا خاندان، جو برمکی کہلاتا تھا، افغانستان کے شہر بلخ کا رہنے والا تھا، جو بامیان سے تھوڑے فاصلے پر پایا جاتا ہے۔وہ لوگ بدھ مت کے پیروکار تھے اور تجارت کے سلسلے میں بغداد میں جا کر آباد ہوئے تھے اور ملکی سیاست پر چھا گئے تھے۔یہاں تک کہ ملک کی وزارت ان کے قبضے میں آگئی تھی اور خلیفہِ وقت محض نام کا حاکم رہ گیا تھا۔خلیفہ مامون نے دھوکا دے کر سارے خاندان کو مروا ڈالا تھا، کیونکہ ان کا اثر رسوخ ملک میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ عباسی خلافت کی بقاء کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

آس پاس کے خشک ٹیلوں اور ان کے پیچھے پائے جانے والے پہاڑوں کے برعکس، جن پر کچھ نہیں اگتا، بامیان کی وادی کی سرسبزی انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔وادی کے بیچوں بیچ ایک ندی

بہتی ہے، جس کا پانی اس زرخیزی کا سبب ہے۔ بامیان کی موجودہ آبادی کا اگر "شہرِ غلغلہ" سے مقابلہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ انسانیت نے قدم آگے کی طرف نہیں بڑھایا بلکہ پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔ کہاں اس شہر کے پختہ مکانات اور کہاں ہمارے وقتوں کے بامیان کا واحد بازار اور اس کے پہلو میں آباد چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں۔ بازار میں ستر اسی یک منزلہ دکانیں تھیں جن میں ٹورسٹوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ ایک چائے خانے کی وساطت سے ہمیں رات بھر کے لیے ایک کمرے میں جگہ مل گئی، جس میں پہلے سے دو یورپین قیام پذیر تھے۔ انھوں نے ہمیں کھٹملوں سے ڈرایا مگر ہم تھکاوٹ سے چور تھے اور محاورے کے مطابق گھوڑے بیچ کر سوئے۔

دیکھنے کو تو ہم نے پہلی شام کو گوتم بدھ کے بتوں کو دیکھا تھا اور ان کے قد کاٹھ کو دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے تھے۔ بڑے بت کی اونچائی ۵۳ میٹر ہے اور چھوٹے کی ۳۸ میٹر، مگر جب ہم نے اگلے روز ان کو قریب سے جا کر دیکھا، تو یوں لگا جیسے ہم کسی ماڈرن دس پندرہ منزلہ اسکائی اسکریپر بلڈنگ کے پہلو میں کھڑے ہوں۔ ان بتوں کو بنانے کے لیے چٹان کو کاٹ کر ایک محراب بنائی گئی تھی، جس کے اندر بت کو تراشا گیا تھا۔ صرف ہاتھوں اور بعض دوسرے حصوں کے لیے لکڑی کا استعمال ہوا تھا ورنہ سارا بت پتھر سے بنا ہوا تھا۔ پہلے وقتوں میں دونوں بتوں کے چہروں کا بالائی نصف حصہ توڑ دیا گیا تھا۔ گویا ان کی آنکھیں اور ناکیں موجود نہیں تھیں۔ بتوں کے پہلو میں چٹان کو کاٹ کر بے شمار حجرے بنائے گئے ہیں، جن میں بھکشو رہا کرتے تھے۔ سرنگیں ان حجروں کو آپس میں ملاتی ہیں جن میں سے ایک راستہ زائرین کو بت کے سر پر پہنچا دیتا ہے۔ وہاں سے بامیان کی سرسبز وادی کا نظارہ بے حد دلکش ہے۔ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی وادی سرسبزی کا ایک لہلہاتا ہوا کھیت ہے، جس میں ہر قسم کے پودے اگتے ہیں۔ محراب کی دیواروں پر اب بھی نقش و نگار دیکھے جا سکتے ہیں۔ گمان کیا جاتا ہے کہ پہلے وقتوں میں پورا بت اسی طرح سجایا گیا تھا۔ اسی وجہ سے چینی سیاح ہزوان تزنگ نے گمان کیا تھا کہ بت سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر جگہوں پر سے نقش و نگار مٹ چکے ہیں بلکہ گزشتہ صدیوں کے دوران جگہ جگہ پر بت شکنوں نے اپنی کارگزاری سے بتوں کو نقصان پہنچایا تھا مگر بتوں کا مجسمہ بدستور کھڑا تھا۔ اس مجسمے کو تباہ کرنے کی "سعادت" طالبان کی حکومت کے حصے میں آئی، جس نے ۲۰۰۱ء کو دونوں تاریخی بتوں کو، جو دوسری اور تیسری صدی میں بنائے گئے تھے، ڈائنامیٹ سے اڑا دیا تھا۔ چونکہ ان بتوں کی پیمائش کا کام عرصہ ہوا ماہرینِ آثارِ قدیمہ کر چکے ہیں اور اس کی تصویریں اور فلمیں بنی ہوئی ہیں، اس لیے دونوں بتوں کو از سرِ نو بنائے جانے کی تجویز پر ان دنوں میں غور ہو رہا ہے۔ چین کا ایک کاروباری ان بتوں کی نقل بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، مگر وہ ان کو اپنے ملک چین میں بنائے گا۔ اسے پتا ہے کہ یہ چیز سیاحوں کے لیے اپنے اندر بہت

کشش رکھتی ہے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت یونیسکو کی مدد سے دونوں بتوں کو اپنے اصل مقام پر بنانے کا ارادہ رکھتی ہے مگر اس بات کا چرچا نہیں کیا جاتا کیونکہ خطرہ ہے کہ طالبان اس بات کو لے اڑیں گے اور حکومت کے خلاف استعمال کریں گے۔

وادیِ بامیان کی سیاحت کے بعد ہم بندامیر دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے، جو وہاں سے ۷۵ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے نام کی توضیح یہ کی جاتی ہے کہ حضرت علیؓ وہاں پر تشریف لائے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک بارگاہ بنی ہوئی ہے، جہاں پر لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔ دراصل بندامیر چھ جھیلوں (بند ہیبت، بند پنیر، بند پودینہ، بند قنبر، بند غلاماں اور بند ذوالفقار) کے ایک پورے سلسلے کا نام ہے جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ بندامیر ایک قدرتی ڈیم ہے، جس کے پانی میں پائی جانے والی کلشیم کاربونیٹ جمتی اور ایک فصیل جیسی دیوار بناتی چلی جاتی ہیں۔ یہ عمل ہزاروں سال سے جاری ہے، جس کے سبب جھیل کا ساحل بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ پانی چھلک کر دیوار کے اوپر سے گرتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پہاڑیوں سے گھرے ہوئے کھلے میدان کے ایک حصے میں پانی سے لبا لب بھرے ہوئے کٹورے کی طرح ایک جھیل پائی جاتی ہو، جس کا کنارہ دس بارہ میٹر اونچا بنا ہوا ہو۔ اگر یہ فصیل توڑ دی جائے یا اس میں سوراخ کر دیا جائے تو سارا پانی ڈھلوان میں بہہ جائے گا۔ آگے چل کر میں نے ایسا نظارہ ترکی میں پامکلے کے مقام پر دیکھا جس کے چشمے سے نکلنے والے گرم پانی میں پایا جانے والا چونا ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے جم جاتا ہے اور دہانہ بلند تر ہوتا ہوا ایک پہاڑی کی صورت اختیار کر گیا ہے

پاکستان کا دوسرا سفر

مجھے کابل سے پشاور جانے کے لیے بس ملی، جس کو ڈی لکس کا نام دیا جاتا تھا، مگر جس کی حالت خاصی قابلِ رحم تھی اور افغانستان کو پاکستان سے ملانے والی سڑک پختہ کہلاتی تھی مگر بہت ناپختہ تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم شام پڑنے تک صحیح سلامت پشاور پہنچ جائیں گے۔ مجھے اطمینان دلانے کے لیے ڈرائیور نے کہا: "بائی ساب ہم یہ سفر روز کرتا ہے۔ اگر راستے میں کچھ ہو جاتا ہے تو ہمارا افغان بائی ہمارا مدد کرتا ہے۔" اور ہم سچ مچ شام تک پشاور میں تھے، جہاں سے مجھے ورسک جانے والی بس بھی مل گئی۔

پاکستان میں انتخابات متوقع تھے اور ملک بھر میں خوب گہما گہمی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ مغربی پاکستان میں لوگوں کو احساس نہیں تھا کہ ملک کی سلامتی خطرے میں تھی۔ "پاکستان پیپلز پارٹی" اور بالخصوص

ذوالفقار علی بھٹو کی عوام میں ہر دل عزیزی کے پیشِ نظر سیاسی مدبر کھلم کھلا کہہ رہے تھے کہ انتخابات میں ان کی جیت کو روکا نہیں جا سکتا۔ جب میں نے جاننا چاہا کہ کیا پی پی کو مشرقی پاکستان میں بھی ووٹ ملیں گے؟ تو کہا گیا کہ انتخابات آنے تک صورتِ حال بدل جائے گی۔

مگر جب میں گوئٹے انسٹیٹیوٹ ڈھاکہ میں تقریر کرنے کے لیے پہنچا اور وہاں کے سیاسی پنڈتوں سے بات ہوئی، تو مجھے اندازہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے سوا کسی دوسری سیاسی پارٹی کے جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری تقریر جرمنی میں اسلامک اسٹڈیز کے بارے میں تھی مگر سامعین کو اس سے زیادہ یہ جاننے کا شوق تھا کہ عوامی لیگ کے منشور کے بارے میں میری رائے کیا تھی۔ ان کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ پنجابیوں نے پاکستان پر قبضہ جما رکھا ہے اور جب تک اس چیز کا قلع قمع نہ کیا گیا مشرقی پاکستان کو اس کے جائز حقوق نہ مل سکیں گے۔ ملک کے دونوں حصوں کی معاشی ترقی میں پیدا ہو جانے والے تفاوت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ مجھے اس چیز کا احساس اپنے سابقہ سفر کے دوران ہو گیا تھا۔ میں چونکہ لیکچر ہال میں اکیلا مغربی پاکستانی تھا اس لیے یہ باتیں مجھے سنائی جا رہی تھیں۔ جب شام کے وقت گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر کے گھر پر ایک محفلِ طعام میرے اعزاز میں منعقد ہوئی تو بہت سے مغربی پاکستانی وہاں پر موجود تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ انتخابات آنے تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے کہا گیا کہ آپ بہت دور رہتے ہیں اس لیے یہاں کے حالات کو سمجھ نہیں سکتے، ہمیں پتا ہے کہ مشرقی پاکستانیوں کو جوتی کہاں پر چبھتی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔

چٹاگانگ میں عارف صاحب نے بتایا کہ وہاں پر رہنے والے بہاریوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور وہ لوگ جلد از جلد مشرقی پاکستان سے ہجرت کر جانے کے ارادے باندھ رہے تھے۔ انھوں نے میرا تعارف ایک کمپنی کے جنرل مینجر سے کرایا، جن کا کہنا تھا کہ سرمایہ تیزی کے ساتھ مشرقی پاکستان سے واپس منگوایا جا رہا ہے۔ چنانچہ کئی کمپنیاں بند ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی فیملی کو کراچی بھیجنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنے کئی دوستوں کے بارے میں بتایا کہ وہ مشرقی پاکستان کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ خود ان کا ارادہ بھی زیادہ دیر تک وہاں پر رکنے کا نہیں تھا، مگر عارف صاحب نے کہا کہ وہ ہر قیمت پر مشرقی پاکستان میں ڈٹے رہیں گے۔ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہاں پر آئے تھے، جس کے پیچھے محض یہ جذبہ کارگر تھا کہ وہ ایک مسلمان ملک میں جا کر رہنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستانی ضرور تھے مگر مغربی پاکستان کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا، اس لیے وہ وہاں پر کٹ جائیں گے مگر ملک کو نہیں چھوڑیں گے۔

کراچی میں میری تقریر گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے زیرِ اہتمام یونیورسٹی کے شعبۂ لائبریری سائنس میں رکھی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کا ماحول ڈھاکہ سے یکسر مختلف تھا۔ میری تقریر جرمنی میں رائج

لائبریریوں کے نظام کے بارے میں تھی۔ کسی نے مجھ سے پاکستان کے سیاسی معاملات پر تبصرہ کرنے کو نہیں کہا۔ سارا ماحول اکیڈیمک تھا، جب کہ ڈھاکہ کے سامعین کو ملکی سیاست کے سوا کسی دوسرے موضوع میں دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے اس بات کا ذکر اپنے میزبان ڈاکٹر پاول تزایاداچ (Paul Zajadacz) کیا اور کہا مجھے لگتا ہے کہ ملک کے دونوں حصے مخالف سمتوں میں جا رہے ہیں۔ انھوں نے میری بات کی تصدیق کی۔ وہ پاکستان میں ایک جرمن آرگنائزیشن کی طرف سے نمائندہ تھے اور ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں جرمن حکومت کی طرف سے دی جانے والی امداد کا جائزہ لینے کے کام پر متعین تھے۔ انھوں نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا کہ پاکستان کی سلامتی خطرے میں ہے، مگر مغربی پاکستان کے عوام تو ایک طرف رہے ملک کے حکام کو بھی اس بات کا احساس نہیں تھا۔ ان کی بیوی ڈاکٹر سالومے تزایاداچ ہاسٹن راتھ (Dr. Salome Zajadacz-Hastenrath) نے، جو جرمنی سے آرٹ کی تاریخ میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھیں اور چند ماہ سے کراچی میں مقیم تھیں، گلہ کیا کہ وہاں پر ان کا وقت بیکار میں ضائع ہو رہا تھا۔ جرمن کالونی کی اکثر بیگمات اپنا وقت الم غلم اشیاء کی خریداری اور ایک دوسرے کی دعوتیں کرنے میں گزارتی تھیں۔ میں نے کہا اگر آپ یہاں کے فوک آرٹ پر کچھ کام کریں، تو اس کا پاکستان کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور آپ کا وقت بھی اچھا بسر ہوگا۔ اس سلسلے میں میری تجویز یہ تھی کہ سندھ میں پائی جانے والی چوکھونڈی قبروں کے آرٹ پر تحقیق ہو۔ یہ قبریں کراچی کے گرد و نواح میں پائی جاتی ہیں اور اس بارے میں ان کی امداد کے لیے یقیناً محکمہ آثارِ قدیمہ تیار ہوگا۔ انھوں نے اس بات کو پلّے باندھ لیا اور اگلے ہی روز کراچی میں واقع میوزیم میں پہنچ گئیں۔ ان کا قیام کراچی میں ۱۹۷۶ء تک تھا، جس کے دوران انھوں نے لگ بھگ پچاس قبرستانوں میں پائی جانے والی قبروں کے نقش و نگار کا جائزہ لیا اور اس بارے میں ایک کتاب لکھی جو پہلی بار ۱۹۷۸ء میں جرمنی سے چھپی۔ اس کا انگریزی ایڈیشن Chaukhandi Tombs: Funerary Art in Sind and Baluchistan ۲۰۰۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی کی طرف سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس دوران میں میری واپسی کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں نے ورسک کے ایک قریبی گاؤں میں ایک متمول پٹھان فیملی کے گھر پر جا کر ان کے دیوان خانے میں بچھا ہوا قالین خرید لیا تھا اور اس کو اپنے ساتھ جرمنی لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اسکے لیے وزارتِ تجارت سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔ جب میں متعلقہ آفس میں گیا تو بتایا گیا کہ اس پر کم و بیش چار ہفتے لگ جائیں گے۔ چونکہ میرے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا اور میں قالین کو چھوڑ کر بھی جانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے بھائی عزیز نے ورسک ڈیم پر کام

کرنے والے اپنے پٹھان دوستوں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا آپ قالین کو سرحدی چوکی طورخم تک لے آئیں، آگے ہمارا آدمی اس کو سرحد کے دوسری طرف پہنچا آئے گا۔ مجھے یوں بھی پشاور سے بس میں کابل جانا تھا، اس لیے قالین کو اپنے سامان میں رکھوا دیا۔ احتیاطاً بھائی عزیز بھی اسی بس میں میرے ساتھ آئے تاکہ اگر قالین کو سرحد سے پار لے جانے میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ قالین کو اپنے ساتھ واپس لے جاسکیں۔ طورخم کی سرحدی چوکی پر بھائی عزیز کے واقف کاروں کا آدمی آیا کھڑا تھا۔ اس نے قالین کو اپنے سر پر اٹھالیا اور سرحد کے پار لے گیا۔ آزاد علاقے میں رہنے والوں پر ملکی قانون لاگو نہیں ہوتا، اس لیے ان کو سرحدی چوکی پر روکا بھی نہیں جاتا۔ جب ہماری بس پاکستان کی چوکی سے فارغ ہو کر دوسری طرف کی افغان چوکی پر جا کر رکی، تو ہمارے پٹھان دوست نے قالین کو بس کی چھت پر میرے سامان میں رکھوا دیا۔ میں نے افغان چوکی کے متعلقہ افسر سے کہا کہ مجھے اس بارے میں ایک تصدیقی چٹھی چاہیے، جس میں لکھا ہو کہ میں قالین کو پاکستان سے لایا ہوں اور آگے جرمنی لے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا اگر آپ مجھے ایک سو کلغی دار (پاکستانی روپے) دیں تو میں اس بات کا اندراج آپکے پاسپورٹ میں کر دوں گا۔ اس طرح یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ جب بس وہاں سے روانہ ہوئی تو بس کے کنڈیکٹر نے پوچھا آپکے ساتھ والی سواری کہاں پر رہ گئی ہے؟ میں نے بتایا کہ بھائی عزیز مجھے طورخم تک چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر آپ کو ٹکٹ بھی صرف وہاں تک کے لیے خریدنا چاہیے تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ کابل کا ٹکٹ کیوں کٹوایا تھا۔ اس نے میرے احتجاج کے باوجود طورخم سے کابل تک کا کرایہ مجھے واپس کر دیا۔

کابل میں میرے مہمان نواز گوتھر نے کہا کہ وہ قالین کو ایک جرمن فارورڈنگ ایجنٹ کے ذریعے بھیجنے کا انتظام کرادے گا۔ رہا قالین کا میرے پاسپورٹ میں اندراج تو اس سلسلے کی کارروائی بھی میری کابل سے روانگی سے قبل ہوائی اڈے پر مکمل کر لی جائے گی۔ متعلقہ محکمے کا انچارج اس کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے پانچ منٹوں کے اندر تصدیقی چھٹی تیار کر دی کہ قالین کو افغانستان سے درآمد کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان کی طرح وہاں پر بھی دفتروں کا لمبا چوڑا طواف کرنا پڑے گا، مگر افغانستان کی دفتر شاہی کی روایت اس سے بہت مختلف نکلی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایروفلوٹ کا طیارہ، جس میں مجھے ماسکو تک سفر کرنا تھا، پروپیلر جہاز تھا۔ مجھے اسی شام کو ماسکو سے برلن جانے والی فلائیٹ لینی تھی، مگر بتایا گیا کہ یہ چیز ممکن نہ ہو سکے گی کیونکہ ان کا طیارہ رات پڑنے سے پہلے شاید ہی وہاں پر پہنچ پائے گا۔ راستے میں مخالف ہواؤں کے سبب طیارہ اپنی مقررہ رفتار نہ پکڑ پایا۔ اس روز دھچکے بھی ایسے لگے کہ بہت سے مسافروں کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ قے کر کر کے نڈھال ہو گئے۔ جیسا کھانا ہمیں اس روز پیش کیا گیا ویسا کھانا میں نے اپنی زندگی میں

کسی دوسرے ہوائی سفر کے دوران نہیں کھایا تھا۔ ہر مسافر کو ایک چوتھائی فرائیڈ چکن، وائن کی ایک بوتل اور ایک سیب ٹرے میں رکھ کر دیے گئے۔ پہلے تو مجھے یہ بات بے حد مضحکہ خیز لگی، کیونکہ اس زمانے میں ہوائی کمپنیاں مینیو کا کھانا دیا کرتی تھیں، مگر جب طیارے نے ایک ائر پاکٹ کی زد میں آ کر کئی ہزار فٹ کا غوطہ لگایا اور میں بمشکل گرتے ہوئے سیب کو پکڑ پایا، تو میں جان گیا کہ ایروفلوٹ نے وہ کھانا اپنے تجربے کی بناء پر درست چنا تھا۔ میں نے تو خیر وائن کی بوتل کو اس خیال سے اپنے سفری بیگ میں ڈال لیا تھا کہ گھر پہنچ کر اپنے ایک ہمسائے کو تحفے میں دے دوں گا، جو روس اور کمیونزم کا دلدادہ تھا اور وہاں کی ہر چیز کو آسمانی نعمت سمجھتا تھا، مگر دوسرے مسافروں کی بوتلیں، سیب اور چکن قلابازیاں کھاتے ہوئے گرے تھے۔ بہتوں کے کپڑے شراب گرنے سے گیلے ہو گئے تھے اور ہوائی جہاز میں الکحل کی بو پھیل گئی تھی۔ بیچاری ائر ہوسٹسیں گیلے تولیے اٹھائے ہوئے مسافروں کے کپڑوں اور سیٹوں کو صاف کرنے میں لگ گئیں۔ وہ تو خیریت گزری کہ شراب کی بوتلیں سرخ وائن کی نہ تھیں ورنہ اس روز طیارہ روسی جھنڈے کی طرح سرخ رنگ سے رنگا جاتا۔

ماسکو ہم کافی دیر سے پہنچے تھے مگر برلن جانے والی فلائیٹ لیٹ ہو جانے کے سبب رکی ہوئی تھی۔ بھاگ دوڑ کر میں متعلقہ کونٹر پر پہنچا تو دیکھا کہ شیطان کی آنت جتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ دوپہر کی فلائیٹ کینسل ہو گئی تھی اور اس فلائٹ کے مسافروں کو بھی اسی جہاز سے جانا تھا، بلکہ ان لوگوں کو دوسرے مسافروں پر ترجیح دی جا رہی تھی۔ مجھ سے آگے ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس جیسی خوش شکل لڑکیاں فلمی رسالوں کے سرورقوں پر تو نظر آ جاتی ہیں، مگر سچ مچ کی زندگی میں آدمی کی ان کے ساتھ ملاقات نہیں ہو پاتی۔ میرے پیچھے چار دوسرے مسافر تھے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے خدشات کے برعکس ماسکو میں رات نہیں بسر کرنی پڑے گی۔ جب خوبصورت لڑکی کی باری آئی تو کونٹر بند کر دیا گیا کیونکہ جہاز کی تمام سیٹیں پر ہو چکی تھیں۔ اب ہمیں اگلے روز دوپہر کی فلائیٹ پر سفر کرنا ہوگا۔ ہم سب نے احتجاج کیا، جو بے سود تھا کیونکہ ہمارے جھگڑنے سے بھرے پرے جہاز میں خالی سیٹیں تو نہیں نکل سکتی تھیں۔ میرے پیچھے جو شخص کھڑا تھا، وہ میری طرح مغربی جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس نے کہا کہ مشرقی جرمنی کی ائر لائن انٹرفلوگ میں وہ اس کا آخری سفر تھا۔ پھر اس نے مجھ سے آگے والی لڑکی کے بارے میں کہا کہ اس کے لیے تو ضرور جہاز میں جگہ نکل سکتی ہے۔ اس کو ائر ہوسٹس بنا کر بھی لے جایا جا سکتا ہے اور اگر کوئی سیٹ خالی نہ ہوئی تو وہ پائلٹ کی گود میں جا کر بیٹھ سکتی ہے۔

کونٹر بند کرنے سے پہلے ہمیں انٹرنیشنل کونٹر پر رپورٹ کرنے کا کہا گیا۔ چنانچہ ہمارا قافلہ اپنے دل کا غبار نکالتا ہوا ادھر چل دیا۔ وہاں پر ایک ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم محترمہ کا راج تھا۔ اس نے ہم پر ایک

نظرِ غلط ڈالی اور دراز میں سے آئینہ نکال کر اپنے بال سنوارنے لگ گئی۔ ہم سب اس کے کونٹر کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راستے میں ماریون نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ مشرقی برلن کی رہنے والی ہے اور سویٹ وظیفے پر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس کو چونکہ روسی زبان خوب آتی تھی، اس لیے ہم نے اسے کہا کہ وہ ہماری نمائندگی میں کونٹر والی محترمہ سے بات کرے۔ ہمیں ماسکو میں رات گزارنے کے لیے ہوٹل دینے کی ذمہ داری ان کی تھی۔

ماریون نے، جس کی عمر انیس بیس برس تھی، لجاتے ہوئے ہمارا کیس پیش کیا، مگر کونٹر والی محترمہ نے سر ہلا کر ذمہ داری سے اپنی بریت کا اظہار کیا۔ ماریون نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مایوسی سے کندھوں کو اچکا دیا، گویا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے کہا کہ ہوائی کمپنیوں کے بین الاقوامی معاہدے کے مطابق اگر مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے، جس کی ذمہ داری ائر لائنز کی ہو، تو اس صورت میں مسافروں کے قیام و طعام کا انتظام ائر لائنز کو کرنا ہوتا ہے۔ ماریون نے بڑے مؤدبانہ انداز میں یہ بات روسی محترمہ سے کہی، جس نے اس کے فقرے کو کاٹ کر پاٹ دار آواز میں کہا کہ ایسا کوئی اصول نہیں پایا جاتا اور اگر ہے تو وہ روس میں نہیں چلتا۔ ماریون مایوس ہو کر ہماری طرف پلٹی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ ماسکو میں اس کی خالہ رہتی ہے، جس کے ہاں وہ رات گزار سکتی ہے، مگر ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ پھر اس نے خود ہی کہا آپ کے پاس تو بہر صورت فارن کرنسی ہوگی، جو غیر ملکیوں کو ہوٹلوں میں ٹھیرنے کے لیے ادا کرنی پڑتی ہے۔

ہمارے گروپ کے ایک دو لوگ کچھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ وہ شخص، جس نے ماریون کو پائلٹ کی گود میں بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا، کسی قدر ناپنے ٹاپنے کے بعد اس بات پر آمادہ نظر آتا تھا کہ ٹیکسی منگوالی جائے۔ ہمارے خرچ پر ہوٹل میں بکنگ کی پیش کش ہمیں کونٹر والی محترمہ کر چکی تھی مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے ماریون سے کہا کہ وہ وہاں پر بیٹھ جائے، اب میں اس معاملے کو سلجھاتا ہوں۔ ماریون نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ میں نے کونٹر کے سامنے کھڑے ہو کر محترمہ جیسی اونچی آواز میں پوچھا کہ اس مسخرے پن کا کیا مطلب ہے۔ یہ اصول ساری دنیا میں چلتا ہے اور تمام ائر لائنیں اس کا پاس کرتی ہیں۔ اگر تم فوری طور پر ہمارے لیے ہوٹل میں رہائش اور وہاں پر پہنچانے اور اگلے روز وہاں سے ائر پورٹ پر لانے کا بندوبست نہیں کرتی ہو تو میں ماسکو ائر پورٹ کے کمانڈر کے پاس تمھاری رپورٹ کر دوں گا۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ محترمہ یکدم بدل گئی۔ اس نے کہا: "محترم آپ غصہ نہ کھائیے، میں اس لڑکی کی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ میں آپ کے لیے فوراً انتظام کر دیتی ہوں۔" چنانچہ اس نے فون کرنے شروع کیے اور پندرہ بیس

منٹوں کے اندر ہمارے لیے ہوٹل کا انتظام ہو گیا اور ائر پورٹ کی بس ہمیں ہوٹل میں پہنچانے کے لیے آ گئی۔ راستے میں ماریون نے، جسے انگریزی نہیں آتی تھی، اس لیے وہ کونٹر والی محترمہ کے ساتھ میری گفتگو کو نہ سمجھ پائی تھی، پوچھا کہ میں نے محترمہ پر کون سا جادو کیا تھا کہ وہ اس قدر جلد ہتھیار ڈال بیٹھی تھی۔ میں نے کہا کہ محترمہ کا ردِعمل سائیکل سواروں کے اصول کا عملی مظاہرہ تھا۔

"سائیکل سواروں کا اصول؟ یہ کیا بلا ہے؟" ماریون نے اپنی بے حد موہنی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ میں نے کہا کہ سائیکل سوار کے جسم کا اوپر والا حصہ جھکا ہوا ہوتا ہے جب کہ نچلا حصہ ٹانگیں چلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ گویا اوپر والوں کے مقابلے میں انسان جھکا رہے۔ ان کے جا و بیجا احکامات کو تسلیم کرے اور اپنے سے نیچے والوں کی ٹھڈوں کے ساتھ مرمت کرے۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ مسکرا کر چپ ہو گئی۔

ہوٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ ماریون کو میری تجویز سے اتفاق تھا کہ کھانے کے بعد ہمیں تھیٹر یا کسی دوسرے شو میں جانا چاہیے۔ اس شام بالشوئے تھیٹر کا بیلے ڈانس کا پروگرام تھا۔ میرا خیال تھا کہ ٹکٹ سب بک چکے ہوں گے مگر ماریون نے کہا کہ اگر میں قیمت ڈالر میں ادا کرنے کو تیار ہوں، تو آخری منٹ تک سیٹیں مل سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہم شو کے شروع ہونے سے پہلے تھیٹر میں پہنچ گئے۔ میرے لیے کسی روسی تھیٹر میں جانے کا وہ پہلا موقع تھا اگرچہ میں ٹیلی ویژن پر متعدد بار بالشوئے تھیٹر کے پروگراموں کو دیکھ چکا تھا۔ سویٹ یونین میں ثقافتی پروگراموں کو خاص اہمیت حاصل تھی اور ان پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ ایکٹروں، ڈانسروں، مصوروں اور دوسرے آرٹسٹوں کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تھیٹر کے تماشائیوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ مزدوروں کی تعداد ان میں دوسروں سے زیادہ لگتی تھی۔

ماریون کا باپ بھی مشرقی جرمنی کے ایک کارخانے میں مزدور تھا اور یہ امر، کہ اس کے دونوں بچے، ماریون اور اس کا بھائی، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے میرے لیے اشتراکی نظام کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں مزدوروں کے بچے شاذونادر ہی یونیورسٹیوں میں پائے جاتے تھے۔ میرے منہ سے ایسے تعریفی کلمات سن کر ماریون بے حد خوش ہوئی مگر اس نے کہا کیا مجھے پتا ہے کہ مشرقی جرمنی اس کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کر رہا ہے؟ میں نے اعتراف کیا کہ مجھے یہ پتا نہیں کہ معاشی اعتبار سے اس کی کیا قیمت ادا کی جا رہی ہے، تاہم مجھے اس کی معاشرتی قیمت کا اندازہ ہے۔ مزدوروں کے بچوں کو تعلیمی میدان میں آگے لانے کی خاطر دانش مند طبقے کے بچوں کا داخلہ یونیورسٹیوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ جو قوم اپنے ذہین ترین طبقے کی صلاحیتیں اس طرح برباد کرتی ہے،

اس کو قوموں کی دوڑ میں ایک روز منہ کی کھانی پڑے گی۔

ماریون نے کہا وہ دن کب آئے گا؟ دانش مند تو ایک طرف رہے خود مزدور اس دن کی راہ تک رہے ہیں۔ وہ لوگ آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مغربی ممالک کے لوگوں کی طرح سیر وسفر کرنا چاہتے ہیں۔اس نے کہا میں تمھیں کل بازار لے چلوں گی تا کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ یہاں کی دکانیں سازوسامان سے خالی ہیں۔تم اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہمیں روزمرہ کی چیزوں کی خریداری کے لیے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

میں نے کہا یہ عارضی چیزیں ہیں اور اسے نہیں بھولنا چاہیے کہ اشتراکی ممالک دنیا کے پرولتاروں کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں اور جب تک وہ ہتھیار نہیں ڈالتے اس وقت تک تیسری دنیا کے لیے امید کا ستارہ روشن ہے۔ ماریون نے کہا تم لوگ سوشلسٹ جنت سے باہر بیٹھ کر یہاں کے خواب دیکھتے ہو۔تمھیں کیا پتا ہے کہ یہ جنت کس نوعیت کی ہے۔ مجھے مغربی برلن کی ایک سڑک پر، جو چیک پوائنٹ چارلی کی طرف جاتی تھی، لکھا ہوا سلوگن یاد آ گیا۔سمت دکھانے والے تیر کے نیچے لکھا ہوا تھا: "سوشلسٹ جنت ==== >>ایک سو میٹر"۔میں برلن دیوار کے بنائے جانے کے تھوڑے دنوں بعد چیک پوائنٹ چارلی سے گزر کر مشرقی برلن گیا تھا۔ ہمارے مغربی برلن کے گائیڈ نے کہا تھا کہ اب ہم سوشلسٹ جنت میں داخل ہو رہے ہیں، جس کے باسیوں کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ جب مشرقی برلن کا گائیڈ ہماری بس میں سوار ہوا تو اس نے کہا ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ قید خانہ دیوار کے اس طرف یا اس طرف ہے۔ ماریون نے کہا یہ بات تو چڑیا گھر جیسی ہوئی، جس کے بارے میں کوئی شخص وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا انسان بندروں کا تماشا کرتے ہیں یا بندر انسانوں کا۔اس نے کہا اگر میں اس کے مشرقی برلن واپس آ کر آباد ہونے کے بعد کبھی آیا، تو وہ مجھے اس پنجرے کی اندر سے سیر کرائے گی تا کہ میں خود جنت یا قید خانے کے بارے میں فیصلہ کر سکوں۔

ہماری بحث ہوٹل میں واپس لوٹنے کے بعد پو پھٹنے تک چلتی رہی۔اسے مغربی دنیا کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا شوق تھا اور مجھے اشتراکی ممالک کے اندرونی تضادات کی قابلِ فہم تشریح وتوضیح درکار تھی۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ میرے اندر چھپا ہوا اشتراکی دھیرے دھیرے اپنا ایمان کھوتا گیا اور ماریون پر یہ بات کھلتی گئی کہ مغربی دنیا کی زندگی دور کے سہانے ڈھول کے سوا کچھ نہ تھی۔شخصی آزادی کا نعرہ بے حد دلفریب تھا مگر وہ شخص اس آزادی سے کیا حاصل کر سکتا ہے، جسے کھانے کو کچھ نہ ملے۔اور ایسے لوگوں کی مغرب میں کمی نہیں ہے۔

دو تین گھنٹوں کے مختصر آرام کے بعد ہم اٹھ گئے اور ناشتہ کر کے شہر کے مرکز کی طرف روانہ ہوئے۔

سب سے پہلے ہم نے ارباط اسٹریٹ کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا۔ اتنی صبح مصوروں نے ابھی اپنے اڈے نہیں لگائے تھے، جہاں پر ماریون کے بیان کے مطابق آرٹ کے عمدہ نمونے کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ دوسری دکانیں کھل گئی تھیں مگر ان میں میرے کام کی کوئی چیز مجھے نظر نہ آئی۔ ماریون کو اس بازار کے ایک ریستوران میں جانے کا شوق تھا مگر وہاں پر گاہکوں کی اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں سے پہلے باری آنے کی امید نہ کی جا سکتی تھی، اس لیے ہم نے ریڈ اسکوئر کا رخ کیا جہاں پر کرملین پایا جاتا ہے۔ لینن اور اسٹالن کے مزاروں کے سامنے لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ماریون نے کہا کہ وہ لوگ اپنے نئے خداؤں کی لاشوں کو دیکھ کر ایمان تازہ کرنیکے لیے جمع ہیں۔ اس کی نظر میں کمیونزم ایک مذہب تھا اور کرملین اسکا ملّا تھا جسکی سمت دنیا بھر کے کمیونسٹ امید بھری نظروں سے تکتے تھے۔

مجھے ماریون پر حیرت ہو رہی تھی کیونکہ وہ خود بھی اس نظام کی پروردہ تھی۔ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی اس نظام سے منسلک تھی۔ اس کا باپ نہ صرف کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا بلکہ اپنے کارخانے میں پارٹی کا معتمد تھا۔ ماریون کا وظیفے پر سویٹ یونین میں تعلیم حاصل کرنا ایک انعام سے کم نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ وظیفہ اس کو شاید لیاقت کے بل پر ہی ملا ہوگا، مگر کتنے دوسرے لائق فائق طالب علموں کو محض اس وجہ سے مقابلے میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا کہ ان کے باپ ڈاکٹر، انجینئر یا پروفیسر تھے اور ان کا تعلق صاحبِ جائیداد خاندانوں سے تھا۔ میرا واسطہ مغربی جرمنی میں آئے دن ایسے لوگوں سے پڑتا تھا، جنھیں کمیونزم ایک آنکھ نہ بھاتا تھا مگر یہ بات کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہ آئی تھی کہ ایک روز میری ملاقات ماریون جیسی لڑکی سے ہوگی، جو کمیونزم کی پروردہ ہو کر اس کو اس طرح رد کرے گی۔ جب میں نے اسے یہ بات کہی تو وہ ذرہ بھر نہ جھینپی۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو میں بھی شاید اسی نتیجے پر پہنچتا کیونکہ کمیونزم کے دکھانے کے دانت اور ہیں اور کھانے کے دوسرے۔ جس قسم کی دھاندلی مشرقی جرمنی میں روزمرہ پارٹی اور حکومت کے کارندے کرتے ہیں اس کا پتا عوام کو چل جائے تو ملک میں انقلاب آ جائے۔ اس کے باپ نے مشرقی برلن کے مضافات میں ایک "ڈاچا" (مکان) بنایا تھا جس کا سارا عمارتی سامان "آرگنائزڈ" گویا چوری شدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے ملک میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے، لیکن بات نکل جائے تو ہر شخص یہ باور کراتا ہے کہ اسے کسی چیز کا علم نہ تھا۔ جب چھوٹے کارندوں کا یہ حال ہے تو اوپر والے کیا کچھ کرتے ہوں گے۔

ہوائی جہاز میں ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں مگر وہاں پر دوسرے مسافروں کی موجودگی میں باتیں اس قدر کھل کے نہ ہو سکتی تھیں۔ ماریون نے مجھے خاص طور پر توجہ دلائی کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ مشرقی جرمنی میں ہر دوسرا تیسرا شخص خفیہ پولیس کے لیے مخبری کرتا ہے، اس

لیے ہماری گفتگو کا محور نجی معاملات اور بے ضرر قسم کے چٹکلے اور لطیفے بن گئے۔ ماریون اپنی یونیورسٹی کی باتیں سناتی رہی، جہاں پر درجن بھر روسی اس کو شادی کی پیشکش کر چکے تھے کیونکہ اس طرح انھیں مشرقی جرمنی آنے کی اجازت مل سکتی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا کہ کیا اس کے لیے میرے سوٹ کیس میں جگہ بن سکتی ہے؟

ہمیں بھاری دل کے ساتھ مشرقی جرمنی کے ہوائی اڈے "شوینے فیلڈ" پر ایک دوسرے کو الوداع کہنا پڑا۔ ماریون نے خاص طور پر فرمائش کی کہ جب بھی میرا غیر ملکوں میں سفر پر جانا ہو تو اسے ویو کارڈ بھیجنا نہ بھولوں۔ اس نے خود بھی خط لکھنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اڈیسہ پہنچ کر اس نے ایک لمبا خط لکھا، جس کے بعد ہماری آپس کی باقاعدہ خط وکتابت کا آغاز ہو گیا، جو وقفوں کے ساتھ برسوں تک جاری رہی۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ماریون کا ارادہ مشرقی جرمنی لوٹ آنے کا تھا۔

ماریون اپنے خطوں میں بہت محتاط تھی، کیونکہ ڈاک سنسر ہوتی تھی۔ کیا مجال ہے جو تنقید کا ایک فقرہ بھی ان میں جگہ پاتا ہو۔ اس کی بجائے وہ پولی تیکنیک کی باتیں لکھتی تھی جہاں پر دنیا بھر کے ملکوں کے طالب علم پڑھتے تھے۔ پھر اس کے خطوں میں سرگے (Serge) کا ذکر تواتر کے ساتھ ہونے لگا جو اس سے ایک سال آگے تھا۔ وہ گروزینین قومیت رکھنے والا روسی تھا۔ اس کا گاؤں اڈیسہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ چھٹیوں میں وہ ماریون کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کی ماں ماریون سے ملنا چاہتی تھی۔ اس خبر سے میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ ان کی دوستی ایک سنجیدہ موڑ مڑنے والی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اگلے خط میں ماریون نے سرگے کے ساتھ اپنی منگنی کی خبر سنائی۔ اس سے اگلے برس ماریون کے فائنل امتحان کے خاتمے پر ان کی شادی ہو گئی۔ اس تقریب کی تصویریں اس نے مجھے بھیجیں۔ انھی دنوں میں میاں بیوی مشرقی جرمنی منتقل ہو گئے۔ ماریون نے مجھے اپنا نیا پتا بھیجا اور برلن آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد میں متعدد بار ان کو ملنے کے لیے وہاں پر جاتا رہا۔

میرے سفر سے واپس آنے کے تھوڑے دنوں کے بعد مشرقی پاکستان میں ایک سائیکلون آیا، جس کے نتیجے میں سمندر کی ایک بہت بڑی لہر میل ہا میل دور تک ملک کے اندر تباہی مچاتی ہوئی دوڑ گئی۔ ہزاروں انسان (چالیس ہزار؟) اور مویشی اس کی نذر ہوئے اور صوبے کے بے شمار گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے تاخیر کے ساتھ کی جانے والی امدادی کارروائی پر بے حد تنقید ہوئی۔ بنگالی قومیت پسندوں نے اس حادثے کا ذمہ دار مرکزی حکومت کو ٹھہرایا، جس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسے سائیکلون ماضی میں آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، حفظِ ماتقدم کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ چیز چنداں بعد منعقد ہونے والے انتخابات میں عوامی لیگ کے خوب کام آئی۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں پارلیمانی انتخابات ہوے۔ اس سے اگلے روز میں اتفاقی طور پر بون میں پاکستانی سفیر خراس صاحب کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میری موجودگی میں سفارت خانے کا کلرک انتخابات کے نتائج لے کر آیا، جن کو پڑھنے کے بعد سفیر صاحب نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: "مبارک ہو، پاکستان میں ٹو پارٹی سسٹم ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے انتخابات کے نتائج والا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا: "خراس صاحب، ملک ٹوٹ گیا ہے۔" مشرقی پاکستان میں دو سیٹیں چھوڑ کر باقی کی ۱۶۰ سیٹیں عوامی لیگ کو ملی تھیں۔ مغربی پاکستان کی کوئی پارٹی وہاں پر سیٹ حاصل نہ کر سکی تھی اور عوامی لیگ کو مغربی پاکستان میں نمائندگی نہیں ملی تھی۔ یہاں پر پی پی پی کو سب سے زیادہ ووٹ اور سیٹیں ملی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیرِ اعظم بنایا جانا چاہیے تھا مگر سب جانتے تھے کہ صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خان اس کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر وہ ہوتے بھی تو ذوالفقار علی بھٹو ان کو ایسا کرنے سے روکنے پر تلے ہوے تھے۔

قیوم کا جرمنی آنا

مارچ ۱۹۷۱ء میں مجھے اپنے بھائی عبدالقیوم ناظر کا انگلستان سے خط ملا، جس میں اس نے لکھا کہ وہ جلد از جلد اس ملک کو خیر باد کہنا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی تھی کہ قیوم کو اچانک اس کی کمپنی کی طرف سے ملازمت سے برطرفی کا نوٹس مل گیا تھا۔ قیوم نے اپنی بیوی برینڈا سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور بولٹن (Bolton) کو چھوڑ کر، جہاں پر اس کی بیوی بچے رہتے تھے، روشڈیل (Rochdale) چلا گیا تھا۔ اس پر برینڈا نے طلاق کے لیے عدالت میں درخواست دے دی۔ جب عدالت کی طرف سے قیوم کو نوٹس ملا، تو اس نے مقدمے کی پیروی نہیں کی۔ اس طرح اس کے خلاف یک طرفہ طور پر طلاق کا فیصلہ ہو گیا۔ دونوں بچوں کی دیکھ بھال کے حقوق بھی برینڈا کو مل گئے۔ قیوم کی تنخواہ سے برینڈا اور بچوں کی کفالت کی رقم ادا کی جاتی تھی، جس کے نکل جانے کے بعد اس کے پاس بمشکل اتنے پیسے بچتے تھے کہ وہ کسی چھوٹے موٹے کمرے میں کرائے پر رہ سکتا تھا۔ اس کی ایک گرل فرینڈ تو تھی مگر اس کے ساتھ شادی کرنے کا خیال بھی وہ دل میں نہ لا سکتا تھا۔ عدالت کے فیصلے کی نقل اس کی جیب میں تھی، جب وہ ایک روز کارخانے میں کام کے دوران پھسل کر گر گیا اور سر کے پچھلے حصے میں چوٹ لگنے کے سبب بے ہوش ہو گیا۔ فوری طور پر ایمرجنسی کار کو بلا لیا گیا جو اسے فرسٹ ایڈ دینے کے بعد ہسپتال میں علاج کے

لیے لے گئی۔ اس کے بیوی بچوں کو اطلاع دینے کے لیے اس کا پتا تلاش کیا گیا تو وہ فوری طور پر نہ مل سکا۔ اس لیے قیوم کی جیب کی تلاشی لی گئی کہ شاید اس میں سے اس کا شناختی کارڈ مل جائے جس پر پتا درج ہوتا ہے۔ اس کی جیب میں سے عدالت کا بھیجا ہوا طلاق نامہ نکلا جو اسے ایک روز قبل ڈاک سے ملا تھا۔ جب قیوم چند روز کے بعد صحت یاب ہو کر کام پر آیا تو کمپنی کے طرف سے اس کو برطرفی کا نوٹس دے دیا گیا، جسکی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ یہ بات ہماری کمپنی کے اصولوں کے خلاف ہے کہ اہم عہدوں پر متعین ورکر طلاق شدہ ہوں۔ کچھ عرصہ قبل ایک امریکن فرم نے، جو عیسائی بنیاد پرستوں کی قایم کردہ تھی، وہ کمپنی خرید لی تھی جس میں قیوم کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے خط میں مجھے لکھا کہ وہ اس نوٹس کی وجہ سے اس درجہ بیزار ہوا ہے کہ انگلستان کو چھوڑ دینے کا ارادہ باندھے ہوے ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے جرمنی میں کوئی کام تلاش کر دوں۔ " چاہے وہ کام جسمانی طور پر مزدوری کرنے کا ہی کیوں نہ ہو۔ " مجھے پتا تھا کہ قیوم تربیت یافتہ کلرسٹ (Skilled Colourist) ہے اس لیے میں نے جواب دیا کہ وہ مجھے اپنی ٹریڈ کوالی فکیشن کی تفصیلات اور اپنے کام کے تجربے کی فہرست بھیج دے۔ میں نے جرمنی کی کم و بیش ایک سو ٹیکسٹائل پرنٹنگ کمپنیوں کو خط لکھ کر پوچھا کہ کیا وہ اس تجربے اور کوالی فکیشن کے آدمی کو اپنے ہاں کوئی جاب آفر کر سکتے ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر چھ کمپنیوں کی طرف سے انٹرویو کے لیے دعوت نامے مل گئے۔

یہ اطلاع ملتے ہی قیوم ہمارے پاس ہمبرگ آ گیا۔ چونکہ اسے جرمن نہیں آتی تھی اس لیے یہ طے پایا کہ میں بطور مترجم اس کے ساتھ جاؤں گا۔ ہم جرمنی کے انتہائی شمالی علاقے میں رہتے ہیں اور ساری کمپنیاں، جہاں پر اسے انٹرویو دینا تھا، جنوبی جرمنی میں سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر تھیں۔ پہلی فرم میں ہی اس کو جو آفر ہوئی، وہ اس کو انگلستان میں ملنے والی تنخواہ سے تین گنا تھی۔ قیوم نے اس کو قبول کر لیا جب کہ ایک دوسری فرم کا جنرل منیجر کئی دنوں سے ہمیں ٹیلی فون کر رہا تھا کہ ہم اس کو ملے اور اس کے کارخانے کو دیکھے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ میرا خیال تھا کہ وہ قیوم کو بہتر آفر دے گا مگر قیوم اپنے فیصلے پر قایم رہا۔ وہ ایک ہفتے کے اندر انگلستان سے اپنا ساز و سامان اٹھا کر واپس آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فرم کی طرف سے اسکو جانے آنے کا کرایہ پیشگی دیا گیا۔ چنانچہ وہ مقررہ وقت کے اندر جرمنی پہنچ گیا۔ فرم کی طرف سے اسکی رہائش کے لیے ایک فلیٹ کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا، مگر جب وہ چھڑا چھانٹ واپس لوٹا تو فرم کے منیجر نے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی بیوی، دوست یا منگیتر نہیں ہے؟ جب اس کو پتا چلا کہ قیوم کی ایک گرل فرینڈ پیچھے انگلستان میں موجود ہے تو اس نے کہا: تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے۔ میں تمھیں جانے کا ایک اور واپسی کے دو ہوائی ٹکٹ دیتا ہوں۔ جاؤ اور شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔ اس طرح جھٹ پٹ قیوم کی شادی کیرول کے ساتھ ہو گئی۔ اس بیوی سے بھی اسکے دو بچے ہیں جو اس دوران

میں برسرِ روزگار ہیں اور اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔

قیوم کو جرمنی میں رہتے ہوے ۳۳ سال ہو گئے ہیں۔ ان سارے برسوں کے دوران وہ اسی فرم میں کام کرتا رہا اور تین برس قبل پنشن لینے کے وقت خود منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ پنشن پانے سے قبل ہی اس کے تعلقات غیر ملکی پرنٹنگ فرموں کے ساتھ استوار ہو گئے تھے، جنھوں نے اس کی معرفت سستے داموں پرنٹنگ مشینیں خریدی تھیں۔ ان کو جرمن فرم ٹھیکے پر پرنٹنگ کا کام دینا چاہتی تھی۔ اس طرح دونوں کا بھلا تھا۔ غیر ملکی فرموں کو، جن کا تعلق پاکستان، ترکی اور مصر سے ہے، جرمن فرم کی معرفت پرنٹنگ کا کام مل جاتا ہے، جس کی کوالٹی جرمن فرم کے قایم کردہ معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ قیوم گزشتہ کئی برسوں سے ان غیر ملکی فرموں کے ساتھ بطور مشیر کام کر رہا ہے۔ وہ سال میں دو تین بار کئی کئی ماہ ترکی اور پاکستان میں گزارتا ہے، جہاں پر وہ پرنٹنگ کی کوالٹی پر نظر رکھتا اور ان فرموں میں کام کرنے والے کاریگروں کو ٹیکنیکل ٹریننگ دیتا ہے۔ علاوہ ازیں قیوم ان کاروباری اداروں کے مال کی یورپ میں کھپت کا بھی انتظام کرتا ہے۔ وہ یہاں پر لگنے والے صنعتی میلوں میں ان فرموں کی نمائندگی کرتا ہے۔

مصر میں قیام

عین انھی دنوں میں، جب قیوم انگلستان سے جرمنی نقلِ مکانی کرنی چاہتا تھا، مجھے اقوامِ متحدہ کی آرگنائزیشن برائے صنعتی ترقی (یونیڈو) کی طرف سے قاہرہ میں منعقد ہونے والے ایک سمینار برائے صنعتی ڈاکومنٹیشن کا انچارج بن کر وہاں جانے کی ہدایت ملی۔ یہ سمینار، جس میں تمام عرب ممالک کے نمائندے شمولیت کے لیے آرہے تھے، چار ہفتوں کے دورانیے کا تھا، جس کے بعد مجھے عرب لیگ کی قاہرہ میں پائی جانے والی صنعتی آرگنائزیشن کے کام کا جائزہ لینا تھا۔ دراصل عرب ممالک کے لیے سولہ صنعتی ڈاکومنٹیشن سنٹر قایم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا، جن کو علیحدہ علیحدہ صنعتوں کے بارے میں تیکنیکی معلومات جمع کرنی تھیں۔ اس کا مرکزی آفس قاہرہ میں قایم ہو چکا تھا، جس کا مجھے تین ماہ کے لیے صلاح کار بنا کر بھیجا جا رہا تھا۔ یونیڈو دراصل یہ چاہتی تھی کہ میں دو برسوں کے لیے جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ سے چھٹی لے لوں اور اتنے عرصہ تک قاہرہ میں مقیم رہوں۔ ہمیں یہ سہولت ملتی تھی کہ اگر اقوامِ متحدہ ہماری خدمات حاصل کرنا چاہے تو ہم پانچ برس تک کے لیے انسٹیٹیوٹ سے رخصت لے سکتے تھے۔ اس عرصہ میں ہمارے حقوقِ ملازمت برقرار رہتے تھے اور اگر ہم چاہیں تو اپنی سابقہ پوزیشن پر لوٹ کر آسکتے تھے۔ مجھے چونکہ اس سے قبل کسی عرب ملک میں قیام کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے میں قاہرہ

میں جا کر رہنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ مجھے یونیڈو کی طرف سے بہت اچھی تنخواہ کی پیش کش ہوئی تھی، اس لیے میں نے اس آفر کو قبول کر لیا اور مئی ۱۹۷۱ء میں قاہرہ چلا گیا۔

اوتا اس دوران میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹی میں پیش کر چکی تھی۔ جرمنی میں یہ اصول رائج ہے کہ مقالوں کی منظوری کا فیصلہ یونیورسٹی کو ایک ماہ کے اندر اندر کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد امیدوار کو اپنے اصل مضمون، جس میں اس نے مقالہ لکھا ہوتا ہے اور دوسرے دونوں ضمنی مضامین کا زبانی امتحان ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں دینا ہوتا ہے۔ گویا اوتا کو مزید دو ماہ تک ہمبرگ میں رہنا تھا۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ اوتا امتحان سے فارغ ہوتے ہی میرے پاس قاہرہ آ جائے گی۔ مجھے اس دوران میں وہاں پر کوئی مناسب رہائش گاہ تلاش کرنی تھی۔ اس سلسلے میں اقوامِ متحدہ کا مقامی آفس مدد کرتا تھا۔ قاہرہ میں غیر ملکیوں کو آسانی کے ساتھ فلیٹ کرائے پر مل جاتے تھے البتہ ان کا کرایہ عام طور سے ملک میں رائج کرائے سے بدرجہا زیادہ ہوتا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے تحت کام کرنے والے تمام کارکنوں کے پتوں کی ایک فہرست ہر ماہ چھپتی تھی، جس میں ان کا مکمل ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر درج ہوتے تھے۔ اس فہرست کی مدد سے ایمرجنسی کی صورت میں کارکنوں سے سرعت کے ساتھ رابطہ قایم کیا جا سکتا تھا، مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جو کہیں زیادہ دلچسپ تھا۔ افقی پیشہ سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں آئے دن غیر ملکیوں سے فون پر ڈیٹ لینے کی کوشش کرتی تھیں۔ میں نے ایک فون کرنے والی لڑکی سے کہا کہ باقی باتوں کو چھوڑو اور مجھے سیدھے سیدھے اپنا ریٹ بتا دو۔ اس نے تیس پونڈ پچاس بیاسٹر بتایا۔ (عربی میں چونکہ پ نہیں پایا جاتا اس لیے اس کی جگہ پر ب یا ف بولتے ہیں۔) میں نے کہا کہ تیس پونڈ کی رقم تو خیر سمجھ میں آتی ہے مگر یہ پچاس پیاسٹر کا دم چھلا تم کس خوشی میں لگاتی ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ اگر کوئی بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو میں پچاس پیاسٹر کی رعایت دے دیتی ہوں۔

سمینار کا انتظام برج ہوٹل میں کیا گیا تھا، جو نیل کے کنارے پر مرکزی پل میدان التحریر پر واقع تھا۔ پل کے دوسری طرف عرب لیگ کی بلڈنگ تھی۔ وہاں سے انسان پیدل چل کر پرانے شہر میں جا سکتا تھا۔ میں چونکہ اس وقت تک عربی کے مصری لہجہ سے ناواقف تھا، اس لیے فرصت کے لمحات اکثر مصریوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں گزارتا تھا۔ مرزا منصور احمد، جس کے ساتھ میری ملاقات دمشق میں ہوئی تھی، ان دنوں میں قاہرہ میں مقیم تھا اور الازہر یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس کی وساطت سے میرا تعارف ایک نوجوان مصری شاعر احمد سراج الدین سے ہوا، جو مشہور عرب ادیب عباس محمود العقاد کی محفل میں جا کر بیٹھا کرتا تھا، جہاں پر قاہرہ کے شاعر و ادیب ہر ہفتے جمع ہوتے تھے۔ اس کو کئی بار اس کے اشعار پر الاستاذ عباس نے داد دی تھی۔ وہ ہر روز تین چار گھنٹے میرے ساتھ گزارتا اور مجھے مصری لہجہ

الدارجہ سکھاتا تھا۔ الاستاذ محمد البسیونی کے ساتھ میرا ملنا بھی منصور کی معرفت ہوا۔ وہ مجھے ان کے گھر پر لے گیا تھا جہاں پر جماعتِ احمدیہ قاہرہ کے لوگ نمازِ جمعہ پڑھتے تھے۔ وہاں پر اس روز دس بارہ افراد جمع تھے۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ جماعت کے اراکین کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔

الاستاذ محمد البسیونی بہت دلچسپ اور نفیس انسان تھے۔ ان کا تعلق دراصل جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا کے مدرسہِ خیال سے تھا، مگر نوجوانی میں جماعتِ احمدیہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ ایک متمول ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو کئی نسلوں سے مصر میں مقیم تھا۔ ان کے گھرانے میں ترکی زبان بدستور بولی جاتی تھی۔ میری ملاقات ان کے والد سے بھی ہوئی، جو مصر کے شاہ فاروق کے زمانے میں حکومت کی ایک کلیدی پوسٹ پر متعین رہ چکے تھے۔ ان کی بہت بڑی زمینداری تھی، جس کی آمدنی پر ان کے لمبے چوڑے خاندان کا گزارہ چلتا تھا۔ الاستاذ محمد البسیونی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی اور اپنی بہن کے ساتھ رہتے تھے۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ انگریزی اور فرانسیسی بہت اچھی جانتے تھے اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اردو بھی سہولت کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ جب میں نے جاننا چاہا کہ انھوں نے اردو کیسے اور کس سے سیکھی تھی تو انھوں نے مالک رام کا نام لیا، جو سولہ برس تک ہندوستان کے محکمۂ تجارت کے مصر میں نمائندہ رہ چکے تھے۔ ان کی رہائش اسکندریہ میں تھی مگر وہ جمعے کی نماز میں شمولیت کے لیے قاہرہ آجاتے تھے اور شام تک بسیونی صاحب کے ساتھ صحبت کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: کیا مالک رام مسلمان تھے؟ اس پر بسیونی صاحب نے کہا کہ جو شخص سالہا سال تک ہمارے ساتھ مل کر نمازیں پڑھتا ہو اور جس نے اپنے بچوں کو اسلامی نام دیے ہوں اور بچے اپنے آپ کو پیدائشی مسلمان کہتے ہوں، اس کی مسلمانی کے بارے میں کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے؟ پھر مالک رام نے "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ بسیونی صاحب کے پاس موجود تھا۔ انھوں نے یہ نسخہ، جس میں مالک رام نے کتابت کی غلطیاں اپنے قلم سے درست کر رکھی تھیں، مجھے عنایت کر دیا۔ بسیونی صاحب نے اسکا ترجمہ عربی میں کیا تھا، جو الاخوان المسلمون کے پریس میں چھپنے والا تھا۔ جب ۱۹۵۶ء میں الاخوان المسلمون کو حکومت نے غیر قانونی قرار دے کر ان کی تمام املاک ضبط کر لیں، تو پریس میں موجود سارے مسودے بھی اٹھا لیے گئے تھے، جن میں مالک رام کی کتاب کا عربی ترجمہ بھی شامل تھا۔ آگے چل کر اس کتاب کا ترجمہ ایک سکھ عالم نے کیا تھا، جو آج بھی مصر کے کتب خانوں میں مل جاتا ہے۔ مالک رام کی زندگی میں اس کتاب کا اردو ایڈیشن دوسری بار ہندوستان سے چھپ گیا تھا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مالک رام کو قرآن اور حدیث و سنت پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ بسیونی صاحب کو انھوں نے بتایا تھا

کہ وہ ایک آریہ سماجی خاندان میں پیدا ہوے تھے اور ابتداءِ کار آریہ سماج کے ایک رسالے کے مدیر رہے تھے، جس میں اسلام کے خلاف بہت زہر اگلا جاتا تھا۔ مگر جب ان پر اسلام کی تعلیم کی حقیقت روشن ہوگئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ زندگی وہ اس دین کی خدمت میں بسر کریں گے۔

بسیونی صاحب کے ساتھ میرا رابطہ بہت لمبے عرصے تک قایم رہا۔ وہ قاہرہ سے میری دلچسپی کی کتابیں خرید کر اور جلد بنوا کر بھیجا کرتے تھے۔ جب کبھی مجھے قاہرہ جانے کا اتفاق ہوتا تھا میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر حاضری دیتا تھا۔ وہ مجھے لے کر ایک عطر فروش کی دکان پر جاتے تھے، جہاں پر وہ ایک بار اوتا کی موجودگی میں ہمارے ساتھ گئے تھے اور انھوں نے نوٹ کیا تھا کہ اوتا کو کون کون سے عطر پسند ہیں۔ خود ان کی پسند کے عطر بھی ہم نے خریدے تھے۔ ان عطروں کی شیشیاں وہ مجھے ہر بار اوتا کے لیے خرید کر بطور تحفہ دیتے تھے۔ جب میں آخری بار یمن سے واپس لوٹتے ہوے قاہرہ میں رکا اور ان سے ملنے کے لیے گیا تو ان کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ انھوں نے مجھ سے معانقہ کیا مگر مجھے نہیں پہچان سکے۔ وہ انگریزی زبان بالکل بھول چکے تھے۔ ان کی ہمشیرہ نے کہا کہ بھائی محمد کی دماغی حالت ان کی نو عمر پوتی کے معیار پر پہنچ چکی ہے، جس کے ساتھ وہ بہت محبت کرتے تھے۔

سمینار کے خاتمے پر مجھے عرب لیگ کے ادارہ برائے صنعتی ترقی میں تین ماہ تک بطور مشیر کام کرنا تھا، جہاں پر مرکزی ڈاکومنٹیشن سینٹر قایم کیا جاچکا تھا۔ مجھے اس سنٹر کے کام کا جائزہ لینا اور اس کے آئندہ لائحۂ عمل کے بارے میں تجاویز پیش کرنی تھیں۔ مختلف عرب ملکوں میں سولہ سنٹر قایم کیے جا چکے تھے، جو بجائے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی ہانڈی پکا رہے تھے۔ سمینار منعقد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو آپس میں تعاون کرنے کی راہ دکھائی جائے۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا اگر قاہرہ کا مرکزی آفس درست طریق سے اپنے فرائضِ منصبی بجالائے۔ جب میں نے سنٹر میں پہنچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا، تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عملہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ چونکہ یہ ادارہ عرب لیگ نے قایم کیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ سب ممبر ممالک کو نمائندگی دی جائے۔ چنانچہ ملک ملک کے لوگ وہاں پر جمع تھے۔ تاہم اسٹاف کی اکثریت لوکل مصری لوگوں کی تھی۔ غیر ممالک سے آنے والوں کی تنخواہیں عرب لیگ کے اس سکیل پر تھیں، جو بین الاقوامی معیار کے مطابق بہت اونچا تھا۔ جب کہ مصری عملہ کو لوکل معیار کے مطابق تنخواہ دی جاتی تھی، جو بہت پست تھا۔ کام دونوں کا ایک ہی تھا مگر ان کی تنخواہوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ادارے کے جنرل منیجر ایک سابق وزیر تھے، جو اپنے مصری لوگوں کی تنخواہوں کو بڑھانے کے لیے ہر جتن کر رہے تھے۔ پورے سنٹر کا بجٹ اقوامِ متحدہ ادا کرتی تھی۔ عرب لیگ کا ایک دھیلہ بھی اس کام پر نہیں لگتا تھا۔ مجھے اس چیز سے کوئی سروکار نہ تھا کہ مصری لوگوں کی

تنخواہیں بڑھائی جائیں یا نہیں۔ میں نے تو یہ دیکھنا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے دی جانے والی رقم کا استعمال درست ہوتا تھا یا نہیں۔

اس سلسلے میں ایک انکشاف یہ ہوا کہ سنٹر کی طرف سے قاہرہ میں پائی جانے والی یونیورسٹیوں (قاہرہ یونیورسٹی، عین الشّمس یونیورسٹی، امریکن یونیورسٹی) کے لگ بھگ ایک سو پروفیسروں کے سپرد ٹیکنیکل رسالے کیے گئے تھے، جن میں چھپنے والے مضامین کا خلاصہ تیار کرنا ہوتا تھا، جس کے لیے فرداً فرداً ہر پروفیسر کو ماہوار ایک سو پونڈ ادا کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں مصر میں پروفیسروں کی تنخواہ ساٹھ سے ستر پونڈ ماہوار تک ہوتی تھی۔ ان کے پیش کردہ خلاصے، جو انگریزی زبان میں ہوتے تھے، ڈاکومینٹیشن سنٹر کی طرف سے چھاپے جاتے تھے۔ یہ سوال اس وقت تک کسی نے نہیں اٹھایا تھا کہ یہ معلومات عرب انڈسٹری کے کام آتی بھی ہیں یا نہیں۔ پھر دلچسپ امر یہ تھا کہ جتنی رقم خرچ کر کے یہ معلومات مہیا کی جاتی تھیں اس سے کہیں کم لاگت پر اس سے ایک سو گنا زیادہ معلومات خریدی جا سکتی تھیں، جو ان ٹیکنیکل رسالوں میں چھپتی تھیں، جو یورپ اور امریکہ میں باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک کام، جو دوسری جگہ پر ہو رہا تھا، اس کو قاہرہ میں نئے سرے سے ناقص معیار پر کیا جائے۔

مجھے پتا تھا کہ یہ سوال اٹھانا بھڑوں کے چھتے پر ڈھیلہ مارنے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود میں نے سنٹر کے ڈائریکٹر کی موجودگی میں اقوامِ متحدہ کے مقامی نمائندے کو ایک میٹنگ میں تحریری رپورٹ پیش کی، جس میں پوری دیانتداری کے ساتھ صورتِ حال کو بیان کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ مرکز میں فنڈز کا درست استعمال نہیں ہو رہا۔ میں نے اس بارے میں تجاویز پیش کیں، جن پر عمل کرتے ہوئے سنٹر کی کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ میری رپورٹ کا پہلا پیراگراف پڑھتے ہی ڈائریکٹر کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے کہا کہ اسے میری خدمات کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اگر میں واپس جانا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ میری رپورٹ پر مزید کوئی بحث نہیں کرنی چاہتا۔ اس پر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا کہ مجھے یونیڈو نے مختلف عرب ملکوں میں قایم کیے جانے والے سولہ ڈاکومینٹیشن سنٹروں کے کام کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں پر اپنا کام ختم کر دوں اور کل سے دوسرے سنٹروں کی طرف توجہ دوں۔ چنانچہ میں نے قاہرہ میں پائے جانے والے دوسرے دو سنٹروں کو آگاہ کر دیا کہ میں اگلے روز سے ان کا کام دیکھنے کے لیے آ رہا ہوں۔ اس کے بعد میں دوسرے عرب ملکوں میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا، جہاں پر ڈاکومنٹیشن سنٹر قایم کیے جا چکے تھے۔

میرے جانے کے بعد دوسرے یا تیسرے روز ادارہ صنعتی ترقی کے ڈائریکٹر نے میری رپورٹ

کو غور سے دیکھا۔ اپنے سارے عملے کی میٹنگ بلائی اور کہا کہ منیر صاحب کی رپورٹ سو فیصد درست ہے۔ خود مجھے علم نہیں تھا کہ میرے ادارے میں یہ دھاندلی ہو رہی ہے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ مجھے ڈھونڈھ کر واپس بلا لائے۔ اس طرح میں چوتھے روز واپس لوٹ آیا، مگر ڈائریکٹر میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ از خود مجھے یہ بات بتاتا۔ میری اس کے ساتھ اس کے بعد کوئی میٹنگ نہیں ہوئی۔ تاہم کبھی کبھی راہداری میں ہماری علیک سلیک ہو جاتی تھی اور وہ قاہرہ کی گرمی کی شکایت کرتا تھا ،جس کی شدت کا اسے درحقیقت سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس کے آفس میں کولر لگا ہوا تھا، جب کہ باقی کے سارے کمروں میں بجلی کا پنکھا تک نہیں پایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ہم اقوامِ متحدہ کے چار ایکسپرٹ وہاں پر کام کر رہے تھے۔ ان میں انگلستان کے مسٹر نیلون بھی شامل تھے، جن کا بھائی انگریزی عہد میں مصری فوج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ انھوں نے اپنے کیلنڈر پر دنوں کی گنتی لگا رکھی تھی، جس کی ابتداء اس روز سے ہوتی تھی جب وہ اپنے وطن لوٹنے کے لیے قاہرہ کو خیر باد کہیں گے۔ آخری دن کا نمبر ایک تھا۔ اس سے پہلے دن کا نمبر دو تھا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ جب ہم صبح آفس میں آتے تھے تو وہ اپنے کیلنڈر پر دیکھ کر بتاتے تھے کہ ان کی واپسی میں کتنے دن باقی ہیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسٹر نیلون، ولندیزی انجینئر مسٹر جیرار اور ہندوستانی اکانومسٹ مسٹر بھٹا چاریا خود اپنی مرضی سے وہاں پر نہیں تھے۔ اس چیز کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ مسٹر بھٹا چاریا خاص طور پر دو ہفتوں کے لیے نئی دہلی گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کی حکومت ان کا نام ان لوگوں کی فہرست سے کاٹ دے، جو اقوامِ متحدہ کے اداروں کے تحت مختلف ملکوں میں خدمات بجا لا رہے ہیں۔ وہ تین برسوں سے قاہرہ میں تھے اور ابھی مزید دو برسوں تک وہاں پر رہنا چاہتے تھے۔ مگر مجھ پر آخر تک یہ راز نہ کھل سکا کہ وہ وہاں پر کیا خدمات بجا لا رہے تھے۔ ان کی میز پر میں نے کبھی کاغذ کا ایک ورق تک نہیں دیکھا۔ تینوں حضرات پورا دن بیٹھے ہوئے گپیں ہانکتے رہتے تھے۔ پتا نہیں وہ کب اپنے مصری کونٹر پارٹ کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے۔ یوں بھی مسٹر نیلون نے مصری لوگوں کے لیے **happy crowd** کی اصطلاح گھڑ رکھی تھی اور ان کو ناقص العقل سمجھتے تھے۔

اس دوران میں اوتا نے ڈاکٹریٹ کا مرحلہ کامیابی کے ساتھ طے کر لیا تھا۔ اسے مصر دیکھنے اور وہاں کی زندگی کا مزا چکھنے کا شوق تھا۔ میں نے قاہرہ کی گارڈن سٹی "المعادی" میں، جو بارہ پندرہ کلومیٹر شہر سے باہر ہے، ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ وگرنہ اس سے پہلے جو فلیٹ مجھے زمالک میں ملا تھا وہ اوتا کو پسند نہ آتا۔ میں چونکہ وہاں پر کسی مہمان کی طرح رہتا تھا، جو بس رات کو سونے کے لیے ادھر کا رخ کرتا تھا، اس لیے مجھے پتا نہ تھا کہ اس مکان میں میرے سوا دوسری مخلوقات بھی قیام پذیر تھیں۔ ایک

رات مجھے پیشاب کرنے کے لیے اٹھنا پڑا، تو میں نے بجلی کے جلنے پر دیکھا کہ کمرے کا سارا فرش تل چٹوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ روشنی ہو جانے کے سبب وہ کمرے کے کونوں کھدروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں حیران ہوا کہ مجھے وہاں پر رہتے ہوئے پورا مہینہ ہو گیا تھا، جس کے دوران میرا آمنا سامنا اس مخلوق سے نہیں ہوا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ بہرصورت مجھے وہاں پر اوتا کو نہیں لانا چاہیے، اس لیے اگلے ہی روز میں نے المعادی میں، جہاں پر ہمارا سنٹر تھا، ایک فلیٹ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس میں کامیابی ہوئی اور المعادی کلب کے پہلو میں واقع ایک نئی بلڈنگ میں فلیٹ مل گیا۔

اوتا کو المعادی کی بستی اور فلیٹ دونوں پسند آئے۔ میں نے ایک باورچن رکھی ہوئی تھی، جو کھانا پکانے کے علاوہ فلیٹ کی صفائی ستھرائی بھی کرتی تھی۔ اسے مصری عربی کے سوا دنیا کی کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی۔ اوتا نے ہمبرگ میں ہی عربی سیکھنی شروع کر دی تھی۔ اب ہماری باورچن اس کی استاد بن گئی اور اوتا بہت جلد اس کے ساتھ عربی میں باتیں کرنے لگی۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں؟ کیا اس کے بچے بھی ہیں اور کتنے؟ اوتا کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کا خاوند نکھٹو تھا اور وہ چھ بچوں کی ماں تھی۔ اس کی آٹھ سالہ بیٹی گھر میں اپنے بھائی بہنوں کے لیے کھانا پکاتی تھی، کیونکہ ماں سویرے سویرے گھر سے نکل جاتی تھی اور کہیں دو بجے کے قریب واپس لوٹتی تھی۔ پھر، جیسے قدرت کو یہ انتظام پسند نہ تھا، میری قاہرہ سے واپسی سے ہفتہ عشرہ قبل اس کی بیٹی کھانا پکاتے ہوئے آگ لگ جانے کے سبب جل کر مر گئی۔

مصری معاشرے میں رائج رسوم و رواج ہمارے ہاں سے ملتے جلتے ہیں، مگر دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ہمارے آفس میں ایک نوجوان لڑکی کام کرتی تھی، جس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک روز کوئی نوجوان لڑکا اس کو گلی میں چلتے ہوئے دیکھے گا اور اس سے محبت کرنے لگے گا۔ شاید کبھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ پھر وہ اس کے ماں باپ سے جا کر اس کا رشتہ مانگے گا۔ مگر اس سے پہلے اس کو بہت سی دولت کمانی ہوگی کیونکہ اس کے ماں باپ اسے کہیں گے کہ کیا تم شادی کے اخراجات ادا کرنے کی توفیق رکھتے ہو۔ اس کے پیشگی ادا کردہ حق مہر سے اس کے ماں باپ ان کے لیے سامانِ خانہ خریدیں گے، ایک فلیٹ کرایے پر لیں گے اور اس کو خریدے ہوئے فرنیچر سے بھر دیں گے۔ پھر باقی ماندہ رقم سے ان کی شادی کی تقریب منائی جائے گی۔ شبِ زفاف کی صبح اس کا خاوند بستر کی چادر کو بالکنی پر لٹکا دے گا تاکہ ہر کوئی دیکھ لے کہ اس کی بیوی باکرہ ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ مصری ڈاکٹر اس معاملے میں مہارت رکھتے ہیں اور زنانہ اندام کی جھلی کو اتنی خوبی سے سی دیتے ہیں کہ ہر حالت میں شادی کی رات خون کے قطرے گرتے ہیں۔

ہمارے مکان کے بالمقابل والی بلڈنگ میں ایک فیملی رہتی تھی ،جس کی چار جوان جہان بیٹیاں تھیں، جو صحیح معنوں میں ایک سے ایک بڑھ کر جوبن پر تھیں۔ چاروں ناشتے کے وقت سے لے کر دن ڈھلنے تک ، جب انھیں کلب میں جانا ہوتا تھا، بالکنی کی زینت بنی رہتی تھیں۔ دوپہر تک وہ شب خوابی کا لباس بھی تبدیل نہ کرتی تھیں، جس میں سے ان کی جوانی ابل ابل پڑتی تھی۔ شاید وہ اس انتظار میں تھیں کہ کوئی لڑکا ان کو دیکھے اوران پر عاشق ہو جائے اوران کے ساتھ شادی کرنے کا آرزومند ہو۔

ہمارے ایک مصری کولیگ نے اپنی بہن کی شادی کے موقع پر ہمیں بھی شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ وہاں پر ایک نوجوان سنا رہا تھا کہ اس کا باپ اس کے بھائی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس نے اس کی شادی بیک وقت دولڑکیوں کے ساتھ کر دی تھی اوراس جواں مرد نے ایک رات میں دونوں بیویوں کو حمل کر دیا تھا۔ شادی کے عین نو ماہ بعد انھوں نے دو بیٹے جنے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ نوجوان کو انگریزی نہیں آتی تھی اور وہ مصری عربی بول رہا تھا، وگرنہ خدا جانے وہاں پر موجود یورپین مہمانوں پر اس کی تعلّی کا کیا اثر پڑتا۔

میرا شاعر دوست احمد سراج الدین مجھے بتایا کرتا تھا کہ اس کی آمدنی بہت تھوڑی ہے اور وہ شاید ہی اس زندگی میں شادی کے لیے اتنی رقم جمع کر سکے گا، جس کی توقع لوگ اپنے داماد سے رکھتے ہیں۔ پھر جب میں ایک بار کئی برسوں کی غیر حاضری کے بعد قاہرہ گیا تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے محلے کے نوجوانوں نے ایک کمیٹی ڈال رکھی ہے، جس میں ہر کوئی ماہوار ایک مقررہ شرح کے مطابق رقم جمع کراتا تھا۔ سال میں دو تین بار قرعہ نکلتا تھا اور جس خوش قسمت کے نام نکلتا تھا اس کو شادی کے لیے مطلوبہ رقم مہیا کی جاتی ہے۔ اس کی شادی پر آٹھ سو پونڈ کی رقم لگی تھی جب کہ اس کی ماہوار آمد تیس پونڈ تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو کتنے برسوں تک اپنی شادی کا قرض ادا کرنا ہوگا۔

قاہرہ میں جرمن مستشرقین کی طرف سے قایم کردہ ایک آرکیولاجیکل انسٹیٹیوٹ پایا جاتا ہے۔ میں ابتداء میں چند روز تک اس کے مہمان خانے میں مقیم رہا تھا۔ وہاں پر میرا ایک طالب علمی کے زمانے کا دوست ڈاکٹر ماینیکے **(Dr. Meineke)** ان دنوں بطور ریسرچ اسکالر کام کرتا تھا، جو بعد میں برلن کے مصری میوزیم کا ڈائریکٹر بنا تھا۔ اس نے مجھے ایک پاس بنوا دیا، جو صرف آثارِ قدیمہ کے اسکالروں کو ملتا ہے۔ اس کی مدد سے مجھے مصر بھر میں ہر میوزیم اور آثارِ قدیمہ کی کھدائی کی ہر سائٹ پر جانے کی اجازت تھی۔ اس لیے میں قریب قریب ہفتے میں ایک دو روز قاہرہ کے مصری میوزیم میں گزارتا تھا۔ اس وجہ سے میں جانتا ہوں کہ جس قدر چیزیں وہاں پر نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں ان سے بیس تیس گنا اشیاء میوزیم کے تہ خانے میں پڑی ہیں، جن کو اب تک سوائے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے کسی نے نہیں دیکھا۔

قاہرہ (جس کو وہاں کے باسی "مصر" کے نام سے پکارتے ہیں) کے تاریخی آثار کی زیارت کو میں نے اوتا کی آمد تک ملتوی رکھا تھا، البتہ اس شہر کی مسجدوں کی تلاش میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ عام طور سے لوگ فرعونوں کے زمانے کی یادگاروں کو دیکھنے پر سارا وقت لگا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ قابلِ دید ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ جو تھوڑا بہت وقت ٹورسٹ لے کر آتے ہیں وہ ان کی نذر ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ بہت سا وقت تھا اس لیے فاتح مصر عمرو ابن العاصؓ کی مسجد سے شروع ہو کر، جو قاہرہ کے محلے الفسطاط میں ہے، جہاں پر ان کی فوجوں کا کیمپ تھا، میں نے باری باری ساری اہم مسجدوں کی زیارت کی۔ اس شہر میں چار سو مسجدیں پائی جاتی ہیں۔ عام طور سے سیاح الازہر کی مسجد کو دیکھ کر وطن لوٹ جاتے ہیں۔ مجھے امام شافعیؒ کی مسجد اور مقبرے کو دیکھنے کا خاص طور پر شوق تھا، جسے غازی صلاح الدین ایوبی نے بنوایا تھا اور اس کے پہلو میں ایک مدرسہ تعمیر کروایا تھا۔ ابنِ طولون کی مسجد کو عام طور سے اس شہر کی قدیم ترین مسجد کا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہاں پر آج بھی قرآن اور چاروں اسلامی فقہ جات پڑھائی جاتی ہیں۔ مصری عیسائیوں (قبطیوں) کے چرچ اتنی بڑی تعداد میں تو نہیں پائے جاتے، مگر انسان ان کی تلاش میں نکلے تو سات تاریخی چرچ نکل آتے ہیں جو اسلامی مسجدوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں پہلو بہ پہلو ایک شہر میں آباد ہیں۔

"المتحف المصری" قدیمی مصری تہذیب کا میوزیم ہے، جسے انسان ایک آدھ دن میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ہم نے بے شمار دن وہاں پر گزارے۔ فرعونوں کی ممیاں حیرت انگیز طور پر صدیوں قبل کے انسانوں کی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ مجھے مصریوں کی طرزِ تحریر (Hieroglyphe) بہت پسند ہے، جو تصویری طور پر لکھی جاتی ہے۔ مجھے اگر یہ اختیار دیا گیا ہوتا کہ میں اپنے لیے ایک طرزِ تحریر چنوں تو میں مصری طرزِ تحریر کا انتخاب کرتا۔ قاہرہ میں اس کے علاوہ بھی بہت سے میوزیم ہیں، جن میں سے اسلامی میوزیم اور قبطی میوزیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس شہر کی لائبریری "دار الکتب" اسلامی دنیا کی اہم ترین لائبریریوں میں سے ہے، جہاں پر صدیوں کے خزانے جمع کر دیے گئے ہیں۔ بالخصوص عرب دنیا میں چھاپہ خانے کی آمد سے لے کر اب تک مصر میں چھاپی جانے والی اگر تمام نہیں تو بیشتر کتابیں وہاں پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مجھے اتنی فرصت حاصل نہ تھی کہ وہاں پر جا کر کسی قسم کا تحقیقی کام کر سکتا۔

اوتا کا قیام مصر میں دو ماہ کا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اسے امتحان کے لیے کی جانے والی مشقت کے بعد کچھ وقت آرام کا مل جائے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر میں یونیڈو کی پیشکش کو قبول کر کے دو برسوں کے لیے مصر میں رہنا چاہوں تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا۔ کیا وہ اتنے لمبے

عرصے کے لیے ایک عرب ملک میں رہنا پسند کرے گی۔ ہم دونوں نے بہت جلد محسوس کیا کہ اس کا دل قاہرہ کی زندگی سے اوب گیا تھا۔ اس کی دلچسپی کا سامان وہاں پر موجود نہیں تھا۔ جب میں کام پر چلا جاتا تھا تو اس کی مشغولیت بس اتنی تھی کہ باورچن کے ساتھ مارکیٹ میں جائے اور کھانے پینے کا سامان خرید کر گھر لوٹے۔ پھر المعادی کلب میں پیرا کی کے لیے چلی جائے۔ اس کی وہاں سے واپسی تک کھانا تیار ہوتا تھا۔ اس کے پاس مطالعہ کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی کتابیں وہ دو اور تین بار پڑھ چکی تھی۔ کلب میں ایک چھوٹی سی لائبریری موجود تھی مگر وہ کتابیں اوتا کی دلچسپی کی نہیں تھیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آخر اس نے اتنے برسوں کی محنت ومشقت کے ساتھ ہسپانوی لٹریچر میں ڈاکٹریٹ کس لیے کی تھی؟ اگر وہ مزید دو برسوں کے لیے مصر میں رہ گئی، تو اس کی ساری کی کرائی محنت رائیگاں جائے گی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو بیکار بیٹھنے پر فخر کرتی ہیں۔ اس کی ساری زندگی مصروفیت میں گزری تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں اپنی لیاقت اور تعلیمی اختصاص کے مطابق ملازمت تلاش کرلے۔ خود مجھے یہ احساس تھا کہ میں اپنا وقت مصر میں ضائع کر رہا ہوں، کیونکہ میرا اصل میدان تحقیق کا ہے، جس کی طرف میں عرصہ ہوا توجہ نہیں دے پایا تھا۔ اس لیے میں نے یونیڈو کی پیشکش کو رد کردینے کا فیصلہ کرلیا۔

اوتا کی واپسی سے پہلے ہم فرعونوں کے آثارِ قدیمہ کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ یوں تو مصر میں ۸۰ اہرام پائے جاتے ہیں، مگر اہم ترین وہ تین اہرام ہیں جو قاہرہ کے مضافاتی علاقے (Giza) غزہ میں کھڑے ہیں۔ ان کے پہلو میں ابوالہول (Sphinx) بیٹھا ہوا ہے۔ اس گروپ کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ چونکہ ہمارے دروازے پر تھے اس لیے ان کو تفصیلی طور پر دیکھنے کے لیے ہم بار بار وقت نکال کر دن کے وقت اور چاندراتوں میں ان کے گرد گھوم چکے تھے، ان کے اوپر چڑھ چکے تھے اور اہرام کے اندر پائے جانے والے کمروں تک کو ہاتھ لگا آئے تھے۔ سب سے پہلا سوال اہرام کی عمر کا تھا، جس کے بارے میں ابنِ عربیؒ نے "فتوحاتِ مکیہ" میں لکھا تھا: "اہرام، جو ملک مصر میں ہیں، ان میں سے ایک میں ان کی بناء کی تاریخ لکھی ہے کہ وہ اس وقت بنائے گئے جب کہ برج نسر برج اسد کے اندر دورہ کر رہا تھا۔ اور اس میں شک نہیں ہے کہ اب برج نسر کا دورہ فلکِ جدی کے اندر واقع ہے۔ ایسا ہی ہم کو معلوم ہوتا ہے۔ بدیں حساب اب تک تیس لاکھ سال ہوتے ہیں اور معلوم ہوا کہ ستارے ثابتہ بروجِ اطلس کے اندر دورہ کرتے ہیں۔" یہ حساب ابنِ عربیؒ نے علمِ ہیئت کے واسطے سے لگایا تھا۔ ہمارے وقتوں میں علمِ مصریات (Egyptology) کے ماہروں کا کہنا ہے کہ خوفو (Khufu)، جس کو یونانی Cheops کا نام دیتے تھے، کی حکمرانی کا زمانہ ۲۵۸۹ سے ۲۵۶۶ قبل مسیح تک تھا۔ گویا اس کے

لیے بطور مقبرہ بنایا جانے والا اہرام ساڑھے چار ہزار سال قبل بنایا گیا تھا۔ اس کے حجم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چاروں طرف سے ۲۳۰ میٹر لمبا ہے اور تیرہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر میں لگنے والے پتھروں کے حجم کا تصور اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر پتھر کا وزن اڑھائی ٹن ہے۔ اہرام کی بلندی ۱۴۰ میٹر ہوا کرتی تھی، جس کی اوپر والی نوک دراصل ایک چوکور پلیٹ فارم ہے، جس کا رقبہ دس مربع میٹر بتایا جاتا ہے۔ اس اہرام میں دوسوتیس لاکھ پتھر لگائے گئے تھے، جن کو آپس میں جوڑنے کے لیے سیمنٹ یا گارا استعمال نہیں ہوا۔ یونانی مؤرخ ہروڈوٹ (Herodotus) نے لکھا تھا کہ اہرام کو ایک لاکھ غلاموں نے بنایا تھا۔ مگر یہ بات درست نہیں لگتی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کو تعمیر کرنے والے مستریوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی، جب کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے مزدور سولہ ہزار سے بیس ہزار تک تھے۔ اس سے زیادہ انسان اس سائٹ پر کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ لوگ غلام نہیں تھے۔ ان کو معاوضہ ملتا تھا۔ بڑے اہرام کے بنانے میں اندازاً بیس برس لگے تھے۔ مگر اس سوال کا اطمینان بخش جواب اب تک نہیں مل سکا کہ اتنے بھاری پتھروں کو کس طریق سے اہرام کی بلندی تک چڑھایا گیا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ایسی مشینیں موجود نہ تھیں، جو ہمارے وقتوں میں یہ کام آسانی کے ساتھ کر سکتی ہیں۔

ابوالہول (Sphinx) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے قبروں پر پہرہ دینے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کا سر انسانی ہے مگر دھڑ ایک شیر کا ہے۔ گویا انسانی عقل کو درندوں جیسی طاقت کے ساتھ مدغم کر دیا گیا ہے۔ اس کی اونچائی بیس میٹر ہے اور لمبائی ۷۳ میٹر۔ کہتے ہیں کہ وہ خداوند "را" کی نمائندگی کرتا ہے، جب کہ اس کی شکل بنوانے والے فرعون خیفرین (Chephren) سے ملتی جلتی ہے۔

اب ہمارے سامنے القصر (Luxor) اور، اگر حکومت اجازت دے تو، اسوان جانا باقی تھا۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز میں ان مقامات تک پرواز کرنے کی ممانعت تھی، کیونکہ مصر بدستور اسرائیل کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھا۔ البتہ القصر تک انسان ریل گاڑی کی سلیپنگ کوچ میں سفر کر سکتا تھا جو رات بھر میں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی تھی۔ کشتی میں بھی یہ سفر کیا جا سکتا تھا، مگر اسمیں زیادہ وقت لگتا تھا۔

القصر دراصل اس جگہ پر واقع ہے، جہاں پر فرعونوں کے زمانے میں ان کا دارالحکومت طیبہ (Thebe) پایا جاتا ہے۔ یہ مقام موجودہ آبادیوں القصر اور کرناک کے درمیان تھا۔ ان تینوں مقامات کو دنیا کا سب سے بڑا میوزیم قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہاں پر میلوں تک پھیلے ہوئے رقبہ میں مندر، قبرستان اور ایک قدیمی محل نما مندر کے آثار ملتے ہیں۔ یہ جگہ دریائے نیل کے دونوں طرف واقع ہے۔ ساحل کے دائیں ہاتھ پر القصر اور کرناک کے مندر ہیں اور ان دونوں کو آپس میں ملانے والے تیسرے

مندر کے آثار ہیں۔ ساحل کے بائیں ہاتھ پر قبرستان ہیں، جو بہت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھراس جگہ پر، جوطیبہ کے نام سے جانی جاتی تھی، میمنون (Memnon) کے دوعظیم بت ہیں، جوایک بہت بڑے مندر کے دربانوں کی طرح دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی اونچائی ۲۱ میٹر ہے، جو ہمارے وقتوں کی چار پانچ منزلہ بلڈنگ کے برابر ہے۔ القصر اور کرناک کے مندروں کے ستون کھڑے ہیں، جواتنے بلند اور بھاری بھرکم ہیں کہ انسان تصور نہیں کرسکتا کہ اتنی صدیوں پہلے کیسے اتنے بڑے پتھروں کوان ستونوں کے اوپر چڑھایا گیا تھا اور کیونکران کے اوپر پتھروں کی بنی ہوئی چھت ڈالی گئی تھی۔ ان کے مقابلے میں کم بلند وبالا مگراپنے نقشے کے اعتبار سے بہت مؤثر وہ عمارت ہے، جس کوملکہ ہاچپ سوت (Hachepsut) نے اپنے، اپنے باپ اوراپنے خاوند کے لیے، جواس کا سگا بھائی تھا، بطور مقبرہ بنوایا تھا۔ مگران مقبروں کو چوروں نے لوٹ لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں بادشاہوں کی وادی میں ۱۹۲۲ء میں توت انخ آمون کی قبردریافت ہوئی تھی، جس کو چوروں نے نہیں لوٹا تھا۔ اس قبر میں سے بے شمار ساز وسامان نکلا تھا، جس میں فرعون کی اپنی ممی اور وہ کفن ملا تھا، جس میں اس کی لاش کو رکھا گیا تھا۔ اس کی ممی کے اوپر جوخول بنایا گیا تھا اس پر سونا مڑھا گیا تھا۔ اس کی نمائش دنیا کے مختلف حصوں میں ہوچکی ہے۔ البتہ اس کا اصل مقام قاہرہ کا المتحف المصری میں ہے جہاں پر ہم نے اسے دیکھا تھا۔

جب ہم وہاں پر ایک قبرستان میں گھوم رہے تھے، جس میں حکومت کے کارندوں کو دفن کیا گیا تھا، تو ہمارے گائیڈ نے کہا آپ ایک منٹ ٹھہریں، میں آپ کو ایک بچے کی ممی دکھاتا ہوں، جس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں اتر گیا۔ جب وہ اوپر آیا تو سچ مچ اس کے ہاتھوں میں ایک بچے کی ممی پکڑی ہوئی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ممی گائیڈوں کی مشترکہ ہے اور ہر گائیڈ اس کو اپنی قرار دے کر دکھاتا اور بخشش حاصل کرتا ہے۔

مجھے قاہرہ سے واپسی کے راستے میں ویانا (Vienna) سے ہوکر جانا تھا جہاں پر یونیڈو کا ہیڈ آفس تھا۔ میں نے اپنے کام کی رپورٹ پیش کی اور بتادیا کہ میں اپنے کام کی مدت میں توسیع کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود بہت برسوں تک مجھے یونیڈو کی طرف سے دوسرے ممالک میں بھیجے جانے کی تجاویز پیش ہوتی رہیں، جن میں لیبیا اور پاکستان بھی شامل تھے۔ اس دوران میں اوتا کو ہمبرگ میں سٹیٹ اور یونیورسٹی لائبریری میں ایگزیکٹو پوسٹ پر تعیناتی مل چکی تھی۔ اس کے سپرد جنوبی امریکا، سپین اور پرتگال کا سیکشن تھا۔ اس کے علاوہ اس کے تحت ایک اسپیشل لائبریری تھی، جس کے لیے ایک جرمن تاجر نے اپنی جائیداد وقف کردی تھی۔ وہ لمبے عرصے تک میکسیکو میں مقیم رہا تھا، جس کے بارے میں اس نے اتنا لٹریچر جمع کیا تھا کہ اس کی نظیر ساری دنیا میں نہیں ملتی۔ جب وہ ہمبرگ واپس لوٹا تو وہ ساری

کتابیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اوتا اس لائبریری کی بھی ڈائریکٹر تھی اور اس نے تیس برسوں کے دوران اس کتب خانے کے ذخیرے کو چار گنا کر دیا تھا۔ وہ پنشن پانے کے بعد بھی اسکے انتظامی بورڈ کی ممبر ہے

مجھے ہمبرگ واپس لوٹنے کے بعد انسٹیٹیوٹ میں ایک عجیب و غریب صورتِ حال سے واسطہ پڑا۔ میں نے مصر جانے سے پہلے ایک شخص کو اپنے اسٹاف میں قبول کر لیا تھا، جس کی شخصیت کی کجی مجھ پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میں نے سن رکھا تھا کہ شادی کرنے کے چوتھے ہفتے اس نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید کسی وجہ سے ان کی آپس میں نہیں بن سکی تھی۔ میری ہمبرگ سے لمبی غیر حاضری کے دوران اسے میرے خلاف ایک محاذ بنانے میں کامیابی ہوگئی تھی۔ میرا اقامت مقام اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا تھا، مگر اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس شخص کو ہر روز کوئی نیا شوشہ سوجھ جاتا تھا، جس کے نتیجے میں سنٹر میں ناچاقی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ یہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ بعض اراکین انسٹیٹیوٹ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہمیں اس وقت تک خبر نہ تھی کہ اس کی شخصیت میں ایک زبردست جنگ جاری تھی، جس کا تعلق اس کی ذات کے نفسیاتی الجھاؤ سے تھا۔ وہ بطور مرد پیدا ہوا تھا، مگر اس کے جسم میں ایک عورت پوشیدہ تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں تب جا کر چلا جب اس نے کھلے بندوں ایک مرد کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ اس کی طبیعت کی متلون مزاجی سچ مچ نک چڑھی عورتوں جیسی تھی۔ یہ صورتِ حال تین چار برسوں تک رہی، تب کہیں جا کر اس سے خلاصی ہوئی اور سارے اسٹاف کی جان میں جان آئی، وگرنہ اس نے ہماری زندگی اجیرن کر دی تھی۔

احمد علی تالپور

اوائل ۱۹۷۲ء میں احمد علی تالپور (جو اپنے نام کا تلفظ ٹالپور کرتے تھے) ہمبرگ تشریف لائے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ، جو صدارت پر متمکن ہونے کے بعد اپنے پہلے غیر ملکی دورے پر نکلے تھے، یورپ آئے تھے۔ راستے میں شدید ناچاقی پیدا ہوگئی اور وہ وفد کو چھوڑ کر ہمبرگ چلے آئے، جہاں پر ان کا ایک واقف کار ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (TCP) کا نمائندہ تھا، جو ون یونٹ کے زمانے میں، جب تالپور صاحب مغربی پاکستان میں وزیر تھے، ان کا پرسنل اسسٹنٹ رہ چکا تھا۔ ان کے قیام کے دوران، جو خاصا لمبا تھا، ہماری ملاقات اکثر ہوتی تھی۔ میں ان کے لیے **Dawn** کا تازہ شمارہ لے کر جاتا تھا، جسے وہ ہجے کر کے پڑھا کرتے تھے۔ ان کو انگریزی بس واجبی سی آتی تھی۔ وہ دراصل بھٹو صاحب کی کابینہ میں کوئی اہم وزارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی رسول بخش تالپور کو

سندھ کا گورنر بنایا گیا تھا، مگر یہ چیز ان کو مطمئن نہ کرسکتی تھی۔ انھوں نے کہا: خاندان کا سربراہ میں ہوں اور اگر میں نے پی پی پی کی سندھ میں پشت پناہی نہ کی ہوتی تو بھٹو کو وہاں پر کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ بھٹو فیملی ان کی نظر میں خاصی غیر اہم تھی۔ انھوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا: اس فیملی کے پاس زمین ہی کتنی ہے؟ اس کا شمار سندھ کے بڑے جاگیرداروں میں نہیں ہوتا۔ میرے بھائی رسول بخش کو سیاست کی کوئی خبر نہیں ہے۔ وہ مجھے ہر روز فون کر کے ہدایات لیتا ہے۔ انھوں نے اس وقت تک پارلیمان کی ممبری کے لیے دستخط بھی نہیں کیے تھے اور ملک سے اپنی غیر حاضری کو طول دیتے جا رہے تھے۔ پھر جب پارلیمان نے دستور پاس کیا تو احمد علی تالپور نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کو یہ چیز پسند نہ آئی تھی کہ وزیرِ اعظم کے احکام صدر کے دستخطوں کے بغیر نہیں چل سکتے۔ انھوں نے اس بارے میں ایک مضمون میں لکھا کہ وزیرِ اعظم صدر کا چپڑاسی نہیں ہے جو فائلیں اٹھائے ہوئے صاحب بہادر کے دروازے پر حاضر ہو۔ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ اس زمانے میں بھٹو صاحب صدرِ مملکت تھے اور تمام اختیارات کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ اپوزیشن نے ان کی مرضی کے خلاف دستور میں وزیرِ اعظم کو حکومت کا سربراہ بنایا تھا اس لیے بھٹو صاحب نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ وزیرِ اعظم کے احکام اس وقت تک جاری نہیں ہو سکیں گے، جب تک ان پر صدر کے دستخط نہ ثبت ہوں۔ احمد علی تالپور آخر تک بھٹو صاحب کی مخالفت میں ڈٹے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل ضیاء الحق نے جب حکومت بنائی تو اس میں احمد علی تالپور کو وزیرِ دفاع بنایا گیا تھا۔

ایک روز باتوں باتوں میں جماعتِ احمدیہ کا ذکر آ گیا تو تالپور صاحب نے بتایا کہ ان کے تعلقات مرزا بشیرالدین محمود احمد کے ساتھ بہت دوستانہ تھے۔ ایک بار مرزا صاحب سندھ میں اپنی زمینوں پر آئے تو تالپور صاحب کی دعوت پر ان کی رہائش گاہ پر تشریف لائے۔ تالپور صاحب کی بیٹی بہت چھوٹی تھی، وہ جا کر مرزا صاحب کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس پر مرزا صاحب نے کہا کہ اب یہ میری بیٹی ہے۔ پھر جب اس بیٹی کی شادی کا وقت آیا تو تالپور صاحب نے مرزا صاحب کو خط لکھا کہ آپ کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ آپ اس تقریب میں شامل ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو رخصت کریں۔ مرزا محمود احمد اس وقت بیماری کے سبب سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ انھوں نے تالپور صاحب کی بیٹی کے لیے ایک بہت خوبصورت ڈبہ تحفے میں بھیجا جو سو سو کے کرنسی نوٹوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

۱۹۷۲ء کے موسمِ خزاں میں جرمن پاکستان فورم کی میٹنگ جنوبی جرمنی کے شہر ٹیوبنگن میں رکھی گئی تھی۔ کتابوں کی ایک دکان میں مجھے برتھولٹ بریشٹ (Bertolt Brecht) کا مکمل دیوان چار جلدوں میں نظر آیا۔ میں اسے خرید کر باہر نکل رہا تھا کہ میرا آمنا سامنا انے ماری شمل سے ہو گیا۔ اس

نے کتاب کو دیکھنے کی خواہش کی جو میں نے خریدی تھی۔ پھر اس نے کہا: اچھا، تو آپ جناب کمیونسٹوں کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ صرف مطالعہ ہی نہیں کرتا بلکہ عین ممکن ہے کہ میں اسکا ترجمہ اردو میں کروں گا۔ کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی مگر اس وقت تک میں نے اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران میں نے ریل گاڑی میں نظموں کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ہمبرگ پہنچنے تک چالیس نظموں کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

پاکستان کا تیسرا سفر

ٹیوبنگن میں ملاقات کے دوران میں نے انے ماری شمل سے جاننا چاہا تھا کہ اس کے تحت ہارورڈ یونیورسٹی میں جو غالبؔ اور میرؔ کے تراجم ہو رہے تھے وہ کام کس مرحلے پر ہے۔ اس نے بتایا کہ ابتدائی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ایک پاکستانی انجینئر سے غالبؔ اور میرؔ کی غزلوں کے تراجم انگریزی نثر میں کرائے جائیں۔ پھر یہ مسودہ مختلف امریکی شاعروں کو بھیجا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ معاوضہ کے عوض اس نثر کو انگریزی نظموں میں ڈھالیں اور بیشک پوری پوری آزادی سے کام لیں۔ دراصل منتظمین کے مدِنظر فٹز جیرالڈ (Edward Fitzgerald) کے خیامؔ کی رباعیات کے تراجم تھے جو براہِ راست فارسی سے نہیں کیے گئے تھے۔ انے ماری شمل نے بتایا کہ یہ تجربہ بالکل ناکام رہا تھا کیونکہ امریکی شاعروں کی رسائی غالبؔ اور میرؔ کی روحوں تک نہ ہو پائی تھی۔

بھٹو صاحب کے زمانے میں فارن آفس میں نئے ڈپلومیٹ بھرتی کرنے کی خاطر ایک اسکیم چلائی گئی تھی جو **lateral entry scheme** کے نام سے مشہور ہوئی۔ میں نے بھی اس کے لیے ایک تحریری امتحان بون میں دیا تھا۔ میرے ساتھ اس روز وہاں پر انعام الحق، ڈاکٹر سعید چوہدری اور ڈاکٹر عثمان ملک شامل ہوے تھے۔ پرچہ صرف ایک تھا جس میں بھٹو صاحب کی ایک کتاب کا دو تین صفحے کا اقتباس دیا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ نکالنا تھا۔ اس کام میں یقیناً انعام الحق، جو صحافی تھے اور اس زمانے میں جرمن ریڈیو "ڈوئچے ویلے" کے اردو پروگرام سے منسلک تھے، ہم سب سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس گروپ میں سے صرف ان کو لیا گیا تھا۔ وہ آگے چل کر مختلف ممالک اور اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت میں وہ تین برسوں تک وزیرِ خارجہ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ میرے مدِنظر دراصل فارن سروس میں جانا نہیں تھا بس یونہی پاکستان کی بیوروکریسی کو قریب سے دیکھنا تھا۔ پھر جب اس امتحان کے چندے بعد میرا پاکستان ہسٹری کانفرنس

کے سلسلے میں اپریل ۱۹۷۳ء میں اسلام آباد جانا ہوا تو خورشید حسن میر کی سرکردگی میں ان لوگوں کا انٹرویو ہو رہا تھا، جنھوں نے امتحان میں حصہ لیا تھا۔ میں بھی اس بورڈ کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہوا۔ خورشید حسن میر نے، جو مجھے اس واسطے سے جانتے تھے کہ ان کی بیوی میری بھاوجہ آپا محمودہ کے تحت سر سید پبلک سکول راولپنڈی میں استانی تھیں، چھوٹتے ہی کہا: آپ تو ہمبرگ میں بہت اچھے انسٹیٹیوٹ میں کام کر رہے ہیں، آپ کو فارن سروس میں آنے سے سراسر گھاٹا رہے گا۔ بورڈ کے ایک دوسرے ممبر نے بھی اس بات کی تائید کی اور کہا: یہ اسکیم آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی موجودہ پوزیشن پر کام کرتے رہیں۔ وہ اس سروس سے کہیں زیادہ محفوظ ہے جس کے لیے ہم لوگوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔

اس چیز کا تھوڑا سا اندازہ مجھے بون میں پاکستانی سفیر سجاد حیدر کے طرزِ عمل سے ہو چکا تھا، جو وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ ان کا تو لوگوں نے نام ہی " کالا ناگ " رکھ چھوڑا تھا، جس کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا۔ انھی دنوں میں ان کے پریس اتاشی ڈاکٹر یاسین رضوی کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ جرمن پریس میں کوئی خبر چھپوانے کے سلسلے میں یا جب کبھی ان کو ٹیلی ویژن پر پاکستان کا نکتۂ نظر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو خود سجاد حیدر مجھے فون کرتے تھے۔ ان کی فرمائش پر میں اخباروں، ریڈیو یا ٹیلی ویژن اسٹیشنوں سے رابطہ کر کے انٹرویو کا انتظام کرتا تھا۔ بعض پروگراموں میں مجھے خود حصہ لینا پڑتا تھا۔ اگر کبھی میں سجاد حیدر سے کہہ دیتا تھا کہ یہ کام وہ ڈاکٹر یاسین رضوی سے کیوں نہیں کرواتے تو ان کا جواب اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ بہت سست ہیں یا ان کی بات چھوڑیں، وہ " کلے " پہ بندھے ہوں یا چور ان کو نکال کر لے جائیں، بات ایک ہی ہے۔ منیر احمد شیخ کو ان کے ساتھ بون میں واسطہ پڑا تھا۔ وہ ان سے بہت نالاں تھا۔ جب آگے چل کر اس کی تعیناتی نئی دہلی میں ہوئی تو پھر ایک بار وہ سجاد حیدر کے پنجے میں تھا۔ چنانچہ اس نے وہاں سے واپسی پر ایک مضمون نما افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان اس نے " ہز ایکسی لینسی " رکھا تھا۔ اس میں اس کی اور سجاد حیدر کے دوسرے ماتحت ڈپلومیٹوں کی حالتِ زار کا حال پڑھا جا سکتا ہے۔

اسلام آباد میں میری ملاقات اپنے جرمن نومسلم دوست دتلف خالد سے ہوئی، جس کو اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ملازمت سے وزارتِ تعلیم کے حکم پر معطل کر دیا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام تھا کہ وہ ملک کے انگریزی اخباروں میں دستور کی اسلامی دفعات کے خلاف مسلسل لکھتا رہا تھا۔ اس کے تعلقات سوشلسٹ حلقوں کے ساتھ تھے اور پی پی پی کے بائیں بازو کے لوگ، جن میں خورشید حسن میر شامل تھے، اس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ خالد کو تنخواہ مل رہی تھی مگر اس کا داخلہ اسلامک ریسرچ

انسٹیٹیوٹ میں بند تھا۔ جب میں نے اس بارے میں اس ادارے کے سربراہ ڈاکٹر ہالے پوتا سے بات کی تو پتا چلا کہ اس معاملے کے پیچھے دراصل ایک "اخلاقی وجہ" تھی، جس کا ذکر وزارت کی چارج شیٹ میں سرے سے غائب تھا۔ اس کا داخلہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں بند تھا۔ اس "اخلاقی وجہ" سے میری ملاقات خالد نے کرائی۔ اس کی عمر اس زمانے میں چوبیس پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ خاصی دلفریب شکل وصورت کی نوجوان عورت تھی، جس کی کفالت کی ذمہ داری خالد نے اٹھا رکھی تھی۔ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مولوی حضرات کو اس کی موجودگی پر اعتراض پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اس زمانے میں ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں رہ رہے تھے۔ دونوں میرے ساتھ ہمارے آبائی گاؤں چنگا بنگیال بھی گئے تھے۔

خالد نے خواجہ مسعود سے میرا ذکر کیا اور بتایا کہ میں نے برتھولٹ بریشٹ کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کو یہ نظمیں سننے کا شوق تھا۔ اس طرح میری ان کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کے ذریعے یہ خبر فیض احمد فیض تک پہنچی، جنھوں نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا۔ وہ نظمیں سن کر بہت خوش ہوے۔ انھوں نے کہا: اگر آپ واپس جا کر مجھے اتنی نظمیں ترجمہ کر کے بھیج دیں کہ ایک کتاب بن سکتی ہو تو میں اس پر پیش لفظ لکھوں گا۔ مگر اس کتاب کو شائع کون کرے گا؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آپ لاہور جا رہے ہیں تو وہاں پر پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے عبدالرؤف ملک سے جا کر بات کریں، وہ عبد اللہ ملک کے بھائی ہیں اور پاکستان میں سوشلسٹ لٹریچر چھاپنے والوں میں اول نمبر پر ہیں۔

میں نے لاہور میں عبدالرؤف ملک سے بات کی۔ وہ کتاب چھاپنے کے لیے تیار تھے، مگر اس شرط پر کہ جرمن حکومت یا کوئی دوسرا ادارہ ان کو جملہ اخراجات پیشگی ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتابیں سویٹ یونین کی مالی امداد سے چھپتی ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ بات یہیں پر ختم ہو جائے گی کیونکہ مغربی جرمنی کا کوئی سرکاری ادارہ ایک کمیونسٹ کی کتاب چھاپنے کے لیے امداد نہیں دے گا۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں برتھولٹ بریشٹ کا عام طور سے بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔

اسی سفر کے دوران یوسف بچ صاحب نے، جن کو بھٹو صاحب نیویارک سے اپنے ساتھ لائے تھے، جہاں پر وہ لمبے عرصہ سے پاکستان کے مشن سے منسلک تھے اور جو اسلام آباد میں ان کے دستِ راست تھے، مجھے ایک روز حکومت کے مہمان خانے میں کھانے پر آنے کی دعوت دی۔ ان کی روشن خیالی سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہ خود کشمیر کے رہنے والے تھے اور چاہتے تھے کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے لیے قابل قبول ہو۔ جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں نے فارن آفس کی طرف سے لیے جانے والے امتحان میں شرکت کی ہے تو انھوں نے کہا:

میری ساری عمر فارن آفس کی سروس میں گزری ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اگر آپ کو جرمنی میں مستقل ملازمت ملی ہوئی ہے تو اس کو چھوڑ کر واپس نہ لوٹیں وگرنہ میری طرح پچھتائیں گے۔ اسلام آباد سے بہت جلد ان کا دل بھر گیا تھا اس لیے ان کو ڈنمارک میں سفیر مقرر کیا گیا تھا۔

جب مارچ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں شورش پیدا ہوئی تو میں قاہرہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ہمیں خبریں ملتی تھیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگالیوں کو کھلم کھلا بغاوت پر اکسایا ہے، جس کے نتیجے میں ملک میں فسادات ہو رہے تھے، مگر اس وقت تک پتا نہیں چل رہا تھا کہ پاکستانی فوج کس حد تک صورتِ حال پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ میرے قاہرہ پہنچنے کے بعد پاکستان کی خبریں ملنی کم ہو گئی تھیں۔ مجھے طبعی طور پر اپنے دوست محمد موسیٰ عارف اور ان کے بیوی بچوں کی فکر تھی، جو چٹاگانگ میں رہتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے نام خطوط لکھے، جن کا کوئی جواب نہ آیا۔ اس پر میں نے اپنے دوسرے واقف کاروں کو، جن کے ساتھ میری ملاقات مشرقی پاکستان کے سفروں کے دوران ہوئی تھی، خطوط لکھے اور ان سے درخواست کی کہ مجھے عارف صاحب اور ان کی فیملی کے بارے میں بتائیں کہ وہ کس حال میں ہیں اور کیا میں ان کی کسی طرح سے مدد کر سکتا ہوں؟ میرے کسی خط کا جواب نہ آیا۔

جب میں بالکل مایوس ہو چکا تھا تو ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اچانک مجھے عارف صاحب کی اہلیہ نیر جہاں کا کراچی سے خط ملا، جس کا ایک حصہ یہاں پر نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے لکھا:

" مکرمی منیر بھائی۔ السلام علیکم۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آپ کو ان حالات میں خط لکھوں گی۔ اور لکھوں گی بھی کیا۔ اپنے عرفی، پیارے عرفی کی شہادت کی خبر۔ منیر بھائی آٹھ ماہ اس کشمکش میں گزر گئے کہ کیسے لکھوں۔ کیا لکھوں۔ ظالموں نے ۲۸ مارچ کو اسی گھر میں، جہاں آپ آئے تھے، حملہ کیا اور عرفی کو روزے کی حالت میں، جب کہ وہ تلاوت کر رہے تھے، میرے سامنے شہید کیا۔ تمام سامان لوٹ لیا اور تینوں بچیوں کو اور مجھے رات کو لے جانے کے ارادے سے اس وقت چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ حادثہ دن کے کوئی ساڑھے نو دس بجے ہوا۔ ان لوگوں نے ہم سب کو گھر میں بند کر دیا۔ سامنے جو لوگ تھے ان کا ایک لڑکا مجھے پہچانتا تھا۔ اسے میں نے اپنے جسم پر جو زیور بچا تھا وہ دے کر حفاظت کی التجا کی۔ اس نے تین دن اور تین رات پہرہ دے کر ہماری حفاظت کی۔ جب بھی غنڈے آتے وہ نیچے چلا جاتا اور انھیں اوپر نہیں آنے دیتا (کذا)۔ ظلم کی حد دیکھیے کہ عرفی کو شہید کرنے کے بعد انھیں دفنانے نہیں دیا۔ تین دن بعد جب مقامی لوگوں کو شکست ہو گئی تو کسی طرح عرفی کو گھر میں پیچھے دفن کر دیا۔ کوئی آٹھ دن بعد فوج نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا اور یہاں پہنچوانے کے انتظامات کیے......"

میں نے انھیں لکھا کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا وہ میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر انھیں مالی

امداد کی ضرورت ہو تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔ وہ پاکستان کو چھوڑنے کا ارادہ کر رہی تھیں، مگر اس بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کا چھوٹا بھائی معین، جو میڈیکل ڈاکٹر ہے، امریکہ جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہ جا سکتی تھیں۔ البتہ وہ اس پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ ان پر گزری اس کا تھوڑا سا تاثر دینے کے لیے ان کے دوسرے خط کا ایک حصہ درج کیا جاتا ہے:

"......زندگی اس ایک سال میں قیامتوں سے گزرتی ہوئی اب ایک ڈھرے پر آ گئی ہے۔ میں نے بی ایڈ کراچی یونیورسٹی سے کر لیا۔ پوزیشن نہ آ سکی فرسٹ ڈویژن بہرحال مل گیا۔ خدا کا شکر ہے۔ ملازمت بالکل بخیر وخوبی چل رہی ہے۔ محنت اور دیانتداری کو اصول بنا لیا ہے۔ یہی عرفی نے سکھایا تھا۔ اپنا گھر مکمل کروا لیا اور کوئی تین ماہ ہوئے کرایے پر بھی دے دیا۔ مجھے اسکول کی طرف سے چھوٹا سا فلیٹ مل گیا ہے اسی میں اپنے دکھ کے لمحے گزارتی ہوں۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت اور شہر کے اسکول کی ملازمت دونوں چھوڑ دیں۔ اس لیے نہیں کہ وہاں کوئی پریشانی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ذہنی طور پر میں بہت بیمار ہو گئی تھی۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کا قصہ سنیے۔ میں اناؤنسمنٹ کر کے نکلی اور بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک بندر روڈ پر میں نے دیکھا...... ہاں ہاں میں نے دیکھا کہ عرفی دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے ہیں۔ میں نے چیخ کر انھیں آواز دی اور اتنا یاد ہے کہ یہ کہا: رکیے رکیے میں بھی آ رہی ہوں۔ دوبارہ جب مجھے ہوش آیا تو میرے چاروں طرف سارا ٹریفک رکا کھڑا تھا اور پولیس والا مجھ سے پوچھ رہا تھا نام بتاؤ۔ جلدی نام بتاؤ...... پھر یہ ہوا منیر بھائی کہ میں نے رکشا سے آمد و رفت شروع کر دی۔ ایک دن واپس گھر جا رہی تھی کہ پھر اچانک میں نے اپنے سامنے ایک سرخ رنگ کی کار میں، جیسی ہماری تھی نا۔ ایک صاحب کو کالا کوٹ پہنے دیکھا۔ میں نے چلا کر اپنے ڈرائیور سے کہا کہ ان صاحب کے ساتھ ساتھ چلو۔ ساتھ ساتھ چلو۔ ساتھ ساتھ...... پھر جب دوبارہ ہوش آیا ہے تو میرا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور رکشا اس کار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ نہ معلوم میں چیخ چیخ کر ان صاحب سے کیا کہہ رہی تھی......تب منیر بھائی مجھے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا۔ میں گھر آ کے بہت روئی اور میں نے خدا سے بڑی دعائیں مانگیں کہ اگر مجھے زندہ رکھنا ہے تو دماغ سلامت رکھ۔ پھر میں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت ہی چھوڑ دی۔ صرف اسکول والی باقی تھی۔ ایک دن اسکول سے نکل کر ریلوے اسٹیشن آ رہی تھی کہ اچانک سامنے سے اک شخص بالکل عرفی کی سی جسامت والا، پتلی پتلی لمبی لمبی خوبصورت انگلیاں ہلاتا تیز تیز قدم رکھتا جانے لگا۔ میرے دل میں اندر کوئی چلا چلا کے یہ کہہ رہا تھا۔ دوڑ یہ عرفی ہے۔ یہ میرا عرفی ہے۔ پکڑ لے۔ یہ پھر بھاگ جائے گا۔ مگر منیر بھائی میں نے حواس قایم رکھے۔ میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ آنسو میرے گلے میں پھنس گئے تھے۔ میری آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ دماغ

میں زلزلہ سا برپا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے قدموں سے قریبی درخت کا سہارا لیا اور وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ کوئی دو گھنٹے تک سن بیٹھی رہی۔ گھر آ کے میں نے استعفا لکھ کے بھیج دیا۔ اب یہ اسکول، جس میں میں کام کر رہی ہوں، یہ شہر سے تقریباً پندرہ بیس میل دور ہے۔ ساتھ کی استانیاں سب بہت اچھی ہیں اور میں کافی مطمئن ہوں۔

باہر جانے کا یہ ہے کہ پٹسبرگ میں گھر مل گیا ہے۔ روانگی غالباً دسمبر جنوری میں ہوگی، کیونکہ وہی زمانہ ایڈمشن کا ہے۔ میرا ارادہ education میں ڈاکٹریٹ کرنے کا ہے۔ بچیاں میرے ساتھ ہی رہیں گی۔ جانے کا ارادہ بالکل غیر متزلزل قسم کا ہے۔ آپ کو صرف اطلاع دے رہی ہوں کہ دنیا گول ہے شاید کوئی دن ایسا آ جائے جب آپ کی کال بل بجے اور میں آپ کو سلام کروں۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد برسوں تک مجھے نیر جہاں کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی۔ میں نے سوچا کہ انھیں امریکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں دقتوں کا سامنا ہوگا۔ پھر حسنِ اتفاق سے کینیڈا سے چھپنے والے ایک اردو رسالے بنامی "پاکیزہ" میں نیر جہاں کی نظم نظر سے گزری۔ میں نے "پاکیزہ" کی مدیرہ کو خط لکھ کر ان کا پتا منگوایا۔ اس طرح تیسری بار ہمارا رابطہ قایم ہوا، جو اب تک چل رہا ہے۔ البتہ نیر جہاں مجھے خط دل میں لکھا کرتی ہیں، جن کو پوسٹ کرنے کی اکثر نوبت نہیں آتی۔ ٹیلی فون پر کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔ میں اور اوتا ایک بار ان کو لاس انجلیز میں جا کر مل چکے ہیں۔

مستشرقین کی عالمی کانفرنس

۱۹۷۳ء میں مستشرقین کی عالمی کانفرنس پیرس میں رکھی گئی تھی، جس میں شرکت سے پہلے عزیز احمد، جو ایک عرصے سے کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز پڑھاتے تھے، ایک جرمن فاؤنڈیشن کی دعوت پر جرمنی تشریف لائے۔ عام طور سے اگر مدعوئین کے پروگرام میں ہمبرگ شامل ہو تو ان کو جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ بھی دکھایا جاتا ہے۔ پاکستان سے آنے والے خواتین و حضرات کی مہمان نوازی عام طور سے میرے سپرد ہوتی تھی۔ اس طرح مجھے ۳۳ برسوں کے دوران، جو میں نے اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں گزارے، بے شمار نامور ہم وطنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عزیز احمد سے ملنا میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں نے ان کے افسانے اور ناول بچپن میں پڑھے تھے۔ پھر یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ان کی کتابیں، جو انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے موضوع پر لکھی تھیں، میرے لیے گائیڈ کا درجہ رکھتی تھیں۔ میں نے ان کتابوں پر تبصرے بھی لکھے تھے، جن میں سے کچھ ان کی نظر سے گزر چکے

تھے مگر ہمارے انسٹیٹیوٹ کے رسالے "اورینٹ" کے پرچے انھوں نے نہیں دیکھے تھے، اس لیے انھوں نے ان تبصروں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھیں یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مجھے ان کے دو ناول اماں نے خاص طور پر پڑھنے کے لیے دیے تھے، وگرنہ ہمارے گھر میں عام طور سے ناول پڑھنے کا ماحول نہیں تھا۔ وہ اس زمانے میں سسلی میں اسلام کی تاریخ پر کام کر رہے تھے، جو ان کی آخری کتاب ثابت ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے گفتگو میں اس امر پر زور دیا تھا کہ اسلامی تاریخ میں جو پسپائی اندلس اور سسلی میں بارھویں تیرھویں صدی میں شروع ہوئی تھی وہ بدستور جاری ہے۔ امت کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس عمل کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ مجھے بھی پیرس والی کانفرنس میں شامل ہونا اور ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ عزیز احمد نے میرا مقالہ لے کر اسی وقت پڑھ ڈالا۔

پیرس میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے میرے لیے اہم ترین حکیم محمد سعید اور ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے ملکوں میں رفاعِ عامہ کے لیے جو ادارے قایم کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جب ہم دوپہر کے کھانے پر اکٹھے ہوتے تھے تو حکیم محمد سعید ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے مگر کچھ نہیں کھاتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں، جس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب وہ ہجرت کر کے کراچی پہنچے، تو ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ دو وقت کی روٹی کھا سکتے۔ اس طرح یہ چیز ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی، جس پر وہ بہت خوش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد انسان تخلیقی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آ گیا کہ میں نے جرمنی پہنچنے پر عہد کیا تھا کہ دس برس تک اردو ادب کی کوئی کتاب نہیں پڑھوں گا، نہ ہی خود کچھ لکھوں گا۔ اس کے نتیجے میں میرے اندر اردو سے بُعد پیدا ہو گیا تھا اور اردو زبان پر میری گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ میں بچپن میں ان کا رسالہ "ہمدردِ صحت" باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا اور اس میں لکھی جانے والی زبان کا بہت مداح تھا۔ میں نے کہا کہ اگر وہ یہ رسالہ مجھے بھیجنا شروع کر دیں، تو ہو سکتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے میرے اندر سویا ہوا ادیب پھر سے بیدار ہو جائے۔ انھوں نے کراچی واپس پہنچ کر یہ رسالہ میرے نام لگوا دیا، جو چار برسوں تک مجھے باقاعدگی سے ملتا رہا۔ عین اس زمانے میں میری اردو ادب کی طرف مراجعت ہوئی، جس میں یقیناً ان کے رسالے کا ہاتھ تھا۔

سوئٹزرلینڈ اور اٹلی

اس برس ہم نے تعطیلات سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا، جس کی محرک اوتا کی سہیلی

کارین تھی۔ وہ نارتھ سی (North Sea) کے جزیرے فیوہر (Föhr) پر رہتی ہے اور چھٹیاں ہمیشہ پہاڑوں پر گزارتی ہے۔ اس نے ہمیں اپنے ساتھ زینال (Zinal) کے صحت افزاء مقام پر چلنے کی دعوت دی تھی، جہاں پر اس نے ایک خاصی بڑی کاٹیج کرایے پر لے رکھی تھی۔ ہم نے اس کی دعوت کو قبول کیا مگر جب میں نے اس کی بھیجی ہوئی اشیاء کی فہرست پر نظر ڈالی، جو ہمیں بہرصورت ساتھ لانی ہوں گی، تو میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ کپڑے ہلکے مگر گرم ہوں۔ ان پر پہنا جانے والا کوٹ برساتی کی طرح واٹر پروف ہو۔ سویٹر اونی اور دستانے گرم ہوں۔ پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے خاص بوٹ خریدے جائیں۔ پیٹھ پر باندھنے والے رکسیک میں فرسٹ ایڈ کی کٹ موجود ہو۔ بیٹری ضرور ساتھ لائی جائے، وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب ہم وہاں پر پہنچے تو سات روز تک دن رات بارش ہوتی رہی۔ بس دو یا تین بار ہم بارش کے وقفوں میں پہاڑ پر چڑھ سکے وگرنہ سارا دن کاٹیج میں ناول پڑھنے یا کارین کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں گزرتا تھا۔ کاٹیج خواہ کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو جب دنوں تک انسان باہر نہ نکل سکے تو چھت سر پر ٹوٹتی ہوئی لگتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ اٹلی ہمسایہ ملک ہے اور وہ قصبہ، جہاں پر اوتا نے اپنا لڑکپن گزارا تھا، ایک دن کی ڈرائیو کے فاصلے پر ہے اس لیے کیوں نہ وہاں چلا جائے، جہاں پر سورج ہر روز نکلتا ہے۔ یوں بھی مجھے وہ جگہیں دیکھنے کا شوق تھا جہاں پر اوتا نے سات برس گزارے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اوتا کی سہیلی اوریتا بھی وہاں کہیں آس پاس رہتی ہو اور دونوں کی ملاقات ہوسکے۔

عام طور سے یورپ کی اندرونی سرحدوں پر چیکنگ نہیں ہوتی مگر اس روز اٹلی کی سرحد پر پاسپورٹ دیکھے جارہے تھے۔ میرے پاکستانی پاسپورٹ میں اٹلی کا ویزا نہ ہونے کے سبب ہمیں واپس کردیا گیا۔ قریب ترین شہر، جہاں پر اطالوی قونصل جنرل پایا جاتا تھا، وہاں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پر ابھی قیلولے کا وقفہ تھا۔ دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد آفس کھلا تو متعلقہ کلرک ایک مسلمان کو اپنے سامنے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ وہ خود لیبیا کے شہر طرابلس میں پیدا ہوا تھا اور تھوڑی بہت عربی بول سکتا تھا۔ اس نے عربی بولنی شروع کردی اور یہ جان کر خوش ہوا کہ میں عرب تو نہیں ہوں مگر عربی جانتا ہوں۔ اس نے فوراً چائے منگوالی اور ہمارا تعارف اپنے کولیگوں سے اس طرح کرانے لگا جیسے ہماری دوستی ایک عمر سے ہو۔ اس نے کہا اگر آپ لوگ آج رات یہاں پر رہ جائیں تو میں آپ کا تعارف اپنی بیوی سے کراؤں گا۔ مجھے نظر آرہا تھا کہ ہم شام پڑنے تک اوتا کے لڑکپن کے شہر نروی (Nervi) نہ پہنچ سکیں گے اور ہمیں راستے میں رات بسر کرنی پڑے گی۔ خدا خدا کر کے اس سے رخصت لے کر ہم دوبارہ سرحد پر پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہاں پر اطالوی پوسٹ پر چیکنگ کرنے والا ایک بھی آدمی موجود نہیں تھا۔

اوتا نے مجھے اپنے بچپن کے تمام مقامات دکھائے۔ وہ مکان، جس میں اس کا خاندان سات برسوں تک مقیم رہا تھا۔ وہ اسکول، جس میں اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ وہ باغ، جس میں وہ کھیلا کرتی تھی۔ وہ ساحلِ سمندر، جہاں پر وہ پیراکی کے لیے جاتی تھی۔ پھر وہ مجھے اس جرمن عورت کے گھر لے گئی جو ایک اطالوی کپتان کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی اور جو اوتا کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی تھی۔ ہم اور یتا کے والدین کی دکان پر گئے جہاں پر اوتا اپنی سہیلی کے ساتھ کھیلتی اور ہوم ورک کرتی تھی۔ وہاں سے ہمیں اوریتا کا پتا مل گیا جو ہمسایہ شہر گینووا (Genua) میں رہتی تھی۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس طریق سے مجھے باطنی آنکھوں سے اوتا کے لڑکپن میں جھانکنے کا موقع ملا۔

پانچواں باب

جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ

''جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ''، ہمبرگ کا قیام ۱۹۶۰ء میں ایک فاؤنڈیشن کے ذریعے عمل میں آیا تھا۔اس ادارے کے تحقیقی کام کے بارے میں یہ طے پایا تھا کہ وہ ہر قسم کے بیرونی دباؤ اور اثر اندازی سے آزاد ہوگا۔ جرمنی میں عام طور سے علمی اداروں کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے، جس پر قیود نہیں لگائی جاتیں۔ چنانچہ ابتدا میں ہمبرگ سٹیٹ کی طرف سے جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ کے لیے سالانہ مالی امداد دینے کا فیصلہ ہوا، جس میں آگے چل کر فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے وزارتِ خارجہ نے شامل ہونا قبول کرلیا۔ان کی طرف سے بھی کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی۔تحقیقات کے لیے موضوعات کے چناؤ میں انسٹیٹیوٹ اسی طرح خود مختار ہے، جس طرح یہ فیصلہ کرنے میں کہ تحقیق کے نتائج کو کس رنگ میں قارئین تک پہنچایا جائے۔ دراصل حکومت یہ چاہتی تھی کہ وزارتوں اور سفارت خانوں کے علاوہ ملک میں ایسے ادارے پائے جاتے ہوں، جو بیوروکریسی سے الگ رہتے ہوئے غیر ملکوں کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات پر نظر رکھتے ہوں اور اپنی تحقیقات کے نتائج جنرل پبلک کے لیے شائع کریں۔ چنانچہ جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا گیا اور ایک سہ ماہی رسالہ ''اورینٹ'' چھپنے لگا۔

اس وقت تک یہ امر واضح نہیں تھا کہ ہماری مطبوعات سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور طالب علموں میں انسٹیٹیوٹ کی شہرت پھیلنے لگی تھی ،مگر صحافیوں نے ہمیں ابھی دریافت نہیں کیا تھا۔وزارتِ خارجہ عام طور سے سفارت خانوں کی رپورٹوں کو اہمیت دیتی ہے، کیونکہ سفارت کار اپنی ڈیوٹی کے مقام پر غیر ملکوں میں موجود ہوتے ہیں اور گویا فرسٹ ہینڈ معلومات مہیا کر سکتے ہیں ۔ تاہم ان کے مقابلے میں تحقیقاتی اداروں کے کارکن لمبے عرصے تک متعلقہ ممالک کے حالات، ثقافت اور تاریخ سے واقفیت رکھنے کے سبب زیادہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ پھر یہ لوگ متعلقہ ملکوں کی زبانیں جانتے ہیں اور وہاں پر چھپنے والے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں مشرقِ

وسطیٰ کے ممالک کے قریب قریب سب اہم اخبارات آتے ہیں، جن کو متعلقہ کارکن باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے اور تمام اہم خبروں کو آرکائیوز میں محفوظ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر وہ منٹوں کے اندر اٹھنے والے سوالوں کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

چونکہ ابتدائی برسوں میں تحقیق پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس لیے پہلے دس بارہ برسوں تک انسٹیٹیوٹ کے فیلوز کا دائرۂ عمل جان بوجھ کر محدود رکھا گیا۔ ہمیں اگر کسی ادارے کی طرف سے تقریر کرنے کی دعوت ملتی تھی، تو ہم اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ تاہم ویک اینڈ (ہفتے اور اتوار) کے دنوں میں تقریر کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میری اس سلسلے کی سرگرمیاں طالب علمی کے دنوں سے چل رہی تھیں اور میں سال بھر میں دس بارہ تقریریں مختلف اداروں میں کرتا چلا آیا تھا۔ مگر یہ سلسلہ کچھ ایسا منظّم نہیں تھا۔ تاہم آگے چل کر وہ بہت پھیل گیا تھا۔ میں انسٹیٹیوٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد آج بھی سال میں تیس چالیس تقریریں کرتا ہوں، جس کے لیے مجھے جرمنی بھر سے دعوتیں ملتی ہیں۔ گاہے بگاہے سوئٹزر لینڈ اور آسٹریا سے بھی یونیورسٹیاں اور دوسرے علمی ادارے بلاتے ہیں۔ جرمنی میں ایسے ادارے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ عیسائی چرچ کے دونوں بڑے فرقوں (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) کی ملک کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی اکاڈیمیاں (academies) موجود ہیں، جہاں پر مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں کانفرنسیں اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں۔ ان میں اسلام کو پوری پوری نمائندگی دی جاتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی بھی اپنی اپنی اکاڈیمیاں پائی جاتی ہیں، جہاں پر مسلمان معاشرے اور ملکوں کے مسائل پر پوری آزادی کے ساتھ بحث ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی جرمنی میں کم وبیش ڈیڑھ دو صد علمی ادارے سارا سال ملک کے عوام اور خواص کو ان مسائل کے بارے میں معلومات مہیا کرتے ہیں، جن سے معاشرے کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے یا جو کل کو ملک اور قوم کو پیش آنے والے ہیں۔

پھر ۱۹۷۳ء میں افغانستان میں انقلاب آیا، جس میں داؤد خان نے ظاہر شاہ کو اس کی کابل سے غیر حاضری کے دوران معزول کر دیا تھا۔ چونکہ جرمنی کے تعلقات افغانستان کے ساتھ امان اللہ خان کے وقت سے دوستانہ تھے اس لیے ہمیں جرمنی کے مختلف شہروں اور اداروں کی طرف سے تقریر کے لیے بلایا جانے لگا۔ پہلے پہل روزنامہ ''دی ویلٹ'' (Die Welt) اور مشہورِ عالم سیاسی ہفت روزہ ''ڈیر شپیگل'' (Der Spiegel) کے صحافی میرے پاس اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے۔ بہت جلد مختلف اخباروں کی طرف سے مضمون لکھنے یا خبروں پر تبصرہ کرنے کے لیے دعوتیں ملنے لگیں۔ یہ سلسلہ آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ میں نے باقاعدگی کے ساتھ اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا۔ آگے چل کر انسٹیٹیوٹ کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے دریافت کر لیا اور ہمیں قریب قریب ہر روز کسی نہ

کسی موضوع پر انٹرویو دینے یا تبصرہ کرنے کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ جب جنرل ضیاء الحق ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوے، تو اس خبر کو نشر کرنے سے پہلے جرمن ریڈیو نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ یہ خبر چند منٹوں کے بعد نشر ہوگی اور کیا میں اس پر لائیو (live) تبصرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ابھی ٹیلیفون کا چونگا رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی اور روزنامہ ''دی ویلٹ'' کی طرف سے اس موضوع پر اداریہ لکھنے کی دعوت مل گئی۔ میں اس اخبار میں باقاعدگی کے ساتھ پاکستان، ایران اور افغانستان سے متعلقہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا رابطہ ''ڈیر شپیگل'' کے ساتھ برسوں تک رہا۔ اس کی ابتداء بھی افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب کے آنے پر ہوئی تھی۔ پھر جب ایران میں اسلامی انقلاب آیا، تو لمبے عرصے تک اس کے متعلق اس رسالے میں چھپنے والے مضامین میرے اشتراک سے لکھے جاتے رہے۔ مجھے آج بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شامل ہونے کی دعوت ملتی ہے اور میں ان میں حصہ لیتا ہوں۔

اس آزادانہ ماحول میں کام کرتے ہوے مجھے تب بہت الجھن ہوتی تھی، جب جرمنی میں پاکستانی سفارت خانہ مجھ سے ایسی توقعات رکھتا تھا، جو میں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً جب شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا، تو سفارت خانہ چاہتا تھا کہ میں جرمن پریس کو یہ باور کراؤں کہ یہ قدم شیخ مجیب الرحمٰن کی ذاتی حفاظت کی خاطر اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح جب پاکستانی پارلیمان نے جماعتِ احمدیہ کو اسلام سے خارج کرنے کی قرارداد پاس کی، تو سفیرِ پاکستان جناب سجاد حیدر کی خواہش تھی کہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس بات کی یورپ میں تشہیر ہوئی تو پاکستان کے نام پر دھبہ لگے گا۔ وہ مجھے اس موضوع پر مقالہ لکھنے سے روکنے کے لیے خاص طور پر ہمبرگ تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا کہ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے فرمایا ہے کہ انھوں نے قوم کا نوّے سالہ مسئلہ حل کر دیا ہے اور یہ کہ اس پر جماعتِ احمدیہ کو بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ بات اخباروں میں چھپ چکی ہے اور جرمن حکومت اور اخبارات ہم سے اس مسئلے کے بارے میں استفسارات کر رہے ہیں۔ وہ لوگ قرارداد کا پس منظر جاننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میرے مقالے میں اس مسئلے کے تاریخی، مذہبی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس بات کا چرچا ہونے سے پاکستان کی بدنامی ہوگی، تو اس کی ذمہ داری پاکستان کی قومی اسمبلی پر آتی ہے، جس نے یہ قرارداد پاس کی تھی۔ البتہ میرے نزدیک اس قرارداد کے نتیجے میں ایک خطرناک روچل نکلنے کا امکان ہے، جو شیعوں، ذکریوں، آغا خانیوں وغیرہ کو اسلام سے خارج کرنے کے مطالبے پر منتج ہو سکتی ہے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ اہل السنّت والجماعت کے فرقے ایک دوسرے کو مرتد قرار دینے اور اسلام سے خارج کرنے کا مطالبہ کریں۔

اس مقالے کے چھپنے پر میرے تعلقات پاکستانی سفارت خانے کے ساتھ نقطۂ انجماد پر پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ سجاد حیدر کے جانشین سمیع اللہ دہلوی نے جرمن پاکستان فورم کی گورننگ باڈی کی سالانہ میٹنگ کے موقع پر، جس میں ہم دونوں شامل تھے، میرے ساتھ مصافحہ کرنا تو ایک طرف رہا میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہ کیا۔ اسی میٹنگ کے موقع پر سفیر صاحب کے صاحبزادے جمیل دہلوی کی پہلی فیچر فلم Tower of Silence دکھائی گئی۔ جس ادارے کی بلڈنگ میں میٹنگ ہو رہی تھی، اس کو سفارت خانے کی طرف سے دس ہزار ڈالر فیس ادا کرنے کا بل پیش کیا گیا، کیونکہ فلم مزعومہ طور پر پہلی باران کے ہاں دکھائی جا رہی تھی۔ وہ لوگ اس مطالبے پر بہت حیران ہوے، کیونکہ ان کا جرمن پاکستان فورم کی میٹنگ اور اس کے پروگرام کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی طرف سے فلم دکھائے جانے کی فرمائش بھی نہیں آئی تھی۔ انھیں تو اس فلم کے وجود کا بھی پتا نہیں تھا۔

اس زمانے میں منیر احمد شیخ سفارت خانے کا پریس اتاشی تھا۔ اس نے اپنی نوکری کا حق ادا کرنے کے لیے ایک مضمون ''باہر بیٹھ کر اندر کا غم کھانے والے'' لکھا جس میں بزعم خود ان لوگوں کا کچا چٹھا پیش کیا، جو اس کے نزدیک پاکستان کو بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس مضمون میں اس نے ایک شخص کا ذکر کیا ہے، جسے وہ کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ اس کو وہ ''کے۔ ایم۔ کالیا'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں اس مضمون کا خلاصہ آ جاتا ہے۔ لکھتا ہے: ''باہر پاکستانیوں کی زبردست مارکیٹ ہے، جو جس ملک میں رہ رہے ہوں وہاں کی زبان میں اپنوں کو گالیاں دے سکیں۔'' آگے چل کر لکھا: ''آپ پاکستان سے باہر نکلیں تو یورپ اور امریکہ میں آپ کی ڈاکٹر کالیا سے ضرور ملاقات ہوگی۔ ڈاکٹر کالیا کے روپ میں اس کے ہمزاد آپ کو ملیں گے۔ یونیورسٹیوں سے لے کر نشر و اشاعت کے اداروں میں ہر جگہ ایک ڈاکٹر کالیا بیٹھا ہوتا ہے، جسے اپنے ملک کے غریبوں سے ہمدردی ہے اور اس ہمدردی کے صلے میں وہ موٹی تنخواہ پاتا ہے اور ملک اور قوم کے غم میں اپنی اپنی ''موزیل'' کی بوتل سے چمٹا ہوا ہے۔''

میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوے لکھا: ''مجھے اس امر کا احساس ہے کہ سفارت خانوں کا عملہ بہر صورت حکومتِ وقت کی اچھی یا بری پالیسی کی حمایت کرنے پر مجبور ہے، مگر انھیں یہ نہ کرنا چاہیے کہ حکومت کے اقدامات پر تنقید کو پاکستان یا قوم و ملت پر اعتراض قرار دیں۔ چند سال ادھر میں نے عبدالولی خان اور ایئر مارشل اصغر خان پر مضامین لکھے، جن میں انکی ذات اور انکے سیاسی افکار پر تبصرہ تھا۔ منیر احمد شیخ نے ایک احتجاجی خط لکھا کہ ملک کے حزبِ اختلاف کے لیڈروں پر مضامین کی اشاعت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کے مترادف ہے۔ انکا کہنا تھا کہ اگر کسی لیڈر کے بارے میں مضمون چھپنا چاہیے تو صرف بھٹو صاحب کی ذات پر۔''

جہاں پر میں نے جناب سمیع اللہ دہلوی کی تنگ نظری کا ذکر کیا ہے، وہاں پر مجھے ان کے جانشین افتخار علی کا ذکر بھی کرنا چاہیے، جن کی روشن نظری اور عالی ظرفی بے مثال تھی۔ ان کی تعیناتی کے زمانے میں ہمبرگ میں پاکستان کے بارے میں ایک نمائش لگائی گئی تھی، جس کا افتتاح کرنے کے لیے وہ ہمارے شہر میں تشریف لائے۔ جب میں نمائش گاہ میں پہنچا اور انھیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اٹھ کر بطورِ خاص میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے بتایا کہ نمائش کا افتتاح کرنے کے لیے انھیں ہمبرگ آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر میرے دل میں سابقہ سفیر صاحب کے طرزِ عمل کے سبب کوئی رنج ہے تو اس کو نکال دوں۔ وہ میرے ساتھ دوستی کے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب میں اگلی بار بون آؤں گا، تو وہ مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دیں گے۔ اس کے بعد جب وہ دوسرے حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے، تو منیر احمد شیخ نے آکر مجھے کلاوے میں جکڑ لیا۔ وہ ایک بار پھر میرے ساتھ اپنی دوستی کا کھلے بندوں اظہار کر سکتا تھا۔ ماتحتوں کو اپنا جھنڈا ہوا کے رخ پر لہرانا پڑتا ہے۔

جرمن پاکستان فورم

جرمن پاکستان فورم کا مقصد جرمنی اور پاکستان کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کے تعلقات پیدا کرنا ہے۔ اس کی بنیاد کراچی میں ممتاز حسن کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ چنانچہ وہاں سے ایک کتاب اقبال پر اور دوسری کتاب جرمن مشنری اور سندھی زبان کے ماہر ایرنسٹ ٹرومپف (Ernst Trumpf) کے بارے میں چھپی تھیں، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب پاکستان میں سابق جرمن نائب سفیر وولفگانگ کوہلر (Wolfgang Koehler) ریٹائر ہونے کے بعد ہمبرگ میں آکر قیام پذیر ہوئے اور ان کو جرمن پاکستان فورم کا صدر بنایا گیا، تو وہ اس کے پروگرام کے بارے میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آئے۔ میں نے انھیں پاکستان کے بارے میں ایک سلسلۂ کتب چھاپنے کو کہا، جن کا اثر وقتی طور پر منعقد کیے جانے والے جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیرپا ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں چھپنے والی سب سے پہلی کتاب پاکستان کے بارے میں جرمن زبان میں لکھی جانے والی مطبوعات کی ببلیوگرافی تھی، جس کو اوتا نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور ہر دوسرے تیسرے سال علمی موضوعات پر جلدیں چھاپی جانے لگیں۔ اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں، جن کو جرمنی کے علمی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔ میری کتاب ''جرمن معاصر ادب''، جس میں جرمن ادب کی شاعری اور نثر کے

چیدہ ادب پارے پیش کیے گئے تھے، اسی سلسلۂ کتب میں شامل تھی۔ اسکے متوازی ایک کتاب میں نے اننے ماری شمل کے تعاون سے پاکستانی زبانوں کے ادب پاروں کے جرمن تراجم پر مشتمل شائع کی تھی۔

خیری برادران

ہمبرگ یونیورسٹی لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر براؤن (Dr. Braun) نے مجھے ایک اردو رسالے کی فائل بھیجی جو عرصۂ دراز سے لائبریری میں پڑی تھی، مگر جس کے کوائف کا اندراج نہیں ہو پایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سٹاف میں سے کسی کو اردو نہ آتی تھی۔ اس ہفت روزہ رسالے کا نام ''اخوت'' تھا، جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک استنبول سے نکلتا رہا تھا۔ کل ۹۸ شمارے چھپے تھے، جن میں سے ۴۴ رسالے فائل میں شامل تھے۔ اس کے مدیر محمد عبدالجبار خیری تھے، جب کہ ان کا چھوٹا بھائی محمد عبدالستار خیری ان کا معاون تھا۔ انھوں نے ایک انجمن بھی قائم کی تھی جس کا نام ترکی زبان میں ''ہند اخوت الاسلام انجمنی'' تھا۔ رسالہ چھاپنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو برطانوی عملداری سے نجات دلائی جائے۔ اس بارے میں ان کا عندیہ تھا کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے بعد ہندوستان میں دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے۔ مجھے ان بھائیوں کے بارے میں مزید جاننے کا شوق تھا اس لیے میں نے ''ڈان'' کراچی میں ایک خط چھپوایا، جس کے جواب میں مجھے علاوہ دوسرے لوگوں کے عبد الستار خیری کی بیٹی زینب ثناء الحق کا خط ملا۔ ان کی وساطت سے اور دوسرے ذرائع سے جو معلومات مل سکیں، ان کا خلاصہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے:

عبدالجبار اور عبدالستار خیری خان بہادر عبدالحامد ڈپٹی کلکٹر (یو پی) کے بیٹے اور علامہ راشد الخیری کے چچازاد تھے۔ مولوی نذیر احمد (مصنف ''توبۃ النصوح'') ان کے پھوپھا تھے۔ دونوں بھائی، جو علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے، ۱۹۰۶ء میں پہلے بغداد گئے، جہاں پر اس زمانے میں قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر ڈپٹی قونصل تھے۔ ان کے توسط سے ان کو مصر کا ویزا مل گیا، جہاں پر انھوں نے جامع الازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا، مگر وہاں کا نظامِ تعلیم اور نصاب ان کی پسند کا نہ تھا، اس لیے وہ بیروت چلے گئے، جہاں پر انھوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں ایک مدرسہ ''دارالعلوم'' کھولا، جو آگے چل کر کالج بنا دیا گیا۔ میرے ایک شاگرد نے مجھے بیروت سے واپسی پر بتایا تھا کہ یہ کالج بدستور چل رہا ہے۔ جب جنگِ عظیم اوّل میں بیروت کو عثمانیہ ترکی سے آزاد کرا لیا گیا، تو دونوں بھائی

وہاں سے استنبول چلے گئے، جہاں سے انھوں نے متذکرہ رسالہ جاری کیا۔ جب ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج ترکی میں داخل ہوئی، تو انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں کے سبب ان کو گرفتار کر لیا جائے گا، اس لیے یہ وہاں سے راتوں رات فرار ہوکر جرمنی چلے گئے، مگر وہاں پر قدم جمانے سے پہلے سٹاک ہوم گئے، جہاں پر ''سوشلسٹ انٹرنیشنل'' کی سالانہ کانفرنس ہونے والی تھی، جو اس سال آخری وقت پر کسی وجہ سے ملتوی کر دی گئی تھی۔ البتہ مندوبین سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی قراردادیں تحریراً سیکرٹری کے پاس جمع کرا دیں تا کہ ان کو ریکارڈ میں لایا جا سکے۔ ایک قرارداد خیری برادران نے بھی جمع کرائی تھی ،جس میں ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ آگے چل کر انھوں نے دعویٰ کیا کہ اس قرارداد میں پہلی بار ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر اس بات کا ثبوت ''سوشلسٹ انٹرنیشنل'' کے ریکارڈ سے نہیں ملتا۔

ان کی مستقل رہائش اس کے بعد برلن میں تھی، جہاں پر اس زمانے میں خاصی بڑی تعداد میں ہندوستانی طالب علم جمع تھے۔ جنھوں نے آگے چل کر شہرت پائی ان میں رفیع پیرزادہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید عابد حسین اور محمد حبیب شامل تھے۔ ستار خیری برلن یونیورسٹی کے باضابطہ طالب علم تھے، جب کہ جبار خیری پروفیسر اور ڈاکٹر کے القابات اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ ان پر کسی نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش نہ کر سکے تھے، اس لیے ان کو جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ آئندہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور پروفیسر نہ لکھیں۔ اس کے باوجود ان کے لواحقین کا دعویٰ ہے کہ موصوف نے سات آٹھ مضامین میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔

ستار خیری اپنے بھائی جبار خیری سے عمر میں دس گیارہ سال چھوٹے تھے۔ چونکہ وہ بڑے بھائی کے برعکس، جن کی داڑھی مونچھیں صفاچٹ تھیں، لمبی داڑھی رکھتے تھے، اس لیے مولانا شبلی نعمانی نے ان کو دیکھنے کے بعد لکھا تھا: باپ بیٹے ایک ہی جگہ پڑھتے ہیں۔ وہ ستار خیری کو باپ اور جبار خیری کو ان کا بیٹا سمجھے تھے۔ ستار خیری شروع سے ہی مذہبی خیالات رکھتے تھے۔ برلن کے زمانے میں وہ باقاعدہ امام الصلوٰۃ تھے اور جمعے کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب رفیع پیرزادہ نے ایک جرمن دوشیزہ سے شادی کرنے کا ارادہ باندھا تو ان کا نکاح جبار خیری نے پڑھایا تھا۔ جرمن قانون کی رو سے جب تک سول میرج کا سرکاری رجسٹر میں اندراج نہ ہو جائے، اس وقت تک مذہبی نکاح خوانی ممنوع ہے اور نکاح پڑھانے والے پر مقدمہ بن سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس نکاح پر اعتراض نہ کیا تھا، اس لیے سرکاری طور پر اس نکاح کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ جرمن بیوی سے رفیع پیرزادہ کی ایک بیٹی۔ رفیع پیرزادہ ۱۹۳۰ء میں بیوی اور بیٹی کو ان کی قسمت پر چھوڑ کر خود ہندوستان سدھار گئے تھے۔ مجھے اس بات کا علم اس طرح ہوا

کہ ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں میری شمولیت کے تھوڑے دنوں کے بعد مجھے مرضیہ پیرزادہ نامی عورت کا خط ملا جس نے لکھا کہ وہ رفیع پیرزادہ کی بیٹی ہے۔ میری اس کے ساتھ خط و کتابت لمبے عرصے تک چلتی رہی۔ آج کل بھی گاہے بگاہے اس کی طرف سے خط آجاتے ہیں۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے ریٹائر ہونے کے بعد بوڑھوں کی لیے بنائے جانے والے ایک ہوسٹل میں رہتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے باپ کے ہندوستان چلے جانے کے بعد اس کو سرکاری طور پر ایک دوسرا نام اختیار کرنا پڑا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اس کو اپنے باپ کا فیملی نام پیرزادہ اختیار کرنے کے لیے مقدمہ لڑنا پڑا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے اسکول ٹیچر تھی۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا تھا، جس نے اسے بتایا تھا کہ اس نے بعض جرمن ڈراموں کو اردو میں ڈھالا تھا، جیسے لیسنگ (Lessing) کا ڈرامہ ناتھان حکیم (Nathan der Weise)۔ مرضیہ نے پاکستان میں کوڑھیوں کا علاج کرنے والی جرمن لیڈی ڈاکٹر روتھ فاؤ (Dr. Ruth Pfau) کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس کو اس ادارے نے، جو روتھ فاؤ کے لیے جرمنی میں رقوم جمع کرتا ہے، مصنفہ کے ساتھ اختلافات پیدا ہو جانے پر چھاپنے کے بعد تلف کروا دیا تھا۔ البتہ وہی کتاب مشرقی جرمنی میں تیس ہزار کی تعداد میں چھپ کر چند دنوں کے اندر بک گئی تھی۔

جبار خیری نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ البتہ ستار خیری نے ۱۹۲۱ء میں برلن میں شادی کی اور اپنی جرمن نژاد بیوی کو فاطمہ کا نام دیا۔ ان کے تینوں بچے برلن میں پیدا ہوئے۔ میری ان کی سب سے بڑی بیٹی زینب کے ساتھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے لکھا کہ ان کے والد اور چچا کو ہندوستان لوٹنے کی اجازت میرا بائی (Miss Madlein Slade) کی کوششوں سے ملی تھی، جو گاندھی جی کی چیلی تھی۔ اس نے ان کے والد ستار خیری سے اردو سیکھی تھی۔ مجھے انے ماری شمل نے بتایا تھا کہ جب اس نے عربی سیکھنی شروع کی تو اس کا استاد اسے ہر ہفتے ایک دو کتابیں اسلامی موضوعات پر پڑھنے کے لیے دیا کرتا تھا۔ ایک کتاب کا عنوان اسے یاد تھا مگر وہ اس کے مصنف کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ عنوان تھا ''ہندوستان میں اسلامی فنِ تعمیرات'' (Islamische Baukunst in Indien)۔ یہ کتاب ستار خیری کی تصنیف تھی، جسے انھوں نے برلن میں قیام کے دوران چھپوایا تھا۔

ہندوستان لوٹنے پر وہ سیدھے علی گڑھ گئے تھے، جہاں پر ان کو قرۃ العین حیدر کے بیان کے مطابق قلیل مشاہرے پر جرمن، اور بقول ستار خیری کی بیٹی زینب کے، جرمن اور فرانسیسی پڑھانے کا کام دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے ان کی بیوی کو ڈیرہ دون میں قائم ہونے والے ایک انگلش پبلک اسکول میں ہوسٹل کے انتظام کے لیے رکھ لیا گیا تھا، مگر ان کی ملازمت زیادہ دیر تک نہ چل سکی، کیونکہ ڈیرہ

کیمبرج اسکول بوجہ مالی مشکلات بند ہو گیا تھا۔ ستار خیری مسلم لیگ کے بہت سرگرم کارکن تھے۔

جب جرمنی نے دوسری جنگِ عظیم چھیڑی، تو دونوں میاں بیوی کو جرمنی کا جاسوس قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ فاطمہ خیری کو، جن کا جرمن نام اسنا (Asna) تھا، چھوٹی بچی سمیت پیرول کیمپ میں رکھا گیا، جب کہ ستار خیری کو اکتوبر ۱۹۴۴ء تک جیل میں رہنا پڑا۔ ان کی صحت اس دوران میں گر گئی تھی اور وہ رہائی سے گیارہ ماہ بعد ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پا گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ ستار خیری کی بیوہ کو ان کی جگہ پر جرمن پڑھانے کے لیے رکھ لیا جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم سے کم بی اے کی ڈگری حاصل کریں۔ جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو ان کو ملازم رکھ لیا گیا، جہاں پر وہ ۱۹۵۱ء تک درس دیتی رہیں۔ پھر وہ اپنے بچوں سمیت ہجرت کر کے کراچی میں آ کر آباد ہو گئی تھیں۔

دونوں بھائیوں کو ہندوستان واپس لوٹنے کی اجازت دیتے ہوے یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے۔ ستار خیری کے برعکس، جو مسلم لیگ کے لیے کام کرتے رہے، جبار خیری نے سیاست سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ وہ ۱۹۵۶ء میں اپنی وفات تک دہلی میں مقیم رہے۔ میں نے انکے رسالے ''اخوت'' کی فائل کی فلم بنوا کر پاکستانی سفارت خانے کی معرفت اسلام آباد یونیورسٹی لائبریری کو بھجوادی تھی۔ امید ہے کہ وہ وہاں پر محفوظ ہو گی۔

احمدیوں کا جرمنی میں پناہ لینا

پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف چلنے والی مہم کے نتیجے میں، جو جنرل ضیاء الحق کے زمانہِ حکومت میں تیز تر ہو گئی تھی، احمدی بہت بڑی تعداد میں ملک سے ہجرت کرنے لگے تھے۔ جرمنی ان ممالک میں سے تھا، جہاں پر انھوں نے پناہ (asylum) حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے اندر اندر ہزاروں اشخاص نے پناہ لینے کی خاطر اس ملک میں درخواستیں داخل کرا دیں۔ جرمن قوم کو ہٹلر کی نازی حکومت کے زمانے میں یہ تجربہ ہوا تھا کہ یورپ کے اکثر ممالک میں ان لوگوں کو سیاسی پناہ نہیں مل سکی تھی، جن کو نازی حکومت کی بربریت کے سبب ملک چھوڑنا پڑا تھا اس لیے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب مغربی جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی، تو اس چیز کا خاص خیال رکھا گیا کہ قانونِ اساسی میں یہ چیز شامل کی جائے کہ اس ملک میں ان لوگوں کو پناہ دی جائے گی، جنکو سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔

جب احمدیوں نے جرمنی میں پناہ لینے کے لیے درخواستیں دیں، تو علاوہ دوسرے سوالوں کے یہ

سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ کیا انکو سیاسی وجوہات کی بنا پر ملک سے نکلنا پڑا تھا اور کیا انکے خلاف چلنے والی مہم کے مقاصد میں یہ چیز شامل تھی کہ احمدیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے؟ چونکہ جرمن حکومت کا متعلقہ ادارہ احمدیوں کو جرمنی میں پناہ دینے کے خلاف تھا، اس لیے عدالت نے اس بارے میں جرمن اوریینٹ انسٹیٹیوٹ کی معرفت مجھ سے ایک رپورٹ لکھنے کی درخواست کی، جس میں اس معاملے کے تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوے بتایا جائے کہ کیا احمدیوں کے خلاف پاکستان میں چلنے والی مہم کے نتیجے میں ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا یا اس کے پیچھے دوسرے اسباب کارگر تھے۔ عدالت نے خاص طور پر مجھے ہدایت کی کہ خود پاکستان جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ اس کے علاوہ عدالت یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس ملک میں احمدیوں کی تعداد کتنی ہے؟ کیونکہ اس بارے میں جماعتِ احمدیہ کے پیش کردہ اعداد وشمار غیر یقینی تھے۔

مجھے پاکستان میں ایک بہت دلچسپ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جماعتِ احمدیہ کے نمائندے مولوی فضل الٰہی انوری نے جرمن سفارت خانے میں اسلام آباد جا کر یہ بیان دیا تھا کہ احمدیوں کو پاکستان میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا، ان کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی گئی اور کوئی مذہبی یا سیاسی جماعت ان کو پاکستان سے نکلوانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کے الٹ مجھے مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں نے صاف صاف بتایا کہ وہ پاکستان کو احمدیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ جماعتِ احمدیہ کے نمائندے کا بیان صریحی طور پر ان بیانات کے خلاف تھا، جو جرمنی میں پناہ لینے والے احمدی دے رہے تھے۔ آگے چل کر اس پالیسی میں تبدیلی آ گئی تھی، کیونکہ احمدیوں کو جرمنی اور بعض دوسرے یورپی ملکوں میں پناہ ملنے لگی تھی، جس سے جماعتِ احمدیہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اب تک لگ بھگ چالیس ہزار احمدیوں کو جرمنی میں پناہ مل چکی ہے۔

پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کے اراکین کی تعداد کے بارے میں بدستور غلو سے کام لیا جا رہا ہے۔ مجھے جماعت کے نمائندہ مولانا شفیع اشرف نے بتایا تھا کہ پاکستان میں احمدیوں کی تعداد تیس اور چالیس لاکھ کے درمیان ہے۔ یہی تعداد خلیفۂ ثالث مرزا ناصر احمد نے پارلیمان کے کمیشن کو بتائی تھی۔ جب میں نے اس بارے میں احمدی صحافی ثاقب زیروی سے استفسار کیا، تو موصوف نے احمدیوں کی تعداد پینتالیس لاکھ بتائی۔ اتفاقی طور پر مجھے ساتویں دہائی کی احمدیہ مجلسِ مشاورت کی ایک رپورٹ مل گئی، جس میں چندہ دینے والوں کی کل تعداد پچیس ہزار بتائی گئی تھی۔ یہ جاننا چاہیے کہ جو احمدی تین ماہ تک لازمی چندہ نہیں دیتا اس کو جماعت سے خارج کر دینے کا حکم ہے۔ اس لیے یہ فرض کر لینا غلط نہیں کہ پچیس ہزار چندہ دینے والے جماعت کے ایکٹو (active) ممبر ہیں۔ یہ ممبر عام طور سے خاندانوں

کے سر براہ ہوتے ہیں، اس لیے اگر ہر خاندان کے دس افراد تصور کر لیے جائیں، تو کل تعداد دو لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے۔ اب اگر تصور کر لیا جائے کہ چندہ نا دہندگان احمدیوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہے، جتنی چندہ دینے والوں کی تو احمدیوں کی کل تعداد پانچ لاکھ بنتی ہے۔ اس سے زیادہ احمدی میرے اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ میں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ دنیا بھر میں احمدیوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ خلیفۂ رابع مرزا طاہر احمد نے ہر سال احمدیوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر بتانا شروع کیا۔ انکی ۲۰۰۳ء میں وفات تک، بقول انکے، ساری دنیا میں احمدیوں کی تعداد بیس کروڑ تک پہنچ چکی تھی اور اس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ہندوستان میں احمدیوں کی تعداد سات کروڑ بتائی گئی۔ گویا اس ملک میں ہر دوسرا مسلمان احمدی تھا۔ انکے جانشین مرزا مسرور احمد نے ۲۰۰۳ء میں بیعت کرنے والوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار بیان کی ہے۔

جب میری رپورٹ عدالت کے سامنے پیش ہوئی، تو اس پر جرمن سفارت خانے سے تبصرہ کرنے کو کہا گیا۔ اتفاقی طور پر برسوں کے بعد مجھے سفارت خانے کے متعلقہ اتاشی سے ملنے کا موقعہ ملا، جس نے میری رپورٹ پر تنقید کی تھی، مگر میرے جواب الجواب کے بعد اس کو شکست ماننی پڑی تھی۔ میں پاکستان کے ایک سفر کے دوران کراچی کے ہوائی اڈے پر پاسپورٹ کی چیکنگ والی قطار میں کھڑا تھا، جب مجھ سے آگے والے شخص نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ پھر اس نے جاننا چاہا کہ میں نے اتنی اچھی جرمن کہاں پر سیکھی تھی۔ جب میں نے ہمبرگ یونیورسٹی کا نام لیا تو اس نے پوچھا: کیا آپ جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ والے ڈاکٹر احمد تو نہیں ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے کہا: آپ کے سامنے وہ شخص کھڑا ہے جس نے آپ کی رپورٹ پر تنقید کرنے کی جرأت کی تھی اور جس کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔ وہ اس دوران میں جرمنی واپس لوٹ گیا تھا اور فارن آفس میں متعین تھا۔ وہ ہر سال پاکستان میں جنگلی خنزیروں کا شکار کرنے کے لیے آتا تھا، جس کا انتظار پاکستان کی عیسائی کمیونٹی سارا سال کرتی تھی۔ وہ لوگ شکار کیے جانے والے جانوروں سے اپنے ریفریجریٹر بھر لیا کرتے تھے۔ مسلمان زمیندار بھی خوش ہو جاتے تھے، کیونکہ اس طرح انکی جان جنگلی خنزیروں سے اور ان کی فصلیں تباہ کاری سے بچ جاتی تھیں۔

چند برسوں کے بعد میری ملاقات اس شخص کے ساتھ دوسری بار ایک شام بون کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی، جہاں پر میں ہمبرگ جانے والی ریل گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس روز شام، یمن اور سعودی عرب کے سفارت خانوں سے ویزا حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ پہلے دونوں ملکوں کا ویزا مل گیا تھا، مگر سعودی عرب کے سفارت خانے نے انکار کر دیا تھا، کیونکہ ان کو میرے بارے میں الریاض سے

وزارتِ اطلاعات کی طرف سے ویزا جاری کرنے کی ہدایت نہیں ملی تھی۔ اس نے کہا: آپ اپنا پاسپورٹ میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں کل صبح سعودی عرب کے سفارت خانے کو وزارتِ خارجہ کی طرف سے ایک زبانی نوٹ (verbal note) بھیج دوں گا اور آپ کو اسی روز ویزا جاری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ تیسرے روز مجھے ڈاک سے پاسپورٹ مل گیا جس میں سعودی عرب کا اعزازی ویزا لگا ہوا تھا۔

دتلف خالد

میرا جرمن نومسلم دوست دتلف خالد اس دوران میں جرمنی واپس لوٹ آیا تھا۔ اسلام آباد میں اس کی دال نہ گل سکی تھی۔ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اس دوران میں پوری طرح ملاؤں کے ہاتھ میں آ چکی تھی اور وہ خالد کو کسی قیمت پر بحال کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ خورشید حسن میر کی وساطت سے اس کو اسلام آباد یونیورسٹی میں فرانسیسی اور جرمن پڑھانے کا جز وقتی کام مل گیا تھا، مگر اس کا دل پاکستان سے اکتا گیا تھا۔ اس کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ جرمنی واپس لوٹنے کے لیے پیسے کہاں سے پیدا کرے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اپنی نصف بہتر سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے اپنے ساتھ یورپ لے جائے گا۔ اچانک کرائے کا انتظام اس طرح ہو گیا کہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک کانفرنس پاکستان کے بارے میں ہونی طے پائی، جس میں پروفیسر قدرت اللہ فاطمی کو شمولیت کی دعوت ملی۔ وہ اس وقت سے خالد کے سرپرست بنے ہوئے تھے، جب وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے زمانے میں نیا نیا پاکستان آیا تھا۔ انھوں نے خالد سے کہا کہ وہ اپنی جگہ پر اس کو بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ اس طریق سے اس کو جرمنی واپس لوٹنے میں آسانی ہو جائے۔

خالد کو برلن میں چونکہ کام نہیں مل رہا تھا، اس لیے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور دوسرے طالب علموں کے ساتھ دیہاڑی کی مزدوری کرنے لگا۔ ان دنوں میں ایک فلم بن رہی تھی، جس کے لیے ان کو اکسٹروں کی ضرورت تھی۔ خالد بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور اس نے اپنے پاکستانی دوستوں کو لکھا کہ وہ فلم ایکٹر بن گیا ہے مگر مجھے پتا تھا کہ اس کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ میں نے ان دنوں میں فولکس واگن فاؤنڈیشن کے لیے جرمنی کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈی کے تحقیقی پروجیکٹوں کا ایک جائزہ لیا، تو برلن یونیورسٹی کی طرف سے جو فہرست بھیجی گئی، اس میں خالد کا ڈاکٹریٹ کے لیے احمد امین پر لکھا جانے والا مقالہ بھی شامل تھا، جس کے بارے میں خالد نے مجھے نہیں بتایا تھا۔

میں نے اورینٹ انسٹیٹیوٹ کی میٹنگ میں پاکستان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے

ہوے بتایا کہ وہاں پر اسلامی تحریکات عوام میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوتی جارہی ہیں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس بارے میں تحقیقی پروجیکٹ بنایا جائے اور کسی ایسے شخص کے سپرد یہ کام کیا جائے، جو اسلامی دنیا سے خوب واقف ہو، وہاں پر مقیم رہا ہو اور جسے ان ممالک کی زبانیں بخوبی آتی ہوں۔ میں نے کہا کہ خوش قسمتی سے ایک ایسا شخص جرمنی میں موجود ہے، جس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تجربے اور مطالعے کی بنا پر یہ کام بخوبی سرانجام دے سکے گا۔

چنانچہ میری سفارش پر خالد کو اسلامی تحریکات پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالے کے لیے معاہدے پر رکھ لیا گیا۔ عین ان دنوں میں ہمیں ایک ادارے کی طرف سے ایک کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت ملی، جہاں پر اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے درمیان مکالمہ ہونا طے پایا تھا۔ وہاں پر جا کر پتا چلا کہ یہ مکالمہ چند برسوں سے چل رہا تھا، جس میں جرمنی سے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک چرچ کے نمائندے اور انگلستان میں مقیم یہودیوں کا ایک ادارہ شامل ہوتے تھے، جہاں پر ربی تیار کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں کی نمائندگی کبھی ہوتی تھی اور کبھی نہیں۔ جب اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والی نئی تحریکات کا ذکر آیا تو میں نے بیان کیا کہ ایران میں عوام کے اندر بہت ہلچل لگتی ہے، جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ تھوڑا عرصہ قبل ایک ایرانی روزنامے نے قارئین سے استدعا کی تھی کہ وہ انھیں اپنے مسائل لکھ کر بھیجیں۔ اس پر چار ہزار خط موصول ہوے۔ یہ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کے آخری دور کی بات ہے، جب کہ وہ بزعمِ خود ملک میں ایک صنعتی انقلاب برپا کرنے والے تھے۔ میں نے کہا کہ ایران میں کوئی انقلاب آیا چاہتا ہے۔ مجھے یہ پتا نہیں ہے کہ وہ انقلاب کس نوعیت کا ہوگا مگر یہ امر طے ہے کہ وہ آکر رہے گا۔ مجھے اس وقت خود علم نہیں تھا کہ میری پیشگوئی ایک سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کو تھوڑے دنوں کے بعد عراق سے نکال دیا گیا اور ان کو فرانس میں پناہ لینی پڑی۔ اس امر کا اس وقت تک کسی کو پتا نہیں تھا کہ ایران میں کیسٹوں کے ذریعے عوام کے اندر اسلامی انقلاب کے لیے میدان ہموار کیا جا رہا تھا، جو بالآخر ایران میں جمہوریتِ اسلامی قائم کرنے پر منتج ہوا۔

اسلامی دنیا میں پیدا ہونے وال تحریکات کا مطالعہ کرنے کے لیے دتلف خالد کو اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں بطور ریسرچ اسکالر کے رکھ لیا گیا۔ وہ پہلے سے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھتا آیا تھا، اس لیے کسی نے اسے اپنے کوائف اور تعلیمی اسناد پیش کرنے کے لیے نہیں کہا۔ البتہ اس کے نام کے بارے میں لوگوں نے کسی قدر حیرت کا اظہار کیا۔ ان کو خالد نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس کا باپ مراکو کا رہنے والا تھا، جس کو جرمنی میں ایک خاندان نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا، جس کے سبب اس کو ان کا فیملی نام اختیار کرنا پڑا تھا۔ مگر اسی پر بس نہیں تھی، اب خالد نے جلدی جلدی اپنا نام بدلنا شروع کر دیا۔ اس نے دتلف کی جگہ

پر ''دولت'' لکھنا شروع کر دیا، پھر کچھ عرصے کے بعد اس کو ''دوران'' میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت سے وہ اپنا نام ''خالد دوران'' لکھتا ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ اپنی ماں کے بارے میں، جو جرمن تھی، اس نے لکھنا شروع کیا کہ وہ دراصل ہسپانیہ کی رہنے والی تھی۔ میں ایک دفعہ اس کے پاس برلن گیا تو اس کی ماں نے میری موجودگی میں اس کو سرزنش کی کہ اپنے باپ کا نام نہ بگاڑو۔ وہ بیچارہ اپنی قبر میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوگا۔ اس وقت اس کو پتا نہیں تھا کہ خالد اپنے باپ کے بارے میں ہی نہیں خود اس کے بارے میں بھی افواہیں پھیلا رہا تھا۔

خالد کے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کے سبب نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ جرمنی میں طلاق بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس چیز کا تجربہ خالد کو ہوا، کیونکہ اس کو پچیس ہزار مارک ادا کرنے پڑے، جس کے نتیجے میں اس کا دیوالہ نکل گیا۔ اسی پر بس نہیں تھی، خالد نے انھیں دنوں میں مشرقی افریقہ کا سفر کیا، جس کے دوران اس کے اپنے بیان کے مطابق کینیا میں اسے ایک لڑکی ملی، جس نے دو چار روز کی سرسری دوستی کے بعد عدالت کے سامنے جا کر بیان دیا کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے ہونے والے بچے کا باپ خالد ہے۔ عدالت کے حکم پر خالد کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا تا کہ وہ عدالت کی طرف سے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے ملک سے نہ بھاگ سکے۔ خالد نے پانچ ہزار مارک ادا کر کے جان چھڑائی۔ اس عرصے میں اس کا ٹکٹ کینسل ہو چکا تھا، اس لیے اسے نیا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جب وہ سفر سے واپس لوٹا تو ایک ایک پائی کا محتاج ہو چکا تھا۔ اس پر بے حد قرض چڑھ چکا تھا اور بنک نے اس کی تنخواہ کی قرقی کرا لی تھی۔ اسے اپنا فلیٹ چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہ کرایہ نہیں ادا کر سکتا تھا۔ اب وہ انسٹیٹیوٹ میں شب بسری کرنے لگا۔ ایک روز کینیا کی ایک لڑکی اسے ڈھونڈتی ہوئی آن نکلی۔ اس کو خالد نے ہمبرگ آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے لیے ایک اسٹوڈنٹ ہوسٹل میں کمرہ مل گیا۔ وہ مہینہ بھر رہی۔ اسے واپس گئے دو چار ہفتے ہی ہوے تھے کہ کینیا کی ایک دوسری لڑکی ہمبرگ میں پہنچ گئی۔ البتہ اس لڑکی کے ساتھ اس نے امریکہ جانے کے بعد شادی کر لی تھی۔

اس کے امریکہ جانے کی سبیل یہ نکلی کہ وہاں کی ٹمپل یونیورسٹی (Temple University) میں مذاہب کی ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت آئی۔ وہاں پر جا کر پتا چلا کہ چندے پہلے اس یونیورسٹی کے پروفیسر پر، جو اسلامی مذہب پڑھاتے تھے، جانی حملہ ہوا تھا، جس سے وہ اور ان کی اہلیہ جان بر نہ ہو سکے تھے۔ چونکہ ان کی پوسٹ خالی تھی اس لیے خالد نے اس کے لیے درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ خالد کو ایک سال کے لیے رکھ لیا گیا، مگر سال پورا ہونے سے پہلے طالب علموں سے اختلاف کے سبب اس کو جواب مل گیا۔ ایک بار پھر اس کی قسمت نے یاوری کی۔ پروفیسر حفیظ ملک (ولا نووا یونیورسٹی)

(Villanove University) کو پتا چلا کہ امریکن یونیورسٹی واشنگٹن میں ابنِ خلدون چیئر پر جن صاحب کا تقرر ہوا تھا، وہ کسی وجہ سے نہیں آ سکتے، اس لیے ان کی جگہ خالی تھی۔ انھوں نے خالد کی سفارش کی، چونکہ وہ فوری طور پر ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے تیار تھا اس لیے اس کو رکھ لیا گیا۔ البتہ یہ پوسٹ محدود وقت کے لیے تھی، اس لیے اس میعاد کے ختم ہونے پر خالد کو ایک بار پھر بیکاری کا سامنا کرنا پڑا۔

اس عرصے میں اسے امریکہ کے بعض حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور ان کے ذریعے اس کا رابطہ سی آئی اے کے ساتھ قائم ہو چکا تھا، جس کی مدد سے اسلامی دنیا میں پائی جانے والی تحریکات کے بارے میں ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا، جس کا نام Inter State Islam رکھا گیا۔ اس رسالے کے سبب اسے مختلف اداروں کی طرف سے امدادی رقوم ملتی رہیں۔ مگر اس دوران میں یہ رسالہ بند ہو چکا ہے۔ اس کے بعد خالد نے ایک عرب اسکالر کے اشتراک سے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ''یہودیوں کے لیے اسلام'' تھا۔ اس کتاب کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے بارے میں یہودیوں کی معلومات بڑھائی جائیں، مگر بعض مسلمانوں کی طرف سے اس کتاب کی مخالفت ہوئی اور مصنف کو قتل کی دھمکیاں تک دی گئیں۔ پھر خالد نے ایک جرمن دوست کے ساتھ مل کر ایک کتاب ابنِ لادن کے بارے میں لکھی، جو گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے کے بعد اس موضوع پر چھپنے والی پہلی کتاب تھی اور اسی سبب بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔

جنوبی یورپ

یورپ کے کئی ایک ملکوں کی ہم سیر کر چکے تھے، مگر بلقان کے علاقے میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۹۷۴ء کی گرمیوں میں ہم نے اوتا کے آبائی ملک آسٹریا میں تعطیلات گزارنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانے میں ہمبرگ سے ریل گاڑی کی ایک خاص سروس چلتی تھی، جو آسٹریا سے ہوتی ہوئی آگے یوگوسلاویہ کے ساحلی شہر ریکا (Rijeka) تک جاتی تھی۔ یوں تو ہم نے آسٹریا کے آخری اسٹیشن پر اترنا تھا، مگر صرف چھ مارک زائد ادا کیے جائیں تو ریکا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اوتا کی ایک یوگوسلاوین سہیلی زاغرب (Zagreb) میں رہتی تھی اور ہمیں بار بار بلا چکی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اس سے ملنے کے بعد واپس جانے والی گاڑی میں آسٹریا چلے جائیں گے۔ مگر زاغرب میں قیام کے دوران ہم نے ٹیلی ویژن پر دیکھا کہ آسٹریا میں برف باری ہو رہی ہے۔ ویزنا اضحاقووچ (Vesna Izakovic) نے کہا بہتر یہ

ہے کہ تم آسٹریا جانے کی بجائے آگے جنوب کی طرف چلے جاؤ، جہاں پر موسم بہتر ہے۔ اسی نے ہمیں یوگوسلاویہ کے جزیرے رگوزنتسا (Ragoznica) پر جا کر چھٹیاں منانے کا مشورہ دیا، جہاں پر میں نے ''اوراقِ پریشاں'' کے عنوان کے تحت اپنی زندگی کے بارے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ہمیں وہاں کا ماحول اتنا بھایا کہ ہم اگلے برس پھر اسی جزیرے پر گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیے گئے۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ پہلے سال ہمارے بعد ایک جرمن جوڑے نے اسی مکان میں ایک ماہ گزارا تھا۔ مالکانِ مکان نے انھیں ہمارے بارے میں بتایا اور شاید زیبِ داستان کے لیے بڑھا چڑھا کر باتیں سنائیں، جس کے سبب ان کے دل میں ہم سے ملاقات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب انھیں پتا چلا کہ ہم اگلے سال پھر جولائی کے مہینے میں وہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ وہ ہم سے ملنے کے لیے اسی مہینے میں آ جائیں گے۔ چنانچہ جب ہم اگلے برس وہاں پہنچے تو وہ لوگ پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ اس طرح ہماری دوستی کا آغاز ہوا، جو آج تک چل رہی ہے۔

اس سے اگلے برس ہم تیسری بار یوگوسلاویہ گئے، مگر اب کے ہم نے جزیرہ کورچولا (Korcula) کا انتخاب کیا، جس کے بارے میں ہمارے نئے دوستوں انگے اور ایرہارڈ نے بتایا تھا۔ اس جزیرے کا تعارف میرے افسانے ''شناخت'' میں موجود ہے۔ میں ان سفروں کے دوران ابھی اپنی زندگی کے بارے میں نوٹ لے رہا تھا اور کہانی لکھنے کی طرف قدم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ مرحلہ بالآخر ۱۹۷۹ء میں یونان کے سفر کے دوران آیا، جب میں نے طولون (Tolon) کے مقام پر ایک افسانہ "جنم جنم کا ساتھ" لکھنا شروع کیا۔ یہ افسانہ صرف مراکو کے سفر کے بعد وجود میں آ سکتا تھا، جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا، مگر اس سے قبل مجھے یونسکو کی ایک کانفرنس کے سلسلے میں مصر جانے کا موقع ملا۔ یہ کانفرنس تعلیمِ بالغاں کے بارے میں تھی۔ اس کا انعقاد منوفیہ کے مقام سرس اللیان میں ۱۹۷۵ء میں ہوا، جو قاہرہ سے اندازاً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پر ہمیں تعلیمِ بالغاں کے ٹیچرز ٹریننگ سنٹر میں رکھا گیا تھا اور چونکہ اس گاؤں میں کسی قسم کی دلچسپی کا سامان موجود نہیں تھا، اس لیے ہم پورا ہفتہ گویا ہمہ وقت کانفرنس میں مشغول رہے تھے۔ البتہ سنٹر کی لائبریری میں مجھے تیس پینتیس کتابیں اسلام میں عورتوں کے مقام کے موضوع پر مل گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس اسکول کے ڈائرکٹر علی عیسیٰ عثمان کو میری طرح اس موضوع میں خاص دلچسپی تھی۔ ساری کتابیں عربی زبان میں تھیں اور سراسر نایاب تھیں۔ میری نظر سے ان میں سے بعض کتابوں کے حوالے گزرے تھے، مگر میں اصل کتابوں کو اس وقت تک نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں نے کانفرنس کی کارروائی سے بچ نکلنے والے وقت میں، جب کہ دوسرے مندوبین فٹ بال کھیلتے تھے، ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ رخصت کے وقت ڈائرکٹر کی ایک کتاب مجھے عنایت کی گئی، جو امام غزالی کی تحریروں میں

انسان کے اسلامی تصور کے بارے میں ہے۔اس کتاب کا پورا عنوان یہ ہے:

"The concept of man in Islam in the writings of al-Ghazali"

مراکو کی سیاحت

مجھے اکتوبر ۱۹۷۷ء کو عرب لیگ کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے مراکو جانے کا اتفاق ہوا،جس کا مقصد عرب ممالک میں صنعتی ڈاکومنٹیشن کے مراکز کے کام کا جائزہ لینا تھا۔ مجھے چونکہ پہلی بار المغرب کے ملک مراکو جانے کا موقع مل رہا تھا،اس لیے میں نے چار روزہ کانفرنس کے بعد،جس کا انعقاد الرباط میں ہونا تھا، ملک کی سیاحت کا ارادہ باندھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جانے آنے کا محض ہوائی ٹکٹ خریدا جائے،تو اس کی قیمت اس ٹکٹ سے کہیں زیادہ تھی،جس میں انسان علاوہ سفر کرنے کے دو ہفتوں تک بطور ٹورسٹ اونچے درجے کے ہوٹل میں جا کر قیام کرسکتا تھا۔ میں نے ایسا ٹکٹ خریدا۔ ہوائی جہاز میں میرے ساتھ سفر کرنے والے جرمن ٹورسٹوں میں سے ایک لڑکی کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ میں دوسروں کی طرح گپ شپ میں شامل ہونے کی بجائے سارا وقت بیٹھا ہوا کیا لکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے سمینار میں پیش کیے جانے والا مقالہ مکمل کرنا تھا،جس کا مجھے ہمبرگ میں عدیم الفرصتی کے سبب موقع نہ مل سکا تھا۔لڑکی نے بتایا کہ وہ ماں اور خالہ کے ساتھ جا رہی تھی۔ ان کو طنجہ میں پہنچتے ہی بس کے ذریعے ایک ہفتے کے ٹور پر نکل جانا تھا،جو انھیں ملک کے اہم شہروں کی سیر کراتا ہوا آغدیر میں جا کر ختم ہوگا، جہاں پر وہ ایک ہفتہ تک سمندر کے کنارے قیام کریں گے۔ میرا پروگرام اس طرح تھا کہ ایک دن طنجہ میں قیام کے بعد ریل گاڑی میں الرباط چلا جاؤں گا،جہاں پر مجھے چار روزہ کانفرنس میں شرکت کرنا تھی، اس کے بعد میرا ارادہ ملک میں گھومنے پھرنے کا تھا۔ ہوائی اڈے پر رخصت کے وقت میں نے لڑکی سے یونہی کہہ دیا کہ ہوسکتا ہے اس سفر کے دوران ہمارا پھر کسی جگہ پر ملنا ہو۔

کانفرنس کا انتظام الرباط سے چند کلومیٹر دور ساحلِ سمندر پر بنے ہوئے ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا۔جس میں شرکت کے لیے میرے قاہرہ میں قیام کے زمانے کے دوست آئے ہوئے تھے۔ دوسرے عرب ملکوں سے آنے والوں میں مجھے خاص طور پر سعودی عرب کے ایک میاں بیوی کا جوڑا بہت اچھا لگا ۔کھانے کی میز پر ہمارا ساتھ رہتا تھا،جس کے دوران میاں تو منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا رہتا تھا،مگر اس کی بیوی اپنے ملک میں رائج رسوم ورواج پر خوب روشنی ڈالتی تھی۔ وہ لڑکیوں کے ایک اسکول کی ہیڈ

مسٹریس تھی۔ اس نے کہا: یہاں پر میں تمھارے ساتھ بیٹھی ہوئی قسم قسم کے موضوعات پر باتیں کر رہی ہوں، لیکن اگر تم کبھی سعودی عرب آئے، تو میرا خاوند تمھیں مجھ سے ملانے کے لیے گھر پر لے کر نہیں آئے گا۔ وہاں پر مجھے پردہ کرنا پڑتا ہے اور اپنے میاں سے تین قدم پیچھے چلنا ہوتا ہے۔ اس کے چند برسوں کے بعد مجھے فی الواقعی سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا، تو میں اس کے خاوند سے ملنے کے لیے اس کے آفس میں گیا۔ میں نے اس کی بیوی کے نام سلام بھیجا مگر اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دی۔

کانفرنس کے دوران ہمیں وزیر اول نے شاہی محل میں کھانے کی دعوت دی، جس کی خاص چیز مجھے یہ یاد ہے کہ ہر میز پر ایک ایک سالم بکری ایک طشت میں رکھ کر پیش کی گئی تھی۔ گوشت اس قدر نرم تھا کہ انگلیوں سے توڑا جا سکتا تھا۔ اس روز ہمارے ساتھ یورپ سے آئے ہوئے مندوبین نے بھی قمیص کی کفیں اوپر چڑھا کر دونوں ہاتھوں سے کھانا کھایا۔ اس محل کو دیکھ کر انسان جان سکتا ہے کہ اسپین میں مسلمان حکمرانوں کے ہاں زندگی کا کیا طور طریق رہا ہوگا۔ عمارتوں کی نقش کاری وہی ہے، محل کے ادب آداب ویسے ہی ہیں، یہاں تک کہ بولی جانے والی زبان اور اس کا لہجہ بھی وہی ہے۔ بادشاہ کو امیر المؤمنین کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے ایک خاص پیغام میں اس امر پر معذرت کی گئی تھی کہ وہ اس شام ہمیں بنفس نفیس خوش آمدید کہنے سے قاصر تھے۔

کانفرنس کے بعد میرا رخ بیت الابیض (Casablanca) کی طرف تھا، جہاں پر پورے شہر میں اس روز کسی اونچے درجے کے ہوٹل میں کمرہ نہ مل سکا۔ آخرِ کار تیسرے درجے کا ایک ہوٹل لینا پڑا، جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہاں پر ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہوگا۔ یہ شہر مجھے بالکل پسند نہ آیا کیونکہ وہاں پر ایک بھی قدیم تاریخی عمارت موجود نہ تھی۔ میں نے وہاں پر صرف ایک رات بسر کی اور اگلے روز ریل گاڑی سے مراکش کے لیے روانہ ہو گیا، جس کے چپے چپے پر اسلامی یادگاریں پائی جاتی ہیں، مگر مجھے وہاں پر جس چیز کو دیکھنے کی خواہش لے جا رہی تھی، وہ میدان الفناء (فن کاروں کا میدان) تھا، جو شہر کی فصیل کے باہر پایا جاتا ہے اور جس میں ہر روز پچھلے پہر ہزاروں انسانوں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ مداری اور تماشا گر اپنے اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ قصہ خوان اپنے قصوں سے اور مراثی اپنے گانوں سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہیں۔ حکیم جڑی بوٹیوں کے خواص پر لمبے چوڑے لیکچر دیتے ہیں اور واعظین مسلمانوں کو دین وتقویٰ کی تلقین کرتے ہیں۔ اس جمگھٹے میں جیب کترے اپنے کاروبار میں اتنی ہی تندہی سے مصروف ہوتے ہیں، جس کا مظاہرہ بھکاری کرتے ہیں۔

میں دو گھنٹوں تک کیمرہ اٹھائے ہوئے ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے مجمع کا رخ کرتا رہا۔ اس سے بہتر جگہ انسانوں کی تصویریں کھینچنے کی بھلا کون سی ہو سکتی ہے۔ ادھر لوگ ہنستے ہنستے

لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں، تو دوسرے مجمع میں محویت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ تیسری جگہ پر واعظ کی گرجدار آواز سے سہمے ہوئے خدا کی قہاری اور قیامت کے روز طے پانے والی جزاء وسزا کے قصے سن رہے ہیں۔ ان میں ہر عمر کے لوگ شامل ہیں۔ بوڑھوں کا لباس روائتی ہے۔ سر پر طربوش، ٹخنوں تک جانے والے خفتان اور پاؤں میں چمڑے کے سلیپر۔ عورتیں اکثر کالے یا گہرے کلیجی رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں۔ بچوں کے کپڑے اکثر یورپی طرز کے دکھائی دیتے ہیں البتہ ملکی لباس ایک لمبا کرتہ ہے جس کے نیچے پاجامہ پہننے کی حاجت نہیں ہوتی۔ کسی کے پاؤں میں جوتے ہیں تو دوسرا ننگے پاؤں پھر رہا ہے۔ تماشابینوں میں ہر طبقے اور ملک کے ہر حصے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ مراکو کا شمار عرب ممالک میں ہوتا ہے، مگر لوگوں کے خدوخال کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ بہتوں کے آباء واجداد حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بربری نسل کے لوگ بھی اپنے بدن کی بناوٹ اور قدوقامت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کہنے کو تو اس ملک میں رنگ ونسل کی تمیز موجود نہیں، مگر عربوں کا افریقیوں سے اور ان دونوں کا بربروں سے نمایاں تفاوت اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتا۔

جامع الفناء کے ایک کونے میں مراکو نیشنل بنک کا بورڈ دیکھ کر یاد آیا کہ چیک بھی کیش کرانا ہے۔ کونٹر پر کھڑا میں کیش کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز کانوں میں پڑی۔ میرے افسانے ''جنم جنم کا ساتھ'' میں یہ آواز بابرا کی بتائی گئی تھی، مگر دراصل وہ آواز اس لڑکی کی تھی، جو مجھے ہوائی جہاز میں ملی تھی اور جسے میں نے کہا تھا کہ شاید ہم ملک میں گھومتے گھماتے کسی جگہ پر ملیں گے۔ مجھے تو خیر اسے دیکھ کر خوشی ہونی ہی تھی، اس کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ دیوانوں کی طرح مجھ سے آن چمٹی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی خالہ مجھے خوفزدہ نظروں سے تک رہی تھی۔ چنانچہ جب ہم بنک سے نکل کر ایک چائے خانے میں جا کر بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ محترمہ کو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ گروپ کی ایک اور لڑکی لیزا (Lisa) بھی تھی، جو خوبصورتی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ میں حیران ہوا کہ وہ مجھے ہوائی جہاز میں کیوں نظر نہ آئی تھی۔ خالہ شاید ڈر کے مارے جلد از جلد وہاں سے کھسک جانا چاہتی تھی۔ لیزا نے کہا کہ وہ میرے ساتھ اندرونِ شہر جانے کا ارادہ رکھتی ہے، جہاں پر وہ اکیلی جانے سے گھبرا رہی تھی۔ وہ سارا دن میرے ساتھ شہر میں گھومتی پھری۔ آدھی رات کو میں اسے اس کے ہوٹل میں چھوڑنے گیا، تو اس نے تجویز پیش کی کہ میں ان کے گروپ کے ساتھ آغدیر چلوں۔ بس میں اس کے ساتھ والی سیٹ خالی ہو گئی تھی، کیونکہ اس کی سہیلی راستے میں اپنے کسی دوست کے پاس رک گئی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اپنے گروپ کی انچارج سے میرے لیے اجازت لے آئی۔ اس طرح میں اگلی صبح ان کے ہمراہ آغدیر (Agadir) کے لیے روانہ ہو گیا۔

آغدیر میں دو روز لیزا کی معیت میں خوب گزرے۔اس شہر میں کوئی قدیم عمارت موجود نہیں تھی، کیونکہ یہ شہر ۱۹۶۰ء میں آنے والے زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا۔وہاں سے میں ہوائی جہاز میں الرباط پہنچا، جہاں کی میں سیر کر چکا تھا،اس لیے اسی شام آگے میکنز (Meknez) کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ شہر زمانۂ قدیم میں ملک کا صدر مقام رہ چکا تھا،اس وجہ سے محلوں، فصیلوں، باغات، مساجد اور مدرسوں کی عمارات سے بھرا پڑا ہے۔میں شہر کا نقشہ ہاتھ میں تھامے تاریخی عمارتوں کو ڈھونڈتا ہوا پھر رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے نو دس سالہ لڑکے نے مجھے شہر کی سیر کرانے کی پیشکش کی۔ میں نے اسے بہتیرا کہا کہ مجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں، مگر وہ کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوا۔آئندہ دو تین گھنٹوں تک وہ میرے آگے پیچھے منڈلاتا رہا۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا میرے بچے ہیں۔ میرا جواب نفی میں تھا۔اس پر اس نے کہا مجھے اپنے ساتھ جرمنی لے چلو۔ میں نے کہا: تمھارے ماں باپ کیا کہیں گے۔اس نے کہا: ان کے پاس مجھ جیسے پانچ اور بچے موجود ہیں، ان کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ ایک لڑکا کم ہو گیا ہے۔شاید وہ خوش ہو جائیں کہ انھیں میرے لیے روزی نہیں کمانی پڑے گی۔ مجھے تم ساتھ لے چلو، میں تمھارے سب کام کر دیا کروں گا۔ مجھے کھانا پکانا آتا ہے۔صفائی ستھرائی کا بھی میں ماہر ہوں۔تم مجھے کسی اسکول میں داخل کرا دینا۔پھر دیکھنا کہ میں کتنی جلدی ترقی کرتا ہوں۔

میں اس کو پیسے دے کر رخصت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب گرہارڈ (Gerhard)، جو ہمبرگ یونیورسٹی میں میرے لیکچرسن چکا تھا اور ایک سال سے مراکو میں عربی سیکھنے کے سلسلے میں مقیم تھا، کہیں سے آنکلا۔وہ بہت محنتی لڑکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچھی خاصی عربی بولنی سیکھ گیا تھا۔وہ مجھے اپنی رہائش گاہ پر لے گیا، جہاں پر میری ملاقات ایک انگریز سے ہوئی، جو وہاں کی یونیورسٹی میں استاد تھا۔اتفاقی طور پر اس کی بیوی پاکستان کی رہنے والی تھی، اس لیے وہ پاکستان میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔شام ان کی معیت میں اچھی گزری۔انھوں نے مجھے میکنز کے ایک حصے کی سیر کرائی، جسکی عمارتیں قدیمی رومن بنیادوں پر اٹھائی گئی تھیں۔ یوں بھی مجھے اگلے روز فاس (Fez) جانا تھا، جسکے پہلو میں قدیمی رومن شہر وولی بلیز (Volibilis) پایا جاتا ہے۔

فاس (Fez) ایک زمانے میں ملک کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ یہ شہر ملک بھر میں سب سے زیادہ اسلامی رنگ کا حامل ہے۔اس کا سبب مسجد قرویین ہے جو الازہر کی طرح اسلامی دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے، جہاں پر سینکڑوں برسوں سے اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔میکنز میں بھی ایک اسلامی یونیورسٹی موجود ہے، جو چودھویں صدی میں قائم ہوئی تھی۔مولائی ادریس نامی شہر اس نواح کا تیسرا قابلِ ذکر مقام ہے، جہاں پر مراکو کے پہلے مسلمان حاکم مدفون ہیں۔انکی قبر مرجعِ عوام وخواص

ہے۔لوگ بڑی تعداد میں ہر وقت وہاں پر دعا کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ مجھے تو ان کے طور اطوار سے یہ لگا، جیسے وہ ان قبروں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ شہر بھی قدیم زمانے میں دار الخلافہ تھا، کیونکہ مولائی ادریس نے عباسی خلافت کے بالمقابل خلافت قائم کی تھی۔

وولی بلیز کا رومن شہر وہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، جس کے عروج کا زمانہ قبل از مسیح تھا۔کھنڈرات سے پتا چلتا ہے کہ عمارتیں خاصے اونچے تمدن کی حامل تھیں۔ستون کھڑے ہیں اور گیٹ قائم ہیں۔فرش پر رنگ برنگی تصویریں بنائی گئی ہیں، جو اتنی تازہ لگتی ہیں جیسے ان کو کسی مصور نے ابھی ابھی بنایا ہو۔دوسرے ملکوں میں بھی میری نظر سے رومن موزائیک گزرے ہیں، مگر جیسی غیر معمولی تازگی وہاں پر دیکھنے میں آئی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

شام کی گاڑی سے میں طنجہ چلا گیا، جہاں سے میرے سفر کا آغاز ہوا تھا۔میرے پاس ابھی ایک روز باقی تھا،اس لیے میں نے تطوان (Tetouan) جانے کا پروگرام بنایا، جو گزشتہ کئی صدیوں سے ہسپانیہ کی کالونی رہا تھا اور ۱۹۵۶ء میں مراکو کو واپس ملا تھا۔ وہاں پر لوگوں کا رہن سہن، بول چال، سب کچھ مراکو سے مختلف ہے۔ یہاں تک کہ مجھے عام طور سے لوگ ہسپانوی بولنے والے ملے۔ریستورانوں میں وہی کھانے پیش کیے جا رہے تھے جو اسپین میں ملتے ہیں۔شام کے قریب میں نے واپسی کے لیے بس لی، جس میں میری طرح دن بھر کے لیے وہاں پر آنے والے لوگ بیٹھے تھے۔ جب ہم شہر کی سرحد کو پار کر رہے تھے، تو ڈرائیور نے خبردار کیا کہ کسٹم والے چیکنگ کر رہے ہیں۔اس پر بس میں اچھی خاصی ہلچل پیدا ہوگئی۔ایک عورت نے اپنی سیٹ کے نیچے سے کپڑوں کے پندرہ بیس تھان نکالے اور لوگوں میں تقسیم کرنے شروع کر دیے۔ مجھے بھی ایک تھان ملا، جس کو میں نے اپنی سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ پتا چلا کہ ایک سے زیادہ تھان ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہے۔جو کوئی زیادہ تھان لائے اس کو بہت کسٹم ادا کرنا پڑتا ہے۔مگر خیریت گزری اور کسٹم کے کارکن نے بس میں جھانک کر دیکھا اور آگے جانے کی اجازت دے دی۔سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ عورت، جس نے تھان تقسیم کیے تھے، اپنے تھان واپس لینے کے لیے پہنچ گئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر کسی نے یہ حرکت جرمنی میں کی ہوتی، تو شاید ہی اسے تمام تھان واپس ملتے۔ایک آدھ تھان ضرور ادھر ادھر کر دیا گیا ہوتا۔

ہمبرگ واپس پہنچ کر پتا چلا کہ میری غیر حاضری میں پاکستان سے اقبال کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں منعقد ہونے والی کانگرس میں شمولیت کا دعوت نامہ میرے نام آیا تھا اور پی آئی اے کے مقامی آفس کی طرف سے فون پر اطلاع آئی تھی کہ میرے لیے پاکستان سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ پہنچ چکا ہے، میں جب چاہوں آکر وصول کر لوں۔ میں نے فون کیا تو پتا چلا کہ ٹکٹ واپس منگوا لیا گیا ہے۔اس کے

پیچھے یہ راز تھا کہ جب پاکستانی سفارت خانے کو پتا چلا کہ مجھے کانگرس میں شرکت کے لیے دعوت بھیجی گئی ہے، تو سفیر صاحب کی ہدایت پر پریس اتاشی منیر احمد شیخ نے ٹکٹ کی منسوخی کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس زمانے میں میرے تعلقات پھر ایک بار سفارت خانے کے ساتھ کشیدہ تھے۔

اوتا کی پاکستان یاترا

میں نے اوتا سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اسے اپنا موروثی وطن پاکستان دکھاؤں گا اوران جگہوں پر لے کر جاؤں گا، جہاں پر میرا بچپن گزرا تھا۔ چنانچہ ہم نے یہ سفر ۱۹۷۸ء میں کیا۔ راولپنڈی میں ہمارا قیام مسز ڈیویز پرائیویٹ ہوٹل (Mrs. Devi's Private Hotel) میں تھا۔ اس چیز کا تعلق بھی میری بچپن کی یادداشتوں سے تھا۔ میں اس ہوٹل کو اس زمانے سے جانتا تھا جب راولپنڈی پاکستان بننے سے قبل ناردرن کمانڈ (Northern Command) کا ہیڈکوارٹر ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس سے بہتر ہوٹل اس شہر میں نہیں پایا جاتا تھا۔ میری امید سے بڑھ کر ہمیں وہاں پر برٹش راج کی فضا زندہ و تابندہ ملی۔ ہمارے سویٹ (suite) میں سونے کے کمرے کے علاوہ مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے ایک خاصی بڑی بیٹھک بھی شامل تھی۔ سونے کا کمرہ اتنا وسیع و عریض تھا کہ اس میں نٹ لگا کر بیڈمنٹن کا میچ کھیلا جا سکتا تھا۔ چھت کی اونچائی نو دس گز تھی۔ روشن دانوں کے دو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، جس کے سبب چڑیوں نے چھت کی کڑیوں میں گھونسلے بنا رکھے تھے اور دن رات کمرے میں اڑتی پھرتی تھیں اور اتنا شور مچاتی تھیں کہ سونا حرام ہو جاتا تھا۔ فرنیچر انیسویں صدی میں انگلستان سے برآمد کیا گیا تھا۔ اس امر کی تصدیق ان پر لگی ہوئی مہروں سے ہوتی تھی، جن پر استاد کاریگروں نے اپنے نام پتے درج کر رکھے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کرسیوں کی چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھی اور ان پر بیٹھتے ہوئے احتیاط برتنی پڑتی تھی کہ کہیں ہمارے بوجھ تلے ٹوٹ کر ڈھیر نہ ہو جائیں۔ بستر کی چادریں دھوبی کی دھلی ہوئی تھیں، مگر ان میں ہتھیلی برابر سوراخ تھے۔ کھانا یورپین باورچی خانے (European cuisine) کی یاد تازہ کراتا تھا، مگر ہمیں سب سے زیادہ یہ چیز ستاتی تھی کہ کھانے کی میز کے گرد ایک دو نہیں چار بیرے سروس کے لیے ہمہ وقت منکر نکیر کی طرح مستعد کھڑے ہوتے تھے۔ باغ کا مالی صبح و شام تازہ پھولوں کے گلدستے دے جاتا تھا۔ غرض برٹش راج کی فضا اس وقت تک اس ہوٹل میں سانس لے رہے تھی۔ پھر اس پر مستزاد یہ امر تھا کہ بھائی جان عبدالمنان ہمیں اپنی جس کار میں سیر و سیاحت کے لیے لے جاتے تھے وہ

بھی انگریزوں کے زمانے کی یادگار تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف اس لیے چل رہی تھی کہ بھائی جان واہ فیکٹری میں ٹرانسپورٹ آفیسر تھے اور ان کے ماتحت مستری ان کو خوش رکھنے کے لیے کار کے لیے درکار سپئیر پارٹس خود بنالیتے تھے، وگرنہ عرصہ ہوا یہ چیزیں مارکیٹ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔

میں نے اوتا کی فرمائش پر اس کو اسلامیہ ہائی سکول دکھایا، جہاں پر میں نے پانچویں سے دسویں جماعت تک پڑھا تھا۔ جھنگی محلے میں وہ مکان دکھایا، جس کے ساتھ میری بچپن کی یادیں بندھی ہوئی ہیں۔ بھائی جان نے ہمیں کوہ مری کی سیر کرائی، جس کی بدلی ہوئی فضا مجھے بالکل پسند نہ آئی۔ میری بچپن کی یادداشتوں میں یہ مقام کوہ قاف کی وادیوں جیسی شان وشوکت کا حامل تھا۔ واپسی پر راستے میں کار کا ایکسی لیٹر ٹوٹ گیا، مگر کار خوش قسمتی سے بھائی جان کے ایک واقف کار کی کوٹھی کے گیٹ پر آن کر رکی۔ انھوں نے ہمیں اپنی کار میں راولپنڈی پہنچا دیا اور اگلے روز بھائی جان کا بھیجا ہوا مستری کار کو ٹھیک کر کے لے آیا۔ پھر ہم اسی کار میں اپنے گاؤں چنگا بنگیال گئے۔ یہ سفر بھی کار کی مرمت کے بغیر تکمیل کو نہ پہنچا۔ راستے میں اس کا سائی لنسر (silencer) ٹوٹ گیا، جس کو رسی سے باندھ کر باقی ماندہ راستہ طے کیا گیا۔

اوتا کو چنگا پسند آیا۔ بالخصوص اس کو وہاں کے گھروں کی صفائی ستھرائی بہت اچھی لگی، وگرنہ وہ اس وقت تک پاکستان کے شہروں کی غلاظت، مکانوں کی بے ترتیبی اور سڑکوں کی بے مرمتی کی شکایت کرتی رہی تھی۔ اس کو پاکستان میں صرف دو ادارے ایسے نظر آئے تھے، جن کی کارکردگی قابلِ تعریف تھی۔ پہلے نمبر پر پی آئی اے (PIA) تھا، جس کے بارے میں اس زمانے میں ابھی وہ لطیفے سننے میں نہیں آتے تھے، جو آگے چل کر رائج ہوئے اور دوسرے نمبر پر ملٹری چھاؤنیاں، جہاں پر سڑکیں صاف ستھری تھیں اور ہر طرف پھول دار پودے اگے ہوئے تھے، جن کی دیکھ بھال کا انتظام مناسب تھا۔ اوتا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہمارے گاؤں میں عورتوں اور بچوں کی بھرمار تھی مگر مرد اکا دکا نظر آتے تھے۔ وہ لوگ نوکری کی تلاش میں انگلستان تک جا نکلے تھے۔ گاؤں میں بس ان کے بچے بستے تھے۔ جب ہم چنگا سے رخصت ہوتے وقت قبرستان میں خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے، تو میں نے ان لوگوں کا ایک گروپ فوٹو بنایا تھا جو مشایعت کی خاطر ہمارے ساتھ وہاں تک آئے تھے۔ اس تصویر میں شامل انتیس افراد میں صرف دو مرد تھے۔

ہم پشاور میں خاص طور پر سرور گنج دیکھنے کے لیے گئے، جہاں پر میں نے بچپن کے چند برس گزارے تھے۔ وہیں پر مجھے پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری یادداشت کا وسیع وعریض مکان دراصل گڑیوں کے گھروندوں جیسا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اتنی دہائیاں گزر جانے کے باوجود ہمارا اس زمانے کا ہمسایہ خاندان بدستور وہیں پر رہائش پذیر تھا۔ البتہ

اب وہ ہمارے مکان میں رہ رہے تھے۔ بھائی محمود، جو پہلے پیٹنٹ دوائیوں کے سیلز مین ہوا کرتے تھے، اب ٹورسٹ گائیڈ تھے اور ان کی بیٹھک میں گندھارا آرٹ کی بیش قیمت مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پتا چلا کہ وہ انھیں امریکن ٹورسٹوں کے ہاتھ بیچا کرتے ہیں۔ ان کا بڑا بھائی ڈاکٹر نور، جو پشاور میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا، تھوڑا عرصہ قبل ٹریفک کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ ان کی بہن محمودہ، جو لمبے عرصے تک ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی تھیں، ان دنوں انسپکٹر آف کالجز تھیں۔ ان کا خاوند مبارک احمد، جو میرے بھائی عبدالقیوم ناظر کا کلاس فیلو تھا اور جرمنی میں سات برسوں تک کیمسٹری پڑھتا رہا تھا، اب پیٹنٹ دوائیوں کی ایک کمپنی کا نمائندہ تھا۔ میں ان لوگوں سے پینتیس چالیس برسوں کے وقفے کے بعد مل رہا تھا، مگر لگتا تھا جیسے ابھی کل کی بات ہے کہ ہم مل کر گلی میں کھیلا کرتے تھے۔

پشاور کے میوزیم میں گندھارا آرٹ کے نمونے دیکھنے کے بعد جب ہم ٹیکسلا پہنچے تو مجھے وہاں پر پائے جانے والے تاریخی کھنڈرات ایک نئی روشنی میں دکھائی دیے۔ میرا تعارف بدھ تہذیب کے ساتھ ہائی سکول کے زمانے میں ہوا تھا، جب تاریخ کے استاد رشید صاحب ہماری کلاس کو ٹیکسلا دکھانے کے لیے لے گئے تھے۔ سفر کے دوران دو طالب علموں نے پوٹھوہاری زبان میں بیت بازی کی تھی، جس نے مجھے اپنی مادری زبان کے ادب کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ دوسری بات، جو اس سفر کے نتیجے میں میرے دل میں بیٹھ گئی تھی، یہ تھی کہ پوٹھوہار کے باسیوں کے مذہبی اعتقادات اور ثقافتی طور اطوار پر بدھ مت کے اثرات بہت واضح ہیں۔ یہ علاقہ صدیوں تک بدھ مت کا گڑھ رہ چکا ہے، جس کے آثار جگہ جگہ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ راولپنڈی سے گوجر خان جانے والی سڑک پر منکیالا توپ موجود ہے، جو دراصل ایک بدھ سٹوپا ہے۔ خود پوٹھوہار (پٹھ وہار) کا نام بتاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہ علاقہ بدھ مت کے پیروکاروں کا مرکز تھا، جیسے ہندوستان میں صوبہ بہار بھی دراصل بدھ مت کی وہار ہی ہے۔

لاہور میں مغلیہ آثار نے اوتا کو بہت مرعوب کیا۔ شاہی مسجد اور قلعے سے شروع کر کے ہم نے باری باری اس شہر کی تمام تاریخی عمارتوں کو دیکھا۔ شالیمار کی خوبصورتی اور اس کے ڈیزائن کے آگے یورپ کے شاہی باغات مات ہیں۔ پاکستان کے شہروں میں اوتا کو صرف لاہور پسند آیا، جس کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کے شہروں میں صرف یہ شہر اپنا مخصوص کیریکٹر رکھتا ہے جب کہ دوسرے شہر بے ترتیبی اور پھوہڑ پن کا مرقع ہیں۔

ہمارے اگلے دونوں پڑاؤ ملتان اور موہنجوداڑو تھے۔ ملتان میں اس روز گرد و غبار کا جھکڑ آیا ہوا تھا، جس کے سبب سیر و سیاحت کے پروگرام میں خلل پڑ گیا۔ موہنجوداڑو میں مطلع صاف تھا اور یوں بھی ہم نے رات وہاں پر گزارنی تھی اس لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ میں پہلے بھی ایک بار وہاں جا چکا

تھا۔ کراچی سے ہوائی جہاز صبح سات بجے موہنجوداڑو پہنچتا تھا اور ساڑھے گیارہ بجے واپس لوٹ جاتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے علم نہ تھا کہ وہاں پر ٹورسٹوں کو ٹھہرانے کا انتظام موجود تھا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوے تھے کہ مہمانوں کے کمرے اپنی سادگی میں راہب خانوں کے کمروں کو مات کرتے تھے۔ ہمارے سوا وہاں پر کوئی دوسرا ٹورسٹ اس روز شب بسری کے لیے نہیں رکا تھا۔ کھانا گوارا تھا مگر ایک چیز ایسی تھی، جس کے سبب وہ رات ہمیں ساری عمر یاد رہے گی۔ اکتارا بجانے والا فقیرا ہمیں اپنے فن سے مالا مال کرنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ وہ آدھی رات تک ہمیں محظوظ کرتا رہا۔ ''علی دا پہلا نمبر'' کے بول آج بھی اوتا کو یاد ہیں اور وہ گاہے بگاہے فقیرے کے انداز میں گنگنایا کرتی ہے۔

اردو ادب کی طرف واپسی

پاکستان کے سفر کے دوران میری نظر سے ''ماہِ نو'' گزرا، تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس میں غیر ملکی ادب کے تراجم چھپے ہوے تھے۔ میں نے جرمنی واپس پہنچ کر جرمن شاعروں کے کلام میں سے چند تراجم کشور ناہید کو بھیجے، جو اس زمانے میں ''ماہِ نو'' کی مدیرہ تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی طرف سے ایسی والہانہ قبولیت کا سندیسہ ملے گا۔ کشور نے اپنے خط میں لکھا:

''یہ آخر آپ چھپے ہوے کہاں تھے۔ آپ کے تراجم کو پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ بڑا دقت طلب کام ہوتا ہے ترجمہ کرنا۔ میں تو خود بھی اس منزل سے بارہا گزر چکی ہوں اس لیے آپ کے کرب کو بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ بہر حال یہ کرب کربِ رائیگاں نہیں ہے کہ ہمیں اس کے طفیل بہت خوبصورت نظمیں پڑھنے کے لیے ملی ہیں۔ حسرت سے یہ نظمیں ملی ہیں۔ نجانے کتنے لوگ بطور تحفہ ان نظموں کو پڑھ کر لطف لیتے رہے۔

مجھے ایک اعتراض ہے۔ آپ کا اپنا نام جامع ہے۔ یہ قلمی، فرضی نام کی علّت کیوں؟ بہر حال تازہ شمارے میں، کہ جہاں فیض اور راشد کی نظمیں شامل ہیں، وہاں آپ کی نظم بھی میں نے البم مکمل کرنے کے لیے دی ہے۔ آپ سے ایک اور درخواست ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو اور آپ نے پڑھا بھی ہو، جرمن زبان کی ایک شاعرہ کہ جو خودکشی کر چکی ہے (وہ ناول نگار بھی تھی)، نام تھا انگیبورگ بیخمن (ہم نے انگریزی میں یونہی پڑھا ہے) اس کی کچھ چیزیں اگر آپ کو ملیں تو ضرور ترجمہ کیجیے۔

''آپ سے بس اتنی التجا ہے کہ آپ لکھتے رہیے اور ''ماہِ نو'' کی موجودہ روش (کہ جو پتا نہیں کتنے

دن چلنے دی جائے) کو زندگی دیجیے۔ اچھا ادب تو اب جیسے ناپید ہے۔ آپ کی چیزیں خاص طور پر ''مڈل کلاس کا ترانہ'' تو ہاتھوں ہاتھوں کا پیاں ہو کر تقسیم ہو رہا ہے۔ باقی حدِ آداب کہ ''ماہِ نو'' کے بہت سے کام آپ لوگوں نے میرے ذمے لگائے ہوئے ہیں۔''

۱۸ جون ۱۹۷۸ء   والسلام کشور ناہید

قلمی نام کی توضیح یہ ہے کہ میں نے ابتدائی تراجم ''یحیٰی فضلی'' کے نام سے کیے تھے، جو پہلے وقتوں میں میرا قلمی نام ہوا کرتا تھا۔ کشور کے خط کے بعد میں نے اپنے اصلی نام کے تحت لکھنا شروع کر دیا۔ یہ دور تراجم کا تھا۔ میں نے ابھی افسانہ نویسی کی طرف رجوع نہیں کیا تھا۔ میں اپنی تحریریں کشور کو بھیج دیتا تھا جو ان کو پاکستان کے ادبی جریدوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔

چنانچہ کشور نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کے خط میں لکھا: ''آپ کی تحریروں کا شہرہ پورے پاکستان میں ہو گیا ہے۔ آج کل ''امروز''، ''احساسات''، ''اظہار'' اور ''سویرا'' میں آپ کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ سب ہی لوگوں نے پسند کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی کتاب چھپنے تک آپ کا نام نہ صرف بڑے شاعر کی حیثیت سے پہچانا جائے گا بلکہ ایک منفرد شاعر کی حیثیت اور بہترین مترجم کے روپ میں آپ کی شخصیت مدون ہو رہی ہے۔''

پھر یکم اگست ۱۹۷۹ء کے خط میں کشور نے لکھا: ''بہت دنوں بعد آپ نے یاد کیا۔ آپ کا خط آتا ہے تو میں بہت دن مسرور رہتی ہوں۔ سبب یہ کہ اچھی نظمیں اور اچھی کہانیاں اتنی کمیاب ہیں کہ کبھی کسی جانب سے نظر افروز ہوں تو نعمت معلوم ہوتی ہیں...... اور ہاں ہندوستان سے بلراج مین را نے ''شعور'' بھیجا ہوگا۔ عبداللہ ملک نے ''احتساب'' بھی بھیجا ہوگا اور ''احساسات'' والوں نے بھی رسالہ روانہ کیا ہو گا۔ ان تمام رسالوں میں آپ کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں...... داریوفو کی اور نظمیں بھیجیں۔ میرا تو اس شخص نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ بہت اچھا شاعر ہے۔ اگر انگریزی میں اس کی کتاب مل جائے تو ضرور بھجوائیے گا۔ ویسے ڈراموں کا مجموعہ بھی سمندر کے راستے یا کسی آتے جاتے (کذا) عنایت ہو جائے۔''

کشور کے ۱۱ اگست ۱۹۸۰ء کو موصول ہونے والے خط کا اقتباس: ''میں نے آپ کے جرمن زبان سے براہِ راست اور یہاں انیس ناگی سے لے کر منو بھائی اور اصغر ندیم سید کے انگریزی زبان سے تراجم دیکھے ہیں۔ آپ کا ترجمہ زیادہ جامع، زیادہ بے ساختہ اور زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ یہ منہ دیکھے کی بات نہیں، بلکہ عرض کرنے کا مقصود یہ ہے کہ آپ کی شہرت بہت بڑے شاعر کی نہ ہونے کے باوجود بہت بڑے مترجم کی تو ہے۔ یہ وصف ابھی تک کوئی اور قابلِ اعتبار شاعر جما نہیں سکا۔''

ستمبر ۱۹۷۹ء میں ہم نے یونان کا سفر کیا، جس کے دوران ہم بہت سی جگہوں پر گئے۔ جب ہم

بالآخر طولون (Tolon) کے مقام پر دو ہفتوں کے لیے رکے، تو میں نے بیس برسوں کے بعد ایک افسانہ ''جنم جنم کا ساتھ'' لکھا، جو فنون، لاہور (شمارہ ۱۶) ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ یہاں سے میری افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا جس کا سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ اس دوران میں میرے افسانوں کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں، پانچواں تکمیل کے مراحل میں ہے۔

حبشہ اور سوڈان

اقوامِ متحدہ کے معاشی ادارہ برائے افریقہ کے زیرِ انتظام منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شمولیت کے لیے مجھے جنوری ۱۹۸۰ء کو اتھیوپیا کے دارالحکومت ادیس ابابا جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ کانفرنس بھی عرب ملکوں میں قائم ہونے والے صنعتی ڈاکومنٹیشن کے سلسلے میں تھی۔ کانفرنس سے زیادہ مجھے اس ملک کے حالات میں دلچسپی تھی، جہاں پر ۱۹۷۴ء میں قیصر ہائیلے سلاسی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ بغاوت کی ابتداء یونیورسٹی کے طالب علموں کے مظاہروں سے ہوئی تھی، جس کی لپیٹ میں سارا ملک آ گیا تھا۔ آخرِ کار پندرہ فوجی افسروں نے قیصر کی حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کے سامنے اس وقت کوئی خاص لائحہِ عمل نہیں تھا۔ بائیں بازو کے طالب علموں نے ان کو اشتراکیت کی راہ دکھائی۔ جس کے نتیجے میں افسروں کے درمیان نظریاتی جنگ شروع ہوگئی، جس کے سبب انقلابی افسروں میں سے تیرہ اس وقت تک موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے۔ مجھے ایک افریقی ملک کے سفیر نے بتایا کہ کچھ عرصہ قبل صدرِ مملکت کے قصر میں اکیس افراد کو گولی ماردی گئی تھی۔ اس سے اگلے روز یہ خبر سننے میں آئی کہ گزشتہ رات مزید چار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ صبح کو ہم کانفرنس میں شرکت کے لیے نکلتے تھے تو سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشیں دیکھتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے کرفیو لگ جاتا تھا۔ ایک رات میری آنکھ دلدوز چیخوں اور واویلے کے سبب کھل گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر سڑک پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ پانچ مرد ایک عورت کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ میری گھڑی پر اس وقت دو بج رہے تھے۔ میں نے اگلی صبح ہوٹل کے ملازم سے رات والے واقعے کے بارے میں پوچھا، تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیسی چیخیں؟ ایک عورت کی چیخ و پکار اس ہوٹل میں میرے سوا کسی نے نہ سنی تھی۔ میں نے یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں اپنے ڈرائیور سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اسے اس کا علم تھا۔ اس نے کہا: کرفیو کی خلاف ورزی پر لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

میں یونیورسٹی دیکھنے کے لیے گیا تو شعبہِ تاریخ کے ایک انگریز استاد نے ملتے ہی معذرت

چاہی۔ اس نے کہا: مجھے شعبہ کے صدر سے ملنا چاہیے۔ صدرِ شعبہ نے فلاسفی کے پروفیسر کے نام رقعہ لکھ کر دیا۔ فلاسفی کے پروفیسر نے مجھے مارکس ازم لینن ازم کے پروفیسر کی طرف بھیج دیا، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ پروفیسر حضرات ایک اجنبی سے بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ ملک میں ایک دوسرے پر الزام تراشی کی روچل رہی تھی۔ جس کسی کی ناک پسند نہ آئی اسے امریکہ کا جاسوس قرار دے دیا جاتا تھا۔ میں تو یوں بھی مغربی جرمنی سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے ہر کوئی مجھ سے بچنا چاہتا تھا۔

ادیس ابابا میں قدم قدم پر ایک محصور شہر میں بند ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ تمام ایسے مقامات پر، جہاں عوام کا آنا جانا تھا، پولیس کے دستے اور محافظ کھڑے ہوتے تھے، جو ہر شخص کی داخلے سے قبل تلاشی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی ہوٹل، ریستوران، ڈاک خانے، بنک، اسٹور وغیرہ میں داخلہ تلاشی کے بعد ہی ممکن تھا۔ شہر سے باہر جانا ہو تو حکومت سے اجازت لینی پڑتی تھی کیونکہ ملک کی تمام شاہراہیں غیر محفوظ تھیں۔ میں نے اپنے قیام کے دوران دو بار تفریحی سفروں کے لیے بکنگ کرائی مگر دونوں بار سفر ملتوی کر دیے گئے۔

ایک روز ناشتے کے وقت مجھے ہوٹل کے لان میں جرمن ٹورسٹوں کی ایک پارٹی ملی، جس میں دس افراد شامل تھے۔ وہ لوگ ایک چھوٹے سے قصبے سے تعلق رکھتے تھے اور ایک بولنگ کلب کے ممبر تھے۔ ہفتے میں ایک روز مل کر بولنگ کرتے تھے۔ جیتی جانے والی رقم سارا سال جمع ہوتی رہتی تھی، جس کی مدد سے وہ دنیا کے کسی دور دراز ملک کی سیر پر نکلتے تھے۔ اتھیوپیا میں وہ ایک بار پہلے آچکے تھے۔ اس بار وہ کینیا جا رہے تھے اور راستے میں ان کا جہاز ایک روز کے لیے ادیس ابابا میں رکا تھا۔ ان میں سے ایک شخص دندان ساز (dentist) تھا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ پہلی بار آیا تھا تو اس نے ایک گاؤں کی پوری آبادی کے دانتوں کا معاینہ کیا تھا اور ان کی مرمت کی تھی۔ جتنے دنوں تک وہ اس گاؤں میں رہا تھا سارا وقت ایک چھوٹی سی لڑکی اس کا تھیلا اٹھا کے اس کے ساتھ پھرتی رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ بڑی ہو جائے گی تو وہ اس کو جرمنی منگوا لے گا اور اس کی پڑھائی کا سارا خرچ ادا کرے گا۔ چونکہ ان کو اگلے روز کینیا چلا جانا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اگر میں اس علاقے کی سیر کے لیے جاؤں، تو کیا میں اس لڑکی کے لیے اس کی طرف سے ایک گھڑی تحفے میں پہنچا سکتا ہوں۔ اس نے گھڑی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دو بار اسی علاقے میں جانے والے ٹورسٹ گروپوں میں نام لکھوا چکا تھا، مگر راستے کے غیر محفوظ ہونے کے سبب دونوں بار پروگرام کینسل کر دیے گئے تھے۔ اس واقعے کے دو یا تین برسوں کے بعد مجھے اس دندان ساز کا فون آیا کہ وہ لڑکی اس کے پاس جرمنی پہنچ چکی ہے اور ایک اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ اس نے کہا: لڑکی اس کی طرح دندان ساز بننا چاہتی ہے اور وہ

اس کی تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔

مصر کے سفیر ڈاکٹر ابو بکر عبدالغفار نے اپنے دولت کدہ پر ایک محفلِ طعام دی، جس میں تیس افراد شامل ہوے۔ باتوں باتوں میں سفیر صاحب نے علامہ اقبال کا ذکر چھیڑ دیا اور بتایا کہ ان کے دل میں علامہ کی بے حد عزت ہے۔ پھر عرب شرکائے محفل کی طرف رخ کرتے ہوے فرمایا: علامہ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کا ترجمہ اپنی ملکی زبان میں کیا تھا۔ میں اس انکشاف پر ہکا بکا رہ گیا۔ اس بھری محفل میں ان کی غلطی کی تصحیح کو مناسب نہ جانتے ہوے چپ رہا۔ میں ابھی پوری طرح فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ شریکِ محفل ڈاکٹر محمد عبدالغنی حسن نے (جنکا شمار عربی زبان کے مشہور معاصر شاعروں میں ہوتا ہے) علامہ اقبال کے بارے میں چند مزید تعریفی کلمات کہے۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ کے اشعار کا ترجمہ پاکستان میں پہلے مصری سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے کیا تھا، جسے ام کلثوم نے اپنے مخصوص رنگ میں گایا تھا۔ انکی غلطی کو میں درست کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر عزام نے فارسی کلام میں سے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا تھا۔ البتہ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کا ترجمہ نابینا شاعر صاوی شعلان نے کیا تھا، جسے امِ کلثوم نے ریڈیو پر پیش کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار قاہرہ میں پہنچا، تو مجھے امِ کلثوم کی کوٹھی کے پہلو میں واقع جرمن آرکیولاجیکل انسٹیٹیوٹ کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس روز کئی گھنٹوں تک امِ کلثوم کا گایا ہوا علامہ اقبال کا کلام ریڈیو پر نشر ہو رہا تھا اور قاہرہ کا ٹریفک رک گیا تھا۔ میں جس طرف بھی جاتا تھا ساری دکانوں سے امِ کلثوم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ لوگ اس کو سنتے تھے اور وجد میں آ آ کر جھوم رہے تھے۔

میں نے خاص طور پر ٹکٹ اس طرح بنوا رکھا تھا کہ واپسی کے راستے میں خرطوم (سوڈان) میں چند روز کے لیے رک سکوں۔ میں سوڈان پر ایک کتاب مرتب کر رہا تھا، اس لیے چاہتا تھا کہ اپنے کتابی علم میں وہاں پر قیام کے ذریعے تھوڑا سا اضافہ کرسکوں۔ مجھے اس سے قبل سوڈان جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ہمیں استاذ محمود محمد طٰہٰ کے بارے میں اس زمانے میں ابھی سرسری سا علم تھا۔ ان کے کچھ رسائل ہمیں ملے تھے، جن کی مدد سے دیکھا جاسکتا تھا کہ اس شخص کے نظریات اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، جوامتِ مسلمہ کے لیے ایک نیا راستہ متعین کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ دتلف خالدان سے مل چکا تھا اور ان کی تعلیمات کا یورپ میں خوب چرچا کر رہا تھا۔ اسی کے ذریعے مجھ تک استاذ محمود محمد طٰہٰ کا پیغام پہنچا تھا۔ میں ان کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ آگے چل کر صدر نمیری کے ایما پر ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ عدالت نے ان کو مرتد قرار دیتے ہوے موت کی سزا سنائی تھی اور عمر رسیدگی کے باوجود ان کو پھانسی دے دی گئی تھی۔

خرطوم اور ام درمان دو توام شہر ہیں، جو دریائے نیل کے آمنے سامنے کے کناروں پر آباد ہیں۔ میں خرطوم میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح صبح میں ٹیکسی میں ام درمان گیا، جہاں پر استاذ محمود طٰہ رہتے تھے۔ میرے پاس ان کا پتا تو نہیں تھا مگر مجھے خالد نے کہا تھا ان کو ڈبّے کتے کی طرح ہر کوئی جانتا ہے، تم کسی راہ چلتے سے پوچھ لینا وہ تمھیں ان کے گھر پر چھوڑ آئے گا۔ راستے میں مجھے ڈرائیور نے مہدی سوڈانی کی مسجد اور ان کی آل اولاد کے مکانات دکھائے۔ محمود محمد طٰہ کا مکان پکے مکانات کی ایک کالونی میں تھا۔ ان کے گھر پر دو چار اصحاب آئے بیٹھے تھے، جو شاید رات کو بھی وہیں پر سوتے تھے۔ ان لوگوں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ محمود محمد طٰہ کو میرے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ باہر تشریف لے آئے۔

ان کا قد میانہ تھا، جسم فربہ نہ تھا۔ ان کی عمر اس زمانے میں ستر کے لگ بھگ تھی۔ صحت اچھی تھی۔ مجھ سے بہت محبت کے ساتھ معانقہ کیا۔ مجھے کہا: ٹیکسی کو چھوڑ دیں۔ ہم آپ کی واپسی کے لیے کار کا انتظام کر دیں گے۔ پھر کون جانتا ہے کہ ہماری گفتگو میں کتنا وقت لگ جائے۔ پہلے آیئے ہمارے ساتھ ناشتہ کیجیے پھر باتیں کریں گے۔ ان کے گھر سے ایک بڑے کونڈے میں دلیہ قسم کا ناشتہ آیا تھا، جو درمیان میں رکھ دیا گیا اور سب لوگ اس کے گرد بیٹھ کر اس میں سے کھانے لگے۔ اس وقت تک ان کے اصحاب کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے ہماری آپس کی باتوں کو سن رہے تھے۔

ہماری گفتگو کبھی عربی میں اور کبھی انگریزی میں ہوتی رہی۔ ان کو انگریزی اچھی آتی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے مگر ساری عمر اسلامی تعلیمات پر غور فکر میں بسر ہوئی تھی۔ ان کے گھر پر رات کو صوفیوں کی محفل جمتی تھی، جس میں ذکر ہوتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خرطوم یونیورسٹی کے طالب علموں میں وہ بہت مقبول تھے۔ ان کی بیٹیاں اسی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ طالب علم ان کی کتابیں پڑھتے تھے، جب کہ محلے کے صوفی منش لوگ ان کو اپنا پیر مانتے تھے۔

ان کی تعلیم کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ قرآنی تعلیمات کے دو نمایاں پہلو پائے جاتے ہیں: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکّہ کے زمانے میں اترنے والی تعلیمات ہمیشہ کے لیے ہیں، جب کہ مدینہ کی زندگی میں روزمرہ کی ضروریات کے پیشِ نظر احکامات نازل ہوتے رہے۔ تعدّدِ ازدواج کی اجازت مدینہ میں دی گئی، کیونکہ بدر اور احد میں بہت سے مسلمان مرد مارے گئے تھے اور معاشرے میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مکّہ کے زمانے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی بیوی تھی۔ اسی طرح دوسرے احکامات کو دیکھا جائے تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ مدینہ کے زمانے میں صحابہ کو بالکل مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر مکّہ میں نازل ہونے والے احکامات کو لیا جائے، تو اسلامی معاشرے کو آج کے زمانے میں کسی قسم کی مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔ وہ مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق دینے کے حق میں

تھے۔

مجھے سوڈان میں جرمن سفیر نے ایک بجے کا وقت دے رکھا تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ استاذ محمود محمد طٰہٰ سے چار گھنٹوں کی نشست کے بعد رخصت لینی پڑی۔ ان کی بیٹی مجھے سفارت خانے میں چھوڑنے کے لیے ساتھ آئی۔ وہ قانون کی طالبہ تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی جانشین بنے گی۔ جرمن سفیر ڈاکٹر کاہلے میری راہ تک رہے تھے۔ میں انھیں بہت دنوں سے جانتا تھا۔ وہ نوجوانی کے زمانے میں پاکستان میں رہ چکے تھے، جہاں پر ان کی بیوی نے تھیٹر ورک شاپ لگائی تھی جس کا چرچا میں متعدد بار سن چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی مستشرق باپوں کی اولاد ہیں۔ سفیر صاحب کے والد ڈاکٹر کاہلے (Dr. Kahle) جرمن مستشرقوں کے سرخیل رہ چکے تھے۔ ان کی بیوی کے والد سویڈیش مستشرق ڈاکٹر نیبرگ (Dr. Nieberg) تھے، جن کے نام کا درست تلفظ ''نی بری'' ہے۔

سفیر صاحب نے گفتگو شروع کرنے سے پہلے پوچھا: یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ میں نے کہا: ٹھنڈے پانی سے میں ڈرتا ہوں، اس لیے چائے مل جائے تو خوب ہے۔ کم سے کم پانی تو ابلا ہوا ہوگا۔ انھوں نے کہا: کیا چائے کے ساتھ بسکٹ بھی کھاؤ گے؟ میں نے کہا: مل جائیں تو کھا لوں گا۔ انھوں نے گھنٹی بجائی اور ملازم سے چائے اور بسکٹ لانے کو کہا۔ اسکے بعد ہم ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے، جس کے خاتمے تک نہ چائے آئی اور نہ ہی کسی نے ہمیں بسکٹ لا کر دیے۔ جب وہ اگلی بار بیوی کی ہمراہی میں مجھے ملنے کے لیے انسٹیٹیوٹ میں آئے، تو میں نے انھیں خود چائے تیار کر کے پلائی اور بسکٹ بھی پیش کیے۔ انھوں نے بتایا کہ اگر وہ سفارت خانے کے سوڈانی ملازم کو ایک دو گھنٹے پہلے سے نہ بتا دیتے تھے کہ مہمان کو چائے پلانی ہے تو چائے تیار نہ ہو پاتی تھی۔

پرتگال کا دوسرا سفر

ستمبر ۱۹۸۰ء میں ہم دوسری بار پرتگال گئے۔ اس دوران میں وہاں پر ملٹری انقلاب آنے کے سبب ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہمارے قیام کے دوران پارلیمان کے انتخابات ہو رہے تھے، جس کے سبب ملک میں خوب ہلچل تھی۔ انتخابات سے ایک روز قبل ہم نے پورٹو (Porto) میں میونسپل کونسل کے سامنے ہزاروں لوگوں کو آپس میں بحث کرتے ہوئے دیکھا۔ بالکل یہ لگتا تھا جیسے میلہ لگا ہوا ہو۔ صرف پانچ برسوں کے اندر ساتویں بار انتخابات ہو رہے تھے۔ ملک میں غربت بہت تھی، جس کے

سبب سڑکوں پر مانگنے والوں کی بھرمار تھی۔ ریستورانوں میں چھوٹے بچے ہاتھ میں پلستر کی دو چار اسٹریپ اٹھائے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور گویا ان کو خریداری کے لیے پیش کرتے تھے، مگر ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ دراصل بھیک مانگ رہے ہوتے تھے۔ چونکہ براہِ راست بھیک مانگنا منع کر دیا گیا تھا، اس لیے یہ حیلہ ایجاد کر لیا گیا تھا۔ ہمیں ایک جگہ پر ایک پچاس سالہ شخص ملا، جس نے یہ کہہ کر بھیک مانگی کہ اس کا کوئی آگا پیچھا نہیں۔ ماں نہیں، باپ نہیں۔ ہمیں اس پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی۔ اس زمانے میں ابھی تیس فیصد لوگ ان پڑھ تھے۔ یورپ بھر میں یہ ریکارڈ تھا۔ جب ہم پندرہ برس قبل آئے تھے، تو اس وقت ان پڑھوں کی شرح پچاس فیصد تھی۔ یہ ملک یورپ کے غریبوں کا گھر تھا۔

یہ اس ملک کا حال تھا، جو ایک زمانے میں دنیا کی دوسری بڑی بحری طاقت رہ چکا تھا۔ زمانۂ وسطیٰ میں اس ملک کے ملاح دنیا کے ہر سمندر میں گئے تھے۔ کہاوت تھی کہ اگر مزید سمندر موجود ہوتے تو ہم وہاں بھی پہنچ جاتے۔ جنوبی امریکہ میں برازیل جیسا ملک انکے قبضے میں آیا تھا۔ افریقہ میں گنی، موزنبیق اور انگولا، ہندوستان میں کالی کٹ اور گوا، جنوبی ایشیا میں مکاؤ، بحرِ اوقیانوس میں کناری جزیرے اور دوسری بہت سی کالونیاں۔ زمانۂ وسطیٰ میں پوپ نے دنیا کو پرتگال اور اسپین کے درمیان تقسیم کیا تھا، جس کے لیے ایک لکیر نقشے پر کھینچی گئی تھی۔ اس زمانے میں ان کا جھنڈا دنیا کے سارے سمندروں پر لہرا رہا تھا۔

ان کے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دنیا بھر میں کالونیاں تو بنا لیں مگر سائنس اور تیکنیک کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے مقابلے میں یورپ کے دوسرے ملکوں میں، جن کے پاس جرمنی کی طرح کالونیاں نہیں تھیں، سائنس اور تیکنیک نے ترقی کی۔ صرف ان ملکوں میں انڈسٹری قائم ہوئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں کے کہیں جا نکلے۔ پرتگال اس کے بالمقابل غیر ترقی یافتہ ملک بن کر رہ گیا، جس کو سالازار (Salazar) کی ڈکٹیٹرشپ نے مزید نقصان پہنچایا۔

جب ہم پہلی بار پرتگال آئے تھے، تو وہاں پر ایک لطیفہ سننے میں آیا تھا۔ اس زمانے میں دریائے الانتیجو (Alantejo) پر لزبن (Lisbon) کے مقام پر ایک پل بنایا جا رہا تھا۔ تکمیل سے قبل ٹھیکہ لینے والی عمارتی کمپنی کی طرف سے وزارتِ داخلہ کو ایک تار بھیجا گیا، جس میں پوچھا گیا تھا کہ پل کا نام کس شخص کے نام پر رکھا جائے۔ جواب آیا: اس شخص کے نام پر جس نے پرتگال کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ کمپنی کی طرف سے پھر ایک تار آیا کہ فٹ بال سٹار اوسیبیو (Osebio) کا نام سین سے لکھا جاتا ہے یا زال سے۔ لطیفہ یہ تھا کہ وزارت یہ چاہتی تھی کہ پل کا نام ملک کے ڈکٹیٹر سالازار کے نام پر رکھا جائے۔ ایسے لطیفے تب رائج ہوتے ہیں، جب عوام کے اندر اپنے حکمرانوں کے خلاف بہت زیادہ غصہ پایا جاتا ہو۔ لوگ اور تو کچھ کر نہیں سکتے ان کا مذاق اڑا کر دل کی بھڑاس تو نکال سکتے ہیں۔

اس سفر کے دوران اوتا کو وہاں کی لائبریوں کا جائزہ لینا اور اس ملک سے کتابوں کے حصول کا انتظام کرنا تھا۔دفتری دورے کے اختتام پر ہم نے دو ہفتے جنوبی پرتگال کے مقام البوفیرہ (Albofeira) میں گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔یہ جگہ الغرب (Algarb) میں سمندر کے کنارے پر پائی جاتی ہے اور اوتا کی سہیلی ماریا اورا کے آبائی گاؤں ارمساؤں دے پیرا (Armasao de Pera) کے ہمسائے میں واقع ہے۔ جب ہم پندرہ برس قبل آئے تھے تو یہ جگہ بھی ایک گاؤں تھی۔اب کے ہم نے جاکر دیکھا تو وہ اچھا بھلا ٹورسٹ رسارٹ بن چکا تھا۔ وہاں پر آرام سے دو ہفتے گزارنے سے قبل ہمیں دو ہفتوں کے لیے ملک کے شمالی حصوں کی خاک چھاننی پڑی تھی۔

اس ملک میں فوک لور کو بہت اہمیت دی جاتی ہے چنانچہ ہر روز کہیں نہ کہیں ڈانسنگ پارٹیاں ملتی تھیں، جن کو موسیقی اور گانے کے ساتھ ناچنا ہوتا تھا۔ہم نے سلوش (Silves) کے مقام پر ایک گروپ کا پروگرام دیکھا، جولبِ سڑک ہو رہا تھا۔ ہوٹلوں میں ٹروپ آتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام قریب قریب ہر روز دکھائے جاتے ہیں۔ ہر علاقے کا مخصوص لباس ہے اور ناچ کی طرز جداگانہ ہے۔فادو (Fado) گانے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عربوں کے مرثیہ کا جانشین ہے۔اس گانے میں درد اور رنج کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔گانے والیاں کالے کپڑے پہنتی ہیں۔یوں بھی آج تک الغرب کی عورتیں عام طور سے کالے کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔البتہ اس سارے علاقے کے گھروں کا رنگ ہمیشہ سفید ہوتا ہے۔عربوں کے زمانے کی ٹائلیں، جن کا بنانا لوگ بھول چکے تھے، ان کا پھر سے رواج ہو رہا ہے۔پھر ایک بار لوگ اپنے گھروں کو عربوں کے وقتوں کی ٹائلوں سے مزین کرنے لگے ہیں، مگر ان کی تاریخ ملک کے مدرسوں میں نہیں پڑھائی جاتی۔اگر ملکی تاریخی کتابیں دیکھی جائیں تو ان میں عربوں کے اقتدار کا زمانہ محض چند صفحوں میں بیان ہوتا ہے، جب کہ انھوں نے چارسو سال تک وہاں پر حکومت کی تھی۔

ماریشس کا سفر

دسمبر ۱۹۷۹ء کی بات ہے۔اس روز سرما کی پہلی برف باری ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں ہمبرگ کا ٹریفک جام ہو کر رہ گیا تھا۔لوگ کاریں چلانے میں اس حد تک احتیاط برت رہے تھے کہ ٹریفک سر کتا سرکتا جیسے منجمد ہو گیا تھا۔اس روز کی ڈاک میں ایک خط ماریشس سے آیا تھا۔احسان الٰہی ملک نے لکھا تھا کہ وہ تھوڑا عرصہ قبل اس ملک میں پاکستان کے سفیر بن کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں ہم اپنی آئندہ سال

کی تعطیلات ان کے پاس گزاریں۔ موسم سرما کی پہلی برفیلی صبح کو اس سے زیادہ سہانا پیغام بھلا کیا ہوسکتا تھا۔ میں تصورات میں کھو کر اس جگہ جا نکلا تھا، جہاں پر سورج دن رات چمکتا ہے اور جہاں پر پانی نہ صرف صاف ستھرا ہے بلکہ گرم ہے، جس میں انسان گھنٹوں تک پیرا کی کرسکتا ہے۔ دعوت کی قبولیت کی اطلاع اسی روز دے دی گئی۔

مارچ کے مہینے میں، جب کہ ہماری سفر کی تیاریاں زوروں پر تھیں، اچانک اوتا کو پتّے میں درد کی تکلیف ہوگئی۔ البتہ فوری طور پر ہمیں پتا نہ چل سکا کہ اس کا سبب پتھریاں تھیں۔ ٹسٹ ہوتے ہوتے اپریل آیا اور گزر گیا بغیر اس کے کہ تشخیص ہوسکتی۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ملک صاحب سے معذرت کریں اور آئندہ برس آنے کا وعدہ کریں۔

پروگرام کے مطابق ہم نے مئی جون ۱۹۸۱ء میں ماریشس کا سفر کیا۔ احسان الٰہی ملک اس سے قبل اس ملک کو خیر باد کہہ چکے تھے، مگر ان کی دعوت ہمارے لیے ایک ایسے ملک میں جانے کا سبب بنی، جس کے بارے میں مارک ٹوین نے کہا تھا کہ اللہ میاں نے جنت کی تخلیق سے قبل ماریشس کو بنایا ہوگا۔ اس جزیرے کی آبادی اس زمانے میں دس لاکھ تھی۔

روم کے ہوائی اڈے پر بریگیٹے اور یورگ ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ سترہ سال سے روم میں مقیم تھے اور اتنے ہی برسوں سے ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ ان کے ساتھ ہماری دوستی طالب علمی کے دنوں سے ہے۔ یورگ ڈینٹل سرجن ہے اور بریگیٹے ہسپانوی ادب کی ماہر ہے۔

ہمارا قیام روم میں آٹھ گھنٹوں کا تھا۔ انھوں نے اوستیا کے ساحلی مقام کی سیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ یورگ کی کار کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ کہاں ایک دن میں ہزاروں کمانے والا ڈینٹل سرجن اور کہاں اس کی عمر رسیدہ فولکس واگن۔ اس نے کہا: یہ کار ہاتھی کے کھانے کے دانتوں کے مترادف ہے، جب کہ دکھانے والی نئی اسپورٹس کار گیرج میں بند ہے۔ روم میں کاروں کی چوری کی وارداتیں اس قدر کثرت سے ہوتی ہیں کہ لوگ نئی کاروں کو سڑک پر پارک کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

اٹلی کی سرزمین پر قدم دھرتے ہی اوتا کے اندر چھپی ہوئی اطالوی عورت بیدار ہوجاتی ہے۔ اس کے بالمقابل بریگیٹے اتنے برسوں تک وہاں پر رہنے کے باوجود جرمن کی جرمن تھی۔ اس کی باتوں میں ٹھہراؤ اور لب و لہجے میں ایک قسم کا انجماد تھا۔ مگر لفظوں کے ساتھ کھیلنے کی عادت اس میں بدستور موجود تھی۔ اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ اس کے ماں باپ کی ایک دوسرے سے جدائی ہے۔ اسے اپنے باپ کی شکل تک یاد نہیں۔ ماں باپ کی جدائی کے وقت وہ اڑھائی برس کی تھی۔ چند برس ادھر اسے اطلاع ملی

کہ اس کا باپ اس سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ باپ بیٹی کی ملاقات چالیس برسوں کے بعد ہوئی۔ اب جب کہ باپ بوڑھا ہو چکا تھا اس کی خواہش تھی اپنی جائیداد بریگیٹے کے نام کر دے۔ باپ کا محبت دینے کا وقت، جس کے لیے بریگیٹے عمر بھر ترستی رہی تھی، اب گزر چکا تھا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن چکے تھے۔ ان کے درمیان اب کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ بریگیٹے جس باپ سے ملنے کی خواہش رکھتی تھی اس کا وجود باقی نہیں رہا تھا اور وہ ننھی بچی، جسے اس کا باپ سوتے ہوئے چھوڑ کر گیا تھا، جوانی کی سرحد کو عبور کر چکی تھی۔ باپ نے اس کا بچپن نہیں دیکھا تھا، نہ اس کی جوانی کے دن۔ وہ اس کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوا تھا، نہ ہی اسے علم تھا کہ گزشتہ چالیس برسوں کے دوران کتنے ہی مرحلے ایسے آئے جب بریگیٹے کو اپنے باپ کی بے حد ضرورت تھی۔ پانچ برس ادھر بریگیٹے کو سرطان کے مرض نے آن دبوچا تھا۔ دوبار آپریشن کے مرحلے سے گزر چکی تھی اور اپنے ذاتی مطالعے اور تحقیق کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس مرض پر صرف اس صورت میں قابو پایا جا سکتا ہے کہ مریض اپنی غذا میں بنیادی تبدیلیاں کرے۔ چنانچہ وہ اپنی ایجاد کردہ غذا کے سر پر جی رہی تھی مگر بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ مشقت کا کوئی کام تھوڑے عرصے سے زیادہ نہیں کر سکتی تھی اور اسے بار بار آرام کرنا پڑتا تھا۔ اس روز ہماری ملاقات کی خوشی میں وہ یکسر بدل چکی تھی۔ روم میں ہمارے قیام کے دوران وہ ایک منٹ کے لیے بھی ہمارے پہلو سے نہ سرکی۔

ایئر ماریشس کے جہاز میں ہمارا استقبال ایک چینی ایئر ہوسٹس نے کیا اور جس ایئر ہوسٹس نے ہماری مقررہ نشستوں تک رہنمائی کی وہ ہندوستانی تھی، جس نے پرواز سے قبل ٹافیاں تقسیم کیں اس کا ناک نقشہ افریقن تھا، اخبار اور رسالے تقسیم کرنے والی سراپا فرانسیسی تھی۔ اکثر مسافر ماریشس کے رہنے والے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ ان کے نقش و نگار ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ان میں ایک قدر مشترک، شیریں کلامی، تھی۔ ہم ماریشس کی سرزمین پر اترنے سے بارہ گھنٹے قبل وہاں کے ماحول میں سانس لے رہے تھے۔

چھ گھنٹوں کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز صبح منہ اندھیرے نیروبی میں اترا۔ ایکا ایکی خاکروبوں کا ایک گروہ جہاز کی صفائی کے لیے آن پہنچا۔ انھوں نے سب سے پہلے اخبارات و رسائل پر ہاتھ صاف کیا۔ یورپی اخباروں کو ہتھیانا تو خیر سمجھ میں آتا تھا، اور یوں بھی اکثر مسافران کو پڑھ چکے تھے، مگر یہ کیا ہوا کہ چند لمحے قبل جہاز میں لائے جانے والے نیروبی کے اخبار بھی ان کے تھیلوں میں گم ہو رہے تھے۔ اسی پر اکتفا نہ تھی، ہر چیز، جو ان کے راستے میں آتی تھی، اسے گویا فالتو قرار دیتے ہوئے وہ کوڑے کرکٹ کے ساتھ سمیٹتے چلے گئے۔ چنانچہ جوتیاں، کھلونے، چھری کانٹے، بلکہ فرش پر گرے

ہوئے کمبل تک، جو ایئر ماریشس کی ملکیت تھے، ان کی دست درازی کا شکار بن رہے تھے۔ ایسی مکمل صفائی ہم نے اس سے قبل اور کہیں پر نہیں دیکھی تھی۔

جب خدا خدا کر کے نیروبی سے جہاز نے پرواز کی اور ہم افریقہ کے برِاعظم کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے بحرِ ہند پر پرواز کر رہے تھے، تو نیچے سمندر میں بادبانی کشتیاں سفید نقطوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایسی کشتیوں میں عرب ملاح زمانۂ قدیم میں دور دور کے ملکوں اور جزیروں تک پہنچے تھے۔ چنانچہ الادریسی کے نقشۂ عالم میں، جو ۱۱۵۳ء میں بنایا گیا تھا، مدغاسکر اور افریقہ کے ساحل کے قریب واقع بعض دوسرے جزیروں کا اندراج موجود تھا۔ ماریشس کو عرب ملاحوں نے ''دینا روبین'' کا نام دیا تھا۔ عرب چونکہ صرف تجارت میں دلچسپی رکھتے تھے اور اس جزیرے پر انسان آباد نہ تھے، جن کے ساتھ تجارتی روابط قائم کیے جا سکتے، اس لیے عربوں نے اس جزیرے کو چنداں اہمیت نہ دی۔ جب پرتگالیوں کو اس بات کا علم ہوا، تو انھوں نے عرب ملاحوں کی خدمات حاصل کیں تا کہ وہاں پر پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکیں۔ انھیں اپنی نو آبادیوں کے راستے میں واقع کسی ایسے جزیرے کی تلاش تھی، جہاں پر کشتیاں مرمت کے لیے رک سکیں اور سامانِ خورونوش حاصل کیا جا سکے۔ کسی وجہ سے پرتگالیوں کو یہ جگہ پسند نہ آئی اور وہ تھوڑے عرصے کے بعد اس جزیرے کو چھوڑ کر چلے گئے۔

ولندیزی جہاز رانوں نے ۱۵۹۸ء میں اس جزیرے پر قدم رکھا اور اس کا نام اپنے بادشاہ کے نام پر ماریشس رکھا۔ ان کا ارادہ اس جزیرے سے تجارتی طور پر فائدہ اٹھانا تھا۔ چنانچہ وہاں پر پائی جانے والی آبنوس کی لکڑی کو یورپ میں لے جا کر فروخت کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا۔ لکڑی کاٹنے کے لیے زر خرید غلام مدغاسکر سے لائے گئے۔ ستر برس کے اندر اندر اس جزیرے پر پائے جانے والے جنگل کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس دوران میں ولندیزی گنے کا پودا لا کر یہاں پر اگانے کے تجربے کرتے رہے تھے۔ ایک صدی بعد گنے کو اس جزیرے کی اہم ترین فصل بننا تھا، مگر ولندیزی ۱۷۱۰ء میں ماریشس کو خیر باد کہہ گئے، کیونکہ ان کی نظر میں جزیرے کی تجارتی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔

تین گھنٹوں کی پرواز کے بعد ہمارا طیارہ ماریشس کے اوپر چکر کاٹ رہا تھا، جس کی لمبائی ۶۵ کلو میٹر اور چوڑائی ۴۸ کلو میٹر ہے۔ جس طرف بھی نظر جاتی تھی ہریاول ہی ہریاول دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارا طیارہ جنوب مشرقی کونے میں واقع فرودگاہ ماہے بور **(Mahébourg)** میں اترا۔ آنے والے مسافروں کے لیے جو ہال مختص کیا گیا تھا اس پر ہال کا نام غالباً بطور تہمت استعمال ہوتا تھا۔ ایک پورے جہاز کے مسافروں کے لیے وہاں پر جگہ ناکافی تھی۔ مسافروں کا سامان خاصی پھرتی سے لایا گیا مگر ہمارے سوٹ کیسوں کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ او تا کو کراچی یاد آ رہا تھا جہاں پر ہمیں سامان کے حصول میں

بہت دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میرا سوٹ کیس تو خیر تگ ودو کے بعد مل گیا تھا مگر اوتا کا نہ مل سکا تھا۔ اس وقت سے میرے سوٹ کیس میں نصف جگہ اوتا کے کپڑوں کے لیے ریزرو رہتی ہے اور اس کے سوٹ کیس میں میرا نصف سامان جگہ پاتا ہے۔ جب ایئر ماریشس کے عملے نے اعلان کر دیا کہ اب جہاز میں کسی کا سامان باقی نہیں رہا، تو ہمارے علاوہ پندرہ بیس دوسرے مسافر بھی حیران پریشان کھڑے تھے۔ ہم نے گم شدہ سامان کے کلیم آفس میں فارم پُر کرنے شروع کر دیے تھے، جب ایکا ایکی مزید سامان کی آمد کا اعلان ہوا۔ عین اسی طریق پر کراچی میں ہمیں اوتا کا سوٹ کیس ملا تھا۔ سامان تو آ گیا مگر اوتا کی ماریشس میں پہنچنے کی آدھی خوشی کا انتقال ہو چکا تھا۔

کسٹم والوں نے شرافت کا ثبوت دیا اور ہمیں سامان کھولنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ پاسپورٹ کی پڑتال کرنے والے عملے کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان جیسی شکل و شباہت والا شخص جرمن پاسپورٹ اٹھائے پھرتا تھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ پاسپورٹ میرا اپنا بنایا ہوا نہ تھا بلکہ سچ مچ جرمن حکومت کا جاری کردہ تھا، تو انھوں نے اس مضمون کی مہر ثبت کر دی کہ مجھے ماریشس میں ملازمت کرنے اور کاروبار کھولنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ چونکہ اوتا کے پاسپورٹ پر ایسی مہر نہیں لگائی گئی تھی، اس وجہ سے اس نے متعلقہ افسر سے اس امتیازی سلوک کی وضاحت چاہی۔ وہ بے چارہ آئیں بائیں شائیں کرنے کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا۔

پورٹ لوئی (Port Louis) جانے والی بس کے ڈرائیور نے رفیع کے گانوں کی ٹیپ انتہائی اونچی آواز میں لگا رکھی تھی۔ رستے میں پڑنے والے ریستورانوں سے اردو اور ہندی فلموں کے گانوں کے بول سنائی دیتے تھے۔ اوتا کا کہنا تھا کہ وہ دوسری بار پاکستان میں پہنچ گئی تھی۔ اس وجہ سے میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ اردو میں مانگے۔ اس نے میرے سوالات کا جواب تسلی بخش اردو میں دیا۔ اوتا نے کہا کہ اب کسر بس یہ رہ گئی ہے کہ ہمیں پان کھاتے ہوئے اور پیک تھوکتے ہوئے پورپیے ملیں اور تم ہوٹل میں اچار اور چھاچھ کا آرڈر دو۔ مگر ہمارے ہوٹل میں، جو شہر کے عین درمیان میں واقع تھا، ہندوستانی کھانا نہیں ملتا تھا۔ ہمیں یوں بھی اگلے روز جزیرے کے شمالی ساحل پر کسی اچھے سے ہوٹل میں چلے جانا تھا۔

اگلی صبح ٹورسٹ آفس کی ایک نمکین حسینہ نے ہمیں ہوٹلوں کی فہرست دکھائی، تو اس میں ایک جرمن فیملی ہوٹل کپ ماہلرو میں نکل آیا، جہاں پر ہم ٹھہرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ پہلے خود جا کر ہوٹل کو دیکھ لیں۔ کپ ماہلرو ہماری توقع کے مطابق ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بس کا سٹاپ ایک چرچ سے ملحقہ میدان میں تھا۔ چرچ میں سروس ہو رہی تھی، جس میں حصہ لینے کے لیے گاؤں کی پوری عیسائی آبادی جمع تھی۔ چونکہ چرچ میں سب کے لیے جگہ نہ تھی اس لیے باہر بھی کرسیاں

بچھائی گئی تھیں۔ چرچ کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور ہمیں پادری سامنے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ حمدیہ گانے کی آواز اتنی دلکش تھی کہ ہم دیر تک وہاں کھڑے اس سے محظوظ ہوتے رہے۔ افریقیوں کے گلے میں قدرت نے ایسا سرود بھر دیا ہے کہ انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عجیب نظارہ تھا۔ صبح کا سماں، نیلا آسمان، سمندر کے کنارے بنا ہوا سفید چوبی چرچ۔ سورج کی شعاعیں تیز مگر ایسی بھی نہیں کہ چبھتی ہوں۔ سمندر کا پانی ایک تختے کی طرح ہموار تھا، جس پر ہوا کے ہولے ہولے جھونکے چھوٹی چھوٹی لہریں پیدا کر رہے تھے۔ او تا مارک ٹوین کی جنت میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم اسی گاؤں میں ٹھہریں گے۔

جرمن کلب میں ایک بنگلہ خالی تھا اور ہمیں مل سکتا تھا۔ رہائش تین کمروں کی تھی، جس کے علاوہ باورچی خانہ اور حمام تھے۔ فرنیچر بہت عمدہ تھا۔ ہر چیز صاف ستھری اور اعلیٰ درجے کے ذوق کا نمونہ۔ دیواروں پر ایک سے ایک بڑھیا تصویریں۔ بنگلے کے سامنے ایک بڑا باغ اور اس کے خاتمے پر سمندر تھا۔ انسان برآمدے میں بیٹھ کر دور دور تک سمندر کا نظارہ کر سکتا تھا۔

کلب کے مالک ایک جرمن میاں بیوی تھے، جنھوں نے بیس برس قبل وہاں پر رہائش اختیار کی تھی۔ مکان انھوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور ٹورسٹوں کو کرائے پر دینے لگے تھے۔ جوں جوں ٹورسٹوں کی تعداد بڑھتی گئی توں توں ان کے لیے بنائے جانے والے بنگلوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کپ ماہلرو چونکہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں پر کوئی ریستوراں نہیں پایا جاتا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے بنگلوں میں آ کر ٹھہرنے والوں کے لیے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ انسان ہر لحاظ سے خود کفیل ہو کر رہ سکتا تھا۔ ہر بنگلے کے لیے ایک باورچن کا انتظام موجود تھا، جو مکان کی صفائی ستھرائی بھی کرتی تھی اور کپڑے بھی دھوتی اور استری کرتی تھی۔ کھانے پینے کا سامان گاؤں کی واحد کریانے کی دکان کا چینی مالک ٹیلی فون پر اطلاع ملتے ہی پہنچا دیتا تھا۔ اس کے پاس بنیادی ضرورت کی اشیاء کی ایک فہرست رکھی ہوئی تھی جس کے مطابق چالیس پچاس مختلف قسم کی چیزوں کی ایک ٹوکری پہنچا دی جاتی تھی۔ جو چیز آپ استعمال کرنا چاہیں وہ رکھ لیں باقی کی چیزیں وہ دوسرے روز آ کر واپس لے جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپ کی ضرورت کی چیزوں کی فہرست لے جائے گا اور شام تک تمام چیزیں پہنچا دے گا۔ ہفتے میں دو بار گوشت ملتا تھا اور ایک بار سبزی والا اپنی گاڑی میں آتا تھا، جس میں ہر قسم کی سبزیاں اور پھل رکھے ہوتے تھے۔ آپ چاہیں تو ساتھ کے ساتھ قیمت ادا کرتے جائیں اور اگر اس کی بجائے آپ پسند کریں تو ہوٹل اشیاء کی قیمت آپ کے بل میں شامل کر دے گا۔ انسان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہوٹل میں رہ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے گھر میں ہر قسم کی آسائش کے ساتھ مزے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

کلب کی انتظامیہ نے ہمیں مشورہ دیا کہ سامان لانے کے لیے پورٹ لوئی ٹیکسی میں جائیں

کیونکہ اس ملک میں ٹیکسی میں سفر کرنے والوں کو آنے اور جانے کا کرایہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ پلک جھپکتے میں ملازم گاؤں سے ٹیکسی لے آیا۔ ڈرائیور کا نام صوفی اسلام تھا اور وہ گاؤں کی مسجد کا متولی تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ تھی۔ کالی داڑھی اس کے چہرے پر خوب سج رہی تھی۔ سر پر اس نے جناح کیپ پہن رکھی تھی۔ اسے یہ جان کر بہت ''کھوشی'' ہوئی کہ میں مسلمان تھا اور پاکستان سے تعلق رکھتا تھا۔ بس پھر کیا تھا، اس نے ہمیں راستے کی ساری مساجد دکھانے کا پروگرام بنالیا۔ اس کی ابتداء اپنی مسجد سے کی، جس کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی زمانے میں محض ایک کمرہ رہی ہوگی، جسے آہستہ آہستہ مسجد کی شکل دے دی گئی تھی۔ پہلے وقتوں میں مسلمانوں کو مساجد تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی، تاہم مسلمان تاجروں کا چونکہ ملک میں اثر و رسوخ تھا، اس وجہ سے ہر آبادی میں مسلمانوں نے جماعت خانے بنا رکھے تھے، جہاں پر اجتماعی عبادات چھپ چھپا کر ادا کی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کو لمبے عرصے تک مندر تعمیر کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ لوگ مسلمانوں کے تہوار ان کے ساتھ مل کر منایا کرتے تھے۔ چنانچہ آج تک محرّم کا تعزیہ نکالا جاتا ہے، جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل ہوتے ہیں۔ ماتم کی بجائے گتکہ بازی ہوتی ہے۔ پہلوان ڈنٹر پیلتے ہیں اور نوراکشتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

صوفی اسلام کا علم ماریشس میں مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں بہت سطحی نکلا۔ مجھے وہ قید خانہ دیکھنے کا شوق تھا، جہاں پر انگریز ہندوستان سے سیاسی قیدیوں کو لا کر رکھا کرتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے مصاحبوں اور فوجی افسروں کو بھی وہاں پر لے جایا گیا تھا۔ میں نے پڑھ رکھا تھا کہ وہ جگہ پورٹ لوئی سے جنوب کی طرف تھوڑے فاصلے پر واقع تھی۔ لکھا تھا قید خانے کا ایک حفاظتی مینار اور فصیل کا کچھ حصہ کھڑا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں پر ایک مسجد بھی پائی جاتی ہے، جس میں قیدی نماز پڑھا کرتے تھے۔ مسجد کا ذکر سن کر صوفی اسلام کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کہا: مسجد سے میں واقف ہوں، مگر یہ ٹیپو سلطان کون تھا اور انگریز کن لوگوں کو ہندوستان سے قیدی بنا کر لائے تھے، اس بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ ڈارون نے، جو ماریشس بھی آیا تھا، ان مہذب قیدیوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوتی تھیں اور وہ اسی حالت میں سڑکیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ ہندوستان سے ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۷ء کے درمیان ۸۳۵ قیدی لائے گئے تھے۔ ان میں چھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ صوفی اسلام کی بیوک کار فراٹے بھرتی ہوئی ہمیں وہاں لے گئی۔ ریل گاڑی کے پل کے قریب ایک مینار کھڑا ہے۔ ہم عمارت کے اندر تو نہ جا سکتے تھے مگر ہم نے باہر سے وہ جگہ دیکھی جہاں پر نوآبادیاتی طاقت کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے حریت پسندوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ قید و بند میں گزارا تھا۔ ان میں سے بعض اپنی سزاؤں کی میعاد کے خاتمے پر ہندوستان واپس چلے گئے تھے، مگر اکثر لوگوں کی قبریں ماریشس کی

سرزمین میں بنی تھیں۔ ان کے ناموں کو کوئی نہیں جانتا اگر چہ ان کا تمام ریکارڈ ماریشس کے گاندھی انسٹیٹیوٹ اور انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔

ہمارے جرمن کلب میں واپس لوٹنے تک باورچن آ چکی تھی، جو ایک نوجوان افریقن عورت تھی، مگر جس کے نقش ونگار بتا رہے تھے کہ اس کی رگوں میں ہندوستانی اور یورپین خون دوڑ رہا تھا۔ کھانا پکانے کی وہ ماہر تھی۔ اس نے ایسا مزیدار کھانا تیار کیا تھا کہ ہم انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ ہماری غیر حاضری میں گاؤں کا چینی دکاندار ہر قسم کی اشیاء کی ٹوکری چھوڑ گیا تھا۔ کلب کے دوسرے باسی سمندر کے کنارے جمع تھے۔ کچھ دھوپ سینک رہے تھے، دوسرے پنگ پانگ کھیل رہے تھے یا پڑھنے میں مصروف تھے۔ کلب میں جرمن کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری موجود تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک کے بعد ہم نے گاؤں کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔

گاؤں میں آبادی کی اکثریت ہندوستانیوں کی تھی، جو غربت کی زندگی بسر کرتے تھے، تاہم ہر خاندان کے پاس اپنا اپنا مکان موجود تھا۔ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا تھی۔ مسلمانوں کی اوسط ماریشس کی کل آبادی میں سترہ فیصد تھی۔ یورپی نسل کے باشندوں کی تعداد دس ہزار تھی، مگر ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ بدستور ان کے ہاتھوں میں تھا۔ اس گاؤں میں سیاہ فام بھی رہتے تھے، جن کو ہم نے صبح کے وقت چرچ سروس میں دیکھا تھا۔ یہ ان غلاموں کی اولاد ہیں، جن کو مدغاسگر سے لایا گیا تھا۔ مگر یہ لوگ زراعت کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کی جگہ پر ہندوستانیوں کو لایا گیا، جن کی اکثریت کا تعلق بہار سے تھا اور جن کی مادری زبان بھوج پوری تھی۔ چینیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی، جن میں سے تین چوتھائی پورٹ لوئی میں مقیم تھی۔ ملک بھر میں کریانے کی دکانیں ان کے ہاتھ میں تھیں۔

میں سفر میں ہمیشہ ایک ٹرانسسٹر ریڈیو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ پورٹ لوئی کا اسٹیشن لگایا تو اردو میں خبریں نشر ہو رہی تھیں، جن کے اختتام پر اردو مشاعرے کا اعلان ہوا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے فوراً اس میں شرکت کرنے کی ٹھان لی۔ مشاعرہ کہاں پر ہو رہا تھا اور کون کروا رہا تھا، اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ میں نے پاکستان کے سفارت خانے سے فون پر رابطہ قایم کیا۔ انھیں کسی مشاعرے کی خبر نہیں تھی، البتہ مجھے مشورہ دیا گیا کہ عنایت حسین عیدن سے بات کروں، جو نیشنل اردو انسٹیٹیوٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ گھر پر نہ ملے۔ ان کی اہلیہ نے مشاعرے کی تصدیق کی مگر یہ بتا کر میری خوشیوں پر پانی پھیر دیا کہ مشاعرہ ختم ہو چکا تھا، البتہ عیدن صاحب ابھی وہاں سے نہیں لوٹے تھے۔ انھوں نے میرا نام اور پتا نوٹ کر لیا۔

اب جب کہ دھوپ کی شدت کم ہو چکی تھی ہم نے سمندر میں پیراکی کا پروگرام بنایا۔ کلب کے

باسیوں کی چمڑیاں سارا دن دھوپ میں پڑے رہنے کے سبب بھبھوکے کی طرح لال سرخ تھیں۔ سمندر میں کچھ دیر تک پیرا کی کے بعد ہم ان کے پاس جا کر بیٹھے، تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انھیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں، کیوں ہیں؟ جرمنوں کی عادت ہے وہ سوالات براہِ راست نہیں کرتے اور نہ ہی کسی ایسے سوال کا سیدھا سا جواب دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔ سو یہ سلسلہ ہمارے ساتھ بھی شروع ہو گیا، جو چار ہفتوں کے قیام کے آخری دن تک جاری رہا۔ باتوں باتوں میں اتنا ضرور پتا چل گیا کہ ہمارے سوا سبھی لفت ہانزا کے ملازم تھے، جن کو سال کے سال دنیا کے کسی بھی ملک کا سفر کمپنی کے خرچ پر کرنے کی رعایت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایسی ایسی جگہوں پر جا چکے تھے جن کے ہم نے محض نام ہی سن رکھے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھیں ہوائی سفر مفت میں ملتا تھا بلکہ اکثر جگہوں پر انھیں ہوٹل کے کرائے میں بھی رعایت ملتی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا: اپنے خرچ پر وہ کبھی ایسے سفر پر جانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ دوسرے نے کہا: اس کا دماغ خراب نہیں ہے کہ وہ اپنی جیب سے اتنے پیسے برباد کرتا پھرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگ یا تو سر پھرے تھے، جو اپنی جیب سے خرچ کر کے اتنے مہنگے سفر پر نکلے تھے یا اتنے امیر تھے کہ ہمیں پیسوں کی پروا نہ تھی۔ چونکہ ہمارا حلیہ پاگلوں والا نہ تھا اس وجہ سے ہم یقیناً امیر ہوں گے۔ مگر کیسے اور کیوں؟ یہ بات ان کے لیے ایک معما تھی، جسے حل کرنے پر وہ لوگ تلے ہوئے تھے اور ہم تھے کہ ان کی ذرہ بھر مدد نہیں کر رہے تھے۔

ہم اس معما بازی میں مشغول تھے جب کلب کے ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ عیدن صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے پیچھے مختصر سی قامت اور پکے رنگ کا ایک نوجوان کھڑا تھا، جس کے سر کے بال چینیوں کی طرح کھڑے تھے۔ عنایت حسین عیدن کو گھر آنے پر اطلاع ملی تھی کہ اردو زبان کا کوئی شیدائی جرمن کلب میں آن کر ٹھہرا تھا اور ان سے ملنے کا خواہشمند تھا۔ ان کا قصبہ ٹریولے (Triolet) کلب سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ خاصی نستعلیق اردو بول رہے تھے۔ پتا چلا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ شمیم حنفی ان کے ہم درس رہ چکے تھے۔ نیشنل اردو انسٹیٹیوٹ کا قیام ان کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ اس کام کے لیے انھیں حکومت کی طرف سے دو سال کی تعطیل دی گئی تھی۔ اس دوران میں انسٹیٹیوٹ کو چلانے کی ذمہ داری مسلمان تاجروں کی ایک جماعت نے اٹھا لی تھی، جس کے صدر احمد عبداللہ تھے۔ عیدن صاحب ٹیچرز ٹریننگ کالج میں اردو کے استاد تھے اور اعزازی طور پر انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھی۔ انھوں نے مجھے اتوار کے روز انسٹیٹیوٹ میں آنے کی دعوت دی تاکہ اپنی آنکھوں سے اردو کی کلاسیں دیکھوں، جن میں نوجوان لڑکے لڑکیاں بڑی تعداد میں حصہ لیتے تھے۔

اردو نیشنل انسٹیٹیوٹ ایک اکہری سی عمارت میں اوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے دکانیں تھیں۔ اوپر دو یا تین کمرے انسٹیٹیوٹ کے پاس تھے، جو بیک وقت دارالمطالعہ اور کلاس روم کے کام آتے تھے۔ ایک کمرے میں پندرہ بیس بچوں کی کلاس لگی ہوئی تھی، جس میں لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے۔ دوسرے کمرے میں انسٹیٹیوٹ کے استاد میرے استقبال کے لیے جمع تھے۔ ان میں سے اکثر نے اردو ٹیچرز ٹریننگ کالج میں سیکھی تھی۔ ان سب کے دادا پردادا اپنے وقتوں میں قلی بن کر ماریشس آئے تھے اور عام طور سے کورے ان پڑھ تھے۔ ان کی مادری زبان بھوج پوری تھی، جو آج بھی اس جزیرے میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ جب انگریزی فوجوں میں کام کرنے والے کچھ ہندوستانی کلرک ماریشس پہنچے تو ان میں کچھ لوگ جماعتِ احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کی تحریک پر قادیان سے مبلغ بھجوائے گئے جو اردو زبان میں تقریریں کرتے اور خطبے دیتے تھے۔ اس طرح عوام کے اندر اردو سیکھنے کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ آگے چل کر مولانا علیم الدین صدیقی سال کے سال وہاں کا دورہ کرنے لگے۔ اس روایت کو ان کے بعد ان کے بیٹے مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے اپنی وفات تک جاری رکھا۔

ماریشس میں اردو صرف مسلمان سیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اردو زبان کو سرکاری اسکولوں میں رائج کرنے میں مشکلات پیش آئیں۔ ہندوستان کی حکومت نے مسلمان طالب علموں کو اپنے ملک میں آ کر پڑھنے کی دعوت دی اور ان کے لیے وظیفے جاری کیے۔ چنانچہ عیدن صاحب کی طرح کئی دوسرے طالب علم علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو کی ڈگریاں حاصل کر کے لوٹ چکے تھے۔ ان کو ٹیچرز ٹریننگ کالج میں لگایا گیا تھا، جہاں پر پرائمری مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ تیار کیے جاتے تھے۔ ان مدارس میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر اطہر پرویز کو خاص طور پر ماریشس بھیجا گیا تھا، جہاں پر انھوں نے سات سالہ قیام کے دوران نصاب کی کتابیں تصنیف کیں۔ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک ادبی رسالہ ''جستجو'' شائع کیا جاتا تھا، جس میں چھپنے والا مواد عام طور سے مقامی لوگوں کا لکھا ہوا ہوتا تھا۔ چونکہ کاتب وہاں پر موجود نہ تھے، اس لیے کتابت کا کام ادارۂ تحریر سے متعلق لوگ خود کرتے تھے۔

عیدن صاحب دوسرے روز مجھے انسٹیٹیوٹ کے سرپرست احمد عبداللہ صاحب سے ملانے کے لیے لے گئے، جنکا شمار ماریشس کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ وہ خود مدراس میں پیدا ہوئے تھے اور اردو اچھی خاصی بول سکتے تھے۔ انکی شادی ماریشس کی ایک گجراتی تاجر فیملی میں ہوئی تھی، جنکے ہاں اردو بولی جاتی تھی۔ انکے ساتھ میرا رابطہ لمبے عرصے تک قائم رہا۔ وہ مجھے ملنے کے لیے ہمبرگ بھی تشریف لاتے رہے۔ میں نے انسٹیٹیوٹ کے لیے ایک پرنٹنگ مشین مہیا کی تھی، جس کو ان کی تجارتی کمپنی نے

ماریشس پہنچانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اس مشین پر رسالہ ''جستجو'' کافی عرصے تک چھپتا رہا۔ کتابت ان کو خود کرنی پڑتی تھی۔ پھر کمپیوٹر کا زمانہ آگیا اور کتابت کی مشکلات کا خاتمہ ہوا۔

چار ہفتوں کے بعد جب ہمارے واپس لوٹنے کا دن آیا، تو عین اس روز احمد عبداللہ صاحب نے اپنے گھر پر وزیرِ اعظم ماریشس کو دعوتِ طعام دے رکھی تھی۔ انھوں نے ہمیں بھی اس موقع پر مدعو کر رکھا تھا مگر ہم نہیں رک سکتے تھے، کیونکہ مجھے واپسی سے اگلے روز ایک کانفرنس میں شرکت کرنی تھی، جس میں پہلی تقریر میری تھی۔ ایئرپورٹ پر پہنچ کر پتا چلا کہ ہمیں اس روز جہاز میں سیٹیں نہیں مل سکتیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لیبیا کا ایک ثقافتی ٹروپ اسی جہاز میں واپس جا رہا تھا اس لیے ہم جیسے غیر اہم لوگوں کی ریزرویشن کینسل کر دی گئی تھی۔ دوسری طرف بعض ایسے لوگوں کو سیٹیں دی جا رہی تھی، جن کی ریزرویشن سرے سے تھی ہی نہیں۔ ایک قلی نے کہا: صاحب! مجھ سے بات کریں تو میں آپ کو سیٹیں دلوا سکتا ہوں۔ گویا سیٹوں کے لیے رشوت مانگی جا رہی تھی، جس کے لیے ہم تیار نہیں تھے۔ یورپ میں مجھے کبھی اس چیز کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر ماریشس میں ہندوستان کی دوسری بیماریوں کے ساتھ ساتھ یہ روگ بھی پایا جاتا ہے۔ جب مجھے اس بات کا پتا چل گیا تو میں نے سیٹیں دینے والے شخص سے کہا کہ اگر ہمیں ہماری ریزرو شدہ سیٹیں نہ دی گئیں تو میں اس بات کی رپورٹ حکومت کے پاس کر دوں گا، کیونکہ یہاں پر کھلم کھلا رشوت مانگی جا رہی ہے۔ یہ سن کر وہ گھبرا گیا اور اس نے جلدی سے ہمیں سیٹیں دے دیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ جب جہاز وہاں سے روانہ ہوا تو اس میں کم و بیش تیس سیٹیں خالی پڑی تھیں۔

چھٹا باب

ترکی کا سفر

ہم نے یہ سفر مئی جون ۱۹۸۲ء میں کیا۔ یہ وقت اس لحاظ سے بہت موزوں تھا کہ ابھی ٹورسٹ سیزن شروع نہیں ہوا تھا اور گرمی کی شدت کا وقت بھی نہیں آیا تھا۔ ہم چونکہ اپنے طور پر سفر کر رہے تھے، اس لیے ہمیں ہر جگہ پر رہائش کا انتظام خود کرنا ہوتا تھا۔ پہلی ہی رات مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم ازمیر (Izmir) میں تھے اور امید رکھتے تھے کہ کسی اچھے ہوٹل میں کمرہ مل جائے گا، مگر وہاں پر خالی کمروں کا کال پڑا ہوا تھا۔ آخرِ کار قسمت ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست ہو گیا مگر آدھی رات کے وقت ساتھ کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ہمارا رات کا سکون جاتا رہا کیونکہ ہمارے ہمسائے نے فون پر جھگڑنا شروع کر دیا، جو اتنی اونچی آواز میں تھا کہ اسے فون کی منت اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی آواز یقیناً اس کے بغیر بھی استنبول میں سنی جا سکتی تھی۔ جب فون پر کلام ختم ہوا تو چند منٹوں کی کھسر پھسر کے بعد ایک عورت نے بلند ترین آواز میں شور مچانا شروع کر دیا۔ دوسری عورت اس کو روکنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ دو چار طمانچے بھی سنائی دیے۔ ایسے میں ہم کیونکر سو سکتے تھے۔ صبح ناشتے کے کمرے میں اوتا نے اس عورت کو، اس کی آواز سے، پہچان لیا جو رات کو شور مچاتی رہی تھی۔ وہ چار عورتوں کے ایک گروپ میں تھی، مگر اس دن کے بعد ہمیں صرف تین عورتیں دکھائی دیتی رہیں۔ شاید چوتھی کو واپس لوٹنا پڑ گیا تھا۔

ہم نے ازمیر کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ ہمیں جرمن ناول نگار دوست یواخیم زائپل نے مشورہ دیا تھا کہ وہاں سے چلنے والے کسی بحری جہاز کا ٹکٹ خرید کر ترکی کے تمام ساحلی مقامات کی سیر کریں۔ یہ جہاز باری باری ان مقامات پر جا کر رکتے ہیں اور ایک آدھ روز تک وہاں پر ٹھہرتے ہیں، جس کے دوران انسان قریبی تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے جہازوں کے چلنے کا ابھی سیزن نہیں تھا، جو ۲۴ جون سے شروع ہوتا ہے۔ ہم ایک ماہ پیشتر آ گئے تھے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ ہم باری باری مختلف تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے جائیں اور رات کو ازمیر واپس لوٹ آیا کریں۔

ہمارا پہلا دورہ پرگامون (Pergamon) کا تھا، جو ازمیر سے ۱۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس شہر کے کھنڈرات یونانی تہذیب کے بہترین آثار میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ اس کا مقابلہ تجارتی طور پر ایفیسوس (Ephesus) کے ساتھ اور ثقافت اور فنون میں مصر کے شہر اسکندریہ کے ساتھ تھا۔ کاغذ کی ایجاد سے قبل پرگامنٹ لکھنے کے کام آتا تھا، جو اس شہر میں سب سے پہلے استعمال میں آیا تھا، جس کا ثبوت اس کے نام کی صورت میں موجود ہے۔ اس شہر میں مشہور یونانی طبیب جالینوس رہتا تھا، جس کی کتابیں آگے چل کر عربی میں ترجمہ ہوئیں اور یورپ تک پہنچیں۔ میرے بڑے بھائی نصیر الدین احمد کو جب ایک حکیم کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا، تو اس کو سب سے پہلے جالینوس کی کتاب پڑھنے کے لیے دی گئی تھی۔ اس شہر کے کتب خانے کی دو لاکھ کتابیں مارک انطونیوس (Mark Antonius) نے کلوپٹرا کو شادی کے تحفے میں دی تھیں، جن کو اسکندریہ کے کتب خانے میں رکھا گیا تھا۔ یہاں کے دو مندروں کی عبادت گاہیں برلن کے میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ تھیٹر کو مکمل طور پر از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔

دوسرا دورہ ایفیسوس (Ephesus) کا تھا۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں بہت بڑا شہر تھا اور اس کی آبادی دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں پر مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی بندرگاہ پائی جاتی تھی، مگر سمندر کے پیچھے ہٹ جانے کے سبب اس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی تھی۔ یہاں پر پائی جانے والی عبادت گاہ آرٹمس مندر کو زمانۂ عتیق میں دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا، البتہ اب اس کی صرف بنیادیں دکھائی دیتی ہیں۔ عیسائیت میں اس شہر کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہوئی کہ حضرت مریمؑ نے اپنی زندگی کے آخری برس وہاں پر گزارے تھے۔ کیتھولک چرچ نے اس شہر کو حج کا مقام قرار دے رکھا ہے، جس کے سبب ۱۵ اگست کو ساری دنیا سے عیسائی وہاں پر عبادت کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پاؤل اور یوحنا نے بھی وہاں پر رہائش اختیار کی تھی۔ اس شہر کے تھیٹر میں پچیس ہزار تماشائی جگہ پاتے تھے۔ آج بھی وہاں پر موسیقی اور تھیٹر کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

اس سے اگلے روز ہم چشمے (Casme) نامی ساحلی مقام کی سیر کو گئے، جہاں پر گینوا کی ریاست کا پندرھویں صدی میں بنایا ہوا قلعہ کھڑا ہے۔ وہ جگہ ہمیں پسند آئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ ازمیر کے مقابلے میں وہاں پر سکون بہت تھا۔ سمندر کے ساحل پر سیر کے دوران ہم نے وہاں پر منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ شہر کی سب سے اونچی عمارت میں جا کر پوچھا کہ کیا ہمیں ان کے ہاں کمرہ مل سکتا ہے۔ وہاں پر سچ مچ مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام موجود تھا۔ چنانچہ ہم ازمیر جا کر اپنا سامان اٹھا لائے۔ پانچویں روز اس مکان میں نوجوان ترک آ گئے، جنکے سبب باتھ روم میں صفائی نہ رہی اور یوں بھی ان کی وجہ سے مکان کا

سکون جاتا رہا تھا، اس لیے ہم نے وہاں سے کوچ کر جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ اب ہماری منزل انطالیا (Antalia) کا ایک قریبی ساحلی مقام سیدے (Side) تھا۔ ہم راستے میں پامکلے (Pamukkale) میں رکنا چاہتے تھے، جہاں پر ترکی کا مشہورِ عالم گرم چشمہ پایا جاتا ہے۔ پانی میں سے نکلنے والا کالسیم کاربونیٹ ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے جم جاتا ہے، جسکے نتیجے میں منبع کا دہانہ ایک پہاڑی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ چشمے کے دہانے پر ہوٹل، ریستوران اور تحائف کی دکانیں ہیں۔ ہوٹل کے عین وسط میں بڑا تالاب ہے اور ہر کمرے کے سامنے سے باہر کی طرف بالکنی کی بجائے علیحدہ تالاب بنے ہوئے ہیں، جن میں سے گزر کر پانی وادی کی طرف بہتا ہے۔ ہم آدھی رات تک قدرت کے اس نادر تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گرم پانی میں نہاتے رہے۔ یہاں پر رومن زمانے کی عمارتوں کے آثار بھی موجود ہیں، جن میں صرف حمام ہی شامل نہیں بلکہ ایک تھیٹر بھی پایا جاتا ہے۔ البتہ اب یہ عمارتیں چشمے کے پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان پر سفید رنگ کا ملمع ہو چکا ہے اور وہ روئی میں لپٹی ہوئی لگتی ہیں۔

پامکلے میں ایک رات گزارنے کے بعد ہم انطالیہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب بس ایک چھوٹے سے قصبے کے اسٹینڈ پر رکی تو دو سواریاں چڑھیں۔ ان میں سے ایک عام سا دیہاتی تھا جب کہ دوسرا دوپہر کی گرمی میں کالا گرم سوٹ پہنے ہوا تھا۔ اسے ہم سے اگلی سیٹ پر جگہ ملی۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس کے کان ہماری طرف لگے ہوئے تھے اور وہ ہماری باتیں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو جماہی لیتے ہوئے دیکھا تو للکار کر پوچھا کہ وہ کب سے بس چلا رہا تھا۔ پھر اس نے ہمیں مخاطب کر کے بہترین جرمن میں بتایا کہ ترکی میں بیشمار حادثات ڈرائیوروں کی تھکاوٹ کے سبب ہوتے ہیں کیونکہ ان کو آرام کرنے کا وقت نہیں دیا جاتا۔ وہ ایک عزیز دوست کی تدفین میں حصہ لے کر لوٹ رہا تھا، جو ایک بس کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ وہ خاصا دلچسپ آدمی تھا اور ہمیں اس کی باتوں میں مزا آنے لگا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں اس قصبے کی ایک نہایت اہم چیز دکھائے گا۔ آبادی کے خاتمے پر اس نے ایک فارم کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ اسلامی ملک ترکی کا مشہور ترین فارم ہے، جہاں پر خنزیر پالے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ ہاتھ کو سلیوٹ کرنے کے انداز میں اپنے ماتھے تک اٹھا کر لے گیا، پھر اسے دل پر رکھ کر السلام علیکم کہا۔ آگے چل کر پتا چلا کہ یہ اس کا خاص مزاح تھا۔ وہ ہمیں اپنے ملک میں پائے جانے والے تضادات دکھا کر کھٹ سے سلیوٹ کرتا اور السلام علیکم کہتا تھا۔ اس کی منزل ہماری طرح انطالیہ تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ سرجن تھا۔ اس نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی اور بیس برسوں تک وہاں پر اور سوئٹزرلینڈ میں پریکٹس کرتا رہا تھا۔ وہ پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا اور دو برس قبل ترکی واپس لوٹا تھا جہاں پر، بقول اس کے، کسی کو ایسے فضول آپریشنوں میں دلچسپی نہیں تھی، جس کے سبب اس کی پریکٹس مندی جا رہی تھی۔

انطالیہ (Antalya) ایک بندرگاہ ہے اور تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، مگر ٹورسٹوں کے لیے، جو سمندر میں نہانے کے لیے آتے ہیں، کم دلکش ہے۔ ہمیں وہاں پر بس دو روز تک قیام کرنا تھا اور وہ بھی ڈاکٹر فکری تکلین کی وجہ سے، جس کی ایک سوئیس دوست لڑکی روزے ماری اسی شام آ رہی تھی۔ ہمارا ارادہ اگلے روز ایک ٹور پر جانے کا تھا، جس کا انتظام ایک لوکل ٹریولنگ ایجنسی کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ ٹور کے پروگرام میں علاوہ دوسرے مقامات کے سیدے بھی شامل تھا، جہاں پر ہم جا کر دو ہفتوں تک قیام کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم اپنا سامان ساتھ لیتے گئے۔

ہمارا پہلا پڑاؤ پرگے (Perge) تھا، جو زمانہِ قبل از مسیح میں ایک بڑا شہر تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس کی آبادی ایک لاکھ رہی ہوگی۔ اسٹیڈیم کے آثار پائے جاتے ہیں اور ایک تھیٹر کے، جسے پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس میں پندرہ ہزار تماشائیوں کے لیے جگہ موجود تھی۔ شہر کے مرکز میں واقع سڑک پر، جو کم و بیش ایک میل لمبی ہے، دو رویہ دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک تین منزلہ گیٹ نما عمارت سے مارکیٹ کا آغاز ہوتا تھا۔ گیٹ سے باہر تین چشمے پائے جاتے تھے جہاں پر عوامی حمام ہوا کرتے تھے۔ چشموں کا پانی سوکھ چکا ہے البتہ حماموں کی دیواریں کھڑی ہیں۔

ہمارا دوسرا پڑاؤ اسپنڈوس (Aspendos) تھا، جس کا تھیٹر مشہورِ زمانہ ہے اور مرمت کے بعد اتنی اچھی حالت میں ہے کہ وہاں پر ہر سال موسیقی کا میلہ لگتا ہے اور تھیٹر کھیلا جاتا ہے۔ وہاں پر بیس ہزار تماشائیوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام موجود ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آخری سیٹ تک ایکٹروں کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ ایک زائر عورت نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر گانا گایا اور ایک سماں باندھ دیا۔ یہ شہر ایک دریا کے کنارے پر آباد تھا۔ شہر کے آثار مٹ چکے ہیں، مگر سلجوق زمانے میں بنایا جانے والا پل بدستور استعمال ہو رہا ہے۔

تیسرا پڑاؤ سیدے (Side) تھا، جہاں پر ہم نے رومن تھیٹر کی اوپر والی گیلری سے گاؤں پر ایک نظر دوڑائی اور سب سے اونچے مکان کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر رہائش کے بارے میں پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ اس مکان میں ہمیں ایک اپارٹمنٹ مل گیا اور ہم بس میں سے اپنا سامان اتار کر وہاں پر چھوڑ گئے۔ گائیڈ کے ساتھ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ٹور سے واپسی کے راستے میں بس ہمیں وہاں پر چھوڑ جائے گی۔ سیدے دراصل انطالیہ قدیم کے کھنڈرات پر بنا ہوا مچھیروں کا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ہر گھر میں، باغیچوں میں، بلکہ سڑکوں اور گلیوں میں جگہ جگہ قدیمی تاریخی عمارتوں کے ستون کھڑے ہیں۔ گاؤں کے مکانات ان پتھروں سے بنائے گئے ہیں، جو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں اور جن کو محفوظ کرنا محکمہ آثارِ قدیمہ نے ضروری نہیں سمجھا۔ سیدے جیسا گاؤں پا کر ہم بہت خوش تھے، کیونکہ وہاں پر ساحلی مقامات والا شور شرابا

نہیں تھا۔ یوں بھی ٹورسٹوں کے ٹڈی دل کا حملہ شروع ہونے میں ابھی مہینہ بھر پڑا تھا۔ ہماری قیام گاہ ساحل کے عین اوپر واقع تھی جہاں سے دو تین کلومیٹر لمبا ساحل شروع ہوتا تھا۔

آخری پڑاؤ الانیہ (Alanya) تھا، جہاں پر زمین کے چالیس گز نیچے جانے والی ایک غار پائی جاتی ہے۔ دمے کے مریضوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ہر روز چند گھنٹے اس میں جا کر گزاریں۔ سلجوقوں کے زمانے کا ایک قلعہ اور کچھ مساجد قابلِ دید ہیں۔ پورا شہر یورپی ٹورسٹوں کے لیے وقف ہے۔

ہمیں واپسی کے لیے طیارہ استنبول سے لینا تھا جہاں پر ہم تین روز قیام کرنا چاہتے تھے۔ انطالیہ سے ہم بس میں پہلے ازمیر آئے۔ یہ سفر گیارہ گھنٹے کا تھا۔ رات وہاں پر گزار کر ہم اگلے روز استنبول کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں قطاہیہ میں ایک روز قیام کیا جہاں پر ہمیں ٹائلوں کے کارخانے میں جا کر ان کی کاریگری کو دیکھنے کا شوق تھا، مگر جو کارخانہ ہمیں دکھایا گیا اس کی کاریگری اعلیٰ پائے کی نہ تھی، جس کے لیے ترکی مشہور ہے۔ تیسرے روز ہم استنبول پہنچے جہاں پر ایسا ہوٹل تلاش کرنا بہت مشکل ثابت ہوا جو اچھا ہو مگر جہاں شور شرابا نہ ہو۔ ہمیں دو بار ہوٹل تبدیل کرنے پڑے پھر بھی سکون نہ مل سکا۔ یہ شہر، جو یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہے، اس کی پانچ سو مسجدوں کو تو ہم تین روز میں نہ دیکھ سکتے تھے، البتہ ہم نے سلطان سلیمان جامع اور سلطان احمد جامع، جسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں، دیکھیں۔ پھر ہا گیا صوفیا گئے جو پہلے چرچ تھا، پھر مسجد بنا اور اب میوزیم ہے۔ توپ کاپی محل کی دنیا فی الواقع نرالی ہے۔ جہاں پر ہمیں اس کی عمارتوں نے متاثر کیا وہاں پر ہمیں سب سے زیادہ شوق ترک سلطانوں کے چینی برتنوں کو دیکھنے کا تھا۔ اوتا ایک عمر سے چینی کے برتنوں پر مصوری کرتی آئی ہے۔ وہ کتابوں میں اس محل میں پائے جانے والی تمام اقسام وانواع کے چینی سیٹوں کی تصویریں دیکھ چکی تھی مگر ان کو اپنی آنکھوں سے، سامنے کھڑے ہو کر، دیکھنے میں جو لطف ہے اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صبح کے گئے ہوئے کہیں شام کو توپ کاپی محل سے باہر نکلے۔ اوتا کا ترکی کا سفر کرنے کا مقصد وہاں پر جا کر پورا ہوا تھا۔ وہ آج بھی چینی کے برتنوں کے نادر نمونے دیکھ کر بتا سکتی ہے کہ وہ توپ کاپی محل میں موجود ہیں یا نہیں؟ وہ یہ بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس کمرے کی کس الماری میں رکھے ہوئے ہیں۔

استنبول میں سیاحوں کے لیے اتنا کچھ پایا جاتا ہے کہ انسان سال بھر میں بھی شہر کے سارے نوادرات کو نہیں دیکھ سکتا۔ ہمیں وہاں پر بازار میں ایک خاص دکان پر بھی جانا تھا، جس کی فرمائش ہماری ایک واقف کار جرمن عورت نے کی تھی، جو عمان کی فضائیہ کے کمانڈر انچیف کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے۔ جب ہم نے اسے بتایا تھا کہ ہم ترکی جا رہے ہیں، تو اس نے فوراً اپنے پرس میں سے سو سو مارک کے پانچ نوٹ نکال کر ہمیں دیے کہ استنبول میں اس کے چچا کی دکان پر کام کرنے والوں کے لیے کوئی بہت اچھا

ساتحفہ لیتے جائیں۔اس کے چچانے ساری عمر استنبول میں گزار دی تھی۔اسکی وفات ہوچکی تھی مگر اس کی دکان بدستور چل رہی تھی،جس میں کام کرنے والوں کے لیے اسکے دل میں بہت عزت اور قدر پائی جاتی تھی۔وہ انکا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی کہ انھوں نے اسکے چچا کی آخری دم تک خدمت کی تھی۔

پاکستان کا پانچواں سفر

نومبر ۱۹۸۲ء کو میں نے پاکستان کا سفر کیا،جس کا مقصد ادبی حلقوں سے تعارف پیدا کرنا تھا۔ اس وقت تک پاکستانی ادیبوں میں سے شاذ شاذ کسی کے ساتھ میری روشنائی تھی۔ مجھے بھی لوگ محض نام سے جانتے تھے۔میرا پروگرام کراچی،راولپنڈی۔اسلام آباد اور لاہور کے ادیبوں سے ملنے کا تھا۔اتفاقی طور پر اس کے ساتھ ایک دوسرا کام نکل آیا،جس کا سبب یہ چیز بنی کہ "پاکستانی مجلس" کی صدارت کے زمانے میں ایک شخص کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی،جس نے پوچھا تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی مجلس میں پاکستان کے بارے میں تقریر کرنے کے لئے دعوت دے،تو کیا میں اس کو منظور کرلوں گا۔میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مجھے علم تھا کہ اس کے قائم کردہ ادارے کا مقصد کیا ہے۔اس نے مجھے اس بارے میں معلومات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔مگر لمبے عرصے تک اس کی طرف سے بالکل خاموشی رہی۔کئی برسوں کے بعد ایک جرمن مجھ سے ملنے کے لئے آیا،جس نے بتایا کہ وہ کچھ عرصے سے ایک انسانیت دوست ادارے Pro Humanitate سے وابستہ ہے،جن کی طرف سے پاکستان میں اڑھائی سو بچوں کو تعلیم دلوائی جاتی ہے۔اس نے مجھے اس ادارے کی مجلس عاملہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہ کچھ پراسپکٹس مطالعہ کے لئے میرے پاس چھوڑ گیا۔پھر ان کی طرف سے مجھے اپنے آفس میں آنے کی دعوت ملی۔میں نے سوچا دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

میں اس ادارے کے دفتر میں پہنچا،تو اس شخص کو بھی وہاں پر موجود پایا،جس نے کئی برس ادھر مجھے پاکستان پر تقریر کرنے کے بارے میں کہا تھا۔وہی اس ادارے کا ڈائرکٹر تھا۔پتا چلا کہ اس ادارے کی طرف سے پاکستان اور جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں نادار بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔اس کا طریق یہ تھا کہ ہر بچے کو جرمنی کا کوئی خاندان چن لیتا تھا اور اس کا ولی بن جاتا تھا،اس بچے کے لئے ماہانہ ایک مقررشدہ رقم ادا کرتا تھا،جس کی وصولی اور اس کے مناسب استعمال کا کام اس ادارے کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔اس کے اپنے نمائندے دونوں ملکوں میں موجود تھے،جو مقامی طور پر بچوں میں وظیفہ تقسیم کرتے تھے۔اس کے علاوہ ان آبادیوں میں ، جہاں پر ایسے نادار بچے رہتے تھے،دوسرے

رفاہی کاموں کا بھی انتظام کرتے تھے۔ مثلاً کراچی میں اس ادارے کی طرف سے پانی کی ترسیل کا کام کیا جاتا تھا، جس کے لئے ایک ٹینکی بنائی گئی تھی، جہاں سے اس علاقے کے باسیوں کو پانی مفت میں فراہم کیا جاتا تھا۔ اس علاقے میں ابھی پانی پہنچانے کی طرف بلدیہ کراچی نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے اس کام کی افادیت کے سبب اس ادارے کی مجلس عاملہ میں شامل ہونا منظور کرلیا۔ چونکہ میں تھوڑے دنوں تک پاکستان جا رہا تھا، اس لئے یہ طے پایا کہ میں کراچی میں اس ادارے کے کام کا جائزہ لوں۔ اس کے علاوہ جرمن قونصل جنرل سے ملاقات کر کے ان شکایات کی پڑتال کروں، جن کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہاں پر جمع ہو چکی تھیں۔

فرانکفورٹ کے ہوائی اڈے پر ایک دوست میرا انتظار کر رہا تھا، جن کے حوالے سے میں نے ایک افسانہ "جلاوطنی کی قید" لکھا تھا، جو میری کتاب "بچھڑی ہوئی کونج" میں شامل ہے۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ اس نے ایک جرمن عورت سے شادی کی تھی، جس سے اس کی دو بچیاں تھیں۔ پھر اس کو پاکستان واپس لوٹنے کی سوجھی۔ بیوی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ بچیوں کو سیر کرانے کے بہانے گھر سے لے کر گیا اور سیدھا ہوائی اڈے پر پہنچا، جہاں پر پاکستان جانے والا جہاز تیار کھڑا تھا۔ بیوی بچوں کو واپس لانے کیلئے پاکستان پہنچی، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر وہ وہیں پر رہ گئی۔ اب مجھے بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی مجبوری کے سبب نہیں، بلکہ اپنی رضامندی سے لاہور میں رہ رہی تھی۔ اس کا وہاں پر کوئی خاص کاروبار نہیں تھا۔ بس سال میں دو بار قالین بنانے والوں سے سامان حاصل کر کے اٹلی اور بعض دوسرے یورپین ملکوں میں نمائش کرتا تھا۔ ان سفروں میں اس کو اتنا منافع ہو جاتا تھا کہ لاہور میں مزے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ ایک دوست کے آفس میں گپ شپ لگانے میں گزرتا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش تھا۔ اسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کیا اس کی بیوی بھی اس زندگی سے خوش تھی یا نہیں۔ اس کو وہاں پر رہنا ہوگا، جہاں پر وہ رہنا چاہتا ہے۔ بچیوں کی تعلیم کا انتظام موجود تھا۔ اس سے زیادہ بھلا ایک عورت کیا توقع رکھ سکتی ہے؟

کراچی کے ہوائی اڈے پر وہی افراتفری دیکھنے میں آئی، جو شاید پاکستان کا خاصا بن چکی ہے۔ پرو ہومانی ٹاٹے کا کراچی میں نمائندہ نسیم اقبال مجھے لینے کے لئے آیا ہوا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ جرمن قونصل جنرل کے پاس جانا تھا۔ ان سے فون پر بات ہوئی، تو انہوں نے کہا ابھی آ جائیں۔ وہ خوش تھے کہ پرو ہومانی تاتے کی مجلس عاملہ کے ایک رکن سے بات ہوگی، جس کے نام اور کام سے وہ واقف تھے۔ ان کے پاس بہت سی شکایات پہنچی تھیں، کیونکہ بچوں کو ماہوار دی جانے والی رقم میں کمی کر دی گئی تھی۔ ایک سال قبل ہر بچے کو ایک سو پچاس روپے ملتے تھے۔ جب میں نے بتایا کہ ہم کراچی میں

مدرسہ کھولنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں، تو اس نے اس تجویز کی مخالفت کی، کیونکہ یہ کام دوسرے ادارے بھی کر رہے تھے۔ اس نے کہا اس کے نتیجے میں آپ کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ اس کو یہ گلہ بھی تھا کہ پرو ہومانی تاتے کو سوشل ڈپارٹمنٹ کے پاس رجسٹر نہیں کرایا گیا تھا۔ پتا چلا کہ نسیم اقبال اپنے اکاونٹ کی پڑتال کسی جانی پہچانی فرم سے نہیں کرواتا۔ جس شخص سے اس نے پڑتال کروائی تھی، اس کے بارے میں جرمن قونصل خانہ کی رائے اچھی نہیں تھی۔ قونصل جنرل نے تجویز پیش کی کہ ہم ماجدہ رضوی کو، جو آگے چل کر سندھ ہائی کورٹ کی پہلی خاتون جج بنی تھیں اور آج کل عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے قائم کردہ کمشن کی صدر ہیں، اپنے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شامل کریں۔ چنانچہ وہاں سے فارغ ہو کر ہم ماجدہ رضوی سے ملنے گئے، جو ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ پرو ہومانی تاتے کو سوشل ڈپارٹمنٹ میں رجسٹر کروا دیا جائے۔ میرے سامنے تو نسیم اقبال نے اس بات کی ہامی بھری، مگر میرے جرمنی چلے جانے کے بعد اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔

ہمبرگ واپس لوٹنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ نسیم اقبال کو پرو ہومانی تاتے کے ڈائریکٹر کی پشت پناہی حاصل تھی، جو اس ادارے کو ذاتی منفعت کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اس نے کراچی میں نسیم اقبال کو اور پیرو میں ایک جرمن دوست کو اپنا نمائندہ مقرر کر رکھا تھا۔ ان کو خوش رکھنے کے لئے اچھی تنخواہیں دیتا تھا، مگر ان کو بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے بہت تھوڑی رقم بھیجی جاتی تھی۔ جرمنی بھر میں کئی ہزار افراد نے اس ادارے کی رکنیت قبول کر رکھی تھی اور ہر شخص ماہوار پچاس مارک ادا کرتا تھا۔ گویا ہر مہینے ہیڈ آفس کو کئی لاکھ مارک موصول ہوتے تھے، جن میں سے صرف دس فیصد پیرو اور پاکستان بھیجے جاتے تھے۔ باقی رقم ڈائریکٹر کی جیب میں چلی جاتی تھی۔ پھر پتا چلا کہ وہ شخص ماضی میں ایسے ہیر پھیر کے سبب سزا یافتہ ہے۔ چنانچہ جب پہلی بار میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے ایک محفل میں پاکستان پر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی، تو اس کے تھوڑے دنوں کے بعد اس کو چار سال قید کی سزا ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ مجھ سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا تھا۔ اس نے قید خانے میں رہتے ہوئے اپنی بیوی کی مدد سے پرو ہومانی تاتے کے قیام کا سارا منصوبہ چلایا تھا۔ جب وہ اپنی سزا کی معیاد پوری کر کے باہر آیا، تو یہ نیا ادارہ بن چکا تھا، جو بہت جلد اس کے لئے معقول آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو اپنی زندگی ہیر پھیر میں صرف کر دیتے ہیں۔

جرمنی میں ایسے رفاہی اداروں کی نگرانی ایک سرکاری محکمے کے سپرد ہے۔ میں نے ان سے رپورٹ منگوائی، تو پتا چلا کہ پرو ہومانی تاتے کا شمار ان اداروں میں ہوتا ہے، جن کے کام کو شک وشبہ کی

نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اس بارے میں مجھے بہت جلد ایک ایسے کام کا سراغ مل گیا، جس کا تعلق رفاع عامہ سے نہیں تھا، بلکہ جو سراسر تجارتی تھا۔ڈائرکٹر نے جرمنی میں ایک ذبح خانے کو، جس کا دیوالیہ نکل چکا تھا،محض ایک مارک کے عوض خرید لیا تھا۔یورپ کے ذبح خانے دراصل ایک پورا کارخانہ ہوتے ہیں، جس میں بجلی کی مشینیں نصب ہوتی ہیں اور جس کو چلانے کے لئے صرف قصائی ہی نہیں رکھے جاتے، بلکہ مکینک اور مشینوں کے ماہرین درکار ہوتے ہیں۔ ڈائرکٹر نے ایک فارورڈنگ ایجنسی کی مدد سے کارخانے کو بہت کم لاگت پر پیرو پہنچانے کا انتظام کرلیا تھا۔وہاں پر کارخانہ لگ چکا تھا اور اس میں کام بھی شروع ہو چکا تھا۔البتہ اس بات کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔جب مجلس عاملہ میں یہ معاملہ زیر بحث آیا،تو ڈائرکٹر نے کہا وہ چاہتا ہے کہ پیرو میں پروہومانی تاتے کے کام کو اس طرح چلایا جائے کہ وہ تھوڑے عرصے کے اندر خودکفیل ہوجائے۔مگر میرے دل میں شبہ پیدا ہو چکا تھا۔اس لئے میں نے اس کارخانے کے کاغذات دکھائے جانے کا مطالبہ کیا۔میری توقع کے مطابق ڈائریکٹر اور اس کے پیرو میں نمائندے کا نام کارخانے کے مالکان کی حیثیت سے درج کرایا گیا تھا۔پروہومانی تاتے کا ان کاغذات میں کوئی ذکر نہ تھا۔میں نے فوری طور پر اس ادارے سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا، جس کو بہت جلد حکومت کے حکم سے بند کردیا گیا۔البتہ ڈائریکٹر کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جاسکی، کیونکہ وہ بروقت پیرو بھاگ گیا تھا۔

اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے کراچی کے ادیبوں سے ملنا تھا، جن کے ساتھ میری اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بعض ادیبوں کے ساتھ میری مراسلت جاری تھی۔محمد علی صدیقی کے ساتھ میرا رابطہ ان کے "ڈان" میں چھپنے والے ادبی کالم کے ذریعہ ہوا تھا۔وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، جہاں پر ان کے دوست حسن عابد اور راحت سعید صاحب بھی آ گئے۔ان دوستوں نے آگے چل کر ایک ادارہ "ارتقاء" قائم کیا، جس کے تحت اسی نام کا رسالہ چھپنا شروع ہوا۔آدھی رات تک وہ مجھ سے جرمن ادب کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں ان سے پاکستان کے ادبی حالات سنتا رہا۔اس زمانے میں میرا تعارف پاکستان کے ادبی حلقوں سے ہونے لگا تھا۔اکثر ادیبوں نے میری تحریریں پڑھی تھیں، مگر ذاتی طور پر مجھے کم ہی لوگ جانتے تھے۔محمد علی صدیقی نے بتایا کہ " افکار" کے مدیر صہبا لکھنوی نے مجھے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی ہے، جہاں پر وہ مجھے دوسرے ادیبوں سے ملانے کا اہتمام کر رہے تھے۔

چنانچہ میں اگلے روز افکار کے دفتر میں پہنچا۔صہبا لکھنوی منحنی سے آدمی تھے، مگر بلا کے محنتی اور باہمت انسان۔اس زمانے میں افکار پینتیس برس سے نکل رہا تھا اور اس کی باقاعدگی ضرب المثل بن چکی تھی۔کچھ عرصہ قبل وہ افکار کا "انگلستان نمبر" نکال چکے تھے۔انہوں نے کہا کہ وہ میری معاونت سے

"جرمن ادب نمبر" نکالنا چاہتے ہیں۔ میں نے جرمن ادب کے تراجم کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، مگر اس زمانے میں ابھی میرے پاس اتنا مواد نہیں تھا کہ ایک تنومند خاص نمبر کا پیٹ بھر سکے۔ البتہ ان کی تحریک کا یہ اثر ضرور ہوا کہ میں نے شاعری کے تراجم کے ساتھ ساتھ نثری تخلیقات کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ چنانچہ چند برسوں کے بعد میں نے "جرمن معاصر ادب" کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی۔ افکار کے دفتر میں بہت سے ادیبوں کے ساتھ ملاقات ہوئی، جن میں سے ادیب سہیل کا نام بالخصوص میرے ذہن میں رہ گیا، جو مشرقی پاکستان سے جان بچا کر آئے تھے اور صہبا لکھنوی کے معاون مدیر تھے۔ وہ آگے چل کر "انجمن ترقی اردو پاکستان" کے ماہوار رسالے "قومی زبان" کے مدیر مقرر ہوئے۔ وہ ان دنوں "افکار" کے معاون مدیر تھے۔

جب باتوں باتوں میں پتا چلا کہ صہبا لکھنوی کے بعد "افکار" کے جاری رہنے کا امکان نہیں ہے۔ تو میں نے تجویز پیش کی کہ افکار فاونڈیشن بنالی جائے، جس کی مالی امداد مخیّر احباب کریں، تا کہ رسالے کا مستقبل میں جاری رکھا جانا ممکن بن سکے۔ صہبا تو جیسے کسی ایسی تجویز کی راہ تک رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر اس پر کام شروع کر دیا اور جب میں دو برسوں کے بعد پاکستان لوٹ کر آیا، تو "افکار فاونڈیشن" کے قیام کا تمام انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ دوستوں اور بہی خواہوں نے اس مقصد کے لیے سرمایہ مہیا کیا اور فاونڈیشن کی طرف سے ایک مفصل پروگرام شائع کیا گیا، جس میں افکار کی اشاعت کے علاوہ دوسرے بہت سے کاموں کو شامل کیا گیا تھا۔ جن میں مستحق ادیبوں کی مالی امداد کے ساتھ ساتھ ادب کی نایاب کتابوں کی چھپائی کو بھی رکھا گیا تھا۔ مگر ان ساری باتوں پر عمل نہ ہو سکا۔ صہبا نے فاونڈیشن کے نام کے تحت جمع ہونے والے سرمائے کو منفعت کے کھاتے میں ڈال کر دوسرے سارے کاموں کو پس پشت ڈال دیا۔ چنانچہ اس کی وفات پر یہ سوال پیدا ہوا کہ " افکار" کو کیسے زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بیٹیوں نے ہمت کا ثبوت دیا اور "افکار" کی اشاعت کو اپنے ذمہ اٹھا لیا۔ اس طرح رسالہ اپنے سابقہ انداز میں چھپ رہا ہے۔ " افکار فاونڈیشن" بدستور موجود ہے اور رسالے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے کراچی اور لاہور میں میری تقریریں رکھی ہوئی تھیں۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں شہروں کے اہل علم سے ملاقات کا سبب پیدا ہو گیا۔ کراچی میں میری تقریر سننے کے لئے آنے والوں میں ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی بھی شامل تھے، جنھوں نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی اور جرمن شاعر رلکے کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک شخص وہاں پر ایسا بھی موجود تھا، جس کے ساتھ میرا تعارف اس وقت تک محض غائبانہ تھا۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ مہکری پاکستان کی ایک عجوبہ روزگار ہستی تھے، جن کے خطوط باقاعدگی کے ساتھ کراچی کے انگریزی اخباروں میں چھپتے تھے اور میں ان کی روشن فکری سے

بہت متاثر تھا۔ بالخصوص ان کے ایک خط نے "مارننگ نیوز" میں ایک بحث کا آغاز کیا تھا، جو بہت دور رس ثابت ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک شادی میں شامل ہونے والے چوبیس افراد میتھول الکحل پینے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئے۔ اس سے اگلے روز اخبار میں ایک خط چھپا کہ اگر اس ملک میں پولیس قوانین کی پابندی کرانے کے کام کو اپنا فرض جانتے ہوئے شراب نوشی سے روکتی، تو آج یہ چوبیس افراد زندہ ہوتے۔ اس خط کے جواب میں مہکری صاحب کا خط چھپا کہ اگر اس ملک میں شراب کی فروخت پر پابندیاں نہ ہوتیں اور لوگ آسانی کے ساتھ اچھی کوالٹی کی شراب حاصل کر سکتے، تو یہ چوبیس افراد نہ مرتے۔ اس خط کے نتیجے میں ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا، جو چودہ مہینوں تک جاری رہی۔ اس دوران میں ۵۴ افراد کے لکھے ہوئے ۱۱۴ خطوط چھپے۔ اسی زمانے میں میری مراسلت مہکری صاحب کے ساتھ شروع ہوئی۔ ہمارے لئے بالمشافہ ملنے کا وہ پہلا موقعہ تھا۔ کراچی کے نوجوان شاعروں ذی شان ساحل، افضال احمد سید اور ثروت حسین کے بھائی شوکت عابد کے ساتھ بھی میری پہلی ملاقات وہیں پر ہوئی۔ پھر شوکت صدیقی اور ممتاز حسین سے تعارف ہوا، جس کے نتیجے میں ہمارے درمیان دوستی کے روابط قائم ہوئے، جو آئندہ برسوں میں گہرے ہوتے چلے گئے۔

زوبی نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی، جو گھر سے زیادہ اسٹوڈیو تھا۔ وہاں پر مجھے اس کے ایک پنسل ورک نے خاص طور پر متاثر کیا، جو چار پانچ گز لمبا ہے اور جس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کی روزمرہ کی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے لئے اسے غیر ملکی دس ہزار ڈالر کی پیش کش کر چکے تھے، مگر وہ چاہتا تھا کہ وہ تصویر پاکستان کے کسی میوزیم میں جگہ پائے۔ زوبی اچھا مصور ہونے کے ساتھ باتیں کرنے کا بھی بادشاہ تھا۔ آدھی رات تک وہ ہمیں اپنی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں بتاتا رہا۔ سعادت حسن منٹو کے ساتھ اس کی دوستی کی داستان دلچسپ تھی، جو صبح سویرے نہا دھو کر افسانہ لکھتا۔ پھر تانگے میں بیٹھتا اور راستے میں اسے پنواڑی سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا خریدنے کو کہتا۔ وہاں سے "ادارہ جدید" یا کسی دوسرے پبلشر کو جا کر تانگے میں بیٹھے بیٹھے باہر سے ہی افسانہ دکھاتا کہ لینا ہے تو چالیس روپے بھیج دو۔ اکثر اس میں سے پانچ سابقہ قرض کی ادائیگی میں کٹ جاتے تھے۔ راستے میں ہی ادھا خریدا جاتا تھا اور وہ تانگے والے کو زوبی کے اسٹوڈیو چلنے کو کہتا تھا۔ نیچے سے ہی نام لے کر پکارتا اور اوپر آ جاتا تھا۔ دونوں بیٹھ کر پینے لگ جاتے تھے۔ پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے یاد آتا تھا کہ تانگہ نیچے کھڑا ہے۔ زوبی سے کہتا تھا، جاؤ اسے فارغ کر آؤ۔ پھر زوبی کی ہمراہی میں شراب خانے کا رخ کرتا تھا اور جب تک پیسے ختم نہ ہو جاتے تھے، دونوں بیٹھے ہوئے پیتے رہتے تھے۔ رات گئے دونوں ایک دوسرے کو تھامتے ہوئے گھر جاتے تھے۔ دونوں بیڈن روڈ پر رہتے تھے۔ پھر زوبی

کراچی اٹھ آیا۔منٹو نے پیغام بھیجا کہ واپس آ جاؤ، میرے آخری دن ہیں۔ چند روز کے بعد وہ سچ مچ مر گیا۔اس کہانی میں خدا جانے کتنا سچ ہے۔البتہ اس روز آدھی رات تک زوبی، جو بسم اللہ پڑھ کر پیتے تھے، پیتے رہے۔ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ میں یورپ میں رہتے ہوئے اس نعمت سے محروم تھا۔

راولپنڈی اور اسلام آباد میں ادیبوں سے ملاقات کا سلسلہ صادق حسین سے شروع ہوا، جو چند برس قبل اپنے بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں ہمبرگ آئے تھے اور میں نے ان کی ملاقات جرمن ادیبوں اور مصوروں سے کرائی تھی۔انہوں نے ڈاکٹر صفدر محمود کو بھی بلا رکھا تھا، جو اس زمانے میں کسی وزارت میں ایڈیشنل سیکرٹری تھے۔ان کے ساتھ میری دوستی کا آغاز اسی روز ہوا تھا۔انہوں نے تین دوستوں (ضمیر جعفری، سلطان رشک اور کرنل محمد خان) کے ساتھ مل کر مزاحیہ مجلّہ "اردو پنچ" نکال رکھا تھا۔منیر احمد شیخ بھی آن نکلا، جس کے بارے میں سن رکھا تھا کہ اس نے مجھے اپنے کسی مضمون میں خوب مطعون کیا تھا، جس کا سبب میرا ایک مضمون تھا، جو میں نے ایران میں آنے والے اسلامی انقلاب کے سلسلے میں جرمنی کے مشہور رسالے "ڈیر شپیگل" کے لئے لکھا تھا۔مگر وہ صاف انکار کر گیا۔صادق حسین نے میری آمد کی خبر جمیل ملک کو پہنچا دی تھی، جن کے ہمسائے میں میرا بچپن گزرا تھا۔ان سے ملنے کے لئے ہم دوسرے روز ان کے بھائی عبدالقیوم ملک کے گھر پر گئے، جو صادق حسین کے قدیمی دوست ہیں اور جن کی بیوی بی بی عزیزہ ہماری بچپن کی دوست تھی اور مجھے جمیل ملک کے ادبی رسالے پڑھنے کے لئے لا کر دیا کرتی تھی۔ڈاکٹر صفدر محمود نے "اردو پنچ" کے ادارہ تحریر سے ملاقات کا انتظام کیا، جو پنڈی کلب میں ہوئی، جہاں پر کرنل محمد خان مستقل طور پر رہتے تھے۔میں نے انہیں یاد دلایا کہ جب انہوں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا، تو جمیل پیرزادہ کی معرفت ان کے ادب پارے ہمیں ہفت روزہ "راز دان" میں اشاعت کے لئے ملے تھے اور میں نے ان کو پہلی بار چھاپا تھا۔

کشور ناہید کی معرفت میری کچھ تحریریں راولپنڈی سے چھپنے والے رسالے "خیابان" میں شائع ہوئی تھی، اس لئے مجھے اس رسالے کے مدیر حسن عباس رضا سے ملنے کا شوق تھا۔میں اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر پر پہنچا، تو دروازے پر لگی ہوئی تختی پر صوفی محمد زمان کا نام دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا، کہ یہ وہی صاحب ہیں، جو میری طالب علمی کے زمانے میں اسلامیہ ہائی سکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ اگلے روز حسن عباس رضا نے اس بات کی تصدیق کر دی اور بتایا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔وہ اپنے ساتھ احمد داؤد کو لایا تھا، جس کے افسانے مجھے بہت پسند تھے۔پھر ادارہ ثقافت پاکستان کی ایک تقریب میں بہت سے دوسرے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔میرے حافظے میں رشید امجد، منصور قیصر، کہکشاں ملک، کرم حیدری، متین فکری، فتح محمد ملک اور کرنل محمد سرور کے نام محفوظ ہیں۔

اسلام آباد میں عبدالغفور چوہدری کے گھر پر، جو تین ماہ جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ میں گزار کر لوٹے تھے، مصور غلام رسول اور ایرک سپرین سے ملنا ہوا، جن کے آپس میں مل بیٹھنے کا مقصد اپنا غم غلط کرنے کے لئے پینا پلانا تھا۔ البتہ ملک کے سیاسی حالات پر ان کے تبصرے بہت بصیرت افروز تھے۔ میں نے انہیں سنایا کہ مجھے اسی روز اپنے ایک قدیمی دوست سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، جو تیس برس لندن میں گزارنے کے بعد لوٹا تھا۔ اس نے صدر میں ایک پلاٹ خرید کر ایک بنگلہ بنوایا تھا، جس کے پہلو میں ایک جنرل صاحب رہائش پذیر تھے۔ ان کو یہ چیز پسند نہ آئی تھی کہ اس نے اپنے بنگلے کا پورچ بہت شاندار بنوایا تھا۔ ان کے بیٹے نے اسے کہا کہ وہ اس کو از خود گرا دے، وگرنہ وہ ملٹری کا کرین منگوا کر توڑ دیں گے۔ پھر اسے جنرل صاحب نے اپنے آفس میں بلوایا، جہاں پر اسے دو گھنٹے تک انتظار کرانے کے بعد جنرل صاحب باہر نکلے اور پوچھا کہ کیا یہی وہ شخص ہیں؟ پھر اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ ملٹری کا کرین لے کر جائیں اور اس کے بنگلے کا پورچ گرا دیں۔ میرا دوست دوڑا دوڑا ایک دوسرے جنرل کے پاس پہنچا اور مدد کے لئے دہائی دی۔ اس نے کہا یہ تو کچھ مسئلہ ہی نہیں۔ تم جنرل اقبال کے پاس جاؤ۔ آج کل جنرل ضیاء الحق نے سارے اختیارات اس کو دے رکھے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ تمہاری مشکل کو فوراً حل کر دے گا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا ہمسایہ، جو اس کا پورچ گرانا چاہتا ہے، وہ جنرل اقبال ہی تو ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملٹری افسر پاکستان میں من مانی کاروائیاں کر رہے تھے۔

جرمن سفارت خانے میں میرا استقبال جس جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا، اس نے مجھے حیران کر دیا، کیونکہ میرا ان کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا۔ انہوں نے میری رپورٹ پر منفی تبصرہ عدالت کو بھیجا تھا۔ سفیر ٹرفلوتھ (Dr.Teerfloth) سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے کہا۔ ہمیں یہ سبق مل چکا ہے کہ آپ کی طرف سے پیش کی جانے والی باتوں کو جھٹلانا مشکل ہے، اس لئے میں نے اپنے عملے کو ہدایت کر دی ہے کہ آپ کی طرف سے آنے والی رپورٹوں کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے۔ بلکہ اگر آپ کو کسی قسم کی کمک کی ضرورت محسوس ہو، تو بلا تکلف سفارت خانے کے وسائل کو استعمال میں لائیں۔ ان دنوں پروفیسر انے ماری شمل پاکستان کے دورے پر تھیں اور ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا جا رہا تھا، مجھے خاص طور پر اس میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ سابقہ سفر کے دوران میری پریس اتاشی روزینی (Rosini) کے ساتھ دتلف خالد کے سلسلے میں جھڑپ ہوگئی تھی۔ اب وہ اس طرح بچھے جا رہے تھے، جیسے ہماری دوستی عمر بھر سے ہو۔ گویا یہاں پر بھی وہی صورت حال تھی، جس کا ذکر میں نے پاکستانی سفارت خانے کے حوالے سے کیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر پر دی جانے والی ٹی پارٹی میں آنے کی دعوت دی، جہاں پر میری ملاقات پاکستان اٹامک انرجی کے چیرمین منیر احمد خان اور ان کی اہلیہ سے ہوئی۔

چنداں قبل بھائی جان عبدالمنان خان کی اہلیہ بھابی محمودہ کا انتقال انگلستان کے سفر کے دوران ہوگیا تھا۔ان کو ہمارے گاؤں کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ وہاں پر جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ بھائی جان کی زندگی میں ایک انقلاب آچکا تھا۔قبرستان جوایک زمانے میں خاصا اجاڑ ہوا کرتا تھا،اس کو انہوں نے ایک باغ میں تبدیل کر دیا تھااوراس کے گردا گرد پختہ دیوار بنادی گئی تھی۔ ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے،جن کی دیکھ بھال کے لئے مالی مقرر تھا۔ایک ماشکی دن میں کئی بار پانی وہاں پر پہنچا تا تھا۔ بھائی جان ہفتے میں تین چار روز گاؤں میں گزارتے تھےاوردن کا بیشتر حصہ قبرستان میں بسر کرتے تھے، جہاں پرانہوں نے بیٹھنے کے لئے بنچ رکھوادیئے تھے۔اس کے علاوہ بھی گاؤں میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔انگلینڈ پلٹ لوگوں نے خوبصورت بنگلے تعمیر کروا لئے تھے۔ گاؤں میں بجلی آ گئی تھی اور ٹیلی فون بھی لگ چکا تھا۔ پرائمری اسکول کے مقابلے میں ایک انگلش میڈیم پرائیوٹ اسکول کھل گیا تھا،جس میں پڑھنے والے بچوں کی تعدادسرکاری مدرسے سے زیادہ تھی۔گوجر خان جانے والی سڑک پراب کوئی پیدل نہیں چلتا تھا۔سائیکل سوار بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔اکثر لوگوں کے پاس موٹر سائیکلیں نظر آئیں۔سڑک پر بسیں اور ویگنیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ میرے بچپن میں دن رات اونٹوں کے کارواں اس سڑک پر چلتے تھے۔اب کے مجھے صرف دو اونٹ دکھائی دیئے،جن پر اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔کھیتوں میں ہل چلانے والے کسان غائب ہوگئے تھے۔گاؤں میں ٹریکٹر آ گئے تھےاور فصل کی کٹائی کا کام ہارویسٹر کے ذریعہ ہوتی تھی۔ان تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ایک افسانہ "لینڈ لیڈی" لکھا تھا،جو میری کتاب "بنت حرام" میں شامل ہے۔

لاہور میں کشور ناہید نے "حلقہ ارباب ذوق" کے پروگرام میں میرا نام شامل کروا دیا تھا۔اس لئے ایک ہی شام میں چالیس پچاس ادیبوں سے ملاقات کا موقعہ نکل آیا۔اس سے اگلا روز کشور کے دفتر "پاکستان نیشنل سنٹر" میں گزرا، جہاں پر ادیبوں کا آنا جانا اس کثرت سے تھا، جیسے ہم بھاٹی دروازے میں بیٹھے ہوں۔ بالخصوص صلاح الدین محمود کے ساتھ لمبی نشست ہوئی۔ڈاکٹر وزیر آغا بھی وہاں پر آن نکلے۔ان کو یاد تھا کہ میں ایک بار پرویز پروازی کی معیت میں ان کے گاؤں وزیر کوٹ حاضر ہوا تھا۔ جرمن ادب سے تراجم کے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ جرمن ادب پاروں کوانگریزی میں پڑھ لینے کو کافی سمجھتے ہیں۔اردو میں ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی ترجمے میں کچھ نہیں رکھا۔اس لئے وہ اپنے مجلّے "اوراق" میں تراجم نہیں چھاپتے۔میں احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں حاضر ہوا۔انہوں نے اپنے رسالے "فنون" میں میرا افسانہ "جنم جنم کا ساتھ" چھاپا تھا، جو میری افسانہ نگاری کے دوسرے دور کا پہلا افسانہ تھا۔پھر میں "نقوش" کے دفتر میں محمد طفیل کو ملنے کے لئے گیا،جنہوں نے اپنے

رسالے کی روایات کو ایک طرف رکھتے ہوئے سب سے پہلے میرا ترجمہ چھاپا تھا۔ وہاں پر مرزا ادیب بھی آئے بیٹھے تھے۔ کشور نے اپنے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو شام کے کھانے پر گھر پر بلا رکھا تھا۔ اس طرح انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، زاہد ڈار، جاوید شاہین، غالب احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، مسعود اشعر سے تعارف ہوا۔ اگلی باران میں سے کسی کی کوئی تحریر سامنے آئے گی، تو اس کی تصویر میرے ذہن کے پردے پر ابھرے گی۔

امریکہ کی سیاحت

پاکستان سے لوٹے ابھی تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ امریکہ سے پروفیسر حفیظ ملک نے ولانووا یونیورسٹی (Villanova) کی طرف سے ایک بین الاقوامی سیمنار میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیجا۔ ہماری ملاقات بون میں ایک کانفرنس کے موقعے پر ہوئی تھی۔ میں ان کو اس زمانے سے جانتا ہوں، جب وہ طالب علمی کے دنوں میں "نوائے وقت" کے لیے امریکہ سے رپورٹ بھیجا کرتے تھے۔ میں نے اوتا سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو، تو ہم سیمنار کے بعد تین چار ہفتوں تک امریکہ کی سیاحت کریں۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں ساتھ چلنے سے انکار ہی نہ کر دے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس کا لڑکپن جنوبی امریکہ میں گزرا تھا، جہاں پر لوگوں کے دلوں میں امریکہ سے بے حد نفرت پائی جاتی ہے۔ ویتنام کی جنگ نے اس کو مزید تقویت دی تھی۔ یہی نہیں امریکہ میں حبشیوں کی حالت زار، غلامی کا نظام، جس کے قانونی طور پر روکے جانے کے ایک سو سال بعد بھی سیاہ فاموں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا اور پھر ریڈ انڈین کو جس بے دردی کے ساتھ تباہ و برباد کیا گیا تھا اور جس طرح ان کے ملک پر قبضہ جمایا گیا تھا، یہ ساری باتیں اوتا کے دل پر مرتسم تھیں۔ وہ بچپن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، تو اسکا پارٹ ریڈ انڈین سردار "سٹنگ بل" (Sitting Bull) کا ہوا کرتا تھا، جو مارا گیا تھا، مگر جس نے آخری سانس تک یورپ سے آنے والے نو آبادوں کے ساتھ صلح نہ کی تھی۔ اسی پر بس نہیں، امریکی حکومت دنیا بھر میں ایسی حکومتوں کی پشت پناہی کرتی ہے، جو اپنے ملکوں میں جبر و ظلم روا رکھتی ہیں۔ جنوبی امریکہ میں نئی نسل کے دلوں میں ان وجوہات کی بنا پر بہت رنج اور غصہ پایا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں جو لوٹ گھسوٹ امریکیوں نے کی ہے، اس کو مد نظر رکھا جائے، تو اس نفرت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ کئی ملکوں میں "امریکن فروٹ کمپنی" کی حکومت چلتی ہے، جن کی معیشت اسکے ہاتھ میں ہے۔ بعض ملکوں میں صرف کیلا لگایا جاتا ہے، دوسرے ملکوں میں صرف کافی بوئی جاتی ہے۔ اور سب جگہوں پر

اجارہ داری امریکی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنوبی امریکہ کی معدنیات پر بھی انکا قبضہ ہے۔ اگر کسی ملک کے عوام میں بیداری پیدا ہوئی ہے اور انہوں نے اپنے ملک کو امریکی پنجے سے آزاد کرانا چاہا ہے، تو وہاں پر سی آئی اے فوجی انقلاب لے آتی ہے، جیسا کہ چلی میں ہوا تھا، جہاں پر اوتا مقیم رہ چکی تھی۔ اوتا نے بتایا کہ وہاں پر اگر کوئی امریکی سڑک پر نظر آ جائے، تو بچے اس پر پتھر پھینکتے ہیں اور گرنگو (Gringo) کو ملک سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ اس ماحول میں جوان ہونے کے سبب اوتا بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے میرے وہاں پر کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھانے کی اس نے مخالفت کی تھی۔ چونکہ ہم صرف چار ہفتوں کے لئے جا رہے تھے اور ہمارا مقصد ملک کی سیاحت تھا۔ اس لیے میں اوتا کو منوانے میں کامیاب ہو گیا۔

ہمارا ارادہ "نارتھ ویسٹ اورینٹ ایرلائنز" سے سفر کرنے کا تھا، جس کے لیے ہمیں ایک ماہ کے لیے "پاسپورٹ" نامی ٹکٹ مل گیا تھا۔ اس میں یہ سہولت حاصل تھی کہ ہم آنے جانے کے سفر کے علاوہ جتنی بار چاہیں ملک کے اندر ہوائی سفر کر سکتے تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ نیویارک تھا، جس کے بارے میں ہم نے اتنا کچھ پڑھ اور سن رکھا تھا کہ کسی قسم کے ٹورسٹ گائیڈ کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے وہاں پر قیام کے چار دن بے حد مصروف گزرے۔ ہم نے ہر اہم میوزیم کو چھان مارا۔ البتہ توام میناروں (Twin Towers) پر چڑھنے کی بجائے صرف ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ (Empire State Building) کو فتح کرنا کافی سمجھا۔ ہوٹل والوں نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ انڈر گراونڈ میں سفر نہ کریں اور کسی ایسے علاقے میں نہ جائیں، جہاں پر کالے لوگ بستے ہیں۔ شام کو اندھیرا پڑنے سے قبل ہوٹل میں واپس لوٹ آئیں اور اگر کہیں پر جانا ہو، تو ٹیکسی میں جائیں۔ اپنے کمرے کا لاک ہمیشہ بند رکھیں۔ یوں بھی ایک چھوڑ دو تالے دروازے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک پورا دن ہم نے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ (Metropolitan Museum of Art) میں گزارا۔ دوسرا دن میوزیم آف ماڈرن آرٹ (Museum of Modern Art) میں بسر ہوا۔ پھر بھی ہمارا دل نہیں بھرا۔ ایک روز ہم دوسرے زائرین کے ساتھ اوپر کی منزل پر جانے کے لئے ایک ایلیویٹر (Elevator) میں داخل ہوئے۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی منزل مقصود کا بٹن دبایا اور دروازہ بند ہونے کے بعد ایلیویٹر چل دیا۔ مگر جب پہلی منزل کے آنے کا اعلان ہوا، تو ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہم بدستور گراونڈ فلور پر کھڑے تھے۔ ایلیویٹر بھی نمائش کی ایک چیز تھی۔ اس کا مقصد ہمیں کہیں بھی نہیں لے جاتا تھا۔

نیویارک سے ہم واشنگٹن گئے، جہاں پر ہمیں لائبریری آف کانگرس کی عقبی سڑک پر ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں رہائش ملی۔ وہاں سے لائبریری تک جانا آسان تھا۔ مگر ہمیں سب سے پہلے

جو ہدایات ملیں، ان کی رو سے ہمیں اندھیرا پڑنے سے قبل واپس آ جانا چاہیئے، کیونکہ اس علاقے میں صرف کالے لوگ رہتے ہیں، جن سے پولیس بھی پناہ مانگتی ہے۔ جس کسی سے بات ہوتی تھی، وہ یہی مشورہ دیتا تھا کہ سڑکوں پر پیدل بالکل نہ چلو۔ کہیں پر جانا ہو، تو ٹیکسی منگوا لو۔ ان ساری ہدایات کے باوجود ہم نے گھوم پھر کر کاپیٹول (Capitol) میں پارلمان کو دیکھا۔ وائٹ ہاؤس کا درشن کیا۔ لائبریری آف کانگرس کے تعارفی راونڈ میں حصہ لیا۔ ہماری رہنما ایک بڑی خوبصورت لڑکی تھی، جس کی جوانی اس کے مختصر لباس سے اچھلی پڑتی تھی۔ اس کا بولنے کا انداز بھی خاصا دلکش تھا۔ جب اس کا راونڈ ختم ہوا، تو دن ڈھل رہا تھا اور اوتا کو ہوٹل واپس لوٹنے کی جلدی تھی، کیونکہ اندھیرا پڑنے سے پہلے ہمیں اپنے ہوٹل کی پناہ گاہ میں ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح ہم واشنگٹن سے بہت سرسری سی واقفیت پیدا کر سکے۔ اوتا کو لائبریری آف کانگرس میں کچھ کام تھا، مگر اس طرف توجہ نہ دی جا سکی۔

آخر ہمیں بادل ناخواستہ واشنگٹن سے رخصت لینا پڑی۔ یوں بھی سیمینار کی تاریخ آن پہنچی تھی، جس کے لیے ہمیں فلاڈلفیا (Philadelphia) جانا تھا، جہاں کے لیے واشنگٹن سے ڈائرکٹ فلائٹ نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "نارتھ ویسٹ اور رینٹ ایرلائنز" کی ان دونوں مقامات کے درمیان براہ راست فلائیٹ نہیں پائی جاتی تھی۔ البتہ ہم اگر وہاں سے ڈیٹرائیٹ (Detroit) جائیں اور وہاں سے فلاڈلفیا کے لیے پرواز لیں، تو اس پر کوئی پابندی نہیں تھی اور ہمارا اس پر کوئی خرچ بھی نہیں اٹھتا تھا۔ واشنگٹن سے فلاڈلفیا کا فاصلہ موٹر کار میں دو اڑھائی گھنٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمیں پہلے آٹھ سو کلومیٹر پرواز کر کے ڈیٹرائیٹ جانا پڑا۔ پھر وہاں سے سات سو کلومیٹر کی پرواز کے بعد فلاڈلفیا پہنچے۔ فرودگاہ سے شٹل کار ہمیں ولانووا پہنچا آئی۔ جہاں پر سیمینار کے شرکاء جمع ہو رہے تھے۔ جنکے ساتھ شام کے کھانے پر ان سے تعارف ہوا۔

سیمینار کا عنوان "International Security in Southwest Asia" تھا۔ شامل ہونے والوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ البتہ غیر ملکوں سے میرے سوا صرف ایک مصری ڈاکٹر دسوکی (Dr. Dasuqi) آئے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، آغا شاہی، لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور سابق سفیر ارشد صاحب مدعو تھے، مگر کسی وجہ سے نہ آ سکے تھے۔ البتہ پاکستان کی نمائندگی اس کے باوجود اچھی خاصی تھی۔ پاکستان کے سفیر لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم اور قونصلر طیب صدیقی کے علاوہ بہت سے دوسرے پاکستانی موجود تھے۔ باقی کے سبھی شرکاء امریکی تھے، جن میں سے چھ سابق سفیر تھے، جو مشرق وسطی کے ملکوں میں متعین رہ چکے تھے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور دوسری وزارتوں کی طرف سے کم و بیش چودہ نمائندے موجود تھے۔ باقی شرکاء امریکی یونیورسٹیوں کے پروفیسر حضرات تھے۔ دو روز میں دس مقالے

پیش کیئے گئے۔ میرا مقالہ افغانستان پر روسی فوجوں کی مداخلت پر یورپی طاقتوں کے ردعمل کے بارے میں تھا۔ آگے چل کر سارے مقالے کتابی صورت میں چھپ گئے تھے، جس کو حفیظ ملک نے ایڈٹ کیا تھا ۔

ایک امریکی پروفیسر نے بحث کے دوران کہا اگر سعودی عرب میں جمہوریت قائم کر دی جائے، تو بہت سے مسائل کا حل نکل آئے گا ۔ اس پر صدر ریگن کا مشیر روبرٹ نیومین (Robert Neumann)، جو سعودی عرب میں سفیر رہ چکا تھا، اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اس نے کہا۔ بالکل غلط۔ سعودی عرب کی موجودہ حکومت اور وہاں کے شاہی خاندان کے ساتھ تعاون کر کے امریکہ نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے مقابلے میں کویت میں جمہوری پارلمان قائم کر کے ہم نے اپنے لیے مصائب کھڑے کر لئے ہیں۔ ان دنوں وہاں کی پارلمان میں اس موضوع پر بحث ہو رہی ہے کہ عورتوں کو ووٹ کا حق دیا جائے یا نہیں۔ ملک میں مظاہرے ہو رہے ہیں اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں طالب علم شور شرابا مچا رہے ہیں۔ اس نے پوچھا۔" کیا آپ چاہتے ہیں کہ سعودی عرب میں بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں؟ "

پاکستانی سفیر لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانی حقوق ہر ملک اور ہر معاشرے میں مختلف رنگ میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ ہم پاکستان میں امریکہ کی نقل کرتے ہوئے ویسے قوانین بنائیں گے، جو آپ کے ملک میں رائج ہیں۔ ہمارے ہاں انسانی حقوق کا تصور آپ کے تصور سے جدا ہے۔ پاکستان میں ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء کو اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جائے گا۔ اور ایک ایسی حکومت قائم کی جائے گی، جو ہماری روایات کے مطابق ہو گی۔ اس لیے وہاں پر انسانی حقوق قائم کرنے پر بحث کرنے کی بجائے آپ کو چاہیئے کہ اس بات کا نوٹس لیں کہ ہم نے تین ملین افغانی مہاجروں کو اپنے ملک میں پناہ دے رکھی ہے۔

صدر ریگن کے ایک مشیر نے کہا اگر مصر نے سویٹ یونین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے، جو اس زمانے میں منقطع تھے، یا پاکستان نے افغانستان کے بارے میں روس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیا، تو امریکہ کا ردعمل بہت سخت ہو گا۔ اس نے کہا اس صورت میں امریکی امداد روک دی جائے گی۔

فلسطین کے بارے میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک نمائندے نے کہا کہ اسرائیل بہت جلد ویسٹ بینک کے ساٹھ فیصد حصے میں اپنی کالونیاں قائم کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دے گا، جس کے بعد ان کو وہاں سے نہیں نکالا جا سکے گا۔ فلسطینیوں کو چاہیئے کہ اسرائیل کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیں۔ البتہ ان کو القدس (یروشلم) سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ امریکہ کی طرف سے اسرائیل پر کسی قسم کا دباؤ

نہیں ڈالا جائے گا، نہ ہی اسرائیل کے لیے امریکی امداد میں بھی کوئی کمی آئے گی۔

میرا واسطہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں امریکی ماہرین مشرق وسطی کے ساتھ آئے دن پڑتا رہتا تھا۔ البتہ جب وہ یورپ میں ہوتے تھے، تو ان کا طرز عمل بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ان کو عام طور سے بہت سونگھ سونگھ کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ مگر امریکہ میں بیٹھے ہوئے ان کو کسی کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک امریکی پروفیسر نے ہماری انسٹی ٹیوٹ میں بیٹھے ہوئے فلسطینیوں کے انتفادہ کے بارے میں کہا تھا کہ اگر اسرائیلی اس کی بات مانیں، تو سرحدیں بند کردیں، کسی غیر ملکی صحافی یا دوسرے مبصر کو اندر نہ آنے دیں اور فلسطینیوں کی ایسی تیسی کردیں۔ اس کو میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس قدر رگیدا تھا کہ اسے اپنے الفاظ واپس لینے پڑے تھے۔ جب وہ دو تین برسوں کے بعد لوٹ کر ہمبرگ آیا، تو اس نے کہا اس کو خوب یاد ہے کہ ہماری تنقید نے اس کی راتوں کی نیند حرام کردی تھی۔

اس کانفرنس میں میری ملاقات ڈاکٹر مغیث الدین سے ہوئی، جو امریکن یونیورسٹی میں انٹر نیشنل ریلیشنز پڑھاتے تھے۔ وہ ۱۹۵۴ء میں امریکہ آئے تھے۔ تعلیم کے خاتمے پر کچھ عرصہ پاکستانی سفارت خانے میں کام کیا۔ پھر ان کو یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ ہماری ملاقات کے وقت وہ اپنے شعبے کے ڈین تھے اور میری لینڈ میں واشنگٹن کی عین سرحد پر رہتے تھے۔ جب ہم نے واشنگٹن کے دورے کے بارے میں بتایا، جس کے دوران اوتا لائبریری آف کانگرس میں وہ کام بھی نہ کر پائی تھی، جس کی خاطر ہم وہاں پر گئے تھے۔ تو انہوں نے کہا آپ لوگ سیمینار کے خاتمے پر میرے ساتھ چلیں اور یہ کام اطمینان کے ساتھ کریں۔ اس طرح ہم ان کی کار میں دوبارہ واشنگٹن گئے۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر ہویا ازمیر (ترکی) کی رہنے والی ہیں اور ان دنوں لیبیا کے سفارت خانے میں کام کررہی تھیں۔ ڈاکٹر مغیث کے ایک کولیگ ڈاکٹر عبدالعزیز سعید نے بتایا کہ امریکہ کی یونیورسٹیوں اور تحقیق کے اداروں میں یہودی لابی کا اثر رسوخ اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ وہ جس کو چاہیں ملازمت سے فارغ کرا سکتے ہیں۔ ان کی طرف سے مسلمان اور عرب محققوں کی فہرستیں ہر سال شائع ہوتی ہیں اور لابی کے لوگوں سے ان کے بارے میں رپورٹ منگوائی جاتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی اسرائیلی یا یہودی مفادات کے خلاف کام کرتا ہو، تو اس کو ملازمت سے نکلوانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مغیث الدین نے بتایا کہ ان کے خلاف ایسا اقدام اٹھایا جا چکا تھا۔ سال ہا سال تک اس یونیورسٹی میں پڑھانے کے باوجود ان کو نکالا جارہا تھا۔ انہوں نے کہا آپ نے امریکہ نہ آنے کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا۔

لائبریری آف کانگرس میں اوتا کو سپینش ڈراما کے کارڈ حاصل کرنے تھے، جن کو نکالنے کا کام

ہمیں خود کرنا پڑا، جس پر ایک پورا دن لگ گیا۔ ہماری ملاقات لائبریری کے ایک ملازم ڈاکٹر سام افتخار سے ہوئی، جو سیالکوٹ کے رہنے والے اور پاکستانیوں کی ایک مجلس کے صدر تھے۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ جان ڈیوی اور علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات کے تقابلی مطالعہ کے بارے میں تھا۔ پاکستان میں وہ عیسائی تعلیمی اداروں کے ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔ ان کا ایک مضمون ۱۹۵۸ء میں یونیسکو کے مقابلے میں اول آیا تھا اور ان کو مغربی ممالک کی سیر کے لیے ایک ٹکٹ ملا تھا۔ امریکہ میں آ کر انہوں نے وہیں پر رہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کو بھی ملازمت میں پروموشن کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص کو ترجیح دی جا رہی تھی، اس لئے وہ اس معاملے کو عدالت میں لے گیے تھے، جہاں پر ان کے مدمقابل پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے حضرت مریم کے بارے میں کہا تھا کہ ان کے ساتھ کسی نے زنا بالجبر کیا تھا اور حضرت عیسیٰ پاگل تھے۔ پھر اس نے ان کے پاکستانی ہونے کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ اس طرح وہ مقدمہ جیت گئے تھے۔

جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم چند روز قبل لائبریری کی عقبی سڑک پر قیام کر چکے تھے، تو انہوں نے کہا: شکر کریں کہ آپ یہاں سے زندہ سلامت نکل گئے تھے۔ وہ ایک زمانے میں اسی علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ ایک شام دو سیاہ فام لٹیروں نے ان کو لوٹنے کے لئے راستہ روکا تھا۔ مگر وہ ان کو پہچان گئے تھے، کیونکہ دونوں لائبریری کے ملازم تھے۔ اس طرح ان کی جان بچ گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اس علاقے کو چھوڑ دیا تھا۔

واشنگٹن سے ہم بوسٹن (Boston) گئے، جو یورپ کا شہر لگتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ سوٹ کیس کو لاکر میں بند کر دیا جائے۔ مگر یہ دیکھ کر ایسا کرنے سے باز رہے کہ لاکر بالکل غیر محفوظ علاقے میں بنے ہوئے تھے اور مزید برآں ایک نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ انتظامیہ سامان کے چوری ہو جانے پر صرف دس ڈالر بطور معاوضہ ادا کرے گی۔ آسٹریا کے صدر مقام ویانا(Vianna) میں مسافروں کے سامان کو رکھوانے کا خاص انتظام موجود ہے۔ گویا بوسٹن صرف دیکھنے میں یورپی شہر لگتا تھا، وگرنہ یورپ میں رائج انتظامات کا فقدان ہے۔ ہمارے لیے کمرہ انیسوی صدی کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ریزرو تھا۔ کمرہ ڈائننگ ہال جتنا تھا، جس میں تمام فرنیچر کم و بیش سو سال پرانا، مگر بہت عمدہ حالت میں تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا، جیسے ہم کسی میوزیم میں رہائش پذیر ہیں۔ چونکہ ابھی ٹورسٹ سیزن شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے ہمارے سوا وہاں پر کوئی قیام پذیر نہیں تھا۔ اگلے روز ہم نے اندرون شہر اور بندرگاہ کی سیر کی، جہاں پر ان تین کشتیوں کی یادگار کے طور پر ایک کشتی لنگر انداز ہے، جو امریکی آزادی کی جنگ کے چھڑنے کا باعث بنی تھی۔ ان میں لائی جانے والی چائے کی پیٹیوں کو امریکہ کے مزدوروں نے کلونیل انگریزی حکومت کی

طرف سے لگائی جانے والی کسٹم ڈیوٹی کے جواب میں سمندر میں پھینک دیا تھا، جس کے سبب یہ واقعہ بوسٹن ٹی پارٹی (Boston Tea Party) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سولہویں صدی میں بوسٹن کی بندرگاہ امریکہ میں حبشیوں کی غلامی سے منسلک رہی۔ ان کو مغربی افریقہ سے لایا جاتا تھا، جہاں پر اسلام کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ ان غلاموں میں معتد بہ حصہ مسلمانوں کا تھا، جن کو ان کے سرداروں نے عرب تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو امریکہ میں اسلامی رسوم و رواج اختیار کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ یوں بھی اکثر لوگ ان پڑھ تھے اور اسلامی عبادات سے گہری واقفیت نہ رکھتے تھے۔ روایت ہے کہ بعض علاقوں میں چھپ چھپا کر یہ لوگ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر دھیرے دھیرے اسلام سے انکی وابستگی ختم ہوتی گئی اور انکو عیسائی بنالیا گیا، البتہ سیاہ فاموں کے چرچ الگ ہوتے تھے۔ آج بھی ایسے چرچ مل جاتے ہیں، جن میں صرف کالے امریکی جاتے ہیں۔

بلیک مسلم کی تحریک بیسویں صدی میں جاری ہوئی، جس کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ عیسائیت سفید فاموں کا مذہب ہے، جس کے ساتھ سیاہ فاموں کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمیں بوسٹن کی سڑکوں پر شام کے وقت سفید کپڑوں میں ملبوس بلیک مسلم ملے، جو ہر گزرنے والے سیاہ فام کو لٹریچر پیش کرتے تھے۔ مگر یہ لوگ ہمیشہ آٹھ دس کے گروہ میں نظر آئے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب یہ امر ہو کہ وہ صرف گروہ کی صورت میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کی اپنی دوکانیں پائی جاتی ہیں، جہاں پر صرف بلیک مسلم سامان خریدنے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ معاشی طور پر سفید فاموں سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

ہمارا اگلا پڑاؤ شکاگو (Chicago) تھا، جہاں پر ہم نے یونیورسٹی کے مہمان خانے میں کمرہ بک کرار کھا تھا۔ بوسٹن میں موسم خوشگوار تھا، مگر جب ہمارا طیارہ کلیولینڈ (Cleveland) کے ہوائی اڈے پر اترا، تو بارش ہو رہی تھی، جو شکاگو میں مزید تیز ہوتی گئی۔ سفر ہمیں شٹل کوچ اور انڈر گراونڈ سے کرنا تھا، جو ہمیں شہر کے عین درمیان تک لے جائے گی۔ ہماری گاڑی ائرپورٹ سے آنے والے مسافروں سے بھری ہوئی تھی، جن میں ہر نسل اور رنگ کے لوگ شامل تھے۔ مگر جوں جوں شہر کا علاقہ آتا گیا، سفید فام مسافر کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر ہمارے اردگرد صرف سیاہ فام رہ گئے۔ آخری اسٹیشن پر ہمارے ساتھ بمشکل دو درجن مسافر اترے۔ پتا چلا کہ ہمیں یونیورسٹی کے مہمان خانے تک جانے کے لیے بس لینی پڑے گی۔ بارش تیز تر ہوگئی تھی اور سڑکیں نالوں میں ڈھلتی جاتی تھیں۔ میں نے ایک سیاہ فام سے بس کے اڈے کا راستہ جاننا چاہا۔ اس نے اس امر کو بے حد فخر مندی جانا اور ہمیں وہاں تک پہنچا گیا، جہاں پر ہماری بس نے آکر رکنا تھا۔ بس کے سیاہ فام ڈرائیور نے کہا کہ ہمیں یونیورسٹی کے مہمان

خانے تک جانے کے لیے راستے میں بس بدلنی پڑے گی۔ چنانچہ اس نے ایک چوک پر جا کر بس روکی اور کہا کہ وہاں سے ہمیں سڑک پار کر کے دوسری طرف جانے والی بس کے اڈے پر جانا ہوگا۔ اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس نے کہا میں یہاں پر اتنی دیر تک کھڑا رہوں گا، جب تک آپ کی بس نہ آ جائے اور آپ اس میں سوار ہو کر روانہ نہ ہو جائیں۔ اگر بس پندرہ منٹوں تک نہ آئے، تو آپ میری بس کی طرف لوٹ آئیں اور میرے ساتھ سفر جاری رکھیں۔ میں آپ کو کسی دوسری بس میں سوار کرا دوں گا۔ ہمارے دلوں میں اس شخص کے لئے آج بھی عزت کے جذبات موجزن ہیں۔ ہماری بس دو چار منٹوں میں آ گئی، جو ہمیں مہمان خانے تک لے گئی۔ مہمان خانہ ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ میں تھا، جس میں کئی سو طالب علم اور پروفیسران رہتے تھے۔ مہمان خانے کے داخلے پر ایک آہنی جنگلا، دوہرا دروازہ اور دو مختلف قسم کے قفل لگے ہوئے تھے۔ ہمیں ایک ہدایت نامہ دیا گیا، جس کی رو سے ہمیں اپنا کمرہ ہر وقت مقفل رکھنا چاہیئے۔ شہر جانے کے لئے انڈر گراونڈ سے سفر کرنا چاہیں، تو عوامی انڈر گراونڈ میں سوار نہ ہوں، بلکہ دوسری گاڑی میں، جس کا ٹکٹ دوگنا مہنگا تھا، مگر جس کے ہر ڈبے میں مسلح محافظ متعین تھے۔

اگلے روز ہم آرٹ گیلری میں گئے، جس کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وقفے کے دوران ہم ایک کافی ہاؤس میں گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ایک بار ادا کی ہوئی قیمت میں ہماری پیالیاں بار بار بھری جاتی رہیں۔ آرٹ گیلری میں بچوں کے لئے ایک علیحدہ گیلری موجود ہے۔ داخلے کی فیس کم سے کم چار ڈالر تھی، مگر جو کوئی چاہے اس سے زیادہ ادا کر دے۔ جگہ جگہ ممبر شپ کے لیے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ اکثر تصویریں پرائیویٹ لوگوں کی وقف کردہ تھیں۔ Expressionist مصوروں کی تصویریں شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے میوزیم میں وہاں سے زیادہ ہوں گی۔ اس حصے پر الگ ٹکٹ لگتا تھا۔ البتہ چونکہ وہ منگل کا دن تھا، جب داخلہ مفت ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ مفت خوری اچھی لگی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آیا، تو ہم نے کسی چینی ریستوران میں جا کر کھانا کھانے کا ارادہ کیا۔ سڑک پر میں نے ایک شخص سے چائنا ٹاؤن جانے کا راستہ جاننا چاہا۔ اس نے کندھوں کو اچکا دیا اور آگے نکل گیا۔ اس دوران میں ایک شخص ہمارے پاس سے گزرا، جس نے میرا سوال سنا تھا۔ وہ چند قدم آگے نکل چکا تھا، مگر لوٹ کر آیا اور اس نے کہا اگر میں آپ کی جگہ پر ہوں، تو بالکل چائنا ٹاؤن نہ جاؤں۔ وہ محفوظ علاقہ نہیں ہے۔ اگر آپ کسی اچھے ریستوران میں جانا چاہتے ہیں، تو ایک بلاک آگے بہت عمدہ ریستوران پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ البتہ ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ اپنی باری کے آنے کا انتظار کرنا پڑا۔ ہم نے دیکھا کہ بعض لوگ ریستوارن سے باہر کسی ٹیلی فون بوتھ سے فون کر کے سیٹ ریزرو کروا کے آتے تھے اور ان کو انتظار کرنے والوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ہمیں لگ

بھگ نصف گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ مگر کھانا اس قدر لذیز تھا کہ انتظار کرنے کا ہمیں کوئی رنج نہ رہا۔

پروگرام کے مطابق ہمارا اگلا پڑاؤ نیو اورلینز (New Orleans) تھا۔ مگر عین ان دنوں میں وہاں پر سیلاب آیا ہوا تھا اور آدھا شہر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے ہم نے وہاں جانے کی بجائے کیلی فورنیا (California) کا رخ کیا، جہاں سے ہمیں نیر جہاں کی دعوت ملی تھی۔ راستے میں ہمیں منیاپولس (Minneapolis) میں جہاز بدلنا تھا۔ وہاں پر صبح سے برف باری ہو رہی تھی۔ اور روشنی اتنی کم تھی کہ طیاروں کا اترنا اور پرواز کرنا آدھا دن بند رہا تھا۔ ہمارا جہاز پہلا تھا، جس کو وہاں پر اترنے کی اجازت ملی تھی۔ کیلے فورنیا جانے والے جہاز صبح سے رکے ہوئے تھے۔ ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ انتظار کرنا تھا، جس کی گھڑیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔

شام پڑنے تک ہم لاس اینجلز (Los Angeles) پہنچ گئے۔ نیر جہاں کی بیٹیاں عظمیٰ، صہبا اور طاہرہ، جن کو میں نے ان کے بچپن میں دیکھا تھا، اب جوان ہو چکی تھیں۔ تینوں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ نیر ایک لبارٹری میں کام کرتی تھیں۔ اردو ادب کے لئے ان کا جوش و خروش نہ صرف موجود تھا، مجھے اس میں پہلے سے زیادہ جوش نظر آیا۔ انہوں نے دوسرے ادب دوستوں کے تعاون سے اردو مرکز قائم کر رکھا تھا، جس کے تحت سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا، جس میں شرکت کرنے کے لیے شعراء ہندو پاک سے بھی بلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی آئے دن ادبی محافل منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ہماری آمد پر انہوں نے ایک محفل کے انعقاد کا اعلان کر رکھا تھا، جو ڈاکٹر جعفر انسان کے کشادہ گھر پر ہوئی۔ جس میں کم و بیش ایک سو افراد نے حصہ لیا۔ اتنے لوگوں کا تھوڑے نوٹس پر اکٹھا ہو جانا ایک معجزہ تھا۔ مشاعرے سے پہلے سب حاضرین کو کھانا کھلایا گیا، جس کے لئے کسی سے چندہ نہیں لیا گیا۔ تمام اخراجات غالباً ڈاکٹر جعفر انسان نے اٹھائے، جن کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں سننے میں آئیں۔ ان کی عادت تھی کہ عین نو بجے سو جاتے تھے، خواہ ان کے ارد گرد شور شرابا ہی کیوں نہ برپا ہو۔ اس روز بھی وہ بڑے کمرے کے ایک کونے میں زمین پر لیٹ کر سو گئے۔ نیر جہاں کے گھر ایک محفل میں انہوں نے اچانک نیر سے پوچھا۔ تمہارا بیڈ روم کہاں ہے؟ پھر وہاں جا کر سو گئے۔ وہ ہائی وے پر کار بالکل نہیں چلاتے تھے۔ ہمیں وہ نیر کے گھر پر پہنچانے کے لئے گئے، تو بائی لین کو استعمال کرتے ہوئے، جن پر دوگنا وقت لگ جاتا ہے

انسان لاس اینجلز جائے اور ہالی وڈ نہ دیکھے، یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ ہم نے ایک پورا دن وہاں کے یونیورسل اسٹوڈیوز میں گزارا۔ میری یادداشت میں اس چھوٹے سے تالاب کی تصویر محفوظ ہے، جس میں وائٹ ویل نامی فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ سمندر میں نہیں بنائی گئی، بلکہ ایک ننھے منے تالاب میں، جس میں کوئی لہر نہیں اٹھتی اور نہ طوفان برپا ہوتا ہے۔ دوسرا دن

ڈزنی لینڈ میں گزرا، جو بنائی تو بچوں کے لئے گئی تھی، مگر جس میں جا کر بڑے بھی بچے بن جاتے ہیں۔
تیسرا دن ہم نے پاول گٹی(Paul Gitty) کے میوزیم میں گزارا، جس کی عمارت اطالوی طرز تعمیر کا شاندار نمونہ ہے اور جو اپنی خوبصورتی اور سنگ مرمر کے کام کے سبب اپنا جواب نہیں رکھتی۔ وہاں پر دنیا بھر کی تہذیبوں کے نہایت عمدہ شاہکار نمائش کی خاطر رکھے ہوئے ہیں۔اس میوزیم کے وقف کی رقم سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ دنیا کے کئی ملکوں کا سالانہ بجٹ اس کے مقابلے میں بچوں کا کھیل لگتا ہے۔ چوتھا دن ہم نے ایک باغ میں گزارا، جہاں پر دنیا بھر سے پودے لگا کر لگائے گئے ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں اور اتنے متنوع پھول ہم نے کسی دوسرے باغ میں نہیں دیکھے۔کم وبیش پچاس مور اس باغ میں آباد ہیں، جو اپنے ناچ سے دیکھنے والوں کو جادو کی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔
ہماری اگلی منزل سان فرانسسکو(San Francisco) تھی، مگر چونکہ ہماری ہوائی کمپنی کا جہاز لاس اینجلز سے وہاں پر براہ راست نہیں جاتا تھا، اس لیے ہم پہلے سان فرانسسکو کے اوپر سے پرواز کر کے سیٹل (Seattle) گئے ، جہاں سے جہاز بدل کے واپس سان فرانسسکو جانا پڑا۔سیٹل کے ہوائی اڈے پر لاروش(La Roche) کے چیلے اسٹینڈ لگائے ہوئے تھے اور ایٹم انرجی کے حق میں بول رہے تھے۔ یہ تحریک سویٹ یونین کے خلاف یورپ میں بھی مختلف ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے پروپیگنڈا کرتی ہے۔ ایک لڑکی بورڈ اٹھائے ہوئے تھی، جس پر جلی حروف میں Build beam لکھا ہوا تھا۔ weapons or learn Russian۔اسٹیند پر ان کا رسالہ Executive Inteligens Service رکھا ہوا تھا، جو میری انسٹی ٹیوٹ میں بھی آتا تھا۔اس میں عموماً بے تکی باتیں ہوتی تھیں، مگر کبھی کبھار کارآمد معلومات بھی مل جاتی تھیں۔ دو گھنٹوں کے بعد ہمیں سان فرانسسکو جانے کے لئے طیارہ ملا۔ جہاں پر پہنچ کر ہم نے اپنا سامان وصول کیا، تو ایک سوٹ کیس ٹوٹا ہوا تھا۔ہم نے کلیم درج کرایا، تو ہوائی کمپنی کی ملازمہ نے ہرجانہ کے طور پر بیس ڈالر پیش کیے۔ میں نے یہ رقم لینے سے انکار کیا، تو رقم دوگنی کر دی گئی۔ جب میں نے یہ رقم بھی لینے سے بھی انکار کیا، تو محترمہ نے کہا اس سے زیادہ رقم دینے کی وہ مجاز نہیں۔ میں نے کہا اپنے افسر اعلیٰ سے بات کرواور کہو کہ مجھے ڈالر درکار نہیں ہیں، بلکہ اپنا سفر جاری رکھنے کے لئے سوٹ کیس چاہیئے۔ بالآخر افسر ہماری بات مان گیا۔اس نے کہا سوٹ کیس آپ کو شہر میں فلاں جگہ پر ملے گا۔ہم نے شہر جانے والی بس لی اور وہاں پر پہنچ گئے۔مگر شام ہو جانے کے سبب اسٹور بند تھا۔ ہمارا ہوٹل اسی علاقے میں تھا، اس لئے ہم نے اگلی صبح اپنی قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کی استقبالیہ میں کہا گیا کہ اگر ہم نے کھانا کھانے کے لئے باہر جانا ہو، تو دائیں ہاتھ کی طرف بالکل نہ جائیں۔ البتہ بائیں طرف ایک چینی ریستوران میں جا سکتے ہیں۔اس بات کے پیچھے کیا چیز پوشیدہ تھی،

اس کو ہم اگلی صبح جان پائے۔ جب سویرے سویرے پولیس کی کاریں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پر آن کر رکیں۔ہم نے اپنی چالیسویں منزل کی کھڑکی میں سے نیچے دیکھا،تو بد معاشی کا ایک اڈا جل رہا تھا اور ایک شخص پولیس سے بچنے کے لئے مکانوں کی چھتوں کے اوپر لٹکتا پھرتا تھا۔ نیچے سیاہ فاموں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا تھا، جو پولیس کے سپاہیوں کو غلط اطراف میں بھیج رہے تھے۔ہمیں اسی علاقے میں سے گزر کر سوٹ کیس بدلنے کے لئے اسٹور تک جانا تھا۔ جب میں ٹوٹا ہوا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے وہاں سے گزرا،تو ایک سڑک کی نکڑ پر چار پانچ سیاہ فام لفنگے کھڑے تھے۔ہم ان کی طرف توجہ دیئے بغیر پاس سے گزر رہے تھے، جب ایک نوجوان نے، جو اپنے سنگیوں سے مذاق کر رہا تھا، پکار کر مجھ سے پوچھا۔ Which Bank did you rob this morning? ۔ اس پر سب کھکھلا کر ہنس دیئے۔ہم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

سان فرانسسکو ایک جزیرہ نما پر آباد ہے،جس تک پہنچنے کے لیے گولڈن گیٹ نامی پل،جس کی تصویر ساری دنیا میں جانی جاتی ہے، پار کرنا ہوتا ہے۔اس کی لمبائی ایک میل اور اونچائی ۱۱۶ میٹر ہے۔ عام طور سے خودکشی کرنے والوں کے لئے یہ پل مقناطیس کی طرح ہے۔اس شہر کا چائنا ٹاؤن خاص اہمیت کا حامل ہے، جہاں پر انیسویں صدی میں قلی بن کر امریکہ آنے والے چینیوں کی آل اولاد آباد ہے۔تیسری قابل ذکر چیز اس شہر کے اندرونی حصے میں چلنے والی ٹرام ہے،جس کو آہنی رسے کھینچتے ہیں اور جو زمین میں لگی ہوئی کلوں کی مدد سے آگے بڑھتی ہے۔اس کی رفتار پندرہ میل فی گھنٹہ بتائی جاتی ہے، جس کے سبب سواریاں آسانی کے ساتھ چلتی ہوئی ٹرام سے اتر اور سوار ہو سکتی ہیں۔ چونکہ اندورن شہر اونچی نیچی زمین پر آباد ہے،اس لیے اس سے بہتر ذریعہ ٹرانسپورٹ بھلا کیا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ ٹرام کی وجہ سے شہر میں ٹریفک کی رفتار بہت سست ہے۔مگر چونکہ ٹرام شہر کے ایک محدود علاقے میں چلتی ہے اور اس کے سبب ٹورسٹ سارا سال شہر پر ہجوم کر کے آتے ہیں،اس لیے لوگ ٹریفک میں رکاوٹ کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔سارا دن سان فرانسسکو میں گھومنے کے بعد شام کا دھندلکا ہونے پر ہم نے اپنی اگلی منزل لاس ویگاس (Las Vergas) جانے والی پرواز لی۔

لاس ویگاس کے ہوائی اڈے سے ہم نے ہوٹلوں کے اشتہاری بورڈ پر سے ایک ہوٹل کا انتخاب کر کے فون کیا۔ ہمیں کمرہ مل سکتا تھا اور وہ بھی بہت سستے داموں پر۔کہا گیا ہوائی اڈے سے چلنے والی کسی ویگن میں آ جائیں۔اس پر آٹھ ڈالر لگیں گے۔جس میں سے چھ ڈالر ہوٹل کی طرف سے واپس مل جائیں گے۔ ویگن کیا تھی، ایک چھ گز لمبی کار تھی،جس میں سات آٹھ مسافروں کے بیٹھنے کے لیے جگہ تھی۔ ڈرائیور نے ہمارے ہوٹل کا نام غلط سمجھا اور ہمیں اس نام سے ملتی جلتی دوسری جگہ پر اتار دیا اور

دوسرے مسافروں کو ان کے ہوٹلوں پر پہنچانے کے لیے آگے چلا گیا۔ جب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو ویگن جا چکی تھی۔ اس نے ہمیں جوئے خانے پر اتار دیا تھا، جس کا ایک پورا ہال جوا کھیلنے والی مشینوں سے بھرا ہوا تھا، جن کو عرف عام ایک بازو والے اچکے کا نام دیا جاتا ہے۔ بے شمار لوگ ان مشینوں میں ڈالر ڈال کر اپنی قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ ہم نے ویگن کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔ میں نے ہوٹل میں فون کیا، تو انہوں نے کہا وہ ابھی سب ویگنوں کو وائرلیس پر پیغام دے رہے ہیں کہ ان میں سے جس ویگن نے ہمیں غلط جگہ پر اتارا تھا، وہ واپس جائے اور ہمیں درست ہوٹل میں پہنچائے۔ ہماری ویگن کے ڈرائیور نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ہمیں درست ہوٹل میں پہنچانے کے لیے پانچ منٹوں کے اندر پہنچ گیا۔ ہوٹل کی طرف سے بے شمار دوسرے فری کوپنوں کے ساتھ پچاس پچاس ڈالر کی مالیت کے فری کوپن ہمیں جوا کھیلنے کے لیے ملے۔ ان کی مدد سے لوگوں کو گھیرا جاتا ہے۔ جو کوئی جوا گھر میں جا کر کھیلنے لگ جاتا ہے، وہ فری کوپن کی رقم ہارنے کے بعد اپنی جیب سے پیسے داؤ پر لگانے لگتا ہے اور اکثر و بیشتر سب کچھ ہار کر دیوالیہ ہو کر باہر نکلتا ہے۔ ہم نے اس نادر موقعے سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ ہمیں اس ہوٹل میں صرف ایک رات گزار کر اگلے روز نیشنل پارکوں کی سیر کے لیے روانہ ہو جانا تھا، جو لاس ویگاس کے قرب و جوار میں پائے جاتے ہیں۔

ہم نے جس کمپنی سے کار بک کرا رکھی تھی۔ اس کا ڈرائیور ہمیں ہوٹل سے آ کر لے گیا۔ ہم جرمنی میں ہی کار کے لیے تمام اخراجات ادا کر چکے تھے۔ اب ہم سے ٹریفک انشورنس کے لیے ساٹھ ڈالر مانگے جا رہے تھے، جب کہ کاغذات کی رو سے ہماری ادا شدہ رقم میں سب کچھ شامل تھا۔ ان کی پڑتال کے بعد کمپنی کے منیجر نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا، مگر کار کے ساتھ امریکہ اور کینیڈا کے نقشے دیئے جانے کی جو ہدایت درج تھی، اس کو وہ پورا کرنے سے قاصر تھا، کیونکہ ان کے پاس ایسے نقشے نہیں تھے۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہم لینڈ اسکیپ کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگ کی وادی (Valley of Fire State Park) میں پہنچے، جس کی پیانو راک (Piano Rock) دور سے ہی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہی تھی۔ یہ سرخ چٹان نیلے آسمان کے نیچے دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کے بعد ایک سے ایک عجیب و غریب چٹانیں، جن کو لوگوں نے ان سے مماثلت رکھنے والی چیزوں کے نام دے رکھے ہیں، آتی چلی گئیں۔ ہاتھی نامی چٹان کی وجہ تسمیہ جاننے میں بالکل دقت نہیں ہوتی۔ مگر سات بہنوں کے نام سے مشہور ستونوں کو خدا جانے کیوں یہ نام دیا جاتا ہے۔ اس وادی میں سے میڈ جھیل (Lake Mead) کا ایک کنارہ دکھائی دیتا ہے۔ شام تک ہم Zion National Park کے عین دروازے پر واقع Springdale میں پہنچ گئے، جہاں پر شب بسری کا انتظام ایک چھوٹے سے فیملی

ہوٹل میں موجود تھا۔ کھانا ہم نے ایک قریبی ریستوراں میں کھایا، جو نہ صرف یہ کہ بہت لذیذ تھا، بلکہ اس کی پیش کش کا انداز نہایت مہذب تھا، جس کی توقع ہم امریکہ کے وائلڈ ویسٹ میں نہیں رکھتے تھے۔

اگلے روز ہم Virgin River کے پہلو بہ پہلو چلنے والی Zion Canyon Scenic Drive پر روانہ ہوئے، جو پورے پارک کی لمبائی میں چلتی ہے۔ مگر ہمیں پارک کی Weeping Rock تک جانا تھا، جس میں سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح گرتے ہیں۔ اب سنتے ہیں کہ کاروں کو پارک کے اندر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ ہمارے سفر کے وقت یہ سہولت موجود تھی۔ البتہ وہاں سے آگے جانے کے لیے واٹر پروف کپڑے اور لانگ بوٹ درکار تھے، جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ اس لئے ہم ایک مختصر سے علاقے کی پیدل سیر کرنے کے بعد پارک سے رخصت ہوگئے۔ یہاں پر دریا کے پانی نے عمیق درہ پیدا کر دیا ہے، جو سینکڑوں فٹ گہرا ہے۔ چٹانیں بعض جگہوں پر عمودی دیواروں کی طرح کھڑی ہیں۔ بعض چٹانیں عمارتوں اور مندروں کا تصور دیتی ہیں۔ اس وجہ سے زمانہ قدیم میں اس علاقے کو دیوتاؤں کا گھر قرار دیا جاتا تھا۔ جب مورمون (Mormon) اس علاقے میں آ کر آباد ہوئے، تو انہوں نے پرانے ریڈ انڈین ناموں کو بائیبل سے مستعار ناموں سے بدل دیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر ہم تیسرے پہر Bryce Canyon کے دہانے پر پہنچے۔ اس جگہ پر دیودار درختوں کے جنگل پھیلے ہوئے ہیں، جو یوٹا سٹیٹ (Utha) کے جنوبی حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہاں پر دریائے پاریا (Paria River) نے ایک گہرا درہ کاٹ کر بنا دیا ہے، جس میں عجیب و غریب شکل کی چٹانیں دکھائی دیتی ہیں، جن کو اوپر سے دیکھا جائے، تو یوں لگتا ہے کہ انسان رنگ برنگے پتھروں کے جنگل کر دیکھ رہا ہے، جن کا رنگ سورج کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ایک اٹھارہ میل لمبی سڑک اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، جہاں پر مختلف جگہوں پر نظارہ کرنے والے اڈے ہیں۔ سب سے دلچسپ وہ جگہ ہے، جہاں سے ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سطح مرتفع آٹھ سے نو ہزار فٹ اونچی ہے، جس کے سبب راتیں بہت سرد ہوتی ہیں۔ دن کے وقت بھی بعض اوقات دھند چھا جاتی ہے۔ چونکہ دیکھنے والے پتھروں کو اوپر سے دیکھتے ہیں، اس لئے دور دور تک نظر جاتی ہے۔ کہنے کو تو یہ کھڈ (Canyon) ہے، مگر دراصل چودہ ایمفی تھیٹر ہیں، جن کو اوپر سے دیکھا جائے، تو ریڈ انڈین کی اس کے بارے میں کہانی سچ لگنے لگتی ہے، جس میں بیان ہوا ہے کہ اس علاقے میں جانوروں جیسی مخلوق رہتی تھی، جو انسانوں کا روپ دھار سکتی تھی۔ چونکہ یہ برے لوگ تھے، اس لئے Coyote (شمالی امریکہ کا بھیڑیے جیسا جانور) نے ان کو پتھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اب تک اپنے چہروں پر مختلف رنگوں کا ملمع کئے ہوئے کھڑے ہیں۔ دوسری حکایتوں میں ان کو جن اور دیو گردانا جاتا ہے، جن کو

کسی نے جادو سے پتھر میں ڈھال دیا تھا۔ برلیس کینیون دوسرے سارے ایسے کھڈوں سے زیادہ خوبصورت ہے، جو اس علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم اگلے نیشنل پارک کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر اڑھائی گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد پارک سے صرف دس کلومیٹر پہلے پکی سڑک اچانک ختم ہو گئی، جو ہمارے نقشے کی رو سے تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ آگے جانے کا راستہ مسدود تھا۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ تھا کہ واپس لوٹیں اور راستے میں پڑنے والی پہلی آبادی میں ہوٹل تلاش کریں۔ ایسا ہوٹل سڑک کے کنارے پر مل گیا، جس کی مالکہ ایک بے حد خوبصورت نوجوان عورت تھی۔ مگر اس کی معلومات کا یہ حال تھا کہ اسے پتا نہ تھا کہ جرمنی کا ملک کس براعظم میں پایا جاتا ہے اور وہاں پر کون لوگ بستے ہیں اور کیا زبان بولتے ہیں۔ اس کے ناک نقشے سے نظر آ رہا تھا کہ اس کے آباءواجداد شاید کبھی جرمنی سے آئے ہوں گے۔ اس علاقے میں بھی مورمون Mormon بستے ہیں، جن کے ہاں تعدازدواج کا عام رواج ہے۔

صبح سویرے ہم وہاں سے روانہ ہو کر Lake Powel پہنچے، جو بہت وسیع و عریض ہے۔ مگر چونکہ ٹورسٹ سیزن نہیں تھا، اس لیے کوئی ریستوراں نظر نہ آیا۔ ہمیں قریبی قصبے Page جانا پڑا۔ وہاں پر ہمارا پہلی بار ریڈ انڈین سے آمنا سامنا ہوا۔ جن کے سٹور سے ہم نے کھانے کا سامان خریدا۔ جس چیز نے ہمیں متاثر کیا وہ اس اسٹور میں صفائی تھی، جب کہ عام طور سے ایسے چھوٹے قصبوں کے امریکن اسٹوروں میں بہت بے ترتیبی سے رکھی ہوئی اشیاء اور پھوہڑپن کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں سے روانہ ہو کر شام پڑنے تک ہم Navajo National Manument پہنچ گئے، جو کولوریڈو (Colorado) کی سطح مرتفع پر اریزونا (Arizona) کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ریڈ انڈین کے لیے مخصوص ہے، جس کے تمام انتظامات ان کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ ہم ریڈ انڈین گاؤں Betatakin دیکھنے کے لیے گئے، جو ایک چٹان میں نصف گنبد کی صورت میں آباد تھا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف ہے، جس کے سبب سردیوں میں سورج کی شعاعیں اندر آتی ہیں، مگر گرمیوں میں سایہ رہتا ہے۔ یہاں پر ہوپی ریڈ انڈین رہا کرتے تھے، جن کی روایات کے مطابق انسان ایک تیسری قسم کی مخلوق میں سے، جو زیرزمین رہتی تھی، ترقی کر کے موجودہ صورت میں ڈھلے تھے۔ اس گاؤں میں ۱۲۵ کمروں میں رہنے کے لیے جگہ پائی جاتی تھی۔ اس آبادی کے لوگ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ خشک سالی کے سبب وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ دوسری روایات کے مطابق یہاں پر بھی اناسازی (Anasazi) ریڈ انڈین رہا کرتے تھے، جن کے آثار اسی قسم کے چٹانوں کے اندر بنے ہوئے گاؤں میں ملتے ہیں۔ میری طالب علمی کے زمانے میں ہمبرگ یونیورسٹی میں ایک دو سمسٹروں کے لئے ایک

ریڈ انڈین لڑکی پڑھنے کے لیے آئی تھی، جس نے بتایا تھا کہ اس کے آباواجداد اریزونا کی سطح مرتفع کے رہنے والے تھے۔ رات ہم نے Kayente کے ایک ہوٹل میں گزاری۔

اگلی صبح ہم Monument Valley کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے، جو کاینتے سے بائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر راستہ کچا ہے، جس کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ریڈ انڈین، جن کے ہاتھ میں سارا انتظام ہے، یہاں پر ٹورسٹوں سے پیسے کمانے کے لیے ان کو اپنی جیپوں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ البتہ ہماری کار کو اس راستے پر کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس وادی کی زمین سرخ رنگ کی ہے، جس میں سے جگہ جگہ ستونوں کی طرح زمین کے تودے کھڑے ہیں، جن کو دیکھ کر انسان جان سکتا ہے کہ وہاں پر سطح زمین صدیوں قبل ان ستونوں کے برابر تھی۔ مگر ہوا، پانی اور شاید زلزلوں کے سبب جھڑتی چلی گئی اور ایک ہموار زمین بنتی چلی گئی۔ ایک جگہ پر چٹان کے اندر ایک سوراخ نظر آتا ہے، جس کی شکل انسانی کان جیسی ہے۔ دوسری جگہ پر ایک سوراخ گرتے ہوئے پانی کے قطرے کی طرح ہے۔ اس علاقے کی پیدل سیاحت کے لیے بہت وقت درکار تھا۔ سورج کی حدت بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے ہم نے کار میں ہی گھومنا پسند کیا۔ یوں بھی ہمیں اسی روز اپنی اگلی منزل Mesa Verde National Park پہنچنے کی فکر تھی، جس کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔

ہم پچھلے پہر Mesa Verde پہنچ گئے۔ اس ہسپانوی نام کا مطلب "ہرا بھرا میز" ہے، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ آبادیاں سرسبز پہاڑوں میں پائی جاتی تھیں اور وہاں کی زمین اپنی اونچائی (دو ہزار سے دو ہزار چھ سو میٹر) کے باوجود کسی میز کی طرح ہے۔ ان کے بیچوں بیچ گہرے کھڈ پائے جاتے ہیں، جن کی دیواروں میں چھ سو میٹر کی اونچائی پر ریڈ انڈین کی قوم اناسازی نے مکانات تعمیر کیے اور پورے گاؤں وہاں آباد کیے۔ جب ہم پہنچے، تو انفارمیشن آفس بند ہو چکا تھا۔ گویا ہمیں داخلے کا ٹکٹ نہیں مل سکتا تھا۔ مگر اس علاقے میں گھومنے پھرنے پر پابندی نہ تھی، جہاں سے انسان کھڈ کی دیوار کے اندر بنے ہوئے مکانات دیکھتا ہے۔ دیوار کے بالمقابل ایک تین کلومیٹر لمبی سڑک پائی جاتی ہے، جس کے مختلف مقامات پر سے کھڈ کی دیواروں کے اندر بنائے گئے مکانات اچھی طرح دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم اس نظارے سے شام تک لطف اندوز ہوتے رہے۔ البتہ گائیڈ کے ساتھ ان گاؤں میں جانے اور مکانات کو قریب سے دیکھنے کے لیے ہمیں دوسرے روز وہاں پر آنے کا شوق تھا۔ اس لیے رات ہم نے ایک موٹل میں گزاری، جہاں پر ایک سات آٹھ سالہ ریڈ انڈین بچی کونٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں کمرہ دیا اور ایک سوڈالر کا ٹریولنگ چیک وصول کیا۔ اس نے ہمیں ایک ریستوراں کے بارے میں بتایا، جہاں پر کھانے کے لیے یوں تو صرف پیزا (Pizza) ملتا ہے۔ مگر ان کی سلاد بار بہت اچھی ہے، جہاں پر ہم

اڑھائی ڈالر فی کس کے حساب سے قیمت ادا کر کے پیٹ بھر کر سلاد کھا سکتے ہیں۔اس کی بات درست تھی اور وہاں پر سلاد کی کم و بیش بیس مختلف اقسام رکھی ہوئی تھیں۔

اگلے روز ہم پھر میسا ویردے گئے تاکہ گائیڈ کی رہنمائی میں ایک گاؤں (Pueblo) میں اتریں، جو پہاڑ کی چٹان کے نیچے بنا ہوا تھا۔اس تک پہنچنے کے لیے سیڑھی استعمال کرنی پڑتی ہے،جس پر چڑھنا بندروں جیسی مہارت چاہتا ہے۔دلچسپ امر یہ تھا کہ وہاں کے باسیوں کو ابھی دھات کا استعمال نہیں آتا تھا۔اس کام کے لیے پتھر استعمال کیے جاتے تھے،جن کو وہ دریا میں سے نکال کر لاتے تھے۔مکانوں کی تعمیر کے لئے گارے کا استعمال ہوتا تھا۔دیواروں کی مضبوطی کے لیے ان میں پتھر بھی جڑے جاتے تھے۔یہ آبادیاں چھٹی صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی تک کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ مکانات چٹانوں کے اندر بنائے جاتے تھے،جن پر گویا ایک چھت پائی جاتی تھی،اس لیے بارش کا پانی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک گاؤں کے مکانوں میں دو صد کمرے تھے، جو گویا ایک بڑے قبیلے کی رہائش گاہ تھا۔مکان کئی منزلہ بھی تھے اور ان میں کھڑکیاں اور دروازے بھی لگائے جاتے تھے۔کمرے عام طور سے تین گز چوڑے اور چار گز لمبے ہوتے تھے۔چھتیں دھویں کی کالک کے سبب سیاہ تھیں۔ان کمروں میں سردی سے بچنے کے لیے لکڑی جلائی جاتی تھی۔ایسی پوشیدہ جگہ پر گاؤں آباد کرنا دشمن کے حملے سے بچنے کی خاطر بھی ہوسکتا ہے۔وہاں پر آباد قبیلے کا نام اناسازی بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے، کیونکہ نوایو انڈین (Navajo) کی زبان میں اس کا مطلب قدیمی دشمن ہے۔وہاں کی آبادی کے کسی وقت ان گھروں اور گاؤں کو چھوڑ کر چلے جانے کی وجوہات کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔بعض ماہرین کہتے ہیں کہ سردی سے بچنے کے لیے لکڑی کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ بارشوں کے بند ہو جانے کے سبب قحط سالی پڑ گئی تھی۔ یہ لوگ درختوں کی شاخوں سے چھابے وغیرہ بڑی مہارت سے بناتے تھے۔مٹی کے برتن بھی ملے ہیں،جن کی بناوٹ اور نقش و نگار سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں میں فنون لطیفہ کی طرف رجحان پایا جاتا تھا۔تیر اور کمان کا عام طور سے استعمال بتاتا ہے کہ وہ جانوروں اور پرندوں کا شکار کرتے تھے اور دشمنوں سے دفاع کرنے کے ڈھنگ سے بھی خوب واقف تھے۔ان کا لباس چمڑے کا ہوتا تھا،جس کو سینے کے لیے ہڈی کی سوئیاں استعمال ہوتی تھیں اور جانوروں کی انتڑیاں دھاگے کے کام آتی تھیں۔ ہر قبیلے کا اپنا قطعہ زمین تھا،جس پر کاشت کی جاتی تھی۔ان ساری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ ثقافتی طور پر ترقی یافتہ تھے،مگر ان کی ثقافت کا معیار ہماری قدیم دنیا کے مقابلے میں پست تھا۔

عام طور سے ماہرین کا قیاس ہے کہ یہ لوگ وہاں سے نکل کر آگے اپنے ہی رشتہ داروں کے

پاس جا کر آباد ہو گئے ہوں گے۔ یہ رشتہ دار Canyon de Shelly (جس کا تلفظ کینیون دے شائے ہے) میں رہتے تھے، جہاں پر بے شمار آبادیوں کے آثار ملے ہیں۔ ہماری اگلی منزل وہی تھی، جہاں پر ہم پچھلے پہر پہنچ گئے۔ مگر اب نیچے اترنے کے لیے وقت نہیں تھا، اس لیے اوپر سے ان آبادیوں پر نظر ڈالنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ نیچے جہاں پر دریا کے پانی نے ایک میدان بنا دیا ہے، وہاں پر ایک سو کے لگ بھگ ریڈ انڈین آباد ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کھڈ کی دیواروں میں، جو قلعے کی دیواروں کی طرح کھڑی ہیں، ان کے قدیمی گاؤں دکھائی دیتے ہیں، جو اب آباد نہیں ہیں۔ اس علاقے میں ایک غار میں ممیاں ملی ہیں۔ ۱۸۶۴ء میں ریڈ انڈین کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں یہاں پر ان کو گھیرے میں لا کر مارا گیا تھا۔ زندہ بچ جانے والوں کو وہاں سے تین سو میل دور فورٹ سمر (Fort Summer) لے جایا گیا۔ اس سفر کے دوران بے شمار ریڈ انڈین مر گئے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ واپس لوٹنے کے خواہشمند تھے۔ جب ان کو پانچ برسوں کے بعد لوٹنے کی اجازت ملی اور وہ واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے، تو زندہ بچ کر اپنے وطن لوٹنے والے آدھے بھی نہ تھے۔ یہ علاقہ ان کے نزدیک مقدس ہے، جہاں پر ان کی وہ غار پائی جاتی ہے، جس میں ان کے آباء واجداد کی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہاں پر سفید فام امریکنوں کو داخل ہونے کی ممانعت ہے۔ چونکہ قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں پائی جاتی تھی اس لیے ہمیں ایک مہنگے ٹورسٹ ہوٹل میں رات بسر کرنا پڑی۔

اگلے روز ہم سویرے سویرے Grand Canyon کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے، جہاں تک پہنچنے کا راستہ خاصا لمبا تھا۔ سڑک اچھی تھی اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ امریکہ میں ۵۵ میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار ممنوع ہے۔ مگر عام طور سے کاریں اس سے دوگنی رفتار میں چلتی ہیں۔ پھر دوسری چیز ہم نے یہ نوٹ کی کہ ہمیں اس علاقے میں سیاہ فام لوگ نظر نہیں آئے۔ صرف ایک بار ایک سیاہ فام ملا، جو ہماری طرح ٹورسٹ تھا۔ ہندوستانی شکل وصورت والے لوگ کہیں پر دیکھنے میں نہیں آئے۔ جب کہ مجھے پتا ہے کہ ہر سال میرے ہزاروں ہموطن امریکہ جاتے ہیں۔ مگر شاید نیشنل پارکوں کو دیکھنے میں وہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ راستے میں ہمیں گاہے بگاہے ایسے مکانات سڑک پر رینگتے ہوئے ملے، جن کو ان کے مالک ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کر رہے تھے۔ یہ مکان لکڑی کے بنے ہوئے تھے، جیسا کہ امریکہ میں اکثر مکانات ہوتے ہیں، مگر ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کے نیچے پہیئے لگے ہوئے تھے۔ اس لیے جب کبھی نقل مکانی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو مکان کو کار کے پیچھے باندھ کر چل دیتے ہیں۔ البتہ گرینڈ کینیون کے علاقے میں ہم نے پتھروں سے بنے ہوئے مکانات بھی دیکھے۔

گرینڈ کینیون ہمارے سیاحتی سفر کا نقطہ عروج تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی غیر معمولی ہے۔

اوپر دہانے پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے، تو گہرائی ایک میل سے تین میل تک، چوڑائی دس میل اور لمبائی تین سو میل کے لگ بھگ ہے۔ نیچے دریائے کولوریڈو بہتا ہے۔ زمین چونکہ بھر بھری ہے، اس لیے ہزاروں سال سے اس کھڈ کی شکل وصورت بدلتی چلی جاتی ہے۔ نیچے دریا کی سطح پر ہوپی ریڈ انڈین کے گاؤں پائے جاتے ہیں، جو سینکڑوں برسوں سے وہاں پر رہائش پذیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کھڈ میں سے نکلے ہیں اور ان کی روحیں اس میں رہتی ہیں۔ اوپر جہاں پر ہم کھڑے تھے، وہاں پر سردیوں میں برف باری ہو جاتی ہے۔ مگر نیچے جہاں پر دریا بہتا ہے، وہاں پر درجہ حرارت سردیوں میں بھی ۳۵ سینٹی گریڈ رہتا ہے۔ گرینڈ کینیون میں بے شمار جانور اور پرندے پائے جاتے ہیں، جو کسی دوسری جگہ پر دیکھنے میں نہیں آتے۔ یہاں پر پارک میں ٹورسٹ ہوٹل پائے جاتے ہیں، جو بہت مہنگے ہیں اور ہم جیسے اکیلے دوکیلے سفر کرنے والوں سے اونچا کرایہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ہم نے قریبی شہر Williams میں رات گزارنے کا ارادہ کیا، جہاں پر ایک سستا موٹل ہماری راہ تک رہا تھا۔ یہاں پر لوگ گرمیوں میں گرینڈ کینیون کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور سردیوں میں برف پر سکیئنگ کرنے کی خاطر۔ اردگرد کے پہاڑوں پر سرما کی برف ابھی نہیں پگھلی تھی۔

ساتویں روز ہمارا راستہ سب دنوں سے زیادہ لمبا تھا۔ ہمیں Hoover Dam کو پار کرتے ہوئے Lake Mead کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر لاس ویگاس جانا تھا۔ اس ڈیم پر ۱۹۳۱ء میں کام شروع ہوا تھا۔ تکمیل تین برس میں وقت سے پہلے ہوگئی۔ اپنے وقتوں میں اس کو دنیا کا ماڈرن ترین ڈیم قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے ذریعے دریائے کولوریڈیو کو قابو میں کیا گیا تھا۔ وگرنہ سال کے سال اس میں طغیانی آتی تھی۔ اس ڈیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پرائیوٹ کمپنی نے بنایا تھا۔ جس کو بجلی بیچنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس کی لمبائی ۳۷۹ میٹر ہے اور اونچائی ۲۲۱ میٹر۔ اس کے بننے کے سبب جو جھیل پیدا ہوئی، وہ ۱۷۰ کلومیٹر لمبی اور ۱۸۰ میٹر گہری ہے۔ ہمارا واپسی کا راستہ اسی میڈ جھیل کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ شام پڑنے تک ہم لاس ویگاس میں پہنچ گئے۔ بلکہ اسی شام ہم نے اپنی جرمنی واپسی کی بکنگ میں تبدیلی بھی کرالی۔ کیونکہ راستے میں اب ہم نیویارک میں رکنے کی بجائے سیدھے ہمبرگ جانا چاہتے تھے۔ وہاں پر پہنچنے کے صرف دو روز بعد اوتا کو ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا تھا۔

ہندوستان یاترا

وسط فروری ۱۹۸۴ء کو نہرو یونیورسٹی دہلی میں ایک کانفرنس ادبی ترجمے کے بارے میں منعقد

ہوئی، جس میں میں نے شرکت کی۔ میرے لیے اس میں دو اسباب سے دلچسپی کا سامان پایا جاتا تھا۔ اول تو یہ کہ میں اس زمانے میں جرمن ادب سے تراجم کر رہا تھا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اس طرح ہندوستان یاترا کا موقع مل رہا تھا۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ اس طرح بنوایا گیا کہ پاکستان سے ہوتا ہوا جاؤں اور واپسی کے راستے میں وہاں پر دو ہفتوں تک قیام کر سکوں۔

کانفرنس میں پانچ سو ادیبوں نے شرکت کی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے اردو ادیبوں کی نمائندگی کسی نے نہ کی۔ بس ایک دیوندر ستھیارتھی اپنی لمبی داڑھی اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں سمیت موجود تھا۔ ہاتھوں میں اس نے کاغذات کا ایک پلندہ اٹھایا ہوا تھا، جس کو وہ اپنی توند پر تھامے ہوئے پھرتا تھا۔ لیکچروں میں کہیں پر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر کھانے کے وقت موجود ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا فوک کہانیاں جمع کرنے کا کام ابھی تک جاری ہے۔ کہنے لگا میں جمع نہیں کرتا، ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس نے ایک اچکن قسم کا کوٹ پہن رکھا تھا، جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کی خاصی بڑی توند پر ایک میلا سا کرتہ پھیلا ہوا تھا۔ بال تو خیر اس کے بڑے تھے ہی، اس کے ناخن بھی عرصہ ہوا نہیں کاٹے گئے تھے۔ آنکھوں پر ایک دبیز چشمہ تھا، جو اکثر اس کی ناک کی پھنک پر ڈھلکا ہوتا تھا۔ مجھ سے پنجابی میں باتیں کرتا رہا۔ وہ پٹیالے کے قریب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ مگر ساری عمر شہروں میں گزری تھی۔ پہلے لاہور میں پھر تقسیم ملک کے بعد دہلی میں۔ انہی دنوں دہلی کے رسالے "کتاب نما" میں اس پر ایک گوشہ چھپا ہوا، جسے وہ ہر کسی کو دکھاتا پھرتا تھا۔

اس کے ساتھ میرا تعارف پنجابی ناول نگار شمشیر سنگھ نرولہ نے کرایا تھا۔ دونوں کی آپس میں لاہور کے زمانے سے دوستی تھی۔ نرولہ نے سنایا کہ چالیس کی دہائی میں یورپ سے ایک کتاب آئی، جس میں چار بائیں بازو کے ادیبوں کی تصویریں تھیں۔ وہ سارے کلین شیوڈ تھے۔ نرولا نے وہ تصویر ستھیارتھی کو دکھائی اور کہا اگر تم اپنے آپ کو بائیں بازو کے ادیبوں کے ساتھ ہم رنگ کرنا چاہتے ہو، تو پھر تمہیں داڑھی منڈھوا دینی چاہیئے۔ دوسرے ادیبوں نے اس بات کی تائید کی اور اسے پکڑ کر ایک نائی کے پاس لے گئے، جس نے اس کی داڑھی مونڈھ ڈالی اور سر کے بال بھی کاٹ دیئے۔ ستھیارتھی گھر گیا، تو بیوی نے اس کے لتے لیے۔ اس نے کہا تمہارا بیڑا غرق ہو۔ یہ تم نے کیا کیا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال تو تمہارا ٹریڈ مارک تھا، جس کے سہارے پر ہماری دال روٹی چلتی تھی۔ اب تمہیں کوئی گھاس بھی نہیں ڈالے گا۔ اس پر بیچارے کو مہینوں تک گھر میں بند ہو کر بیٹھنا پڑا۔ جب بال پھر لمبے ہو گئے، تو گھر سے نکلا اور ان سب کو، جنھوں نے اس کو بال منڈھوانے کی صلاح دی تھی، مارنے کو دوڑا۔

پروفیسر نرولا پنجابی میں کئی ناولوں کے مصنف تھے۔ ابتدا میں اردو میں بھی لکھتے رہے تھے۔ مگر

تقسیم ملک کے بعد پنجابی کے ہو رہے تھے۔لدھیانہ کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہے تھے۔ پڑھاتے انگریزی ادب تھے اور اکثر پنجابی بولتے بولتے انگریزی پر آ جاتے تھے۔انہوں نے میرا تعارف سکھ ادیبوں سے کرایا۔ پوری کانفرنس کے دوران انہوں نے مجھے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ مجھے اپنی دریافت قرار دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم مل کر پنجابی افسانوں کا جرمن میں ترجمہ چھاپیں۔مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل نہ ہو سکا۔انہوں نے مجھے کرتار سنگھ دگل سے ملوایا، جو میری طرح پٹھوہار کے رہنے والے ہیں اور جن کے ناولوں میں ایک آدھ کردار ہمیشہ پٹھوہاری بولتا ہے۔ وہ اکیڈمی آف لیٹرز کے رکن تھے۔انہوں نے کہا ان کو گھرانا آدھا مسلمان ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کر رکھی تھی۔نرولا نے میرا تعارف ایک نوجوان سکھ ادیب گلزار سندھو سے کرایا، جو مجھے دہلی میں ادیبوں کے چائے خانوں میں لیے لیے پھرا۔اس نے مجھے سکھ مذہب پر اسلامی اثرات کے بارے میں بہت سی تفصیلات بتائیں۔اس نے اور دوسرے سکھ ادیبوں نے جس محبت وخلوص کا اظہار کیا، اس کی یاد آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔

میں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرا ہوا تھا۔ کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور میں ملک کی سیر و سیاحت کا پروگرام بنا رہا تھا، جب ایک شام حسن رضوی اور سعادت سعید بھی وہاں پر آن نکلے۔ دونوں انبالہ میں مشاعرہ پڑھنے آئے تھے، مگر وہاں کا ویزا نہ مل سکا تھا۔ان کی خاطر سہارن پور میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ رکھ لیا گیا تھا۔مگر ان کی آمد کا مقصد پورا نہ ہوا تھا۔ وہاں سے وہ دہلی آ گئے تھے۔انہی دنوں میں احمد فراز بھی دہلی آئے ہوئے تھے اور ان کے لیے شعری نشستیں "ایوان غالب" اور "غالب اکیڈیمی" میں رکھی گئی تھیں۔ان کے ساتھ حسن اور سعادت کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وہاں پر ہماری ملاقات کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ساتھ ہوئی، جنہوں نے بتایا کہ ایک نشست نیرنگ ساقی کے گھر پر منعقد ہو گی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ بیدی میرے ہموطن ہیں، کیونکہ ان کا آبائی گاؤں کلر سیداں ہمارے گاؤں چنگا بنگیال سے صرف سات میل کے فاصلے پر ہے۔ان کو پٹھوہاری بھولی نہیں تھی۔مگر ان کے گھر پر اب نہیں بولی جاتی تھی۔ان کے دادا سر کھیم سنگھ بیدی، جن کا تعلق گرو بابا نانک کے خاندان سے تھا، مشہور مذہبی پیشوا گزرے ہیں۔ساقی کے گھر پر ہمیں لے جانے کی ذمہ داری سحر نے اٹھا رکھی تھی۔

جب ہم ساقی کے ہاں پہنچے، تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہاں پر جیسے کسی بارات کے استقبال کے انتظامات ہو رہے تھے۔ پکوان پک رہے تھے اور گھر بار والے اپنے بہترین لباس میں ملبوس پاکستانی شاعروں کو ملنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مہمان دھڑا دھڑ آتے چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے میزبان کے دو جڑواں مکان ادب کے پرستاروں سے بھر گئے۔ وہاں پر اس روز فکر تونسوی بھی پہنچ گئے،

جن سے ملنے کی خواہش میں ہم "انقلاب" اخبار کے دفتر میں پہنچے تھے۔ مگر پتا چلا تھا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ خاصے نحیف لگ رہے تھے۔ کسی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح گلے لگ کر ملے۔ مشاعرہ کے شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ سحر کمرے کے وسط میں چوکڑی لگا کر بیٹھ گئے۔ واضح تھا کہ ان کی موجودگی میں اور کوئی صدر محفل ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ مشاعرہ احمد فراز کی آمد کے لمبے انتظار کے بعد شروع ہوا۔ ایک سے ایک عمدہ غزلیں سننے کو ملیں۔ بعض شعراء نے اپنا کلام ترنم سے سنایا۔ ان میں جمیلہ بھی شامل تھیں۔ وہ جتنی خود خوبصورت تھیں، اتنی ہی ان کی آواز بھی دلکش تھی۔ ان کی غزل نے سماں باندھ دیا۔ سعادت سعید میرے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پھر اپنی ایک طویل نظم سنانی چاہتا ہے۔ اسے اس خودکشی سے روکنا آسان کام نہ تھا۔ اس نے میرے مشورے کے برخلاف نظم سنا ہی دی۔ چونکہ داد نہ ملی، اس لیے شاید مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر سحر سے کہا منیر سے بھی کچھ سنا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ میری نثری نظمیں پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں، سنانے کے لئے نہیں۔ بتایا گیا کہ دہلی میں ڈاکٹر محمد حسن اور دوسرے نثری نظم لکھنے والے مشاعروں میں اپنی نظمیں سناتے ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی کوئی نظم یاد نہیں اور ان کی نقلیں میں اپنے ساتھ نہیں رکھتا ہوں۔ اس طرح میری جان بخشی ہوئی۔

احمد فراز نصف شب کے لگ بھگ پہنچے اور سحر کے پہلو میں براجمان ہو گئے اور اپنی نیم وا آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ کسی نے فکر تونسوی کا نام لیا، جو دوسری دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ فراز چونکے، پوچھا آپ فکر تونسوی ہیں؟ جواب اثبات میں پا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھے۔ کہنے لگے فکر صاحب ہم آپ کی چیزیں اس وقت سے پڑھتے آئے ہیں، جب ہم مدرسہ میں طالب علم ہوتے تھے۔ آپکی قدر ہمارے دلوں میں بے انداز ہے۔ فکر کسر نفسی سے کام لینے لگے، تو فراز نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ وہ اس بات پر بے حد خوش اور فخر مند ہیں کہ ان کی ملاقات فکر تونسوی کے ساتھ ہو گئی ہے۔ مجھے فراز پر بے حد پیار آیا، کیونکہ انہوں نے ہر وہ بات کہہ دی تھی، جو ہم میں سے ہر کوئی کہنا چاہتا تھا، مگر نہ کہہ پایا تھا۔ اسکے بعد فراز نے غزلیں سنائیں اور مشاعرہ لوٹ لیا۔ فکر نے کچھ نہ سنایا، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے شعروشاعری سے لکھنے کی ابتداء کی تھی۔

حسن رضوی، سعادت سعید اور مجھے رہائش گاہ پر پہنچانے کی ذمہ داری جمیلہ نے لی۔ جب ہم انکی کار میں بیٹھنے لگے، تو انہوں نے اپنے شوہر کرنل اروڑا سے متعارف کرایا، جو محکمہ دفاع میں کسی اونچے عہدے پر فائز تھے۔ جمیلہ نے شرارت سے ہماری طرف دیکھا اور کہا پتا ہے کافر مارا ہے۔ ان کے شوہر نے اس بات کی تصدیق کرنے سے انکار کرنا چاہا، تو جمیلہ نے یاد دلایا کہ نکاح سے قبل انہوں نے کلمہ پڑھا تھا۔ اروڑہ نے کہا رات گئی، بات گئی۔ وہ خود شاعر تو نہیں، مگر شعروشاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔ اس

بات کا پتا ہمیں تب چلا جب وہ ہمیں سیدھے اپنے گھر لے گئے اور دوسرے مشاعرے کی طرح رکھ دی۔

دہلی میں بہت سے ادیبوں سے ملنا ہوا۔ مگر امرتا پریتم سے ملاقات یادگار رہے گی۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں، جب ان کی کتاب "نویں رت" آئی تھی اور ہم نے ان کی نظم تواریخ کو پڑھا تھا۔ ہم ان کے گھر پر گئے۔ وہ بہت محبت سے ملیں۔ اپنی زندگی اور ادب کے بارے میں بتاتی رہیں۔ یہاں تک کہ ساحر لدھیانوی تک کا ذکر آیا۔ مجھے شمشیر سنگھ نرولا نے بتایا تھا کہ سکھوں نے امرتا کو اس کی نظم کی وجہ سے بہت لعن طعن کیا تھا، کیونکہ اس نے گرو بابا نانک کی بجائے وارث شاہ کو دہائی دی تھی۔ ان دنوں اس کے خلاف کسی ادیب نے مقدمہ کر رکھا تھا، کیونکہ اس نے اپنی ایک کتاب کا عنوان "زندگی نامہ" رکھا تھا۔ یہ عنوان اس سے قبل وہ ادیب اپنی آپ بیتی کو دے چکے تھے۔ اس نے ہمیں اس بارے میں ایک وضاحتی بیان لکھ کر دینے کو کہا، جس میں بیان کیا گیا ہو کہ یہ عنوان اس سے قبل اردو اور فارسی ادب میں استعمال ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں دوسرے روز اس مضمون کا پرچہ لکھ کر دیا، جس کو لینے کے لیے امرتا کا خاوند امروز میرے پاس گیسٹ ہاؤس میں آیا تھا۔ وہ لائل پور کا رہنے والا ہے اور اس نے اردو رسم الخط اسکول میں سیکھا تھا۔ امرتا صرف گورمکھی لپی جانتی ہے۔ جرمنی واپس لوٹنے کے بعد کچھ عرصہ تک میری مراسلت امرتا کے ساتھ رہی۔ مگر رسم الخط کی مشکل کے سبب جاری نہ رکھی جا سکی۔

دہلی میں قیام کے دوران مجھے نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر شمس الدین کی معرفت ایک سیمینار میں شرکت کی دعوت ملی، جو نیشنل ڈیفنس کے بارے میں تھا۔ میرے سوا وہاں پر کوئی دوسرا غیر ملکی نہیں تھا۔ پڑھے جانے والے مقالوں میں کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ جس کے سبب میری موجودگی پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ وہاں پر ایک مسلمان ریسرچ اسکالر سے ملاقات ہوئی، جو بحر ہند کے ساحل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کا پروجیکٹ (Costtex) بہت دلچسپ تھا۔ وہ خود اس پروجیکٹ میں مشیر تھے، جب کہ اس کی سرکردگی ان کی نوجوان بیٹی زہرہ فاطمہ کے پاس تھی۔ وہ ہر سال ساحلی علاقے کا پیدل سروے کر رہے تھے۔ چار سال قبل ان کا سفر کچھ کے علاقے میں پاکستان کی سرحد سے شروع ہوا تھا۔ اور ان دنوں وہ بمبئی سے آگے نکل چکے تھے۔ ان کی پارٹی میں نوجوان طالب علم شامل ہوتے تھے، جو کالج کی چھٹیوں کے دوران اس جگہ سے سفر کو جاری رکھتے تھے، جہاں پر انہوں نے اس سے قبل اس کو چھوڑا ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے مجھے گھر پر آنے کی دعوت دی، جہاں پر وہ مجھے بہت سی دستاویزیں بھی دکھائیں گے۔ چنانچہ میں ان کے گھر گیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان کے پاس سفر کی کئی ہزار کلرڈ تصویریں تھیں، جن کی فلموں کو فنڈز کی کمی کے سبب دھلوایا نہیں گیا تھا۔ باپ نے اپنی ملازمت چھوڑ دی تھی اور اپنا سارا وقت اس پروجیکٹ پر صرف کر رہے تھے۔ وہی راستے میں کیے گئے مشاہدات کی

رپورٹ لکھتے اور اس کو علمی حلقوں میں پھیلاتے تھے۔ بیٹی کو پروجیکٹ کی سرکردگی دینے کا مقصد شاید اس کے لیے مستقبل میں کسی علمی ادارے میں جگہ پیدا کرنا تھا۔ اخباروں میں اس پروجیکٹ کی تشہیر خوب ہو رہی تھی۔ مگر عملی طور پر ان کو کسی طرف امداد نہیں مل رہی تھی۔

کانفرنسوں کے خاتمے پر سیاحت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جامع مسجد کی زیارت پہلے نمبر پر تھی، جو لال قلعے کے سامنے ایک ٹیلے پر کھڑی ہے۔ اس کے مینار پر چڑھ کر دیکھیں، تو پرانی دلی قدموں میں پڑی ہوئی لگتی ہے۔ اتنی بڑی مسجد کو سولہویں صدی میں صرف دس برس کے عرصے میں مکمل کر لیا گیا تھا، جس میں پچیس ہزار نمازی جگہ پاتے ہیں۔ اس کو آج بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے اور اس کے امام کا خطبہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مسجد کے اردگرد مسلمانوں کی دوکانیں ہیں، جن کے کاروباری طریق کار میں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسجد کا بھرپور نظارہ کرنا ہو، تو پانچ سو میٹر دور کھڑے لال قلعے کے گیٹ پر جا کر اس پر نظر ڈالیں۔ ہمارے لئے لال قلعے کو اندر سے دیکھنا نہیں لکھا تھا، کیونکہ ان دنوں مرمت کا کام جاری تھا اور سیاحوں کا داخلہ بند تھا۔ ہم نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دلا دی کہ اس کو یہاں نہ دیکھا تو کیا ہوا۔ آگرے جا کر دیکھ لیں گے۔ کیونکہ اس قلعے کو وہاں کے قلعے کی نقل میں بنایا گیا تھا۔

دہلی میں بے شمار تاریخی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ سب کو دیکھنے کے لیے بہت وقت درکار تھا، جو میرے پاس نہیں تھا، کیونکہ میں آگرے اور جے پور بھی جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لیے سوچا کہ قطب مینار دیکھ لیں، جس کو قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام اقتدار کا گویا اعلان کرنے کے لیے بنایا تھا۔ وہاں پر بھی مینار پر چڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ اس کی خوبصورتی بہت دلآویز تھی۔ اس کے ساتھ بنائی جانے والی مسجد قوۃ الاسلام کے بس کھنڈر کھڑے تھے۔ علاء الدین خلجی کی تعمیر کردہ عمارتوں کا حال اس سے بھی پتلا تھا۔ علائی مینار کا صرف نچلا حصہ کھڑا ہے۔ باقی عمارتیں بہت خستہ حالت میں ہیں۔

آگرہ دہلی سے دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ڈی لکس بسیں چلتی ہیں، جن میں سواریاں کھڑکیوں پر پردہ ڈال کر ٹیلی ویژن پر فلم دیکھتی ہیں۔ راستے میں ایک جگہ پر آدھ گھنٹے کا سٹاپ تھا۔ سہ پہر تک میں آگرہ پہنچ گیا۔ ٹیکسی مل نہ سکی، اس لیے سائیکل رکشا لینا پڑا۔ ڈرائیور ایک سکھ نوجوان تھا، جس نے ایک بہت اچھے مگر سستے ہوٹل میں لے جانے کی پیش کش کی اور تاج محل اور دوسری تاریخی عمارتیں دکھانے کے لئے سودا پکا کرنے لگا۔ مجھے اس روز صرف اکبر کا لال قلعہ دیکھنا تھا، جہاں پر اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہ جہان کو اس کی زندگی کے آخری تین برسوں میں محبوس رکھا تھا۔ اس قلعے کا ایوان عام،

جہاں پر بادشاہ عام دربار لگایا کرتا تھا اور ایوان خاص، جہاں پر مقربین قدم بوسی کے لئے آتے تھے، مغل شاہوں کی عظمت کے گواہ ہیں۔ پھر قلعے کی موتی مسجد قابل ذکر ہے، جو مکمل طور پر سنگ مرمر سے بنائی گئی تھی۔ شاہ جہان کو بیٹے نے ہشت پہلو سماں برج رہنے کے لیے دیا تھا، جس کے جھروکوں سے تاج محل ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔

رات کو میرا معدہ خراب ہو گیا۔ جس کے سبب میں اگلی صبح تاج محل دیکھنے کے لیے جانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے پوچھا کہ کیا آس پاس کوئی حکیم یا وید مطب کرتا ہے، جس سے میں طبی مشورہ کر سکوں۔ انہوں نے ایلو پیتھک ڈاکٹر کا پتہ بتایا۔ پھر میرے اصرار پر کہا کہ ساتھ کی گلی میں ایک وید جی رہتے ہیں۔ میں شام کے وقت ان کے مطب میں گیا۔ وہ چاندنی لگا کر فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک حصے میں ان کا معاون جڑی بوٹیوں کے مرتبانوں کے بیچ بیٹھا ہوا وید جی کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق دوائیوں کی پڑیاں بنا رہا تھا۔ مریض ایک نیم دائرے کی صورت میں وید جی کے گرد جمع تھے۔ مجھے مطب میں داخل ہوتے دیکھ کر وید جی نے مجھے مخاطب کر کے کہا ڈاکٹر صاحب کی دوکان گلی کی نکڑ پر ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں درست جگہ پر پہنچا ہوں اور ان سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا پھر تشریف رکھیئے۔ میں مریضوں سے نپٹنے کے بعد آرام کے ساتھ آپ سے بات کروں گا۔ وید جی ہر مریض کی نبض ٹٹولتے اور زبان دیکھتے تھے۔ پھر نسخہ لکھ کر اپنے معاون کو دیتے تھے، جو مختلف جڑی بوٹیوں کے پوڈر کی چھ پڑیاں بنا کر دیتا جاتا تھا۔ وید جی کی فیس چار پانچ روپے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ نسخے میں بہت کم ردو بدل ہوتا تھا۔ ایک دو جڑی بوٹیاں ایسی تھیں، جو ہر نسخے میں شامل ہوتی تھیں۔ جب سب مریض جا چکے، تو وید جی میری طرف متوجہ ہوئے۔ آمد کی غرض پوچھی اور اتا پتا جاننا چاہا۔ پھر بیماری کی تشخیص کی اور مجھے بھی ویسی ہی جڑی بوٹیوں کی چھ پڑیاں اور اسپغول کا چھلکا تین علیحدہ پڑیوں میں ڈال کر دیا۔ میرے سوال کے جواب میں کہ سب کو ایک جیسی دوائی کیوں دی جاتی ہے، انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس آنے والے مریضوں میں سے ننانوے فیصد پیٹ کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔ جب میں نے ان کی فیس ادا کرنا چاہی، تو کہا آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہم مہمان سے پیسے نہیں لیا کرتے۔

میں تاج محل کو دیکھنے کے لئے ہوٹل سے نکلا، تو ایک نوجوان مسلمان رکشا والا ملا۔ اس نے بتایا کہ اکثر مسلمان اس علاقے میں بہت غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے۔ بہت ہوا تو کسی مدرسے میں قرآن پڑھنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، جہاں پر ان کو اردو پڑھا دی جاتی ہے۔ چار پانچ کلاسوں سے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ عام طور سے وہ لوگ دیہاڑی کی مزدوری

کرتے ہیں، چھوٹی موٹی دوکان کھول لیتے ہیں یا چھابڑی لگاتے ہیں۔ اس روز وہ پورا دن میرے ساتھ رہا۔ میں اس روز تاج محل دیکھنے کے لیے نکلا تھا اور وہاں پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے مجھے اعتمادالدولہ کا مقبرہ دیکھنے کی تحریک کی، جس کے قریب اس کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ وہ نہ ہوتا، تو میں اس نہایت عمدہ عمارت کو دیکھنے سے محروم رہتا۔

تاج محل جرمن محاورے کے مطابق ایک نظم ہے، جس کا سحر انسان پر چھا جاتا ہے، اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور آزاد نہیں کرتا۔ اس جیسی عمارت دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس کی عظمت کا راز اس کی سادگی اور تناسب اور موزونیت میں پوشیدہ ہے۔ سنگ مرمر دوسری عمارتوں میں بھی استعمال ہوا ہے، مگر جیسی نزاکت اور نفاست کا مظاہرہ تاج محل بنانے والے معماروں اور سنگ تراشوں نے کیا ہے، اس کی کہیں پر نظیر نہیں ملتی۔ میں ابھی گیٹ میں سے گزرنے کے بعد کھڑا تاج محل کے سحر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے جرمن میں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا آپ یہاں کیسے؟ میں نے گھوم کر دیکھا، تو میرے دائیں اور بائیں دو نوجوان جرمن لڑکیاں کھڑی تھیں، جن کے ساتھ میری ملاقات دہلی میں ادبی ترجمہ کانفرنس میں ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک کیرالا یونیورسٹی میں جرمن کی لیکچرر تھی اور دوسری دہلی یونیورسٹی میں۔ انہوں نے کانفرنس میں میرا لیکچر سنا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں ان کو اردو ادب کے جرمن تراجم ایک سہ ماہی رسالے (German Studies in India) میں شائع کرنے کے لئے دے سکتا ہوں، جو کیرالا یونیورسٹی کی طرف سے جرمن میں چھپتا تھا۔ (چنانچہ میرے تراجم وہاں پر آئندہ برسوں میں چھپتے رہے)۔ اس روز میں نے تاج محل کو ان پریوں کی ہمراہی میں دیکھا، جس کو میں آج بھی آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن کے پردے پر کسی فلم کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ میں دوسرے روز پھر ایک بار تاج محل کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ وہ چھٹی کا دن تھا، جب داخلے پر ٹکٹ نہیں لگتا۔ اس روز پورا شہر وہاں پر اُمڈ آیا تھا۔ یہ نظارہ مجھے پہلے روز سے بھی زیادہ دلچسپ لگا، کیونکہ عام شہریوں کے ساتھ بھکاریوں پر بھی تاج محل کے کمپونڈ میں داخل ہونے پر پابندی نہ تھی۔ البتہ بھیک مانگنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اس بات کی کون پرواہ کرتا ہے۔

جرمن لڑکیاں وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اکبر کے دارالحکومت فتح پور سیکری جانا چاہتی تھیں۔ جب کہ مجھے اعتمادالدولہ کا روضہ دیکھنے کا شوق تھا، جس کے بارے میں مجھے رکشا ڈرائیور نے بتایا تھا۔ مگر اسے علم نہ تھا کہ اعتمادالدولہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کا باپ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ شاہ جہان نے اپنی جس ملکہ کے لیے تاج محل تعمیر کرایا تھا، وہ نور جہاں کے بھائی آصف خان کی بیٹی ارجمند بانو تھی، جس کو شاہ جہان نے ممتاز محل کا لقب عطا کیا تھا۔ اعتمادالدولہ کا روضہ اس کی بیٹی نور جہاں نے

تاج محل سے ۳۴ برس قبل سنگ مرمر سے بنوایا تھا اور اس عمارت کے معماروں نے سنگ مرمر میں نگینے جڑنے کی تکنیک وہاں پر پہلی بار استعمال کی تھی۔ جب شاہ جہان نے تاج محل بنوانا چاہا، تو معماروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اعتماد الدولہ کے روضے کی عمارت کو بطور نمونہ سامنے رکھیں۔

آگرہ کے بعد میری اگلی منزل جے پور تھی، جو وہاں سے ۲۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر راجستھان میں واقع ہے۔ اس شہر کو باقاعدہ طور پر پلاننگ کے بعد اٹھارہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اندرون شہر کی فصیل اور اس کے سات دروازے اچھی حالت میں ہیں۔ اہم ترین عمارتوں میں سے شاہی محل ہے، جس کے ایک حصے کو میوزیم میں ڈھال دیا گیا ہے۔ راجپوت آرٹ کے ساتھ ساتھ مغل آرٹ کے نمونے، مخطوطات اور ہتھیار دیکھے جا سکتے ہیں۔ محل کا باغ آج بھی ابتدائی زمانے کے نمونے پر قائم ہے۔ چندرا محل میں شاہی خاندان کی رہائش ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب حصوں کو ٹورسٹ دیکھ سکتے ہیں۔ اس شہر کے پیازی رنگ کی تشریح یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز کی آمد پر جب شہر کی عمارتوں پر نیا رنگ کیا جانا تھا، تو کنٹریکٹر صرف پیازی رنگ مہیا کر سکتا تھا۔ اس وقت سے یہ رنگ اس شہر کے ساتھ چپک گیا ہے۔ دوسری نشانی ہوا محل ہے، جو پیازی رنگ کی طرح اس شہر کو مشہور کرنے کا باعث ہے۔ کہنے کو تو یہ محل ہے، جس کی پانچ منزلیں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر دراصل اس کا صرف سامنے کا حصہ کھڑا ہے، جیسے فلم اسٹوڈیوز میں عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ محل کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس پچاس میٹر لمبی عمارت کی چوڑائی (دراصل موٹائی) ایک میٹر سے بھی کم ہے۔ اس میں اوپر نیچے پانچ گیلریاں بنی ہوئی ہیں، جن کے پیچھے شاہی خاندان کی خواتین کھڑی ہو کر نیچے بازار کی رونق کی سیر کر سکتی تھیں۔ کھڑکیاں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ انکے روزنوں میں سے باہر جھانکا جا سکتا ہے، مگر باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ کھڑکی کے پیچھے کون کھڑا ہے۔ ہوا محل کو یہ نام شاید اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ ہوا کی طرح ایک موہوم چیز ہے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ کھڑکیوں کے روزن ہوا کی آمد و رفت میں روک پیدا نہیں کرتیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محل ہوا کھانے کی جگہ ہے۔ جے پور سے تھوڑا باہر قلعہ امبر ہے، جو ایک پہاڑی کے اوپر بنا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر راجہ من سنگھ نے ۱۶۰۰ء میں شروع کروائی، مگر راجہ جے سنگھ نے اٹھارھویں صدی میں اسے مکمل کرایا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر ہندو اور مسلم طرز تعمیر کو آپس میں یکجا کرنے کا کامیاب تجربہ ہوا ہے۔ شیش محل اور دل آرام باغ میں اس چیز کو بالخصوص دیکھا جا سکتا ہے۔ میں جے پور سے پین ورک کی چار تصویریں لایا تھا، جنکو کسی نامعلوم مصور نے بنایا تھا۔ وہ اب ہمارے گھر میں لگی ہوئی ہیں۔ مصور کے فن کی پختگی قابل داد ہے۔

ہندوستان میں دو ہفتے گزارنے کے بعد میں لاہور پہنچا، جہاں پر مجھے کشور ناہید کے پاس

یوسف کامران کی تعزیت کرنے کے لیے جانا تھا۔ ان کی شادی اپنی پسند کی تھی، مگر دونوں خاندانوں کی مرضی کے خلاف تھی۔ میرے پاس اس کے گھر کا پتا نہیں تھا۔ اس لئے میں پاک ٹی ہاؤس گیا۔ انور سجاد سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ اس سے قبل تعارف نہ تھا۔ مسعود اشعر مجھے کشور کے گھر پہنچانے گئے، جہاں پر چند ادیب آئے بیٹھے تھے۔ کشور کا غم تازہ تھا، مگر اسکا صبر بے مثال تھا۔ اس جیسی باہمت عورت میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ وہ فوراً میرے قیام لاہور کا پروگرام بنانے بیٹھ گئی۔ اگلے روز حلقہ ارباب ذوق کی میٹنگ تھی۔ وہاں پر بہت سے ادیبوں سے ملنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ صدارت قاضی جاوید نے کی اور فخر زمان نے ماسکو کا سفر نامہ پیش کیا، جس میں جگہ جگہ انگریزی کا استعمال ہوا تھا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اگر مصنف نے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا ہوتا، تو اسکو اردو اصطلاحات مل سکتی تھیں۔ پھر ماسکو کو مصنف نے روس کے دارالخلافے کے نام سے یاد کیا تھا۔ میں نے کہا دارالخلافہ تو اس شہر کو کہتے ہیں، جہاں پر خلیفہ رہتا ہو۔ ماسکو میں کون سا خلیفہ رہتا ہے۔ اسکو دارالسلطنت کہنا چاہئے۔ مگر جب یہ سفر نامہ چھپ کر آیا، تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ شاید اپنے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کرنے کا رواج نہیں رہا۔

کراچی میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے میری تقریر کا انتظام کر رکھا تھا۔ جس میں شرکت کے لئے بہت سے ادیب آئے ہوئے تھے۔ صہبا لکھنوی، ڈاکٹر مہکری، یوسف مظہر، افضال احمد سید، شوکت رانا، ذی شان ساحل، منظر شہزاد، صبا اکرام اور علی حیدر ملک کے نام میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ شفیع عقیل نے اپنی کتاب جرمن لوک کہانیاں پیش کی، جس کا اس نے میرے نام انتساب کیا تھا۔ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ہوشلے نے اپنے گھر پر، جو سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا کشادہ اور خوبصورت مکان تھا، کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس سے اگلے روز شان الحق حقی نے اپنے گھر پر ایک محفل بلا رکھی تھی، جس میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، صمد شاہین، عزیز حامد مدنی، سہیل ادیب، صہبا لکھنوی، شبنم رومانی، ممتاز حسین اور ملتان سے آئے ہوئے مقصود زاہدی اور ان کی بیٹی ماہ طلعت زاہدی شامل تھے۔ اس طرح کراچی میں میرے دوروزہ قیام کے دوران اس شہر کے اہم ادیبوں سے ملاقات ہوگئی۔ اسی پر بس نہیں تھی، ہوائی جہاز میں فرنکفورٹ تک ممتاز حسین کا ساتھ رہا، جو آگے لندن جارہے تھے۔

شام کا سفر

یوں تو ہمیشہ سے میرے پاؤں میں چکر رہا ہے۔ مگر ۱۹۸۴ء کا سال کچھ زیادہ ہی چکر دینے والا

ثابت ہوا۔اس برس مجھے نوملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ہمیں جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے باری باری مشرق وسطی کے ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔مقصد یہ تھا کہ وہاں کے مقامی حالات سے آگاہی پیدا کی جائے، ملک کی اہم شخصیتوں سے تعارف ہو، وہاں پر چھپنے والے لٹریچر کا جائزہ لیں اور خاص طور پر حکومت کی طرف سے چھاپی جانے والی رپورٹیں جمع کریں، جن تک یورپ میں بیٹھے ہوئے اکثر رسائی ممکن نہ تھی۔اس سال ایسا سفر کرنے کا قرعہ میرے نام پڑا۔میں نے شام، سعودی عرب اور یمن کے ممالک کو سفر کی خاطر چنا، جہاں پر میں اس سے قبل نہیں گیا تھا۔البتہ مجھے یہ سفر موسم گرما میں کرنا پڑا، وہ بھی رمضان کے مہینے میں۔

دمشق تک مجھے یوگوسلاویہ ایرلائنز میں سفر کرنا تھا۔چیک ان کے کونٹر پر گیارہ جرمنوں کے ایک گروپ سے تعارف ہوا، جو ایک لاٹری کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر رکن ماہوار بیس مارک ادا کرتا تھا، جس میں سے آدھے لاٹری کے ٹکٹوں پر لگ جاتے تھے۔باقی رقم جمع ہوتی رہتی تھی۔اس کے علاوہ لاٹری میں سے جیتی جانے والی رقم بھی اجتماعی خزانے میں ڈال دی جاتی تھی۔پھر سال کے سال ان پیسوں سے مل کر کوئی سفر کیا جاتا تھا۔وہ لوگ پہلی بار دمشق جارہے تھے۔میں اس سے قبل وہاں پر جاچکا تھا۔

آدھی رات کو ہمارا جہاز دمشق کے ہوائی اڈے پر اترا۔ ہر مسافر کو ایک سو ڈالر کی رقم مقامی کرنسی لیرے میں بدلنے کا حکم تھا۔کسٹم کے کارندوں نے ہر قسم کے اخبارات اور رسائل ضبط کر لیے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید یورپی رسالوں میں چھپنے والی نیم برہنہ عورتوں کی تصویروں کو ملک میں داخل ہونے سے روکنا مطلوب تھا۔مگر کسٹم افسر نے بتایا کہ دراصل حکومت غیر ممالک کے اخباروں میں چھپنے والی خبروں کو ملک میں پھیلنے سے روکنا چاہتی ہے۔ملک کے اندر خبروں پر پابندی تھی۔

میں نے کسی ہوٹل میں ریزرویشن نہیں کرا رکھی تھی۔البتہ مجھے آسٹرین صحافی عورت برگٹ سرہا (Birgit Cirha) نے، جس کے اخبار میں میرے مضامین چھپتے تھے، ایک ہوٹل کا پتا لکھوا دیا تھا۔مگر اس شہر میں شاید ٹیکسی ڈرائیوروں کو بھی سڑکوں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔وہ مسافروں کو لیے پھرتے ہیں۔دس جگہوں پر پوچھتے ہیں اور پھر ہر بار یوں پوز کرتے ہیں، جیسے انہیں شروع سے علم تھا۔لوگوں کو شہر کا نقشہ پڑھنا نہیں آتا۔میرے پاس دمشق کا نقشہ تھا، جس پر تمام اندراجات عربی میں تھے۔مگر جس کسی کو میں نے نقشہ دکھایا اور اس جگہ کی نشان دہی کی، جہاں پر ہم تھے۔تب بھی لمبے چوڑے غور وخوض اور مطالعہ کے بعد کہا جاتا تھا کہ میں غلط راستے پر تھا۔جب کہ یہ بات ہر بار غلط ثابت ہوتی رہی۔

میری سب سے پہلی منزل جرمن انسٹی ٹیوٹ برائے آثار قدیمہ تھی، جس کا ڈائریکٹر میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست ڈاکٹر مائنکے (Dr. Meineke) تھا۔وہ تعطیل پر جرمنی گیا ہوا تھا۔مگر اس کے

دو کولیگوں نے میرا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ انہوں نے مجھے فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ برائے ادب عربی میں جانے کا مشورہ دیا اور خود ہی وہاں پر فون کر دیا۔ پھر انہوں نے جرمن سفارت خانے کے اتاشی برائے اطلاعات ڈاکٹر فان شینک (Dr. von Schenk) کو میری آمد کی اطلاع دی، جو حلب جانے والے تھے۔ میری آمد کی خبر سنی، تو رک گئے اور کہا میں ابھی آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ بہت خوش خلق آدمی نکلے۔ میری ہر طرح سے مدد کرنے کا وعدہ کیا اور بہت سی کار آمد معلومات بہم پہنچائیں۔ انہوں نے میرے لیے بہت سے لوگوں سے ملاقات کے لیے وقت لینے کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔ میں حکومت شام کے نمائندوں کے علاوہ فلسطینی مقاومت کے لیڈروں سے بھی ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔

فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ برائے ادب عربی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ژاں پول پاسکوال (Jean-Paul Pascual) نے میرا استقبال کیا۔ وہ لمبے عرصے سے دمشق میں مقیم تھے اور عربی زبان پر خوب دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اسلامی نظام تعلیم کے ابتدائی زمانے پر لکھی جانے والی میری کتاب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ اس شہر میں آپ کی ایک چیلی رہتی ہے۔ پتا چلا کہ ان کی انسٹی ٹیوٹ نے ملکہ ابیض کی کتاب دمشق میں اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں چھاپی تھی، جس کو لکھنے کی تحریک ان کو میری کتاب پڑھ کر ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً ملکہ ابیض کو میری آمد کی خبر سنائی۔ انہوں نے مجھے اگلے روز اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔ پتا چلا کہ وہ سلیمان العیسیٰ کی اہلیہ ہیں، جو ملک شام کے ملک الشعراء ہیں۔

اگلی صبح میں ڈاکٹر ملکہ ابیض کے دفتر (**المركز العربي لبحوث التعليم العالي**) میں حاضر ہوا۔ وہ وہاں پر کام کرنے کے علاوہ دمشق یونیورسٹی میں متقابلی تعلیم کی پروفیسر اور صدر شعبہ بھی تھیں۔ پتا چلا کہ جب انہوں نے اپنے لیکچروں کے لئے نوٹس لینے کی خاطر میری کتاب کو پڑھا اور انہوں نے دیکھا کہ میں نے تاریخ بغداد میں سے اپنے مقالے کے لیے مواد حاصل کیا تھا، تو ان کو تحریک ہوئی کہ میری پیروی میں تاریخ دمشق للعساکر کو اسی طریق سے پڑھیں اور دیکھیں کہ اس میں کیا کچھ مواد مل سکتا ہے۔ ان کو اس مقالے پر ڈاکٹریٹ ملی تھی۔ انہیں یہ جان کے خوشی ہوئی کہ مجھے بھی ان کی طرح عرب لیگ کے ادارہ برائے تعلیم نے اسلامی نظام تعلیم پر چھاپی جانے والی کتاب کے لیے ایک باب لکھنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے شوہر سے ملاقات کی خاطر اپنے گھر پر آنے کو کہا۔

سلیمان العیسیٰ بہت دلچسپ شخصیت تھے۔ انکی زبانی پتا چلا کہ وہ بھی صدر حافظ الاسد کی طرح علوی تھے۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے، بلکہ جب حافظ الاسد مدرسہ میں پڑھتے تھے، تو سلیمان العیسیٰ انکے استاد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں شام کے علوی حلقوں میں

یہ تحریک چلی تھی کہ اپنے آپ کو اہل السنّت والجماعت کے ساتھ ملحق کر لیا جائے۔ چنانچہ اس غرض سے بہت سے طالب علموں کو جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ خیال تھا کہ یہ لوگ جب واپس لوٹیں گے، تو انکے زیر اثر علوی عوام آہستہ آہستہ شیعہ فقہ کو چھوڑ کر شافعی فقہ کو اختیار کر لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ پھر جب ۱۹۷۹ء میں ایران میں اسلامی انقلاب آیا، تو صدر مملکت حافظ الاسد نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک سو طالب علموں کو شیعہ فقہ پڑھنے کے لیے قم بھیجا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور امید رکھی جاتی ہے کہ چند برسوں کے اندر اندر یہ لوگ تعلیم حاصل کرنیکے بعد اپنے گاؤں میں واپس لوٹیں گے اور لوگوں کو، جو نام کے شیعہ ہیں، عملی طور پر شیعہ بنا دیں گے۔

جرمن سفارت خانے کی وساطت سے پی۔ ایل۔ او کی تحریک وفا کے ایک سرکردہ لیڈر محمود لبدی کے ساتھ میری ملاقات کا انتظام ہوا۔ اس تحریک نے کچھ عرصہ قبل بریگیڈیر ابو موسیٰ کی سرکردگی میں یاسر عرفات کے خلاف بغاوت کی تھی۔ میں بتائے گئے پتے پر پہنچا اور ابھی مکان کا نمبر تلاش کر رہا تھا کہ ایک نوجوان فلسطینی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ڈاکٹر احمد ہوں اور محمود لبدی سے ملنے آیا ہوں؟ میرا رہبر مجھے محمود کے پاس لے گیا، جس کا آفس ایک قدیمی مکان کے تہہ خانے میں تھا۔ کہیں پر کوئی سائن بورڈ کچھ نہیں لگا ہوا تھا۔ ہر طرف مسلح کمانڈوز گھوم رہے تھے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگہ خطرے سے خالی نہ تھی۔ اسرائیلی ایجنٹ ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے اور موقعہ ملنے پر قاتلانہ حملہ کرتے تھے۔

محمود نے بتایا کہ اس نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے مقالے کے سلسلے میں میرے پاس اورینٹ انسٹی ٹیوٹ میں آیا تھا اور میں نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ جب ۱۹۷۲ء میں جرمنی میں فلسطینی کمانڈوز نے میونخ اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے والے اسرائیلی کھلاڑیوں کو اپنے قابو میں کیا تھا، اس وقت وہ جرمنی میں فلسطینی طالب علموں کی مجلس کا صدر تھا۔ اس کو دوسرے بہت سے فلسطینیوں کے ساتھ جرمنی سے نکال دیا گیا تھا۔ دس برس تک وہ یاسر عرفات کا دست راست رہا۔ اسے بلجیم میں پی۔ ایل۔ او کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مگر اس کو ڈپلومیٹ کی زندگی پسند نہ تھی، اس لیے اس نے استعفیٰ دے دیا۔ عرفات کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ اپنی روح امریکیوں کے پاس گروی رکھ چکا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان کی مدد سے وہ فلسطین کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کبھی اس کا ساتھ نہیں دے گا اور اسرائیل کسی قسم کی فلسطینی حکومت کو قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ تمام فلسطینیوں کو اس علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں وہ عربوں کی دوسری سرزمینوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

پی۔ ایل۔ او کا ہیڈ کوارٹر بیروت، دمشق یا عمان میں ہونا چاہیئے نہ کہ فلسطین سے تین ہزار کلومیٹر دور (اس زمانے میں پی۔ ایل۔ او کا ہیڈ کوارٹر تونس میں تھا)۔ عراق اور ایران کی جنگ کے بارے میں

اس نے کہا کہ یہ جنگ صدام حسین نے امریکہ کی خاطر شروع کی ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جیت جائے گا۔ اگراس کا موقف ایران کے خلاف درست ہے، تو اس نے یہ جنگ اس وقت کیوں نہ شروع کی، جب ایران میں شاہ کی حکومت تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے وفا گروپ کو لیبیا، ایران اور بعض دوسرے ذرائع سے مالی امداد ملتی ہے۔ جہاں تک شام کی حکومت کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو اس کے تحت نہیں سمجھتے۔ البتہ وہ وہاں کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔

پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق (جس کو "ضیاء الباطل" کے نام سے یاد کرتا تھا) کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ یہ شخص خطرناک اور امریکہ کا زرخرید ہے۔ اس کی آنکھیں قاتلوں والی ہیں۔ وہ جنرل ضیاء الحق کو اس وقت سے جانتا تھا، جب موصوف اردن میں متعین تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں اس کی رائے بہت اچھی تھی۔ وہ ان کو انتہائی ذہین انسان سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھٹو کو امریکہ نے قتل کروایا تھا۔ کیونکہ اس کو خطرہ تھا کہ یہ شخص اسلامی ممالک کو قریب لاسکتا ہے اور ان کا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں پاکستان کے سفیر ائر مارشل ایاز احمد خان سے ملنے کے لیے گیا۔ وہ بہت ملنسار انسان نکلے۔ ان میں ڈپلومیٹوں والی بناوٹ بالکل نہیں۔ بتا رہے تھے کہ پاکستان سے لوگ زیارت کرنے کے بہانے سے آجاتے ہیں۔ مقصد سب کا یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح ملک میں رک جائیں اور محنت مزدوری کریں۔ ایک شخص صبح سے آیا بیٹھا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگوں کو سرحد پر روک لیا گیا تھا، کیونکہ ان کے ویزے میں کوئی نقص تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سفارت خانہ ان کی مشکل حل کرائے۔ وہ شخص دو برسوں سے شام میں رہ رہا تھا۔ بسکٹوں کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ مالکوں نے اس کو دو کمروں کا مکان بھی بنا دیا تھا۔ اب وہ اپنے خاندان کو زیارتوں کے ویزے پر لایا تھا۔ سفیر صاحب نے کہا کہ ان کا بیشتر وقت اس قسم کے معاملات کے سلجھانے میں لگ جاتا ہے۔ مجھے سڑک پر دو پاکستانی ملے تھے، جو زیارتوں کے بہانے پر کئی ماہ سے وہاں پر رکے ہوئے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ حضرت زینب کے مزار پر مجلس ہوئی، تو ایک سو کے لگ بھگ پاکستانی اس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ سبھی زیارتوں کے بہانے ملک میں داخل ہوئے تھے اور اب پولیس کو پیسے دے دلا کر رہ رہے تھے۔ مجھے ایک شامی نے بتایا کہ پاکستانی مانگتے ہوئے بھی دیکھے گئے ہیں۔ اس کو کسی نے ایک بار کہا تھا کہ دمشق کے رہنے والے یزیدی ہیں اور ان سے مال نکلوانا جائز ہے، خواہ لوٹ کھسوٹ سے نکالا جائے یا مانگ تانگ کر۔ عام طور سے وہاں پر بہت کم مانگنے والے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ پر سڑک کے کنارے ایک عورت بیٹھی ہوئی بھیک مانگ رہی تھی۔ ایرانیوں کی ایک کار وہاں پر آکر رکی اور ان لوگوں نے اسے خیرات دی۔

جب میں نے سفیر صاحب کو سلیمان العیسیٰ کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا، تو انہوں نے کہا کہ سفارت خانے کے مترجم کی ماں بھی ایک مشہور شاعرہ ہے۔ چنانچہ مترجم نے اپنی والدہ مقبولہ الشلق کے ساتھ ملنے کے لیے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے مجھے اپنی ایک کتاب بھی عنایت کی، جس کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اچھی شاعرہ ہیں، البتہ ان کی نظمیں پرانے اسلوب میں ہوتی ہیں۔ جب کہ سلیمان العیسیٰ کے کلام میں، جو عمر میں ان سے بڑے تھے، بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ ان کی نوجوانی کے زمانے کی نظمیں پرانے اسلوب میں ہوا کرتی تھیں۔ مگر نئی نظمیں کے مضامین اور طرز ادا یکسر بدل چکی تھی۔

ایرانی دمشق میں بہت نظر آتے تھے۔ عراق اور ایران کی جنگ پانچویں سال میں داخل ہو رہی تھی، جس میں بہت سے ایرانی فوجی مارے گئے تھے۔ ان کی بیواؤں کو حکومت کے خرچ پر دمشق کی سیر کرائی جاتی تھی، جہاں پر انہیں چار ہفتوں تک ہوٹل میں رکھا جاتا تھا۔ ایک ایسے ہوٹل کے دروازے پر اس مضمون کا اشتہار لگا ہوا تھا براہ مہربانی کمرے کے بارے میں پوچھ کر ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہمارا ہوٹل دو برسوں کے لیے بک ہے۔ ایک شامی دوست نے بتایا کہ ان ہوٹلوں میں جنگ میں شہید ہونے والے ایرانی فوجیوں کی بیوائیں لا کر رکھی جاتی ہیں اور جو چاہے ان کے ساتھ متعہ کر سکتا ہے۔ جس کی مدت اتنی ہوتی ہے، جتنا عرصہ ان عورتوں کو دمشق میں قیام کی اجازت ہوتی ہے۔

جرمن سفارت خانے کی طرف سے میرا پروگرام اس طرح بنایا گیا تھا کہ ہر روز ایک دو وزارتوں میں جانا ہوتا تھا۔ وزیر یا ان کے نائب سے عام طور سے آدھ پون گھنٹے کی گفتگو ہو جاتی تھی۔ مگر بیشتر وزارتوں کے پاس مجھے دینے کے لیے رپورٹ لٹریچر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی ایک کتاب مل جاتی تھی اور کبھی دو یا تین۔ پاکستان میں گورنمنٹ کا پرنٹنگ پریس ہے، جس میں ایسی رپورٹیں چھپتی ہیں اور جو چاہے قیمت ادا کر کے انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ عرب ممالک میں سوائے مصر کے کہیں پر ایسا انتظام نہیں ہے۔ عام طور سے ہر وزارت سائیکلوسٹائل پر اپنی رپورٹیں نکلوا لیتی ہے اور ان کو تقسیم کر دیتی ہے۔ اسٹاک رکھنے کا رواج نہیں ہے۔ اس لئے وزارتوں سے صرف تازہ چھپی ہوئی کتابیں ملتی ہیں اور وہ بھی اگر قسمت اچھی ہو۔

مجھے حکومت کے ایک محکمے میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں پر عورتوں کی معاملات کی نگرانی ہوتی ہے۔ پورا محکمہ عورتوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے تعلیمی پروگرام بہت سے تھے، جن میں عورتوں کو ان کے حقوق کے بارے میں بتایا جاتا تھا۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے نتیجے میں شام میں پھر سے عورتوں کے اندر حجاب کا رواج ہونے لگا تھا۔ میں نے دمشق یونیورسٹی میں لڑکیوں سے جاننا چاہا کہ وہ کب سے اسکارف سر پر باندھنے لگی ہیں۔ عام طور سے یہ جواب ملا جب سے ایران میں اسلامی انقلاب آیا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ اسکارف اس بات کی علامت تھا کہ وہ اپنے معاملات کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔ عام طور سے شام میں طالب علموں کو کسی قسم کا سیاسی مظاہرہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر کسی نے لڑکیوں کو اسکارف باندھنے سے نہیں روکا تھا۔ ڈاکٹر ملکہ ابیض نے بتایا کہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کا نصف حصہ اسکارف باندھنے لگا تھا۔ ایران کے اسلامی انقلاب سے قبل ایسا نہ تھا۔

عورتوں کے دو طبقے دیکھنے میں آئے۔ پہلا طبقہ ان عورتوں کا تھا، جو روایات کی پابند ہیں اور شلوار قمیص پر لمبا کوٹ پہنتی ہیں۔ ان میں سے ماڈرن قسم کی عورتیں کالے رنگ کے کپڑوں میں ملفوف گھر سے باہر نکلتی ہیں اور ایک برقعہ قسم کا پہناوا اس کے اوپر اوڑھتی ہیں۔ یہ عورتیں اکثر اپنے مردوں کے پیچھے چلتی ہیں اور چپ چاپ رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں شہری طبقے کی تعلیم یافتہ عورتیں مغربی لباس پہنتی ہیں۔ عام طور سے یہ عورتیں وزارتوں میں یا دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کام کرتی ہیں۔ ان کے بولنے کے انداز سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ وہ مشرقی عورتوں کے برعکس مغربی یورپی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ ان کی آواز مردوں کی طرح موٹی اور بلند و بالا ہوتی ہے۔

میرے ربوہ میں قیام کے زمانے میں ایک شامی طالب علم سلیم الجابی وہاں پر رہتا تھا۔ میں نے ان کو فون کیا، تو وہ آ کر مجھے اپنے گھر لے گیا، جو ایک آٹھ منزلہ عمارت میں تھا، جہاں سے سارے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا کہنا تھا کہ اس سے بھی زیادہ عمدہ نظارہ دمشق کے پہلو میں پائی جانے والی پہاڑی کے اوپر سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مجھے وہاں لے گیا۔ ہماری طرح بے شمار دوسرے تماشائی وہاں پر جمع تھے۔ دمشق فی الواقع روشنیوں کا شہر ہے، جو اس وقت ہمارے قدموں میں پڑا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس ملک کے باسی دمشق کو شام کے نام سے پکارتے ہیں، جیسے مصری قاہرہ کو مصر کے نام سے جانتے ہیں۔ واپسی کے راستے میں اس نے مجھے ایک بستی دکھائی، جس کا نام ربوہ ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، جہاں پر بیان ہوا ہے کہ حضرت مریم اپنے بچے کو لے کر ربوہ کی طرف گئیں اور وہاں پر پناہ لی۔ جماعت احمدیہ نے پاکستان میں اپنے شہر کا نام اسی بستی کے نام پر رکھا تھا۔ مرزا محمود احمد کی والدہ زندہ تھیں اور اس کے ساتھ قادیان سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔

سلیم الجابی نے کہا تم پہلے بھی ایک بار ملک شام کو دیکھے بغیر چلے گئے تھے۔ اس دفعہ میں تم کو ملک کی سیر کرانی چاہتا ہوں۔ چنانچہ ہم اگلے روز اس کی کار میں سیاحتی سفر پر نکلے، جس کے دوران اس نے چار روز کے اندر مجھے اپنے وطن کے قریب قریب سارے اہم تاریخی مقامات دکھائے۔

سلیم نے کہا سب سے پہلے میں تمہیں ایک قریبی پہاڑی علاقہ دکھاؤں گا، جس کے ایک طرف (القنط) برف گرتی ہے، مگر کسی قسم کی نباتات نہیں اگتیں۔ جب کہ دوسری طرف (زبدانی) پانی کی

فراوانی ہے اور ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے۔ اس معمے کا حل یہ تھا کہ اس پہاڑی کے اندر ایک غار (جب) پائی جاتی ہے۔ جس میں برف کا پانی قدرتی چشمے کے ساتھ مل جاتا ہے، جس میں سے ایک ندی نکلتی ہے۔ سلیم اس پانی کی تعریف کرتا اور گلاس پر گلاس پیتا جاتا تھا۔ شاید اس کو استسقاء کا مرض لاحق تھا۔

اگلا عجوبہ ایک شہر (النبک) تھا، جہاں پر عمارتیں بہت بڑی تعداد میں بنائی گئی تھیں۔ مگر تکمیل سے پہلے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے ایک بہت ماڈرن شہر ویرانے میں کھڑا تھا، جس میں کوئی ذی نفس نہیں بستا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس شہر کو آگے چل کر بسایا گیا ہو۔ مگر جب ہم اسکے پاس سے گزرے تھے، اس وقت اس میں الوؤں کا بسیرا تھا۔

ہماری پہلی منزل تدمر (Palmera) تھی، جس کا شمار زمانہ قدیم میں دنیا کے متمدن ترین شہروں میں ہوتا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے آس پاس صحرا پھیلا ہوا ہے۔ پھر اچانک ایک شہر کے آثار ابھرتے ہیں، جس کی مثال دنیا میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر مشرق اور مغرب کے درمیان سب سے اہم تجارتی منڈی کا درجہ رکھتا تھا۔ بلند ستونوں (دس میٹر بلند) کو دیکھا جائے، جو کشادہ سڑک کے دائیں بائیں کھڑے تھے، جس کی لمبائی ایک میل سے زیادہ تھی، تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شہر کی امارت کا معیار کیا تھا۔ سڑک کی چوڑائی گیارہ میٹر تھی، جس کے دونوں طرف چھ میٹر چوڑا مسقّف راستہ تھا۔ اس کے پیچھے دوکانیں اور گودام تھے۔ پھر شہر میں پبلک عمارتیں آتی ہیں، جن میں مندر، حمام اور تھیٹر شامل تھے۔ تماشائیوں کے بیٹھنے کی سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ تاریخی عمارتوں کے دیکھنے کے بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہونے والے تھے، تو سلیم نے ایک ماڈرن عمارت دکھائی، جو شام کا بدنام ترین قید خانہ تھا۔ اس نے کہا یہاں سے کم ہی لوگ زندہ سلامت باہر نکلتے ہیں۔

اب ہم صحرا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حمص کی طرف روانہ تھے۔ سرسبزی پچیس تیس کلومیٹر پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ مگر سارے درخت مشرق کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ جس کے پیچھے یہ راز تھا کہ ہر روز سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوائیں پودوں کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ حمص پہنچ کر میں نے تجویز پیش کی کہ ہم کسی مسجد میں جا کر منہ ہاتھ دھولیں۔ سلیم نے بتایا کہ ۱۹۸۰ء میں اخوان المسلمون نے بغاوت کی تھی، اس وقت سے ملک کی مساجد کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ ان کو صرف نماز کے اوقات پر کھولا جاتا ہے اور نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد کو خالی کر کے بند کر دیا جاتا ہے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے حاما شہر پر، جو اخوان المسلمون کا گڑھ تھا، بم برسائے گئے تھے، جس کے سبب دس ہزار انسان مارے گئے تھے۔ گویا اس شہر کا تیسرا حصہ اپنے فوجیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

ہم نے حضرت خالد بن ولید کی مسجد میں نماز ادا کی اور ان کی قبر پر دعا کی۔ ان کی وفات حمص

میں ہوئی تھی، جہاں پر انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سات برس گزارے تھے۔ مسجد سے باہر ایک لاٹ نصب ہے، جس پر آپ کا یہ قول درج ہے۔" میں نے ایک سو سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا اور میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے، جس پر تلوار، نیزے یا بھالے سے زخم نہ لگا ہو۔ اور آج میری موت بستر پر واقع ہو رہی ہے"۔

سلیم عمارتوں کی ڈیکوریشن کا ماہر ہے۔ اس نے حمص میں ایک مسجد دکھائی، جس کے چھت کی گیلری پر، جو تیس فٹ اونچی ہے، اس نے پلاسٹر سے نقش و نگار بنائے تھے۔ شہر سے باہر ہمیں خانہ بدوشوں کا ایک ٹھکانہ دکھائی دیا، جس کے بارے میں سلیم نے کہا کہ یہ غجر لوگ ہیں۔ گویا یہاں پر بھی گوجر پائے جاتے ہیں۔ عربی میں چونکہ گ نہیں پائی جاتی، اس لئے اس کے لئے غ استعمال ہوتا ہے۔ آگے چل کر عرب ملکوں میں گوجروں کے بارے میں متعدد کتابیں میرے مطالعہ میں آئیں۔ دوسری چیز جو حمص کے شہر کو چھوڑتے ہوئے ہماری نظر سے گزری، اس کا تعلق ایرانی فوجیوں کے کیمپ سے تھا۔ پتا چلا کہ ان کو شام میں ملٹری ٹریننگ دی جاتی تھی۔

راستے میں ہماری کار میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی، جس کی مرمت فوری طور پر ہونی ضروری تھی۔ اس لئے ہم اللاذقیہ (لطاقیہ) میں ہوٹل تلاش کرنے سے پہلے ایک موٹر گیراج میں گئے۔ گیراج کے مالک نے دور سے ہی ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس نے بتایا کہ جونہی میں نے آپ کو کار میں سے اترتے ہوئے دیکھا، میرے دل میں آپ کے لئے الفت اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ سلیم کی اس کے ساتھ فوراً دوستی ہو گئی۔ جب مستری نے نوے لیرے کا بل پیش کیا، تو مالک گیراج نے کہا آپ میرے عزیز ہیں، میں آپ سے پیسے بالکل نہیں لوں گا۔ سلیم اس کو ایک سو لیرے کا نوٹ دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کو رکھ لیں۔ اور مالک گیراج پیسوں کو ہاتھ لگانے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے اس چیز نے بہت لطف دیا۔ کیونکہ یہ چیز یورپ میں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آخر میں سلیم نے مستری کی جیب میں نوٹ ڈھونس دیا اور ہم ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

سلیم نے کہا کہ اس کی کار خوش ہے۔ کیونکہ مستری نے اس کا ناخن کاٹ دیئے ہیں اور بال سنوار دیئے ہیں۔ جب ہم ہوٹل میں جانے کے لیے اپنا سامان کار میں سے نکال رہے تھے، تو سلیم نے کار کو مخاطب کر کے کہا تمہیں رات یہاں سڑک پر گزارنی ہوگی۔ ہوٹل کا مالک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکیں۔ وہ کار کے ساتھ اس طرح باتیں کرتا تھا، جیسے وہ اس کی عزیز دوست ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر چیز کا ایک حق ہوتا ہے۔ کار بھی ہماری طرح ہے۔ اس کو اپنا مقصد حیات پورا ہوتے دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دنبے کو ذبح کیا جاتا ہے، تو اس کو اس بات پر خوشی

ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہوا۔ اس نے کہا وہ خدا تعالےٰ سے دعا کرتا ہے کہ اس کی کارکو اس کے ساتھ جنت میں جگہ دے۔

اللاذقیہ میں دمشق سے زیادہ عورتیں کالے برقعے میں ملبوس دکھائی دیں۔ البتہ سب کی ٹانگیں ننگی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ برقعے کے نیچے یورپی لباس پہنتی ہیں۔ بڈھے مردوں میں بدستور طربوش مقبول تھا۔ سمندر کے کنارے ایک گوجر عورت لوگوں کو کھونگھے خریداری کیلئے پیش کر رہی تھی۔ کندھے پر اس نے ایک جھولا سا لٹکا رکھا تھا، جس میں اس کا ننھا بچہ لیٹا ہوا ماں کے پستان سے دودھ پی رہا تھا۔ میں نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے اپنی تصویر لینے کی اجازت دے گی، جسکے لئے میں نے اسے پیسے دینے کی پیش کش کی۔ مگر اس نے یہ کہہ کر تصویر اتروانے سے انکار کر دیا کہ وہ حاجن ہے۔

راستے میں ایک ٹوٹے ہوئے پل کو دیکھ کر میں نے سلیم سے پوچھا کہ کیا یہ اسرائیلیوں کی کارستانی ہے؟ اس نے کہا نہیں یہاں سے ہمارا شیر (حافظ الاسد) گزرا تھا اور اس کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے پل نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ دوسری جگہ پر ایک پل اچھی حالت میں تھا۔ اس کے بارے میں سلیم نے کہا یہاں سے ابھی ہمارا شیر نہیں گزرا۔

حافظ الاسد کے بارے میں بہت سے لطیفے سننے میں آئے۔ چونکہ سرکاری اشتہاروں میں اس کو **اسد العرب** (عربوں کا شیر) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس لئے لوگوں نے اس کا نام **اسد العرب بلا ذنب** (عربوں کا شیر دم کے بغیر)۔ یہ لطیفہ سننے میں آیا کہ ایک آدمی مر گیا۔ منکر اور نکیر نے اس سے پوچھا۔ تمہارا خدا کون ہے؟ اس نے جواب دیا۔ نور الاتاسی (اس وقت کا وزیر اعلیٰ)۔ تمہارا رسول کون ہے؟ میشل عفلق (سرکاری پارٹی بعث کا بانی)۔ تمہارا دین کیا ہے؟ بعث (سرکاری پارٹی)۔ اس کی رپورٹ خدا تعالےٰ کی خدمت میں کی گئی۔ جس پر اس کو پیش ہونے کے لیے کہا گیا۔ پوچھا گیا کیا ماجرا ہے۔ پھر ایک بار تینوں سوال کئے گئے۔ اب کے جوابات درست تھے۔ خدا تعالےٰ نے پوچھا تم نے یہ جوابات منکر اور نکیر کو کیوں نہ دیئے۔ اس نے جواب دیا میں سمجھا تھا کہ یہ لوگ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ تمہاری طرف سے ہیں، تو میں درست جواب دیتا۔

ایک گدھا سڑک پر آن کر کھڑا ہو گیا اور اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر ایک شخص نے کہا میں اس کو ہٹا سکتا ہوں۔ اس نے جا کر گدھے کے کان میں کچھ کہا۔ اس پر گدھا فوراً چھلانگ لگا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ پوچھا گیا تم نے اسے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا صرف یہ بات کہ اگر فوراً یہاں سے نہ ٹلے، تو تمہیں بعث پارٹی کا ممبر بنا دیں گے۔

گدھے کے ذکر سے یاد آیا کہ آٹو باہن (تیز رفتار سڑک) پر کسی قسم کے جنگلے نہیں لگے ہوئے

تھے، جس کے سبب گدھے اور دوسرے جانور سڑک پر آ جاتے تھے اور کاروں سے ٹکرا کر مارے جاتے تھے۔ ہم نے راستے میں ایک گدھے کو دیکھا، جو کسی حادثے کے سبب سڑک پر مرا پڑا تھا۔ اس کے سرہانے ایک دوسرا گدھا کھڑا تھا، جیسے پہرا دے رہا ہو اور ماتم کر رہا ہو۔ سلیم نے کہا اس نے گدھے کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔ ملک بھر میں آٹو باہن سڑکیں بن چکی تھیں۔ مگر اس زمانے میں ابھی بہت کم ٹریفک تھا۔ بعض اوقات میلوں تک ہمارے سوا کوئی دوسری گاڑی نظر نہ آتی تھی۔

شام کے ملک میں ہر قسم کے پھلدار درخت اگتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے راستے میں بادام، انار، سیب، اخروٹ، کیلا، نبو، انگور، سنگترے، پستہ وغیرہ ہر قسم کے پھل دیکھے۔ سمندر کے کنارے پر آباد بستیاں بہت خوبصورت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وقتوں میں وہاں پر بہت رونق ہوتی تھی۔ البتہ اب بعض مکان نظر آتے تھے، جن کی عرصہ ہوا کسی نے مرمت نہیں کی تھی۔ مگر ان کے باغات بدستور بہت عمدہ حالت میں تھے۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ عوام میں نباتات کے ساتھ خاص لگاؤ پایا جاتا ہے۔ پہاڑ بھی سرسبز ہیں۔ کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ زیتون کے درختوں کے آرچرڈ ہم نے راستے میں دیکھے، جو سینکڑوں سال پرانے تھے۔ سرو کے پودے عام طور سے ہر طرف نظر آتے ہیں۔ سڑک کے کنارے پر بہت خوبصورت خودرو پھول اگتے ہیں۔

مگر سڑکوں پر لگی ہوئی تختیاں، جن پر شہروں کی مسافت لکھی ہوتی ہے، بالکل غیر معتبر ہیں۔ ایک جگہ پر ہم نے لکھا دیکھا حلب ۷ اکلو میٹر۔ جب ہم نے اس سڑک کو چھوڑ کر دوسری سڑک لی، تو مسافت صرف دس کلو میٹر بتائی گئی۔ مگر دس کلو میٹر گزرنے پر ابھی حلب کا نام ونشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اگلی تختی پر حلب کی مسافت ۲۰ کلو میٹر لکھی ہوئی تھی۔ حلب شہر میں داخل ہونے سے پہلے کاروں کی تلاشی لی گئی۔ جب کہ الاخوان المسلمون کی بغاوت عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مارے گئے تھے یا ملک کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ حلب شہر میں ون وے ٹریفک تھا اور پورے شہر میں ٹریفک جام تھا۔ کار کی بجائے انسان پیدل جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد ہم شام کو سلیم کے پھوپھی زاد بھائی سے ملنے کے لیے اس کے گھر گئے، جس کی بیوی عیسائی تھی۔ اس وجہ سے سلیم کی نظر میں وہ بچوں کو اسلامی تربیت دینے کے سلسلے میں قابل اعتبار نہ تھی۔ اس نے خاص طور پر ذکر کیا کہ اس کے پھوپھی زاد کے بچوں میں سے صرف ایک بیٹی باپ کے ساتھ مل کر نماز پڑھتی ہے۔ باقی بچے ماں کے زیر اثر ہیں۔ مجھے یہ بات حیران کن لگی، کیونکہ شام میں لوگ مذہب کے سلسلے میں کم تشدد پسند تھے۔ میں ماہ رمضان میں وہاں پر تھا۔ مگر مجھے وہاں پر پاکستان والی ملائیت نظر نہیں آئی تھی۔ شہروں میں ریستوراں دن کے وقت کھلے تھے اور جو کوئی چاہتا تھا

کھلے بندوں کھا پی سکتا تھا۔ بسوں میں سگریٹ پینا منع تھا۔اس کے باوجود نوجوان سگریٹ سلگا لیتے تھے۔ مجھے ایک اور چیز زیادہ قابل اعتراض لگی ،جس کی طرف سارے مشرق وسطی میں توجہ نہیں دی جاتی ۔وہاں پر کوئی عورتوں ، بوڑھوں یا بچوں کے لئے سیٹ خالی نہیں کرتا۔ میں نے بس میں ایک عورت کو، جو بچوں سمیت سفر کر رہی تھی ، اپنی سیٹ پیش کی ،تو دوسرے مسافروں نے اس چیز پر ناک بھوں چڑھائی اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تھا۔

حلب کا راستہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ بہت بڑے رقبے میں کچھ نہیں اگتا۔ دور دور تک سرخ زمین پھیلی ہوئی ہے، جو ہموار ہے اور جس میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں ملتا۔انسانی وجود کا دور دور تک نام ونشان نہیں ،سوائے اس کے یہاں وہاں کوئی ریوڑ دکھائی دے جاتا ہے یا کوئی چھوٹا موٹا بے نام سا گاؤں جیسے اپنے قافلے سے بچھڑا ہوا نظر آتا ہے۔اس نظارے میں تبدیلی تب آتی ہے، جب حلب کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور دور تک پھیلی ہوئی سرسبز وادی میں آبادی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔مگر یہاں پر ایک پہاڑی حلب کو اپنی اوٹ میں چھپا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جب مسافر اس پہاڑی کی اونچائی سے نیچے اترتے ہیں،تو ان کی نظر سب سے پہلے حلب کے قلعے پر پڑتی ہے، جو شہر کے عین درمیان ایک ٹیلے پر براجمان ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ٹیلے کے نیچے پہاڑی نہیں ہے، بلکہ صدیوں کی آبادیاں ہیں، جو ایک دوسرے کے اوپر بنائی جاتی رہی ہیں۔حلب (عربی میں دودھ کو حلیب کہتے ہیں) کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے حوران جاتے ہوئے یہاں پر اپنی گائے دوہی تھی۔ مجھے یہ روایت کمزور لگتی ہے۔شاید حلب کے پیچھے کوئی اور معنی پوشیدہ ہے۔

یہ شہر صدیوں سے تاجروں کی آماجگاہ رہا ہے، جہاں پر بیٹھ کر وہ مشرق میں ہندوستان اور چین سے اور مغرب میں روم اور مصر کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔اس کی یادگاریں وہ سرائے ہیں،جن کو عربی میں خان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔وہاں پر تاجر آ کر اترتے تھے۔ نچلے حصے میں مال برداری کے جانوروں کو رکھا جاتا تھا اور اوپر کی منزل پر تاجر قیام کرتے تھے۔ان عمارتوں نے اسلامی نظام تعلیم میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔چونکہ ان کے قرب وجوار میں تعلیمی ادارے پائے جاتے تھے،جن میں پڑھنے اور پڑھانے کے لئے دور دور سے شاگرد اور استاد آتے تھے،جن کو رہائش درکار ہوتی تھی۔اس لئے ان کو ٹھیرانے کا انتظام خان میں ہوسکتا تھا،جس کو ہم آج کی اصطلاح میں ہوسٹل کا نام دیتے ہیں۔جب مدارس بنائے جانے لگے،تو ان میں اس چیز کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ وہاں پر نہ صرف پڑھانے کے لئے ایوان بنائے جائیں، بلکہ طالب علموں اور استادوں کی رہائش کے لئے کمرے بنائے جائیں۔ جو خان کی طرح اوپر کی منزل پر ہوتے تھے۔اس شہر کا "مدرسۃ الفردوس" بہت شہرت رکھتا ہے۔

حلب کی مسجد کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ دمشق کی مسجد امویہ کی ہم پلہ تھی۔ اس شہر میں دوصد مینار پائے جاتے ہیں۔ مجھے ایک اور پہلو سے بھی حلب دیکھنے کی خواہش تھی۔ عربی ادب کا مشہور شاعر المتنبی وہاں پر مقیم رہا تھا، جو سیف الدولہ ہمدانی کے دربار سے منسلک تھا۔ میں نے مولوی فاضل کے امتحان کی خاطر اس کا پورا دیوان پڑھا تھا اور بے حد لطف اٹھایا تھا۔ اس کا نشہ میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنے کلام کے بے مثال ہونے کی بنا پر نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس وجہ سے معاصروں نے اس کو المتنبی (جھوٹا نبی) کہنا شروع کر دیا تھا۔ ادب کی دنیا میں وہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ حلب میں ایک گلی اسکے نام سے آج بھی پائی جاتی ہے۔

حلب سے ہمیں سیدھے دمشق جانا تھا۔ یہ سارے دن کا سفر تھا۔ کہنے کو تو فاصلہ صرف ۳۴۱ کلو میٹر کا تھا۔ مگر سلیم کی کار پرانے وقتوں کی تھی، جو اپنی مرضی سے چلتی تھی۔ راستے میں سلیم نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بہت دلکش ہے۔ ربوہ میں قیام کے زمانے میں وہ اپنے مخصوص طریق سے لاؤڈ اسپیکر پر اذان دیا کرتا تھا، جس کے سبب سارے قصبے کا کاروبار رک جاتا تھا۔ مجھے اس روز پتا چلا کہ وہ شاعر بھی ہے۔ چنانچہ اس روز اس نے اپنا قصیدہ سنایا، جو شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا۔ المتنبی کے قصیدے بھی لمبے ہوا کرتے تھے۔

دمشق پہنچے تو میرے ہوٹل کے کونٹر پر ایک نوجوان یورپین عورت کھڑی منتیں کر رہی تھی کہ ٹیلی فون پر اس کی ایک شخص سے بات کرائی جائے۔ مگر اس کو جواب دیا جا رہا تھا کہ نقد پیسوں کی ادائیگی کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے اس کا بل ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ تب کہیں جا کر وہ فون کر سکی۔ شام کے کھانے پر ڈائننگ روم میں وہ میرے پاس آن کر بیٹھی۔ اس نے کہا اس ہوٹل کے لوگ بہت خبیث ہیں، کیونکہ ہر کوئی اس کا پیچھا کرتا ہے۔ لفٹ میں ایک لڑکے نے زبردستی اس کا بوسہ لینا چاہا تھا۔ رات کے وقت ہوٹل کا مالک اس کے کمرے میں گھس آیا تھا، جب کہ وہ سو رہی تھی۔ اس نے شور مچا دیا اور کہا کہ وہ پولیس کے پاس رپورٹ کر کے اس کا ہوٹل بند کروا دے گی۔ تب کہیں جا کر اس نے اس کی جان چھوڑی۔ وہ پولینڈ کی رہنے والی تھی۔ تین بار کی طلاق یافتہ۔ اس کا منگیتر امریکن تھا۔ جس کو لبنان کی سرحد پر روک لیا گیا تھا۔ وہ اسی کے ساتھ فون پر بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ اگلے روز اس کو پیسے مل جائیں گے اور وہ میرا قرض اتار دے گی۔ اس کا پاسپورٹ ڈپلومیٹک تھا۔ اس لئے اس کو سرحد پر نہیں روکا گیا۔ اس کے منگیتر کو بھی داخلہ مل جائے گا، کیونکہ اس کی دوستی سعودی شہزادوں کے ساتھ ہے۔ میں نے پوچھا تم کہاں پر رہتی ہو؟ اس نے جواب دیا میں انٹرنیشنل ہوں۔ بچے پولینڈ میں ہیں، منگیتر امریکن ہے اور میں بیروت اور سعودی عرب کے درمیان آتی

جاتی رہتی ہوں۔ یہ تفصیلات میرے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کے لئے کافی تھیں۔ میں نے اس پر ایک افسانہ "مبروک مبروک" لکھا تھا، جو میری کتاب "شجرِ ممنوعہ" میں شامل ہے۔

سعودی عرب کی زیارت

شام سے مجھے سعودی عرب جانا تھا۔ پورا طیارہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے یہ راز تھا کہ رمضان کا مہینہ چل رہا تھا اور عید کا تہوار بیویاں اپنے خاوندوں کے ساتھ منانے کے لیے جا رہی تھیں۔ سعودیہ میں بہت سے عرب ملکوں کے لوگ بھی کام کرتے ہیں۔ مگر عام طور سے ان کے بیوی بچے پیچھے وطن میں مقیم ہوتے ہیں اور صرف تہواروں پر ان کو ملنے کے لیے آتے ہیں۔ میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک بوڑھی شامی عورت بیٹھی ہوئی تھی، جو عمرہ کرنے کے لیے جا رہی تھی۔ اس کے لیے سعودیہ میں داخلے کا فارم مجھے پُر کرنا پڑا۔ جب میں نے اس کو مقررہ جگہ پر دستخط کرنے کو کہا تو اس نے کہا: "لا اعرف الکتابہ" (میں لکھنا نہیں جانتی)۔ میں نے کہا پھر یہاں پر ضرب کا نشان ہی لگا دو۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے ایک بار ابوظہبی سے پشاور جاتے ہوئے درجن بھر پٹھانوں کے فارم پُر کرنے پڑے تھے۔ سب کے سب کورے اَن پڑھ تھے۔ ہمارے جہاز کی سبھی عورتیں کالے برقعوں میں ملبوس تھیں۔ جب کہ ایسا برقع مجھے شام میں بہت کم نظر آیا تھا۔ یہ چیز سعودیہ میں داخلے کی شرایط میں سے تھی کہ عورتیں داخلے کے وقت برقع پہنے ہوں۔

شام کو چھوڑنے پر ٹیکس لگتا ہے، جو شامیوں کو بھی دینا پڑتا ہے، بلکہ ان کو دوسروں سے زیادہ دینا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اُن کو دو صد لیرے اور غیر ملکیوں کو، اگر وہ کسی غیر عرب ملک جا رہے ہوں، دس لیرے دینے ہوتے تھے۔ عرب ملک کی طرف سفر کرنے پر پانچ لیرے لگتے تھے۔ ملکیوں اور غیر ملکیوں پر ٹیکس کی شرح میں تفاوت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ غیر ملکیوں کو شام میں داخل ہونے پر ایک سو ڈالر مقامی کرنسی میں سرکاری ریٹ پر بدلنے پڑتے ہیں۔ گویا اس طرح وہ اچھا خاصا ٹیکس ادا کر چکے ہوتے ہیں، کیونکہ سرکاری ریٹ اصل شرح تبادلہ کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ مگر شامیوں پر اتنا بھاری ٹیکس لگانے کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کو ملک سے باہر جانا اتنا مہنگا پڑے کہ وہ سوائے اشد ضرورت کے ملک کو چھوڑنے سے باز رہیں۔ اب ایسا ٹیکس تیسری دنیا کے قریب قریب سب ملکوں میں لگتا ہے۔

اس روز کے اخبار میں اگلے وقتوں کے عرب نحوی جاحظ کے بارے میں ایک لطیفہ چھپا ہوا تھا۔ اس سے ایک عورت نے بازار میں پوچھا کہ کیا وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

عورت اس کو لے کر ایک یہودی سنارے کی دکان پر گئی اور کہا: اس جیسی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جاحظ نے سنارے سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ عورت میرے پاس ایک لوح لے کر آئی تھی اور کہا تھا کہ اس پر شیطان کی تصویر بنا دوں۔ میں نے کہا میں نے شیطان کو نہیں دیکھا۔ اس پر عورت نے کہا میں اسے تمھارے پاس لاتی ہوں۔ اب وہ تمھیں لے کر آئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ تم جیسی تصویر بناؤں۔ جاحظ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کو اپنے بدصورت ہونے کا بہت احساس تھا۔ اس وجہ سے اس نے کہا تھا: ''جاحظ کے بارے میں دور سے (باتیں) سنو۔ اس کو دیکھنے نہ جاؤ۔''

درمیانی سیٹوں پر دو شامی عورتیں بیٹھی تھیں، جو شاید بہنیں تھیں اور خوبصورتی میں ایک دوسری کو مات کرتی تھی۔ دونوں کے ساتھ چار چار بچے تھے۔ بڑی بہن کے بچے ذرا سیانے تھے، مگر چھوٹی بہن کے بچے بہت چھوٹے تھے۔ دو تین ماہ کی ایک بچی اس کی گود میں تھی۔ اس سے بڑی بچی یہی ڈیڑھ سال کی ہوگی۔ دوسرے دونوں بچے اپنے قدموں پر چلتے تھے۔ جب جہاز جدّہ میں اترنے والا تھا، تو اس نے مجھے مدد کرنے کو کہا۔ چنانچہ ڈیڑھ سال والی بچی میری گود میں دے دی گئی۔ طیارے سے ٹرمینل کی طرف جاتے ہوئے بہنوں نے بتایا کہ وہ حمص کی رہنے والی ہیں اور اپنے خاوندوں کے ساتھ عید منانے جا رہی ہیں۔ پاسپورٹ کی چیکنگ تک میں ان کے ساتھ رہا اور بچوں کو سنبھالتا رہا۔

جدّے کا ہوائی اڈہ بہت ماڈرن ہے اور اتنا بڑا ہے کہ یورپ کے دو چار ہوائی اڈے اس میں سما سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کی ٹینٹ نما چھت دنیا کے کسی بھی ہوائی اڈے سے بڑی ہے۔ اس کے اندر درخت اگے ہوئے ہیں اور پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں۔ مجھے ہوٹل تلاش کرنا تھا مگر میں ہوائی اڈے کی بھول بھلیوں میں گم تھا۔ ایسے میں دو پاکستانی دکھائی دیے، جو آپس میں اردو بول رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ ہوٹل کے بارے میں میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک پاکستانی ہوٹل ''فندق الشرفیہ'' کے بارے میں بتایا، جو اچھا اور سستا ہے۔ پھر انھوں نے کہا اگر آپ تھوڑی دیر تک ہمارا انتظار کر سکیں، تو ہم اپنے مہمانوں کو وصول کرنے کے بعد آپ کو اپنے ساتھ شہر لیتے جائیں گے اور اس ہوٹل میں پہنچا دیں گے۔ ان کے مہمان پاکستان سے آ رہے تھے، جو اچھا خاصا قافلہ نکلے۔ دو خاندان تھے، جو بے تحاشا سامان اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو سیدھے مکّے چلے جانا تھا، اس لیے دو کاریں کرائے پر لی گئیں اور وہ وہاں کے لیے روانہ ہو گئے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک ان کا قریبی رشتہ دار تھا، وہ ان کے ساتھ چل دیا۔ دوسرا ساتھی، جس کا نام اسد جان تھا، مجھے لے کر جدّہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ پہلی بار ہوائی اڈے پر آیا تھا اور شہر کا راستہ نہیں جانتا، مگر ہمیں ہوٹل تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

دونوں دوست ایک سعودی پاکستانی بنک میں ملازم تھے۔ اسد جان نے کہا کہ وہ صبح کام پر

جاتے ہیں اور واپس لوٹ کر اپنے گھر پر رہتے ہیں۔ کہیں آنا جانا نہیں ہے۔ گھر سے باہر کم نکلتے ہیں، اس ڈر کے مارے کہ کہیں کوئی مقدمہ نہ کھڑا ہو جائے۔ سعودی پولیس جگہ جگہ پر چیکنگ کرتی ہے۔ جس کسی کے پاس اقامہ (رہائشی پرمٹ) نہ ہو اس کو حوالات میں بند کر دیتی ہے۔ کسی سعودی کار سے ٹکر لگ جائے تو اس کی ذمہ داری ہمیشہ غیر ملکی پر ڈالی جاتی ہے۔ سعودی ہر حالت میں حق پر ہوتا ہے۔ اسد جان نے کہا پیسے بہت ملتے ہیں مگر زندگی کا کوئی مزا نہیں ہے۔ پھر ایک پاکستانی انجینئر کی داستان سنائی، جو تھوڑا عرصہ قبل وہاں پر رہنے کے لیے امریکہ سے نوکری چھوڑ کر آیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی چھوٹی بچی کو سکول سے لانے کے لیے گیا۔ راستے میں کسی سعودی کی کار سے ٹکر لگ گئی۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا مگر ٹریفک کے سپاہی نے اس کو گرفتار کر کے جیل خانے میں بھجوا دیا۔ اس نے بہتیرا کہا کہ اس کی بچی سکول کے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے، اس لیے اس کو گھر پہنچانے کی اجازت دی جائے، مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ اس کی بیوی کو فون تک نہ کرنے دیا۔ یہ ویک اینڈ کی بات ہے۔ سپاہی اس کو جیل بھیج کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ پاکستانی کو تین روز تک جیل میں اس کی واپسی تک انتظار کرنا پڑا، کیونکہ قانون کی رو سے صرف وہی سپاہی اس کو جیل سے رہا کر سکتا تھا، جس نے اس کو گرفتار کیا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے افسر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جب خدا خدا کر کے پاکستانی کو رہائی ملی، تو وہ سعودیہ کو خیر باد کہنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔

فندق الشرفیہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا، جس کی عمارت تو اچھی بھلی تھی مگر صفائی ستھرائی کا معیار اچھا نہ تھا۔ البتہ ائر کنڈیشنر کام کر رہا تھا۔ کمرے کا کرایہ ایک سو ریال تھا، جب کہ سعودی ہوٹلوں میں اس سے تین اور چار گنا قیمت مانگی جاتی تھی۔ ہوٹل کے منتظم شریف صاحب نے کہا اگر آپ کو کھانے پینے کا سامان خریدنا ہے، تو رات کا وقت اس کام کے لیے مناسب ہے۔ رمضان کے مہینے میں دکانیں ساری رات کھلی رہتی ہیں اور اگر آپ نے عمرہ کرنا ہے، تو میں آپ کو احرام کی چادریں دے سکتا ہوں۔ ایک چوک آگے ٹیکسیوں کا اڈا ہے۔ وہاں سے چوبیس گھنٹے جب چاہیں سواری مل سکتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ رات کے وقت مکّہ جائیں کیونکہ حاجیوں کا رش کم ہوگا اور دن میں پڑنے والی گرمی بھی نہیں ہوگی۔ یہاں پر سارا شہر رات بھر جاگتا ہے۔ سحری کھا کر لوگ سو جاتے ہیں اور دن کے وقت کاروبار بند رہتا ہے، اس لیے ان دنوں میں آپ کو سرکاری دفتروں میں کسی سے ملنا ہو، تو اس بات کو بھول جائیں۔ رمضان کے دوران یہ لوگ کام پر نہیں آتے اور اگر حاضری لگانے کے لیے آتے بھی ہیں تو کوئی کام نہیں کرتے۔ ان کی بات کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ مجھے مختلف وزارتوں میں دفتر کے اوقات میں ملازمین میزوں پر سوئے ہوئے ملے۔ ایک صاحب کو میں نے اپنے آفس کی میز کے نیچے سویا ہوا پایا۔ ہندو پاک میں مسلمان نمازِ تراویح پڑھنے کے بعد سو جاتے ہیں

اور صبح سحری کے وقت اٹھ کر کھاتے پیتے ہیں اور روزہ رکھ لیتے ہیں۔ عرب ملکوں میں رمضان میں رات کو دن بنا لیتے ہیں اور دن کو رات۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اکثر لوگ روزہ رکھتے ہیں۔

میں شریف صاحب کی ہدایت کے مطابق کھانے پینے کا سامان خریدنے چلا گیا۔ بازار ہوٹل کے پہلو میں تھا، جس میں پاکستانی گانوں کے کیسٹ اونچی آواز میں لگے ہوئے تھے۔ جس طرف دیکھو پاکستانی دھوتیاں باندھے ہوئے دوستوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے مٹر گشت کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میں لاہور کے کسی بازار میں آن نکلا تھا۔ پھر خیال آیا کہ اوتا کے لیے یہاں سے اردو گانوں کے کیسٹ لیتا جاؤں۔ وہ مجھ سے زیادہ ان کی رسیا ہے۔ وہ گانوں کے متن کو تو نہیں سمجھتی، مگر پاکستانی موسیقی کو بہت شوق سے سنتی ہے۔ دکان دار کے مشورے سے میں نے پندرہ بیس کیسٹ چنے۔ پتا چلا کہ ان کے پاس پہلے سے تیار شدہ کیسٹ نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنے کیسٹ کی نقل بنا کر دیتے ہیں۔ مجھے کہا گیا آپ باقی کی خریداری کرنے کے بعد یہاں پر سے گزرتے ہوئے تیار شدہ کیسٹ لیتے جائیں۔ دکان دار کو بالکل احساس نہیں تھا کہ کیسٹوں کی نقلیں بیچ کر وہ کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ اس نے کہا یہاں پر سب کچھ چلتا ہے۔ سعودیوں کو تو یوں بھی پتا نہیں ہے کہ ہم کیا بیچتے ہیں۔

جدّہ میں مجھے سوائے اسلامک کانفرنس کے آفس کے کہیں پر نہیں جانا تھا۔ فون پر ارشد الزمان کے ساتھ وقت طے پا گیا۔ میں اس کو اس زمانے سے جانتا تھا، جب وہ ساٹھ کی دہائی میں جرمنی میں پاکستانی سفارت خانے میں انفارمیشن کا اتاشی تھا۔ وہ مشرقی پاکستان سے تھا اور بنگلہ دیش بننے پر اس کو اپنے ملک کا سفیر بنا دیا گیا تھا۔ جدّہ میں وہ اسلامک کانفرنس کا اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی تھا، مگر جدہ سے کچھ ایسا واقف نہیں لگتا تھا۔ سات آٹھ کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کو راستے میں سعودی پولیس کی گاڑی سڑک کے کنارے پر کھڑی دکھائی دی۔ اس نے فوراً بریک لگا دی اور کہا: بھائی صاحب میں آگے نہیں جا سکتا۔ یہ پولیس والے مجھے کہیں پکڑ نہ لیں۔ شاید وہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھا۔ اس نے مجھے ایک دفتر کے سامنے اتار دیا اور کرایہ لیے بغیر کار کو پیچھے کی طرف موڑ کر چلا گیا۔ اب میں راستے میں کھڑا تھا۔ وہاں پر کوئی ٹیکسی نہیں رکتی تھی۔ میں نے ایک دکان میں پوچھا کہ اسلامک کانفرنس کا دفتر وہاں سے کتنی دور ہے۔ پتا چلا کہ بمشکل ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ دکاندار نے کہا اتنی تھوڑی مسافت کے لیے آپ کو ٹیکسی نہیں ملے گی۔ چونکہ ارشد الزمان کے ساتھ مقرر کردہ وقت تھوڑا رہ گیا تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ باقی ماندہ راستہ پیدل طے کروں۔ اسلامک کانفرنس کے دفتر میں پہنچتے پہنچتے گرمی کے سبب میرا بھرکس نکل گیا۔

ارشد کے ساتھ میری بے تکلفی تھی۔ اس کے ساتھ میں کھل کے بات کر سکتا تھا۔ اسلامک کانفرنس

کی کارکردگی کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ اس نے کسی قسم کی سیاسی، معاشی یا معاشرتی خدمت عالمِ اسلام کی نہیں کی تھی۔ اس کے سالانہ اجلاسوں میں، جس میں سارے عالمِ اسلامی کی ریاستوں کے سربراہ شامل ہوتے تھے، کسی ایک موقع پر بھی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں اسلامی دنیا کو تقویت پہنچی ہو۔ اس نے کہا: تمھاری توقعات غلط ہیں۔ ایک ادارہ، جو سعودی عرب کے زیرِ سایہ ہے، اس سے تمھیں ایسی توقعات رکھنی ہی نہیں چاہییں۔ تم اس ملک میں گھوم پھر کر دیکھو کہ یہاں پر کیسی دھاندلیاں ہوتی ہیں۔ اس ملک کی سیاسی پالیسی امریکہ میں بنتی ہے، جس کے سبب یہاں پر بیٹھ کر کوئی شخص آزادانہ فیصلے نہیں کر سکتا۔

ارشد مجھے ہوٹل تک اپنی کار میں چھوڑنے آیا۔ راستے میں اس نے ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ دکھائی اور کہا: ذرا قیاس لگاؤ کہ اس بلڈنگ میں کیا کاروبار ہوتا ہے۔ میں نے کہا: بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ اس میں کسی کمپنی کا ہیڈ آفس ہے۔ اس نے کہا: تمھاری بات درست ہے، مگر جانتے ہو کہ اس کمپنی کا کاروبار کیا ہے؟ یہاں پر صرف اقامت کے ویزے بکتے ہیں۔ جو کوئی سعودیہ میں کام کرنے کے لیے آنا چاہتا ہے، اس کو اس ملک میں اقامت کا ویزا خریدنا پڑتا ہے۔ یہ کمپنی، جس کو ایک سعودی شہزادے نے قائم کیا تھا، سوائے ویزے بیچنے کے کوئی دوسرا کاروبار نہیں کرتی تھی۔ پھر اسی پر بس نہیں تھا، عام طور سے حکومت یہ توقع رکھتی تھی کہ جو کمپنی لوگوں کو ملک میں لائے گی، وہ ان کو ملازمت بھی دے گی، مگر عملاً یہ ہو رہا تھا کہ کمپنی غیر ملکیوں سے اقامہ کی قیمت وصول کرتی تھی اور جب لوگ سعودیہ میں پہنچ جاتے تھے، تو ان کو کہا جاتا ہے کہ کام تم خود تلاش کرو۔ یہ چیز قانون کے خلاف تھی، مگر سعودی شہزادے کو کون پوچھ سکتا تھا۔ یہ کام صرف یہی ایک کمپنی نہیں کر رہی تھی بلکہ بے شمار دوسرے لوگ بھی اسی طریق سے دولت کما رہے تھے۔ کسی کے پاس دس اقامہ دینے کی اجازت ہوتی تھی، دوسرے کے پاس بیس، تیس یا اس سے زیادہ کی۔ اقامہ کی چھٹی میں جائے رہائش مثلاً جدّہ درج ہوتی تھی۔ اب اگر مزدور مدینہ جانا چاہے، تو اس کو کمپنی کے پاس جانا پڑتا تھا، جو اس کام کے لیے علیحدہ فیس مانگتی تھی۔ ارشد نے کہا: اس کو کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جب ایرانی اور دوسری قومیتوں کے لوگ اسلامی ریاست کے تحت آئے تھے، تو عربوں نے ان کو اپنے معاشرے میں مدغم کرنے کے لیے یہ نظام بنایا تھا کہ کوئی عرب قبیلہ یا خاندان اس شخص کو اپنا مولیٰ (دوست) بنا لیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کام اس وقت بھی معاوضے کے عوض ہوتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اس عجمی کو عرب فیملی کا نام اختیار کرنے کا حق مل جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخی کتابوں میں درج شدہ افراد کی قومیت کا سراغ لگانا آسان کام نہیں ہے۔

پھر اس نے مجھے پرفیومری کی ایک دکان دکھائی، جس میں ہر قسم کے عطر بک رہے تھے، مگر

یورپ کے برعکس، جہاں پر عطر کی شیشیاں عام طور سے چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، وہاں پر شیشیاں خاصی بڑی تھیں۔ میں نے کہا: لگتا ہے کہ لوگ یہاں پر عطر لیٹر کے حساب سے خریدتے ہیں۔ ارشد نے کہا: تمھاری بات درست ہے، مگر اکثر شیشیوں میں عطر کی بجائے الکحل ہوتا ہے، جس کو لوگ پیتے ہیں۔ ملک میں شراب کی خرید وفروخت منع ہے، اس لیے اس کی بجائے عطر کا نام استعمال ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میرے ایک کولیگ کا سالا سعودیہ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ اپنے گھر پر شراب کشید کر کے بیچتا تھا۔ وہاں پر مقیم غیر ملکیوں کو شراب حاصل کرنے کے لیے اپنے سفارت خانوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں، جن کو ذاتی استعمال کے لیے شراب برآمد کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

شریف صاحب کی ہدایت کے مطابق میں شام کے وقت عمرے کے لیے مکّے جانے کی خاطر ٹیکسیوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور سب مسافروں سے ان کے پاسپورٹ لے کر ایک آفس میں گیا، جہاں پر اس بات کی پڑتال کی جاتی تھی کہ مسافر مسلمان ہے یا نہیں۔ غیر مسلموں کو مکّے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ راستے میں روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا۔ ٹیکسی کو سڑک کے کنارے پر روک کر مسافروں نے روزہ کھولا اور ڈرائیور نے تیمّم کر کے نماز ادا کی۔ ہم عشاء کی نماز سے پہلے مکّے پہنچ گئے، جہاں پر ہمیں حرم کے سامنے بڑے میدان میں اتار دیا گیا۔ وہاں پر اس وقت ہزاروں انسان بالخصوص افریقی عورتیں ڈیرہ لگائے بیٹھی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ رات بھی وہیں پر بسر کرتی تھیں۔ شاید دن کے وقت، جب سورج چمکتا تھا، سب لوگ حرم شریف میں چلے جاتے تھے۔ وہاں پر کسی کو سونے کی اجازت نہ تھی، اس لیے رات گزارنے کے لیے ان کو باہر کھلے میدان میں آنا پڑتا تھا۔ حرم شریف میں چوبیس گھنٹے طواف ہوتا ہے اور لاکھوں انسان ہر وقت وہاں پر موجود ہوتے ہیں۔

حرم شریف، جس کے اندر نہ صرف خانہ کعبہ ہے، بلکہ جس کے پہلو میں پایا جانے والا اصفا ومروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنے والا راستہ بھی ہے، جس کو مسقّف کر دیا گیا ہے۔ حرم شریف کی عمارت اتنی وسیع ہے کہ وہاں پر بیک وقت کئی لاکھ انسان جمع ہو سکتے ہیں، چنانچہ عشاء کی نماز اور تراویح میں شرکت کرنے کے لیے کم وبیش ایک لاکھ انسان وہاں پر موجود تھے۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے طواف شروع ہو گیا، جس میں اس روز دس بیس ہزار انسان حصہ لے رہے تھے۔ یہ نظارہ بہت ایمان افروز ہے۔ کیا بوڑھے اور کیا بچے اور مرد وعورتیں سب ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رواں ہوتے ہیں اور **لبیک اللھم لبیک** کی آواز سے پورا ماحول مرتعش ہوتا ہے۔ میں نے اس روز وہاں پر ایسے ایسے نظارے دیکھے، جو آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ ایک ایرانی حاجی، جو اپنے ساتھ اپنے بچوں کو لایا تھا، بلند آواز میں تکبیر کہتا تھا، جس کو اس کی بڑی بیٹی دہراتی جاتی تھی اور اس کے کم سن

بھائی، بہن کی آواز پر الفاظ کو اپنے معصوم لہجے میں دہراتے تھے۔ عام طور سے حاجیوں کے ساتھ ان کے عرب معلّم ہوتے ہیں، جو مسنون دعائیں بلند آواز میں پڑھتے ہیں، جنکو حاجی دہراتے ہیں۔ میں اکثر کسی ایسے گروپ کے ساتھ چلتا تھا اور مسنون دعائیں ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ معذور حاجیوں کو دو اور بعض اوقات چار قلی ایک چارپائی یا اس سے ملتے جلتے کھٹولے پر ڈال کر اپنے سروں پر اٹھا کر طواف کراتے ہیں۔ سب سے نازک مرحلہ وہ ہوتا ہے، جب طواف کے دوران حاجی حجرِ اسود کو چھونا یا چومنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس کونے میں ہر لحظہ انسانوں کا ایک جمگھٹا ملتا تھا، جو ایک دوسرے کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوے اس کوشش میں ہوتے تھے کہ کسی طریق سے حجرِ اسود کو چوم سکیں۔ میں اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس کشمکش میں شامل ہو کر دوسروں کے ساتھ کشتی لڑوں، کیونکہ وہاں پر ہونے والی دھکا بازی کے لیے انسان کو کسی ماجھے گامے کی طرح صحت مند ہونا چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو پہلوانوں نے انسانوں کے اس جمگھٹے کو دھکیلنا شروع کیا۔ میں انکی پشت پر تھا اس لیے جب انکی اجتماعی کوششوں سے حجرِ اسود ایک آدھ منٹ کے لیے انسانوں سے آزاد ہوا، تو میں نے بھی آگے بڑھ کر اسکو ہاتھ لگایا اور اپنے ہاتھ کو حضرت عمرؓ کے الفاظ دہراتے ہوے چوم لیا۔ آپؓ نے فرمایا تھا: تم محض ایک سیاہ پتھر ہو۔ خدا کی قسم اگر میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھیں چومتے ہوے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تمھیں کبھی نہ چومتا۔

صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ کی پیروی میں سعی کرنے پر بہت وقت لگ جاتا ہے، کیونکہ حاجیوں کی کثرت کے سبب انسان اتنی تیزی سے نہیں دوڑ سکتا، جو سنت ہے۔ تاہم اس سارے رقبے پر ایک گیلری بنا دی گئی ہے، جس میں ہر چند میٹر کے فاصلے پر کولر لگے ہوے ہیں۔ اس طرح سعی حضرت ہاجرہ کی طرح ایک صحرا میں نہیں ہوتی، بلکہ ایک ایسی گیلری میں، جس میں بار بار سرد ہوا کے جھونکے حاجیوں کا پسینہ سکھا دیتے ہیں۔ جگہ جگہ پر پانی کی سبیلیں لگی ہوئی ہیں جن کو بنانے کا ٹھیکہ شاید کسی جرمن کمپنی کو دیا گیا تھا۔ پورے رقبے میں اور مسجدِ حرام میں کئی سو جگھوں پر اس کمپنی کے لگائے ہوے کولر نظر آتے ہیں، جن پر کمپنی کا نام **Gott** درج ہے۔ جرمن زبان میں خدا تعالیٰ کو گوٹ کہتے ہیں۔ گویا خدا کے گھر میں پانی کے کولر جرمن گوٹ نے لگا رکھے تھے۔

جب میں طواف اور سعی سے فارغ ہوا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ اب میں نے جدّہ واپس لوٹنے کا ارادہ کیا، جہاں پر میں بمشکل سحری کے وقت پہنچ سکتا تھا۔ مسجدِ حرام سے باہر نکلتے ہی ایک پاکستانی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں جدّہ جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: اس کے پاس ایک مسافر پہلے سے ہے۔ اب مجھ سمیت دو ہو گئے۔ چند منٹوں تک وہ دوسرے مسافروں کی راہ تکنی چاہتا تھا۔ جونہی اس کو ایک آدھ مسافر اور مل گیا وہ جدّہ کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف پاکستانیوں کی

تلاش میں تھا۔ منٹوں کے اندر اس کو ایک مسافر اور مل گیا۔ روانگی سے پہلے اس نے ہم سے درخواست کی کہ اگر کسی جگہ پر پولیس چیک کرنے کے لیے اس کو روکے اور وہ ان کو بتائے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو لے جارہا ہے، تو ہم اس بات کی تصدیق کر دیں، وگرنہ اس پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔ اس کے پاس ٹیکسی چلانے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے وہ اپنی پرائیوٹ کار میں سواریاں بٹھا لیتا تھا۔

اس کو سعودیہ میں آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ اس دوران میں اس کو کوئی ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ جس شخص نے اس کو اقامہ کی چٹھی دی تھی، اس نے اس سے بیس ہزار روپے وصول کیے تھے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ وہ اس کو ملازمت نہیں دے سکتا۔ اس کا پاسپورٹ البتہ اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ٹیکسی چلانے کا کام اس نے خود شروع کیا تھا۔ اس نے کہا: اگر آپ مدینہ جانا چاہتے ہیں، تو میں آپ کو لے جا سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے اپنے اقامہ دینے والے سے اجازت کی چٹھی حاصل کرنی ہوگی، جس کے لیے وہ نقد رقم طلب کرے گا۔ اس نے کہا: کہنے کو تو اس ملک میں غلامی نہیں پائی جاتی مگر ہمارے ساتھ جو سلوک یہاں پر کیا جاتا ہے وہ غلاموں سے بھی بدتر ہے۔

میری اگلی منزل سعودیہ کا دارالسلطنت الریاض تھی۔ میں نے چلنے سے پہلے ڈاکٹر فہیم اعظمی کو، جو اس زمانے میں وہاں پر رہائش پذیر تھے، اپنی آمد کی اطلاع دے رکھی تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ میرے لیے کسی ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیں مگر انھوں نے مجھے اپنے گھر پر ٹھیرایا۔ ہماری واقفیت اس وقت تک محض غائبانہ تھی۔ ہم دونوں صہبا لکھنوی کے مجلّے ''افکار'' میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھے بس اتنا پتا تھا کہ سجاد باقر رضوی کے بڑے بھائی ہیں اور پاکستان ائرفورس میں ونگ کمانڈر رہ چکے تھے۔ ان دنوں وہ سعودی ائرفورس میں بطور مشیر کام کر رہے تھے۔

فہیم اعظمی ان غیر معمولی انسانوں میں سے تھے، جنھوں نے ائرفورس میں لمبے عرصہ تک رہنے کے دوران بھی ادب سے اپنا ناطہ قائم رکھا تھا۔ میں ان کو بطور افسانہ نگار کے جانتا تھا، جس کے قلم سے ایسے افسانے نکل چکے تھے، جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے مجھے اپنا ناول ''جنم کنڈلی'' دیا، جس میں وہ ایک نئے روپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ ناول اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں کہانی سنانے کی جو تکنیک برتی گئی ہے، وہ جیمز جائس کی یاد دلاتی ہے۔ پیٹر بخسل نے کہا تھا کہ کوئی شخص جائس کے ناول **Finnegans Wake** کو نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے ''جنم کنڈلی'' کو دو بار پڑھا ہے اور مجھے یہ اقرار کرتے ہوئے ذرہ بھر شرم نہیں آتی کہ میں اس کو نہیں سمجھ پایا ہوں۔ اس کے بعض ٹکڑے مجھے جانے پہچانے لگتے ہیں، اس کے باوجود اس ناول کی مکمل کہانی میری گرفت میں نہیں آتی۔ اگر انھوں نے مجھے نہ بتایا ہوتا کہ ان کے والد عرصہ ہوا لاپتا ہو گئے تھے اور تب سے ان کے بارے میں

کبھی کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ کہاں گئے تھے اوران کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا تھا،تو میں اس ناول کے ان حصوں کو بھی نہ سمجھ پاتا، جہاں پر وہ اس حادثے کو کہانی میں سموتے ہیں۔

ان کی یہ عادت مجھے بہت پسند آئی کہ وہ ہر بات کمال سادگی کے ساتھ بیان کردیتے تھے۔ مثلاً جب میں نے جاننا چاہا کہ انھوں نے کس مضمون میں ڈاکٹریٹ کی تھی اور کس یونیورسٹی سے،تو انھوں نے ایک یونیورسٹی کا نام لیا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔ پتا چلا کہ ان کو پاکستان کے بارے میں ایک مختصر مضمون لکھنے پر ڈگری مل گئی تھی۔البتہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کس ملک میں رجسٹرڈ تھی۔ ڈگری قیمت لے کر ڈاک کے ذریعے بھیج دی گئی تھی۔ایسی یونیورسٹیوں کے اشتہار یورپ کے اخباروں میں روزانہ چھپتے ہیں۔امیدوار اگران کی طرف سے مقررشدہ فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہو،تو وہ ہر قسم کے کورسوں اور امتحانات سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔صرف فہیم اعظمی ہی نہیں بعض دوسرے پاکستانی ادیب بھی اس قسم کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کرچکے ہیں۔لاہور کے ایک بزرگ شاعر غلام مصطفٰی تبسم چند ماہ کے لیے اپنے عزیزوں کے پاس امریکہ میں جا کر ٹھیرے تھے۔اس قیام کے اختتام پر جب وہ وطن واپس لوٹے،تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے مزین تھے۔اسی طرح چند برسوں سے کینیڈا میں مقیم ایک دوسرے بزرگ ادیب نے بھی ایسی ڈگری شاید مراسلت کے ذریعے حاصل کی تھی۔فہیم اعظمی نے وطن لوٹنے پر کراچی میں رہائش اختیار کی اور ایک ماہوار رسالہ ''صریر'' شائع کرنا شروع کیا، جسے وہ ۲۰۰۴ء میں اپنی وفات تک باقاعدگی کے ساتھ کامیابی سے نکالتے رہے۔ان کو ادبی تنقید کی ماڈرن تھیوریوں میں دلچسپی تھی۔آخری برسوں میں وہ پاکستان میں مابعد جدیدیت کے سب سے اہم پرچارک تھے۔ان کی وساطت سے میری ملاقات الریاض میں بہت سے اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہوئی، جن میں صلاح الدین پرویز، راشد فضلی اور شمیم مناروی شامل تھے۔صلاح الدین پرویز نے اپنا ناول ''نمرتا'' دیا، جو اپنی طرز کی ایک شاہکار تصنیف ہے،مگر جس کو قاری سمجھ نہیں سکتا۔

میں ایک ہفتہ الریاض میں مقیم رہا اور ہر روز سعودیہ کی مختلف وزارتوں کا طواف کرتا رہا۔رمضان ہونے کے سبب وزارتوں کے سیکرٹریوں کے ساتھ بہت کم مفصل گفتگو ہوسکی۔ وزارتوں کی شائع کردہ رپورٹیں عام طور سے دستیاب نہ تھیں۔دوپہر تک ایک یا دو سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہوسکتی تھیں۔اگر میں نے جرمن سفارت خانے سے مدد لی ہوتی،تو ان کی وساطت سے زیادہ کامیابی کی امید کی جاسکتی تھی۔البتہ بازار کے کتب خانوں سے تازہ مطبوعات بڑی تعداد میں مل گئیں۔اس کے باوجود میں ذاتی طور پر سعودیہ کے دورے سے مطمئن نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے وہاں کے بازاروں میں گھوم پھر کر وہاں کی زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں،جن کے بارے میں عام طور سے ملک سے باہر بہت کم خبریں پہنچ

پاتی ہیں۔ مثلاً میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سعودیہ میں سگرٹ نوشی کے خلاف ایک باقاعدہ مہم جاری تھی۔ تمام سرکاری عمارتوں میں اس مضمون کے اشتہار نظر آتے تھے۔ وزارت المعارف کی دیوار پر ایک پوسٹر لگا ہوا تھا، جس پر لکھا تھا: سگریٹ نوشی ایک ہلاک کر دینے والی بلا ہے۔ اس کے نیچے ایک چرٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی، جس میں ایک سانپ تمباکو کی جگہ پر کنڈلی بنا کے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا پھن باہر جھانک رہا تھا۔ کسی عرب ملک میں ایسی مہم کا چلایا جانا بہت انقلابی اقدام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں یونیسکو کے تحت منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے مصر گیا، جس میں پینتیس ڈیلیگیٹ شامل ہوے۔ ان میں سے سات یورپ اور کینیڈا سے آئے تھے، جب کہ باقی کے شرکاء عرب ملکوں کے نمائندے تھے۔ عرب ملکوں سے آنے والے تمام افراد سگرٹ نوشی کر رہے تھے۔ وہاں پر ابھی یہ بات نہیں پہنچی تھی کہ سگرٹ نوشی اجتماعی محفلوں میں نہیں کی جانی چاہیے، بالخصوص اگر وہاں پر ایسے افراد بھی موجود ہوں، جو تمباکو نوشی سے پرہیز کرتے ہیں۔ یورپ میں اس چیز کو گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے رواج مل چکا تھا اور میٹنگوں کے دوران سگرٹ نوشی روک دی گئی تھی۔

یمن کا سفر

یمن میرے دورے کا تیسرا ملک تھا۔ صنعاء جانے والے طیارے کی قطار میں میرے سوا سارے مسافر یمنی تھے۔ ایک شخص نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ دھر کر کہا: **نحن نسافر الی صنعاء** (ہم صنعاء جا رہے ہیں)۔ ساتھ ہی اس نے پی آئی اے کے کونٹر کی طرف اشارہ کیا، جس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ تم غلطی سے اس قطار میں آ نکلے ہو۔ پاکستان جانے والی ائر لائن کا آفس ادھر ہے۔ میں نے جواب دیا: **معلوم یا حاجی معلوم**۔ میرا جواب سن کر وہ کسی قدر سٹپٹایا۔ اس کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا کہ اسے اب بھی یقین تھا کہ میں غلط قطار میں کھڑا تھا، اس لیے اسے اطمینان دلانے کے لیے میں نے اپنا بورڈنگ کارڈ اس کی ناک تلے لہرا دیا۔ اس کی بات اپنی جگہ پر درست تھی کہ کسی غیر ملکی کو یمن میں جا کر کیا لینا تھا۔ وہاں کے باشندے خود پیسے کمانے کے لیے سعودی عرب آتے تھے۔ اس زمانے میں ابھی یمن میں کالا سونا (تیل) دریافت نہیں ہوا تھا۔

سعودیہ کے طیارے کی روانگی کے چنداں بعد ائر ہوسٹسوں نے، جو خدا جانے کس کس ملک سے تھیں، جوس اور دوسرے مشروبات مسافروں کو پیش کیے اور وہ بھی دن دیہاڑے رمضان کے مہینے میں۔ میں چونکہ روزے سے نہیں تھا اس لیے میں نے ٹماٹر جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ یمنی مسافروں کے ہاتھ

گلاس کی طرف اٹھتے تھے، مگر دوسروں کی طرف دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ وہ بھی روزے سے نہیں تھے، مگر ایک دوسرے سے شرم کھا رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے سعودیہ کی سرزمین سے پرواز کیا تھا، جہاں پر روزہ رکھا ہی نہیں جاتا رکھوایا بھی جاتا تھا۔ وہاں پر وہابیوں کا راج تھا، جو مذہبی امور میں تشدد کرنے سے نہیں چوکتے۔

یمن میں اکثریت شافعیوں کی ہے (اندازاً پینتالیس فیصد) مگر حکومت صدیوں تک زیدی شیعوں کے ہاتھ میں رہی تھی، جنکا آبادی میں تناسب چالیس فیصد کہا جاتا ہے۔ زیدی چوتھے امام حضرت علیؓ ابنِ حسینؓ کے بیٹے حضرت زیدؓ کے پیروکار ہیں۔ آخری زیدی امام محمد بدر کے خلاف ۱۹۶۲ء میں اسکی جانشینی سے ایک ہفتہ بعد عبداللہ السلال نے بغاوت کی تھی، جسکے نتیجے میں سالہا سال تک اس ملک میں خانہ جنگی کا دور دورہ رہا تھا۔ امام بدر بھاگ کر قبائلی علاقے میں چلا گیا تھا۔ خانہ جنگی ۱۹۷۰ء میں جا کر ختم ہوئی اور ملک دوبارہ متحد ہوا۔ ایک جرمن صحافی ہارالڈ فوکے (Harald Vocke) امام بدر کی فوج کی معیت میں یمن کے دور دراز علاقوں میں گھومتا پھرا تھا۔ اس نے جرمنی واپس لوٹنے پر ایک کتاب لکھی تھی جسکا عنوان تھا: ''یمن کا سفر گھوڑے کی کاٹھی پر''۔ اس کتاب میں مصر کے صدر جمال عبد الناصر کے خلاف زہر اگلا گیا تھا، کیونکہ مصر نے عبداللہ السلال کے انقلاب کی پشت پناہی کی تھی اور چالیس ہزار فوجی اس کی کمک کی خاطر یمن بھیجے تھے۔ ہمارے جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ کے اس زمانے کے ڈائریکٹر ڈاکٹر میسرشمیٹ (Messerschmidt) نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قارئینِ کتاب کے حق میں یہ بات بہتر ہوتی اگر مصنف یمن کے سفر سے گھوڑے کی کاٹھی سمیت واپس نہ لوٹتا۔

میں نے سعودیہ کے بورڈ میگزین کے نقشے پر نگاہ ڈالی، تو پتا چلا کہ ہمارے طیارے کا روٹ عین مارب کے اوپر سے گزرتا تھا، جو قدیمی وقتوں میں ایک اہم شہر ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان اور حضرموت سے آنے والے قافلوں کا وہاں ملاپ ہوتا تھا۔ میں نے ائر ہوسٹس سے جاننا چاہا کہ کیا مارب کا ڈیم جہاز میں سے نظر آئے گا۔ اس نے کہا وہ کپتان سے پوچھ کر بتاتی ہے۔ کپتان، جو یمن کا رہنے والا تھا، اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر خود میرے پاس آگیا۔ اس نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ مجھے جزیرہ نماعرب کی تاریخ میں دلچسپی تھی۔ اس نے کہا ہمارا طیارہ چند منٹوں میں اس وادی کے اوپر سے گزرے گا، جس کو زمانہِ قدیم میں جنتِ ارضی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس خطے کی زرخیزی کا راز آبپاشی کی نہروں کا نظام تھا، جو صدِ مارب سے نکلتی تھیں۔ اس نے کہا مجھے یمن میں قیام کے دوران ضرور وہاں پر جانا چاہیے۔ تھوڑا پہلے صنعاء سے مارب جانے والی سڑک کا افتتاح ہوا تھا، جس کے سبب وہاں پر جانا آسان ہو گیا تھا۔ وہ دیر تک

میرے پاس بیٹھا رہا اور راستے میں پڑنے والے مقامات کے بارے میں بتاتا رہا۔ جہاز میں سے وادی تو صاف نظر آتی تھی، مگر اتنی بلندی سے ڈیم یا مارب شہر کے آثار کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

صنعاء کے مطار پر میرا دوست اور کولیگ ڈاکٹر پوئین (Puin) مجھے لینے کے لیے آیا ہوا تھا، وہ جرمنی کی سارلینڈ یونیورسٹی (Saarland University) میں پڑھاتا تھا اور اس زمانے میں ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں چار برسوں سے صنعاء میں مقیم تھا۔ اسے عربی خوب آتی تھی۔ یمن کے قیام نے اس کی زبان دانی کو مزید جلا بخشی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ ڈیڑھ برس الریاض یونیورسٹی میں پڑھ چکا تھا۔ اس کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ حضرت عمرؓ کے دیوان (نظامِ ریاست اور بیت المال) کے بارے میں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے عبدالوہاب کی تحریک الوہابیہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کی لینڈ روور کو دیکھ کر میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا اس سے زیادہ مضبوط ٹینک اسے مجھے ہوائی اڈے سے لانے کے لیے نہیں ملا تھا۔ اس نے کہا اتنی جلد بازی نہ کرو۔ صنعاء کی سڑکیں دیکھ کر تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہاں پر صرف اس قسم کی گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ اس زمانے میں صنعاء کی جملہ سڑکیں ٹوٹی ہوئی تھی، جن کی مرمت بقول پوئین اس وقت سے نہ ہوئی تھی، جب اس شہر کو حضرت نوحؑ کے بیٹے سام نے آباد کیا تھا۔

ہم ہوائی اڈے سے شہر کی جانب روانہ ہوئے، تو پوئین نے کہا راستے میں خاص طور پر دو چیزوں پر نظر رکھنا۔ اول دکانوں کے سائن بورڈ اور دوم ٹریفک پولیس کے سپاہی۔ سائن بورڈوں کا معاملہ آسان تھا۔ ان کی بدولت ہمیں خوب ہنسنے کا موقع ملا۔ قریب قریب ہر بورڈ پر انگریزی کے ہجّے غلط تھے۔ اس کی تشریح یہ تھی کہ دکانوں کے مالکان انگریزی کی حد تک نیم خواندہ اور سائن بورڈ لکھنے والے پینٹر اکثر ان پڑھ تھے۔ پوئین نے سارے شہر میں گھوم پھر کر سائن بورڈوں کی رنگین سلائیڈز بنا رکھی تھی، البتہ ٹریفک پولیس کے سپاہیوں کا قصہ میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ ان کی وردیاں ٹھیک ٹھاک تھیں اور وہ چاق و چوبند کھڑے اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ پوئین نے کہا ان کے قدموں میں پڑی ہوئی کنکریوں کے ڈھیر پر نظر ڈالو، جو محض اتفاقی طور پر وہاں موجود نہیں ہے۔ جب کوئی ڈرائیور ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور سپاہی کے سیٹی بجانے پر نہیں رکتا، تو سپاہی اس کی کار پر پتھر دے مارتا ہے۔ میں نے کہا اس سے تو بہتر ہے کہ انسان رک جائے۔ پوئین نے کہا ایسی بیوقوفی کبھی نہ کرنا، کیونکہ ایک دفعہ تم سپاہی کے ہتھے چڑھ گئے اور اس نے جان لیا کہ تم غیر ملکی ہو تو رشوت اور وہسکی کی بوتل لیے بغیر تمھاری جان نہیں چھوڑے گا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ سیٹی سنتے ہی وہاں سے رفو چکّر ہو جاؤ۔

پوئین نے نئی آبادی میں ایک بنگلہ کرایے پر لے رکھا تھا۔ مجھے جس کمرے میں ٹھیرایا گیا وہ نیچے سے اوپر تک کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ چاروں دیواروں کے ساتھ الماریاں لگی ہوئی تھیں، جن میں کتابوں کو

مضمون وار ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ان میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں، جو دنیا کی کسی لائبریری میں نہیں پائی جاتیں۔ چنانچہ جب میں پچھلے پہر قیلولہ کرنے کے لیے اپنے کمرے میں گیا، تو بارھویں صدی کے مصنف نشوان بن سعید الحمیری کی کتاب **عقد الدرر السلوانیه الملتقت من شرح النشوانیه** کی فوٹو کاپی میرے ہاتھ لگ گئی۔ اس کتاب میں ملکہ سباء کے بارے میں ایک عجیب وغریب داستان درج ہے، جس کو یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

''الخذاء (مارب کا بادشاہ الخذاء بن سرح) شکار کا رسیا تھا۔ ایک روز شیر کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اپنی سلطنت کی سرحد سے باہر دشت میں نکل گیا۔ اس نے ایک ہرنی دیکھی، جس کے پیچھے ایک بھیڑیا لگا ہوا تھا۔ الخذاء نے اپنے پہلے شکار کو بھلا دیا اور بھیڑیے کے پیچھے لگ گیا، جو ہرنی کا پیچھا کرتے ہوئے پہاڑ کی ڈھلوان پر پائے جانے والی ایک کھوہ میں پھنس گیا تھا۔ الخذاء بھیڑیے کو مارنے کے بعد ہرنی کے پیچھے چل دیا، جو اپنی سبقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب ہوگئی تھی۔ جب بادشاہ شکار کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے محل سے بہت دور نکل گیا، تو ایکا ایکی ایک دھات سے بنے ہوئے شہر کو اپنے روبرو پایا، جو چار عظیم ستونوں پر کھڑا تھا اور کھجور کے درختوں اور پھلدار پودوں کے اوپر بنا ہوا تھا۔ بادشاہ حیران و پریشان ایک ستون کے سامنے جا کر رکا ہی تھا کہ ستون کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر نکلا۔ اس نے سلام کیا اور کہا اے بادشاہ میں تمھیں حیران دیکھتا ہوں۔ میں تمھیں اس کی حقیقت بتاتا ہوں۔ یہ شہر مارب ہے جس کا وہی نام ہے، جو تمھاری سلطنت کا ہے، مگر یہاں پر جن اور جادوگر رہتے ہیں اور میں یعلب بن ساب ان کا بادشاہ ہوں۔ جب وہ یوں کھڑے باتیں کر رہے تھے تو ایک بے حد خوبصورت لڑکی اس طرف آئی اور ان پر نظر ڈالے بغیر شہر میں داخل ہوگئی۔ ملک الخذاء پسندیدگی سے لڑکی کے پیچھے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے جنوں کے بادشاہ سے لڑکی کے بارے میں جاننا چاہا۔ بادشاہ نے جواب دیا یہ میری بیٹی ہے۔ کیا تم نے اسے نہیں پہچانا؟ یہ وہی ہرنی ہے جس کا تم نے بھیڑیے کو مارنے کے بعد پیچھا کیا تھا۔ ملک الخذاء نے لڑکی کو اپنی زوجیت میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا اور جب بادشاہ یعلب نے ہامی بھر لی تو یہ طے پایا کہ شادی ایک ماہ کے بعد انجام پائے، جس میں دونوں مملکتوں کے معزز لوگ شامل ہوں۔ اس وعدہ کے ملنے کے بعد الخذاء نے اپنی سلطنت کی طرف جانے کے لیے رخ پھیرا، مگر صرف چند قدموں کے بعد شہر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اپنے محل میں لوٹنے کے بعد اس نے اپنے مصاحبوں کو نہ بتایا کہ اس کو کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب مقررہ دن آ پہنچا تو وہ اپنے مصاحبوں اور سارے سرداروں سمیت اس پراسرار شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پر حیرت انگیز طور پر ایک محل کو پایا، جو چمکتے دمکتے ہوئے سونے سے بنا ہوا تھا اور جس کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے

شیشے جواہرات کی طرح جگمگا رہے تھے۔محل کے اندر پانی دھات کی نلکیوں میں سے بہہ رہا تھا۔کھجور کے درخت، جھاڑیاں اور پودے مزیدار پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور ایک مسحور کر دینے والی مہک پھیلا رہے تھے۔جنوں کے بادشاہ نے الخذاء اور اس کے ہمراہیوں کا شان وشوکت کے ساتھ استقبال کیا اور انھیں محل میں خوش آمدید کہا۔ جب باراتی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو تمام میزوں پر بہترین کھانے اور مشروبات جیسے کسی پوشیدہ ہاتھ نے چن دیے۔محل کا اندرونہ قیمتی قالینوں اور سنہری ساز وسامان سے سجایا گیا تھا۔تین روز کے جشن اور تہوار کے ساتھ شادی منائی گئی۔اس طرح ملک الخذاء بادشاہ یعلب کی بیٹی حورا کو اپنی زوجیت میں لایا۔ وہ محل اس شاہی جوڑے کی جائے رہائش بنا اور اسی میں آگے چل کر ان کی بیٹی ملکہ بلقیس پیدا ہوئی۔‘‘

یہی ملکہ بلقیس اپنے باپ کی جانشین بنی اور ملکہ سباء کے نام سے مشہور ہوئی۔یمن کے باسی آج بھی اس کو بلقیس کے نام سے جانتے ہیں اور بے شمار لوگ اپنی بیٹیوں کو یہی نام دیتے ہیں۔میری ملاقات صنعاء میں اس ملک کی مشہور شاعرہ ملکہ بلقیس کے ساتھ ہوئی، جو حسن وجمال میں ملکہ سباء سے یقیناً ہیٹی نہیں تھی۔ وہ نثری نظمیں لکھتی تھی، جو اس لحاظ سے ممتاز تھیں کہ ان میں عورتوں کے جذبات کی ترجمانی بہت بے باکی کے ساتھ ہوتی تھی۔

پچھلے پہر پوئین نے مجھے قرب وجوار کے دیہات دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ملک میں گھومنے پھرنے کے لیے سرکاری پرمٹ لینا ہوتا تھا اور صنعاء میں مقیم غیر ملکیوں کو شہر کی سرحد سے باہر جانے کی قطعی ممانعت تھی، مگر پوئین کو سیر وتفریح کے لیے صنعاء سے باہر جانے کی خاص اجازت ملی ہوئی تھی۔قبائلی علاقہ شہر کی سرحد سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔صدرِ مملکت عبداللہ صالح نے اپنا رہائشی مکان اپنے قبائلی خاندان کی زمینوں میں بنوا رکھا تھا۔ یہ امران کے ذاتی تحفظ کے لیے اہم تھا۔شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ایک ہسپتال کی عمارت کھڑی تھی، جو حکومتِ کویت کے خرچ پر تعمیر ہوئی تھی اور جس میں ہر قسم کے آلات اور علاج معالجے کی جملہ ضروریات کا سامان موجود تھا۔ہسپتال کئی سال سے بند پڑا تھا کیونکہ اس کے افتتاح سے چند روز قبل اس وقت کے صدرِ مملکت حمدی ایک قاتلانہ حملے کا شکار بن گئے تھے۔اس چیز کو بدشگونی پر محمول کرتے ہوئے ہسپتال کا افتتاح روک دیا گیا تھا۔

ہسپتال مارب ڈیم کو جانے والی سڑک پر واقع تھا، جو انھی دنوں میں تکمیل کو پہنچی تھی۔اس کا ٹھیکہ چین کی ایک سرکاری فرم نے لے رکھا تھا، جو سزا یافتہ قیدیوں سے کام کرواتی تھی۔ہسپتال کے بالمقابل ایک یادگار کھڑی تھی، جو ان مزدوروں کے لیے بنائی گئی تھی، جو سڑک کی تعمیر کے دوران حادثات کا شکار ہو گئے تھے۔چینیوں کے پاس ماڈرن مشینیں نہیں تھیں، اس لیے مزدوروں کو زورِ بازو سے چٹانوں کو کاٹنا پڑتا

تھا۔ عین انھی دنوں میں یمن میں واٹر ورکس قائم کرنے اور پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں بنانے کا ٹھیکہ جنوبی کوریا کی ایک فرم نے لے رکھا تھا، جس کے پاس ہر قسم کی مشینیں اور بل ڈوزر موجود تھے۔ میں نے ان کے کارکنوں کو آدھی رات کے وقت کام کرتے ہوئے دیکھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ اس زمانے میں یمن کے جنوبی کوریا کے ساتھ سفارتی تعلقات نہیں تھے۔ ٹھیکہ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا اور وہی تمام اخراجات کی ادائیگی کی ذمہ دار تھی۔ کویت اور سعودی عرب کے علاوہ بعض دوسرے عرب ملک بھی یمن میں ترقیاتی کام کروا رہے تھے۔ مصر اور سوڈان کے ہزارہا استاد یمن کے سکولوں میں پڑھا رہے تھے۔ یمن کی ایڈمنسٹریشن کو مصری ماہرین نے اپنے ملک کی نقل میں ڈھالا تھا، جس کے نتیجے میں مصری سرکاری محکموں کی بے ترتیبی اور رشوت بازی یمن میں جڑ پکڑ چکی تھی۔

ہم شام پڑنے تک پہاڑیوں، وادیوں اور ٹیلوں پر پھرتے رہے۔ پوئین نے مجھے کات کے درخت دکھائے، جس کے پتے یمنی لوگ چباتے ہیں۔ اس درخت کی بہت عزت اور حفاظت کی جاتی ہے۔ ایک گاؤں کے قبرستان میں، جو بالکل اجاڑ تھا، بعض قبروں پر ایک پتھر نصب تھا، جب کہ دوسری قبریں اس کے بغیر تھیں۔ پوئین نے بتایا کہ جن قبروں پر پتھر نصب ہے، ان کے قتل کا بدلہ لیا جا چکا ہے۔ یہ قبر کے سرہانے پر لگا ہوا کتبہ نہیں تھا، بلکہ قبر کے عین درمیان ایک نوکیلا پتھر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بدلے میں قتل کرنے والا مقتول کی قبر پر کھڑا ہو کر ہوا میں گولیاں چلا کر اعلان کرتا ہے کہ اس نے فلاں کو قتل کر کے مقتول کا بدلہ لے لیا ہے۔ دوسری طرف مقتول کی لاش کی موجودگی میں اس کے بھائی بند بدلہ لینے کے عزم کا اعلان کرتے ہیں۔ قبائل میں خون کا بدلہ خون سے لینے کا رواج ہے۔ جس قبیلے کا آدمی قتل ہو جاتا ہے، اس قبیلے کے مرد اپنے آپ پر خمر (شراب) کو اور عورتیں الطیب (عطر) کو حرام قرار دے دیتی ہیں، یہاں تک کہ انھیں بدلہ لینے میں کامیابی ہو جائے۔ اس چیز سے بڑی بے عزتی کسی قبیلے کے لیے کوئی نہیں کہ اس کے کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے۔ جس قبیلے کا آدمی قتل ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو اس کا بدلہ لینے کا حقدار بلکہ مقروض سمجھتا ہے۔ قاتل کے قبیلے کا ہر مرد بدلے میں مارا جا سکتا ہے۔ اگر دیّت ادا کر کے قبیلوں کے درمیان صلح ہو جائے، تو جس قبیلے کا آدمی مارا گیا تھا، اس کے ہر مرد کو دیّت میں سے حصہ ملتا ہے۔ دوسری طرف قاتل کے قبیلے کا ہر مرد دیّت کی ادائیگی میں شریک ہوتا ہے۔ عام طور سے دیّت میں زمین کا ٹکڑا دینا ہوتا ہے، جو مقتول کے قبیلے کی مشترکہ ملکیت بن جاتا ہے۔ جب مقتول کے بیٹے جوان ہو جاتے ہیں، تو ان کو اس زمین میں سے حصہ دیا جاتا ہے۔ البتہ مقتول نے اپنے پیچھے بیٹے نہ چھوڑے ہوں، تو اس کے خاندان کو حصہ نہیں ملتا۔ اس زمانے میں ایک مرد کا قصاص ۹۶ ہزار ریال تھا۔

یمن میں ہر شخص خنجر لگائے پھرتا ہے اور اس کو استعمال کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اگر کوئی شخص

غصے میں آکر خنجر کو ہاتھ لگاتا ہے، تو اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بعض قبائل میں یہ رسم ہے کہ خنجر پر ہاتھ پڑ گیا، تو پھر اس کو نکالنا پڑتا ہے اور جب تک خون نہ بہے اس کو واپس خول میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ خنجر کو ایک پٹکے میں باندھتے ہیں جو کمر کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ یمنی خنجر خمدار ہوتا ہے، جس کا خول اکثر جانوروں کے سینگ سے بنتا ہے۔ اس پر بے حد کاریگری سے نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔ اس کی قیمت کئی ہزار ریال تک ہوتی ہے۔

قتل کا بدلہ لینے کا رواج (عربی میں اس کو الثار کہتے ہیں) نہ صرف قبائل میں پایا جاتا ہے، بلکہ شہری آبادی کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال میرے قیام کے دوران دیکھنے میں آئی۔ ایک شام ایک امریکن ہمیں ملنے کے لیے آیا۔ محفل آدھی رات تک چلتی رہی۔ جب وہ ہم سے رخصت ہو کر باہر سڑک پر کھڑی اپنی کار کے پاس پہنچا، تو وہاں پر دو سپاہی شہری لباس میں ملبوس کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کار کی ڈکی کھول کر دکھائے۔ ان کو امید تھی کہ اس کے پاس شراب کی بوتلیں ہوں گی۔ ڈاکٹر پوئین نے بتایا تھا کہ پولیس کے سپاہی اکثر غیر ملکیوں کی کاریں روک لیتے ہیں اور وہسکی کی بوتل وصول کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ شراب پینے کا یمن میں بہت رواج ہے۔ کہتے ہیں کات چبانے کے ساتھ ساتھ شراب پی جائے تو اس کا مزا دگنا ہو جاتا ہے۔ ہمارے امریکی دوست نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی اور اپنی راہ پر چل دیا۔ وہاں سے قریب ملٹری ہیڈکوارٹر کے گیٹ پر ٹریفک کی لائٹ سرخ تھی، جس کے سبب اسے رکنا پڑا۔ عین اس وقت کہیں سے ایک گولی چلی اور ہیڈکوارٹر گارڈ کے ایک سپاہی کو لگی جو موقع پر ہی جان بحق ہو گیا۔ اس وقت وہاں پر اس کی کار کے سوا چونکہ دوسری کوئی گاڑی موجود نہ تھی اور نہ ہی دور دور اس کے سوا کوئی دوسرا شخص نظر آتا تھا، اس لیے گارڈ کے سپاہیوں نے اس کی کار روک لی اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا اور خوب پیٹا۔ کار کی تلاشی لینے پر کوئی بندوق یا پستول نہ نکلا۔ اس کے باوجود اس کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کو کسی ذریعے سے اپنی یمنی بیوی کو اطلاع بھیجنے میں کامیابی ہوئی، جس کی کوششوں اور امریکی سفارت خانے کی سفارش سے اس کو آزاد کرا لیا گیا، مگر ان کو مشورہ دیا گیا کہ فوری طور پر نقل مکانی کر لیں، کیونکہ مقتول کے رشتہ دار بدلہ لینے یا قصاص حاصل کرنے کے لیے آئیں گے۔ چنانچہ میاں بیوی ایک ہفتے کے اندر اندر یمن کو چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔

ڈاکٹر پوئین کو تھوڑا عرصہ قبل قبائلی علاقے میں ایک شادی میں شرکت کے لیے بلایا گیا تھا۔ عام طور سے ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے اور کسی قسم کی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔ لڑکی اوپر کی منزل پر تھی، جہاں پر دولھے کو دس سیڑھیاں چڑھ کر پہنچنا تھا۔ اسے ہر سیڑھی پر لڑکی کی سہیلیوں کو ایک ہزار ریال ادا کرنے تھے۔ اس کے علاوہ اسے دلھن کو گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے دس ہزار ریال کا تحفہ پیش کرنا تھا، جو حق

مہر میں شامل نہیں تھا۔ دلھن نے اچانک بیس ہزار ریال کا مطالبہ کر دیا، جس کے سبب پتا چل گیا کہ لڑکی اس شادی کے خلاف تھی۔ لڑکی کی ماں خود مردوں کے مفرش میں آئی اور اس نے گھٹنے ٹیک کر اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اس رشتے کو منسوخ کر دے مگر وہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔ وہ اس زمانے میں کویت میں یمن کا سفیر تھا۔ اس کی بیٹی غیر ملکوں میں پڑھی پلی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی قبیلے کے ایک نوجوان سے کر دی جائے۔ رات بھر صلاح مشورہ ہوتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ دولھا اور دلھن فی الحال اکٹھے رہیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ معاملہ کیسے سدھر سکتا ہے۔ شادی کی محفل کہیں اگلے روز جا کر اختتام کو پہنچی۔ مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ میاں بیوی اکٹھے تھے یا جدا ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر پوئین نے کہا ہم اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی جائیں گے، جہاں پر وہ لڑکی کی ایک سہیلی کو جانتا تھا۔

ہماری ملاقات یمنی اسٹڈی سنٹر میں افراہ کے ساتھ ہوئی، جس نے بیروت اور انگلستان میں تعلیم پائی تھی، جہاں پر اس کا باپ سفیر تھا۔ وہ انگریزی ادب کی گریجویٹ تھی اور نہ صرف خوبصورت انگریزی بولتی تھی بلکہ خود بھی خوبصورتی کا مرقع تھی۔ اپنے بارے میں اس نے کہا کہ وہ مذہبی خیالات رکھتی ہے، چنانچہ اس نے عادی یمنی لباس کے اوپر ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور دوپٹے کو اس طرح سر پر لپیٹ رکھا تھا کہ سوائے چہرے کے کان اور بال پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی سہیلی کے بارے میں بتایا کہ اس کے خاوند نے اس کی مرضی کے مطابق طلاق دے دی تھی۔ اسلامی معاشرے میں عورتوں کے حقوق سے وہ قطعاً مطمئن نہ تھی اور اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کام کر رہی تھی۔ یمنی عورتیں بہت سختی سے پردہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی عورت کھلے منہ نظر آ جائے تو وہ یقیناً غیر ملکی ہوگی۔ یہاں تک کہ میں نے ایک بنک میں ایک عورت کو نقاب ڈالے ہوئے ٹائپ رائٹر پر لکھتے ہوئے دیکھا۔ میں حیران ہوتا رہا کہ اس کو کاغذ پر کیا دکھائی دیتا ہوگا۔

پوئین مجھے ایک نارویجن ماہرِ تعمیرات ژاں سے ملانے کے لیے لے گیا، جو برسوں سے صنعاء میں مقیم تھا۔ اس سے قبل وہ یمن کے دوسرے علاقوں میں رہ چکا تھا۔ عربی اچھی خاصی بول لیتا تھا۔ اس کو پرانی عمارتوں کی مرمت میں دلچسپی تھی۔ چار سال تک وہ ہالینڈ کی طرف سے دی جانے والی ایک گرانٹ کے تحت مدرسہ امیریا کی مرمت کا کام کر چکا تھا۔ تین چوتھائی کام مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ ہالینڈ نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ کم سے کم ایک چوتھائی کام کی لاگت یمنی حکومت ادا کرے گی، مگر صنعاء کی طرف سے ایک دھیلہ بھی ادا نہ کیا گیا، جس کے سبب کام کو روکنا پڑا۔ وہ قاہرہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا، جہاں پر اس کی الجیرین دوست مقیم تھی، جس کو یمن سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ سوشیالوجسٹ تھی اور کئی عرب ملکوں میں کام کر چکی تھی۔ یمن سے اس کو نکالنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ ژاں کے ساتھ منسلک تھی، جب کہ وہ آپس

میں شادی شدہ نہ تھے۔ژاں کے ہاں جانے کی وجہ یہ تھی کہ پوئین مجھے صنعاء کے یہودیوں کی آبادی دکھانی چاہتا تھا، جس کے لیے ہمیں ژاں سے بہتر گائیڈ نہ مل سکتا تھا۔۱۹۴۹ء میں ایک لاکھ یہودی وہاں سے ہجرت کر کے اسرائیل چلے گئے تھے۔ ان کا پورا محلّہ اس وقت سے خالی پڑا تھا۔ ایک مکان میں ژاں رہتا تھا، جس میں داخل ہونے کے بعد انسان سارے محلے کے مکانات میں گھوم پھر سکتا تھا۔ مکانات کے اندر خفیہ کمرے اور کوریڈور بنے ہوے تھے، جو باہر سے نظر نہیں آتے تھے۔ژاں نے ایک مکان میں داخل ہونے پر کہا کہ اس مکان میں ایک خفیہ کمرہ پایا جاتا ہے اور اگر ہم اس کمرے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو وہ ہمیں انعام دے گا۔ ہم اس کمرے کا سراغ نہ لگا سکے، جب کہ اس میں داخل ہونے کا راستہ عین اس کمرے میں موجود تھا، جس میں ہم بیٹھے ہوے تھے۔ اس خفیہ کمرے میں دو آدمیوں کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں صنعاء میں صرف دو افراد مگر شمالی علاقے میں پانچ چھ ہزار یہودی مقیم تھے، جن کو مقامی قبائل کی حمایت (تحفظ) حاصل تھی۔ یہ لوگ اکثر زیور بناتے ہیں۔ ان کے بنائے ہوے چاندی کے زیوروں کی ملک میں بہت مانگ تھی۔ ڈاکٹر پوئین اس بارے میں ایک کتاب کے لیے مواد جمع کر رہا تھا۔ اس نے مجھے سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے ایک جوڑے کے بارے میں بتایا، جو دس برسوں سے یمن میں مقیم تھا اور اپنا سارا سرمایہ چاندی کے زیورات جمع کرنے پر صرف کر رہا تھا۔ اس نے کہا ان کے نوادرات کو دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ چنانچہ ژاں سے رخصت ہو کر ہم ان سے ملنے کے لیے گئے۔ وہ لوگ زیورک کے رہنے والے اور ماہرینِ تعمیرات تھے مگر یمن میں آن بسے تھے۔ ان کا گھر سچ مچ کا میوزیم تھا جس کی مثال دنیا بھر میں کہیں پر نہیں ملتی۔

ڈاکٹر پوئین نے اسلامی اور قبل از اسلامی زمانے کے سکوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا، جس کی مدد سے تاریخ کے بعض نامعلوم ادوار کا پتا چلتا تھا۔ چنانچہ وہ دنیا بھر کے عجائب گھروں کی فہرستوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بعض ایسے سکّے دکھائے، جو کسی میوزیم کے پاس موجود نہیں تھے۔ پھر ایک شام مجھے سڑک پر گرا ہوا ایک سکّہ ملا جو پوئین کے پاس بھی نہیں تھا۔ ہم نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ اس کا تعلق سولھویں صدی سے تھا۔ میں نے وہ سکّہ پوئین کو تحفہ کر دیا۔

پوئین یمنی قبائلی قوانین کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا، جو اس وقت تک کسی کتاب میں شائع نہیں ہوے تھے۔ کچھ عرصہ قبل اس کو ایک شیخ نے ایک فوٹو کاپی مہیا کی تھی۔ اس کو ایک دوسرے شیخ کی طرف سے کات کھانے کی محفل میں شمولیت کی دعوت ملی تھی، جہاں پر اس کو قبائلی قوانین کا ایک نسخہ دکھایا جائے گا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر خبردار کر دیا کہ یمن میں معاملات کھٹ سے طے نہیں پا جاتے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہمیں ساری رات شیخ کے ساتھ کات کھانی پڑے اور صبح دم بے نیل مرام واپس لوٹنا پڑے۔ چنانچہ شیخ نے

بے شمار کات چبانے، حقہ پینے اور پانی اور کافی کے دور لگنے کے بعد ہمیں ایک فوٹو کاپی دکھائی، جس کے کچھ صفحے ہم اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ہم نے گھر لوٹ کر ان قوانین کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر قبائل کے لہجات اس قدر مشکل ہیں کہ کسی قبائلی کی مدد کے بغیر ہم ایک پیرا گراف تک نہ سمجھ سکتے تھے۔ پوئین نے قبائلی شیوخ کی مدد سے پچاس صفحات پر مشتمل ایک لغات تیار کر رکھی تھی، جسکی مدد سے ہم پہلے دو قوانین کو پڑھ سکے۔

پہلا قانون عورتوں کے بارے میں تھا، جن کو زخمی یا قتل کرنے پر کس قدر تاوان ادا کرنا ہوگا، اور کن صورتوں میں قاتل کو سزائے موت دی جاسکتی ہے۔

دوسرا قانون ان مردوں کے بارے میں تھا، جن میں کوئی جسمانی نقص یا بیماری پائی جاتی ہو۔ چونکہ ان کا ختنہ نہیں کیا جاتا، اس لیے ان کو پورا مرد شمار نہیں کرتے۔ جو کوئی ان پر حملہ کرتا اور ان کو جسمانی نقصان پہنچاتا ہے، اس کو تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔

ایک شام ہم ایک شیخ کے ہاں مدعو تھے، جہاں پر مہمان نوازی کے آداب پر بات ہو رہی تھی۔ کسی نے سنایا کہ ایک قاتل نے مقتول کی بہن کے گھر پر جا کر امان مانگی۔ اس نے کہا تم خواہ کوئی بھی ہو میں تمھیں امان دیتی ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کے کمرے میں گئی اور اس کو سوتے سے جگا کر کہا کہ ایک قاتل نے مجھ سے امان مانگی ہے۔ میں اس کو امان دوں یا نہیں۔ باپ نے کہا ضرور امان دو، خواہ وہ تمھارے بھائی کا قاتل ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وہ سچ مچ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ اس پر باپ نے قاتل کو معاف کر دیا۔ شیخ نے اپنے حلقے میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش آدمی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اس نے مہمان نوازی کے صدقے اپنے سگے بھائی کو مار ڈالا تھا، جس نے اس کے مہمان پر دست درازی کی تھی۔ ایسے قتل کی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔ یہی نہیں بیوی، بہن اور بیٹی کو بعض حالات میں جان سے مار ڈالنے کا حق قبائلیوں کو حاصل ہے، بالخصوص اگر ان کے طور اطوار پر شبہہ پیدا ہو جائے۔ میرے قیام کے دوران صنعاء کے ہسپتال میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا۔ ایک شخص اپنی بیمار بیٹی کی تیمارداری کے لیے ہسپتال گیا، جہاں پر اس نے دیکھا کہ ایک میل نرس اس کی بیٹی کی چارپائی کو دھکیل رہا تھا اور اس کی بیٹی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے خنجر سے بیٹی کا پیٹ چیر ڈالا۔ دوسری طرف قتل کا بدلہ لینے کے لیے مخالف قبیلے کے آدمی پر حملہ نہیں کیا جاتا، اگر وہ عورتوں یا بچوں کی معیت میں ہو۔ ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ہمیشہ اپنی بیٹی کی ہمراہی میں گھر سے باہر نکلتا تھا۔ اس وجہ سے دشمن اس پر حملہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ایک روز وہ اپنے خیمے کے باہر بیٹھا ہوا تھا، جب اس کی بیٹی خیمے کے اندر چلی گئی، عین اس وقت کہیں سے ایک گولی چلی اور اس کو ہلاک کر گئی۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ کرنے والے کو گیارہ دیّتیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ ایک دیّت کی مالیت ایک سو اونٹ ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عورت

کے ساتھ جبراً زنا کرتا ہے، تو اس کو قبیلے سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کو کسی دوسرے قبیلے کے پاس جا کر پناہ لینی پڑتی ہے۔ وگرنہ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ربع الخالی میں جا کر رہے اور لوٹ مار کر کے زندگی بسر کرے۔

جمعے کی نماز کی ادائیگی کے لیے میں جامع مسجد میں گیا۔ وہاں پر یہ رسم دیکھنے میں آئی کہ لوگ ایک پودے کی شاخیں اٹھائے پھرتے تھے، جس پر لگے ہوئے پھولوں کی بھینی خوشبو سے سارا ماحول مہک رہا تھا۔ وہ یہ شاخیں ایک دوسرے کو تحفے میں دے رہے تھے۔ مجھے بھی ایک شخص نے ایک شاخ دی۔ نماز کے بعد لوگ ان شاخوں کو اپنے عماموں میں اڑس کر پھر رہے تھے۔ اس روز شہر کی گلیوں میں گھومنے والے بہت شوخ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھے، مگر دوسری طرف گلیوں میں ہر طرف پلاسٹک بیگ اڑتے پھرتے تھے۔ پورے شہر میں کسی قسم کی صفائی کا انتظام نہیں لگتا تھا۔ گزشتہ صدیوں میں صنعاء کی سیاحت کرنے والوں نے اس شہر کے باغات کی تعریف کی ہے مگر مجھے وہاں پر کہیں کوئی باغ دکھائی نہیں دیا۔ اس روز کے اخبار میں کسی نے یہ سوال پوچھا تھا کہ ہمارے شہر میں پھول کیوں نہیں پائے جاتے۔ کات تو یہاں پر تازہ بتازہ مل جاتی ہے، مگر پھول اور سبزیاں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ شہر کی گلیوں میں جگہ جگہ پر حکومت کی طرف سے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا: **الشجر کل ام تعطی و لا تاخذ** (درخت ماں کی طرح ہے جو دیتا ہے مگر بدلے میں کچھ نہیں لیتا)۔

یوئین کے ہاں میری ملاقات ایک امریکن ریسرچ اسکالر ڈک سے ہوئی، جو یمن کے ان عناصر کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا، جو معاشرے میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس نے ایک تاجر سے ایک رجسٹر قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا، جس میں اس کا باپ اپنے خطوط کی نقلیں درج کرتا رہا تھا، جو اس نے اپنے کاروباری شرکاء کے نام لکھے تھے۔ میں نے اس رجسٹر کا جستہ جستہ مطالعہ کیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان خطوط میں کس قدر معلومات بھری ہوئی تھیں۔ ڈک باری باری ان تمام شخصیتوں کو یا ان کے ورثا کو مل چکا تھا جن کا ذکر ان خطوط میں پایا جاتا تھا۔

پھر ایک تاجر نے ہمیں اپنے ہاں کات کی محفل میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہر کوئی کات کا اپنا اپنا بنڈل لے کر آیا ہوا تھا۔ ہماری محفل مکان کے مردانہ حصے میں لگی۔ لوگ پتوں کو توڑ توڑ کر اپنے منہ میں ڈالتے جاتے تھے۔ میری معذرت قبول کر لی گئی کہ میں ایسا نہ کر سکوں گا۔ حقے کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کافی اور پانی کے دور چلتے رہے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی گالوں میں اچھا خاصا تھیلا سا بن گیا، جس میں کم و بیش ڈیڑھ دو پاؤ پتے دبے ہوئے تھے، جن کو دھیرے دھیرے چبا کر ان کا رس لعاب کے ساتھ نگلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کات چبانے سے بھوک ماری جاتی ہے، البتہ کام کرنے کی طاقت میں

اضافہ ہوجاتا ہے۔ میں شرکائے محفل کی نکتہ سنجی پر سر دھنتا رہا۔ ان میں سے کوئی بھی نشے میں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی سوچ کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس شام یہ لطیفہ سننے میں آیا کہ امام یحییٰ کے زمانے میں شہر کے گیٹ باب الیمن کے باہر جمعے کے روز قاضی بیٹھتا تھا، جس کے پاس لوگ اپنے مقدمات لے کر جاتے تھے۔ ایک شخص اس سے عدل کا طلبگار ہوا کیونکہ اس کا ہمسایہ خودکشی کرنے کی خاطر اپنے گھر کی چھت پر سے نیچے گلی میں کود گیا تھا۔ عین اس وقت وہاں سے مدعی کی بیوی گزر رہی تھی، جو اس کے بوجھ تلے دب کر مر گئی تھی۔ وہ قصاص چاہتا تھا۔ قاضی نے کہا: تمھیں اس بات کا حق پہنچتا ہے مگر صرف ایک صورت میں۔ وہ یہ کہ اس شخص کی بیوی کو گلی میں کھڑا کر دیا جائے اور تم چھت پر سے اس پر کود کر بدلے میں مار ڈالو۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے بتایا کہ اگر کوئی شخص سرحد پر ایک جگہ سے چلنا شروع کرے اور پورے ملک کے گرد گھوم کر واپس پہلی جگہ پر لوٹے، تو عین نویں روز وہاں پر پہنچے گا۔ یہ بات وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا تھا۔ یمنی پیدل چلنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

میں پاکستانی سفیر سردار حسن محمود سے ملنے کے لیے گیا۔ انھیں یمن میں آئے ہوئے چار ماہ ہوئے تھے۔ ان کا فرنیچر ابھی نہیں پہنچا تھا اور وہ ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ وہ میرے ساتھ ڈاکٹر پوئین کے بنگلے پر آ گئے۔ انھوں نے ایک دلچسپ لطیفہ سنایا کہ حضرت آدمؑ کو اپنی آل اولاد کا رہن سہن دیکھنے کی خواہش ہوئی اور خاص اجازت سے فرشتے کی معیت میں ملک ملک پہنچے۔ امریکہ کے اوپر سے گزرے، تو پوچھا یہ اونچے اونچے دڑبے ان لوگوں نے کاہے کو بنا رکھے ہیں۔ فرشتے نے کہا یہ ان کے مکانات ہیں جن میں وہ رہتے ہیں۔ حضرت آدمؑ بہت مایوس ہوئے اور کہا میں ان لوگوں کو نہیں جانتا اور نہ ان کے رہنے سہنے کے طور اطوار کے بارے میں کچھ خبر رکھتا ہوں۔ پرواز کرتے کرتے ایک ملک کے اوپر سے گزرے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ تو یمن ہے۔ فرشتے نے کہا آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا۔ فرمایا یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا۔

سفیر صاحب نے پاکستانیوں کے بارے میں بتایا کہ ان کی تعداد ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک پاکستانی ان کی آمد کی خبر سن کر تعز سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہ ۱۹۵۳ء میں حج کرنے کے لیے مکّہ آیا تھا۔ پاکستان میں وہ بیوی اور پانچ بچوں کو چھوڑ کر آیا تھا۔ حج کے بعد سعودی عرب میں ہی رہ گیا۔ شاہی خاندان میں ملک عبدالعزیز کی پوتی سے شادی کر لی۔ اس بیوی سے بھی ایک بچہ ہوا۔ پھر یمن آ گیا، جہاں پر اس نے یکے بعد دیگرے انیس شادیاں کیں، جن سے چھبیس بچے پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر پوئین جرمن ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت ایک خاص پروگرام کے سلسلے میں صنعاء میں مقیم تھا، جس کا سبب اس طرح پیدا ہوا کہ جامع مسجد کی توسیع کے لیے جب ایک کمرے کو کھولا گیا، جو صدیوں سے بند

تھا،تو اس میں پڑے ہوئے قرآن کے غیر مکمل نسخے اور پھٹے ہوئے کاغذات ہزاروں کی تعداد میں ملے۔ جرمن مستشرقین نے ان کاغذات کو تلف کیے جانے سے بچانے کی خاطر ان کی درستی اور سائنٹیفک طریق سے تجدید کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس تجویز کے پیچھے یہ چیز کارگر تھی کہ قرآن کے ان پھٹے ہوئے اوراق کا جائزہ لیا جائے جو صدیوں پرانے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان پر درج شدہ عبارت اور قرآن کے موجودہ متن میں کوئی فرق مل جائے۔ چنانچہ پینتیس ہزار پرزوں کی فلم بنائی جا چکی تھی، جن کو دکھانے کے لیے مجھے ایک روز ڈاکٹر پوئین اپنی لیبارٹری میں لے گیا، جو جامع مسجد کے پہلو میں تھی۔ وہ اس سے قبل بھی مجھے چند پرزوں کی فوٹو کاپیاں دکھا چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کو قرآن کے متن سے ہٹ کر کوئی عبارت ملی ہے۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ ابھی چند برس ہوئے اس کے حوالے سے جرمن اور امریکی اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ قرآن کے متن میں تبدیلیوں کا سراغ مل گیا ہے، مگر آج تک وہ ایک بھی آیت پیش نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود مستشرقین کا ایک گروہ قرآن کے متن کے بارے میں عجیب وغریب دعوے کرنے میں مصروف ہے۔ جنوری ۲۰۰۴ء کو برلن میں ایک خاص کانفرنس اس مقصد کے لیے منعقد کی گئی، جس میں جرمن مستشرق گونتھر لولنگ (Günter Lüling) کے اس دعوے پر بحث ہوئی کہ قرآن دراصل قدیم عیسائی آرامی نظموں پر مشتمل ہے، جو کسی طریق سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تھیں اور جن میں ردو بدل کرکے قرآن کا متن تیار کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر اس کی کتاب ۱۹۷۴ء میں چھپی تھی جس پر کسی نامور مستشرق نے تبصرہ تک کرنا پسند نہ کیا تھا کیونکہ لولنگ کا دعویٰ بے حد بودا تھا اور کسی طریق سے بھی سائنٹفک نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ مجھے بھی اس زمانے میں اس کی کتاب تبصرے کے لیے ملی تھی اور میں اس کے مطالعہ کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ اب اس نے نام بدل کر ایک اور کتاب لکھی ہے جس کو امریکی اخبارات اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے لیے استعمال کررہے ہیں۔ اس نے فرضی نام کرسٹوف لکسنبرگ (Christoph Luxenberg) اختیار کیا ہے۔ انگریز مستشرقین کا ایک گروہ وانزبرو (Wansbrough) کی سرکردگی میں یہ دعویٰ کررہا ہے کہ قرآن دراصل نویں صدی میں جا کر تصنیف ہوا تھا۔ گویا اس سے قبل دو اڑھائی صدیوں تک مسلمانوں کے پاس قرآن کا وہ نسخہ نہیں تھا، جو آج کل پڑھا جا رہا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر پوئین یہ ثبوت مہیا کردے کہ قرآن کے متن میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، تو گویا اسلام کی بنیاد ڈھے جائے گی۔ برلن کے سیمینار میں کوئی ایسا ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکا۔

یمن کی وزارتوں کی کارکردگی کا مجھے یہ تجربہ ہوا کہ میں نے چلنے سے پہلے وزارتِ اطلاعات کو ایک چٹھی لکھی تھی، جس میں اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور متعلقہ وزیر یا اس کے نائب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، مگر وہاں پر کسی کو میری چٹھی کی خبر نہیں تھی۔ میں اس کی نقل ساتھ لایا تھا۔ اس کو پیش کرنے

کے بعد بھی میری اصل چٹھی کی تلاش جاری رہی۔ چونکہ وہ نہ مل سکی اس لیے میں ہر روز وزارت میں حاضر ہوتا رہا اور مجھے واپس کر دیا جاتا رہا کہ چٹھی کی تلاش جاری رہے۔ میرے قیام کے آخری روز تک یہی جواب ملتا رہا۔ اس سے ملتی جلتی کارروائی مصری ائرلائن مصر للطیران کے کارندے کرتے رہے۔ وہ دو ہفتوں تک مجھے یہ کہتے رہے کہ میری سیٹ کے بارے میں ان کو ہیڈ آفس سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں ایک ہفتے کے لیے یمن آیا تھا مگر مصر للطیران کی حیل وحجت کے سبب مجھے دو ہفتے ٹھیرنا پڑا۔ یمن میں بیوروکریسی کی تربیت مصری ماہرین کے ذریعہ ہوئی تھی، جس کا مظاہرہ قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ہر شخص کو، جو یمن آتا ہے، سات روز کے اندر اندر پولیس کے پاس رپورٹ کرنی ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے تین کمروں میں جانا پڑتا ہے۔ پہلے کمرے میں صرف مہر لگتی ہے، دوسرے کمرے میں رجسٹر میں اندراج ہوتا ہے اور تیسرے کمرے میں افسرِ بالا پاسپورٹ پر دستخط کرتا ہے۔ ملک کو چھوڑنے سے پہلے پھر ان تین کمروں کا طواف کرنا پڑتا ہے۔

ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ اخبار یا رسالے اگر دکان سے خریدے جائیں، تو سرورق پر درج شدہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جب کہ ہاکر اس سے دگنی قیمت مانگتے ہیں۔ اخباروں کا معیار بہت پست ہے البتہ رسالے معیار کے اعتبار سے اچھے تھے۔ ملک کا نظامِ تعلیم مصری استادوں کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے عرب ملکوں کے استاد بھی دیکھنے میں آئے۔

یمن کے مکانات دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ پانچ سات یا اس سے زیادہ منزلوں کے مکانات، جو کچی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں اور صدیوں سے کھڑے ہیں، ان کی دیواروں پر نقش ونگار کیے جاتے ہیں۔ بعض جگہوں پر ایسے مکانات ٹیلوں پر کھڑے ہیں۔ ان کے اندر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ غالباً دنیا بھر میں سب سے پہلے وہاں پر اسکائی سکریپر بنائے گئے تھے۔ صنعاء کے نام کا مطلب ہی خوبصورت تعمیر شدہ ہے۔

یمن کے باسی ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ پہلے وقتوں میں یہ لوگ ہر طرف نکل گئے تھے۔ ویت نام کی جنگ کے نتیجے میں وہاں پر رہنے والے یمنیوں کی آل اولاد وطن لوٹ آئی تھی۔ صرف صنعاء میں ان لوگوں کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی تھی۔ ہم اکثر ان کے ریستورانوں میں کھانا کھانے جاتے تھے۔ وہاں پر ایک روز ہمیں بنوضبیان قبیلے کا ایک آدمی ملا، جو روزہ نہیں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کے ہاں یہ اصول جاری ہے کہ بطور فرضِ کفایہ اگر قبیلے کا ایک آدمی روزہ رکھ لے، تو باقیوں کو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس نے ایک اور قبیلے کے بارے میں بتایا کہ وہ لوگ مہمان کو رات کے لیے عورت بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ امر مہمان نوازی میں شامل

ہے۔صنعاء میں بھیک مانگنے والوں کی بھرمار تھی۔دن ہو یا رات ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔ایک روز میں کتابوں کی ایک دکان میں تھا، جب وہاں پر ایک بھیک مانگنے والا اندر گھس آیا۔مالک دکان نے اسے باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔اس پر اس نے تنک کر کہا: یہ ساری کتابیں اور رسالے، جن پر عورتوں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں، یہ سب حرام کاری ہے۔

یمن سے واپسی مصر کے راستے ہوئی، جہاں پر مجھے اپنے دوستوں سے ملنے اور بہت سی نئی کتابیں خریدنے کا موقع ملا۔جہاں پر ایک طرف یہ تکلیف دہ حقیقت درپیش تھی کہ الاستاذ محمد بسیونی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، جس کے سبب وہ مجھے پہچان نہ سکے، دوسری طرف یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے شاعر دوست احمد سراج الدین کی شادی ہوگئی تھی اور وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔اس کی بیوی کے ماں باپ سعودی عرب میں مقیم تھے، جہاں پر وہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔خود میرے پاؤں میں پورا سال چکر رہا، جیسے پانچ ملکوں کی سیاحت کافی نہ تھی۔اوتا کو لائبریری کے لیے کتابیں خریدنے کے لیے پرتگال جانا تھا۔اس سفر کے دوران اسے ملک کے شمالی علاقے میں پائی جانے والی بعض یونیورسٹیوں میں جانا تھا، جس کے لیے اسے میری خدمات کی ضرورت تھی اس لیے میں انکار نہ کر سکتا تھا۔اس سفر کی یادگار میرا افسانہ ''نروان'' ہے، جو میرے پہلے مجموعے ''زرد ستارہ'' میں شامل ہے۔

ساتواں باب

اسرائیل کا سفر

دسمبر ۱۹۸۴ء میں تل ابیب یونیورسٹی کی طرف سے ایک بین الاقوامی سمینار بعنوان ''انقلاب اور شیعہ'' میں شرکت کی دعوت ملی۔ مجھے پاکستان کے شیعوں پر مقالہ پیش کرنا تھا۔ کل انیس مقالے رکھے گئے تھے۔ گویا دنیا بھر میں بسنے والے شیعوں کا جائزہ لینا مطلوب تھا۔ مدعوئین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا تھا کہ اس موضوع کے متخصصین کو بلایا گیا تھا۔ مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا بندوبست ایک امریکی پبلشر کے تعاون سے کرلیا گیا تھا۔ مجھے اسرائیل جانے کی کچھ ایسی خواہش نہ تھی، مگر میرے کانوں میں فلسطینی دوستوں کے یہ فقرے گونج رہے تھے کہ فلسطین کے قضیے کو سمجھنا چاہتے ہو، تو موقع ملنے پر اسرائیل کا ایک چکر ضرور لگاؤ۔

اس سفر کا ابتدائیہ میرے افسانے ''نقد سودا'' میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

''فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر اسرائیل ائر لائنز ''ایل آل'' کا کاونٹر سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں ہے۔ اس کے گرد ایک حفاظتی جنگلہ بنا ہوا ہے۔ چاق و چوبند پہرہ دار اسلحہ سے لیس ہر آنے والے پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ میں اپنا سفری بیگ اٹھائے ہوئے وہاں پر پہنچا، تو دوسرے مسافروں کے ساتھ مجھے بھی ایک ایک چیز کھول کر دکھانی پڑی۔ پوچھا گیا کہ کیا کسی نے کوئی تحفہ، خط یا پیکٹ ساتھ لے جانے کو دیا ہے۔ میرا جواب نفی میں تھا۔ چیک ان کے کونٹر پر ایک عورت مجھ سے آگے تھی۔ اس کے پاس چالیس کلو زائد سامان تھا، جس کے لیے وہ سرچارج دینے کو تیار نہ تھی۔ کبھی کہتی تھی کہ اس کے پاس جرمن مارک کافی نہیں ہیں۔ پھر دوسرے ہی سانس میں کہتی تھی کہ سارا جہاز خالی جا رہا ہے، اس لیے اگر چالیس کلو زائد سامان ہو گیا تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ سرچارج کی چھوٹ چاہتی تھی۔ اس عرصے میں ''ایل آل'' کا اسٹیشن کمانڈر بھی کونٹر پر پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ نصف سامان

کا سرچارج دینے کو تیار ہو جائے، تو وہ ایک آنکھ میچتے ہوئے اس کا سامان نکلنے دے گا۔ محترمہ نے یہ دیکھا تو ادائیگی سے بالکل ہی مکر گئی۔ یہ ساری گفتگو انگریزی، جرمن اور عبرانی کی ملی جلی کھچڑی میں ہو رہی تھی اور میں اپنے آپ کو اسرائیل میں پہنچا ہوا محسوس کر رہا تھا، جہاں پر مباحثات زندگی کا جزو ہیں۔ میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے پیش کش کی کہ محترمہ کے سامان کے دس کلو میرے سامان میں شامل کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ میرے سامان کا وزن صرف دس کلو تھا، جب کہ بیس کلو سامان ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس سے محترمہ کو اور بھی شہ مل گئی۔ اب بحث صرف دس کلو کے سرچارج کی ادائیگی پر ہونے لگی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کو تل ابیب پہنچ کر طے کر لیا جائے گا۔''

ویٹنگ روم میں وہ میرے پاس آن بیٹھی اور آتے ہی اسرائیلی ائر کمپنی کو کوسنے لگی۔ اس کو یوں بھی اسرائیل اور وہاں کی ہر چیز پر اعتراض تھا۔ وہ اور اس کا خاوند چیکوسلاواکیہ سے ہجرت کر کے اسرائیل میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس نے کہا انھوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو بہتر تھا۔ اسرائیل میں اس قدر مہنگائی ہے کہ جینا مشکل ہو چکا ہے۔ کہنے لگی کہ وہ اسرائیل آ کر پھنس گئے ہیں۔ مگر اب وہ کہاں جا سکتے تھے۔ اپنی بیٹی کے بارے میں اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائے۔ اس کی بیٹی گیارہ برس کی تھی اور چھ ماہ سے سوئٹزر لینڈ اور جرمنی کے مختلف شہروں میں جرمن خاندانوں کے پاس رہ رہی تھی۔ ماں نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ بیٹی ہر دو تین ماہ کے بعد کسی دوسرے خاندان کے پاس منتقل ہو جاتی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کا زائد سامان دراصل سارے کا سارا اس کی بیٹی کے کھلونوں پر مشتمل تھا، جو اس کو مختلف خاندانوں کی طرف سے تحفے میں ملے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی لوٹ کر اسرائیل آئے۔ اس نے کہا اس کے پاس تل ابیب میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے، جب کہ اس کی بیٹی جرمنی میں ایسے خاندانوں کے پاس رہ رہی تھی، جن کے پاس کوٹھیاں ہیں، باغات اور سومنگ پول ہیں۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ہم دونوں سمیت صرف آٹھ مسافر لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا پورا جمبو جیٹ خالی جا رہا تھا؟

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' راحل نے رازداری سے کہا۔ "ایل آل کی ہر فلائیٹ نیچے سے اوپر تک سامان سے لاد دی جاتی ہے۔ تم کیا جانو کہ یہ لوگ کون کون سی چیزیں ٹرانسپورٹ کرتے ہیں۔ مسافروں کی کمی کی کسر اس طرح نکال دی جاتی ہے کہ بڑی بڑی مشینیں اور جنگی سامان فریٹ میں لاد دیتے ہیں۔''

اسرائیل میں قدامت پسند یہودیوں کا بہت زور ہے، جس کو انسان قدم قدم پر محسوس کرتا ہے۔ جمعہ کے روز سورج ڈھلنے کے وقت سے، جب کہ سبت شروع ہونے والا ہوتا ہے، بعض علاقوں میں سے

کاریں نہیں گزر سکتیں، کیونکہ قدامت پسند ان پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہودیوں کو سبت کے روز آگ جلانے کی ممانعت ہے۔ مجھے ہوٹل میں چوتھی منزل پر کمرہ ملا تھا، جہاں پر پہنچنے کے لیے مجھے لفٹ لینی تھی۔ استقبالیہ میں کہا گیا کہ مجھے لفٹ کا بٹن نہیں دبانا پڑے گا، کیونکہ وہ سبت کے روز خود بخود اوپر نیچے آتی جاتی رہتی ہے۔ کمرے میں روشنی کرنے کے لیے یا ائرکنڈیشنر کو چلانے کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ دروازہ کھلتے ہی روشنی ہو جائے گی اور ائرکنڈیشنر کام کرنا شروع کر دے گا۔ کمرے کی بتیاں بھی نصف شب کو خود بخود بجھ جائیں گی۔ میں نے پوچھا اگر کسی کو اس کے بعد پڑھنا ہو تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟ اسی طرح میرے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہ تھا کہ اگر کسی کو سبت کے روز ٹیلی فون کرنا ہو تو اس کا کیا انتظام ہے۔ لوگ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کیسے آن اور آف کرتے ہیں۔ قدامت پسند یہودیوں کے اس چیز پر سختی سے عمل کرنے کا ایک واقعہ مجھے مصری شہر اسکندریہ میں پیش آیا تھا۔ ہم ایک بین الاقوامی کانفرنس میں حصہ لے رہے تھے، جس میں یہودی اسکالر بھی شامل تھے۔ جب صاحبِ صدر نے ان میں سے ایک کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، تو وہ دائیں بائیں جھانکنے لگا۔ صدرِ مجلس نے تھوڑے وقفے کے بعد دوسری بار اس کا نام پکارا۔ تب مجھے خیال آیا کہ آج جمعہ ہے اور شام پڑ چکی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ یہودی اسکالر سبت کے شروع ہو جانے کے سبب مائیکروفون کا بٹن نہ دبانا چاہتا ہو۔ میں اس سے کافی دور بیٹھا ہوا تھا۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر گیا اور میں نے اس کے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون کا بٹن دبایا۔ اس نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا مقالہ پیش کرنے لگا۔

میں کمرے میں پہنچ کر ابھی سوٹ کیس کھول ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف تل ابیب ٹیلی ویژن اسٹیشن کا ایک کارندہ بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں پاکستان میں ہونے والے ریفرنڈم کے بارے میں انٹرویو دے سکوں گا۔ میرے وہاں پر پہنچنے سے دو روز بعد جنرل ضیاء الحق کا رسوائے زمانہ ریفرنڈم ہونے والا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ صرف ایک یا دو منٹ کے بعد دوسری بار فون کی گھنٹی بجی۔ اب ریڈیو اسرائیل کا نمائندہ انٹرویو کے لیے خواہشمند تھا۔ میں نے پوچھا، آپ لوگوں کو میرے اسرائیل میں پہنچنے کی خبر کیسے ہوئی۔ اس نے کہا ابھی آپ ہمبرگ سے نہیں چلے تھے کہ ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔

میری آمد سے اگلا روز سبت کا تھا اس لیے سیمینار کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں سویرے سویرے یروشلم (القدس) چلا گیا تا کہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کر سکوں۔ اس زمانے میں ابھی مسلمانوں پر اتنی پابندیاں نہیں تھیں، جو آگے چل کر عاید کی گئیں۔ میں آزادی کے ساتھ ہر جگہ پر جا سکتا تھا، یہاں تک کہ یہودیوں کے قدیمی مندر کی دیوار کے سامنے کھڑا ہو کر گریہ و

زاری کرنے کا نظارہ بھی قریب سے کر سکتا تھا۔ پھر مجھے مسجدِ اقصیٰ میں نفل ادا کرنے کی سعادت ملی اور اس طرح ایک ہی سال میں مجھے مکّہ مکرمہ میں عمرہ کرنے اور القدس میں نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد عیسائیوں کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت ایک جرمن گروپ کی معیت میں کی، جو کرسمس وہاں پر منانے کے لیے آیا تھا۔ ان کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ ایک مسلمان عیسائیوں کی ہمراہی میں ان جگہوں کی زیارت کر رہا تھا۔ میں نے کہا حضرت عیسیٰؑ مسلمانوں کے لیے ایک پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں اور کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لائے۔

سمینار کا انعقاد تل ابیب یونیورسٹی کے ''موشے دیان سنٹر برائے مشرقِ وسطیٰ وافریقن اسٹڈی'' کے تحت ہو رہا تھا۔ پہلی شام ایک خاص تقریب ملنے ملانے اور تعارف پیدا کرنے کی غرض سے رکھی گئی تھی، جس میں ہانوکا کی بتیاں جلائی گئیں۔ جنرل موشے دیان کی بیٹی بھی اس موقع پر موجود تھی۔ یونیورسٹی کے اسٹاف کے علاوہ ملک کی اہم سیاسی شخصیتیں اور فوجی افسر بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ پریس سیکشن کی ایک محترمہ نے، جسے شاید مجھ پر لگایا گیا تھا، خاص طور پر مجھے اپنے پروں تلے لے لیا۔ میرے قیام کے آخری دن تک وہ مجھ پر بہت مہربان رہی اور ہمہ وقت مجھ پر نظر رکھتی رہی۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ میں اس کے ساتھ کھل کر ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا اور وہ لگی لپٹی رکھے بغیر مجھے اپنی ذاتی رائے سے مطلع کرتی رہی۔ مثلاً اسے اس بات کا بہت افسوس تھا کہ اس کے دوستوں میں کوئی عرب شامل نہیں تھا اور اس کو کبھی کسی عرب فیملی کے ہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہودی اور عرب دو متوازی ثقافتوں کی طرح اس ملک میں رہ رہے ہیں، جن کے درمیان رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ قریب قریب ہر عرب عبرانی جانتا ہے، مگر یہودیوں میں عربی زبان کا علم ناپید ہے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو بھی محض کتابی عربی آتی ہے۔ ایک پروفیسر کی بیوی نے بتایا کہ انھوں نے ابتداء میں بعض عربوں کو اپنی نجی محفلوں میں بلایا تھا، مگر وہ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لاتے تھے یا اگر ایک آدھ بار کسی کی بیوی آ بھی گئی، تو وہ ساری شام منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے عرب کولیگوں کو بلانا چھوڑ دیا۔

اسرائیلی عورتوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ یورپین عورتوں کی طرح ہر قسم کی بندش سے آزاد رہنے کو ترجیح دیتی ہیں اور حتی الامکان ملازمت کرتی ہیں۔ فوج میں بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو لازمی سروس کرتی ہیں۔ البتہ میں نے سن رکھا تھا کہ ملٹری میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ایک عرب دوست نے تو یہاں تک کہا کہ اسرائیلی فوجی افسر نوجوان لڑکیوں کو اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ پچاس برس تک کی عمر کے ہر اسرائیلی کو تین برس تک لازمی فوجی سروس کرنی ہوتی ہے، جس کے

بعد ان کو ہر سال ایک ماہ کے لیے ٹریننگ کی خاطر ملٹری کیمپ میں جانا ہوتا ہے۔ یہ مرد اکثر بڑی عمر کے ہوتے ہیں اور نوجوان لڑکیوں کو محبوبہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف بیویاں ان کی گھر سے غیر حاضری کے دوران دوسرے مردوں کے ساتھ یاری لگا لیتی ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں پوچھا، تو ایک عورت نے کہا کہ اس کی اٹھارہ سالہ بیٹی ایک شادی شدہ افسر کے عشق میں مبتلا ہے اور اس بارے میں ماں باپ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ جب میں نے جاننا چاہا کہ کیا یہ بات درست ہے کہ لڑکیوں سے ملٹری میں ادنیٰ قسم کے کام کرائے جاتے ہیں، جیسے افسروں کے لیے کافی تیار کرنا یا بطور سیکرٹری ان کے لیے لکھت پڑھت، تو ایک عورت نے کہا کہ اسے یہ پسند ہے کہ اس کی بیٹی سے ایسا کام لیا جائے بجائے ایسی سخت ٹریننگ کے جو لڑکوں کو دی جاتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ عورتیں عام طور سے اپنے حقوق کے بارے میں شاکی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان سے وہی کام کرائے جاتے ہیں جو عام طور سے سب معاشروں میں عورتیں کرتی آئی ہیں، مثلاً کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی ستھرائی اور بچوں کی پرورش۔ اسرائیل کے قائم ہونے سے پہلے وہاں پر تجرباتی طور پر بنائے گئے کیبوتز میں، جن کا مقصد ایک نئی یہودی نسل کی پرورش تھا جو ایک طرف کھیتی باڑی کرے گی دوسری طرف اعلیٰ معیار کی سائنٹفک تعلیم پائے گی، بچوں کی اجتماعی تربیت کے سلسلے میں تجربات کیے گئے تھے۔ وہاں بچوں کو ماں باپ سے علیحدہ گھروں میں رکھا جاتا تھا۔ ماں باپ اپنے بچوں کو کام سے فارغ ہونے پر تیسرے پہر گھر لے جا سکتے تھے مگر آٹھ بجے شام تک سب بچوں کو واپس اجتماعی رہائش گاہ میں پہنچنا ہوتا تھا۔ یہ تجربات کچھ ایسے کامیاب نہیں ہوئے تھے اور اکثر کیبوتز میں پھر سے عورتیں اپنے روایتی کاموں کی طرف لوٹ رہی تھیں۔

عام طور سے بین الاقوامی سیمیناروں کے اجلاسوں میں صرف وہی لوگ حصہ لیتے ہیں، جن کو مقالہ پیش کرنا ہوتا ہے، مگر وہاں پر حاضرین میں غیر متعلقہ ریسرچ اسکالروں کی خاصی بڑی تعداد کے علاوہ بے شمار دوسرے لوگ بھی حصہ لے رہے تھے، جن میں سابق صدرِ مملکت خائم ہرسوک، سابق وزیرِ خارجہ ابا ایبان اور اپوزیشن لیبر پارٹی کے سربراہ اضحاق رابین بھی شامل تھے، جو تھوڑے دنوں بعد ملک کے وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مؤخر الذکر کے ساتھ ہماری ایک خاص نشست ہوئی، جس میں سوال و جواب کا سلسلہ تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ ان کے علاوہ ملٹری کے افسروں کی وہاں پر بھرمار تھی۔ یوں لگتا تھا سیمینار کا موضوع ان لوگوں کی نظر میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس زمانے میں ایران کے اسلامی انقلاب کے پیشِ نظر شیعوں کے انقلابی جوش و خروش کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ایران کی خارجہ پالیسی اسرائیل کی نظر میں بہت جارحانہ تھی۔ جنوبی لبنان کی شیعہ آبادی میں ایران کی مقبولیت دن

بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسرائیل بدستور اس ملک کے ایک حصے پر قابض تھا اور روز بروز اس کی فوج کو حزب اللہ کے ساتھ لڑنا پڑتا تھا، جس نے فلسطینی مجاہدین کی جگہ لے لی تھی۔ ہمیں خاص طور پر جنوبی لبنان کے شہر صور (Tyrus) بھی لے جایا گیا تاکہ وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ بات چیت کر سکیں، مگر سوائے دو تین افراد کے آبادی کے شرفاء حاضر نہیں ہوئے اور جو لوگ آئے تھے وہ بھی کسی قسم کی بات چیت کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ سفر ملٹری کے خاص انتظام کے تحت کیا گیا تھا، کیونکہ اس علاقے میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جس ہوٹل میں ہمیں لے جایا گیا تھا، اس کے چاروں طرف توپیں نصب تھیں اور باہر فوج کا ایک دستہ حفاظت کے لیے کھڑا تھا۔

اس سیمینار کے سبب مجھے بہت سے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں سے خاص طور پر برنارڈ لیویس (Bernard Lewis)، ایلی قدوری (Elie Kedourie) اور نکی کدی (Nikki Keddie) شامل تھے۔ استشراق کے اسرائیلی طالب علموں کو امریکہ میں لیویس اور انگلستان میں قدوری کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کے علاوہ میرا تعارف امریکہ سے آئے ہوئے زلمے خلیل زاد (جس کو طالبان کی شکست کے بعد افغانستان میں امریکہ کا سفیر مقرر کیا گیا تھا) اور اس کی بیوی شیریل بنار (Cheryl Benard) سے ہوا جو ویانا میں سوشل اسٹڈی کا ایک انسٹیٹیوٹ چلا رہی تھی۔ دونوں نے مل کر انھیں دنوں ایک کتاب ایران پر لکھی تھی۔ اس کے علاوہ شیریل پاکستان پر بھی دو کتابیں تصنیف کر چکی تھی۔

ایک شام ایک جنرل کے گھر پر دی جانے والی پارٹی کے لیے مخصوص تھی، جس میں شرکائے سیمینار کے علاوہ بہت سے ملٹری افسر بھی حصہ لے رہے تھے۔ وہاں پر مجھے ایک کرنل نے بتایا کہ وہ پاکستان کو اپنی واسکٹ کی جیب کی طرح جانتا ہے۔ میں نے کہا تم کو تو اس ملک میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا۔ اس پر اس نے اپنی جیب سے برٹش پاسپورٹ نکال لیا۔ اس نے کہا ہم میں سے اکثر کے پاس دو ملکوں کی قومیت ہے۔ برٹش پاسپورٹ نے کرنل بیلی کے لیے پاکستان کی سربرآوردہ فیملیوں کے دروازے وا کر دیے تھے۔ اس کا تعارف کسی موقعے پر انگلستان میں ریاست سوات کے والی سے ہوا تھا، جس نے اسے پاکستان آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے ہاں دو تین ہفتے قیام کرنے کے بعد وہ اپنے مہمان نواز دوستوں کے ہاں جا کر باری باری ٹھیرا تھا، جو سارے پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے کہا میں پاکستان کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے یقین ہے اس نے یہ سفر حکومتِ اسرائیل کے ایما پر کیا تھا۔ ایک وہی نہیں چند ایک دوسرے شرکائے محفل بھی پاکستان کا سفر کر چکے تھے۔ مجھ سے ڈاکٹر رابینووچ نے، جن کو واشنگٹن میں سفیر بنا کر بھیجا جا رہا تھا، پوچھا کہ پاکستان کب اسرائیل کو تسلیم کرے گا؟ میں نے کہا اس وقت تک نہیں جب تک سارے عرب ملک اور اسلامی دنیا کی دوسری حکومتیں قبول نہ کر چکی ہوں۔ گویا پاکستان اسلامی دنیا کا آخری ملک ہوگا جو

اسرائیل کو تسلیم کرے گا۔ انھوں نے کہا ہم امریکہ سے کہہ کر دباؤ بھی توڑ ڈال سکتے ہیں۔

میں اس رات ہوٹل میں واپس لوٹا تو اسرائیل ٹیلی ویژن کے عربی پروگرام میں ایک عرب قیدی کا انٹرویو نشر ہو رہا تھا، جس کو اپنی بہن کو قتل کرنے کے جرم میں پندرہ سال کی سزا ہوئی تھی، جس میں سے بارہ سال وہ جیل میں گزار چکا تھا۔ بہن کو چھری سے مار ڈالنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس نے ایک رات اپنے گھر سے باہر گزاری تھی۔ انٹرویو لینے والی ایک عرب صحافی خاتون تھی۔ اس نے پوچھا: کیا اتنے برسوں کے بعد اس کو اپنے فعل پر ندامت محسوس نہیں ہوتی؟ اس نے جواب دیا: وہ ان سارے برسوں کے دوران دن رات اپنے فعل پر غور کرتا رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ درست تھا۔ اس کے اس فعل کے نتیجے میں اس کے خاندان کے نام پر سے دھبّہ دھل گیا تھا، جو بہن کے فعل کی وجہ سے لگ گیا تھا۔ انٹرویو لینے والی نے اس کے اس فعل کو غیر انسانی اور غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سراسر بربریت تھی، مگر قیدی نے کہا کہ اس نے ایک مصری فلم دیکھی تھی، جس کی کہانی ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھی تھی۔ اس فلم میں باپ اپنی بیٹی کو اس کی ماں اور بھائی بہنوں کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیتا ہے کیونکہ بیٹی نے کسی لڑکے کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی۔ اس فلم سے اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہ چیز عربوں کی سنّت اور ریت ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس کہانی کے ذریعہ اس شنیع فعل کی مذمت کرنی چاہتے تھے۔ انٹرویو لینے والی خاتون نے بہتیری کوشش کی کہ اس کو سمجھائے کہ اس نے اپنی بہن پر ظلم کیا تھا مگر قیدی اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے کہا اس کا سارا خاندان اس فعل کی بنا پر اس کا احسان مند ہے۔

سمینار کے خاتمے پر میں ایک روز کے لیے اپنے عرب دوست ابراہیم عودہ کے پاس حیفا چلا گیا، جس کے ساتھ میری دوستی اس وقت سے تھی، جب وہ جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں اس کو ملے بغیر اور اسرائیل کے بارے میں اس کی رائے سنے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر میں اس کی زبان سے اسرائیل میں جماعتِ احمدیہ کی کہانی سننی چاہتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ عودہ خاندان ۱۹۳۰ء سے احمدی چلا آ رہا تھا۔ یہ لوگ اسرائیل بننے کے بعد ملک کو چھوڑ کر نہیں گئے تھے اور بدستور اپنی خاندانی زمین پر قابض تھے۔ اس خاندان کے نو سو افراد تھے اور وہ سب حیفا کے پہلو میں واقع پہاڑی کبابیر پر آباد تھے۔ ان کے گھر شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح پہاڑی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ابراہیم کا گھر احمدیہ مسجد کے پہلو میں تھا۔ مکان میں داخلے کا دروازہ دوسری منزل پر کھلتا تھا، جب کہ پہلی منزل تک نیچے اور تیسری منزل تک اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں لینی پڑتی تھیں۔ ابراہیم اسرائیل میں عربوں کی ٹیکنیکل تعلیم کا انسپکٹر جنرل ہے۔ ہم شام کے وقت جماعتِ احمدیہ کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ وہاں پر تیس بتیس

افراد جمع تھے۔ امامت مولوی شریف احمد امینی نے کرائی، جن کو قادیان سے بھیجا گیا تھا۔ چونکہ پاکستان کے اسرائیل کے ساتھ ڈپلومیٹک تعلقات نہیں ہیں، اس لیے وہاں سے مبلّغ نہیں بھیجا جا سکتا۔ ابراہیم نے بتایا کہ اسرائیل کے احمدی فوج میں سروس نہیں کرتے، البتہ وہ اس ملک کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ جماعتِ احمدیہ کی مسجد کے قریب بہائیوں کی مرکزی عبادت گاہ ہے کیونکہ ان کا مرکز، ایران سے نکالے جانے کے بعد، پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں وہاں پر منتقل ہو گیا تھا۔ اس وقت یہ علاقہ انگریزی عملداری میں شامل تھا۔

سپین میں سمینار

میں اسرائیل سے واپس لوٹا تو سپین سے ایک کانفرنس میں شمولیت کے لیے دعوت نامہ آیا پڑا تھا، جو لبنان کے بارے میں تھی اور خوزے اورتیگا ای گاسیت (Jose Ortega y Gasset) فاونڈیشن کی طرف سے تھی، جس کا مرکز طلیطلہ (Toledo) میں ہے۔ میڈرڈ ائرپورٹ پر لوسیا مجھے لینے کے لیے آئی ہوئی تھی، جو یونیورسٹی میں پڑھتی اور فاؤنڈیشن میں کام کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ تھوڑی دیر میں لندن سے ڈاکٹر عباس قلعہ داری کا جہاز آنے والا ہے، اس لیے اس کا انتظار کر لیتے ہیں۔ میں عباس کے نام اور کام سے واقف تھا مگر پہلی بار اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ لبنان سے ڈاکٹر کمال صلیبی بھی آ رہے تھے، جن کو تل ابیب میں ہونے والی کانفرنس میں اس لیے نہیں بلایا گیا تھا کہ ان کی نئی کتاب میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ بائبل کی سرزمین فلسطین نہیں تھی بلکہ سعودی عرب کا علاقہ عسیر تھا، جو ملّہ سے جنوب کی طرف ہے اور چھ سو میل تک یمن کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ یہ نظریہ صیہونیوں کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکانے کے مترادف تھا، جو فلسطین کو اپنے آباء واجداد کا علاقہ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، جہاں پر یہودیت نے جنم پایا تھا، اس لیے حکومت کے نزدیک ڈاکٹر کمال صلیبی کو اسرائیل آنے کی دعوت نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں ان کا نام اسپین والی کانفرنس کے مدعوئین کی فہرست میں دیکھ چکا تھا، بلکہ ان کے لیے ہمبرگ کے ہفتہ وار ''ڈیر شپیگل'' کے مدیر کا پیغام لایا تھا، جو ان کی کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ چھاپ رہے تھے۔ یہ کتاب تھوڑے دنوں میں چھپ کر شائع ہوئی مگر عام طور سے مبصرین نے اس پر لکھنے سے گریز کیا۔

طلیطلہ بہت خوبصورت شہر ہے جس کو Tejo دریا نے (جس کو عرب شاید تاج کے نام سے

جانتے تھے) تین طرف سے گھیر رکھا ہے اور گویا سر پر تاج کی طرح مزین ہے۔ہمیں میڈرڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بتایا کہ میڈرڈ بھی دراصل عربی زبان کے لفظ **مجریط** کا بگڑا ہوا نام ہے جس کا مطلب بہتے ہوئے پانی کی ندی ہے، جس کے کنارے پر یہ شہر آباد ہے۔ہمیں فاؤنڈیشن کی بلڈنگ میں ٹھیرایا گیا ،جو شہر کے عین درمیان میں پرانے قصبے کے اندر پائی جاتی ہے۔

سمینار کے شرکاء کے اعزاز میں کھانے کی ایک خاص دعوت دی گئی، جس میں فاؤنڈیشن کی صدر بھی شامل ہوئی، جو اورتیگا کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے دائیں ہاتھ پر بٹھایا گیا۔ میں اس اعزاز پر حیران ہو رہا تھا، کیونکہ میں سمینار کا عہدے دار نہیں تھا۔اس نے بتایا کہ اس نے منتظمین سے پوچھا تھا کہ کیا کوئی عرب سمینار میں شامل ہو رہا ہے۔اسے بتایا گیا کہ تین عیسائی عرب سکالر شامل ہو رہے ہیں۔ اس پر اس نے کہا کیا کوئی مسلمان بھی موجود ہے۔اس پر تمھارا نام لیا گیا۔میں نے کہا اس کو میرے دائیں ہاتھ پر بٹھایا جائے۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ ہم نے عربوں اور اسلام کو اس ملک سے نکال تو دیا تھا، مگر آج بھی ہمارے دلوں میں اس عہد کی عظمت کے آثار نقش ہیں۔اس نے بتایا کہ کالج کے زمانے میں اس نے عربی سیکھنی شروع کی تھی، مگر ملکی خانہ جنگی کے سبب اسے تعلیم نامکمل چھوڑنی پڑی تھی۔

اسرائیل سے آنے والے محققین کی بڑی تعداد اور بالخصوص ڈاکٹر اعتمار رابینووچ کی اس سمینار میں شمولیت کے سبب مجھے یہ شبہہ پیدا ہوا تھا کہ شاید یہ کانفرنس بھی اسرائیل کے ایما پر ہو رہی ہے۔اس بات کی تصدیق اورتیگا کی بیٹی کی باتوں سے ہوگئی، جس نے کہا کہ اسے ذاتی طور پر اسرائیل میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، مگر جب اسے بتایا گیا کہ یہ کانفرنس عرب ممالک کے ساتھ دوستی اور خیر سگالی کے روابط پیدا کرنے میں مدد ہو سکتی ہے، تو اس نے کانفرنس کی منظوری دے دی البتہ اخراجات اسرائیل کا ایک ادارہ ادا کرے گا۔پھر جب اگلے روز کانفرنس شروع ہوئی، اور میڈرڈ یونیورسٹی کے مستشرقین اپنے طلبہ کے ایک وفد کے ساتھ وارد ہوئے، تو بہت جلد یہ بات کھل گئی کہ اسپین کے نمائندگان کا رویہ اسرائیل کے ساتھ دوستانہ نہیں تھا۔نوجوان طالب علموں نے اپنے سوالات کے ذریعہ اسرائیلیوں کو بہت پریشان کیا۔ ایک ہسپانوی اخبار نویس عورت نے ان پر غیر معمولی طور پر جارحانہ تنقید کی۔اس نے کہا یہودی دنیا بھر سے کھلے بندوں اسرائیل آتے ہیں اور ان کا حق وہاں کی زمین پر تسلیم کیا جاتا ہے، مگر فلسطینیوں سے یہ حق چھین لیا گیا ہے۔اس نے اسرائیل کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ انسانیت دشمن ملک قرار دیا۔

(اس زمانے میں اسرائیل کے ایما پر بہت سے بین الاقوامی سمینار منعقد ہو رہے تھے، جن کا مقصد یہ تھا کہ اسرائیل کو مشرقِ وسطیٰ کا حصہ مان لیا جائے۔ چنانچہ مجھے دسمبر ۱۹۹۳ء میں جرمنی کی فریڈریش ناؤمن فاؤنڈیشن کی طرف سے اسکندریہ (مصر) میں بلائے جانے والے ایک سمینار میں شامل

ہونے کا موقع ملا تھا، جس میں اسرائیل کی طرف سے چھ مندوب بھیجے گئے تھے، جو مختلف وزارتوں کی نمائندگی کررہے تھے۔ ان کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ کے لیے ایک نیا معاشی نظام پیش کیا گیا، جس میں بین الاقوامی سطح پر اسرائیل تجارتی اور دیگر معاشی معاملات میں مشرقِ وسطیٰ کی نمائندگی کرے گا۔ عرب، بالخصوص، فلسطینیوں کے لیے اس اسکیم میں بہت جونیئر مقام رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ عرب ملکوں کی طرف سے غیر ممالک کو تیل اسرائیل کی معرفت بھیجا جائے گا، جس کے لیے اسرائیل کے ساحلی مقامات تک پائپ لائن لگائی جائے گی۔ فلسطینی عرب سنگترے، ٹماٹر اور زیتون کی پیداوار کے ذمہ دار ہوں گے، جب کہ اسرائیلی اپنے علاقے میں ماڈرن انڈسٹری لگائیں گے، جن میں کام کرنیکے لیے فلسطینی مزدور بھرتی کیے جائیں گے۔)

دوپہر کے کھانے میں تولیدو کے رئیسِ بلدیہ ہمارے ساتھ شامل ہوے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سال ان کے شہر کو عربوں سے آزاد کرائے ہوے نو صدیاں پوری ہورہی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جشن منایا جارہا ہے۔ اس موقع پر وہ ایک خاص سکّہ جاری کرنا چاہتے تھے، جس پر ایک قدیم عربی سکّے کی عبارت درج کی جائے گی۔ وہ اس کی نقل اپنے ساتھ لائے تھے، جس کا متن یہ تھا: **نقش بمدینة طليطلة اسرها الله** (شہر طلیطلہ، جس کو اللہ آباد رکھے، میں نقش ہوا۔) وہ یہ عبارت کوفی رسم الخط میں لکھوانا چاہتے تھے۔ اردن کے ڈاکٹر کامل ابو جابر نے عمان سے لکھوا کر بھیجنے کا وعدہ کیا۔ کامل ابو جابر نے اپنے مضمون کے ہر صفحے پر کم سے کم تین بار اردن کے شاہ حسین کا تعریفی رنگ میں ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا اگر میں شاہ حسین کی جگہ پر ہوتا تو تمھیں ایک آدھ تمغہ اس خدمت کے سلسلے میں ضرور پیش کرتا۔ اتفاقی طور پر اس کانفرنس کے صرف چھ ماہ بعد کامل ابو جابر کو اردن کا وزیرِ خارجہ بنا دیا گیا۔

رئیسِ بلدیہ نے کھانے کے بعد مجھے اور کامل ابو جابر کو کتھیڈرل دکھانے کی پیشکش کی، جو ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے باقاعدہ طور پر عربی سیکھ رکھی تھی۔ پرانے چیپل کی تمام کرسیوں کی پشتوں پر عربوں کے ساتھ ہونے والی جنگوں کے سین لکڑی میں کھدے ہوے ہیں۔ ایک عجیب بات انھوں نے یہ بتائی کہ اسپین میں شروع سے یہ اصول چلا آرہا ہے کہ تاریخی اہمیت کی عمارتوں میں اگر دروازہ بنوایا جاتا ہے، تو اس کے دونوں پٹ دو مختلف کاریگروں سے بنوائے جاتے ہیں۔ کمرے کا آدھا حصہ ایک کاریگر بناتا ہے اور دوسرا حصہ دوسرے کاریگر کے سپرد کیا جاتا ہے۔ ایک کمرے کے دروازے کی میناکاری عربی طرز کی تھی۔ تاہم عربی عبارت اور قرآنی آیات موجود نہیں تھیں۔ اسی طرح چرچ کی بعض کھڑکیاں اور ان میں لگے ہوے شیشے عرب کاریگروں کے بنائے ہوے تھے۔ ایک کمرے میں کسی عرب بادشاہ ابوالحسن کے علَم رکھے ہوے تھے، جن پر عربی زبان

میں عبارت درج ہے۔ دونوں علموں پر کلمہِ شہادت لکھا ہوا ہے۔ اسی کمرے کی ایک الماری میں ایک شاہی کوٹ رکھا ہے، جو کسی عرب کاریگر کا بنایا ہوا ہے۔ یہ کوٹ بادشاہ نے اپنے سترہ سالہ بیٹے کے لیے بنوایا تھا، جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ کوٹ کو اس کے ساتھ دفن کر دیا گیا تھا۔ چند برس قبل اس کی قبر کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کھولا، تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کوٹ اپنی اصل حالت میں صحیح وسالم موجود تھا۔ چونکہ اس پر سونے کی تاروں سے نقش ونگار کیے گئے تھے، اس لیے کیڑے مکوڑے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ وہاں سے واپسی کے راستے میں رئیسِ بلدیہ نے ہمیں ایک ریستوراں دکھایا، جس کے اندر ایک ستون کھڑا ہے، جس پر کوفی طرزِ تحریر میں کوئی عبارت درج ہے۔ ہم وہاں پر گئے مگر روشنی کافی نہ ہونے کے سبب عبارت کو نہ پڑھ سکے۔ ریستوراں کتھیڈرل کے عین عقب میں ہے اور شاید عربوں کے زمانے میں وہ جگہ جامع مسجد کا حصہ تھی۔ جب مکان تعمیر کیا گیا تو وہ ستون عین اسی جگہ پر کھڑا تھا اس لیے اس کو کھڑا رہنے دیا گیا اور مکان کی دیواریں اس کے اردگرد بنا دی گئیں۔

دوسرے روز سب شرکائے سیمینار یہودی سیناگوگ دیکھنے گئے، جو ایک مستطیل ہال کی طرح تھا۔ چھت کی اونچائی بیس گز کے لگ بھگ تھی، جس کی سیلنگ لبنان کے صنوبر کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ چھت سے ذرا نیچے پلستر سے استرکاری کی گئی تھی جسکی عبارتیں عربی اور عبرانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ کسی قسم کا گنبد یا مینار موجود نہیں تھی۔ لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر ایلی قدوری نے، جو عراق کے رہنے والے یہودی تھے، بتایا کہ یہودی عبادت گاہیں سادگی کا مرقع ہوتی ہیں، ان میں مسجدوں کی طرح اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی قسم کی تصویریں یا بت موجود نہ ہوں۔ پہلو کے ایک کمرے میں تین یہودی طبیبوں کے مرقد بنے ہوئے ہیں، جنکے بارے میں بتایا گیا کہ انھوں نے طاعون پھیلنے پر طلیطلہ کے باسیوں کی بلاتمیزِ مذہب ونسل خدمت کی تھی اور خود بھی اسی وباء کی نذر ہو گئے تھے۔

جب ہم کتھیڈرل کے ایک عقبی کمرے میں عرب بادشاہوں کے علَم دیکھ رہے تھے، تو ہماری پارٹی میں ایک چینی لڑکی بھی شامل ہوگئی، جو امریکہ سے سیر وسیاحت کے لیے آئی تھی۔ باتوں باتوں میں جب اسے پتا چلا کہ میں کانفرنس کے بعد جنوبی اسپین کے عرب شہروں کی سیاحت کے لیے جا رہا ہوں، تو اس نے کہا کہ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ میرے ساتھ وہاں پر جانا چاہتی ہے۔ اس طرح اس کو مفت میں ایک ٹورسٹ گائیڈ مل جائے گا جس کو عربی آتی ہے اور جو ان مقامات کی تاریخ سے واقف ہے۔ میں نے اس لڑکی کے بارے میں ایک افسانہ بعنوان ''کیتھی چن'' لکھا تھا جو میرے افسانوں کے مجموعے ''زرد ستارہ'' میں شامل ہے۔ اشبیلیہ میں ہمارا ساتھ صرف دو روز تک رہا۔ اس کے بعد وہ اکیلی سفر کرنا چاہتی تھی۔ دراصل وہ حمل سے تھی اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ اس کو اسقاطِ حمل کرانا چاہیے یا نہیں۔ میں

نے کہا کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو کبھی اسقاطِ حمل کے بارے میں نہ سوچتا۔ اس نے کہا چونکہ اسے پتا چل گیا ہے کہ میں اس بارے میں کیا سوچتا ہوں اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ میں اس کے فیصلے پر اثر انداز ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ باقی ماندہ سفر اکیلی کرنا چاہتی ہے، جس کے دوران وہ ازخود کوئی فیصلہ کرے گی۔

اس افسانے میں سے ایک ٹکڑا یہاں پر درج کیا جاتا ہے، اس کا تعلق رومن شہر ایطالیکا (Italica) سے ہے، جس کی سیاحت میں نے پہلی بار کیتھی کی معیت میں کی تھی:

''پچھلے پہر ہم سیویا سے نو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع قدیم رومن شہر ایطالیکا کے آثار دیکھنے گئے۔ دریا کے اس طرف سیویا آباد ہے اور دوسری طرف ایطالیکا ہوا کرتا تھا۔ یہاں کی بندرگاہ میں کسی زمانے میں سمندری جہاز آکر لنگر انداز ہوتے تھے۔ چنانچہ کولمبس کا بیڑا ہندوستان کا رستہ تلاش کرنے کے لیے یہیں سے روانہ ہوا تھا۔ مگر بعد کے زمانوں میں دریا کی تہہ میں ریت اور مٹی کے جم جانے کی وجہ سے پانی کی گہرائی کم ہوگئی تھی اور دریا جہاز رانی کے قابل نہ رہا تھا۔

ایطالیکا کے طول و عرض کا اندازہ ان پختہ سڑکوں سے ہوتا ہے، جو میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نہر کے وسط میں ایک ایمفی تھیٹر تھا، جس کے آثار کھودے جا چکے ہیں۔ دوسری طرف بہت سی عمارتوں، بازاروں اور مندروں کی بنیادیں نظر آتی ہیں۔ بعض جگہوں پر موزائیق کا فرش بھی دیکھنے میں آتا ہے۔

کیتھی جانتی ہو کہ اس شہر میں پیدا ہونے والا ایک غریب لڑکا روم میں جا کر قیصر بن گیا تھا۔ اس کا نام ہاڈریان تھا۔ میں اس کے بارے میں پہلے سے پڑھ چکا تھا۔

ایک منٹ ٹھیرو۔ میری گائیڈ بک میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ کیتھی نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ ہاڈریان ۲۴ جنوری ۷۶ء کو ایطالیکا میں پیدا ہوا تھا۔

پھر تو آج اس کی سالگرہ ہے۔ میں نے اپنی گھڑی پر تاریخ دیکھ کر کہا۔

کیتھی ہاڈریان کی سالگرہ منانے کی ضد کرنے لگی۔ آثارِ قدیمہ کے گیٹ کے پاس کچھ ریستوران پائے جاتے ہیں مگر ٹورسٹ سیزن نہ ہونے کی وجہ سے بند تھے۔ آخر کار گاؤں میں ہمیں ایک ریستوران کھلا مل گیا۔ اندر پانچ کسان ٹیلی ویژن کے سامنے بڑے مؤدبانہ انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے ریستوران میں داخل ہوتے ہی کیتھی ان کی نظروں کا مرکز بن گئی جب کہ کیتھی کی نظر بوفے میں رکھے ہوئے کیک پر جمی ہوئی تھیں۔

کیتھی نے پورے کیک کا آرڈر دیا اور ریستوران میں موجود سب لوگوں کے لیے کافی بنانے کو کہا۔

جب ہم سب ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور کیک کاٹا جا رہا تھا تو ایک دیہاتی نے لجاتے

ہوئے مجھ سے پوچھا: کیا آج لیڈی کی سالگرہ ہے؟

لیڈی کی نہیں، بلکہ تمھارے قصبے کے مشہورترین فرزند ہاڈریان کی، جو ایطالیکا میں آج کے روز پیدا ہوا تھا اور رومن امپائر کا امپراطور بن کے مرا تھا۔

دیہاتیوں نے ہاڈریان کا نام بھی نہیں سن رکھا تھا مگر وہ یہ جان کر خوش ہوئے کہ ان کے گاؤں کا لڑکا اتنا بڑا آدمی بن گیا تھا۔ ان کی متفقہ رائے تھی کہ جب وہاں کے لوگ غیر ملکوں میں چلے جاتے ہیں تو بہت کچھ بن جایا کرتے ہیں اور اگر ہاڈریان وہاں کا رہنے والا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اس کی برتھ ڈے پارٹی میں شمولیت کے لیے تیار تھے۔ ریستوران کے مالک کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ وہ کافی کا دور چلنے کے بعد وائن کے گلاس لے آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب ہمیں اس کی طرف سے دی جانے والی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کرنی ہوگی۔ اب وائن کا دور چلنے لگا اور خدا جانے اس کا خاتمہ کب ہوتا اگر کیتھی کو یاد نہ آجاتا کہ سیویا جانے والی آخری بس کا وقت ہو گیا تھا۔"

میرا اگلا پڑاؤ قرطبہ تھا۔ اب کے میں نے بس میں سفر کیا۔ سڑک بہت اچھی تھی۔ جگہ جگہ سنگترے بیچنے والے کھڑے تھے۔ تھوڑا عرصہ پہلے ملک میں انتخابات ہوئے تھے، جس کی یادگار ایک دیوار پر بنائی جانے والی تصویر تھی جو بیس گز کے لگ بھگ لمبی تھی۔ آرٹسٹ نے کالے کپڑوں میں ملبوس مزدوروں کا جلوس بنایا تھا، جو سر پر کالے ہیٹ رکھے ہوئے کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دینے کے لیے جا رہے تھے۔ صرف بیس برس قبل جب ہم اس ملک میں پہلی بار آئے تھے تو اس وقت ملک میں جنرل فرانکو کی ڈکٹیٹرشپ تھی۔ اس دوران میں ملک میں جمہوریت آ چکی تھی، جس کے سبب لوگوں کے اندر بہت ولولہ پایا جاتا تھا۔ ملک میں آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی۔

اب کے مجھے عین مسجد (Mesquita) کے پہلو میں ایک ہوٹل ملا، جو سردیوں کی وجہ سے خالی پڑا تھا۔ میں ان کا اس روز واحد مہمان تھا۔ ہوٹل میں ہیٹنگ کا انتظام نہیں تھا۔ ایک بہت فیشن ایبل محترمہ کمرے کے بارے میں پوچھنے آئی۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ پتا چلا کہ ارجنٹائن کی رہنے والی ہے اور گرمیوں کی چھٹیاں منانے آئی ہے۔ جب یورپ میں سردیاں ہوتی ہیں تو جنوبی امریکہ میں گرما کا موسم ہوتا ہے۔ میں نے کہا تم بھی میری طرح اس جگہ پر آن کر پھنس گئی ہو۔ اس ہوٹل میں ہیٹنگ نہیں پائی جاتی، اس لیے ساری رات ٹھٹھرتے ہوئے گزرے گی۔ اس نے کہا کیا تم میرے ساتھ کسی کلچرل پروگرام میں جا سکو گے؟ میں نے کہا بندہ حاضر ہے۔ سونیا شکل وصورت کی بے حد دلکش عورت تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ماہرِ نفسیات تھی۔ چونکہ ہمیں اس شام کسی پروگرام کا ٹکٹ نہ مل سکتا تھا، اس لیے ہم نے قرطبہ کے اندرونِ شہر کی گلیوں میں گھومنے کا پروگرام بنایا، جس کے دوران مختلف

ریستورانوں میں جا کر بیٹھے۔ سونیا طلاق شدہ تھی۔ اس نے کہا اس کی اصل زندگی طلاق لینے کے بعد شروع ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنے وطن کے شب و روز کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی باتیں میرے لیے ایک نئے برِاعظم کی دریافت سے کم نہ تھیں۔

اگلی صبح مسجد کی زیارت کے لیے جانے کا پروگرام تھا، مگر سونیا دس بجے تک اپنے کمرے سے برآمد نہ ہوئی اس لیے میں اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ خدا جانے کیوں میں نے دل میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ مسجد کی اصل ہیئت کو برقرار رکھا گیا تھا اور صرف درمیان میں ایک حصے کو چرچ میں ڈھالا گیا تھا۔ اب کے جا کر دیکھا تو پتا چلا کہ مسجد کی وضع کو بدلنے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی۔ مسجد کے عین بیچوں بیچ ایک باروک چرچ کھڑا کر دیا گیا تھا، جو بدصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مسجد کے صرف قدیم ترین حصے کو محراب سمیت باقی رہنے دیا گیا تھا۔ مسجد کے ستون اپنی جگہوں پر کھڑے ہیں، جن کے اوپر بنائی جانے والی محرابوں پر نقش رنگین لکیریں ان کی دلکشی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ بعض جگہوں پر محرابوں کو بدل دیا گیا ہے۔ صرف نافِ کلیسا عربوں کے زمانے کی یادگار ہیں، جن پر ہموار چھت ڈالی گئی تھی۔ سیلنگ لکڑی کی ہے، جس پر پائے جانے والے نقش و نگار کاریگری کا نادر نمونہ ہیں۔ بعض جگہوں پر چھت کو اکھاڑ کر گنبد تعمیر کیے گئے ہیں۔ مسجد کی ایک بیرونی دیوار کو برقرار رکھا گیا تھا، جو عین اس جگہ پر بنائی گئی تھی، جہاں پر سابقہ رومن زمانے کے مندر کی بنیادیں پائی جاتی تھیں۔ ان دنوں اس دیوار کی مرمت ہو رہی تھی۔ جب ہم پہلی بار ۱۹۶۵ء میں آئے تھے تو اس دیوار پر عربوں کے زمانے کے نقش و نگار دیکھے جا سکتے تھے، جو اس دوران میں معدوم ہو چکے تھے۔ اس عمارت میں نہ تو اب چرچ ہے اور نہ ہی مسجد۔ مقامی لوگ ایک کونے میں خاموشی کے ساتھ عبادت کر سکتے ہیں البتہ مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ متعین نہیں ہے۔ میں نے عین محراب کے سامنے دو نفل پڑھے اور مسجد تعمیر کرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ مجھے کسی نے روکا ٹوکا نہیں۔

وہ تو اچھا ہی ہوا کہ سونیا میرے ساتھ نہ آئی تھی، کیونکہ مجھے اس روز قرطبہ سے تھوڑے فاصلے پر پائے جانے والے گاؤں پیدرو آباد جانے کا شوق تھا، جہاں پر جماعتِ احمدیہ نے کچھ عرصہ قبل ایک مسجد بنائی تھی۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا یہ بات درست تھی کہ اس مسجد کے بننے کے سبب اندلس کے مقامی لوگوں میں اسلام کا احیاء ہو رہا تھا۔ یہ مسجد چونکہ میڈرڈ سے قرطبہ جانے والی سڑک کے کنارے اونچی جگہ پر واقع ہے، اس لیے وہاں سے گزرنے والے لوگ مسجد دیکھنے کے لیے رک جاتے ہیں۔ میں نے مسجد کے ''رجسٹر برائے زائرین'' میں دیکھا کہ سال بھر میں کئی سو افراد نے اس میں دستخط کر رکھے تھے۔ میرا استقبال امامِ مسجد میر محمود احمد ناصر نے کیا جو مرزا محمود احمد کے ماموں زاد ہیں اور جماعتِ

احمد یہ کی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ خلیفہِ چہارم مرزا طاہر احمد کا پاکستان کو چھوڑ کر لندن میں آ کر رہنا آدھی ہجرت ہے۔ میں نے کہا مجھے تو وہ پوری لگتی ہے۔اس پر انھوں نے جواب دیا کہ آپ کی بات درست ہے۔ میں نے پوچھا کیا جماعت اپنے مرکز کو دوبارہ ہندوستان نہیں لے جانا چاہتی۔انھوں نے جواب دیا کہ جماعت اس بارے میں سوچ رہی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ جماعت کے مبلغین نے پارٹیشن کے وقت بیرونی ممالک میں پاکستان کے مؤقف کے حق میں جو پروپیگنڈا کیا تھا اس کے سبب نہرو اور اندرا گاندھی جماعتِ احمد یہ سے ناراض تھے۔ ہوسکتا ہے ان کے جانشین اس بات کو اہمیت نہ دیتے ہوں۔ میں نے ان سے پاکستان میں احمدیوں کی تعداد جاننا چاہی، تو انھوں نے کہا جماعت کے پروپیگنڈا کے برعکس ان کی تعداد کہیں کم ہے۔اس بات کا اندازہ انھوں نے اس طرح لگایا تھا کہ جب خلیفہِ ثالث مرزا ناصر احمد کے زمانے میں ان کو اشاعتِ تعلیم القرآن کا سربراہ بنایا گیا، تو انھوں نے پاکستان کی احمدی جماعتوں کو اس بات کا جائزہ لینے کو کہا تھا کہ کتنے احمدیوں نے قرآن کو ناظرہ پڑھ رکھا ہے اور کتنوں نے اس کو باترجمہ پڑھا ہے اور کتنوں نے بالکل نہیں پڑھا۔اس سروے کے اعداد و شمار کے رو سے احمدیوں کی تعداد ملک بھر میں چار پانچ لاکھ سے زیادہ نہ تھی، کیونکہ اس میں مردوں، عورتوں، بڑوں اور بچوں کی کل تعداد بھیجی گئی تھی۔

شام کو سونیا ملی تو پتا چلا کہ وہ سارا دن مجھے ڈھونڈتی رہی تھی۔اس نے کہا وہ میرے ساتھ مسجد دیکھنے کے لیے پیدروآباد ضرور جاتی۔ میں نے کہا میں اس کی خاطر اگلے روز مدینۃ الزہراء جانے کے لیے تیار ہوں، جس کی سیاحت میں ۱۹۶۵ء میں کر چکا تھا۔ یہ جگہ قرطبہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی کے پہلو میں واقع ہے، جہاں پر ایک کلومیٹر مربع رقبے میں شاہی محلات بنائے گئے تھے، جو المواحدون کی نظر میں عیاشی کا اڈا تھے، اس لیے ان کو زمین بوس کر دیا گیا تھا۔ پانی وہاں پر ایک پہاڑی چشمے سے آتا تھا، جس کے سبب وہاں پر لگائے جانے والے باغات کو جنت نشان قرار دیا جاتا تھا۔میری پہلی اور دوسری آمد کے درمیانی بیس برسوں کے دوران محل کی عمارت کی مرمت کا کام بہت سست رفتار میں ہوتا رہا تھا۔وہی تین کمرے کھڑے تھے اور ہر قسم کی ڈیکوریشن سے عاری تھے۔باغ بھی اجڑی ہوئی حالت میں پڑا تھا۔مسجد کے بارے میں اخباروں میں چھپا تھا کہ اس کو از سرِ نو تعمیر کر دیا گیا ہے مگر اس کی بنیادوں کو کھڑا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوا تھا۔

میرا اگلا پڑاؤ غرناطہ تھا، جہاں پر اس روز برف پڑی ہوئی تھی۔یوں بھی غرناطہ پہاڑ کے دامن میں ہے، جس کی چوٹیوں پر سارا سال برف دیکھی جاسکتی ہے۔دوسرے طرف سمندر بھی زیادہ دور نہیں۔ دو گھنٹوں میں انسان ساحلِ سمندر پر پہنچ جاتا ہے۔ہوٹل میں یہاں پر بھی ہیٹنگ کا انتظام نہیں تھا۔تین

کمبل اور اوورکوٹ کو اپنے اوپر ڈال کر بھی میں آرام سے نہ سو سکا، اس لیے میں نے اپنا عرصۂ قیام صرف ایک روز پر محدود کر لیا۔ مجھے سوائے الحمراء کے وہاں پر کچھ نہیں دیکھنا تھا، کیونکہ میں پہلے سفر کے دوران شہر اور اس کے گرد و نواح میں گھوم پھر چکا تھا۔ الحمراء کی خوبصورتی اتنی دلکش ہے اور نقش و نگار اتنے دلآویز ہیں کہ انسان اس کو جتنی بار بھی دیکھے کم ہے۔ میں ایک ایوان میں تصویر کھینچ رہا تھا کہ ایک خوبصورت عورت اچانک کیمرے کے فوکس میں آ گئی۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ میں نے کہا کہ اس کا تصویر میں شامل ہو جانا اس میں خاص بات پیدا کر دے گا اس لیے بے شک وہیں کھڑی رہے۔ اس کے ساتھ اس طرح تعارف پیدا ہوا۔ پتا چلا کہ جرمن الاصل ہے مگر اسپین میں جنمی پلی ہے۔ بائیوکیمسٹ ہے اور ایک جرمن فرم کے لیے کام کرتی ہے۔ اس روز وہ غرناطہ کی ایک فرم سے کسی معاملے کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس کا جہاز شام کو جانا تھا اس لیے دن کا باقی ماندہ حصہ الحمراء میں گزارنے کے لیے آ گئی تھی۔ میں چونکہ کچھ عمارتیں دیکھ چکا تھا اور اسے ابھی ان عمارتوں کو دیکھنا تھا اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ریستوران میں ملیں گے، جو الحمراء کے بڑے گیٹ کے باہر واقع ہے۔ میں اس کے ساتھ یہ طے کر کے ابھی اگلے ایوان میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک شخص نے، جس کا نام خالد اسلم تھا، اپنا کیمرہ میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنی تصویر لینے کو کہا۔ اس کے ساتھ میرا ملنا دوسری بار الحمراء سے باہر نکلتے ہوئے ہوا۔ پتا چلا کہ وہ پاکستان کا رہنے والا اور فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہے اور ان دنوں ملٹری اسٹاف کالج، کوئٹہ میں انسٹرکٹر ہے اور دو سال کے لیے انگلستان کی ملٹری اکاڈمی سینڈ ہرسٹ میں ٹریننگ لے رہا ہے۔ وہاں سے کرسمس کی چھٹیوں میں اسپین آ گیا تھا، جہاں پر وہ مالاگا کے قریب کسی جگہ پر ٹھیرا ہوا تھا اور ہر روز وہاں سے بس میں بیٹھ کر اسلامی آثار کو دیکھنے کے لیے جاتا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اتنے میں الکسانڈرا آ گئی، جس کی معیت میں ہم ریستوران میں جا کر بیٹھے اور ایک یادگار کھانے میں شریک ہوئے۔ الکسانڈرا نے معذرت چاہی کہ ہمیں اس کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ دراصل اسے راستے میں دو جپسی عورتوں نے روک لیا تھا، جو الحمراء کے گیٹ پر کھڑی تھیں اور ہر کسی کو زبردستی پھول پکڑاتی تھیں۔ انھوں نے الکسانڈرا کو پھول دینے کے بعد اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اس کی آئندہ زندگی کے بارے میں بتایا تھا۔ مگر کون جانتا ہے کہ ان کی باتیں پوری ہوئی تھیں یا نہیں۔ الکسانڈرا کو ہماری طرح افسوس تھا کہ ہماری رفاقت اتنے مختصر عرصے کے لیے تھی۔ شام پڑنے تک تینوں کو مختلف سمتوں میں روانہ ہو جانا تھا۔

میں رات کی گاڑی سے میڈرڈ کے لیے روانہ ہوا، جو اگلی صبح وہاں پر پہنچی۔ یہاں پر بھی ہوٹل میں ہیٹنگ کا انتظام نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک رات وہاں پر سونا تھا۔ دن کا بیشتر وقت پرادو میوزیم میں گزرا،

جس کا شمار دنیا کی مشہور ترین آرٹ گیلریوں میں ہوتا ہے۔ اگلی صبح سگوویا (Segovia) کی سیر کے لیے روانہ ہوا، جو میڈرڈ سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ گاڑی نوجوانوں سے بھر گئی، جو قریبی پہاڑوں پر سکیئنگ کے لیے جا رہے تھے۔ پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر پہلی پہاڑیاں آجاتی ہیں، جن پر برف پڑی ہوئی تھی۔ جوں جوں صحت افزا مقامات آتے چلے گئے لوگ گاڑی سے اترتے گئے۔ بالکل وہی نظارہ تھا جو سوئٹزرلینڈ میں ویک اینڈ پر دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ سارا دن برف پر پھسلتے، بھاگتے دوڑتے ہوئے بسر کرتے ہیں اور شام کی گاڑی سے میڈرڈ واپس لوٹ جاتے ہیں۔ سگوویا کا شہر رومن وقتوں سے آباد ہے، جس کو خاص طور پر حفاظتی نقطۂ نظر سے سطحِ مرتفع پر بسایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف وادی ہے، جس میں پانی کی فراوانی ہے جب کہ قلعہ ایسی جگہ پر بنایا جانا تھا جہاں پر پانی نہیں پایا جاتا، اس لیے آب رسانی کے لیے ایک آب ریز (aqueduct) بنانی پڑی جو اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی پوری کی پوری کھڑی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۷۸ میٹر اور اونچائی ۲۹ میٹر ہے۔ اتنی اونچائی کے سبب دہری محراب بنانی پڑی، اس طرح کہ پہلی محراب کے اوپر دوسری محراب کو تعمیر کیا گیا، جس کے اوپر پانی کی نہر چلتی ہے۔ اس کو بنانے کے لیے پتھروں کے عظیم بلاک استعمال کیے گئے، جن کو گھڑ کر بغیر کسی قسم کے گارے، چونے یا سیمنٹ کے ایک دوسرے کے اوپر جما دیا گیا تھا۔ آج تک ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا۔ محراب بنانے کے لیے پتھروں کو اس طرح گھڑا جاتا تھا کہ نچلا حصہ اوپر والے حصے کے مقابلے میں چھوٹا رکھا جائے۔ چنانچہ جب محراب کا آخری پتھر اپنی جگہ پر لگا دیا جاتا تھا تو محراب اپنے بوجھ سے اس کی مضبوطی کی ضامن بن جاتی تھی۔

اس شہر کی دوسری قابلِ ذکر عمارت کتھیڈرل کی ہے، جس میں مجھے کوئی خاص خوبی نظر نہیں آئی، سوائے اس بات کے کہ وہ اپنی طرز پر تعمیر کی جانے والی آخری عمارت تھی۔ البتہ اس میں پایا جانے والا میوزیم مجھے دلچسپ لگا۔ چھت کی ملمع کاری سونے کے پانی سے کی گئی تھی، جو اتنی تازہ لگتی تھی جیسے ابھی ابھی تکمیل کو پہنچی ہو۔ دوسری ساری چیزوں سے زیادہ مجھے حضرت مریمؑ کا بت پسند آیا۔ بت تراش نے اس کے لیے ایک نہایت خوبصورت لڑکی کو چنا تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت عیسیٰؑ کا بت بہت عامی سا تھا۔ عبادت میں استعمال ہونے والے آلات اور شمع دان سونے کے تھے۔ شاید جنوبی امریکہ سے لوٹ کر لائے جانے والے سونے سے چرچ نے اپنا حصہ بانٹا تھا۔

تیسری قابلِ ذکر عمارت القصر کی ہے جس کو قلعے کی صورت میں عین اس جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا، جہاں پر پشت کی طرف کئی سو میٹر گہری چٹانیں دیوار کی طرح کھڑی ہیں، جن کو دشمن سر نہیں کر سکتا۔ سامنے کی طرف قلعے کو ایک خندق کے ذریعے شہر سے پاٹ دیا گیا تھا، جس پر بنا ہوا پل اوپر کھینچ لیا جائے، تو

قلعے تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ محل کی عمارت بہت اچھی حالت میں ہے۔ شاہی ساز و سامان کو نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ الحمراء کی طرح یہاں پر بھی ایک چھوٹا سا شاہی عبادت خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں دھری ہوئی چینی پلیٹوں میں سے ایک میری یادداشت میں محفوظ رہ گئی ہے، کیونکہ اس کا تعلق الحمراء سے تھا۔ اس کے بارڈر پر **ولا غالب الا اللہ** منقش ہے۔ القصر کے مینار پر چڑھ کر گردونواح پر نظر ڈالی جائے تو ایک طرف پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں، جن پر برف پڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف پوری وادی جیسے قدموں میں بچھی ہوئی تھی۔

ترقی پسند مصنّفین کی جوبلی

یوں تو میں ترقی پسند مصنّفین کا باقاعدہ رکن کبھی نہیں رہا، مگر یہ ضرور ہے کہ میرا دل بھی بائیں پہلو میں دھڑکتا ہے۔ اس لیے جب عاشور کاظمی نے اگست ۱۹۸۵ء کو لندن میں جوبلی منانے کا اعلان کیا، تو میں نے اس میں شامل ہونے کا ارادہ باندھا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے والی بات تھی۔ چونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے، اس لیے جب ان کو میری طرف سے اس مضمون کا خط ملا کہ میرے لیے براہِ کرم اسی ہوٹل میں کمرہ بک کرادیں، جہاں پر دوسرے مندوبین کو ٹھیرایا جائے گا، تو انھوں نے مجھے مفت خور سمجھتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے ہیتھرو ہوائی اڈے پر پہنچ کر ان کو فون کیا کہ مجھے ہوٹل کا پتا بتا دیں، جہاں پر میرے لیے کمرہ بک کرایا گیا ہے، تاکہ میں سیدھا وہاں چلا جاؤں۔ جواب ملا کہ عاشور کاظمی کے گھر پر آجائیں، جہاں پر منتظمین جمع ہیں۔ وہاں پر پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی اور پھر یہ غضب کہ کسی نے کمرہ بک نہیں کرایا تھا۔ فارغ بخاری مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کو انگلستان میں سیاسی پناہ کے صدقے میں ایک بوسیدہ مکان میں فلیٹ ملا ہوا تھا۔ وہاں پر ان کے سالے رضا ہمدانی بھی ٹھیرے ہوئے تھے، جو جوبلی کے سلسلے میں آئے تھے۔ میرے لیے ان دونوں سے ملنا ایک انعام سے کم نہ تھا۔ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ پھر فارغ بخاری نے کمرے کے عین درمیان میز کو ہٹا کر فرش پر ایک چادر بچھا دی اور مجھے اس پر سو جانے کو کہا۔ میں حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یورپ میں بھلا کون اس طرح فرش پر سوتا ہے۔ ظالم نے سرہانہ تک مہیا نہ کیا تھا۔ مجھے پتا ہوتا کہ وہ اس بے سروسامانی میں رہ رہے ہیں، تو میں اپنے طور پر کسی ہوٹل میں چلا جاتا۔ بہرصورت وہ رات میں نے وہاں پر کسی طرح گزاری۔ اگلی صبح دیکھا کہ فارغ بخاری باورچی خانے میں کھڑے شیو کر رہے ہیں اور رضا ہمدانی ٹوسٹ بنا رہے ہیں۔

اس مکان میں باتھ روم تک نہیں تھا۔ بیت الخلاء میں جانے کے لیے سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا تھا، جو اس قدر گھناؤنی حالت میں تھا کہ اس کو استعمال کرنا حفظانِ صحت کے خلاف تھا۔ میں حیران کہ ان بزرگ ادیبوں کو کیسی غربت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جب جوبلی کے جلسے میں شرکت کے لیے جانے لگے اور میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا تو فارغ بخاری نے اصرار کیا کہ اب آپ ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انھیں تھوڑی دیر بعد امریکہ سے انور خواجہ کی آمد کی اطلاع مل گئی، جس کو ان کے پاس ٹھیرنا تھا اس لیے مجھے نقلِ مکانی کی اجازت مرحمت ہوئی۔ میں نے لبرل پارٹی کے کلب میں فون کیا، جہاں پر مجھے اس سے قبل ایک بار ایک سیمینار کے سلسلے میں لارڈ ایوبری (Lord Evebury) نے ٹھیرایا تھا اور اس وقت سے مجھے اس کلب میں رہنے کی خاص اجازت تھی۔ مجھے وہاں پر کمرہ مل گیا اور میں ادھر منتقل ہو گیا۔

مجھے امید تھی کہ اس موقعے پر ہندو پاک سے ترقی پسند مصنفین بڑی تعداد میں شرکت کے لیے آئیں گے اور ان کے ساتھ تعارف ہو سکے گا۔ ہندوستان سے آنے والوں میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس، کرتار سنگھ دگل کے نام ممتاز تھے۔ ان کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے پروفیسر حضرات آئے ہوئے تھے۔ لگتا تھا ان کو سفر کے لیے اخراجات سرکاری طور پر مل گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان سے بہت کم ادیب آئے تھے۔ سننے میں آیا کہ وہاں پر یہ اعتراض کیا جا رہا تھا کہ لندن میں کانفرنس کرنے والوں کا اپنا اس تحریک سے گہرا رشتہ نہیں ہے۔ عاشور کاظمی کا نام اس زمانے میں ابھی بہت لوگ نہیں جانتے تھے، اس لیے انھوں نے فارغ بخاری کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا، جن کا تعلق ترقی پسند مصنّفین کے ساتھ بہت پرانا اور مستند تھا۔ دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ پاکستانی ادیب جنرل ضیاء الحق کی ملٹری حکومت کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے تھے، بالخصوص ایسے ادیب جو کسی سرکاری ادارے سے منسلک تھے۔ البتہ صفدر میر، حمید اختر، فخر زمان، عبداللہ ملک، سبطِ حسن اور احمد ہمدانی کے آنے سے پاکستانی وفد اچھا خاصا بن گیا تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ انگلستان میں بہت سے پاکستانی ادیب جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر مغربی ممالک میں مقیم پاکستانی ادیب بھی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ سب کے نام تو مجھے یاد نہیں البتہ ناروے سے سعید انجم، سویڈن سے سائیں سچا (مشتاق احمد)، کینڈا سے اشفاق حسین اور خالد سہیل اور جرمنی سے میرے علاوہ طفیل خلش اور مشرقی برلن سے اسداللہ شامل ہوئے تھے۔ ادیبوں کو پہلی قطار میں بٹھایا گیا اور لندن سے شامل ہونے والے شائقین کو پیچھے جگہ دی گئی۔ میرے اندازے کے مطابق ادیبوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی، جب کہ اجلاسوں میں حاضری ایک سو کے قریب رہتی تھی۔

جوبلی کے سلسلے میں منائے جانے والے جشن میں کسی قسم کی سنجیدہ بحث کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی،

تاہم کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کے درمیان خوب جھڑپیں ہوئیں۔ مؤخر الذکر گروپ نے کہا کہ ہم ایسا ادب پیدا کریں گے، جو ترقی پسند ہوگا۔ مگر ہم یہ نہیں ہونے دیں گے کہ کمیونسٹ پارٹی اور ماسکو ہمیں اس سلسلے میں ہدایات جاری کریں۔ مشرقی برلن سے آئے ہوئے اسد اللہ کے بارے میں سنا تھا کہ ان کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا کہ ترقی پسند مصنّفین کو پارٹی لائن کا پابند کیا جائے۔ ان کی معرفت جو بلی کے منتظمین کو شاید مالی امداد بھی دی گئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چلی کا سفر

چلی میں اوتا نے نوجوانی کا زمانہ گزارا تھا اور وہاں پر اس کی بہن انگریڈ مقیم تھی، مگر ان کے والدین اس دوران میں کولمبیا منتقل ہو گئے تھے۔ ہم بہت دنوں سے چلی جانے کا ارادہ باندھے ہوئے تھے، جہاں سے اوتا اپنے تعلیمی سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم دسمبر ۱۹۸۵ء میں وہاں گئے جب یورپ میں سردی چھا چکی تھی البتہ چلی میں موسم گرما اپنے جوبن پر تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسری کو چھبیس برسوں کے بعد مل رہی تھیں۔ انگریڈ نے گھر جاتے ہوئے، جو سانتیاگو سے چھتیس کلومیٹر دور پہاڑ کے دامن میں واقع لوس ویرتیئنتس (Los Vertientes) میں ہے، مجھے شہر کا وہ علاقہ دکھایا، جہاں پر ان کا خاندان ان کی نوجوانی کے زمانے میں مقیم رہا تھا۔ وہ جگہ شہر کے عین وسط میں تھی، جہاں سے مارکیٹ اور ڈاک خانہ ایک جتنے فاصلے پر تھے۔ مارکیٹ ماں کے لیے اور ڈاک خانہ باپ کے لیے بہت اہم تھے۔ اس کے الٹ انگریڈ کا خاوند ملی شہر کی گہما گہمی سے بھاگتا تھا البتہ اس کی دکان شہر کے مرکز میں تھی۔ اس کا کاروبار ڈاک کے ٹکٹوں کا تھا، جس کے لیے اسے خریدار غیر ملکوں میں تلاش کرنے پڑتے تھے، جن کی اکثریت امریکہ میں مقیم تھی۔ ہماری آمد سے چار برس قبل وہ دل کا دورہ پڑنے کے سبب مر گیا تھا۔ ان کے دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا الیکس یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور ایک سال قبل یورپ کے سفر کے دوران ہمیں ملنے آیا تھا۔ چھوٹی بیٹی ملینا نو برس کی تھی۔

انگریڈ کا فارم وسیع و عریض ہے، جس کو دیکھ بھال کے لیے کل وقتی مینجر رکھنا پڑتا ہے، جو اپنے خاندان سمیت فارم میں رہتا ہے۔ پہلے وقتوں میں وہاں پر بھیڑیں پالی جاتی تھیں، اب سبزیاں اگائی جاتی ہیں۔ ان کا رہائشی مکان فارم کے اندر ہی بنایا گیا ہے، جس کا تالاب اتنا بڑا ہے جتنا یورپ کے چھوٹے موٹے شہروں کا پبلک باتھ ہوا کرتا ہے۔ فارم میں قسم قسم کے پھلدار درخت لگے ہوئے ہیں جن

پر بے تحاشا پھل لگتا ہے۔ مالی اس میں سے ایک حصہ مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

لوس ویر تینتس میں ہمارا استقبال تاوانس (Tawanus) بھڑوں نے کیا جو ہر سال دسمبر کے وسط میں اچانک پیدا ہو جاتی ہیں اور جنوری کے وسط میں اسی طرح اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ ان کا ڈنک زیادہ زہریلا نہیں ہوتا مگر وہ انسان کا پیچھا ڈھیٹ پن سے کرتی ہیں، جس کے سبب آدمی کمرے سے باہر نکلے، تو سارا وقت اسے بھڑوں سے بچنے کے لیے پنکھا جھلنا پڑتا ہے۔ جب ہم جنوبی چلی کے سفر پر گئے تو وہاں پر جھیلوں کے علاقے میں ان کا راج تھا۔

چلی کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ ۱۱۰ میل اور لمبائی ۲۶۵۰ میل ہے۔ آندن (Anden) سلسلۂ پہاڑ سے مشرق کی طرف ارجنٹائن ہے اور مغرب کی طرف چلی۔ اتنے لمبے ملک کے شمالی علاقے میں اتاکاما (Atacama) صحرا ہے، جہاں پر سال ہا سال تک بارش نہیں ہوتی اور جنوبی علاقے میں سارا سال بارش پڑتی اور برف گرتی ہے۔ ملک کا صدر مقام سانتیاگو ملک کے وسط میں آباد ہے، جہاں پر موسم معتدل ہے۔ ہم نے جنوبی چلی کے شہر پورٹو مونت (Puerto Montt) تک سفر کرنے ارادہ کیا، جو سانتیاگو سے ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے آگے جنوب کی طرف آبادیاں کم ہیں، کیونکہ علاقہ برفانی ہے اور سردی کے سبب کاشتکاری ممکن نہیں، البتہ قدرتی طور پر اگنے والے درختوں کی بھرمار ہے۔ پورٹو مونٹ کے اردگرد کے علاقے میں جرمنوں کو انیسویں صدی میں آباد کیا گیا تھا، بالخصوص جب ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں عوامی انقلابی تحریک ناکام ہوگئی، تو بے شمار لوگ ملک کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی ہزاروں جرمن اپنے ملک سے ہجرت کر کے چلی آ گئے تھے۔ انھوں نے وہاں پر لکڑی کے مکانات بنائے تھے جن کو لکڑی کی Schindel سے ڈھک دیا جاتا ہے، جو ہتھیلی بھر چوڑی تختیاں ہوتی ہیں، جن کو اس طرح لگایا جاتا ہے کہ نچلی قطار کو اوپر والی لکڑی ڈھکتی ہے، جو بارش کے پانی کو دیوار میں داخل ہونے سے روکتی ہے اور کمروں کو گرم رکھتی ہے۔ جنوبی جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں اس طریق سے بنائے جانے والے مکان سارا سال ہونے والی بارش کے باوجود دو سو سال تک اچھی حالت میں رہتے ہیں۔

وہاں سے ہم پوئرٹو واراز (Puerto Varas) چلے گئے، جس کو جرمنوں نے ۱۸۵۴ء میں آباد کیا تھا۔ یہ جگہ ایک جھیل کے کنارے پر واقع ہے، جس کے دوسری طرف آتش فشاں پہاڑ اوسورنو (Osorno) کھڑا ہے، جس کی چوٹی سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ اسی جھیل کے کنارے پر ایک اور جرمن قصبہ فروتیار (Frutillar) ہے، جس کو دیکھنے کی ہر کسی نے سفارش کی تھی۔ جھیل کے کنارے مٹرگشت کرتے ہوئے ایک مکان پر لگے ہوئے جرمن چائے خانے کے بورڈ نے ہمیں اپنی

طرف متوجہ کیا، جہاں پر جرمن کیک ملتے تھے۔ اندر ایک وسیع کمرے میں عورتیں بیٹھی چائے پی رہی تھیں اور جرمن اور ہسپانوی زبان کی کھچڑی نما زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ ہمیں آپس میں جرمن بولتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے ہمارا استقبال ولولے سے کیا۔ بتایا گیا کہ ہم ایک سو سالہ پرانے مکان میں بیٹھے ہیں، جو دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے دو چار برس قبل بنایا گیا ہو۔ مکان کے باسیوں کی تیسری نسل وہاں پر رہ رہی تھی۔ ہسپانوی کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں عام طور سے جرمن زبان بولی جاتی ہے۔

ہم جرمن میوزیم دیکھنے گئے، جو دراصل ایک گاؤں تھا، جس میں مختلف قسم کے مکانات کھڑے تھے، جو جرمن آبادکاروں نے اس علاقے میں بنائے تھے۔ ان کے باغات عین مین ویسے ہی تھے، جیسے میں جرمنی سے جانتا تھا۔ ایک ندی کے کنارے پر دو سو سال پرانی پن چکی کھڑی تھی۔ اس میں گندم پس رہی تھی۔ کمروں کی دیواروں پر جرمن آبادکاروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے لباسوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ایک شوکیس میں چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں، جو آبادکار وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ زیادہ تر بائبل کے نسخے تھے مگر ایک ادبی کتاب، نظموں کا مجموعہ، بھی ان میں شامل تھی، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۷۵ء میں چھپا تھا۔ اس کتاب کے آخر میں غیر ملکی زبانوں سے نظموں کے تراجم چھپے ہوئے ہیں۔ ایک کتاب جرمن فلاسفر نطشے (Nietzsche) کی لکھی ہوئی تھی۔ پھر ایک گودام میں شنڈل رکھے ہوئے تھے، جن کو ۱۳۰ برس پرانے مکان سے اتارا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بالکل نئے ہوں۔ ایک لوہار کے مکان میں آلات رکھے ہوئے ہیں، جو انیسویں صدی میں زیرِ استعمال رہے تھے۔ قابلِ ذکر ان میں سے ایک ٹیلی سکوپ ہے، جس میں دو تصویریں لگتی تھیں اور ایک ٹیلیفون کا آلہ ہے، جو چند برس قبل تک زیرِ استعمال رہا تھا۔

جب ہم ٹیکسی میں واپس جا رہے تھے، تو ڈرائیور نے پابلو نرودا کی نظموں کی کیسٹ لگا رکھی تھی۔ یہی نظمیں ہم خود پابلو کی زبان سے ہمبرگ یونیورسٹی میں سن چکے تھے۔ جب اوتا نے ڈرائیور کو یہ بات بتائی، تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ نرودا کے گاؤں کا رہنے والا تھا، مگر اسے کبھی نرودا سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس نے رخصت کے وقت وہ کیسٹ اوتا کو بطور تحفہ پیش کر دی۔

ایک پورا دن ہم نے آتش فشاں پہاڑ اوسورنو (Osorno) اور اس کے گرد و نواح کی سیاحت میں گزارا، جس کے قدموں میں پڑی ہوئی جھیل کسی زمانے میں اسّی گز گہری ہوا کرتی تھی، پھر جب ایک بار آتش فشانی کے دوران نکلنے والے لاوے نے دریا کا راستہ روک دیا اور اس کا پانی پہاڑی دروں سے گزرتا ہوا ارجنٹائن کی ایک جھیل میں جا کر گرنے لگا، جس کی سرحد وہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اس وقت سے جھیل کی سطحِ آب متواتر گرتی جا رہی ہے۔ لاوے کے بڑے تودوں سے زیادہ مجھے اس ریت نما

لاوے میں دلچسپی تھی، جو ریت کی طرح بھربھرا ہے اور جس پر انسان قدم جما کر نہیں چل سکتا۔ چنانچہ ایک جگہ پر میں پھسل گیا اور یوں لگا جیسے میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل رہی تھی۔ ٹورسٹوں کے لیے ریستوران موجود ہیں۔ ایک پن چکی میں، جو اس زمانے میں ایک سو پچیس سال سے چل رہی تھی، کافی ہاؤس بنا ہوا تھا۔ ایک طرف گندم پس رہی تھی اور دوسری طرف سیب اور دوسرے پھلوں کو کاٹنے اور ان کا بھرتہ بنانے والی کلیں چل رہی تھیں۔

ایک روز کے لیے ہم انکود (Ancud) گئے، جو چلووے (Chiloe) جزیرے پر چھوٹا سا قصبہ ہے۔ چلی کا نام اسی جزیرے کا دیا ہوا ہے۔ یہاں کے آروکانز (Araukaner) ریڈ انڈین نے ہسپانوی حملہ آوروں کا بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ یہی لوگ اب ماپوچے (Mapuche) کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ قلم بند نہیں ہے، جب کہ شمال کی طرف واقع پیرو (Peru) کی مایا ثقافت، جس کا محور مکی کا پودا تھا، کے بارے میں بہت تفصیل سے معلومات ملتی ہیں۔ مکی کے علاوہ آلو، تمباکو، ربڑ اور کوکا جنوبی امریکہ سے برآمد شدہ ہیں۔ انکود میں ماپوچے ثقافت کا میوزیم بنا ہوا ہے۔ ایک فریم میں چلی کی حکومت کے نمائندے اور ایک جرمن خاندان کے سربراہ کے درمیان ۱۹۰۶ء کو طے پائے جاتے معاہدے کی اصل کاپی لگی ہوئی ہے، جس کی رو سے اس خاندان کے آٹھ افراد کو حکومت کے خرچ پر چلی لایا جائے گا۔ سربراہ کو ستر اور دوسرے افراد کو چالیس ایکٹر فی کس زمین دی جائے گی۔ ان کو زراعت کے لیے جملہ سامان مہیا کیا جائے گا اور مکان بنانے کے لیے لکڑی اور میخیں دی جائیں گی۔ سب کو طبی امداد مفت ملے گی۔ قرض کی صورت میں دی جانے والی رقم کی ادائیگی چھ برس کے بعد شروع ہوگی۔ اس خاندان کے آٹھ افراد کی تصویر لگی ہوئی ہے، جو ایک گھنے جنگل میں کھڑے ہیں، جس کو کاٹ کر انھیں اپنے فارم کے لیے جگہ بنانی تھی۔

اس علاقے میں ۱۹۶۰ء میں سمندری زلزلے کے نتیجے میں ایک بہت بڑی لہر پیدا ہوئی تھی، جس کی نذر جنوبی چلی کے کئی شہر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ابھی ''سونامی'' کی اصطلاح ایجاد نہیں ہوئی تھی، جس کا اطلاق جاپانی زبان میں ایسی مہیب لہروں پر ہوتا ہے، جس کا مظاہرہ دسمبر ۲۰۰۴ء کو جنوبی ایشائی ممالک میں ہوا تھا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ تیموکو (Temuco) تھا، جہاں کے ماپوچے میوزیم کی ہم نے بہت تعریفیں سنیں تھیں مگر وہ ہماری توقعات پر پورا نہ اترا۔ اس سے بہتر چیزوں کی نمائش ہم سانتیاگو میں دیکھ چکے تھے۔ البتہ وہاں پر ایک نیشنل پارک پایا جاتا ہے، جو اونچی جگہ پر بنایا گیا ہے، جہاں سے سارے شہر کو دیکھا جا سکتا ہے مگر جو چیز میری یادداشت میں رہ گئی ہے، وہ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور کی ہے، جس نے کہا کہ چڑھائی

پر کرایہ دوگنا لگے گا کیونکہ زیادہ پٹرول جلتا ہے۔ میں نے کہا تم اسی قدر فاصلہ نیچے بھی تو اترو گے مگر اس بات کو ماننے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔

اس علاقے میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ پائے جاتے ہیں مگر صرف پوکون (Pucon) کے پہاڑ سے دھواں اٹھتا ہے جس میں سے کالے ذرات دن رات زمین پر گرتے ہیں۔ ہماری آمد سے ایک سال قبل لاوا بھی نکلا تھا، جس کے سبب لوگ گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہوں پر منتقل ہو رہے تھے۔ دوسری طرف آتش فشانی کو قریب سے دیکھنے کے لیے ٹورسٹ شائقین بڑی تعداد میں آرہے تھے۔

واپسی کا سفر ہم نے تموکو (Temuco) سے ریل گاڑی میں کیا، جس میں پرانی وضع کے سونے والے کمپارٹمنٹ لگے ہوئے تھے، جیسے امریکی فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ گاڑی ہمیں رات بھر میں سانتیاگو لے آئی۔ انگریڈ نے کہا کہ تم نے چلی کا صرف جنوبی حصہ دیکھا ہے، پھر ایک بار آؤ تو تمھیں ملک کے شمالی حصے کی سیر کرائیں۔ اس طرح ہمارا دوسری بار آنا طے پا گیا۔

چلی کا دوسرا سفر ہم نے دسمبر ۱۹۸۶ء کو کیا۔ اب کے ہمارا بھتیجا موبی، جو اس وقت بارہ برس کا تھا، ہمارے ساتھ گیا۔ شمالی چلی کا سفر ہم نے بس میں کیا۔ اس علاقے میں آبادی کم ہے اور شہر ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ پہلے پانچ سو کلومیٹر تک زمین زرخیز ہے اور پانی وافر مقدار میں میسر ہے، جس کے سبب زراعت کے قابل ہے۔ بھیڑ، بکریاں اور گائے رکھنے کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی نسل افزائش کی جاتی ہے۔ پہلے روز کا سفر ۴۷۰ کلومیٹر دور لا سیرینا (La Serena) تک کا تھا، جو امریکی طرز کا ہے اور جس کے بلاک ایک سو میٹر کی لمبائی چوڑائی کے ہیں۔ میوزیم میں اس علاقے کی جیالوجی کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ پرانی قبروں میں سے ملنے والے ممیاں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں، جن کی عمر پندرہ ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ گویا وہ مصری ممیوں سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ ہیں۔ قدیم باشندوں کے ہتھیاروں سے پتا چلتا ہے کہ ان کو تانبے کی دھات کو ڈھالنا آتا تھا۔ ان کے تیروں کے سرے پر تانبے کی نوکیں لگتی تھیں جب کہ عام طور سے دوسرے علاقوں میں نوکیلا پتھر لگایا جاتا تھا۔ ہم ٹیکسی میں وہاں سے ۶۲ کلومیٹر کے فاصلے پر پائے جانے والے مقام ویکونیا (Vicuna) گئے، جو چلی کی پہلی نوبیل پرائز برائے ادب پانے والی شاعرہ گابریلے مسٹرال (Gabriele Mistral) کی جنم بھومی ہے۔ وہ وہاں کے ایک پرائمری اسکول میں استانی رہی تھی البتہ بعد میں دارالحکومت سانتیاگو چلی گئی تھی۔ وہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑوں میں فلکیاتی مشاہدوں کے لیے رصدگاہ (Observatory) بنائی گئی ہے، جو بین الاقوامی تعاون کی عمدہ مثال ہے۔ وہاں سے شمال کی طرف پایا جانے والے علاقہ بالکل بنجر صحرا ہے، جس میں البتہ قلمی شورا بہت بڑی مقدار

میں پایا جاتا ہے۔اس علاقے کے سبب چلی کو اپنے ہمسایہ ملکوں بولیویا(Bolivia) اور پیرو(Peru) کے ساتھ انیسویں صدی میں جنگ لڑنی پڑی تھی۔ ہمارا سفر انتوفوگاستا(Antofogasta) تک کا تھا ، جہاں سے آگے پیرو کی سرحد ابھی چھ سات سوکلومیٹر دور تھی ،مگر ہم بنجر علاقے کو دیکھتے ہوئے تھک گئے تھے جس میں کسی قسم کی ہریاول نہیں پائی جاتی اور آبادیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ ضرور تھا کہ جہاں کہیں چند جھونپڑیاں کھڑی ہوتی تھیں ،وہاں پر فٹ بال کا میدان پایا جاتا تھا۔اس علاقے میں زمینی گیس کے ذخیرے موجود ہیں۔کالاما(Calama) میں تانبے کی کانیں ہیں ، جو امریکی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھیں، جن کو قومیانے کے سبب چلی کے سوشلسٹ صدر آلیندے(Aliende) کو امریکی سازش کے تحت مارڈالا گیا تھا۔شمالی چلی نے ہمیں بے حد مایوس کیا، جب کہ جنوبی چلی کے سفر سے ہم بہت خوش واپس لوٹے تھے۔

شمالی اور جنوبی امریکہ،افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملک ہم نے دیکھ لیے تھے،مگر اس وقت تک ابھی روس کے علاقے میں نہیں گئے تھے۔کمیونسٹ دنیا کے ممالک ہمارے لیے بدستور سربستہ راز تھے۔ہمارا ارادہ مشرقی یورپ کے ممالک کی سیر کا تھا،جن میں سے یوگوسلاویا کے علاوہ ہم نے صرف رومانیا کا ایک سفر کیا تھا۔ مجھے بالخصوص وسطی ایشیا کے مسلمان آبادی کے علاقوں میں جانے کا شوق تھا جس کو پورا کرنے کا بہت جلد سامان پیدا ہو گیا۔

پین انٹرنیشنل کی کانفرنس

سن ۱۹۸۶ء میں ہمبرگ میں دو اہم بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ پہلی کا تعلق مستشرقین سے تھا، جس کا میں رکن ہوں اور جو عام طور سے چار برسوں کے وقفے کے بعد بلائی جاتی ہے۔دوسری پین انٹرنیشنل(Pen International) کی سالانہ کانفرنس تھی، جو ادیبوں کی انجمن ہے۔ پاکستان میں اس کی کوئی شاخ نہیں تھی اور نہ ہی اردو ادیبوں کا اس کے ساتھ کبھی واسطہ رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں کشور ناہید کو لکھا کہ اگر وہ بیس ادیبوں سے ممبر شپ کے فارم پر دستخط کروالیں ،تو میں اس موقع پر پاکستانی برانچ کی منظوری لینے کی کوشش کروں گا۔اس سلسلے میں جرمنی کی شاخ نے ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے کشور کو خاص طور پر ہمبرگ آنے اور کانفرنس میں شرکت کرنے کی دعوت بھی دی اور تمام اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری اٹھائی۔ چنانچہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ لاہور پہنچ گیا اور جرمن سفارت خانے نے ویزا بھی جاری کر دیا تھا مگر کشور کسی وجہ سے سفر نہ کر سکیں۔البتہ مجھے پین کی مجلسِ عاملہ

کے اجلاس میں پاکستان کی پین برانچ کے قیام کی تجویز پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ کینیڈا کی نمائندہ مشہور ناول نگار مارگریٹ ایٹ ووڈ (Margaret Atwood) نے اس تجویز کے حق میں تقریر کی، جس کے نتیجے میں پاکستانی پین برانچ کے قیام کی منظوری دے دی گئی۔ جب یہ خبر اخبارات میں چھپی، جس میں بنیادی بیس ممبروں کے نام درج تھے، تو محمد علی صدیقی نے مجھے لکھا کہ انھوں نے ممبر شپ کے فارم پر ہرگز دستخط نہیں کیے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک پین انٹرنیشنل ایک استعماری ادارہ ہے، جس میں ترقی پسند ادیبوں نے کبھی شامل ہونا پسند نہیں کیا۔

ان کی بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ ہندو پاک کے ادیبوں نے پین انٹرنیشنل میں شمولیت سے ہمیشہ اجتناب کیا تھا۔ چنانچہ دونوں ملکوں میں اس کی شاخیں قائم نہ ہو سکی تھیں۔ مگر دوسری طرف تمام اشتراکی ممالک میں پین کی شاخیں موجود تھیں۔ چنانچہ ہمبرگ میں ان ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں ان ممالک کے غیر ملکوں میں پناہ گزین ادیبوں نے بھی اپنی علیحدہ شاخیں قائم کر رکھی تھیں، جن کے نمائندے ہمبرگ کانفرنس میں شمولیت کر رہے تھے۔ چنانچہ میرا دوست گابریل لاؤب (Gabriel Laub) مشرقی یورپ کے مہاجر ادیبوں کی شاخ کا صدر تھا۔ وہ لمبے عرصے سے جرمنی میں رہ رہا تھا اور اس دوران میں جرمن ادیبوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی شاخ کی طرف سے چیک ادیب یاروسلاف زائیفرٹ (Jaroslav Seifert) کا نام ادب کے نوبیل پرائز کے لیے پیش کیا گیا تھا، جسے ۱۹۸۴ء میں یہ انعام ملا تھا۔ عرب ممالک کے وفود مصری ادیب ایڈوارڈ خراط کی سرکردگی میں نجیب محفوظ کے لیے زیادہ سے زیادہ ملکوں کی پین برانچوں کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ مشرقی یورپ کے وفود نے اس بارے میں تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اور فی الواقع دو برسوں کے بعد نجیب محفوظ کو ادب کا نوبیل پرائز مل گیا۔ شاید ہمارے ہاں ادیبوں کو پتا نہیں ہے کہ ادب کا نوبیل انعام گٹھ جوڑ سے ملتا ہے۔ اس لیے جب تک ہم ادیبوں کے بین الاقوامی اداروں سے کنارہ کش رہیں گے اور ادب کے ایوانوں میں ہماری آواز بلند نہیں ہوگی اس وقت تک ادب کا نوبیل پرائز ہمارے کسی ادیب کو نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ پاکستانی پین کی شاخ کے بن جانے پر مجھے سٹاک ہوم سے نوبیل کمیٹی کی طرف سے اگلے چار برسوں تک کسی ادیب کا نام تجویز کرنے کی دعوت ملتی رہی۔ میں نے دو بار احمد ندیم قاسمی کا، تیسرے سال شوکت صدیقی کا اور چوتھے سال قرۃ العین حیدر کا نام پیش کیا۔ عام طور سے نامزدگی کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں ہوتی، مگر چونکہ اس بات پر بہت سال گزر چکے ہیں ،اس لیے اب یہ راز کھولنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان پین کی مجلس مختلف وجوہات کی بنا پر نہ چل سکی۔ اس لیے ہم اردو ادب کے کسی ادیب کے لیے باضابطہ طور پر کنویسنگ نہ کر سکے، جب کہ ہم

جانتے ہیں کہ یہ تینوں بہت سے ایسے ادیبوں سے زیادہ وقعت کے حامل ہیں، جن کو ادب کا نوبیل پرائز دیا جا چکا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں یہ انعام جرمن زبان کی آسٹرین ادیبہ ایلفریدے یلینک **(Elfriede Jelineck)** کو ملا تھا، جو قرۃ العین حیدر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

کانفرنس میں حصہ لینے والے بہت سے نامور ادیبوں سے تعارف ہوا، جن میں البرٹو مراویا **(Alberto Moravia)** کا نام سب سے زیادہ جانا پہچانا تھا۔ اتفاق سے ایک محفل میں میرے پہلو میں ایک جرمن مصنفہ بیٹھی تھی، جس کو میں اس سے قبل نہیں ملا تھا۔ جب ہمارے درمیان بات چیت ہونے لگی تو پتا چلا کہ وہ میرے جرمن ادیب دوست یواخیم زائپل **(Joachim Seppel)** کی سابقہ بیوی تھی، جس کو یواخیم نے مشرقی جرمنی کی ایک نوجوان لڑکی کی خاطر چھوڑ دیا تھا اور وہی نوجوان لڑکی ہمبرگ یونیورسٹی میں میری شاگرد ہوا کرتی تھی اور اسی کی معرفت میری ملاقات یواخیم سے ہوئی تھی۔ اسی طرح مصری ادیب ایڈوارڈ خراط نے مجھے اپنے ملک کی ادیبہ الیفہ رفعت کے بارے میں بتایا تھا، جس کی کہانیوں میں قدیمی قصوں کی چس پائی جاتی ہے۔ الیفہ ہمبرگ والی کانفرنس میں شرکت کے لیے نہ آئی تھی، مگر چند برسوں کے بعد میری ملاقات اس کے ساتھ آسٹریا کے شہر گراتز **(Graz)** میں ہوئی، جو اوتا کی جنم بھومی ہے۔ مجھے گراتز یونیورسٹی کی طرف سے منعقد ہونے والے اورینٹ میلے میں شرکت کرنے کی دعوت ملی تھی، جس کو ہم نے شوق سے قبول کیا تھا کہ اس طرح میں اوتا کا جنم شہر اس کی معیت میں دیکھ سکوں گا۔ وہاں پر آنے والے ادیبوں میں الیفہ رفعت کو دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی تھی۔ میں اس دوران میں اس کی کہانیاں پڑھ چکا تھا۔ وہ مجھے اپنی کہانیوں سے بھی بڑھ کر الف لیلائی لگی۔ جب تھوڑے عرصے کے بعد بریمن یونیورسٹی میں کسی مصری ادیب کو بلائے جانے کی تجویز پر غور ہو رہا تھا، تو میں نے الیفہ رفعت کا نام پیش کیا، جس کی تین کتابیں جرمن میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ مگر اس کو بلایا نہ جا سکا، کیونکہ اس نے دس ہزار ڈالر معاوضہ مانگا تھا اور یہ شرط رکھی تھی کہ اس کے بیٹے کو بھی بلایا جائے، جو کینیڈا میں پڑھتا تھا۔ مجھے بھی اسکے ساتھ ایک ایسا ہی تجربہ ہوا۔ ادبیات، اسلام آباد نے اسلامی ممالک کے ادب پر خاص نمبر چھاپنے کے لیے مجھ سے کسی مصری ادیب کی کہانی کا ترجمہ کرنے کو کہا تھا۔ میں نے الیفہ سے ایک کہانی کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی، تو اس نے لکھا کہ دس ہزار ڈالر کے عوض ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور یہ رقم پیشگی ادا کرنی ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے کبھی منہ مانگا معاوضہ ملا تھا یا نہیں۔

میں ایک عرصے سے جرمن ادب سے تراجم کر رہا ہوں، جس کے لیے مجھے اکثر متعلقہ ادیبوں کی طرف سے بلا معاوضہ ترجمہ کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ صرف ایک بار یہ ہوا تھا کہ ایک ادیب نے اپنی کہانی کا ترجمہ کیے جانے کے لیے معاوضہ طلب کیا تھا، وگرنہ وہ عام طور سے اپنے ادب پاروں کے

اردو میں ڈھالے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور جب میں ان کو بتاتا ہوں کہ پاکستان میں ادیبوں کو معاوضہ ادا کرنے کی کوئی رسم نہیں ہے، تو وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بلا معاوضہ ترجمہ کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں، جب کہ جرمنی میں مصنفوں کو فی سطر معاوضہ ادا کیا جاتا ہے اور عام طور سے ادیبوں کو کتاب لکھنے کے لیے پیشگی ادائیگی کرنے کا رواج ہے۔

۱۹۸۶ء میں میری ترجمہ کردہ دو کتابیں جرمن پاکستان فورم کی طرف سے چھاپی گئی تھیں۔ جن میں سے ایک میں جرمن ادب پاروں کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا تھا، جس کے لیے ہم نے سب ادیبوں یا ان کے پبلشروں سے اجازت حاصل کی تھی۔ دوسری کتاب میں پاکستان کی زبانوں میں سے اردو، پنجابی، سندھی، پشتو اور ہندکو کے چنیدہ ادب پاروں کے تراجم جرمن میں ڈھالے گئے تھے۔ یہ کتاب انّے ماری شمل کے تعاون سے مکمل کی گئی تھی۔

میں ہمبرگ میں جرمن ادیبوں کی ایک مجلس کا رکن ہوں۔ وہیں پر میری دوستی گابریل لاؤب (Gabriel Laub) سے ہوئی تھی جس کا شمار بہترین مقولہ (Aphorism) سازوں میں ہوتا ہے۔ وہ پولینڈ میں پیدا ہوا تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اس کے ماں باپ کو تاشقند میں پناہ لینی پڑی تھی، جس کے سبب اس کے اندر مشرقِ وسطیٰ کے ادب سے ایک خاص لگاؤ پایا جاتا تھا۔ یہ چیز بالخصوص اس کے افورسم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنگ کے بعد اس کو چیکوسلاواکیہ میں سر چھپانے کو جگہ ملی۔ اب وہاں پر کمیونسٹوں کی حکومت تھی، جس کے ساتھ وہ کبھی سمجھوتہ نہ کر سکا۔ جب ستر کی دہائی میں وہاں پر سویٹ یونین کے نظام سے بچ نکلنے کی کوشش ہونے لگی، جس کو دبانے کے لیے مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک کی فوجیں پراگ (Prague) بھیجی گئیں تھیں، تو اس کو دوسرے بہت سے ادیبوں کے ساتھ ملک چھوڑنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ وہ مغربی جرمنی میں پہنچا تو اس کو جرمن زبان نہیں آتی تھی۔ اس نے تھوڑے عرصے کے اندر اس زبان میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ اس میں ادب پارے لکھنے لگا، جب کہ اس سے پہلے اسے اپنی تحریروں کے تراجم کرانے پڑتے تھے۔ جب ہمارا ملنا ہوا تو سوائے اس کے ہلکے سے اجنبی لہجے کے کوئی چیز اس بات کی چغلی نہ کھاتی تھی کہ جرمن اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس کی وفات پر میں نے اس کی شریکِ حیات فشر ڈیہل (Fischer-Diehl) سے کہا کہ ہمیں اس کے بارے میں ایک کتاب لکھنی چاہیے، جس میں گابریل کے ادیب دوست ایک ایک باب لکھیں۔ یہ تجویز پبلشر کو پسند آئی اور اس کی وفات کی پہلی برسی پر ہماری مشترکہ کتاب مارکیٹ میں آ گئی، جس کے دو ایڈیشن ایک سال کے اندر بک گئے۔

اس سے بہت مختلف میرے ناول نگار دوست یواخیم زائیپل کی زندگی گزری ہے، جس کو نوجوانی

میں نازی پارٹی کی بربریت سے واسطہ پڑا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں وہ سپاہی تھا اوراس کو کئی برس محاذ پر گزارنے پڑے تھے۔ جنگ کے خاتمے پر وہ ان نوجوان طالب علموں میں شامل تھا، جن کو ہارورڈ یونیورسٹی (Harvard University) میں تعلیم کے لیے لے جایا گیا تھا۔ اس کورس کے خاتمے پر وہ امریکہ میں ہی رہ گیا تھا، جہاں پر اسے ایک یونیورسٹی میں جرمن ادب پڑھانے کے لیے پروفیسر شپ مل گئی تھی۔ اس نے وہاں پر دس برس گزارے، ایک امریکی لڑکی سے شادی کی، امریکہ کی شہریت حاصل کی مگر دل سے امریکن نہ بن سکا، کیونکہ اس دوران میں اس کے اندر چھپا ہوا جرمن ادیب چادر پھاڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ناول جرمنی میں چھپنے لگے تھے اور وہ برلن میں جا کر رہنا چاہتا تھا جہاں کا وہ پودا تھا۔ وہ شہر دو حصوں میں منقسم تھا۔ مشرقی حصہ کمیونسٹ حکومت کے تحت تھا اور مغربی حصے پر بون کی اجارہ داری تھی، جس کے خلاف یونیورسٹیوں میں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ اپنے بیٹے، بیٹی اور بیوی سمیت، جو سب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے، وہ طالب علموں کی تحریک کا حصہ بن گیا، جو بنیادی طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھتی تھی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اسکی کتابیں مغربی جرمنی میں چھپنی بند ہوگئیں، البتہ مشرقی جرمنی کے پبلشروں کی طرف سے اس کی کتابوں کی مانگ بڑھ گئی، اس لیے وہ مشرقی جرمنی منتقل ہو گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب وہاں سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھاگ رہے تھے اور جس کو ''پاؤں سے ملکی نظام کے خلاف ووٹ دینے'' کا نام دیا جاتا تھا۔ یواخیم کو تین برس کے ویزے پر ملک سے باہر جانے کی اجازت دی گئی تھی، جسکے دوران وہ ہمبرگ میں آکر مقیم ہوا جہاں پر اس کی نوجوان بیوی ہمبرگ یونیورسٹی میں میری شاگرد بنی اور اسکے واسطے سے ہمارا آپس میں ملنا ہوا۔ یہ اسی دوستی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ اپنے خاندان کی تاریخ لکھ رہا تھا تو اس میں ایک باب میرے حوالے سے لکھا گیا، جسکا عنوان ''پاکستانی بھائی'' (Der Bruder aus Pakistan) تھا۔ اس نے اپنے خاندانی نام کے ڈانڈے آریائی زبانوں سے جا ملائے تھے، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ ہم دونوں ایک ہی راجہ خاندان کے سپوت ہیں، جو صدیوں کی جدائی کے بعد ایک دوسرے سے آن ملے ہیں۔ چونکہ اس نے مشرقی جرمن حکومت کے بعض اقدامات پر کڑی تنقید کی تھی، جن کا تعلق ادیبوں کی آزادی رائے سے تھا، اس لیے اس کی شہریت منسوخ کر دی گئی تھی۔

دوسری طرف میرے ادیب دوستوں میں پیٹر شوٹ (Peter Schütt) بھی شامل ہے، جو طالب علمی کے زمانے سے کمیونسٹ پارٹی کا سرکردہ رکن تھا۔ وہ ہمبرگ یونیورسٹی میں میرا ہمعصر تھا۔ صرف وہی نہیں قریب قریب سب طالب علم اس زمانے میں بائیں بازو کی جماعتوں سے منسلک تھے۔ آپ نے Bertrand Russel کا مقولہ سنا ہوگا کہ ''جو شخص نوجوانی میں اشتراکی نہیں ہوتا، وہ دل نہیں

رکھتا۔ اور جو کوئی بڑی عمر میں بھی اشتراکی رہتا ہے، اس کی کھوپڑی میں دماغ نہیں پایا جاتا۔'' پیٹر شوٹ نے عین اس زمانے میں، جب مشرقی جرمنی میں اشتراکی حکومت کی بنیادیں لرز رہی تھیں، کمیونسٹ پارٹی سے اپنا ناطہ توڑ دیا تھا، جس کے سبب اس پر بائیں بازو کے حامیوں نے غداری کا الزام لگایا تھا۔ اس کی زندگی میں ایسے مراحل اس سے قبل بھی آ چکے تھے، جب اس نے نوجوانی کے دنوں میں پروٹسٹنٹ ماں باپ کے مذہب کو چھوڑ کر کیتھولک چرچ سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ اب کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا اور اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا اور مسلمان بن گیا۔ پھر اس نے ایک ایرانی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کی پہلی بیوی امریکن تھی، جو ویت نام کی جنگ کے زمانے میں جرمنی چلی آئی تھی، کیونکہ اس کو اپنے ملک کی سیاست سے اختلاف تھا۔

جرمن روشن ضمیروں میں اسلام کی طرف رجوع کی لہریں آتی جاتی رہتی ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یکے بعد دیگرے بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں اسلام کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام ہندو پاک میں جانے پہچانے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ شہرت لیوپولڈ وائیس (Leopold Weiss) نے حاصل کی تھی، جس نے محمد اسد کا نام اختیار کیا تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی، جس کے دوران اسے ہندو پاک میں رہنے اور پاکستان کا اقوام متحدہ میں پہلا نمائندہ ہونے کا اعزاز ملا۔ اس کی کتابیں شہرتِ عام رکھتی ہیں، مگر اس کے پہلو بہ پہلو دوسرے غیر معمولی لیاقت کے حامل نومسلم گزرے ہیں، جن کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ آسٹریا کے بیرن عمر رولف فان اہرن فیلز (Baron Umar Rolf von Ehrenfels) کو لوگ عام طور سے نہیں جانتے۔ وہ آسٹریا کے شاہی خاندان کا سپوت تھا۔ اس کی ماں ایک نامور ادیبہ تھی اور باپ ایک مشہور عالم پروفیسر تھا۔ میری ملاقات اس کے ساتھ ساتویں دہائی میں ایک علمی کانفرنس میں ہوئی اور ہماری دوستی اس کی وفات (۱۹۸۰ء) تک قائم رہی۔ اس نے ۱۹۲۷ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ جب آسٹریا نے نازی جرمنی کے ساتھ اتحاد کا فیصلہ کیا، تو وہ ہندوستان ہجرت کر گیا تھا، جہاں پر اس نے ایک کتاب (Mother rights in India) ''ہندوستان میں مادرسری نظام'' لکھی۔ اس سے قبل وہ ایک کتاب اسلام میں عورتوں کے مقام پر لکھ چکا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کو مدراس یونیورسٹی میں پروفیسر شپ ملی اور وہ ساتویں دہائی میں ریٹائرمنٹ تک وہاں پر خدمات بجا لاتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کو اسلام کا پیغام ۱۹۲۴ء میں برلن میں قائم ہونے والے احمدیہ (لاہوری) مشن کے ذریعے ملا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی مسلمان ہو گئی تھی، جو اس کی طرح شاہی خاندان سے تھی۔ ادبی دنیا میں اس کی بیوی کا نام اس لیے یاد رکھا جائے گا کہ اس نے ویانا کے ایک پبلشر کو ایک ناول ''علی اور نینو'' چھاپنے کے لیے دیا تھا، جو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں

چھپا۔اس پر مصنف کا نام قربان سعید (Gurban Sayid) لکھا ہوا تھا،مگر عام طور سے خیال کیا جاتا تھا کہ ناول کا اصل مصنف اسد بائے(Essad Bey) نامی نومسلم مصنف تھا، جوآذر بائیجان کا رہنے والا اور یہودی الاصل تھا۔مگر یہ بات اب تک صیغۂ راز میں ہے کہ اگر وہ مصنف تھا،تو اس کی کتاب کیسے بیرن عمر کی بیوی کے ہاتھ لگی۔کیا وہ کتاب کو اپنے وطن آسٹریا سے چھپوا کر، جہاں پر اس کا خاندان بہت با اثر تھا، اسد کی مدد کرنا چاہتی تھی یا یہ کہ دراصل وہی اس کتاب کی مصنفہ تھی۔جنگ کے بعد اس کتاب کا ایک نسخہ ایک جرمن روسی ڈانسر کے ہاتھ لگا، جو اس کو اپنے ساتھ انگلستان لے گئی۔اس نے برسوں کی محنت کے ساتھ اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔یہ کتاب انگلستان میں بہت مقبول ہوئی۔پھر ایک امریکن پبلشر کے ہاتھ لگی اور امریکہ میں بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔اب تک چھبیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ہالی ووڈ میں اس کہانی پر مبنی فلم بن رہی ہے۔

جماعتِ احمدیہ (لاہوری) کے ذریعے اسلام قبول کرنے والوں میں محمد امان ہوبوہم (Hobohm) بھی شامل ہیں۔ بلکہ وہ ایک زمانے میں احمدیہ برلن مسجد میں نائب امام رہ چکے ہیں۔انھوں نے لاہور کی ایک مسلمان فیملی میں شادی کی تھی اور کچھ عرصہ تک پاکستان میں جرمن سفارت خانے میں اتاشی برائے انفارمیشن رہے تھے۔ان کا آخری عہدہ بون میں سعودی عرب کی طرف سے قائم کردہ کنگ فہد اکاڈیمی کے ڈائرکٹر کا تھا۔اردو ادب ان کا اس لیے مرہونِ منت ہے کہ انھوں نے اقبال اور مس ویگناسٹ (Wegnast) کی مراسلت کو محفوظ کیا تھا، جس کو سعید درانی نے ان سے حاصل کر کے چھاپ دیا تھا۔

یہ چیز عام طور سے دیکھنے میں آئی ہے کہ بیشتر جرمن نومسلم اپنی بائیوگرافی میں ردّ و بدل کرتے ہیں۔میرے دوست دتلف خالد کی کہانی بیان ہو چکی ہے، جو آئے دن نام بدلتا رہتا ہے۔ یہ امر، کہ اس کے باپ کا خاندانی نام ہویسلر (Häusler) تھا، اس کی تشریح وہ یہ کرتا ہے کہ دراصل یہ نام اس جرمنی فیملی کا ہے، جس نے اس کے باپ کو اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔اس سے ملتی جلتی کہانی ایک دوسرا نومسلم سناتا ہے ، جو آج کل جرمنی میں ایک مسلم ادارے کا سربراہ ہے۔وہ بھی اپنے اصل نام کو چھپاتا ہے۔اس نے اپنا نام ہربرٹ کراونکل (Herbert Krawinkel) سے بدل کر محمد ایس عبداللہ رکھ لیا ہے۔اس کے پیچھے یہ راز پوشیدہ ہے کہ اس نام کا ایک مسلمان عالم تیسری دہائی میں برلن مسجد سے منسلک رہ چکا ہے۔ناواقف لوگ سمجھیں گے کہ یہ وہی شخص ہے۔اس کا کہنا ہے کہ اس کا مسلمان باپ بوسنیا کا رہنے والا تھا، جو جرمنی سے جاتے ہوئے اسے ایک جرمن لاولد خاندان کے پاس چھوڑ گیا تھا۔اس طریق سے یہ لوگ اپنے آپ کو خود ایجاد کرتے ہیں، جو شاید ان کی نفسیاتی ضرورت ہے۔

میرے جرمن ادیب دوستوں میں ہائیکے ڈوٹینے (Heike Dotine) بھی شامل ہے، جس کو میں طالب علمی کے دنوں سے جانتا ہوں۔ اس زمانے میں اس کا پہلا ناول چھپا تھا، جسے اس نے انیس برس کی عمر میں لکھا تھا۔ اس کا نام بتا رہا ہے کہ اس کا تعلق فرانسیسی پروٹسٹنٹ ہوگینوٹ (Huguenot) سے ہے، جن کو مذہبی اعتقادات کی بنا پر سولھویں صدی میں فرانس سے ہجرت کرنا پڑی تھی۔ اتنی صدیوں تک جرمنی میں رہنے کے باوجود یہ لوگ اپنا تشخص قائم رکھے ہوے ہیں۔ البتہ اب ان کے گھروں میں فرانسیسی نہیں بولی جاتی۔

اپنے وطن میں رہتے ہوے ہجرت کا سامنا میرے شاعر دوست راتھے نو (Rathenow) کو کرنا پڑا تھا، جو مشرقی جرمنی کا باشندہ تھا۔ اس کو اپنے ملک میں رائج اشتراکیت سے سخت اختلاف تھا، جس کے سبب اس کے ادب پارے اپنے وطن کے اخبارات ورسائل میں نہیں چھپ سکتے تھے۔ وہ سمگل ہو کر مغربی جرمنی میں پہنچتے تھے اور یہاں پر ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ میرا تعارف اس کے ساتھ قطعاً یک طرفہ تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں اس کے ادب پاروں کے تراجم باقاعدگی کے ساتھ پاکستان کے ادبی مجلّوں میں چھپوا رہا تھا۔ ہماری بالمشافہ ملاقات جرمنی کے متحد ہو جانے کے بعد جا کر ہوئی، جب ہمارے ایک مشترکہ دوست نے اسے میرے بارے میں بتایا اور وہ مجھ سے ملنے کے لیے ہمبرگ آیا۔

مجھے اریش فریڈ (Erich Fried) کے ساتھ بھی دوستی کا فخر حاصل ہے، جو ساری عمر اشتراکیت کی تعریف کرتا رہا مگر کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی ایک سو نظموں کے اردو تراجم کتابی صورت میں چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تو اس نے کہا کہ اس نظم کو ضرور کتاب میں شامل کرنا، جو میں نے ذوالفقار علی بھٹو کے پھانسی پر لٹکائے جانے پر لکھی تھی۔ یہ نظم ایک لٹکتی ہوئی رسی کی طرح چھپی تھی، جس کا ہر لفظ علیحدہ سطر میں اوپر سے نیچے کی طرف لکھا گیا تھا اور جو صرف ایک فقرے پر مشتمل ہے:

''پھانسی پانے والے کے گھر میں رسی کی بات نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اس گھر میں اب جلاد نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔''

میں اپنے سارے جرمن ادیب دوستوں کا ذکر یہاں پر نہیں کروں گا۔ بس چند ایک کے نام درج کر رہا ہوں۔ بہتوں کے ساتھ میں پاکستان سے آنے والے ادیب مہمانوں کی ملاقات کرواتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک اتنا کافی نہیں ہے کہ صرف جرمنی کے گلی کوچوں کی زیارت کی جائے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ بات ہے کہ یہاں کے ادیبوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، ابنِ

انشاء، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، صادق حسین، صہبا لکھنوی، فتح محمد ملک، کشور ناہید، پروین شاکر، شفیع عقیل ،فہمیدہ ریاض، آصف فرخی، صدیقہ بیگم اور دوسرے بہت سے ادیب وشاعر، جنھوں نے ہمیں شرفِ مہمان نوازی بخشا، ان ملاقاتوں سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی زیارت

ایک زمانے سے میرے دل میں یہ خواہش پنپ رہی تھی کہ اشتراکی ممالک کی سیر کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں ہم رومانیا کی سیاحت کے لیے گئے اور وہاں کی بے سواد زندگی کو دیکھ کر اشتراکی رومان پسندی سے بہت حد تک صحت یاب ہو کر واپس لوٹے تھے۔ اس کے باوجود مجھے بالخصوص سویٹ یونین کی وسط ایشیا میں پائی جانے والی ریاستوں (ترکستان) کو دیکھنے کا شوق تھا، جہاں پر مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے اور جس کا ہندوستان کی تاریخ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ تیمور اور بابر دونوں ازبکستان میں پیدا ہوے تھے۔ تیمور نے ہندوستان کو صرف لوٹا، مگر بابر نے اس ملک میں ایک سلطنت قائم کی جو صدیوں تک چلی اور جس کے اثرات آج بھی ہماری زندگیوں پر نظر آتے ہیں۔

میری طالب علمی کے دوران اس کا ایک زریں موقع ۱۹۶۵ء میں پیدا ہوا تھا، جب ترک اسٹڈیز کی پروفیسرا نے ماری فان گابیں (Annemarie von Gabain) کی زیرِ قیادت ہمارے سمینار کا ایک گروپ گرمیوں کی تعطیلات میں ازبکستان گیا تھا۔ وہ ترک زبانوں اور تاریخ کی ماہر تھی، اس لیے اس کے ساتھ جانا یقیناً بہت نفع بخش ہوتا۔ اس نے قدیمی ثقافت کی حامل وسط ایشیائی طرفان ویلی (Turfan Valley) پر تحقیق کی تھی، جسے ترک قوم کا اصل گھر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے قدیمی ترک زبان کی لغات بھی مرتب کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں طالب علمی کے دنوں میں معاوضے کے عوض تھوڑا سا کام بھی کیا تھا۔ بدقسمتی سے میں اس گروپ کے ساتھ نہ جا سکا تھا، کیونکہ میں نے عین انھی دنوں میں اوتا کے ساتھ پرتگال جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ البتہ وہاں پر جانے کی خواہش میرے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی، جس کو پورا کرنے کا موقع ہمیں بالآخر ۱۹۸۷ء میں مل گیا، جب ہم ایک ایسے گروپ میں شامل ہو سکے، جو وسط ایشیا کی پانچ ری پبلکوں کے سفر پر جا رہا تھا۔ مگر میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم ازبکستان جائیں گے اور تاشقند، سمرقند، شہرِ سبز اور بخارا کی سیر کریں گے۔

ہمارے سفر کے زمانے میں ابھی سویٹ یونین اپنے پورے دبدبے سمیت زندہ سلامت تھی۔

تاہم جنرل سیکرٹری گورباچوف (Gorbatchov) نے گلاسنوسٹ (Glasnost) اور پیرسٹرویکا (Perestroika) کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا، جنھیں کمیونزم میں حیاتِ نو پھونکنے کی بجائے اس کے کفن میں آخری کیل بننا تھا۔

سوویٹ یونین میں تمام راستے ماسکو سے نکلتے تھے اور یوں بھی ہمارے گروپ کو، جو جرمنی اور آسٹریا سے آنے والے وفدوں پر مشتمل تھا، وہاں پر ملنا اور اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ماسکو میں ہمیں وزارتِ خارجہ کے بالمقابل بلگراڈ ہوٹل کی انیسویں منزل میں کمرہ ملا تھا، جہاں سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف ہوٹل کے ریستوراں میں دو ہزار مسافروں کو ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کھانا کھلانے کا حال ویسا ہی تھا، جیسا بڑے شہروں میں ریلوے اسٹیشنوں کے ویٹنگ روم میں دیکھنے میں آتا ہے۔ بیرے کھانا دو تین منزلہ ٹرالی میں رکھ کر لاتے تھے اور اتنی سرعت سے مہمانوں کے سامنے رکھتے تھے جیسے ڈنگروں کے آگے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ ہوٹل سے باہر کسی ریستواں میں جانے کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ وہاں پر انتظار کرنے والوں کی قطار باہر سڑک تک لگی ہوتی تھی اور دکانوں میں خریدنے کے لیے قریب قریب کچھ نہیں تھا۔ پھر فروخت کے قواعد بھی عجیب وغریب تھے۔ کسی چیز کو خریدنے سے پہلے گاہک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح کہ اگر آپ نے چار چیزیں خریدنی ہیں، تو پہلے ان کی قیمت کو جا کر دیکھ لیں۔ پھر حساب کتاب والے کونٹر پر جا کر ایک ایک چیز کی قیمت ادا کر کے رسیدیں حاصل کریں۔ پھر یہ رسیدیں جا کر شاپ اٹنڈنٹ کو دیں، جو آپ کو متعلقہ چیزیں نکال کر دے گا۔ عام طور سے کونٹر پر لمبی قطار لگ جاتی تھی، کیونکہ پیسے وصول کرنے اور رسیدیں کاٹنے کی بجائے متعلقہ کارکن کسی دوسرے بہت اہم کام، جیسے ناخن کاٹنے یا صاف کرنے، میں مصروف ہوتی تھی۔ سرکاری دکانوں میں گاہک کو بھیک منگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ کارکنوں کی نوکری پکی تھی، اس لیے وہ کام کریں یا نہ کریں، کیا مجال ہے کہ کوئی ان کی کارکردگی پر اعتراض کرنے کی جرأت کرے۔ یوں بھی ملک میں مزدوروں کا راج تھا اور ان کی گھڑیوں کی چال دوسری تھی۔

مجھے جو چیز ماسکو میں بہت پسند آئی وہ یہ تھی کہ شہر کی ہوا کثافت سے بہت حد تک پاک تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ کاریں گیس پر چلتی تھیں اور سارے شہر کے مکانوں کی ہیٹنگ کا انتظام مرکزی طور پر تھا، جس کے لیے علیحدہ اسٹیشن بنائے گئے تھے، جو شہر سے بہت دور مضافات میں پائے جاتے تھے۔ خود ماسکو شہر کی حدود کے اندر اس زمانے میں ستر کارخانے تھے۔ صرف ان کی چمنیوں سے دھواں نکلتا تھا، جو اتنا نہیں تھا کہ شہریوں کی برداشت سے باہر ہو۔

شہر میں نقل وحرکت کا انتظام انڈر گراؤنڈ ٹرین (Underground Train) کے ذریعے تھا

جس کی گاڑیاں ایک منٹ سے بھی کم وقفے سے چلتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گاڑیاں ایک زنجیر سے بندھی ہوئی مسلسل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگی چلی جا رہی ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دنوں میں انڈر گراؤنڈ کو حفاظتی تہہ خانوں میں بدل دیا گیا تھا۔ ہمیں ایک اسٹیشن دکھایا گیا، جہاں پر ہسپتال ہوا کرتا تھا۔ ہزاروں روسی بچے اس ہسپتال میں پیدا ہوئے تھے۔ یوں بھی ماسکو کی انڈر گراؤنڈ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کے اسٹیشنوں میں سنگِ مرمر لگایا گیا تھا اور ان کی تزئین کا کام آرٹسٹوں کے سپرد کیا گیا تھا، جن کے آرٹ کے نمونوں کو لاکھوں انسان ہر روز دیکھتے ہیں۔ وہ اسٹیشن سے زیادہ میوزیم لگتے ہیں۔

کریملین میں حکومت کے آفس تھے، پہلے وقتوں میں یہ زار بادشاہوں کے محلات ہوا کرتے تھے۔ البتہ زار پیٹرزبرگ میں رہائش رکھتے تھے اور صرف خاص خاص موقعوں پر ماسکو آتے تھے۔ تاج پوشی وہاں پر ہوتی تھی اور جشن منائے جاتے تھے۔ کریملین میں سات چرچ بنے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک خاص طور پر بادشاہ کے لیے تھا۔ کہتے ہیں کہ ایوان نامی زار کو، جس کو تاریخ میں ظالم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، بیک وقت پانچ بیویاں رکھنے کے سبب اور بعض دوسری وجوہات کی بنا پر چرچ میں داخلے کی ممانعت تھی۔ وہ سروس کے وقت گیلری میں جا کر بیٹھتا تھا، جو گویا چرچ کا حصہ نہ تھی۔ وہاں سے وہ منبر کو نہیں دیکھ سکتا تھا، جہاں پر کھڑا ہو کر پادری سروس کی امامت کرتا تھا۔ سویٹ یونین میں ادیبوں اور شاعروں کی بہت عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ماسکو میں ہم نے پشکین، ٹالسٹائی اور گوگول کے مجسمے دیکھے۔ پشکین کے قدموں میں تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ٹالسٹائی ایک باغ کے کونے میں بیٹھا ہوا جیسے کوئی کہانی تخلیق کر رہا تھا۔

ہماری گائیڈ نے بتایا کہ فلیٹوں کے کرائے بہت معمولی ہیں۔ ایک مربع میٹر کے لیے چودہ کوپیک ادا کرنے پڑتے ہیں اور وہ بھی صرف سونے کے کمرے اور لونگ روم کے لیے۔ اس کے باوجود پچاس لاکھ روسی کرایہ ادا نہیں کرتے اور ملک میں کوئی قانون موجود نہیں، جس کے ذریعے ان کو کرایہ ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ جس کو ایک بار فلیٹ الاٹ ہو جاتا ہے، وہ ساری عمر اس پر قابض رہتا ہے۔ عمارتوں کی مرمت کا کام رکا ہوا تھا کیونکہ حکومت کا دیوالیہ نکلنے والا تھا۔ روس کو کمیونزم کا گھن لگا ہوا تھا جو اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ سڑکوں پر سرِ شام شراب میں دھت مرد اور عورتیں ادھر ادھر گری پڑی نظر آتی تھیں۔ ہر کوئی دیکھ سکتا تھا کہ یہ جنتِ ارضی نہیں ہے، جس کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچا جاتا تھا۔

ماسکو سے ہمیں ازبکستان کے صدر مقام تاشقند لے جایا گیا، جو ماسکو سے تین ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور جہاں پر گھڑی کو تین گھنٹے آگے کرنا پڑتا ہے۔ بیس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں کم و بیش نصف آبادی اس زمانے میں روسیوں پر مشتمل تھی۔ پورا شہر ۱۹۶۶ء میں آنے والے ایک زلزلے کے

سبب تباہ ہو گیا تھا، اس لیے پرانی عمارتوں میں سے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ بس ایک مدرسہ اور ایک مسجد پرانے وقتوں کی یادگار کے طور پر کھڑے ہیں۔ مدرسے کو سرکاری دفتر میں ڈھال دیا گیا ہے، جس کے سبب داخلہ بند تھا اور مسجد تاریخی طور پر اہم نہ تھی۔ شہر مکمل طور پر نئے سرے سے روسی شہروں کے انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اور پرانی آبادی شہر کا دسواں حصہ بھی نہ رہی تھی۔ میرے کولیگ ڈاکٹر مراد الہام نے، جن کا تعلق اس شہر سے تھا، کہا تھا کہ اگر وقت مل جائے تو میرے بڑے بھائی کو پرانی آبادی میں جا کر تلاش کرنا، جس کو اس نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ ان کا باپ پچاس برس قبل افغانستان ہجرت کر گیا تھا ، جہاں پر اس کا چھوٹا بیٹا مراد پیدا ہوا تھا۔ خود مجھے اس شہر میں مشہور ہندوستانی اردو ادیب منظر سلیم سے ملنا تھا، جو لمبے عرصے سے وہاں پر مقیم تھے۔ شوکت صدیقی ان کو لکھنو کے زمانے سے جانتے تھے اور تھوڑا عرصہ قبل ان سے مل کر آئے تھے۔ انھوں نے بہت تاکید کی تھی کہ اگر تاشقند جاؤ تو میرے دوست منظر سلیم سے جا کر ضرور ملنا۔ میرے خط کے جواب میں منظر صاحب نے لکھا تھا کہ ان کے گھر پر فون نہیں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ میں خود ان کے گھر پر آ جاؤں۔

مقامی گائیڈ نے بتایا کہ میں انڈر گراؤنڈ ریل گاڑی سے جاؤں، تو وہ مجھے سیدھی اس سڑک پر پہنچا دے گی، جس پر منظر سلیم کا مکان واقع ہے۔ میں نے متعلقہ اسٹیشن سے باہر نکل کر بلاک کا نمبر تلاش کرنا شروع کیا، تو ایک عجیب و غریب صورتِ حال سے واسطہ پڑا۔ مجھے بلاک نمبر ۳۵ میں جانا تھا، جب کہ میرے سامنے بلاک نمبر ۶۰ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس طرف چل دوں، جس طرف نمبر کم ہو رہے ہیں، تو پندرہ بیس منٹوں میں بلاک نمبر ۳۵ تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر بلاک نمبر ۵۸ کے بعد ۵۷ نمبر کی جگہ پر بلاک نمبر ۶۵ آ گیا۔ میں تھوڑا آگے بڑھا تو بلاک نمبر ۱۰۵ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے الٹے رخ پر چلنا شروع کیا، تو پھر ایک بار نمبر کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگے۔ میں ایک راہی سے مدد کا خواستگار ہوا ۔ اس نے دو تین آدمیوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد مجھے چوک کے دوسری طرف والی سڑک پر جا کر دیکھنے کی ہدایت کی۔ مگر وہاں کے نمبر بالکل مختلف نکلے۔ کسی نے کہا کہ ٹرام میں بیٹھ کر دو تین اسٹیشن پیچھے جا کر دیکھو۔ میں نے اس پر بھی عمل کر کے دیکھا۔ راستے میں یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے بتایا کہ دراصل جب پہلے پہل بلاک تعمیر کیے گئے، تو ان کے درمیان بہت سا فاصلہ رکھا گیا تھا تاکہ وہاں پر باغیچے لگائے جا سکیں۔ آگے چل کر آبادی کے بڑھ جانے کے سبب مزید بلاک تعمیر کرنے کی ضرورت پڑی، تو بلاکوں کے درمیان خالی پڑے ہوئے رقبے میں نئے بلاک بنائے گئے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سب بلاکوں کو سلسلہ وار نئے نمبر دیے جاتے مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے پرانے بلاکوں کے نمبر قائم رہے اور نئے بلاکوں کو نئے نمبر دیے گئے۔ طالب علم بھی مجھے میری منزلِ مقصود تک نہ پہنچا سکا۔

جب مجھے وہاں پر گھومتے ہوئے دو تین گھنٹے ہو گئے اور شام پڑ جانے کے سبب اندھیرا ہونے لگا، تو میں نے ہوٹل واپس جانا مناسب سمجھا۔ جرمنی واپس لوٹنے پر میں نے منظر سلیم کے خط پر ان کے گھر کا ایڈریس دیکھا تو پتا چلا کہ مجھ سے اس کو ایڈریس بک میں درج کرتے ہوئے چوک ہو گئی تھی، میں نے ان کے گھر کا نمبر ۵۳ کی بجائے ۳۵ لکھ رکھا تھا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ سمرقند تھا، جو آبادی کے اعتبار سے تاشقند کا پاسنگ بھی نہیں، مگر تاریخی لحاظ سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تیمور نے اس شہر کو اپنا صدر مقام بنایا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو ایک ایسے شہر میں بدل دے، جس کی نظیر ساری اسلامی دنیا میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس کی فوجوں کی لوٹ مار کے سبب قرب و جوار کے ملکوں پر ایسا زوال آیا کہ اس کے اثرات صدیوں میں بھی نہ دور کیے جا سکے۔ تیمور جہاں جہاں گیا وہاں سے کاریگروں اور ہنر مندوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لیتا گیا۔ دوسری طرف اس کو تجارت کی اہمیت کا پورا احساس تھا اور وہ سمرقند کو تجارتی اور صنعتی مرکز بنانا چاہتا تھا۔ یوں بھی یہ شہر چین سے آنے والی شاہراہِ ابریشم کے سنگم پر واقع تھا، جس کا ایک راستہ جنوب کی طرف ہندوستان کو جاتا تھا اور دوسرا راستہ ایران اور آگے روم (ترکی) کی طرف نکلتا تھا۔ تینوں اطراف سے کارواں سامانِ تجارت لے کر آتے تھے اور یہاں پر آپس میں سامان کا تبادلہ کرتے تھے۔ تیمور نے حکم دیا کہ شاہراہِ ابریشم کو سمرقند کے بیچوں بیچ سے گزارا جائے، جس کے لیے ضروری تھا کہ شہر کی آبادی کے ایک حصے کو ان کے گھروں اور رقبوں سے بے دخل کیا جائے۔ دو فوجی سپہ سالاروں کو اس کام پر معمور کیا گیا، جن کو دو ہفتوں کے اندر سڑکیں بنانی تھیں۔ عدم تعمیل کی صورت میں ان کو پتا تھا کہ خود ان کی گردنوں کا صفایا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ کام عین مقررہ وقت کے اندر تکمیل کو پہنچا۔ اس سڑک پر تعمیر ہونے والا بازار مسقّف تھا، جس کے گنبدوں میں روشن دان بنے ہوئے تھے، جن کے راستے سورج کی شعاعیں چھن کر اندر آتی تھیں اور گرم ہوا باہر نکلتی تھی۔ ایک ایسا مختصر سا بازار اب بھی وہاں پر موجود ہے، جو شاید اس بازار کی باقیات میں سے ہے، جس کو تیمور نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ شہر کی سڑکیں اینٹوں سے پختہ کی گئی تھیں۔ ابنِ حوقل نے لکھا ہے کہ سڑکوں پر گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کے مجسمے اس طرح استادہ کیے گئے تھے، جیسے وہ کسی بھی لمحے ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔ انسانوں کے مجسمے مسلمان علاقوں میں ابھی نہیں لگائے جاتے تھے۔

تیمور کی طبیعت میں جلد بازی بہت تھی۔ وہ چاہتا تھا عمارتیں دنوں اور ہفتوں میں کھڑی کر دی جائیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی تعمیر کردہ عمارتیں بہت دنوں تک نہ چل سکیں۔ اس کی ملکہ بی بی خانم کے نام سے موسوم جامع مسجد، جس کا شمار اسلامی دنیا کی بڑی مسجدوں میں ہوتا ہے، پوری تو باقی نہیں، مگر جو حصے کھڑے ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کیسی عظیم الشان عمارت تھی۔ اس پر لگائی جانے والی

ٹائلیں آج بھی پہلے دن کی طرح چمکتی ہیں۔ مرکزی ایوان کا گنبد نصف سے زیادہ ڈھے گیا تھا اور جن دنوں ہم وہاں تھے اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ یہی صورت تیمور کے سفید محل کی ہے، جو اس نے اپنے آبائی شہر کش میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی بھی صرف دیواریں کھڑی ہیں، جن کی بلندی اور ان پر کیے جانے والے نقش و نگار سے محل کے حجم اور اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر اس محل کے بھی اب صرف کھنڈرات باقی ہیں۔

جامع مسجد سے صرف دس پندرہ منٹوں کے فاصلے پر ریگستان نامی میدان پایا جاتا ہے، جو تیمور کے زمانے میں چھ سڑکوں کا نقطۂ ملاپ تھا۔ تجارتی قافلوں کو ٹھیرانے کے لیے کارواں سرائے بنائی گئی تھیں، جن کو ''خان'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ میدان شاہی فوجوں کی شان و شوکت دکھانے کے کام آتا تھا۔ سزائے موت پانے والوں کے سر وہاں پر قلم کیے جاتے تھے، جس کا تماشا دیکھنے کے لیے شہر کے سارے باسیوں کو جمع ہونے کا حکم ہوتا تھا۔ آگے چل کر اس جگہ پر مدارس تعمیر کیے گئے، جن میں سے تین آج بھی کھڑے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تیمور کے پوتے الغ بیگ کے نام سے موسوم ہے، جس کا مقولہ تھا کہ حکومت آتی جاتی چیز ہے مگر علم کی دنیا میں سرانجام دیے گئے کارنامے رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ چنانچہ اس کی زندگی علمی کاموں میں بسر ہوئی۔ اس کی تعمیر کردہ رصدگاہ (فلک پیما) دنیا بھر میں لاثانی تھی۔ اس علاقے میں آئے دن زلزلے آتے ہیں اس لیے معماروں نے یہ عمارت اس طرح بنائی کہ اس کا ایک تہائی حصہ زیرِ زمین ایک پہاڑی چٹان کے اندر بنایا گیا، جس میں آلۂ سدس کو لگایا گیا، اس طرح کہ اس کے بیالیس گزوں میں سے گیارہ گز زیرِ زمین تھے۔ اس کے اوپر ایک تین منزلہ عمارت تھی جو معدوم ہو چکی ہے۔ اب اس جگہ پر ایک دومنزلہ عمارت کھڑی کر دی گئی ہے، جو میوزیم کے کام آتی ہے۔ البتہ زیرِ زمین پائے جانے والا حصہ، جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، اچھی حالت میں ہے۔ الغ بیگ نے اپنے استاد قاضی زادے رومی کی معیت میں سورج اور اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کیا اور ان کی حرکات پر کتابیں تصنیف کیں، جو صدیوں تک علمی دنیا میں سند رہیں۔ اس نے ۱۰۱۸ ستاروں اور سیاروں کے محور کو بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے سال کی لمبائی کا جو اندازہ لگایا تھا اس میں اور ہمارے وقت کی پیمائشوں میں صرف دو منٹ کا فرق ملتا ہے۔ البتہ میں اس بات کی سچائی کا ثبوت دینے کی خاطر اپنا ہاتھ آگ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

آثارِ قدیمہ کے سلسلے میں اس شہر کا قبرستان بہت اہمیت رکھتا ہے، جس میں ایک مزار قثم ابنِ عباس کا ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ موصوف صحابی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے۔ ان کو قتل کر دیا گیا تھا۔ روایات کا کہنا ہے کہ جب ان کا سر قلم کیا گیا تو وہ اس کو اٹھا کر ایک

چٹان کے اندر چلے گئے، جس میں معجزۃً ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا، جوان کے داخل ہونے کے بعد پھر بند ہو گیا تھا۔ دوسری روایات کے مطابق وہ ایک چشمے میں اتر گئے تھے، جہاں پر وہ بدستور زندہ ہیں۔ اس وجہ سے اس قبرستان کا نام ''شاہ زندہ'' پڑ گیا ہے۔ گویا ان کا مزار دراصل مزار نہیں ہے، بلکہ وہ مقام ہے ، جہاں پر وہ چشمے میں پوشیدہ ہیں اور ہمہ وقت عبادت میں مصروف ہیں۔ اس مقام پر بنائی جانے والی عمارت اچھی حالت میں ہے، جب کہ دوسرے مقبرے عام طور سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ صدر دروازے پر ایک حدیث کندہ ہے جس کے راوی قثم ابنِ عباس تھے۔ راستے میں سولہ مقبرے آتے ہیں، جن پر عمدہ نقش و نگار کیے گئے ہیں۔ اکثر عبارتیں قرآنی آیات ہیں۔ بعض جگہوں پر اشعار بھی لکھے ہوئے ہیں۔ مقبرے عام طور سے تیمور کے خاندان کے افراد کے ہیں۔ چند ایک مزار صوفیا کے ہیں۔ مغلوں میں پیر پرستی کا رواج تھا چنانچہ تیمور نے اپنے باپ کی قبر ایک پیر کی قبر کے پہلو میں بنائی تھی۔ اسی طرح اس کے بیٹے جہانگیر کو بھی ایک پیر کے مزار میں دفن کیا گیا تھا۔ خود تیمور اور الغ بیگ کی قبریں شیخ میر سید برکہ کے مزار میں بنائی گئی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مزار اب ''گورِ امیر'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور زمانہِ قدیم میں اس عمارت میں ایک مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ پہلی قبر وہاں پر تیمور کے پوتے سلطان محمد کی بنی تھی، جو ترکی پر حملے کے دوران زخمی ہو کر مر گیا تھا۔ صرف ایک سال کے بعد خود تیمور نے چین پر فوج کشی کے دوران وفات پائی، جسکے فوراً بعد اس کے بیٹوں میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ بابر کا باپ عمر شیخ بھی، جو تیمور کا بیٹا تھا، وہاں پر دفن ہے۔ تیمور نے اپنے مدفن کے لیے آبائی قصبے کش میں، جس کو اس نے ''شہرِ سبز'' کا نام دیا تھا، اپنے باپ کی قبر کے پہلو میں جگہ چن رکھی تھی، مگر جانشینی کی جنگ کے سبب اس پر عمل نہ ہو سکا۔ سمرقند کے مقابلے میں کش محض ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جہاں پر بدستور تیمور کی نسل آباد ہے۔

۱۹۴۱ء میں روسی محققوں نے تیمور اور الغ بیگ کی قبریں کھول کر ان کی نعشوں کا معاینہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں کی کھوپڑیوں پر ان کے چہروں کی نقل بنائی گئی تھی۔ یہ دونوں نقلیں الغ بیگ کی رصدگاہ کے میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے صاف نظر آتا ہے کہ ان کا نسلی تعلق منگول قوم سے تھا۔ تیمور کی ایک ٹانگ تین سینٹی میٹر چھوٹی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس کے سبب اس کا نصف جسد بیکار تھا۔ البتہ وہ بلند قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ الغ بیگ کا سر اس کے دھڑ سے جدا تھا، جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کو قتل کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بیٹے نے بغاوت کی تھی اور باپ کو حج پر بھیجا تھا، جہاں سے واپسی پر راستے میں ہی اس کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس پر ساتویں آسمان کا انکار کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہجہان کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا تھا اور اس کو آگرے کے قلعے میں محبوس رکھا تھا، جہاں سے تاج محل دکھائی دیتا ہے اور جس میں اس کو مرنے

کے بعد دفن کیا جانا تھا۔

ایک روز کے لیے ہم تیمور کی جنم بھومی کش (شہرِ سبز) دیکھنے کے لیے بھی گئے، جو سمرقند سے زیادہ دور نہیں۔ راستے میں ایک پہاڑ کو عبور کرنا پڑتا ہے، جس کے درّے ''تختہ کرچا'' سے گزر کر دوسری طرف اتریں، تو سامنے کشکا دریا کا میدان آجاتا ہے، جس کی ہریاول کے سبب انسان سمجھ سکتا ہے کہ تیمور نے کیوں اپنے گاؤں کا نام شہرِ سبز رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے وہاں پر ایک سفید محل (آق سرائے) کی بنیاد ڈالی، جس کو دنیا کا سب سے بڑا اور بے مثال محل بنانے کا خواب تیمور نے دیکھا تھا۔ اس کے کھنڈرات کو دیکھ کر انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس کا دعویٰ کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ دہلی کے شاہانِ مغلیہ کی باطنی آنکھوں کے سامنے تیمور کی مثال تھی، جس کی پیروی میں انھوں نے ہندوستان میں عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اس گاؤں میں آج بھی تیمور کی نسل کے لوگ آباد ہیں، جن کی مہمان نوازی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ ایک گلی میں سے ہمارا گروپ گزر رہا تھا، جب ایک دس بارہ سال کے چھوکرے نے ہمیں اپنی حویلی میں آنے کی دعوت دی۔ صدر دروازے کے پیچھے اس کے خاندان کی عورتیں خوش گپیوں میں مشغول تھیں، کافی اور چائے پی جا رہی تھی۔ آناً فاناً سب کے لیے موڑھے اور کرسیاں مہیا کر دی گئیں اور چائے کا سماوار بھی کہیں سے آن پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سردے کاٹے جانے لگے، جن کی مٹھاس کا مزا اب تک میری زبان پر ہے۔ اس اچانک دعوت نے ہمیں رئیسِ بلدیہ کی تقریب سے کہیں زیادہ متاثر کیا، جس نے ہمیں ابریشم کا ایک ماڈرن کارخانہ دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ اس گاؤں میں پہلی بار ہم نے ایک چائے خانے میں داخل ہونے کی جرأت کی، جس کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ ایک میز کے چاروں طرف کشادہ بنچ لگے ہوئے تھے، جن پر لوگ جوتیاں اتار کر اور چوکڑی لگا کر بیٹھتے، درست ہوگا اگر کہا جائے نیم دراز لیٹتے ہیں۔ وہ ہماری طرح جھٹ پٹ چائے کی پیالی پینے کے بعد اٹھ نہیں جاتے، بلکہ گھنٹوں تک چائے خانے کو آباد رکھتے ہیں۔ حقہ پیا جاتا ہے، بٹیرے بازی ہوتی ہے، گپیں ہانکی جاتی ہیں۔ میں نے سچ مچ مردوں کو پنجابیوں دیہاتیوں کی طرح بٹیرے ہاتھوں میں تھامے ہوئے دیکھا۔ شاید ہمیں تھوڑا سا وقت اور مل جاتا تو بٹیروں کی بازی بھی ہوتی ہوئی دیکھنے کو مل جاتی۔

تیمور نے اپنے باپ کی قبر جامع مسجد کے اندر بنائی تھی اور اس پر ایک ایوان کھڑا کیا تھا۔ ایسا ہی ایک اور ایوان اس نے اپنی قبر کے لیے بنوایا تھا۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، وہاں پر دفن ہونا اس کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ جامع مسجد کے باقی ماندہ حصے میں تین قبریں موجود ہیں اور عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک قبر اس کے پلوٹھی کے بیٹے جہانگیر کی ہے۔ مگر قبر پر کندہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہ لگ بھگ پچاس ساٹھ سال بعد کی ہیں۔ ان میں سے ایک قبر ایک صوفی کی ہے۔

اب ہمارا رخ بخارا کی طرف تھا، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ترکستان میں اسلام کا مرکز تھا۔ اسلام کے آنے سے قبل یہ شہر بدھ مت کا علمی گہوارہ تھا، جس کی طرف اس کا نام اشارہ کرتا ہے جو دراصل وہار یعنی بدھ مت کا تعلیمی گڑھ تھا۔ ہندوستان میں وہار کا لفظ عام طور سے بہار میں بدل گیا ہے البتہ پٹوہار (پوٹھوہار) میں وہار قائم رہا ہے۔ ترکستان میں جا کر اس نے بخارا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسلام کا تعلیمی ادارہ مدرسہ، جس میں طالب علموں اور استادوں کی رہائش کا انتظام ہوتا ہے، اسی شہر میں پہلی بار قائم ہوا تھا، جہاں پر اس سے قبل بدھ مت کی وہار (Monastery) ہوا کرتی تھی، جس میں بھکشو رہائش پذیر تھے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ سے ڈیڑھ سو سال قبل بخارا میں اسلامی مدرسہ قائم کیا جا چکا تھا۔ کسی دوسرے شہر میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس نہیں پائے جاتے جتنے بخارا میں ہوا کرتے تھے اور جنکے آثار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بخارا میرے لیے اس سفر کا اہم ترین مقام تھا، جس کو دیکھنے کا شوق اس وقت سے میرے دل میں پنپ رہا تھا، جب میں اسلام کے نظامِ تعلیم پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہا تھا۔

بخارا دریائے سرافشان کے کنارے پر آباد نخلستان ہے جس کے پانی پر اس شہر کا انحصار ہے۔ البتہ قدیمی شہر اونچی جگہ پر آباد ہے، جہاں سے پانی کا گزر نہیں۔ شہر کے نشیبی علاقے میں سے نہریں گزرتی ہیں، جن کے سبب آج بھی شہر میں تالاب پائے جاتے ہیں، جن کا پانی پینے اور دھونے کے کام آتا ہے۔ ایک ایسے تالاب کے کنارے پر بنے ہوئے چائے خانے میں جا کر بیٹھنے سے اندازہ ہوا کہ عرب شاعر ثعلبی نے بخارا کی ہجو کرتے ہوئے غلاظت اور متعفن فضا کا جو ذکر کیا تھا، وہ بے جا نہ تھا۔

بخارا بھی دوسرے شہروں کی طرح دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ نئی آبادی روسی شہروں کی طرح کھلی سڑکوں اور کنکریٹ کی بنی ہوئی اونچی عمارتوں پر مشتمل ہے، جب کہ قدیمی آبادی کی گلیاں تنگ ہیں اور مکان کچے ہیں، جن میں کسی قسم کی ایرکنڈیشننگ نہیں پائی جاتی۔ اس زمانے میں ابھی گھروں میں کولر کسی کے ہاں نہیں تھا۔ پینے کا پانی صراحیوں میں رکھا جاتا تھا۔ ماڈرن فرنیچر کی بجائے لوگ قالینوں پر بیٹھتے تھے۔ یوں بھی بخارا زمانہ قدیم سے قالینوں کے لیے مشہور ہے، جو بہت عمدہ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ قدیمی آبادی کا تعلق عام طور سے تاجک قوم سے ہے، جو آپس میں فارسی بولتے ہیں۔ ہماری مقامی گائیڈ ساجدہ بھی فارسی دان تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے ماں باپ کے گھر میں نماز روزے کی پابندی ہوتی ہے اور گھر کے افراد قرآن خوانی کرتے ہیں، البتہ ان کو گھر سے باہر روسی بولنی پڑتی ہے۔ اس نے کہا گھر میں داخلے سے پہلے وہ روسی زبان کی تہذیب کو جوتیوں کی طرح دروازے پر چھوڑ جاتی ہے اور اندر جا کر اپنا روایتی تاجک لباس پہن لیتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور سے لوگ کھلے بندوں اسلام کی بات نہیں کرتے تھے، اگرچہ سویٹ یونین میں ۱۹۴۶ء سے مساجد کو عوام کے لیے کھول دیا گیا تھا اور ملک میں دو

مدارس میں روایتی اسلامی تعلیم دینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ البتہ اس کے لیے اخراجات خود مسلمانوں کو برداشت کرنے پڑتے تھے، بلکہ ہر طالب علم کو ایک سو پچاس ریال ماہوار حکومت کے خزانے میں بطور حرجانہ ادا کرنے ہوتے تھے، کیونکہ سرکار کو ایک فرد کی خدمات سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ تاشقند کے مفتی یوسف بوگدانووچ (Bogdanivic) نے ۱۹۵۷ء کو روسی حکومت کے ایما پر فتویٰ دیا تھا کہ مزدوروں کو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کا کام خود عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

ساجدہ ہمیں قدیمی شہر کے مرکز میں لے گئی، جہاں پر مینار ہائے کلاں اور اس کے پہلو میں ایک طرف مسجد کلاں اور دوسری طرف مدرسہ میر عرب آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ مینار کی بلندی ۵۷ میٹر ہے اور اس کے بنائے جانے کی وجہ شاید یہ تھی کہ شہر پر حملہ آور فوجوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ سزائے موت پانے والے مجرموں کو بورے میں ڈال کر مینار کی بلندی سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ مدرسہ میر عرب اس ملک کا واحد مدرسہ تھا، جس میں دینی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ ان دنوں وہاں پر بیس طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے، جو روسی ترکستان کی مختلف ریاستوں کے رہنے والے تھے۔ گیٹ پر ہماری ملاقات دو نوجوان طالب علموں سے ہوئی، جن کو فارسی بس واجبی سی آتی تھی البتہ عربی سے خوب واقف تھے۔ ان میں سے ایک آذربائیجان کا رہنے والا شیعہ تھا، جب کہ بخارا میں صرف فقہ حنفیہ پڑھائی جاتی تھی۔ طالب علموں کو ان کے شہروں کی مسلم انجمنوں کی طرف سے بھیجا جاتا تھا، جو ان کے تمام اخراجات بھی برداشت کرتی تھیں۔ انھوں نے ہمیں مدرسے کی عمارت کی سیر کرائی اور اپنا کمرہ بھی دکھایا۔ سب مدارس کا ذکر تو نہیں کیا جا سکتا مگر بخارا کا نشانِ امتیاز بن جانے والے چار مینار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کو ایک تاجر نے ۱۸۰۷ء کو تعمیر کروایا تھا۔ دراصل یہ چار مینار ایک مدرسے کا صدر دروازہ تھے، جو مرورِ زمانہ سے معدوم ہو چکا ہے۔ بس چار مینار کھڑے ہیں۔

بخارا کی اہم ترین عمارت سامانی بادشاہ اسمٰعیل کا مزار ہے، جس کو اس نے خود تعمیر کرایا تھا۔ تکمیل کا سن عیسوی کیلنڈر کے اعتبار سے ۹۰۷ء بنتا ہے۔ یہ ایک چوکور عمارت ہے، جس کی لمبائی چوڑائی دس دس میٹر ہے اور جس کے لیے صرف اینٹیں استعمال کی گئی ہے۔ ڈیکوریشن کی خاطر اینٹوں کو اس طرح لگایا گیا ہے کہ ان پر پڑنے والی سورج کی شعاعیں دن کے مختلف اوقات میں اپنا رنگ بدلتی رہتی ہیں اور چاندنی کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ سچ مچ طلسم کے زور سے بنائی ہوئی غیر ارضی عمارت لگتی ہے، جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ دلچسپ چیز یہ بھی ہے کہ وہ موجودہ سطحِ زمین سے کئی گز نیچی ہے۔ گویا صدیوں کے دوران بخارا کی عمارتیں ٹوٹتی پھوٹتی رہی ہیں اور ان کے اوپر نئی عمارتیں بنائی جاتی رہی ہیں۔

ازبکستان کے بعد ہم نے جورجیا کے صدر مقام طبلیسی کی سیر کی، ارمینیا کے دارالحکومت

ایریوان اور اس کے چرچوں کو دیکھا، آذربائیجان کے تخت پایہ باکو میں گھومے پھرے، مگر میرا دل بخارا میں اٹکا رہ گیا تھا۔ ہم نے اس کے بعد کیا کچھ دیکھا، اس کو میں بیان کرنے سے قاصر ہوں، کیونکہ میری باطنی آنکھیں بدستور ازبکستان کے شہروں میں گھوم رہی تھیں۔ آج بھی میں آنکھیں موند کر وہاں کی ایک ایک عمارت کو دیکھ سکتا ہوں۔ مفصل بیان ایک پوری کتاب چاہتا ہے، جو میں شاید نہیں لکھوں گا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ یہاں پر اس سفر کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے تاکہ قارئینِ کرام پر میری دلی کیفیت کھل سکے اور وہ جان لیں کہ مسلم تاریخ میرے لیے محض ایک تعلیمی مضمون نہیں ہے بلکہ دل کی گہرائیوں میں اسکے لیے ایک خاص دلچسپی اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔

سلمان رشدی کی ''شیطانی آیات''

اگست یا ستمبر ۱۹۸۸ء میں جرمن رسالے ''ڈیر شپیگل'' **(Der Spiegel)** کے ایک صحافی نے مجھے فون پر کہا کہ ان کو سلمان رشدی کا نیا ناول ''شیطانی آیات'' تبصرے کے لیے ملا ہے اور اس نے اس کو پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر بیسویں صفحے سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اس نے پوچھا کہ اگر وہ کتاب مجھے بھیج دے تو کیا میں اس پر تبصرہ لکھنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس سے قبل رشدی کی دو کتابیں **Midnight Children** اور **Shame** پڑھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اپنی کتابوں کو شہرت دلانے کے لیے وہ ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ پہلی کتاب میں ہندوستان کے خلاف مواد تھا، جس کی بنا پر اندرا گاندھی کی حکومت نے اس کو ضبط کر لیا تھا۔ دوسری کتاب میں پاکستان اور بالخصوص ذوالفقار علی بھٹو کو رگیدا گیا تھا، جس کے سبب اس کو پاکستان میں ضبط کر لیا گیا تھا۔ اس طرح دونوں کتابوں کا بین الاقوامی پریس میں چرچا ہوا تھا اور مغربی دنیا میں ان کی اشاعت خوب ہوئی تھی۔ ''شیطانی آیات'' میں اس نے یہ ہتھکنڈا اسلام کے خلاف استعمال کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رشدی کی توقعات کے مطابق اس کتاب کے خلاف اسلامی دنیا میں احتجاج ہوگا، جو کتاب کی شہرت کا باعث بنے گا۔

چنانچہ یہی ہوا اور ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں نکالے جانے والے جلوسوں کی تصویریں اور پاکستان میں پولیس کے ہاتھوں مرنے والے احتجاجیوں کو مغربی دنیا کے اخباروں نے خوب اچھالا۔ اور پھر امام خمینی کے فتوے نے رہی سہی کسر نکال دی۔ رشدی کو اپنی جان کے لالے پڑے اور اس کو برٹش پولیس نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ رشدی کا نام ہر کسی کی زبان پر تھا مگر اس وقت تک کسی

نے یورپ میں اس کتاب کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ جرمنی کے کتب خانوں میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا اور شاید میرے سوا اس ملک میں کسی نے کتاب کو نہیں پڑھا تھا۔ جرمن فارن آفس کی طرف سے اورینٹ انسٹی ٹیوٹ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم انھیں بتا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے، جس کی بنا پر اسلامی دنیا میں اس کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا ہے۔ عین انہی دنوں میں جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ کے اخباروں اور رسالوں کی طرف سے ہمیں فون آنے لگے، جو رشدی کی کتاب کے بارے میں انٹرویو چاہتے تھے۔ میں نے کم و بیش تیس انٹرویو ریڈیو اسٹیشنوں کو دیے، دس اخباروں کے لیے مضامین لکھے اور ٹیلی ویژن کے بے شمار پروگراموں میں شرکت کی۔ ایک ٹاک شو ساڑھے تین گھنٹوں کی تھی، جو آسٹریا کے صدر مقام ویانا سے نشر ہوئی تھی۔ اس میں رشدی اور اس کی کتاب پر اور اسلامی دنیا میں ہونے والے احتجاج کی وجوہات پر کھل کر بحث ہوئی۔ میرا کہنا تھا کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک کتاب کو کھلے عام جلانے کی بجائے اس میں پیش کی جانے والی باتوں کے جواب میں کتاب لکھی جائے۔ میں نے پوری تصریح کے ساتھ بتایا تھا کہ رشدی کی کتاب میں کہاں کہاں پر تاریخی واقعات کو مسخ کیا گیا تھا اور جھوٹ کا سہارا لے کر کتاب کو شہرت دلانے کے لیے بدلا گیا تھا۔ مجھے بہت جلد اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ باتیں، جو ریڈیو پر کہی اور اخباروں میں لکھی جا سکتی ہیں ان کو ٹیلی ویژن پر پیش کرنا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کا باعث بن سکتا ہے۔

اگلی رات کے دو بجے ہمارے گھر میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں چونکہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور میرے ہوش و حواس ابھی پوری طرح ٹھکانے نہ تھے، اس لیے میں کچھ سمجھ نہ پایا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ کوئی شخص شاید مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ کیا وہ اردو بول رہا تھا یا پنجابی؟ اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اس نے فون کی لائن کو بند کر دیا۔ میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی بلکہ آئندہ دنوں میں جب دو تین بار اسی قسم کے فون آئے تب بھی میں نے کسی کے ساتھ اس کا ذکر نہ کیا۔ البتہ میں اس دوران میں یہ جان گیا تھا کہ فون کرنے والا اگرچہ اردو بولتا تھا اور اسی زبان میں مغلظات بکتا تھا مگر اس کی مادری زبان پنجابی تھی۔ شاید اسے پتا نہ تھا کہ بعض گالیاں، جو اس کا تکیۂ کلام تھیں، اردو میں اس طرح نہیں دی جاتیں جیسے پنجابی میں۔

پھر ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت اس کا فون آیا۔ میں نے آواز کو پہچان لیا، مگر اب کے اس نے کوئی گالی نہیں دی۔ اس نے کہا کہ وہ اتفاق سے پنے برگ نامی شہر میں آیا ہوا ہے جو ہمارے گاؤں کے قریب واقع ہے۔ وہاں پر اس کے دوست رہتے ہیں۔ انہی کی زبانی اسے پتا چلا تھا کہ میں وہاں پر کہیں قرب و جوار میں رہتا ہوں۔ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور کئی بار مجھے ٹیلی ویژن پر دیکھا اور

ریڈیو پر سنا تھا۔ اس وجہ سے اسے مجھ سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اگر مجھے اعتراض نہ ہو تو وہ مجھے گھڑی کی گھڑی ملنے کے لیے آنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھ سے میرے گھر کا راستہ جاننا چاہا۔ اس بات سے کم از کم یہ پتا چل گیا کہ اس کے پاس میرے گھر کا پتا نہیں تھا۔ جرمنی میں ٹیلی فون ڈائریکٹری میں عام طور سے مکمل پتا درج ہوتا ہے، مگر چھوٹے موٹے گاؤں کے فون نمبروں کے ساتھ پتا لکھنے کا رواج نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت جرمن ادیب یواخیم زائپل (Joachim Seyppel) آیا ہوا تھا اس لیے میں نے معذرت کر دی۔

اگلی بار اس کا فون آیا تو سیدھا سیدھا قتل کر دینے کی دھمکی لے کر آیا۔ اس سے ایک روز قبل بروسلز کی مسجد کے امام کو کسی نے گولی مار دی تھی، اس لیے اوتا نے کہا کہ اب ہمیں معاملہ پولیس کے پاس لے جانا چاہیے۔ پولیس کا حفاظتی دستہ اطلاع ملنے پر پندرہ منٹوں کے اندر اندر ہمارے مکان پر پہنچ گیا۔ جلد بعد ان کا خاص عملہ آ گیا۔ ہمارے بیانات کو نوٹ کیا گیا اور دیگر ضروری معاملات کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہمیں کہا گیا کہ اس رات کسی دوسری جگہ پر جا کر سوئیں۔ پولیس نے ہمارے مکان کی نگرانی اپنے ذمے لی اور ہمیں اپنی حفاظت میں ایک دوسرے مکان پر پہنچا دیا۔ دوسرے روز حکومت کے ماہرین حالات کا جائزہ لینے کے لیے آ گئے۔ اِنھیں کے مشورے پر ہم نے چند دنوں کے لیے جنوبی جرمنی چلے جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم وہاں سے آگے تین ہفتوں کے لیے اسپین چلے گئے۔

خفیہ پولیس کا خیال تھا کہ اس معاملے میں ہمبرگ کی ایرانی مسجد کا ہاتھ لگتا ہے، اس لیے اگر میں ان کو خط لکھ کر معذرت کر دوں کہ میرے بارے میں انھیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے سلمان رشدی کا دفاع نہیں کیا تھا، بلکہ اس کی کتاب پر کڑی تنقید کی تھی، تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اپنے ایجنٹوں کو میرا پیچھا کرنے سے روک دیں۔ یہ خط بعد میں مسجد کی طرف سے ان کے ماہانہ رسالے میں چھپ گیا تھا، جس پر میرے دوستوں نے مجھے بزدل ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ایک بار پروفیسر محمد سرور کے اشتراک سے جماعتِ احمدیہ پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا، تو انھوں نے کہا تھا کہ وہ بہت بزدل آدمی ہیں اور ڈرتے ہیں کہ پاکستان میں لوگ ان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس پر میں حیران ہوا تھا کہ کوئی شخص کیسے اتنا بزدل ہو سکتا ہے کہ ایک تحقیقی کتاب لکھنے کی جرأت نہ رکھتا ہو۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ میں ان سے کم بزدل نہیں تھا، جو اپنی جان بچانے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا اور جب چار ہفتوں کے بعد واپس لوٹا تھا تو سڑک پر مڑ مڑ کر دیکھتا تھا کہ کوئی شخص میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہا۔

اتفاقی طور پر خفیہ پولیس نے اس پاکستانی فیملی کا پتا چلا لیا تھا، جنھوں نے مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ انھوں نے آسٹریا کے ایک ہفت روزہ کو انٹرویو دیا تھا، جس کی تصویروں میں ان کو چاقو

اور پستول تھامے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ اسلام کے نام پر دھبا لگانے والوں کو بلاتردد موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ فیملی ہمبرگ کے مضافات میں رہتی تھی اور ان کو میرے ایک جاننے والے نے اپنی سادہ لوحی میں اس گاؤں کا نام بتا دیا تھا، جہاں پر میں رہتا تھا اور میرا فون نمبر بھی دیا تھا۔ چنانچہ پولیس نے ان کو خبردار کر دیا کہ اگر مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تو وہ لوگ سب سے پہلے گرفتار کیے جائیں گے۔ اس طرح ان کی طرف سے خطرہ ٹل گیا۔

سلمان رشدی کا منحوس سایہ انے ماری شمل پر بھی پڑا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں جرمن پبلشروں کی طرف سے شمل کو امن پرائز دیے جانے کا اعلان ہوا، جو ہر سال فرینکفرٹ میں منعقد ہونے والے کتابوں کے میلے کے موقع پر دیا جاتا ہے۔ ہمبرگ یونیورسٹی میں میرے کولیگ ڈاکٹر روٹر (Gernot Rotter) نے ، جو شمل کا شاگرد رہ چکا تھا، اس کے خلاف اخباروں میں ایک احتجاجی تحریک چلائی، جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ شمل اس انعام کی مستحق نہیں ہے، کیونکہ اس نے کبھی ایران کے اسلامی انقلاب کے خلاف آواز نہیں اٹھائی، بلکہ حتی الامکان اس کی تائید کی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' کے خلاف امام خمینی کے فتوے کو درست قرار دیتی ہے۔ اس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ رشدی کی کتاب نے مسلمانوں کو جذباتی طور پر دلی رنج پہنچایا ہے، جس کے سبب اس نے عمر رسیدہ مردوں کو کھلے بندوں روتے ہوئے دیکھا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شمل کے خلاف ایک محاذ قائم ہو گیا، جس میں وہ سب لوگ حصہ لینے لگے، جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ دوسری طرف جرمن مستشرقین کی اکثریت شمل کے حق میں تھی۔ چنانچہ انھی دنوں ہونے والی سالانہ کانفرنس میں اس کو خطبۂ افتتاحیہ دینے کی دعوت ملی، مگر عام طور سے کھل کر کوئی شخص شمل کا دفاع کرنے کے لیے میدان میں نہ اترا۔ نتیجہ یہ تھا کہ شمل کو مشورہ دیا جانے لگا کہ وہ اپنے طور پر امن انعام لینے سے انکار کر دے۔ میں نے اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر کائی حافظ، جو ایک مصری باپ اور جرمن ماں کا بیٹا ہے، کے ساتھ مل کر شمل کا انٹرویو لینے کا پروگرام بنایا، جس کے ذریعے ہم اس کو اپنا دفاع کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اس کے زندگی بھر کے کام اور علمی وادبی خدمات کا جائزہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ یہ انٹرویو ہم نے بون میں اس کے گھر پر جا کر لیا جس کو اگلے روز جرمنی کے اہم ترین اخبار ''دی فرانکفوٹرا لگے مائنے تزائٹنگ'' (Die Frankfurter Allgemeine Zeitung) نے پورے صفحے پر شائع کیا۔ اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی، کیونکہ اس انٹرویو میں ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا، جن کی بنا پر اس کو امن انعام کے لیے غیر مستحق قرار دیا جا رہا تھا۔

پارلمانی الیکشن کی مبصری

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ہونے والے جنرل الیکشن کے موقعے پر حکومت جرمنی کی طرف سے پانچ مبصروں کا ایک وفد پاکستان بھیجنے کا فیصلہ ہوا،جس میں مجھے شامل ہونے کی دعوت ملی۔ میرے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں پاکستان کے کسی الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا اور باوجود اس امر کے کہ میں عرصۂ دراز سے جرمن قومیت اختیار کر چکا تھا اور پاکستانی پاسپورٹ واپس کر چکا تھا، میرا نام بدستور ہمارے آبائی گاؤں چنگا بنگیال کے ووٹروں کی لسٹ میں شامل تھا۔ صرف یہی نہیں میری جرمن بیوی اوتا کا نام بھی وہاں پر موجود تھا۔ اس بارے میں مجھے میرے تایازاد بھائی عزیز الدین احمد نے بتایا تھا، جو پنجاب اسمبلی کا الیکشن لڑ چکا تھا۔ اس نے کہا تم دونوں کے ووٹ ڈالنے کا انتظام بھی موجود ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ پاکستان میں الیکشنوں میں دھاندلی کس طریق سے کی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے نامزدگی قبول کر لی۔

جرمن وفد دراصل یورپین یونین کے اجتماعی وفد کا حصہ تھا، جس کے ممبروں کی تعداد ایک صد تھی۔ اسلام آباد میں ہماری دو مجالس ہوئیں، جن میں یہ طے پایا کہ ہمیں کن کن چیزوں پر خاص نظر رکھنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عنایت اللہ کو تقریر کی دعوت دی گئی تھی، جنھوں نے پاکستان میں ہونے والے انتخابات کی تفصیلات بیان کیں اور بتایا کہ گزشتہ موقعوں پر کس قسم کی دھاندلی کے مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے وفد کے اکثر ارکان کا علم پاکستان کی سیاسی تحریکات کے بارے میں بہت سرسری تھا۔ ان کو ملک کی پارلمانی تاریخ کا بھی کچھ ایسا علم نہیں تھا۔

یورپین یونین کے ملکوں کے سفیروں نے آپس میں مبصروں کو ملک کے مختلف مقامات پر تعینات کرنے کے سلسلے میں سمجھوتہ کر رکھا تھا، جس کے مطابق میری تعیناتی ساہی وال (منٹگمری) کے مقام پر تھی، جہاں پر پی پی پی نے ایک خاتون کو ٹکٹ دیا تھا۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے ہمیں شناختی کارڈ جاری کیے گئے اور ایک میٹنگ میں بتا دیا گیا کہ ہمیں اپنے نگرانی کے کام کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا ہوگا اور ہمیں کون سی سہولتیں میسر ہوں گی۔ البتہ مبصروں کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا، نہ ہی انھیں مقامی افسران سے رابطہ کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ الیکشن بوتھوں پر اپنا شناختی کارڈ دکھا کر موقع پر حاضر رہ سکتے تھے اور بس۔

میرا قیام ساہی وال کے ایک عوامی ہوٹل میں تھا، جہاں پر شام کے وقت قرب و جوار کے علاقوں کے چوہدری صاحبان جمع ہوتے تھے۔ ایک امیدوار نے کھلے بندوں بھری مجلس میں بتایا کہ اسے اپنے مزاروں کے ایک خاندان کے لوگوں کی وفاداری پر اعتبار نہیں ہے، اس لیے انتخاب سے دو روز قبل اس نے پورے خاندان کے ووٹروں سے ان کے شناختی کارڈ حاصل کر لیے تھے۔ شناختی کارڈوں کا ڈھیر اس نے اپنے سامنے میز پر لگایا ہوا تھا۔ اس نے کہا چونکہ اسے شبہہ ہے کہ یہ لوگ اس کے مخالف امیدوار کو ووٹ دیں گے، اس لیے ان کو ووٹ ڈالنے سے روکنے کا یہ مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اگر وہ الیکشن بوتھ پر آ کر اسے قسم کھا کر یقین دلائیں گے کہ ان کا ووٹ اسے ملے گا تو پھر وہ شناختی کارڈ ان کے حوالے کرے گا، جس کے بغیر ووٹ نہیں ڈالے جا سکتے تھے۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ میں الیکشن کا غیر ملکی مبصر تھا۔ مجھے اس نے کہا اب آپ سے بھلا کیا پردہ، پاکستان میں ووٹنگ بس اسی طریق سے ہوتی ہے۔ اس نے رازداری سے مجھے یہ بھی کہا کہ اب کی بار ہماری پی پی پی جیتے گی۔ افسرانِ بالا نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جب نتیجہ نکلے گا تو میں اس چیز کو خود جان جاؤں گا۔ اور فی الواقعی پیپلز پارٹی نے الیکشن جیتا تھا۔

عام طور سے ووٹنگ کسی قسم کی رکاوٹ اور دھاندلی کے بغیر ہوئی، جس کو میں نے مختلف بوتھوں پر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ البتہ جب شام کو ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی اور نتائج ایک مرکزی الیکشن سیل کو بھیجے جانے لگے، تو میں چاہتا تھا کہ اس موقعے پر وہاں پر موجود رہوں اور دیکھوں کہ شہر کے مختلف حصوں اور مضافات سے آنے والے اعداد و شمار کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، مگر مجھے اس آفس میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ پریذائیڈنگ افسر نے کہا کہ الیکشن کے مبصروں کو اس اندرونی کارروائی کو دیکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے اس فیصلے کے بارے میں ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کرنی چاہیے کہ نہیں، تب ایک شخص میرے پاس آیا۔ اس نے کہا آپ کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے ساری زندگی میں شراب نوشی نہیں کی اور میرا ڈرائیور گواہی دے سکتا ہے کہ میں نے اس روز بھی شراب نہیں پی۔ اس نے کہا یہ پاکستان ہے۔ یہاں پر کھلے بندوں یہ کہہ دینا کافی ہے۔ لوگ آپ کو پکڑ کر اگلے درخت سے باندھ کر سنگسار کر دیں گے۔ ان میں سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ میری بات درست بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں اور ہمارے کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اس سے اگلے روز یورپین یونین کے وفد نے تصدیق کی کہ پاکستان میں الیکشن کسی قسم کی دھاندلی کے بغیر ہوئے تھے، کسی مبصر نے اپنی آنکھوں سے دھاندلی ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔

اسلام آباد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے، جو اس زمانے میں مقتدرہ قومی زبان کے ڈائرکٹر تھے، اپنے گھر پر میرے اعزاز میں ایک دعوت دی جسمیں شرکت کے لیے اسلام آباد اور راولپنڈی کے پینتیس ادیب تشریف لائے۔ اس طرح میرے لیے ان سے تعارف کا عمدہ موقع پیدا ہو گیا۔ اس سے قبل جرمن سفیر الفرڈ ویسٹرنگ (Alfred Vestring) نے اپنے گھر پر دس ادیبوں کو مجھ سے ملنے کے لیے کھانے پر بلایا تھا مگر صرف تین (جمیل جالبی، صادق حسین اور انور زاہدی) آئے تھے۔ پتا چلا کہ پاکستان میں کسی غیر ملکی سفارت خانے میں جانا اپنے آپکو مشکلات میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ جمیل جالبی کے گھر پر جمع ہونے والے ادیبوں میں سے کچھ کو میں پہلے سے جانتا تھا، جنکے ساتھ میری ملاقات کا اہتمام اکادمی ادبیات کر چکی تھی۔ ان میں افسانہ نگار رشید امجد، منشا یاد، انور زاہدی، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد، وقار بن الٰہی شامل تھے۔ جمیل جالبی کے ہاں ضیا جالندھری، ڈاکٹر آفتاب احمد اور ممتاز مفتی بھی تشریف لائے تھے۔ ساری شام ممتاز مفتی عورتوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ہر کسی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بزرگانہ عشق فرمانے لگے۔ وہاں پر موجود خواتین نامور ادیب تھیں۔ ان میں سے ہر کسی پر وہ اپنی زندگی میں ایک آدھ خاکہ لکھ گئے ہیں۔ مجھے کہنے لگے جب میں جوان تھا تو کوئی مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا اور اب جب منہ میں دانت نہیں رہے دیکھو کیسے لڑکیاں مجھ پر ٹوٹی پڑتی ہیں۔

عالمی ادبی کانفرنس

نومبر ۱۹۹۵ء کو اکادمی ادبیات کی دعوت پر ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس اسلام آباد میں منعقد ہوئی، جس کے کرتا دھرتا فخر زمان تھے۔ جرمنی سے مجھے، فتح محمد ملک کو، جو اس زمانے میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر تھے، اور تین جرمنوں کو دعوت دی گئی تھی، جو ادیب ہونا تو دور کی بات ہے شاید دانشور بھی نہیں تھے۔ ان کا چناؤ پاکستان کے سفارت خانے کی سفارش پر ہوا تھا۔ اگر مجھ سے مشورہ مانگا جاتا تو میں نامور جرمن ادیبوں کو شرکت کے لیے تیار کر سکتا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال دوسرے ملکوں کے مندوبین کے سلسلے میں دیکھنے میں آئی۔ ان میں بڑی تعداد غیر ممالک میں اردو پڑھانے والوں کی تھی، جو اپنے ہاں رائج کورسوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ کمیونسٹ ممالک (شمالی کوریا۔ چین) کے نمائندوں نے اپنے اپنے ملک کی حکومتوں کی تعریف میں قصیدے پڑھے، جو ادب کی خدمت کرتی ہیں۔ ادب اور ادیبوں کے مسائل پر بات نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی تو مجھ

تک اس کی خبر نہیں پہنچی۔ کانفرنس کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم کرنے کی بجائے، جہاں پر الگ الگ موضوعات پر بحث ہو سکتی تھی، چنیدہ مقالے عام مجلس میں پیش کیے جاتے رہے، جس میں کچھ لوگ شریک ہوتے تھے، باقی کے ادھر ادھر گھوم پھر کر وقت گزارتے تھے۔ مجھ جیسے لوگ، جو مقالے لکھ کر لائے تھے، ان کو کہا گیا کہ مقالے جمع کرا دیں۔ مجھے خبر نہیں کہ ان مقالوں کا کیا بنا۔ اگر ان کا کوئی مجموعہ چھپا تھا تو پھر اس کو خوب حفاظت سے رکھا گیا تھا اور باہر کی ہوا نہیں لگنے دی گئی تھی۔

پاکستانی ادیبوں کے ساتھ تعارف پیدا کرنے کے لیے، جو بہت بڑی تعداد میں وہاں پر جمع تھے، یہ موقع خوب تھا۔ جیلانی کامران، مظفر علی سید، منیر نیازی، پرتو روہیلہ اور محمود احمد قاضی سے ملنا میرے لیے ایک انعام سے کم نہ تھا۔ پاکستان جاتے ہوئے جہاز میں ن۔م۔راشد کے بھانجے اور داماد فاروق حسن، ہالینڈ کے اسد مفتی اور ڈنمارک کے نصر ملک کا ساتھ رہا تھا۔ راستے میں ابوظبی سے نجم الحسن رضوی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اسلام آباد میں کشور ناہید کے گھر پر ایک دعوت میں مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات ہوئی، مگر وہ حضرت ساری شام منہ میں گھنگنیاں ڈالے ہوئے بیٹھے رہے۔ وہ تو فیض احمد فیض سے بھی بڑھ کر چُپّے نکلے۔ البتہ تبسم کاشمیری، عذرا عباس اور اس کے شوہر سین رائے سے تجدیدِ ملاقات ہوئی۔ ایک شام ساز و سرود کی رکھی گئی تھی، جس میں دھمال پڑی، جو پی پی کا خاص کلچر تھا۔ ن۔م۔راشد کے فرزند شہریار سے، جو انگریزی میں شاعری کرتے تھے، ملنا ہوا۔ وہ اس زمانے میں وزارتِ خارجہ میں ڈائرکٹر جنرل تھے اور اپنی سفارتی تعیناتی کے انتظار میں تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد ان کو تاشقند میں سفیر بنا کر بھیجا گیا، جہاں پر جلد بعد ان کی وفات ہو گئی۔

جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ پاکستانی خواتین کی ہر شعبۂ زندگی میں پیش قدمی تھی۔ جس کا مظاہرہ نہ صرف اس بات سے ہوتا تھا کہ بینظیر بھٹو وزیرِ اعظم تھیں۔ ایک روز شرکائے کانفرنس کو صوبہ سرحد کے ایک پروجیکٹ کو دکھانے کے لیے لے جایا گیا، جہاں پر ایک خاتون نے نہایت قابلیت کے ساتھ پروگرام پیش کیا، بلکہ خود ہی قرآن کی تلاوت بھی کی۔ کوئی قاری اس سے بہتر شاید ہی یہ فریضہ ادا کر سکتا۔ ش فرخ اور فاطمہ حسن سے ملنا مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ دونوں اپنے اپنے دائرۂ عمل میں بہت کامیاب ہیں۔ ٹیلی ویژن پر عورتوں کے حقوق پر بحث چل رہی تھی۔

گل جی نے کراچی میں اپنے اسٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ میں رات دو بجے تک ان کے آرٹ کے نمونوں کو دیکھتا رہا۔ انھوں نے ہر چڑھتے سورج کی پوجا کی ہے۔ آغا خان سے لے کر مسلمان بادشاہوں اور صدرانِ مملکت کے پورٹریٹ سنگِ لاجورد میں بنا رکھے ہیں۔ بھٹو کی تصویر اس کی کلفٹن والی کوٹھی میں لگی ہوئی ہے، مگر قیمت ادا نہیں کی گئی، کیونکہ تصویر کی وصولی کے تھوڑے دنوں کے بعد جنرل

ضیاء الحق نے بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اسلام آباد کے صدارتی محل کے لیے ان کے آرٹ کے نمونے حاصل کیے گئے تھے، مگر قیمت کی ادائیگی معرضِ التوا میں تھی۔ اسلام آباد کی بلدیہ سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے بجٹ میں سے ادا کر دیں۔ انھوں نے بتایا کہ صدارتی اقامت گاہ میں صادقین کی دو پینٹنگز کی نقلیں لگی ہوئی ہیں، جن پر نقل کرنے والے نے اپنا نام تک لکھ رکھا ہے۔ گل جی کے فن کی خاص چیز خطاطی ہے۔ انھوں نے ایک بہت عجیب و غریب مجسمہ بنا رکھا ہے، جس پر خطِ عربی کے قریب قریب ہر اسلوب میں قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان اسکو خرید کر پارلمان کی بلڈنگ میں یا صدارتی اقامت گاہ میں لگائے۔ گل جی خطِ نستعلیق کو ناقص سمجھتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ عربی کا خطِ نسخ تمام دوسرے اسلوبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فنکاری کا نمونہ ہے۔

سنگِ میل نے میری جرمن افسانوں کے تراجم کی کتاب (''آدمی جس نے اپنے آپ کو بھلا دیا ــــ جرمن کہانیاں'') چھاپی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے ان کے پاس لاہور جانا تھا، مگر اس کتاب سے زیادہ اہم کام مجھے ان سے یہ تھا کہ میری اطلاع کے مطابق انھوں نے میرے دادا مولوی محمد فضل خان کا کیا ہوا ''فتوحاتِ مکیہ'' کا ترجمہ چھاپنے کے بعد تلف کر دیا تھا۔ میں اس کی وجوہات جاننی چاہتا تھا۔ نیاز احمد نے بتایا کہ انھوں نے کتاب مولویوں اور وکیلوں سے پڑھوائی تھی۔ سب نے کہا کہ اس کی اشاعت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا اس کے پیچھے یہ بات کارگر تھی کہ دادا جان ایک زمانے میں احمدی ہوا کرتے تھے۔ کیا انھیں اس بات کا پہلے سے علم نہیں تھا؟ انھوں نے کہا وہ اس چیز سے خوب واقف تھے اور اسی لیے انھوں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ربوہ کی خلافت لائبریری سے منگوایا تھا۔ پھر جب ان کو ڈرایا گیا کہ تمھاری دکان کو آگ لگا دی جائے گی، تو انھوں نے پورا ایڈیشن مشین سے کٹوا دیا تھا۔ وہ مجھے کتاب اس لیے نہیں دکھا سکتے تھے، کیونکہ انھوں نے اس کا ایک بھی نسخہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ جب اس سے اگلے روز اشفاق احمد سے میری بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ نیاز احمد نے ان کو ''فتوحاتِ مکیہ'' کا ایک نسخہ پیش کیا تھا، جو ان کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے یہ کتاب ان کے گھر پر جا کر دیکھی۔ ان کو کتاب کی تلفی کا رنج تھا، تاہم انھوں نے مجھے نہیں بتایا کہ انھوں نے نیاز احمد کو کیا مشورہ دیا تھا، کیونکہ وہ بھی سنگِ میل کے صلاح کاروں میں سے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا میں کتاب کسی دوسرے پبلشر کو دے رہا ہوں اور کیا میں ''فتوحاتِ مکیہ'' کے باقی ماندہ حصوں کا ترجمہ بھی چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ایک پبلشر (المعارف، لاہور) سے بات ہوئی تو وہ فوراً کتاب کو چھاپنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے اس مضمون کا خط حاصل کر کے کتاب میں شامل کر دیا کہ دادا جان نے وفات سے قبل جماعتِ احمدیہ کو چھوڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ میں نے کتاب کے لیے ایک پیش لفظ لکھ کر دیا تھا جس کو نئے ایڈیشن

کے شروع میں رکھا جانا تھا، مگر پبلشر نے میرے لکھے ہوئے پیش لفظ کی بجائے اس کا چربہ بنا کر اپنے نام سے چھاپ دیا۔ اس کی دکان کو کسی نے آگ نہیں لگائی۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ پاکستان میں تنگ نظری اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ایک احمدی کا کیا ہوا ترجمہ بھی نہیں چھاپا جا سکتا، خواہ وہ کتاب ابنِ عربی کی ''فتوحاتِ مکیہ'' ہی کیوں نہ ہو۔

میں ایک کتاب (حدیثِ یاراں) کا مسودہ اپنے ساتھ لایا تھا، جو میری اور سید احمد سعید ہمدانی کی مراسلت پر مشتمل ہے۔ مطبوعات دستاویز، لاہور کے سلیم اشرف نے کہا کہ وہ کتاب کو ایک ماہ کے اندر چھاپ دیں گے۔ اس کی شرط صرف یہ تھی کہ میں اس سے دو صد کتابیں نصف قیمت کے عوض خرید لوں اور اس رقم کی ادائیگی پیشگی کر دوں۔ ہمارا اس بارے میں تحریری معاہدہ ہوا۔ میں نے اپنی سادہ لوحی میں اس کی مطلوبہ رقم (اکیس ہزار روپے) نقد ادا کر دی اور کتاب کا مسودہ اس کے سپرد کیا جو کمپوٹر سے کمپوز شدہ تھا۔ موصوف نے یہ کتاب آج تک نہیں چھاپی اور نہ ہی میری رقم واپس کی ہے۔ جب بھی میں اس بارے میں پوچھتا ہوں جواب ملتا ہے کہ کتاب پریس میں ہے اور بس کسی بھی دن آنے والی ہے۔ اب اس بات کو دس برس گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں یہ کتاب دہلی سے معیار پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

ایران کا دوسرا سفر

جون ۱۹۹۶ء کے آخری ہفتے میں ایران کے سفارت خانے کا بون سے فون یہ بتانے کے لیے آیا کہ تہران میں ایک بین الاقوامی کانفرنس افغانستان کے بارے میں ہو رہی ہے، جس میں مجھے وزارتِ خارجہ کی طرف سے شرکت کی دعوت آئی ہے۔ کانفرنس اگلے ہفتے ہو رہی تھی۔ عام طور سے بین الاقوامی کانفرنسوں کے انعقاد کا اعلان مہینوں پہلے کر دیا جاتا ہے تاکہ اس میں شامل ہونے والے اپنے پروگرام میں سے اس کے لیے وقت نکال سکیں اور اپنا پیش کیا جانے والا مقالہ تیار کر لیں مگر معلوم ہوتا تھا کہ انقلابی ایران میں بدستور ہنگامی صورتِ حال طاری تھی۔ اس سے چند برس پہلے تہران میں علامہ اقبال پر ایک سیمینار منعقد کیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا اور اس میں حصہ لینے کے خواہشمندوں کو اپنے مقالے بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے علامہ اقبال کے سیاسی فلسفے پر ایک مقالہ لکھ کر بھیج دیا، اور شاید یہی میری غلطی تھی، کیونکہ مجھے شمولیت کا دعوت نامہ جاری نہ کیا گیا۔ اس کے پیچھے کیا راز تھا، اس کا پتا تب

چلا جب کانفرنس میں میرا مقالہ وزیرِ خارجہ ڈاکٹر اکبر ولایتی نے اپنے نام سے پڑھ کر سنایا۔ سمینار میں پیش کیے جانے والے تمام مقالے بعد میں ''تہران ٹائمز'' میں چھاپے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولایتی کا مقالہ حرف بہ حرف وہی تھا، جو میں نے لکھ کر بھیجا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو اس بات کا علم نہیں ہوگا اور انھوں نے گمان کیا ہوگا کہ وزارتِ خارجہ کے کسی ریسرچ اسکالر نے ان کے لیے مقالہ تیار کیا تھا۔

مجھے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ نہ بھیجنے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب برپا ہونے پر جہاں پر میں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا وہاں پر اپنے مضمونوں اور ٹیلی ویژن کے متعدد انٹرویوز میں کہا تھا کہ انقلابیوں کی بہت سی باتیں اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہیں۔ پھر جب امام خمینی نے ''شیطانی آیات'' لکھنے پر سلمان رشدی کے قتل کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ اس فتوے نے مسلمانوں کو مدعی ہونے کی بجائے مدعا علیہ بنا دیا تھا اور سلمان رشدی کی بجائے اسلامی دنیا کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے بعد جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مجھے قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں، جن کے پیچھے شاید ایران کی خفیہ پولیس کا ہاتھ تھا۔ اس وجہ سے ایک عرصہ تک ایرانی سفارت کاروں کے ساتھ میرا رابطہ نہ رہا لیکن جب جرمنی اور ایران کے درمیان انسانی حقوق اور جمہوریت کے بارے میں مکالمہ شروع ہوا، تو میں نے اس میں جرمن وفد کے ممبر کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایران کی قیادت میں ایسے روشن خیال لوگ موجود ہیں، جن کے ساتھ مثبت رنگ میں مکالمہ ممکن ہے۔ اس لیے جب سفارت خانے کا فون آیا تو میں نے کانفرنس میں شرکت کی ہامی بھری اور شرط لگائی کہ مجھے ملک کے اہم شہروں کی زیارت کی اجازت دی جائے گی۔

میں چھبیس برسوں کے بعد ایران جا رہا تھا۔ ہمبرگ سے مجھے جو کنکشن ملا وہ ایسا تھا کہ میرے فرینکفرٹ پہنچنے اور آگے تہران کے لیے پرواز میں ساڑھے تین گھنٹوں کا وقفہ تھا۔ میں اس خیال میں غلطاں تھا کہ اس قدر وقت وہاں پر ہوائی اڈے پر کیسے بیکار کاٹوں گا۔ اتفاقی طور پر ہماری ہمبرگ سے روانگی میں کچھ رخنہ پڑ گیا، کیونکہ جب پائلٹ نے انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے کمپیوٹر پر جہاز کے سارے فنکشن چیک کیے، تو پہیوں کے نظام میں خرابی نکل آئی۔ پائلٹ نے مناسب چھان بین کے لیے ٹیکنیشنوں کو بلا لیا۔ اس معاملے میں گھنٹہ بھر لگ گیا، تاہم خرابی کا مداوا ہو گیا۔ میں دل میں خوش ہوا کہ فرینکفرٹ کی فرودگاہ پر انتظار کا ایک گھنٹہ کم ہو گیا۔ ہمبرگ سے پرواز کرنے پر کیپٹن نے مسافروں کو خوش آمدید کہا اور بتایا کہ ہمارے ساتھ ایک برات جا رہی ہے، جسے فرینکفرٹ سے آگے اٹلی کے شہر نیپل جانا ہے، جہاں پر دولہا برات کا استقبال کرے گا اور انھیں پوزیٹانو لے جائے گا۔ اس نے کہا دلہن کے لیے اب بھی ایک موقع موجود ہے کہ اگر اس کا دل نہیں مانتا تو وہ فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر اتر سکتی ہے۔

اس نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی، مگر معاملہ سچ مچ بگڑتا جا رہا تھا، کیونکہ جب ہمارا طیارہ فرینکفرٹ کے اوپر پہنچا تو وہاں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور اولے پڑ رہے تھے۔ ہمارے طیارے کو کولون کے ہوائی اڈے پر اترنے کی ہدایت کی گئی، جو وہاں سے دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں پر پہنچنے اور پٹرول بھرنے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ میں بدستور اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ سب کچھ میرے انتظار کی گھڑیوں کو مختصر کرنے کے لیے ہو رہا تھا اور میں تہران والی پرواز سے قبل فرینکفرٹ پہنچ جاؤں گا، مگر جب بالآخر ہمارا طیارہ فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر اترا تو ایران ایئر کو روانہ ہوئے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ مجھے پتا نہیں کہ براتیوں نے اس لمحے میں کیا سوچا، کیونکہ ان کے رابطے کی پرواز بھی جا چکی تھی۔ میں نے تہران کانفرنس میں اپنی شمولیت کے امکانات کا ختم ہونا باور کر لیا۔

فرینکفرٹ سے ایران ایئر کی اگلی پرواز دو روز کے بعد تھی، جس میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ البتہ ایک روز پہلے ایک پرواز ہمبرگ سے جا رہی تھی، مگر اس میں بھی سیٹ ملنے کا امکان نہیں تھا۔ لفت ہانزا نے مجھے ہمبرگ واپس جانے کے لیے ٹکٹ دے دیا، کیونکہ ان کی پرواز کے لیٹ ہونے کی وجہ سے میں تہران کا طیارہ نہ لے سکا تھا۔ اب معاملہ میرے سوٹ کیس کا تھا، جو ہمبرگ سے تہران کے لیے بک ہو چکا تھا۔ اس کو فرینکفرٹ میں روکنے کے لیے متعلقہ عملے کو ہدایت کر دی گئی۔ مجھے کہا گیا کہ سوٹ کیس ہمبرگ بھیج دیا جائے گا، لیکن جب میں وہاں پر پہنچا تو سوٹ کیس موجود نہیں تھا۔ لفت ہانزا کی اگلی پرواز تین گھنٹوں کے بعد آنی تھی، جس میں سوٹ کیس آ سکتا تھا اس لیے یہ طے پایا کہ سوٹ کیس کو ہوائی اڈے پر روک لیا جائے گا اور میں اسے اگلے روز وہاں سے وصول کروں گا۔ میں نے ابھی پوری طرح شکست قبول نہیں کی تھی اور چاہتا تھا کہ اگلے روز والی پرواز میں سیٹ حاصل کروں۔

اس شام تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا، مگر دوسرے روز میں نے سویرے سویرے ایران کے قونصل جنرل کے نام فون پر یہ پیغام چھوڑا کہ مجھے سیٹ حاصل کرنے کے لیے ان کی سفارش درکار ہو گی۔ پتا چلا کہ جو کچھ میرے ساتھ بیتی تھی اس کا شکار ایران کا ایک سرکاری وفد بھی بنا تھا، جس میں وزارت کے سیکرٹری اور دوسرے اعلیٰ افسران شامل تھے، اس لیے اگر سیٹیں خالی ہوئیں تو پہلے ان کو دی جائیں گی۔ میں نے کہا پھر تو مجھے ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں قونصل جنرل کا فون آ گیا کہ چونکہ میں جرمنی کا واحد نمائندہ ہوں، اس لیے کانفرنس میں میری شمولیت بہت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر میرے لیے سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ میں نے ہوائی اڈے جانے کا ارادہ باندھ لیا، جہاں پر مجھے امید تھی کہ میرا سوٹ کیس روک لیا گیا ہو گا۔ عین اس وقت، جب میں گھر سے نکل رہا تھا، لفت ہانزا کی گاڑی سوٹ کیس لے کر آ گئی۔ اگر اسے پہنچنے میں دو منٹ کی دیر ہو جاتی، تو میں روانہ ہو

چکا ہوتا اور واضح ہے کہ سوٹ کیس کے بغیر سفر جاری نہ رکھ سکتا۔

ہوائی اڈے پر قونصل جنرل خلیلی خود پہنچے ہوے تھے۔ پتا چلا کہ انھوں نے چھ برس تک کراچی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور اردو اچھی خاصی جانتے تھے۔ میرے لیے سیٹ کا انتظام ہو گیا تھا۔ گویا میرا ایران کا سفر چوبیس گھنٹوں کی تاخیر سے شروع ہو رہا تھا۔ انھوں نے تہران کی بہت تعریف کی۔ پھر جب سنا کہ میں اس کے علاوہ قم، شیراز، اصفہان اور مشہد بھی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو بہت خوش ہوے۔ انھوں نے کہا یہی شہر ایران کی اصل پہچان ہیں۔ منتظمینِ کانفرنس کو تہران میں میری آمد کے اوقات کی اطلاع دینا اب قونصل خانے کی ذمے داری تھی، مگر جب میں تہران کے ہوائی اڈے پر اترا، تو کوئی مجھے لینے کے لیے نہیں آیا ہوا تھا۔ اطلاعات کی ڈیسک کو سرے سے کانفرنس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کہا گیا کہ رات آپ ''آزادی ہوٹل'' میں گزاریں اور اگلے روز منتظمینِ کانفرنس سے رابطہ کریں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو، جس نے مجھے ہوائی اڈے کے اندر ہی دبوچ لیا تھا، مجھے اس ہوٹل میں لے چلنے کو کہا۔ اس نے کہا کیوں اتنے مہنگے ہوٹل میں جانا چاہتے ہو، جہاں پر ایک رات کے لیے تمھیں ڈیڑھ سو ڈالر دینے پڑیں گے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمھیں درمیانے درجہ کے ایک نئے ہوٹل میں لے چلتا ہوں، جو صفائی ستھرائی میں کسی بھی مہنگے ہوٹل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس طرح میں ''قارون ہوٹل'' میں پہنچ گیا، جس کا ایک رات کا کرایہ ساٹھ ڈالر تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور دراصل فرودگاہِ تہران کا ملازم تھا۔ دن بھر وہاں پر کام کرنے کے بعد وہ راتوں کو ٹیکسی چلاتا تھا۔ اس نے کہا نوکری سے اس کی آمدنی اتنی تھوڑی ہے کہ وہ اس سے اپنے آٹھ بچوں کو نہیں پال سکتا۔ مگر اس دن رات کی دوہری ڈیوٹی نے اس کو تھکا دیا تھا۔ عرصہ ہوا اسے کبھی رات بھر اطمینان سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ جب سے اسلامی انقلاب آیا ہے غریب لوگوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ لوگوں کو روٹی اور دوسری بنیادی ضرورت کا سامان راشن پر ملتا ہے۔ حکومت اپنے خرچ پر ان کو سستا مال دیتی ہے ورنہ لوگ دو وقت کی روٹی نہ کھا سکیں۔ اس نے کہا امام خمینی نیک اور سمجھ دار آدمی تھے مگر ان کے جانشین گدھے ہیں، جن کو حکومت چلانی نہیں آتی۔

جب میں ہوٹل میں پہنچا تو ٹیلی ویژن پر یورپین فٹ بال چمپین شپ کا فائنل میچ دکھایا جا رہا تھا، جو جرمنی اور چیکوسلاویہ کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ البتہ فلم نصف گھنٹے کی تاخیر سے دکھائی جا رہی تھی، جس میں سے سارے ایسے سین، جن میں فٹ بال اسٹیڈیم میں یورپین لباس میں ملبوس عورتیں دکھائی دیتی تھیں، کاٹ دیے گئے تھے۔ میں بھی ناظرین میں شامل ہو گیا اور حسبِ عادت میری ہمدردی کمزور ٹیم کے ساتھ تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ چیک، جو ایک چھوٹی سی قوم ہے، فٹ بال میں جرمنی کو ہرا دے۔ اس سے جرمنی کا کچھ نہیں جائے گا، مگر چیک قوم کا سر بلند ہو جائے گا۔ میں نے جلد ہی محسوس کیا

کہ حاضرین میں میرے سوا باقی سب لوگ جرمن ٹیم کے حامی تھے۔ ہوائی جہاز میں میرے ساتھ ایک ایرانی فیملی بیٹھی ہوئی تھی، جو اسلامی انقلاب آنے پر ملک سے ہجرت کر گئی تھی۔ ان کے بڑے بیٹے نے کہا کہ وہ جرمن ٹیم کی کامیابی کا خواہش مند ہے۔ میں نے کہا کہ چیک جیت جائیں تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایرانیوں میں جرمن قوم کے لیے خیر سگالی کے بے پایاں جذبات پائے جاتے ہیں، جس کا قدم قدم پر مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کو ایران کی تہذیب اور زبان سے متعارف کرانے کے لیے دو برسوں تک جا کر تہران میں رہی تھی۔ اس کا خاوند پندرہ برسوں سے واپس نہیں گیا۔

افغانستان کے سیمینار میں شمولیت کے لیے سوائے طالبان کے باقی سب مجاہدین کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دس بارہ ملکوں کی طرف سے وفد بھیجے گئے تھے، جن میں خاص طور پر چین، ہندوستان اور پاکستان شامل تھے۔ پاکستان کا وفد اچھا خاصا تھا۔ یورپ سے جرمنی کے علاوہ صرف فرانس کا نمائندہ آیا تھا۔ البتہ متعدد ممالک کے سفیر اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ سیمناریوں تو افغانستان کے بارے میں تھا مگر اصل مقصد پاکستان پر تنقید کرنا تھا۔ پاکستانی وفد کے لیڈر ریٹائرڈ بریگیڈیر سردار احمد تھے، جو ایک زمانے میں جرمنی میں پاکستانی سفارت خانے میں نائب سفیر رہ چکے تھے۔ انھوں نے ایرانیوں سے سوال کیا کہ آج تم پاکستان پر اعتراض کرتے ہو اور افغانیوں کے دوست بنے ہوئے ہو، تم اس وقت کہاں تھے جب روس نے کابل میں فوجیں بھیجی تھیں اور پاکستان نے افغانیوں کے جہاد کو ممکن بنایا تھا۔ ہندوستان کی نمائندگی ڈاکٹر ڈیکسٹ **(Dixit)**، جو پاکستان میں سفیر رہ چکے تھے، کی بیٹی کر رہی تھی۔ افغان مجاہدین نے خاص طور پر پاکستان کے خلاف بیانات دیے۔ البتہ مولوی دین محمد نے، جو جلال آباد کے گورنر حاجی قدیر کے بڑے بھائی ہیں، اجلاس میں تو نہیں مگر علیحدگی میں میرے سامنے پاکستان کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ کانفرنس اسلام آباد میں ہوتی، تو یہی مجاہدین وہاں پر پاکستان کے حق میں بولتے کیونکہ یہ سب اس ملک کے وظیفہ خور ہیں۔

جب میں ۱۹۷۲ء میں تہران آیا تھا اس وقت اس کی آبادی دو ملین تھی۔ اب بارہ ملین ہو چکی تھی۔ شہر کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ ٹریفک اس قدر ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ سڑک پار نہیں کر سکتا۔ شہر کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملانے والی تیز رفتار سڑکوں کے سبب ان کے درمیان رابطہ آسان ہو گیا ہے۔ یوں تو عورتوں کو چادر میں لپیٹ کر پنگوین بنا دیا گیا ہے، مگر ان پر ڈرائیونگ کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں۔ سر کے بالوں کو ڈھانپنے کے لیے اسکارف کا استعمال لازمی ہے۔ البتہ نئے فیشن کے اسکارف دیکھنے میں آئے جو بہت خوبصورت تھے۔ ظلم کی حد تو یہ تھی کہ عورتوں

کوسارا سال گرمیوں اور سردیوں میں اوورکوٹ پہننا پڑتا تھا۔ غیر ملکی عورتوں کو بھی یہ لباس پہننا ہوتا تھا۔ سمینار میں چین کی نمائندہ وانگ ہونگ (Wang Hong) چوتھے روز واپس چلی گئی، کیونکہ اس کو یہ لباس پہننا بہت دشوار لگا۔ دیواروں پر یہ سلوگن دیکھنے میں آیا: ''مردانِ با غیرت زنانِ با حجاب دارند'' (غیرت مند مردوں کی عورتیں حجاب پہنتی ہیں)۔ ایک دکان میں لکھا تھا: ''رعایتِ لباسِ اسلامی در ایں مکان التزامی است'' (اس جگہ پر اسلامی لباس کا پہننا ضروری ہے)۔ کسی نے التزامی کی ت کے نقطے مٹا دیے تھے جس کے سبب ''الزامی'' باقی رہ گیا تھا۔ میں نے دکاندار سے پوچھا کہ کیا یہ بورڈ اس نے اپنی مرضی سے لگا رکھا ہے۔ اس نے کہا۔ خدا کا خوف کرو۔ اگر مجھے حکم نہ دیا گیا ہوتا تو یہ بورڈ کبھی نہ لگایا جاتا۔ پاسداران کے لونڈے آکر دیکھتے ہیں کہ کیا دکان میں عورتیں پردہ کرتی ہیں یا نہیں۔ میں ایران کی عورتوں کے پردے کا رونا رو رہا ہوں، جب کہ شیراز کے ہوائی اڈے پر کسی خلیجی ملک کا ایک خاندان نظر آیا، جسکی عورتوں نے کامل حجاب کر رکھا تھا، اس طرح کہ ان کی آنکھوں کے سامنے بھی پردہ تھا، جس میں کوئی سوراخ یا جالی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ان کے مقابلے میں ایران کی عورتوں کو اپنا چہرہ نہیں ڈھانپنا پڑتا۔

میں سمینار کے خاتمے پر سب سے پہلے قم گیا، جو ایران میں علومِ دینی کا اہم ترین مرکز ہے۔ آدھے راستے میں امام خمینی کا مزار (حرمِ مطہر) ہے، جو اس زمانے میں ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ وہاں جانے والی سڑک پر جگہ جگہ سلوگن لکھے ہوئے تھے، جو مجھے بہت دلچسپ لگے: مثلاً ''اے خدا امام مہدی کی آمد تک امام خمینی کے انقلاب کی حفاظت فرما۔'' دوسری جگہ امام خمینی کا ارشاد لکھا ہوا تھا: ''اسلامی فوج میری آنکھ کا تارا ہے۔'' ایک مشہور حدیث (**اللہ جمیل و یحب الجمال**) کا ایرانی ترجمہ ملاحظہ ہو: ''خداوند زیبا است زیبائی دوست دارد۔'' پھر یہ سلوگن مجھے بہت اچھا لگا: ''عالم صدف است فاطمہؑ گوہرِ او'' (دنیا سیپی ہے فاطمہؑ اس کا موتی ہے)۔ امام خمینی کی قبر کے گرد جنگلا لگا دیا گیا ہے، جس کے سبب لوگ جنگلے کی جالی کو پکڑ کر روتے، اسے آنکھوں سے لگاتے، چومتے اور آہ وزاری کرتے ہیں اور جالی کے اندر کرنسی نوٹ ڈالتے ہیں، جو لاکھوں کی مالیت کے ہوں گے۔ باہر جاتے ہوئے لوگ قبر کی طرف پیٹھ نہیں پھیرتے۔ ایک چیز میں نے یہ نوٹ کی کہ ایرانی ہماری طرح ہاتھ اٹھا کر مرحومین کے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ لوحِ قبر پر ہاتھ رکھ کر یا انگلی ٹکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے وہ مسنون دعائیں پڑھتے ہیں یا تسبیح پھیرنے والوں کی طرح، جو عام طور سے محض دانوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، وہ بھی خاموشی کے ساتھ صاحبِ قبر سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی قبرستان میں جنگ میں مارے جانے والوں کو دفن کیا گیا تھا۔ ایک طرف فوارہ لگا ہوا تھا، جس میں سے سرخ پانی خون کی طرح ابل کر نکلتا تھا۔ میں نے بعد میں سنا تھا کہ لوگ اس فوارے کے خونی پانی کو تبرک کے طور پر پینے لگ گئے تھے، اس لیے فوارے کو بند کر دیا گیا

تھا۔ حرم کے اندر لوگ نماز پڑھ رہے تھے، عورتیں سینہ کوٹ رہی تھیں، دوسری طرف بعض لوگ لیٹے ہوئے تھے، شاید سو رہے تھے۔ میرا ڈرائیور ایران کی اسلامی حکومت کا سخت مخالف تھا۔ وہ میرے ساتھ حرم میں نہیں گیا۔ اسکا کہنا تھا کہ اگر اسکا باپ وہاں پر دفن نہ ہوتا، تو وہ کبھی وہاں پر نہ جاتا۔ جب سے خمینی کو وہاں پر دفنایا گیا تھا، اس جیسے بہت سے لوگوں نے اس قبرستان سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ دوسری طرف میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ امام خمینی کے حامیوں کا ایک نہ رکنے والا ریلا اس قبرستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

قم میں حوضہ علمیہ کا مدرسہ ''دارالشفاء'' دیکھا، جہاں پر امام خمینی پڑھاتے رہے تھے۔ اس کی عمارت بہت لمبی چوڑی ہے۔ پہلا صحن، دوسرا صحن، تیسرا صحن۔ چاروں طرف کلاس روم اور دوسرے کمرے ہیں۔ اوپر طالب علموں اور استادوں کی رہائش گاہیں۔ سب کے سب ایر کنڈیشنڈ۔ صحن میں پھولوں کی کیاریاں اور باغیچہ، جس کی دیکھ بھال کا اچھا انتظام تھا۔ ایسے مدرسے قم میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہی بخارا والا ماحول دیکھنے میں آیا، جہاں پر شاذو نادر کوئی مدرسہ اکیلا دکیلا کھڑا نظر آتا ہے۔ ایک طالب علم نے بتایا کہ لوگ مرجعِ تقلید (شیعہ علماء میں سب سے اونچا درجہ) کو خمس ادا کرتے ہیں، جس میں سے طالب علموں کو ایک مقررہ رقم دی جاتی ہے۔ عام طور سے طالب علم ہر ماہ مختلف مراجعِ تقلید کے دفتروں میں جا کر اپنے حصے کی رقم وصول کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے گزارے کے لیے اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر مرجعِ تقلید کے شاگرد بھی ہوں۔

اب میری منزل شیراز تھی، جو تہران سے نوصد کلومیٹر جنوب کی طرف صوبہ فارس میں ہے، جس کا درست تلفظ دراصل پارس ہے، مگر چونکہ عربی حروفِ تہجی میں پ کا حرف نہیں پایا جاتا اس لیے عرب اس کی جگہ ف استعمال کرتے ہیں۔ گویا اس صوبے نے ملک کو فارس کا نام دیا تھا، جو ساری دنیا میں جانا جانے لگا۔ شیراز ایک قدرتی جھیل ماہرلو کے پہلو میں آباد ہے۔ ہوائی اڈے سے شہر کی طرف جانے والی سڑک کے دونوں طرف بیس بائیس کلومیٹر تک گلاب کے پودوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں، جن کے رنگ برنگے پھول اور ان کی انسان کو متوالا بنا دینے والی خوشبو ایک نہ مٹنے والا تاثر چھوڑتے ہیں۔ شیراز سعدیؒ اور حافظؒ کا وطن ہے، جن کی مقبولیت کا عکس اس شہر پر بھی پڑتا ہے۔ دونوں کے مقبرے، جو بجائے خود باغات ہیں، خلقِ عام کے لیے مقناطیس کی طرح ہیں، جس کے سبب وہاں پر زائرین کا ایک نہ ٹوٹنے والا ریلا لگا رہتا ہے۔ حافظؒ کا دیوان ایک طرف رکھا ہے، جس کو کھول کر لوگ فال نکالتے ہیں۔ مزار کے پہلو میں باغ کے اندر ایک چائے خانہ ہے، جس کی دیوار میں بھی جگہ جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے اطاق بنے ہوئے ہیں جن میں لوگ بیٹھتے بلکہ پاؤں پسار کر لیٹتے اور حقہ پیتے ہیں۔ یوں بھی شیراز باغوں کا شہر ہے،

جو شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوے ہیں۔ شام کے وقت وہاں پر خوب رونق ہوتی ہے۔

آٹھویں شیعہ امام حضرت امام رضاؑ کے بھائی حضرت سید امیر احمدؒ، جن کو لوگوں نے ''شاہ چراغ'' کا لقب دے رکھا ہے، کا مزار شیراز میں ہے، جہاں پر دن رات زائرین کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ میں وہاں پر جانا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے سمت دکھائی اور کہا کہ کسی بھی اجتماعی ٹیکسی (دولموش) میں بیٹھ جاؤ، جو اس طرف جاتی ہے۔ ڈرائیور کو میں نے اپنی منزل بتائی تو پتا چلا کہ ''مزار شاہ چراغ'' اس کے روٹ پر نہیں ہے، مگر اس نے کہا میں تمھیں وہاں پر چھوڑ آؤں گا۔ تم ہمارے مہمان ہو اس لیے میں تم سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ وہاں پر زائرین ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ یہاں پر بھی مقبرہ مسجد کے اندر ہی ہے۔ پوری بلڈنگ پر شیشے کا کام کیا گیا ہے۔ ساری دیواریں اور چھتیں شیشہ کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ شاہ چراغ کی قبر کی چار دیواری کے اندر یہاں پر بھی زائرین کرنسی نوٹ ڈالتے ہیں، جن کا ایک ڈیڑھ فٹ اونچا ڈھیر چاروں دیواروں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ دروازے چاندی کے ہیں اور ان پر قرآنی آیات اور دعائیہ عبارات کندہ ہیں۔ باہر کی طرف کھلنے والے دروازے لکڑی کی کشیدہ کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ دیواروں پر ٹائلیں لگی ہوئی ہیں، جنکے نقش و نگار اس قدر تازہ اور جن کا رنگ ایسا چمکدار ہے، جیسے ابھی حال میں ہی لگائی گئی ہوں، جبکہ وہ صدیوں پرانی ہیں۔ یہاں پر زائرین جس رقت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں وہ ناقابلِ بیان ہے۔ مسجد میں داخل ہونے والے دروازے کے پہلو میں ایک چھابے میں کوفے کی مٹی کی ٹکیاں رکھی ہوئی تھیں، جن پر شیعہ مسلمان سجدہ کرتے ہیں۔ لوگ انکو استعمال کرنے کے بعد مسجد سے باہر جاتے ہوے واپس چھابے میں ڈال دیتے ہیں۔

اس شہر کی جامع مسجد (مسجد عتیق)، جو ۸۹۴ء میں تعمیر ہوئی تھی، اس اعتبار سے بے مثال ہے کہ اس کے صحن میں چودھویں صدی کا تعمیر شدہ ''خدا خانہ'' بنا ہوا ہے، جو خانہ کعبہ کی نقل ہے، مگر شاید پہلے مجوسیوں کا آتش کدہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے گرد طواف بھی ہوتا تھا۔ اب اس میں قرآن رکھے جاتے ہیں۔ شیراز میں ایک ہزار سالہ ''قرآن گیٹ'' پایا جاتا ہے۔ شمال کی طرف سے آنے والا ٹریفک آج بھی اس میں سے گزرتا ہے۔ اس میں بھی قرآن کا ایک قدیمی نسخہ بطور تبرک رکھا ہوا ہے، جس کے نیچے سے گزرنے والوں کو سفر و حضر میں حفاظت کی امید دلائی جاتی ہے۔ وہاں ہی نہیں مسجدوں میں محراب کے اوپر ایک طاقچے میں قرآن بطور تبرک رکھا ہوتا ہے، جو عام طور سے تلاوت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ چیز میں نے پہلی بار ایران میں دیکھی کہ مسجد میں اس جگہ کی سطح، جہاں پر امام الصلوٰۃ کا مصلیٰ بچھایا جاتا ہے اور جس پر کھڑا ہو کر وہ نماز پڑھاتا ہے، ایک قبر کی طرح گہری ہوتی ہے۔ اس کو حالتِ تواضع کا نام دیا جاتا ہے۔ جب کبھی میں ٹیلی ویژن میں دیکھا کرتا تھا کہ امام ایک ایسی قبر میں کھڑا ہو کر

نماز کی امامت کرتا ہے، تو میں گمان کیا کرتا تھا کہ یہ چیز انقلابی اماموں کی ذاتی حفاظت کے لیے اختیار کی جاتی ہے، مگر زمانہ قدیم کی ایرانی مسجدوں میں اس قبر کو دیکھ کر مجھے ماننا پڑا کہ اس چیز کا تعلق ایک خاص نقطۂ فکر سے ہے اور وہ ہمارے وقتوں کی ایجاد نہیں۔

شیراز سے شمال مشرق کی طرف ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدیم ایرانی اخمینی بادشاہوں کا گرمائی دارالسلطنت تختِ جمشید واقع ہے جس کو یونانیوں نے Persepolis (فارس کا صدر مقام) کا نام دیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ اس مقام کا ذکر کسی غیر ملکی تاریخی کتاب یا یادداشت میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ فردوسی نے بھی اس کو شاہنامے میں شامل نہیں کیا۔ البتہ یہ چیز ثابت ہے کہ اسکندرِ اعظم نے فارسیوں کی طاقت کو توڑنے کے لیے اس مقام پر پائے جانے والے محلات کو ۳۳۱ قبل مسیح میں نذرِ آتش کر دیا تھا۔ باقی ماندہ کھنڈرات بتاتے ہیں کہ اس جگہ پر عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں شاہِ ایران رضا پہلوی نے وہاں پر بادشاہت کا اڑھائی ہزارواں جشن منایا تھا اور خود اپنے سر پر تاج رکھ کر شاہنشاہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس چیز میں کوئی شبہ نہیں کہ تختِ جمشید بنانے والا شاہنشاہ دارائے اعظم میلادِ عیسیٰؑ سے پانچ سو سال قبل دنیا کی سب سے بڑی مملکت کا فرمانروا تھا۔ ایوانِ عام کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی دیواروں پر سلطنت کے انتیس ماتحت ملکوں کے نمائندے دیکھے جا سکتے ہیں، جو نوروز (جشنِ سالِ نو) کے موقعے پر تحفے تحائف پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ آرٹسٹوں نے ہر ملک کے باسیوں کے مخصوص لباس یا دوسری چیزوں کے ذریعے ان کی نشاندہی کر دی ہے۔ ہندوستان سے آنے والے ایلچی دھوتیاں باندھے ہوئے ہیں۔ ایک نے بھانڈوں سے بھری ہوئی ٹوکری، دوسروں نے دو پھلوں والی کلہاڑیاں اٹھائی ہوئی ہیں اور ایک گدھا اپنے ساتھ لائے ہیں۔

مرودشت سطح مرتفع میں کوہِ رحمت کے پہلو میں واقع تختِ جمشید دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی تکمیل پر ڈیڑھ صدیاں لگ گئی تھیں، مگر عمارتوں اور ایوانوں کی ہم رنگی ایسی ہے جیسے وہ ایک ہی سانچے سے ڈھل کر نکلی ہوں۔ کل چار مختلف سطحیں بنائی گئی تھیں۔ اس طرح کہ ہر سطح پہلی سے دو میٹر اونچی تھی۔ داخل ہونے کے بعد پہلی سطح زیر شدہ قوموں کے نمائندوں کے لیے مخصوص تھی۔ امرائے سلطنت کے لیے دوسری سطح مخصوص تھی۔ جب کہ محلات کے اسٹور وغیرہ سب سے نچلی سطح پر تھے۔ سب سے اوپر شاہی خاندان کی سطح تھی، جہاں سے انسان ہر طرف دیکھ سکتا ہے۔ داخلے کی سیڑھیاں سات میٹر چوڑی چٹانوں کو کاٹ کر اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ہر پتھر کے پانچ قدمچے بنتے تھے، جن پر سلطنت کے سالار گھوڑوں پر سواری کرتے ہوئے اقوام کے گیٹ تک چڑھ سکتے تھے۔ وہاں پر دائیں اور بائیں کھڑے بگل بجانے والے ان کی آمد کا اعلان کرتے تھے۔ شاہی کارندے ان کو ایک سو

ستونوں والے ایوان میں لے جا کر شاہنشاہ کے حضور پیش کرتے تھے۔محل سے باہر کوریڈور میں سنگی بنچ لگے ہوئے ہیں، جن پر شاید اپنی باری کے آنے کا انتظار کرنے والوں کو بٹھایا جاتا تھا۔اندرونی محل کی چھت ۳۶ ستونوں پر کھڑی تھی جو بیس میٹر اونچے تھے۔ان میں سے اب بھی تیرہ کھڑے ہیں۔چھت پر لکڑی کے شہتیر ڈالے گئے تھے، جو دروازوں اور کھڑکیوں سمیت جل کر راکھ ہو گئے تھے۔کوریڈوروں کے ستونوں کو ملا کر گنا جائے تو ان کی تعداد ایک سو بنتی ہے۔ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ یونانیوں کے برعکس، مصریوں کی طرح، فارسیوں نے دیواروں پر انسانوں اور جانوروں کی پلاسٹک بنائی ہیں مگر بت کہیں پر نظر نہیں آتے۔مینڈھے کے جڑواں سر جگہ جگہ موجود ہیں، جو شاید قوتِ بازو اور طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔قدیم دنیا میں فارس کی مملکت کا کوئی ہم پلّہ حریف موجود نہ تھا، اس لیے اسکندرِ اعظم چاہتا تھا کہ تختِ جمشید کی عمارتوں کو تباہ کر کے ان کی مملکت کے خاتمے کا اعلان کرے۔وہیں پر اس نے دارا کی بیٹی رخسانہ سے شادی کی تھی۔تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس کی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں اور افسروں کو اس چیز کی مخالفت کرنے کے سبب موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

واپسی کے راستے میں مجھے بادشاہوں کا مقبرہ دیکھنا تھا، جو وہاں سے دس کلومیٹر جنوب کی طرف شیراز کے راستے پر واقع ہے۔وہاں پر چار بادشاہوں کے لیے پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر قبریں بنائی گئی تھیں۔چنانچہ دارا اعظم نے اپنی زندگی میں اپنے لیے قبر تیار کرائی تھی۔یہ چیز اس نے مصر کو فتح کرنے پر دیکھی تھی کہ فرعون اپنے لیے خود قبریں بنواتے تھے۔اس نے بھی اپنی زندگی میں اپنے لیے قبر بنوائی، جس کی پیروی اس کے تین جانشینوں نے کی۔بادشاہ کو اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے، جس کے پیچھے درباری کھڑے ہیں۔تخت کو زیرِ قوموں کے سردار اپنے ہاتھوں اور کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ایک طرف مقدس آگ جل رہی ہے۔دارا کی قبر میں آہورا مزدا (پارسیوں کے خداوند) کی تعریف میں ایک عبارت کندہ ہے۔یہ چیز ثابت نہیں ہے کہ وہ فی الواقعی آتش پرست تھے۔قبروں کی چٹان کے سامنے پارسیوں کا ''کعبۂ زرتشت'' پایا جاتا ہے مگر یہ چیز بھی غیر یقینی ہے کیونکہ ایسی عمارتیں دوسری جگہوں پر بھی موجود ہیں۔ہوسکتا ہے اس عمارت میں بھی کسی بادشاہ کی قبر ہو۔اس کی ایک دیوار پر شاپور بادشاہ نے رومیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے اور رومی قیدیوں کے بدلے میں ملنے والے پانچ لاکھ سونے کے درہم کندہ کروائے تھے۔اس عمارت کا دوسرا نام ''زندانِ سلیمان'' بھی ہے، جس کی وجہ تسمیہ نامعلوم ہے۔شاہی مقبرے کو عوام ''نقشِ رستم'' کے نام سے جانتے ہیں، جس کی چٹان کو کاٹ کر آٹھ تصویریں ساسانی زمانے میں (تیسری اور چوتھی صدی عیسوی) بنائی گئی تھیں۔ان میں ایرانی بادشاہوں کو اپنی فتح مناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ''نقشِ

رجب'' پایا جاتا ہے جہاں پر شاہ پور بادشاہ کو آریا قوم کا فرمانروا دکھایا گیا ہے۔ اہم ترین وہ تصویر ہے جس میں ساسانی بادشاہوں کے پہلو میں معبدِ معبدیان (اعلیٰ ترین امام) کارتر دکھایا گیا ہے، جس نے ایران کو مانی مذہب سے پاک کیا تھا۔ یہاں پر بھی ''کعبۂ زرتشت'' سے ملتی جلتی عمارت موجود ہے۔

جب میں ''تختِ جمشید'' میں دارا اعظم کی قبر دیکھنے کے لیے گیا، تو وہاں پر ایک ایرانی خاندان بھی گھوم پھر رہا تھا۔ اس کے بچوں کو مجھ میں دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ میرے آگے پیچھے منڈلانے لگے۔ میرے سوا وہاں پر کوئی دوسرا غیر ملکی ٹورسٹ موجود نہیں تھا۔ ایران بدستور امریکی بائیکاٹ کے تحت باہر کی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ ایک آٹھ نو سالہ بچی نے جاننا چاہا کہ میں کہاں سے ہوں۔ میں نے پاکستان کا نام لیا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کہا ہمارا برادر ملک۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر کا ایک تراشا گیا ٹکڑا بطور تحفہ میری طرف بڑھا دیا جو اس کو وہاں پر ملا تھا۔ جب میں نے اس واقعے کا ذکر ایک خط میں آغا بابر سے کیا تو ان کو یہ بات بہت اچھی لگی، انھوں نے لکھا:

''وہ لڑکی چھوٹی سی جان ہمیں اچھی لگی۔ جس نے چمکداری اور وضع داری سے ہاتھ کا معمولی پتھر آپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ہاتھ میں اس پتھر کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ پتھر نہیں، منیر صاحب یہ نگینہ ہے۔ اس پر ایک شارٹ سٹوری بنتی ہے۔ بنا ڈالیے گا۔ ہاتھ آیا ہوا خیال ہے۔ یہ فانوسِ خیال اڑ نہ جائے۔ قابو میں کر لیجیے گا۔ یہی افسانہ ایران نے آپ کو سوغات میں دیا ہے، بلکہ ایران کی نئی پہچان (نئی نسل) نے دیا ہے، جو کل ایران کی مالک بنے گی۔ (اور پھر یاد رکھیے گا لڑکی نے دیا ہے، جو کل دخترِ ایران کہلائے گی۔) یہاں اس مقام پر آ کر بڈھے بڈھے ملاؤں کو بہت کچھ نئی روشنی کے تعلق سے تلقین کی جا سکتی ہے۔ چاہے سطور میں ہو چاہے بین السطور۔ یہ افسانہ ہاتھ آیا ہوا ہاتھ سے جانے نہ پائے۔''

میری اگلی منزل اصفہان تھی جس کو ایرانی ''نصف جہان'' کہتے ہیں۔ ہوائی اڈے پر پاکستانی نوجوانوں کے ایک گروپ سے ملنا ہوا جو زیارت کی غرض سے ایران آیا تھا۔ وہ لوگ ملتان کے رہنے والے تھے، جن کے سفر کے اخراجات ایک امیر زمیندار اٹھا رہا تھا۔ وہ خود سات برسوں میں دس بار ایران آ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اس گروپ میں بیڈمنٹن کی ٹیم کے بارہ کھلاڑی شامل ہیں۔ اگلا گروپ چالیس افراد پر مشتمل ہوگا۔ یہ لوگ جانباز تھے جن کو ''سپاہِ صحابہ'' کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں دونوں طرف سے قاتلانہ حملے جاری تھے اور بے شمار انسان اس بربریت کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے شہر کے بیچوں بیچ سے گزرنے والے دریائے زایندہ رود (ایرانی اسے دریا نہیں کہتے کیونکہ فارسی میں دریا کا لفظ جھیل کے لیے مختص ہے) کے ساحل پر پائے جانے والے ایک ہوٹل میں کمرہ ملا جس پر پاسداران کی انجمن نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو شاہ کے زمانے میں کسی ہوٹل میں داخل

ہونے کی جرات نہ ہوتی تھی۔امیراور دانش ور طبقے کے ہجرت کر جانے کے بعداب ملک پر ملاؤں اور کمیوں نے قبضہ جمار کھا تھا۔ پاسداران کی کارگزاری کا یہ حال تھا کہ میں ہوٹل سے جرمنی فون نہیں کرسکتا تھا کیونکہ متعلقہ اوپریٹر دو روز کی چھٹی پر جا چکا تھا۔اگلے روز حضرت امام حسینؑ کا چالیسواں تھااور سارے ملک کا کاروبار بند تھا۔ایک جگہ پر لکھا ہوانظر آیا:''این حسین کیست کہ عالم ہمہ دیوانہِ اوست''(یہ حسین کیا شخصیت تھے کہ ساری دنیاان کی دیوانہ بنی ہوئی ہے)۔شام کے وقت یوں لگتا تھا جیسے سارا شہر دریا کے کنارے پر امڈ آیا تھا۔ فیملیاں سامانِ خورونوش سمیت درختوں کے نیچے گھاس پر پڑی تھیں۔ان کے درمیان چادریں لٹکائی جارہی تھیں،جس کے لیے بلدیہ کی طرف سے لوہے کی تاریں لگائی گئی ہیں۔ بہتوں نے رات وہیں پر گزاری۔بعض لوگ مچھر دانیاں ساتھ لائے تھے اور ان کے نیچے گدوں پر سو رہے تھے۔ ایک عجیب نظارہ تھا، جیسے ساحلِ دریا پر پورا شہرآباد ہو۔میں نے اگلی صبح لوگوں کو وہاں پر ناشتہ کرتے ہوے دیکھا۔اکثر فیملیاں کھانا گھر سے پکا کرلائی تھیں مگر بعض نے وہاں پر دیگچے چولہوں پر چڑھار کھے تھے۔یوں بھی ایران میں ایسے ریستوران پائے جاتے ہیں، جہاں سے لوگ تیارشدہ کھانے دیگچیوں میں ڈال کے گھر لے جاتے ہیں۔میں نے شیراز میں ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ مجھے کسی اچھے سے ریستوران میں چھوڑ آئے ، جہاں پر ایران کی خاص ڈش چلو کباب ملتی ہو۔ وہ مجھے ایک ایسے ریستوران میں چھوڑ گیا جہاں پر گاہک دیگچیاں اٹھائے ہوے قطار لگا کر کھڑے تھے۔ پتا چلا کہ ایسے ریستورانوں سے پکا پکایا کھانا لانے کا رواج ہو چلا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اوتا میرے ساتھ نہیں گئی تھی وگرنہ وہ مجھے اس ڈھابے میں کبھی داخل نہ ہونے دیتی،جسکی صفائی ستھرائی کا معیار ویسا ہی تھا جیسا ہمارے ہاں کے حلوائیوں کی دکانوں کا ہوتا ہے۔

اصفہان کی اکثر تاریخی عمارتیں شہر کے مرکز میں ہیں،جن تک پہنچنے کے لیے دریا کے عجوبہِ روزگار تینتیس دروازوں والے پل کو پار کرنا پڑتا ہے جو بیک وقت دریا پر بند اور پل ہے اورجس کی دوہری محرابیں تین صدیوں سے شہر کی خوبصورتی میں اضافے کا موجب ہیں۔شہر کی حدود میں دریا پر تین دوسرے پل بھی پائے جاتے ہیں۔ایک پل کے نیچے دونوں ساحلوں پر چائے خانے بنے ہوے ہیں،جن میں گاہک بہتے ہوے کھلے پانی کی سطح پر بیٹھتے ہیں اور پانی کی نہریں ان کی میزوں کے دائیں بائیں بہتی ہیں۔اس سے اوپر پائی جانے والی محراب کی ڈاٹ میں بھی لوگ داخل ہوسکتے ہیں، اگر چہ ان کو سر نیوڑھا کر چلنا پڑتا ہے۔ دریا کے کنارے پر فردوسی کا مجسمہ کھڑا ہے اور تھوڑا آگے مشہورِ عالم ایران شناس پروفیسر پوپ(A.U.Pope) اوراسکی بیوی کی قبریں ہیں جس نے اصفہان میں ایران شناسی کا ادارہ قائم کیا تھا اور وہاں پر دفن کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔پل کے دوسری طرف ''چہار باغ'' نامی سڑک ہے

جس پر سے گزر کر انسان ''میدانِ امام'' (انقلاب سے قبل ''میدانِ شاہ'') میں پہنچتا ہے جو اپنی لمبائی (۵۵۰ میٹر) اور چوڑائی (۱۶۵ میٹر) کے سبب ماسکو کے ریڈ اسکویر سے دو گنا بڑا ہے۔ اسکے چاروں طرف تاریخی عمارتیں کھڑی ہیں، جو سترھویں صدی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ عین درمیان میں شاہی محل ''علی قاپو'' کھڑا ہے، جسکی بالکنی سے شاہ عباس پولو کا کھیل دیکھا کرتے تھے، جو اس میدان میں کھیلا جاتا تھا۔

اس میدان میں ایران کی دو خوبصورت ترین مسجدیں بھی پائی جاتی ہیں، جن میں سے ایک (مسجد شیخ لطف اللہ) شاہ کے حرم کی خواتین کے لیے مخصوص تھی اور اب میوزیم ہے۔ اس کی بناوٹ اور ڈیکوریشن بے مثال ہے۔ دوسری ''مسجدِ امام'' ہے، جس میں داخلہ صرف اوقاتِ نماز میں ممکن تھا۔ میں گیٹ پر کھڑا ظہر کی اذان کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان نے مجھے باتوں میں لگا لیا۔ آیندہ دو روز تک وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہا۔ ''مسجدِ امام'' کے اندر ایک نہیں پندرہ محرابیں ہیں۔ پھر اس کی خاص چیز یہ ہے کہ مرکزی گنبد کے نیچے اگر چٹکی بجائی جائے تو اس کی بازگشت گنبد کی طرف سے سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گنبد کو زلزلہ پروف بنانے کی خاطر اس کی دو پرتیں بنائی گئی تھیں مگر جب خطیب منبر پر کھڑا ہو کر خطبہ دیتا ہے تو اس کی آواز کی بازگشت پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ کسی قسم کے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اس کی آواز اس وسیع و عریض مسجد کے ہر کونے میں سنی جاتی ہے۔ جو چیز مجھے بہت پسند آئی وہ یہ تھی کہ مسجد کے دروازے پر اور ایک بغلی ایوان کی دیواروں پر ایسی ٹائلیں لگائی گئی ہیں، جن پر ایران میں پائے جانے والے پرندوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ اس کو جنگلی یا درختی پیٹرن کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تصویریں آگے چل کر ایران میں بنائے جانے والے قالینوں میں نقل کی جانے لگی تھیں۔ یہی نہیں اس مسجد کی ٹائلوں پر عربی حروف کو نئے اسلوب میں لکھنے کے جو تجربے تین سو سال پہلے کیے گئے تھے، ان کی بازگشت بیسویں صدی کے آرٹ ورک میں ملتی ہے۔

پھر میری ملاقات ایک یہودی سنار سے ہوئی جس نے بتایا کہ ایران میں شاہ رضا پہلوی کے زمانے میں تیس لاکھ یہودی ہوا کرتے تھے، اب صرف پندرہ ہزار رہ گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر امریکہ یا اسرائیل چلے گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میں تل ابیب میں ایک ایرانی یہودی کی دکان پر ایرانی قالین دیکھنے گیا تھا، جس نے بتایا تھا کہ ایرانیوں کی وہاں پر اچھی خاصی کالونی بن چکی ہے۔ اسرائیل کا موجودہ صدر ایرانی نژاد قتساف (ایرانی نام ''قصاب'') ہے۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آ گیا کہ میں اگلے روز مشہد جانا چاہتا تھا، مگر ہوائی جہاز میں بکنگ نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے کہا یہ بات میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس نے فون کر کے اسی وقت سیٹ بک کرا دی۔ میں نے کہا کہ میں نے ایرانی دوستوں سے اصفہان کی خوبصورت لڑکیوں کے بہت قصے سن رکھے ہیں، خدا جانے وہ سب کہاں چلی گئی ہیں۔ مجھے

سڑکوں پر اور باغات میں نچلے طبقے کے لوگ دکھائی دیے ہیں، جن کے کسانوں اور دہقانوں والے چہروں پر ایرانی ثقافت کا غازہ ابھی نہیں چڑھا۔ اس نے کہا شام کو میرے ساتھ فردوس ہوٹل چلو تو تمھارا گلہ دور ہو جائے گا۔ پھر اس نے اضافہ کیا، دیکھو اکیلے آنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے ساتھ پھرنے والا نوجوان آ کر ہمیں غضِ بصر کی تلقین کر کر کے ساری شام بور کرتا رہے۔

فردوس ہوٹل پہلے وقتوں میں کارواں سرائے تھا۔ اس کی عمارت اتنے پیار سے بنائی گئی ہے کہ انسان معماروں اور بنوانے والے کے ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ داخلے کا حال ایسا ہے کہ یورپ کا بڑے سے بڑا ہوٹل اس کو دیکھ کر شرم کے مارے منہ چھپاتا پھرے۔ مہمانوں کے کمرے وسیع وعریض صحن کے چاروں طرف دو منزلہ بنے ہوئے ہیں۔ صحن دراصل ایک نہایت خوبصورت باغ ہے۔ جگہ جگہ فوارے پانی اچھال رہے ہیں۔ کیاریوں میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ سامنے کے ایوان میں چائے خانہ ہے جس کی کرسیاں اور بنچ باغ کے اندر بچھے ہوئے ہیں۔ لگتا تھا کہ اصفہان کی ساری خوبصورت لڑکیاں اس شام وہاں پر جمع تھیں۔ ان کے حسن کی چمک کے سبب میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اصفہان کی پریوں کی تعریف کرنے والوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

اصفہان کے بعد میری اگلی منزل مشہد تھی۔ ''سائے'' نے ہوائی اڈے تک میرا ساتھ دیا۔ راستے میں بات چادر سے شروع ہو کر متعہ کی طرف جا نکلی، جو اس کے نزدیک ایک آدھ ماہ کے لیے جائز ہے، البتہ عورت کو حمل ٹھہر جائے تو وضعِ حمل تک اور بچے کی رضاعت کے دوران زچہ و بچہ دونوں کو خرچ دینا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ تم نے اب تک متعہ کیوں نہیں کیا؟ اس نے کہا پیسوں کی قلت کے سبب۔ البتہ جب وہ شادی کرے گا تو وہ ہمیشہ کے لیے ہوگی۔ پھر اس نے مجھے ہدایات دینی شروع کر دیں کہ مشہد میں حرامیوں سے بچ کر رہوں، کسی پرائیویٹ کار میں نہ سوار ہوں، صرف منظور شدہ ٹیکسیوں میں سفر کروں۔ ہوٹلوں میں کوئی خطرہ نہیں ہے مگر سڑکوں پر افغانی اور آذربائیجان کے بدمعاش بہت ہوتے ہیں اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایران میں ہائی جیکنگ کے واقعات ان دنوں بہت ہو رہے تھے۔

ہوائی جہاز پر بورڈنگ کے وقت میں نے ایک نوجوان لڑکی کو، جس کی باری نہیں آ رہی تھی، قطار میں اپنے سے آگے جگہ دے دی۔ وہ شکل وصورت سے بالکل پاکستانی لگ رہی تھی۔ اس نے ایرانی عورتوں کی طرح کالے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے اور سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا۔ جب ہم مشہد میں جہاز سے اتر رہے تھے تو وہ پھر کہیں سے نمودار ہو گئی۔ اس نے پوچھا پرواز کیسی گزری؟ میں نے کہا بس گزر گئی۔ اس نے کہا کیا خاک گزری ہے۔ دراصل ایر کنڈیشننگ کام نہیں کر رہی تھی، جس کے سبب جہاز میں بے پناہ گرمی تھی۔ جہاز کو اچھے دن دیکھے ہوئے بہت زمانہ بیت چکا تھا۔ سوا گھنٹے کی پرواز کسی

گرم حمام میں بیٹھے ہونے کا احساس دلاتی تھی، جس کے دوران سب مسافر پسینے میں شرابور تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ دس برس تک ابوظبی میں رہ چکی تھی، جہاں پر اس کے خاندان کی دوستی پاکستانی فیملیوں کے ساتھ تھی، جن سے اس نے انگریزی سیکھی تھی۔ اس نے پوچھا کیا میں مشہد میں کسی کو جانتا ہوں۔ میں نے کہا وہاں میری کتاب کا مترجم رہتا ہے۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا ہوں اور نہ ہی اسے میری آمد کی اطلاع ہے۔ اس نے کہا ہوائی اڈے پر آپ کی ملاقات میری فیملی سے ہوگی۔ ہم آپ کو اپنی کار میں شہر لے جائیں گے اور کسی اچھے سے ہوٹل میں ٹھیرنے کا انتظام کرا دیں گے۔ اس کا باپ ہادی غراب مشہد کا جانا پہچانا صنعت کار تھا، جس نے مجھے اپنے ایک دوست کے ہوٹل میں کمرہ لے دیا۔ رخصت کے وقت، جب ہم ان کی کار کے پاس سڑک پر کھڑے تھے، بیٹی نے الوداعی مصافحہ کے لیے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے پتا تھا کہ ایران میں عورتوں کے لیے غیر مردوں سے مصافحہ کرنا ممنوع ہے، اس لیے میں نے کہا اگر کسی ملا نے دیکھ لیا تو دھر لی جاؤ گی۔ اس کے باپ نے کہا وہ وقت آ رہا ہے جب ہر درخت پر ایک ملا لٹک رہا ہوگا۔

اگلی صبح میں اس پبلشر (''موسسہ چاپ وانتشارات آستانِ قدسِ رضوی'') کے آفس میں پہنچ گیا جس نے میری انگریزی کتاب (Muslim Education) کا فارسی ترجمہ (''نہاد آموزش اسلامی'') چھاپا تھا۔ وہ گھبرا گیا کہ میں کہیں اس سے رائلٹی نہ مانگ بیٹھوں، اس لیے اس نے کتاب کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں اس کے آفس سے اٹھ کر نیچے دکان میں گیا اور وہاں سے کتاب کا ایک نسخہ اٹھا لایا۔ اب اس کو یاد آ گیا کہ اس کتاب کی رائلٹی انھوں نے مترجم کو ادا کر دی تھی، ساتھ ہی اس نے کہا کہ تین ہزار کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ اگر میں ان کو دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دیتا جاؤں تو وہ کتاب کو اگلے دو تین ماہ کے اندر چھاپ کر شائع کر دیں گے۔ میں نے مترجم کا پتا دینے کو کہا، جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ مشہد میں رہتا ہے اور عدالت کا جج ہے، پبلشر نے کہا کہ وہ اس کو بالکل نہیں جانتا۔ مگر اتنے میں اس کی دکان کا ایک کارندہ آفس میں آ گیا تھا۔ اس نے کہا مترجم محمد حسین ساکت مشہد کی ایک مشہور شخصیت ہیں، جن کو وہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان کی عدالت پبلشنگ ہاؤس کے بالکل قریب ہے۔ اس کو ان کا فون نمبر بھی یاد تھا۔ اس دوران میں ساکت صاحب ایران کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے جج مقرر کیے جا چکے ہیں اور انھوں نے میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن تہران کے ایک پبلشر کے تعاون سے چھپوا دیا ہے، جس میں میرا ایک مقالہ بھی شامل کیا گیا ہے، جو میں نے اسلامی نظامِ تعلیم پر عربی میں چھپنے والی ایک کتاب کے لئے لکھا تھا۔ علاوہ ازیں متعدد مستشرقین کے میری کتاب پر لکھے جانے والے ریویو بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

ساکت صاحب یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں ان کے شہر میں آیا ہوا تھا۔انھوں نے کہا آپ ابھی عدالت میں آجائیں۔ مجھے خود آپ سے ملنے کا ایک عمر سے اشتیاق تھا۔ میں گیا تو وہ عدالت کا باقی ماندہ کام اگلے روز پر ملتوی کر چکے تھے۔ میں نے انھیں پبلشر کے طرزِ عمل کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے کہا ایران میں پبلشر رائلٹی ادا نہیں کرنا چاہتے اس لیے قسم قسم کے بہانے تراشتے ہیں۔ان کو بھی رائلٹی یا ترجمے کا معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔یوں بھی کتاب کا ترجمہ انھوں نے پیسے کمانے کی خاطر نہیں کیا تھا۔وہ اس موضوع پر کئی ایک دوسری کتابیں بھی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پھر انھوں نے انکشاف کیا کہ میری کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں بھی ہو چکا ہے، جس کو سعودی عرب کے ایک پبلشر نے شائع کیا تھا(''**تاریخ التعلیم عند المسلمین والمکانۃ الاجتماعیہ لعلمائھم حتی القرن الخامس الھجری**'')۔انھوں نے شام کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور کہا کہ وہ حرم شریف کی زیارت کے لیے خود میرے ساتھ چلیں گے ،جس کی مجلسِ انتظامیہ کے وہ رکن تھے۔ مجھے خاص طور پر حضرت علیؑ کے نسخۂ قرآن کو دیکھنے کا شوق تھا، جو حرم کے کتاب خانۂ مرکزی میں رکھا ہوا ہے۔

ساکت صاحب کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ایک ماتمی گروپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو شاید ایک سو افراد پر مشتمل تھا۔سب لوگ باقاعدہ قطاروں میں چل رہے تھے اور ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی لوہے کی زنجیروں سے اپنی پشتوں پر ڈھول کی تال پر ضربیں لگا رہے تھے۔ یہ ماتم بھی اربعین کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔مشہد ایران سے زیادہ افغانی شہر لگتا ہے۔ ملک کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں وہاں پر نئی کاریں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ سڑکوں پر پرانے وقتوں کی کاریں جیسے جادو کے زور پر چل رہی تھیں۔ وہ ٹریفک کے جملہ اصولوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنی مرضی سے ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہی تھیں۔ ٹریفک کے سپاہی چوکوں پر کھڑے تھے ،مگر ان کو جیسے اس سارے کاروبار سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اندرونی شہر سے باہر نکل جائیں تو سڑکیں کشادہ ہیں اور ہر طرف سرسبزی نظر آتی ہے۔جس طرف دیکھو باغات دکھائی دیتے ہیں۔فردوسی چوک جیسے ایک چھوٹا سا باغ ہے، جسکے اردگرد اتفاقی طور پر ٹریفک کی بھرمار ہے۔

ساکت صاحب نے بتایا کہ ایران میں علامہ اقبال کے کلام کو مقبول بنانے میں انھوں نے پہل کی تھی۔ چنانچہ وہاں پر اقبال پر چھپنے والا پہلا تحقیقی مقالہ ان کا لکھا ہوا تھا،جس کے سبب ان کو لاہور میں ہونے والی اقبال کانفرنس میں بلایا گیا تھا۔ پھر انھوں نے ڈاکٹر علی شریعتی کو اقبال کی کتابیں پڑھنے کے لیے بھیجیں ،جن کو پڑھ کر انھوں نے اقبال پر ایک کتاب لکھی تھی ، جو بہت مقبول ہوئی۔امام خمینی کے جانشین حجت الاسلام علی خامنائی نے اقبال کی کتابیں ان سے منگوا کر پڑھی تھیں اور خود بھی ایک رسالہ

اقبال پر لکھا تھا، جس کے سبب فی زمانہ ایران میں اقبال کا شمار عظیم ترین فارسی شاعروں میں ہوتا ہے۔ خود اقبال نے ایران کے ملک الشعراء بہار سے مراسلت بھی کی تھی، جس کے بارے میں شاید عام طور سے لوگوں کو علم نہیں ہے۔ ساکت صاحب نے ایک بات پر تعجب کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ اقبال کی فارسی نظموں میں گرائمر کی غلطیاں نہیں ملتیں، مگر ان کے خطوں کی نثر میں ایسی غلطیاں موجود ہیں۔ ان کی ذاتی رائے میں اقبال بیسویں صدی میں عالمِ اسلامی کے اہم ترین شاعر تھے۔

دوسرے روز ساکت صاحب اور ان کے بیٹے مصطفیٰ کی معیت میں آٹھویں حضرت امام رضاؑ کے روضہ (حرم شریف) پر حاضری دی، جو ایران میں شیعوں کا سب سے اہم مقامِ زیارت ہے۔ وہاں پر زائرین کا بے حد ہجوم تھا، جس کے بارے میں بتلایا گیا کہ دن رات اسی طرح رہتا ہے۔ عقیدت مندوں کی آہ و زاری دکھاوے کی چیز نہ تھی، ان کے اندرونی جذبات کا آئینہ تھی۔ لوگ مقبرے کی جالی کو پکڑ کر رو رہے تھے، دعائیں پڑھ رہے تھے، منتوں کے پورے ہونے کی التجائیں کر رہے تھے۔ میں نے زندگی میں ایسا منظر کسی دوسری جگہ پر نہیں دیکھا۔ میں نے صاحبِ قبر کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ میرے اندر چھپے ہوے وہابی نے مجھے اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔

یوں تو حرم کی عمارت کی بیرونی دیواروں اور گنبد پر ٹائلوں سے نہایت عمدہ گلکاری کی گئی ہے، مگر اس کے ایوانوں میں شیشے کا استعمال ہوا ہے جس کا نمونہ میں شیراز میں حضرت امام رضاؑ کے بھائی کے مقبرے میں دیکھ چکا تھا۔ دونوں جگہوں پر اس کے نتیجے میں چمک ضرور پیدا ہو جاتی ہے، مگر وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو رنگین ٹائلیں پیدا کرتی ہیں۔ حرم شریف کے پہلو میں تیمور کی بہو گوہر شاد نے، جو اس کے بیٹے شاہ رخ کی بیوی تھی، ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جس پر لگنے والی ٹائلیں اپنا ثانی ڈھونڈتی ہیں۔

ساکت صاحب کی ہمراہی کے سبب میرے لیے حرم آستان قدس رضوی کے مرکزی کتاب خانے کے دروازے کھل گئے، جہاں پر فارسی اور عربی کی کتابوں کا غیر معمولی خزانہ پایا جاتا ہے۔ حضرت علیؑ کا قرآن دیکھا جو ہرن کے چمڑے پر مکتوب ہے۔ اس پر سن چالیس ہجری لکھا ہوا ہے۔ قرآن کا دوسرا قدیمی نسخہ ۱۲۸۱ھ کا تحریر کردہ ہے، جس کی کتابت علی عسکر ارسنجانی نے کی تھی۔ اسی طرح قرآن کا ایک ورق رکھا ہوا ہے جو خطِ محقق میں تحریر کردہ ہے، اس کا کاتب تیمور کا پوتا بائیسنگو رمرزا تھا، جو شاہ رخ کا بیٹا تھا۔ کتاب خانے کے ہیڈ کاتب محمد علی فراستی نے اپنے عملے سے متعارف کرایا اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوے خطاطی کے چند نادر نمونے عطا کیے۔ میں نے پوچھا کیا میں ان کو پاکستان کے کسی مجلّے میں چھپوا سکتا ہوں۔ اس درخواست کو انھوں نے کمال مہربانی سے قبول کیا اور اجازت مرحمت کی۔

ہادی غراب صاحب مجھے تہران جانے کے لیے ہوائی اڈے پر چھوڑنے آئے۔ وہ کوکا کولا کی

بڑی بوتلیں بھرنے کے لیے فیکٹری لگانے کے تمام مراحل طے کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ریگ مار کاغذ تیار کرنے کی فیکٹری بھی لگانے کا ارادہ رکھتے تھے اور کسی جرمن کمپنی کی شراکت چاہتے تھے۔ ہوائی اڈے پر ہماری ملاقات دو ایرانی انجینئروں سے ہوئی جنھوں نے مشورہ دیا کہ ریل گاڑی کی پٹڑیاں تیار کرنے کا کارخانہ لگایا جائے، جس کے لیے انھیں جرمنی سے لوہے کے کارخانے کی مشینری مل جائے گی۔ غراب صاحب نے کہا جرمنوں سے جا کر کہو کہ ایران میں مینیو لگ چکا ہے اور جو کوئی چاہے کھانے میں شریک ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا اس چیز کا کیا علاج کیا جائے کہ امریکہ نے ایران کا معاشی بائیکاٹ کر رکھا ہے، جس کی خلاف ورزی کی جرأت جرمن کارخانہ دار نہیں رکھتے۔

ہوائی جہاز میں میرے پہلو میں ڈاکٹر امیر خلیلی بیٹھے ہوے تھے، جو برسوں تک امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں اقتصادیات پڑھانے کے بعد اسلامی انقلاب آنے پر ایران لوٹ آئے تھے اور نیشنل یونیورسٹی میں پڑھانے پر مامور ہوے تھے، مگر اس دوران میں بہت حد تک مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب انقلاب آیا تو ملا لوگ حکومت کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ اس دوران میں انھوں نے ملک کی اقتصادیات کو برباد کر دیا ہے ۔ انھوں نے خاویار (Caviar) کی مثال دی جو ایک خاص مچھلی Stohr کے انڈوں کا نام ہے اور جس کی مغربی ممالک میں بہت مانگ ہے۔ امام خمینی نے اس کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ خاویار کو زندہ مچھلی کے پیٹ کو چیر کر حاصل کرنا اور اس کی تجارت کرنا اسلامی فقہ کی نظر میں حرام ہے۔ اس وقت تک خاویار کی تجارت پر ایران کی گویا اجارہ داری تھی، کیونکہ دنیا کا بہترین خاویار کیسپین بحیرہ (Caspian Sea) سے آتا تھا اور ایران اس کی برآمد سے کئی ملین ڈالر سالانہ کماتا تھا۔ امام خمینی کے فتوے کے نتیجے میں خاویار کی تجارت ایرانیوں کے ہاتھ سے نکل کر روسیوں اور دوسری قوموں کے قبضے میں چلی گئی۔ جب اس قدر نقصان ہو چکا اور ہزاروں ایرانی بیکاری کا شکار ہو گئے تو پھر کہیں جا کر صدرِ مملکت رفسنجانی کسی طریق سے امام خمینی کو اپنا فتویٰ واپس لینے پر آمادہ کر سکے۔ ڈاکٹر خلیل اس دوران میں امریکہ لوٹ گئے تھے، مگر چاہتے تھے کہ ان کے بچے ایرانی ثقافت و تمدن سے آگاہ رہیں اس لیے ان کو لے کر بار بار ایران آتے تھے۔

تہران ہوائی اڈے پر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ''ایران ہوٹل'' چلنے کو کہا۔ اس نے وہ بات دہرائی، جو میں اس سے قبل سن چکا تھا کہ کیوں اتنے مہنگے ہوٹل میں جانا چاہتے ہو، میں تم کو ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں لے چلتا ہوں، جو کسی بھی مہنگے ہوٹل کا مقابلہ کرسکتا ہے مگر جس کی قیمتیں بہت مناسب ہیں۔ اس طرح میں ''امید ہوٹل'' میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کو شاید بھتہ ملتا ہوگا۔ اس کی بات درست تھی۔ تہران میں بہت سے ایسے نئے ہوٹل کھل چکے ہیں، جو فی الواقع یورپ کے

ہوٹلوں کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کمرے میں میز پر موسمی پھلوں کی پلیٹ دھری تھی اور چار کتابیں۔ میں نے ’’امتیازات اقتصادی اسلامی‘‘ کی ورق گردانی شروع کی جس میں ایک ذیلی عنوان ’’اسلام دینِ استعمار‘‘ مجھے بہت دلچسپ لگا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اور مصنف (فخر الدین حجازی) کی نکتہ سنجی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ بسا اوقات اصطلاحات کے اصل معنی لوگ بھول جاتے ہیں اور ایسے معنی اختیار کر لیتے ہیں، جو اصل کے برعکس ہوتا ہے۔ اس نے کہا دنیا میں کتنی ہی انجمنیں تحفظِ حقوقِ انسانی وحیوانات کے لیے بنائی جاتی ہیں مگر اب تک کسی کو یہ بات نہیں سوجھی کہ لغت کے تحفظ کی خاطر بھی انجمن بنائی جانی چاہیے، کیونکہ یہ بے دفاع کلمات دوسری ہر چیز سے زیادہ حفاظت کیے جانے کے لائق ہیں۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے قرآن کی درجِ ذیل آیت کا حوالہ دیا: **هو انشاكم من الارض و استعمركم فيها** (٦ ہود) خدا تعالیٰ نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں استعمار (آباد) کیا۔ اس نے لکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سب سے بڑا استعماری ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس لفظ کے معنی کو بدل دیا گیا ہے۔ آج کل اس لفظ کا غلط استعمال ہو رہا ہے اور اس کا جو معنی لیا جاتا ہے وہ اس لفظ کے اندر نہیں پایا جاتا۔ میں نے ایران کے سفر سے صرف یہی ایک سبق نہیں سیکھا، بلکہ وہاں سے بہت حد تک اس ملک کے بارے میں مثبت تأثرات کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔

ملائیزیا میں اسلام کانفرنس

ستمبر ۱۹۹۹ء کو ملائیزیا میں ایک کانفرنس غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں منعقد ہوئی، جس میں مجھے حکومتِ جرمنی کی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت تک مجھے بنگلہ دیش سے آگے جنوبی ایشیا کے علاقوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، البتہ میں برسوں سے ایک رسالے **Journal Institute of Muslim Minority Affairs** کے بورڈ آف ایڈیٹرز میں شامل ہوں، جس میں ساری دنیا میں پائے جانے والی مسلم اقلیتی آبادیوں کے بارے میں مضامین چھپتے ہیں۔ کوالا لومپور کانفرنس میں شمولیت کے لیے قریب قریب تمام جنوبی ایشیائی ممالک کے مسلمانوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ کمبوچا، ملوکا، تھائی لینڈ یا فلپائن کے مسلمانوں کے بارے میں کسی رسالے یا اخبار میں مضمون پڑھنا مختلف چیز ہے اور ان سے بالمشافہ ملنا اور تبادلۂ خیالات سراسر دوسری۔ اس سے

قبل میری ملاقات کمبوچا کے چند مسلمانوں کے ساتھ یمن میں ہوئی تھی مگر وہ لوگ نسلاً یمنی تھے اور ان کے گھروں میں بدستور عربی بولی جاتی تھی اس لیے جب اس ملک پر پول پوٹ کے ریڈ خمیر نے قبضہ جما لیا اور لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا جانے لگا، تو وہ لوگ اپنے آباء واجداد کے ملک یمن لوٹ گئے تھے۔ جب کہ کولالمپور میں میری ملاقات ڈاکٹر عبدالقیوم سے ہوئی، جو چام قوم سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے اکثر افراد مسلمان ہیں۔ یہ قوم پندرھویں صدی میں مرکزی ویت نام سے ہجرت کر کے کمبوچا آئی تھی۔ یہ اہلِ سنت ہیں اور شافعی فقہ کی پیروی کرتے ہیں۔ ریڈ خمیر نے اپنے زمانۂ اقتدار (۱۹۷۵ء۔۱۹۷۸ء) میں بیس لاکھ انسانوں کو قتل کیا تھا، جن میں پانچ لاکھ مسلمان بھی شامل تھے۔ بمشکل دو لاکھ مسلمانوں کو اپنی جان بچانے میں کامیابی ہوئی تھی۔ ۱۹۹۹ء میں ان کی تعداد چار لاکھ پچاس ہزار بتائی گئی۔ ان کے ہر گاؤں میں مسجدیں موجود ہیں جہاں پر بچوں کو اسلامی تعلیم سکھانے کا انتظام ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے بتایا کہ ریڈ خمیر نے مسلمانوں کے علماء اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کیا تھا۔ کمبوچا کے مقابلے میں تھائی لینڈ اور فلپائن میں مسلمان اپنے حقوق کی خاطر ملک کی مرکزی حکومت کے خلاف مسلح جنگ میں مصروف تھے۔ دونوں ملکوں میں خالص اسلامی آبادی کے علاقے موجود ہیں جو خود مختاری چاہتے ہیں۔ فلپائن کے وفد میں دس استانیاں بھی شامل تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ آٹھ بیٹوں کی ماں ہے، جو سب کے سب غازی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک علاقائی بادشاہ بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور بتایا کہ ان کی مملکت میں اسلامی شریعت رائج ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہاں کے مسلمان فلپائن کی مرکزی حکومت کے قوانین کی کوئی پروانہیں کرتے۔

چین میں مسلمانوں کی تعداد بیس ملین بتائی جاتی ہے۔ دس اقلیتی قوموں کے تمام افراد مسلمان ہیں۔ ان کی اکثریت اہل سنتِ والجماعت سے تعلق رکھتی ہے اور حنفی فقہ کی پیروکار ہے۔ ملک میں پینتیس ہزار مساجد اور چار صد اسلامی انجمنیں پائی جاتی ہیں۔

اختتامیہ

یکم دسمبر ۱۹۹۹ء کو مجھے ملازمت سے ریٹائرمنٹ ملی، مگر پیشتر اس کے کہ میں اس وقت کے مصرف کے لیے، جو آئندہ دنوں میں مجھے وافر طور پر میسر ہوگا، کوئی اچھا سا پروگرام بنا سکتا، دل کے موروثی مرض نے آن دبوچا، جس کے بارے میں مجھے پتا تھا کہ وہ کسی روز میرے دروازے پر دستک دے گا۔ میرے خاندان کے اکثر افراد اس کا شکار ہوئے تھے۔ دو بھائی اور ایک بہن مجھ سے قبل ہارٹ اٹیک کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ تینوں فضلِ ربی سے حیات ہیں۔ ان کا کامیاب بائی پاس آپریشن ہو چکا ہے۔ میں برسوں سے کولیسٹرول لیول کو قابو میں رکھنے کی خاطر دوائیاں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے پتا تھا کہ میری باری ایک روز آنے والی ہے۔ البتہ یہ خبر نہ تھی کہ وہ ریٹائرمنٹ کے صرف تین ماہ بعد آ جائے گی۔ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ یہ مرحلہ کسی قسم کی مشکلات کے بغیر سہولت سے گزر گیا۔ قدرت نے مجھے ہارٹ اٹیک سے، جس کے نتیجے میں دل کا ایک حصہ ناکارہ ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے، محفوظ رکھا۔ بائی پاس آپریشن کے بعد طبی ہدایات کے مطابق مجھے اپنے شب و روز کے پروگرام میں کچھ تبدیلیاں کرنے کے علاوہ سیر و سیاحت کے مشغلے کو خیر باد کہنا پڑا، جو میری زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے افسانہ نگاری کو تھوڑے عرصے کے لیے پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنا زندگی نامہ لکھنا شروع کیا، جو آپ کے سامنے ہے۔

آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہوئے بعض مقامات پر اپنے افسانوں کا حوالہ دیا ہے، مگر صرف اس حد تک جہاں پر ان میں حقیقی واقعات کا بیان موجود ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے گا کہ بس یہی چند افسانے ہیں، جن میں سچی کہانیاں بیان ہوئی ہیں اور دوسرے افسانوں میں حقیقت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کسی جگہ پر لکھ چکا ہوں کہ کوئی کہانی نہیں پائی جاتی، جس میں حقیقت سرے سے موجود نہ ہو۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ حقیقت عام طور سے اکثر و بیشتر سپاٹ ہوتی ہے، جس کو افسانہ بنانے کے لیے بہت کچھ گھڑنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں افسانویت پیدا کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ نقاد اس کو ناول قرار دینے پر اصرار کریں گے۔ گابریل لاؤب کا مقولہ ہے کہ ''نقاد، جن کو لکھنا نہیں

آتا، وہ ان نقادوں سے بہتر ہیں جن کو پڑھنا نہیں آتا۔‘‘

دوسری طرف مجھے پتا ہے کہ اس کتاب میں پون صدی کی کہانی بیان ہوئی ہے، جس کا میں صرف راوی ہی نہیں مرکزی کردار بھی ہوں۔ واضح ہے کہ مجھے ہر مرحلے پر چناؤ کرنا پڑا ہے۔ ایک لمبی عمر کے دوران پیش آنے والے تمام واقعات سنائے جانے کے قابل نہیں ہوتے اور نہ ہی قاری ہر قسم کا رطب و یابس پڑھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ باتیں چنی جائیں، جو قاری کے لیے دلچسپی کا موجب ہوسکتی ہیں۔ اس کتاب میں میرے متعدد سفروں کا ذکر بھی آیا ہے، جس کے سبب آپ بیتی بعض جگہوں پر سیاحت نامے کا رنگ اختیار کرگئی ہے۔ میں نے چاہا کہ قاری کو اپنا ہم سفر بنا کر ان مقامات پر لے جاؤں اور اس کو اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دکھاؤں، جو میں نے وہاں پر دیکھا تھا۔ سفر میں نے اپنی زندگی میں اس کے علاوہ بھی بہت کیے ہیں، مگر کیا ضروری ہے کہ انسان ہر سفر کی روداد بیان کرتا پھرے۔ میں نے صرف ان سفروں کے بارے میں لکھا ہے جو کسی پہلو سے میرے لیے اہمیت کے حامل تھے۔ میں نے اپنے دوستوں اور ہمعصروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض اوقات تفصیل کے ساتھ اور دوسری جگہوں پر اختصار سے۔ میں نے ان کی کہانی اس طرح بیان کی ہے، جس طرح میں نے اسے دیکھا اور سمجھا تھا۔ ہو سکتا ہے انھوں نے خود اپنی کہانی کو مختلف رنگ میں دیکھا ہو۔ میرے مدِّ نظر کسی کی تنقیص نہیں تھی، یہ ضرور ہے کہ میں نے ہر بات لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف بیان کردی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے خود اپنے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتی۔ کہانیوں میں انسان بہت کچھ چھپا سکتا ہے، تاریخ میں اس کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اور جو کچھ میں نے اس کتاب میں لکھا ہے وہ تاریخ ہے، جو یہ نہیں دیکھتی کہ کس کی بات ہورہی ہے، بلکہ اس کے مدِّ نظر یہ امر ہوتا ہے کہ بات کتنے سلیقے سے کہی جارہی ہے۔ اگر قارئینِ کرام نے میرے زندگی نامے کو پڑھے جانے کے قابل جانا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ تمت بالخیر۔

کمر فیلڈ۔ ۳ ستمبر ۲۰۰۵ء